بصائر و عبر

حصہ اول

رشحاتِ قلم
محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ

جمع و ترتیب
مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار
مہتمم جامعۃ العلوم الاسلامیہ
علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

مکتبہ بنوریہ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی ۵

بصائر و عبر

حصہ اوّل

رشحاتِ قلم

حضرت علّامۃ العصر محدّث کبیر شیخ سیّد محمّد یوسف بنوری رحمہ اللہ

ترتیب و جمع

مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار

رئیس

مجلس الدّعوۃ والتّحقیق الاسلامی

نائب رئیس

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی ۵

ناشر

مکتبہ بنوریہ، علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی ۵

باب اوّل

علمی مقالات

ج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ وحدہٗ، والصلاۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہ، وعلیٰ من تبع ھداہ وھدیہ؛ وبعد۔

ہمارے شیخ، محدث العصر حضرت العلامہ مولانا سیّد محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس دار فانی سے رحلت فرمانے کے بعد راقم الحروف کا دل چاہا کہ اپنے محبوب شیخ کے آنکھوں سے اوجھل ہونے کے بعد بھی وہ پیاری ہستی، وہ نورانی چہرہ، وہ بابرکت شخصیّت کسی نہ کسی بہانے سب کے سامنے موجود رہے۔ قارئین نے سنا ہوگا کہ من أحب شیئاً أکثر ذکرہ (جس کو کسی سے محبّت ہوتی ہے اس کا تذکرہ کرتا ہی رہتا ہے) یہ بھی ایک باعث تھا، اور ساتھ ہی یہ بھی کہ زندگی میں اپنے شیخ کی خدمت نہ کر سکے تو اب کچھ لیپا پوتی کرلیں۔ اس لئے مختلف جہات سے حضرت شیخ رحمہ اللہ پر اپنے ناقص انداز سے کام کرنے کا ارادہ کیا اور اب تک درج ذیل آثارِ شیخ ہدیۂ ناظرین ہو چکے ہیں۔

۱. جامعۃ دیوبند الاسلامیہ فی ضوء المقالات البنوریہ (عربی)

۲. المقدمات البنوریۃ (عربی، فارسی، اردو)

۳. القصائد البنوریۃ (عربی)

۴. مجربات بنوریہ (اردو)

یہ چاروں کتابیں چھپ چکی ہیں اور اب خدا کے فضل سے بصائر وعبر پیش خدمت ہیں۔ کئی سال قبل حضرت مولانا رحمہ اللہ کے تحریر کردہ ماہنامہ بینات کے اداریے الگ کئے تھے اور انہیں اپنی سمجھ کے مطابق تین ابواب میں تقسیم کر دیا تھا۔ (۱) مقالات علمیہ (۲) حالاتِ حاضرہ (۳) وفیات۔ مقالات علمیہ میں ان اداریوں کو لیا گیا ہے جس میں علمی مواد غالب تھا، اسی طرح حالاتِ حاضرہ میں ان مضامین کو رکھا گیا ہے جن میں حالات حاضرہ سے متعلق مواد کا حصہ وافر تھا۔

اگرچہ وہ بھی حقیقت میں علمی مقالات ہی ہیں لیکن چونکہ ان میں حالات حاضرہ کا رنگ و پہلو غالب ہے اس لئے اس ذیل میں ذکر کر دیا ورنہ سب ہی اداریے علمی شاہکار، ادبی یادگار اور حساس دل کے ترجمان اور عظیم مصلح کی شخصیت پر روز روشن کی طرح دلالت کرنے والے ہیں۔

وفیات میں ان صفحات کو رکھا گیا ہے جن میں دنیا سے رحلت کرنے والی بعض ممتاز و اہم شخصیات پر حضرت شیخ رحمہ اللہ نے کلمات تعزیت تحریر فرمائے تھے۔

اداریوں میں کچھ وہ مضامین بھی شامل ہیں جو بینات میں طبع ہو چکے ہیں، علمی مقام اور افادیت کے خاطر بصائر و عبر میں شامل کر لیا گیا، عنوانات بندہ کی ناقص رائے کے مطابق ہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ کسی جگہ جو عنوان ہونا چاہئے وہ نہ لگ سکا ہو۔ ایسی صورت میں مطلع فرما کر اجر حاصل کریں آئندہ اشاعت میں انشاء اللہ تعالیٰ درست کر لیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے یہ کام آج سے غالباً تین سال قبل کا ہے۔ کتابت بھی ہو چکی تھی لیکن طباعت نہ ہو سکی اب یہ مرحلہ بھی آ گیا۔ اللہ تعالیٰ ہی کا لاکھ لاکھ شکر ہے اس کی توفیق پر بھی اور اعانت پر بھی، اللہ تعالیٰ جزاءِ خیر دے برادر محترم مولانا عطاء الرحمٰن صاحب کو جنہوں نے حسب معمول اس کام میں بھی ہاتھ بٹایا اور برادرم مولانا حسن الرحمٰن صاحب اور برادرم مولانا فیض الرحمٰن صاحب کو بھی جنہوں نے اس کی تصحیح میں حصہ لیا اور ان سب حضرات کو بھی جنہوں نے اس سلسلہ میں کسی بھی طرح کی اعانت کی ہو۔ مکتبہ بنوریہ کی خوش نصیبی ہے کہ اسے اس کتاب کے طبع کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے تمام کاموں کو محض اپنی رضاء و قرب کا ذریعہ بنائے اور قبولیت سے نوازے اور موفق بنائے إنه علیٰ کل شئٍ قدیر و بالإجابة جدیر۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقه محمد و آله و صحبه اجمعین۔

کتبہ
محمد حبیب اللہ مختار

۲۸ - ۶ - ۱۴۰۸ھ
۱۷ - ۲ - ۱۹۸۸ء

فہرست

دینِ اسلام اور اس کی جامعیت

دینِ اسلام ایک جامع ترین نظامِ حیات ہے جو اپنے اصول و فروع کے لحاظ سے اخلاق و عبادات سیاسیات و معاملات اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے اس کی بنیاد وحیِ ربانی پر ہے جو ماورائے عقلِ انسانی ہے، حق جل مجدہٗ نے اپنے علمِ محیط اور کمالِ قدرت سے قیامت تک کے امراض کے لئے یہ نسخۂ شفا نازل فرمایا ہے، انسانی زندگی کا کوئی بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ ایسا نہیں جس کے لئے اسلام کا کوئی منصوص یا غیر منصوص حکم موجود نہ ہو، حق تعالیٰ نے قیامت تک اسے باقی رکھنے کی یہ تدبیر فرمائی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات اور عملی زندگی سے اس کی تشریح فرمائی اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ بابرکات میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسے خوب سمجھ کر اپنی زندگی کا نصب العین اور دستور العمل بنایا اور خلافت راشدہ میں اس کی عملی تفصیلات اپنی پوری وسعت سے منضبط ہوئیں۔ پھر ان فقہائے صحابہ۔ خلفائے راشدین، عبداللہ بن مسعود، ابوالدرداء، زید بن ثابت، ابی بن کعب، معاذ بن جبل، ابوموسیٰ اشعری، ابوہریرہ انس بن مالک، عبداللہ بن عباس، عائشہ صدیقہ اور دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے علمی و عملی طور پر تابعین اور ائمہ مجتہدین تک صحیح سالم بکمال و تمام پہنچا، اسی طرح تمام عالم میں عادل خدا ترس، پاک نیت اور اہلِ امانت افراد کے علم و عمل کے ذریعہ قرناً بعد قرنٍ توارث و تواتر سے پہنچ رہا ہے۔ چنانچہ آج کے اس خدا فراموش، پُرفتن اور قربِ قیامت کے دور میں بھی الحمد للہ یہ دین اپنی علمی اور عملی شکل میں ٹھیک ٹھیک موجود ہے، امت کے صالحین اور علمائے ربانیین اس پر عمل پیرا بھی ہیں اور اس کی تعلیم و تعلم اور تبلیغ و اشاعت میں بھی مشغول ہیں اور قیامت تک کے لئے کوئی نہ کوئی جماعت ایسی موجود رہے گی جو اپنی علمی و عملی زندگی سے اس کے صحیح صحیح خد و خال پیش کرتی رہے گی، الغرض اس طرح اللہ تعالےٰ نے اپنے دین کی حفاظت فرما کر ہر دور میں تمام عالم پر اتمامِ حجت کر دیا، نہ کل کسی کے لئے یہ کہنے کا موقعہ تھا کہ اسلام کے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے والے کہاں ہیں، نہ آج کسی کے لئے یہ

موقعہ ہے نہ آئندہ قیامت تک یہ گنجائش رہے گی۔

لیھلك من ھلك عن بینة ویحیی من حیی عن بینة۔

اب اتمامِ حجت کے بعد جسے اسلام کو چھوڑ کر برباد ہونا ہے وہ برباد ہوتا رہے اور جسے اسلام کو اپنا کر زندہ رہنا ہے وہ زندہ رہے۔

دار الافتاء و دار القضاء

اسلامی حکومتوں میں جب تک اسلامی قانون جاری رہا اور اسلامی حکومتیں کسی نہ کسی حد تک خدمتِ دین کی ذمہ داری کو محسوس کرتی رہیں، اس وقت تک ایک طرف محاکمِ عدلیہ قضا کا نظام جاری رہا اور دوسری طرف علمائے امت کے ذریعہ ہر وقت افتاء کا کام ہوتا رہا، اسلامی حکومتیں، دار القضاء کی طرح دار الافتاء کی سرپرستی بھی کرتی رہیں، آج بھی ان حکومتوں میں، جنہیں پوری طرح اسلامی حکومتیں کہنا مشکل ہے، قضاء و افتاء کا نظام کسی نہ کسی حد تک قائم ہے۔

متحدہ ہندوستان کے فرنگی استعمار کا شکار ہو جانے اور اس کے ظلم و جبر کے شکنجے میں جکڑ جانے کے بعد بھی بہت سی اسلامی ریاستوں میں یہ نظام کسی حد تک قائم رہا اور بھوپال، ٹونک، بہاول پور وغیرہ میں سوائے حدود کے تمام فیصلے اسلامی قانون کے مطابق ہوتے رہے۔ البتہ برٹش گورنمنٹ کے زیرِ نگیں علاقوں میں اسلامی قانون کو معطل کر دیا گیا، محاکمِ عدلیہ اٹھا دیئے گئے، ان کی جگہ تاجِ برطانیہ کی وفادار عدالتیں قائم ہوئیں، اسلامی حکومتوں کے قائم کردہ دار الافتاء برباد کر دیئے گئے، ان حالات میں امتِ محمدیہ کے دور اندیش اکابرِ دین نے امت میں دین کے علمی و عملی اور اخلاقی و اعتقادی نظام کو قائم اور باقی رکھنے کے لئے دینی ادارے قائم کئے جن سے تعلیم و تبلیغ اور درس و افتاء کے چشمے جاری ہوئے، یہ فقہائے اسلام اور حکمائے امت جنہوں نے ان کٹھن حالات میں یہ نظام قائم رکھا، صرف یہی نہیں کہ یہ حضرات علومِ اسلامیہ (تفسیر و حدیث، فقہ و اصول، جرح و تعدیل، قضایائے صحابہ و تابعین، نحو و بلاغت، صرف و لغت) کے دریائے ناپید اکنار کے شناور ہوتے تھے، بلکہ

اکابر اولیاء اللہ اور صالحینِ امت کے فیضِ صحبت سے تربیت یافتہ بھی ہوتے تھے، ان کے دل نورِ ایمان سے منور، ان کے دماغ فراستِ ایمانی سے روشن اور ان کے اخلاق و اعمال امت کے لئے قابلِ حجت نمونہ ہوتے تھے، روزِ اوّل ہی سے ان کی تعلیم و تربیت علومِ انبیاءؑ کے مزاج کے مطابق "خضر صفت" اساتذہ کے انفاسِ قدسیہ اور صحبتِ مقدسہ کے ذریعہ ہوتی تھی جس کے نتیجہ میں وہ علمی تبحر اخلاقی بلندی اور عملی کمال کے ساتھ شریعتِ محمدیہ کی ذمہ داری کی نزاکتوں کا بھی پورا پورا احساس رکھتے تھے انہیں یہ بات پوری طرح ملحوظ رہتی تھی کہ کل انہیں بارگاہِ خداوندی میں پیش ہونا ہے اس لئے خدا خوفی اور فکرِ آخرت کے جذبے سے کسی کی رو رعایت یا خوفِ ملامت کئے بغیر وہ ٹھیک ٹھیک احکامِ خداوندی بیان کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ یہ منصب صرف کتابوں کی ورق گردانی، غیر مسلم مستشرقین کی شاگردی، اعدائے اسلام کی معاشرت ان سے محبت و تعلق اور ان کی رہنمائی سے حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ ان کفار اور مستشرقین کی صحبت سے رہے سہے فطری نقوش بھی مٹ جاتے ہیں، قبولِ حق کی توفیق سلب ہو جاتی ہے اور دلوں پر مہر لگ جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلم ممالک کے سادہ لوح اسکالر جب مستشرقین کے سامنے زانوئے تَلَمُّذ طے کرتے ہیں تو انھیں دیکھتے ہی ان کی زبان سے بولنے اور ان ہی کے ذہن سے سوچنے لگ جاتے ہیں، ان کے صفحہ، دماغ اور لوحِ دل پر مستشرقین اساتذہ کے کافرانہ و معاندانہ نقوش کچھ اس طرح مرتسم ہو جاتے ہیں کہ کھلے کھلے اسلام کش نظریات کو وہ غیر شعوری طور پر ہضم کرتے چلے جاتے ہیں تاآنکہ وہ ان کفار کی کورانہ تقلید میں اس قدر راسخ ہو جاتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو "روایتی اسلام" کہہ کر بلائے استحقار سے ٹھکرا دیتے ہیں، جب قلوب مسخ ہو جائیں، نیتیں بدل جائیں، عزائم میں فساد ابھر آئے، مزاج بگڑ جائیں، ذہن کفر کے زہر سے مسموم ہو جائیں تو صرف یہی نہیں کہ پھر ان لوگوں کے سدھرنے کی توقع باقی نہیں رہتی بلکہ ان کا وجود ان کا علم اور ان کا کردار امت کے لئے سراپا فتنہ بن جاتا ہے، اس وقت ان کی حالت ٹھیک وہی ہوتی جو نوح علیہ السلام نے اپنی امت کی بیان فرمائی :-

إنك إن تذرهم يضلوا عبادك ولا يلدوا إلا فاجرا كفارا. اے اللہ اگر آپ انہیں مزید مہلت دیں گے تو یہ صرف آپ کے بندوں کو بہکائیں گے اور ان کی آئندہ نسل بھی فاجر و بدکار ہی ہوگی۔

تَفَقُّہ فی الدین اور منصبِ افتاء

بہر حال تَفَقُّہ فی الدین اور "افتاء" کے بلند منصب پر ہر زید و عمرو کو فائز نہیں کیا جا سکتا، نہ ابوالفضل اور فیضی مزاج کے لوگوں کو اس پر براجمان کیا جا سکتا ہے، ہمارے ملک میں ہزاروں علماء، ہزاروں مؤلف اور ہزاروں مبلغ موجود ہیں لیکن ایسے حضرات بس چند گنے چنے ہی ہوں گے جنہیں تفقہ کا منصبِ جلیل حاصل ہے اور امت ان کے علم و عمل پر اعتماد رکھتی ہے، فتویٰ نویسی بچوں کا کھیل نہیں کہ ہر شخص کو اس کا اہل سمجھا جائے، اگرچہ اسلامی حکومت کی سرپرستی نہ ہونے کی وجہ سے آج کل برساتی کیڑوں کی طرح نام نہاد فتویٰ نویسوں کا سیلاب امنڈنا شروع ہو گیا ہے جس کے ہاتھ میں قلم ہے اور اس نے الٹے سیدھے چند سیاہ حروف پڑھ لئے ہیں وہ مفتی بن بیٹھا ہے اور خلق خدا کو گمراہ کرکے اپنے نامۂ عمل کی سیاہی میں اضافہ کر رہا ہے لیکن امتِ مسلمہ کے ایک عامی شخص تک میں بھی ابھی اتنا شعور موجود ہے کہ وہ واقعی مفتی اور "مصنوعی مفتی" کے درمیان اور صحیح عالم اور "عالم نما جاہل" کے درمیان تمیز کر سکے۔

ہمارا ملک جب سے نقشۂ عالم پر ظاہر ہوا ہے آج تک حکومت کی سرپرستی میں "اسلامی محکمہ عدلیہ" اور اسلامی دارالافتاء سے محروم رہا ہے، حکومت کی نظر میں اگر اس کام کی کوئی اہمیت تھی تو اسے ممنون ہونا چاہیئے تھا کہ علماءِ امت نے بغیر کسی طمع و لالچ اور بغیر حکومتی اعانت کے دینی ادارے قائم کرکے امتِ مسلمہ کے دینی ضمیر کو بیدار رکھا، آج تمام قابلِ قدر ممتاز اداروں میں فتویٰ نویسی کے لئے دارالافتاء قائم ہیں جن میں ملک کے گوشے گوشے سے سوالات آتے ہیں اور قابلِ اعتماد ماہرین کی نگرانی میں ان کے جواب دیئے جاتے ہیں جو کام اسلامی حکومت کے کرنے کا تھا، الحمد للہ کہ وہ غریب نادار اور

بے نوا مسلمانوں کی توجہ سے پورا ہو رہا ہے، حکومت کے خزانے سے اس پر ایک پائی خرچ نہیں ہوتی۔

جدید مسائل اور اُن کے حل کے لئے مجلس کا قیام

عام فقہی مسائل کے مشکل ہونے کے علاوہ جو نئے مسائل جدید تمدن نے پیدا کر دیئے ہیں ان کے صحیح اسلامی حل کا مسئلہ اور بھی انتہائی پیچیدہ اور دشوار ہے جن لوگوں نے حالات کے دھارے پر بہہ جانے اور لوگوں کے دین و ایمان کی کشتی کو مغرب کی طرف بہنے والے الحادی سیلاب کے رُخ پر ڈال دینے ہی کو اصول بنا لیا ہے انہیں مشکلات کا احساس نہیں ہو سکتا، ان کے پاس ہر مشکل کا آسان حل زمانے کی آواز پر لبیک کہنا اور زمانہ سازی میں پورے اسلام کو لپیٹ لینا ہے، مشکلات کا صحیح احساس اس وقت ہوگا جب علومِ اسلامیہ اور فقہی دقائق کا صحیح علم ہو، منصبِ افتاء کی نزاکت کا احساس ہو، حلال و حرام میں فکرِ آخرت دامنگیر ہو اور قیامت کی مسئولیت پیش نظر ہو، الغرض دل و دماغ میں خوفِ خدا اور ذہن و فکر میں علم صحیح کا نور موجود ہو تو احساس ہوگا کہ شرعی احکام و مسائل میں منہ کھولنا کتنا مشکل مرحلہ ہے۔

جہاں تک غور و فکر کیا گیا، یہی احساس ہوا کہ جدید مسائل کے لئے شخصی و انفرادی غور و خوض کافی نہیں اور یہی یقین اس حدیثِ نبوی سے بھی ہوتا ہے جو ہم بار ہا پیش کر چکے ہیں ((ولا تمضوا فیه رأی خاصة)) چنانچہ اس مقصد کے لئے اپنے محدود وسائل کے مطابق چار حضرات کی جماعت نے بتوفیقِ اللہ تعالیٰ جدید مسائل پر اجتماعی غور و فکر شروع کر دیا ہے، تصفیہ شدہ مسائل کا اعلان اجتماعی فتوے کی صورت میں انشاء اللہ عنقریب کر دیا جائے گا۔

ادارۂ تحقیقات اسلامی کی فتوے بازی

لیکن انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی نے ان تمام حقائق اور مشکلات سے آنکھیں بند کر کے جدید و قدیم مسائل میں فتویٰ بازی شروع کر دی ہے، گذشتہ

دنوں یہ فتویٰ صادر کیا گیا کہ ایک انسان کے اعضاء کاٹ کر دوسرے کے لگا دینا جائز ہے اور اب یہ حکم صادر ہوا کہ بسم اللہ پڑھے بغیر جس جانور کو مشین سے قتل کر دیا جائے وہ حلال ہے اور تمام کفار کا ذبیحہ بھی حلال اور طیب ہے، یہ فتویٰ قرآن کی نصِ صریح اور اجماعِ اُمت کے خلاف ہے اس فتویٰ کی تردید حضرت مولانا محمد شفیع صاحب اور دوسرے علماء فرما چکے ہیں، مگر سوال ان چند جزیاتی مسائل کا نہیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق تمام احکامِ شرعیہ کو مسخ کر ڈالنے کا منصوبہ ہے۔

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی اب تک جس طرح اسلام کے اصولی اور بنیادی مسائل کو تختۂ مشق بنا چکا ہے وہ اس ملک کے مسلمانوں کو معلوم ہے، اب ملتِ اسلامیہ میں مزید انتشار پیدا کرنے کے لئے اسلام کے متفق علیہ مسائل کو نشانہ بنا لیا گیا ہے کتنا اچھا ہوتا کہ یہ ادارہ جو حکومت کی نگرانی میں کام کر رہا ہے، صحیح العلم محقق علماء کو ساتھ لے کر ان مشکلات کو حل کرتا اور امت کے لئے صحیح علمی و فقہی روشنی مہیا کرتا لیکن اس صورت میں ان اداروں کی اصلی خواہشات شاید بروئے کار نہ آتیں، اب تو کتاب وسُنت، فقہِ اسلامی، خوفِ خدا اور مسئولیتِ آخرت سے بے نیاز ہو کر جو چاہیں فتویٰ صادر کریں، علمائے حق کے ساتھ مشورہ کرنے اور مسئولیتِ آخرت کو سامنے رکھنے کے بعد ظاہر ہے کہ یہ آزادی مشکل تھی۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اس ملک میں اب تک کوئی رسمی دارالافتاء قائم نہ ہوا، قائم ہوا تو "ادارۂ تحقیقاتِ اسلام" کاش یہ اسم بامسمّٰی ہوتا، لیکن اس کی اب تک کی تحقیقات کے پیشِ نظر تو اس کا صحیح نام "ادارۂ تحریفاتِ اسلام" ہی موزوں ہوگا جس نے سود شراب اور مردار کو حلال اور طیب ثابت کرنے پر "ریسرچ" کی۔

شعبان ۱۳۸۷ھ

اسلام کیا ہے؟

"اسلام" یا "دینِ اسلام" "حق تعالیٰ شانہٗ" اور حضرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک معاہدہ کا نام ہے: "کلمہ طیبہ" یعنی لا اِلٰہَ اِلاَّ اللہ محمد رسول اللہ" اسی معاہدہ کا متن ہے، معاہدے کی تمام دفعات نہایت اجمال وخوبی کے ساتھ انہی دو حرفوں میں سمیٹ دی گئی ہیں: کلمہ طیبہ کا پہلا جزء اللہ تعالیٰ شانہٗ کی الوہیت وخدائی کا دل وجان سے اقرار ہے، اس جزء میں حق تعالیٰ شانہٗ کی تمام صفاتِ کمال وجلال وجمال کو سمیٹ دیا گیا، حق تعالیٰ خالق ہے، حق تعالیٰ رازق ہے ہادی برحق ہے، وہ ہر دور میں تمام مخلوقات کے لئے ہدایت وارشاد کے نظام نامے نازل فرماتا اور اپنے نمائندے بھیجتا رہا ہے، کسی قوم کو بغیر ہادی کے نہیں چھوڑا، ہر دور کے ہر پیغام پر ایمان لانا یقین کرنا ضروری ہوگا، الغرض یہ اور اس قسم کی تمام تفصیلات اسی جزء کی تشریحات ہوں گی، دوسرا جزء، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کا زبان سے اعتراف اور دل وجان سے اسے تسلیم کرنا ہے، وہ تمام صفات وکمالات جو حضرت حق تعالیٰ نے آپؐ کو عطا فرمائے ہیں ان سب پر ایمان لانا ایک کلمہ گو کے لئے ضروری ہوگا، بعثتِ انبیاء کا جو سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا تھا وہ آپؐ پر ختم ہوا اور آپؐ خاتم النبیین بنائے گئے، حق تعالیٰ کا آخری پیغامِ ہدایت "قرآنِ کریم" آپؐ ہی کے ذریعہ رہتی دنیا تک تمام انسانیت کے لئے نازل فرمایا گیا اور اس کے تمام احکام ابدی ہیں ان میں کسی ترمیم وتبدیل کی گنجائش نہیں اور یہ نظامنامۂ ہدایت چونکہ تمام مخلوقات کے لئے تھا عرب کے لئے بھی تھا عجم کے لئے بھی ایشیا کے لئے بھی تھا اور یورپ کے لئے بھی، افریقہ کے لئے بھی تھا اور امریکہ کے لئے بھی تھا، اور ہر دور کے لئے تھا اور تمام نسلِ انسانی جو قیامت تک آنے والی تھی سب کے لئے تھا اس لئے کسی دور میں جو برائیاں اور خرابیاں پیدا ہونے والی تھیں، ان سب کی اصلاح کے لئے تھا اور ایسا کرنے سے حق تعالیٰ عاجز نہ تھا کیونکہ اس کا علم بھی کامل ومحیط تھا، ازلی تھا، ابدی تھا، کوئی چیز اس سے مخفی نہ تھی اور قدرت بھی کامل تھی، کوئی چیز اس کی قدرت سے باہر نہ تھی، اس لئے تمام نسلِ انسانی کے لئے اور ان کے امراضِ روحانی کے لئے ایک جامع نسخۂ شفا نازل کرنا اس کے علمِ محیط اور قدرتِ کاملہ سے باہر نہ تھا اور اسی آخری پیغامِ ہدایت میں یہ واضح

اعلان فرما دیا تھا کہ آپ خاتم النبیین ہیں اور نبوت کا سلسلہ آپ پر ختم کر دیا گیا اور نہایت شرح و بسط کے ساتھ اس کی تفصیلات کو قرآن و حدیث میں واضح کر دیا گیا، خلاصہ یہ ہے کہ یہ تمام تفصیل اسی دوسرے جزء کی تشریح ہے، ان دو حرفوں کے اعتراف کر لینے سے تمام دین کے تسلیم کر لینے کا معاہدہ ہو جاتا ہے اور دین کی ایک ایک بات کو ماننا اور اس پر ایمان لانا ضروری ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ زبان سے تو صرف اظہار و اقرار کرنا ہوتا ہے، اصل تسلیم و اعتراف تو دل کا ماننا اور اس پر یقین کرنا ہے کوئی شخص بھی ایسے معاہدہ کو صحیح نہیں مان سکتا جو صرف زبان سے تو کہا جائے اور دل میں نہ ہو، اسی کا نام جھوٹ ہوگا، سچے اقرار کے معنی یہ ہیں کہ بدل و جان تسلیم کیا جائے اور قلبی یقین و اذعان کا زبان سے اظہار و اقرار کیا جائے دیکھئے "عقدِ نکاح" کیا ہے؟ بظاہر تو صرف دو لفظ ہیں "ایجاب و قبول" ایک کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ میں نے اپنا نفس آپ کے نکاح میں دے دیا دوسرا کہتا ہے کہ میں نے قبول کیا، انہی دو لفظوں کے بولنے کے بعد گویا وہ تمام باتیں جو زوجیت کے لوازم ہیں سب اسی ایجاب و قبول میں آگئیں، بیوی کا نفقہ، اس کی رہائش، اس کی تیمار داری، اس کی حفاظت، اس کی ہر وہ خدمت جس کی وہ محتاج ہوگی ان سب کے التزام کا معاہدہ ہو گیا، کوئی جاہل یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ میں نے کب ان باتوں کا اقرار کیا تھا، تمام عقود و معاملات کا دار و مدار ان ہی دو حرفوں پر ہوتا ہے جس کا نام شرعی زبان میں "ایجاب قبول" ہے، تمام حکومتوں کے معاملات اسی طرح سے ہوتے ہیں، جب ایک حکومت نے دوسری حکومت کو تسلیم کر لیا اور اپنا سفیر بھیج دیا تو وہ تمام روابط جو آج کی بین الاقوامی سیاست میں دو دوست حکومتوں میں ہوا کرتے ہیں وہ سب قائم ہو جاتے ہیں، الغرض "لا إلٰهَ إلا الله محمد رسول الله" کا یہ مختصر کلمہ تمام اسلامی معاہدے کا متن ہے اور دینِ اسلام کی تمام ہدایات و احکام کا ماننا ضروری ہو جاتا ہے، اس لئے تمام علماءِ امتِ محمدیہ کا یہ اجتماعی عقیدہ ہے کہ ایمان یا اسلام نام ہے اس عقد کا کہ جو کچھ اللہ و رسول نے فرمایا ہے وہ سب سچ ہے، دل و جان سے اس کی تصدیق کی جائے اور اس پر ایسا یقین کامل ہو جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ ہو اور ہر طرح کے شبہات و شکوک سے بالاتر ہو اس قسم کی تصدیق کا نام ایمان ہے (ھو تصدیق

النبیّ فی جمیع ما جاء به من عند الله، مما علم کونه من الدین ضرورة)

لغت میں اسلام کے معنی

جہاں تک لغت کا تعلق ہے "اسلام" کے معنی تسلیم و انقیاد اور طاعت و فرمانبرداری کے ہیں اور قرآنِ کریم کی اصطلاح میں "اسلام" کا اطلاق اس آسمانی دین پر ہوتا ہے جو انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰت والتسلیمات کے ذریعہ حق تعالےٰ کی طرف سے آیا، یہ سلسلہ حضرت آدم صفی اللہ علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا، اسی لئے ہر نبی کے دورِ نبوت میں اس کے ذریعہ آئے ہوئے دین کو "دینِ اسلام" کہا جاتا تھا اور ہر وہ شخص جو اس دین کا متبع ہو "مسلمان" کہلانے کا مستحق تھا لیکن آخر میں جب یہ سلسلہ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر آکر ٹھہرا تو دینِ حق، دینِ محمدی (علی صاحبہ الصلاۃ والسلام) کا نام بن گیا اور جو دینِ حق اللہ تعالےٰ نے حضرت رسول اللہ محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نازل فرمایا محض اس کا لقب "اسلام" رکھا گیا اب "دینِ اسلام" صرف اسی مخصوص دین کا لقب اور نام ہے کسی دوسرے دین پر اس کا اطلاق نہ ہوگا اور نہ کسی قدیم یا جدید دین کے ماننے والے کو "مسلمان" کہنا ہی صحیح ہوگا اسی لئے عرفات کے میدان میں عرفے کے دن جمعہ کی عصر کو (۹ ذی الحجہ ۱۰ھ)، تمام امتِ اسلامیہ کے سامنے یہ اعلان کر دیا گیا:-

((الیوم أکملت لکم دینکم	آج کے دن تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا اور
وأتممت علیکم نعمتی ورضیت	اپنی نعمت پوری کر دی اور اسلام ہی تمہارا دین
لکم الإسلام دینا))	تمہارے لئے پسند کیا۔

اس مقام پر بعض مشاہیر اہلِ قلم کو بڑی غلط فہمی ہوئی اور خطرناک باتیں قلم سے نکل گئیں، حقیقت یہی ہے جو عرض کی گئی، کامل ترین صورت میں حق تعالےٰ نے "دینِ اسلام" کو نازل فرمایا اور اس آخری ہدایت کو آخری شکل دے دی گئی جس میں کسی اضافے یا ترمیم کی گنجائش نہیں اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی اور ارشادات سے اس کی مکمل تشریح کر دی گئی اور قرآنی و نبوی ارشادات میں ایسے رموز و نکات و اشارات کر دئے گئے کہ صحیح طور پر سمجھ لینے کے بعد آئندہ کے تمام مسائل کا حل نکل سکے اور ان کی روشنی میں وہ تمام مسائل خود بخود

واضح ہوتے رہیں گے، ظاہر ہے کہ مدارک وعقول کے مراتب میں قدرتی تفاوت واختلاف موجود ہے تو اجتہادی مسائل میں بھی اختلاف ناگزیر ہے اس لئے اس کو برداشت کیا گیا اور عہدِ نبوت میں جو طریقہ کار رہا اس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے البتہ غور وفکر کرنے والے حضرات کے لئے قرآن وحدیث کی روشنی میں اجتہاد کی اہلیت اور اس کے شرائط ضروری ہیں اور جن کو اہلیت نہ ہو ان کی مداخلت برداشت کے قابل نہیں، یہ تو نہایت نازک مرحلہ ہے اور غامض و دقیق حِکَم واَسرار ہیں، اللہ ورسول کا کلام ہے، ہرکس وناکس کے لئے دخل دینے کی گنجائش کا کیا امکان ہے، جب کہ دنیا کے "علوم وفنون" جو انسانی عقول وادراکات کے نتائج ہیں اور انسانی دائرۂ عقل سے بالاتر نہیں، ان کے لئے بھی اہلیت کو ضروری سمجھا جاتا ہے پھر کیسی عجیب بات ہے کہ اللہ ورسول کے کلام میں اتنی آزادی وحریت ؟ کہ جس کا جی چاہے اور جو چاہے اس کے لئے وقف عام کردیا جائے کتنی حیرت کی بات ہے اور اس سے بڑھ کر حیرت کی بات یہ ہے کہ شرعی نصوص یعنی اللہ تعالیٰ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایات کو میزانِ عقلِ قاصر سے ناپا تولا جائے اور جب اپنی فہم نارسا کے موافق نہ دیکھے انکار کیا جائے۔

انبیاءِ کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد

تمام انبیاءِ کرام علیہم السلام کی بعثت کا اصلی مرکزی نقطہ نہ صرف اصلاحِ معاشرہ ہے بلکہ مخلوق کا خالق سے ٹھیک ٹھاک رابطہ پیدا کرنا ہے تاکہ انسانی نظریات اور اخلاق واعمال میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کی اصلاح کی جائے اور اللہ تعالیٰ کی وہ مرضیات بتلائی جائیں جن کے ادراک سے انسانی عقلیں قاصر ہیں، اسی طرح توحید، صفاتِ باری، جنت دوزخ، برزخ کے احوال، ملائکہ کا وجود یا مرنے کے بعد کی زندگی، حساب وکتاب وغیرہ وغیرہ وہ دینی حقائق جن کے فہم وادراک سے تمام عقلیں قاصر ہیں ان کا بتلانا اور ان تمام غیبی حقائق پر یقین پیدا کرنا ان سب کا منصب ہے، غرض جو خرابیاں اعتقاد وعمل اخلاق وکردار میں پیدا ہوتی ہیں انبیاءِ کرام علیہم السلام ان کی اصلاح کرتے ہیں ان خرابیوں اور بے اعتدالیوں میں سے کسی کا نام شرک ہے اور کسی کا کفر کسی کا نام فسق ہے اور کسی کا ظلم وغیرہ وغیرہ، ان تمام مراحل کو طے کرنا ہے اور اس اصلاح کے راستے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں ان سے عہدہ برآ ہونا ہے، اور بسا اوقات

جب معاملہ حد سے گذر جائے اور اصلاح کے تمام راستے بند ہو جائیں تو تلوار اٹھانے کی ضرورت پڑتی ہے اور جہاد و قتال کی نوبت آجاتی ہے اگر انبیاءِ کرام کفر کو برداشت کریں اور کوئی اصلاحی قدم نہ اٹھائیں اور لوگوں کو اپنی اپنی حالت پر چھوڑ دیں اور عملی جدوجہد شرک و کفر کے مٹانے کے لئے نہ کریں تو بعثتِ نبوت کا تمام نظام بیکار ہو جاتا ہے اور معاذ اللہ محض تماشہ سے زیادہ اس کی حیثیت نہ ہوگی کامیابی و ناکامی تو اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے، نتائج ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، مسؤلیت سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تمام آسمانی ہدایات پر عمل کرنے کا جیسے حکم ہے اس کی تعمیل ہوگی، الغرض ایمان اور ایمانی حقائق کو واشگاف بیان کرنا، کفر و شرک کی باتوں کو واضح کرنا اور عملی جدوجہد کے تمام مراحل سے گزرنا انبیاءِ کرام علیہم السلام کے لئے ناگزیر ہے، اگر دعوت و تبلیغ کے کسی مرحلے پر ((لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی[1])) کا اعلان ہوتا ہے تو کسی مرحلے پر جاکر ((ما كان لنبيٍّ أن يكون له أسرى حتى يثخن في الأرض[2])) کا اعلان بھی ہوتا ہے ((وقاتلوا الذين يلونكم من الكفار وليجدوا فيكم غلظة[3])) اور یہ بھی اعلان ہوتا ہے ((يا أيها النبي جاهد الكفار والمنافقين واغلظ عليهم ومأواهم جهنم وبئس المصير[4])) اور یہ بھی اعلان ہوتا ہے ((قل لا تعتذروا قد كفرتم بعد إيمانكم[5])) اور یہ بھی اعلان ہوتا ہے ((فما لكم في المنافقين فئتين والله أركسهم بما كسبوا أتريدون أن تهدوا من أضل الله[6])) ؟

---

[1] (کسی کو) دین (پر لانے کے معاملہ) میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت (اور) گمراہی (ایک دوسرے) سے الگ الگ واضح ہو چکی ہے (اس کے بعد بھی جو گمراہی کو چھوڑ کر ہدایت پر نہیں آتا، نہ آئے جہنم میں جائے)۔ [2] کسی نبی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ اس کے پاس (کافر) قیدی ہوں (اور وہ ان کو رہا کر دے) یہاں تک کہ زمین میں خونریزی نہ کرلے۔ [3] اور لڑو ان کافروں سے جو تمہارے قریب (آباد) ہیں اور انہیں تم میں سختی محسوس کرنی چاہیئے۔ [4] اے نبی! ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجئے اور (ان سے نرمی نہ کیجئے بلکہ) ان پر سختی کیجئے اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ لوٹنے کی بہت ہی بُری جگہ ہے۔ [5] آپ کہہ دیجئے: بہانے نہ بناؤ اس میں ذرا شک نہیں کہ تم نے (دعویٰ) ایمان کے بعد (بھی) کفر کا ارتکاب کیا ہے۔ [6] (اے مسلمانو!) تمہیں کیا ہوا کہ تم منافقوں کے بارے میں اختلاف کرنے لگے (کہ تم میں سے بعض ان کو مسلمان کہتے ہیں) باوجودیکہ اللہ نے ان کو بدعملی کے سبب الٹے پاؤں پھیر دیا کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جسے اللہ نے گمراہ کر دیا اسے بھی ہدایت یافتہ قرار دو ؟

بہرحال کفر و شرک کو مٹانا اور توحید کے جھنڈے گاڑنا ان کا سب سے پہلا کام ہوتا ہے، دینی نظام کے مختلف ادوار میں انبیاء آتے رہے، کبھی کبھی انبیاءِ کرام کے ساتھ ملوک و سلاطین کا نظام بھی قائم کیا گیا اور انبیاء کی رہنمائی میں کام کرنے کا حکم دیا گیا، خاتم الانبیاء حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو تمام انبیاءِ سابقین و ملوکِ صالحین و عادلین کے کمالات کا وارث بنایا گیا اور ایسی جامعیت عطا فرمائی گئی کہ تمام مناصبِ اصلاح خواہ دعوت و تبلیغ کے ہوں یا جہاد و قتال کے یا نظمِ مملکت کے، آپؐ کی ذاتِ بابرکات میں جمع کر دئیے گئے تھے، بیک وقت آپؐ داعی الی اللہ بھی تھے اور حاکمِ اعلیٰ بھی اور قائدِ جیوش بھی آپؐ کے خلفائے راشدین بھی آپؐ کی صفاتِ کمال کے صحیح جانشین تھے، جس طرح انبیاء کا منصب تھا کہ توحید کی علمبرداری کریں، دنیا سے کفر و شرک کو مٹائیں اور دعوت الی اللہ کے لئے جدوجہد کریں، ٹھیک اسی طرح علومِ نبوت کے وارثین کا فرضِ منصبی ہے کہ ایمان و کفر کی تمیز کرائیں اور ایک دوسرے کی حدود کو متعین کریں جس طرح کسی مسلمان کو کافر کہنا گناہِ عظیم ہے، ٹھیک اسی طرح کسی کافر کو مسلمان کہنا بھی بڑا عظیم جرم ہے اگر علماءِ امت اس فریضہ میں کوتاہی کریں تو ادائے فرض کی کوتاہی میں عنداللہ مجرم ہوں گے، البتہ یہ ضروری ہے کہ اس فریضہ کی ادائیگی علمِ صحیح کی روشنی میں نیک نیتی سے ہو، جذبات سے بالاتر ہو۔

علماء کا فرضِ منصبی

حدودِ اسلام کی حفاظت اور پاسبانی یہ علماءِ امت کا فرضِ منصبی ہے جس کے بہرحال مکلف ہیں، اگر اسلامی حکمرانوں کا فرضِ منصبی ہے کہ وہ مملکتِ اسلامیہ کی جغرافیائی حدود کی حفاظت کریں تو علماءِ امت کا فریضہ ہے کہ وہ حدودِ دینِ اسلام کی حفاظت کی تدابیر سرانجام دیں، اور اگر غور کیا جائے تو دینِ اسلام کی حدود کی حفاظت مملکتِ اسلامی کی حفاظت سے بھی زیادہ اہم ہے، اب اگر مملکتِ اسلامی کے چپہ چپہ کی پاسبانی ضروری ہے تو اس سے زیادہ اسلامی قوانین اور احکام کی پاسبانی بلکہ ہر ہر حکم و قانون کی پاسبانی ضروری ہے اور اسلامی مملکت بھی صحیح معنی میں وہی ہو سکتی ہے جو دینِ اسلام کی محافظ ہو اور جس میں احکامِ اسلام کی تنفیذ و تحفظ کی ضمانت ہو، ظاہر ہے کہ مملکتِ خداداد پاکستان اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت اور

پاسبانی کے لئے وجود میں آئی ہے، تمام تر کوشش اسی لئے تھی کہ مسلمانوں کے نفوس کو امن و امان نصیب ہو اور اسلامی احکام محفوظ ہوں اگر کسی اسلامی ملک میں اسلامی قوانین کی حفاظت نہ ہو تو اس اسلامی حکومت کو اسلامی کہنا بے معنی ہو جاتا ہے، ہر مملکت کی نوعیت اس کے دستور اور اس کے قوانین سے پہچانی جاتی ہے جس طرح کمیونسٹ حکومت کا نظام اس کے دستور سے معلوم ہوگا اور جمہوری مملکت اس کے آئین سے معلوم ہو گی اس طرح ایک اسلامی مملکت کی شناخت کی علامت اسلامی دستور ہے، اگر کسی اسلامی مملکت میں "غیر اسلامی اقلیت" موجود ہے تو اس کے یہ معنی ہر گز نہیں کہ ان کو غیر مسلم کہنا جرم ہوگا، کوئی غیر مسلم صرف اسلامی مملکت میں رہنے سے تو مسلمان نہیں بنے گا، کافر کافر رہے گا اور مسلمان مسلمان، اگر کافر موجود ہے تو اس کو کافر کہنا پڑے گا اگر کوئی شخص اسلامی قوانین میں سے کسی بھی قانون کا انکار کرے گا تو وہ یقیناً کافر اور غیر مسلم قرار دیا جائے گا، اسلام کا تعلق نہ تو جغرافیائی حد بندی سے ہے نہ رنگ و نسل سے ہے نہ وطن سے ہے بلکہ دینِ محمدی کی ایک ایک بات کو ماننے اور بغیر ہیر پھیر کے اس پر ایمان لانے اور یقین کرنے سے ہے، اس یقین کے اقرار کرنے کے لئے عنوان ہے" لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه محمد رسول اللّٰه" امید ہے کہ اہلِ انصاف کے لئے یہ چند اشارات کافی ہوں گے حق تعالیٰ صحیح فہم نصیب فرمائے۔

واللّٰه سبحانه ولی التوفیق والهدایة وهو حسبنا ونعم الوکیل۔

رمضان ۱۳۸۸ھ

دینِ اسلام کیا ہے؟

"اسلام" نام ہے اس دین و شریعت کا جو حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے امتِ محمدیہ کو دیا گیا ہے، اس کی بنیاد دو چیزوں پر ہے ایک قرآنِ کریم اور دوسری سنتِ نبویہ محمدیہ علی صاحبہا الصلوات والسلام، یہ دین مجموعہ ہے عقائد و عبادات کا، قوانین و احکام کا، اخلاق و تزکیہ نفوس کا، اس میں عبادت کا جامع ترین نظام ہے جس میں عباداتِ بدنیہ بھی ہیں جیسے نماز روزہ، مالی بھی ہیں جیسے زکاۃ، صدقات، کفارات، بدنی و مالی دونوں کی جامع بھی ہیں جیسے حج و عمرہ، اسلام جس طرح عبادات کا جامع نظام رکھتا ہے، اسی طرح وہ احکام و قوانین کا بھی محیرالعقول جامع ترین نظام ہے جس میں نظمِ مملکت سے لے کر امورِ خانہ داری تک زندگی کے انفرادی و اجتماعی، دینی و سیاسی، معاشی و اقتصادی ہر پہلو اور ہر گوشے کے لئے تمام جزئیات موجود ہیں، اسی طرح اس میں نفس و روح کے تزکیہ کے لئے ظاہری و باطنی تمام ہدایات و ارشادات موجود ہیں، غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے لئے اسلام کے حیرت انگیز نظام نامۂ حیات میں ارشادات و ہدایات کا کافی و شافی سرمایہ موجود نہ ہو، دینِ اسلام کا خزانۂ عامرہ ان تمام جواہرات اور قیمتی لعل و گہر سے مالا مال ہے جو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے درکار ہیں اور جن سے دنیا بھر کے "ازموں" کا دامن خالی ہے اسلام کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ لینن و مارکس اور ہیگل و اینجلز کے دروازے پر جا کر بھیک مانگے یا کسی سرمایہ دارانہ نظام کا دروازہ کھٹکھٹائے، اسلام، علیم و خبیر اور سمیع و بصیر رب العالمین جل ذکرہٗ کی طرف سے نازل کردہ دین ہے، چند عقلاء و حکماء کے ذہنی ادراک کا نتیجہ نہیں، نہ قانون ساز اداروں یا قوم کے چند نمائندوں کی دماغی کاوشوں کا ثمرہ ہے، یہ اس علیم و خبیر کی قدرتِ کاملہ اور رحمتِ کاملہ کا ظہور ہے جو ہر دور، ہر زمانہ، ہر قوم اور ہر ملک کے انسانوں کا خالق ہے جو پوری انسانیت کے حقیقی امراض سے باخبر اس کی واقعی ضروریات سے واقف اور اس کی دقیق نفسیات کا رازدان ہے۔

دینِ اسلام سے دُوری کے نتائج

تاریخ کے جس دور میں مسلمان حکمران اس پاکیزہ دین پر عمل کرتے رہے، اس کی برکات وثمرات سے فیضیاب ہوتے اور جتنی بہتر صورت میں اس پر عمل ہوتا رہا اس کے مطابق نتائج بھی ظاہر ہوتے رہے، بالآخر رفتہ رفتہ ملوک و امراء کی عیش و عشرت اور افراد واقوام کی غفلت سے ان قوانین واحکام پر عمل کمزور ہوتا چلا گیا اور رفتہ رفتہ اسلامی نظام کی برکات سے مسلمان محروم ہوتے چلے گئے اور بعض ممالک میں تو یہ نعمت بالکلیہ چھین لی گئی، ان بدنصیب ملکوں میں ہمارا متحدہ ہندوستان بھی تھا جس پر تقریباً ایک ہزار برس کے بعد کفارِ یورپ کی ظالم وجابر حکومت کا تسلط ہوا، تقریباً ایک صدی بعد ایک حصّہ متحدہ ہندوستان کا دوبارہ "پاکستان" کے نام سے مسلمانوں کے اقتدار میں دیا گیا، یہاں ابتدائی دور کے چند سالوں کے بعد ایسے حکمران آتے گئے جن کی طرف سے دینِ اسلام کے ساتھ ایسا معاملہ ہوتا رہا جیسے کوئی دشمنِ اسلام طاقت اسلام سے دیرینہ انتقام لینا چاہتی ہو، حق تعالےٰ کا نظام ہے، آخر کار ان ظالموں کو ذلیل کیا گیا (فمنھا قائم وحصید) ان کے بعد نظمِ حکومت اور زمامِ اقتدار ایک ایسے شخص کے ہاتھ آئی جس سے شروع میں توقع تھی کہ شاید اس کے ذریعہ سابقہ دور کی تلافی ہو جائے گی، اسلام کا بول بالا ہوگا اور اہلِ اسلام کی عظمتِ رفتہ ایک دفعہ پھر واپس آجائے گی لیکن افسوس کہ اس دور میں دینِ اسلام کے تمام شعبوں کی تباہی وبربادی سابقہ ادوار سے کہیں زیادہ ہوئی، "مشاورتی کونسل" قائم کی گئی جس کا مقصد یہ بتلایا گیا کہ قانون ساز اسمبلی کوئی ایسا قانون نہ بنائے جس کی مشاورتی بورڈ تصدیق نہ کرے، عنوان کتنا خوبصورت ہے لیکن اس کی حقیقت کیا ہے:-

اسلامی مشاورتی کونسل اور اس کے ارکان

اولاً:- اس کے ارکان اکثر ایسے مقرر کئے گئے جو نہ صرف اسلام اور علومِ اسلام سے ناواقف تھے بلکہ ان میں سے بعض تو دینِ اسلام کے کھلے دشمن ثابت ہوئے جن پر "برعکس نہند نام زنگی را کافور" والی مثل پوری طرح صادق آئی۔

ثانیاً:- اس مشاورتی کونسل کی حیثیت صرف برائے نام رکھی گئی، اس بات کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ اس کے کسی صحیح فیصلہ کو واجب القبول قرار دیا جائے۔

ثالثاً: اس کے فیصلوں کا آخری اختیار صدرِ مملکت کو دیا گیا کہ وہ جب چاہیں اس کو رد کر ڈالیں۔

رابعاً: ۸ سال کے عرصہ میں مشاورتی کونسل نے جو کام کیا وہ سب کے سامنے ہے، حدیہ کہ اس کے ایک اہم عہدیدار نے اعلان کیا کہ بینک کا سود جائز اور درست ہے، یہ شرعی ربا کے حکم میں نہیں آتا اور "بیئر" شراب نہیں اس کا استعمال جائز ہے، یوں اس لغو اور بے معنی مصرف پر حکومت کے خزانۂ عامر کا لاکھوں روپیہ خرچ ہوا اور ہو رہا ہے، یہ تو احکام و قوانین کا حشر ہوا، اس کے علاوہ ایک "تحقیقاتی اسلامی ادارہ" قائم کیا گیا، ابتداءً جناب اشتیاق حسین صاحب قریشی اس کے صدر تھے لیکن بہت جلد ان کو ہٹا کر میک گل یونیورسٹی کے ایک فارغ شدہ ملحد کو اس کا ڈائرکٹر مقرر کر دیا گیا جس نے تمام اسلامی نظام کی جڑوں کو کریدنا شروع کر دیا، اسلام کے تمام بنیادی عقائد و احکام کو کھوکھلا کرنے کی خدمت انجام دی اور اسلام کا کچھ ایسا عجیب و غریب نقشہ تیار کر ڈالا جس میں ہر قسم کا کفر و الحاد سمو دیا جا سکے۔

"عائلی قوانین"

اسلام کے وہ شخصی مسائل جو برطانوی حکومت کے ظالمانہ دور تک میں بھی مسلمانوں میں قانوناً رائج تھے اور اسلامی قرآنی آئین کے ماتحت مسلمانوں کا ان پر عمل تھا (یعنی نکاح، طلاق، عدت اور وراثت کے احکام و مسائل) انتہائی افسوس اور درد سے کہنا پڑتا ہے کہ حکومتِ حاضرہ نے عائلی قانون بنا کر جو ملک پر مسلط کیا، اس کے ذریعہ اسلام کے ان شخصی قوانین کا بھی جنازہ نکال دیا گیا، یہ عائلی قوانین وہ تھے جن کا خاکہ سابقہ دورِ حکومت کے چند پر دیزی فکر لوگوں نے مغربی معاشرت سے درآمد کیا تھا لیکن تمام مسلمانوں کی نیز مسلم پریس کی شدید مخالفت کے باعث وہ منظور نہیں ہو سکا تھا لیکن مارشل لا کے دور میں اس کو مسلط کر دیا گیا، بعد میں علماء نے قرآن و سنت کے دلائل سے اس کی تنسیخ و ترمیم کا مطالبہ کیا اور تمام اراکینِ اسمبلی نے اس کی معقولیت کو تسلیم کر لیا، سترہ ترمیمیں منظور کی گئیں اور ان پر غور کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی مقرر ہوئی، آخر کار صدرِ مملکت نے اپنے اختیارات سے اسمبلی کے فیصلے کو راتوں رات مسترد کر دیا اور اس طرح وہ رسوائے عالم قانون مسلمانوں پر بدستور مسلط رہا جو قرآن و سنت، نصوصِ قطعیہ اور

عقل و دیانت سب کے خلاف ہے۔

افرادی قوت اور عددی اکثریت کے فوائد

دنیا کی دانشمند قومیں ہمیشہ اپنی عددی اکثریت پر فخر کرتی ہیں، اگر کسی قوم کو عددی اکثریت کے ساتھ عسکری قوت اور فوجی طاقت بھی مہیا ہو جائے تو دنیا میں وہ زبردست طاقت بن جاتی ہے، حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مسلمانوں کو نسل بڑھانے کی ترغیب دی اور اسے قیامت کے روز اپنے فخر کا ذریعہ فرمایا اور قرآنِ کریم نے بھی نسل کشی کی مذمت کی ہے اور یہ فرمایا کہ یہ حرکت حق تعالیٰ کی رزاقیت کے عقیدے کے خلاف ہے، حق تعالیٰ رزاق ہے رزق کا کفیل اللہ تعالیٰ ہے کوئی فرد یا جماعت یا حکومت رزاق نہیں فرد و جماعت اور حکومت کے ذمہ تو صرف کسبِ معاش کی تدبیر ہے لیکن تقلیلِ نسل کی اس لعنت کو پاکستان پر مسلط کرنے کے لئے خاندانی منصوبہ بندی درآمد کی گئی اور کروڑوں روپیہ اس نسل کشی پر خرچ کر کے اعداءِ اسلام کو مطمئن کرنے کا موقع دیا گیا، علماءِ امت نے اس کی قباحتیں اور اس کے برُے نتائج کے واضح کرنے میں تقریراً و تحریراً کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی لیکن افسوس کہ کسی کی ایک نہیں سنی گئی، ستم یہ کہ اس قبیح تحریک کو غیر شادی شدہ لڑکوں اور لڑکیوں میں فروغ دے کر فواحش و منکرات کا دروازہ کھول دیا، انا للہ۔

یہ ہیں وہ دینی کارنامے جو عہدِ حاضر کی حکومت کے زریں کارنامے ہیں عقائد، احکام اخلاق معاشرت سب کو تباہ کرنے کی کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی گئی، اقتصادی، سیاسی اور معاشی مسائل کی داستان بھی طویل ہے جو عوام سے مخفی نہیں، الغرض تمام دینی احکام اور دنیوی مصالح کی بنیادوں کو ہلا دیا گیا، آخر حق تعالیٰ کے وصف "عزیزٌ ذوانتقام" کا ظہور ہوا اور آج اس حکومت کی ذلت کے وہ روح فرسا مظاہر سامنے آئے کہ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایسا ہوگا، سابقہ ادوار کا ایک حکمران مردہ گوروں میں جا ملا اور گورا قبرستان میں دفن ہوا، دوسرا اسلام دشمن حکمران زندہ گوروں میں جا کر سکونت پذیر ہوا، دونوں کا حشر دنیا نے دیکھ لیا یہ ہیں تاریخ کے عبرت ناک مظاہر۔

ان روح فرسا عبرت ناک واقعات سے درسِ عبرت لینے کی ضرورت ہے، بہ ظاہر ہے کہ

ملک اسلام کے نام پر بنا اور اسلام کا نام بلند کرنے کے ارادوں سے وجود میں آیا، پھر کتنا دردناک منظر ہے کہ اسلام ہی کو ذبح کرنے کی کوششیں ہوئیں جس کے تصور سے دل کانپ اٹھتا ہے، اب بعض حلقوں سے "سوشلزم یا "اسلامی سوشلزم" کی آوازیں سننے میں آرہی ہیں۔

سوشلزم کیا ہے؟ اس کے نتائج کتنے ہولناک ہیں؟ اس نے دنیا کو کیا دیا؟ اس کے بانی اور لیڈر غریب عوام کے کتنے خیرخواہ اور مساوات کے خوشنما اور بلند بانگ دعوؤں میں کتنے مخلص ہیں؟ اس کے لئے کسی دوسری فرصت کی ضرورت ہے یہاں ہم صرف اتنا کہیں گے، پاکستان اسلام اور صرف اسلام کی خاطر معرض وجود میں آیا، اسلام ہی پر اس کا وجود موقوف ہے، اسلام اور پاکستان کا درمیانی رشتہ اتنا مضبوط اتنا گہرا اور اتنا شدید ہے کہ ان دونوں کو جدا نہیں کیا جا سکتا، اس لئے جو لوگ پاکستان میں اسلام کے سوا کسی اور "ازم" کو لانے کا خواب دیکھتے ہیں وہ بنائے پاکستان کی نفی کر کے نہ صرف اسلام اور ملت سے دغا کرتے ہیں بلکہ خود اپنے آپ کو بھی فریب دیتے ہیں اور جو لوگ اسلام کے حسین قبا میں "مارکسی ٹاٹ" کا پیوند لگانا چاہتے ہیں وہ بیک وقت اسلام اور سوشلزم دونوں سے اپنی ناواقفیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

صدر ایوب کے بارے میں ایک افواہ اور اس کی وضاحت

روزنامہ جنگ نے ۱۰ جنوری ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں "صدر ایوب کے عقیدہ" کی وضاحت کی سُرخی کے ساتھ یہ خبر شائع کی ہے:۔

لاہور کے ایک ممتاز شہری نے حال ہی میں صدر کے ملٹری سیکرٹری کو ایک خط لکھا تھا، جس میں قرآن مجید کے متعلق صدر کے بعض مبینہ تبصروں کی وضاحت کے لئے استدعا کی گئی تھی، ان کو جوابی مکتوب میں مطلع کیا گیا ہے کہ آپ نے ملٹری سیکرٹری کو جو خط ارسال کیا تھا، صدر ایوب نے اس کا مطالعہ کیا اور سید فدا حسن کو ہدایت کی کہ وہ اس خط کا جواب روانہ کریں اور صحیح صورتِ حال کی وضاحت کر دیں، صدر کے مشیرِ اعلیٰ نے اپنے جواب میں واضح اور غیر مبہم طور پر لکھا ہے کہ صدر سے جو باتیں منسوب کی گئی ہیں وہ قطعی غلط اور بے بنیاد ہیں اور صدر کا کہنا ہے کہ "وہ کبھی یہ الفاظ نہیں کہہ سکتے۔" سید فدا حسن نے مزید لکھا ہے: "یہ قطعی غلط

اور بے بنیاد ہے کہ سربراہِ مملکت اس فرقہ[1] میں شامل ہو گئے ہیں جو "قادیانی" عقیدہ رکھتا ہے انہوں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا: "صدر ایوب ایک "سُنّی" خاندان میں پیدا ہوئے اور وہ راسخ العقیدہ "سُنّی" ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے کبھی اپنے عقیدے میں تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی"۔ سید فدا حسن نے آخر میں امید ظاہر کی ہے کہ اس وضاحت سے تمام لوگوں کے شکوک و شبہات ختم ہو جائیں گے۔"

راسخ العقیدہ "سنّی" مسلمان کون ہے؟

صدرِ محترم کے بارے میں یہ افواہ گذشتہ کئی مہینے سے گرم تھی کہ انہوں نے قادیانی مسلک اختیار کر لیا ہے اور وہ واقعۃً قادیانی ہو گئے ہیں اگرچہ عقل اسے کسی طرح ماننے کے لئے تیار نہیں تھی لیکن بعض حلقے بڑے وثوق و اعتماد سے اس پر چیلنج کر رہے تھے اور صدرِ محترم سے اس بارے میں وضاحتی بیان کا مطالبہ کیا جا رہا تھا، ادھر قصرِ صدارت کی طرف سے اس کا جواب مکمل خاموشی رہا، ایسے میں عوام کا شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جانا ایک طبعی امر تھا، مقامِ شکر ہے کہ صدر کے مشیرِ اعلیٰ نے اس افواہ کی "غیر مبہم الفاظ" میں تردید کر دی، کاش یہ کام چند مہینے پہلے ہو گیا ہوتا تو غلط فہمی کو جاگزیں ہونے کا موقعہ نہ ملتا اور فضا میں جو تلخی اور شدت پیدا ہو چکی ہے، یہ نہ ہوتی مگر یہ فرض صدر کے قریبی حلقوں کا تھا کہ وہ صدرِ مملکت کو حالات کی صحیح نزاکت سے آگاہ رکھتے، خیال ہوتا ہے کہ شاید اب بھی اس قضیہ کے پورے گوشے صدر کے سامنے نہیں رکھے گئے نہ ان تمام غلط فہمیوں سے انہیں آگاہ کیا گیا جو ان کے بارے میں پائی جاتی ہیں، ورنہ صدر کے مشیرِ اعلیٰ کا وضاحتی بیان اور زیادہ واضح صورت میں ہوتا، ان کا کہنا ہے کہ: "صدر راسخ العقیدہ "سنّی" مسلمان ہیں حالانکہ تمام مسلمانوں کے نزدیک:

(الف) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بایں معنیٰ خاتم النبیین ہیں کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا نہ حقیقی نہ مجازی، نہ ظلّی، نہ بُروزی۔

---

[1] قادیانی امت کو "فرقہ" کہنا ہی غلط فہمیوں کی اصل جڑ و بنیاد ہے قادیانی جماعت اسلام کا ایک فرقہ نہیں بلکہ اسلام کے بالکل محاذی ایک جدید دین اور جدید امت ہے ہمیں تعجب ہے کہ صدر کے مشیرِ اعلیٰ نے غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے اس کی اصل جڑ کو جوں کا توں کیسے رہنے دیا۔ مدیر

(ب) مرزا غلام احمد قادیانی نے نبی بلکہ خاتم الانبیاء ہونے کا دعویٰ کیا اور خود کو محمد رسول اللہ کا مصداق قرار دیا ہے، اس لئے مرزا صاحب کا وہی حکم ہوگا جو اسلام میں جھوٹے متنبّی کا ہوتا ہے۔

(ج) مرزائی حضرات مرزا صاحب کو ان کے دعاوی میں سچا سمجھتے ہیں اس لئے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں، اب اگر صدر کے مشیرِ اعلیٰ کے بقول صدرِ محترم قادیانی نہیں بلکہ راسخ العقیدہ "سُنّی" مسلمان ہیں تو صدر کے عقیدہ کا اعلان اس طرح ہونا چاہیئے کہ:-

(الف) صدر مملکت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ کہ آپؐ کے بعد کسی قسم کی نبوت کا مدعی کذّاب اور جھوٹا ہے۔

(ب) صدر، مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی نہیں سمجھتے بلکہ "سُنّی" عقیدہ کے مطابق اسے مرتد سمجھتے ہیں۔

(ج) وہ تمام قادیانیوں کو "سُنّی" عقیدہ کے مطابق دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

پھر صدر اگر راسخ العقیدہ سنی مسلمان ہیں تو انہیں اپنے عقیدہ کی عملی تصدیق کے لئے اعلان کرنا چاہیئے کہ:-

(الف) مرزائی (قادیانی اور لاہوری دونوں گروپ) پاکستان کی غیر مسلم اقلیت ہیں، ہم دوسری غیر مسلم اقلیتوں کی طرح اسلامی ہدایات کے مطابق ان کی جان و مال کی حفاظت کرسکتے ہیں لیکن انہیں مسلمانوں کی صفوں میں گھسنے کی اجازت نہیں دے سکتے، نہ انہیں کلیدی آسامیاں دے کر مسلمانوں کے سروں پر مسلط کرسکتے ہیں۔

(ب) نیز صدرِ مملکت کو ایسے قادیانی لٹریچر کی اشاعت پر پابندی عائد کرنی چاہیئے جس میں مرزا صاحب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظل قرار دیتے ہوئے آپؐ سے مساوات کا دعویٰ کیا گیا ہے جس میں مرزا صاحب کو "نبی" "خاتم الانبیاء" اور "محمد رسول اللہ" کے القاب سے مشرف کیا گیا ہے جس میں اسلام کی مسلّم الثبوت ہستیوں کو ناروا الفاظ سے نوازا گیا ہے اور جس میں مرزا صاحب کی فرضی نبوت پر ایمان نہ لانے والے تمام مسلمانوں کو جنگل کے سور اور کنجریوں کی اولاد سے یاد کیا گیا ہے۔

(ج) نیز قادیانیوں کو بیرونِ ملک اپنے نظریات پھیلانے کے لئے "تبلیغِ اسلام" کی مد سے جو لاکھوں روپے کا زرِمبادلہ دیا جاتا ہے صدر کے راسخ العقیدہ "سُنّی" مسلمان ہونے کا تقاضا

تھا کہ پہلی فرصت میں اسے بند کر دیا جاتا۔

(د) نیز صوبائی حکومت کی طرف سے "اسلامی فرقوں" کے خلاف لکھنے پر جو پابندی اپریل ۱۹۶۷ء سے عائد ہے صدر کی طرف سے وضاحت ہو جانی چاہیئے تھی کہ اس آرڈیننس کا اطلاق قادیانیوں کے خلاف لکھی گئی کسی تحریر پر نہیں ہوتا کیونکہ وہ اسلامی فرقوں میں شامل نہیں ہیں۔

(ھ) اسی طرح صدر کی طرف سے قادیانی جماعت کو یہ ہدایت ہونی چاہیئے تھی کہ وہ اپنے مشن کی تبلیغ کرتے ہوئے یہ پوزیشن اختیار نہ کریں کہ وہ اسلام کے نمائندہ ہیں، نہ اپنی سرگرمیوں کو مسلمانوں کی طرف منسوب کریں، اقلیتوں کی آزادی کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے غیر اسلامی نظریات کو اسلام کے نام سے رائج کرتے پھریں۔

ہمارا خیال ہے کہ صدرِ محترم کو جب تک اس صحیح صورت حال سے آگاہ نہیں کیا جاتا اور وہ اپنی وضاحت کی تصدیق ان عملی اقدامات سے نہیں کرتے تب تک ان کی یہ وضاحت ناکافی رہے گی اور نوع در نوع غلط فہمیوں کا صحیح ازالہ نہیں ہو سکے گا، غلط فہمی کی بنیاد یہ نہیں کہ صدر کس اسلامی فرقے سے منسلک ہیں؟ بلکہ اس کی اصل بنیاد یہ ہے کہ صدرِ محترم قادیانی امت کو اپنے راسخ "سُنّی" عقیدہ کے مطابق، خارج از اسلام سمجھتے ہیں یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ جب تک اس امر کی دو ٹوک وضاحت نہیں کر دی جاتی اور اس کی تصدیق کے طور پر مذکورہ بالا عملی اقدامات نہیں کئے جاتے، صدرِ مملکت کے بارے میں افواہوں اور غلط فہمیوں کا جنگل صاف نہیں ہوگا، قول کی تصدیق جب تک عمل سے نہ ہو "عوامی عدالت" اسے کوئی وزن نہیں دیا کرتی۔

حضرتِ ابراہیم تیمی رحمہ اللہ کا حکیمانہ ارشاد ہے:

ما عرضت قولی علیٰ عملی إلا خشیت أن أکون مکذَّبا۔ (بخاری باب خشیة المؤمن أن یحبط عملہ)	میں نے جب بھی اپنے قول کا اپنے عمل سے موازنہ کیا مجھے یہی خدشہ رہا کہ لوگ مجھے "جھوٹا" سمجھیں گے۔

حق تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائیں، وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ صفوة البریة سیدنا محمد وآلہ وأصحابہ وأتباعہ وعلماء امتہ أجمعین۔ آمین برحمتك یارب العالمین۔

لہ وقد ضبط بفتحہا (الذال)، ومعناہ خشیت أن یکذّبنی من رأی عملی مخالفاً لقولی۔ کرمانی

ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ

دین اسلام کی امتیازی خصوصیات

کون نہیں جانتا کہ اسلام میں غیبت گناہِ کبیرہ ہے اور یہ ایسا گناہ ہے جس کا ذکر قرآنِ کریم نے کیا ہے اور ایک عجیب و غریب مثال سے اس کی قباحت و شناعت واضح فرمائی ہے، ظاہر ہے کہ غیبت میں کوئی خلاف واقعہ بات نہیں ہوتی ہے بلکہ جو کمزوری کسی انسان میں ہو اس کا ذکر اس کی غیر موجودگی میں کرنا غیبت کہلاتا ہے وہ بھی اتنا بڑا گناہ ہے کہ خود حق تعالیٰ قرآن میں اس کا ذکر فرماتا ہے اور مسلمانوں کو اس سے منع فرماتا ہے، کون نہیں جانتا کہ جھوٹ گناہِ کبیرہ ہے اور جھوٹی بات کہنا منافقت کی علامت بتلائی گئی ہے، منافق وہ شخص ہے جس کی زبان پر اسلام کا دعویٰ ہو اور دل میں کفر چھپا ہوا ہو، کون نہیں جانتا کہ "افترا" یعنی کسی پر جھوٹی بات لگانا جھوٹا الزام لگا دینا گناہِ کبیرہ ہے اور یہی افترا اگر حد سے بڑھ جائے کہ لوگ سن کر مبہوت ہو جائیں تو "بہتان" کہلاتا ہے اور وہ گناہِ کبیرہ ہے، غرض غیبت کذب، افترا، بہتان، تمام کے تمام معاصیٔ کبیرہ ہیں اور ان کے مرتکب کے لئے جہنم کی وعید ہے، یہ سب کچھ اس لئے کہ اسلام نے مسلمانوں میں عالمگیر اخوت قائم کی ہے ((إنما المؤمنون إخوة)) کہ مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہیں اور اسلامی اخوت کے بارے میں احادیثِ نبویہ میں عجیب عجیب حقائق بیان فرمائے گئے ہیں، ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر کیا حقوق ہیں؟ فرمایا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرے نہ اسے دشمن کے حوالے کرے، بوقتِ حاجت اس کی امداد کرے، اگر کوئی گناہ کرے تو اس کی پردہ پوشی کرے اور جو مسلمان مسلمان بھائی کی پردہ پوشی کرے گا حق تعالیٰ شانہٗ دنیا و آخرت دونوں میں اس کی پردہ پوشی فرمائے گا اور فرمایا کہ مسلمانوں کی مثال ہمدردی و غمخواری میں ایک جسد کے اعضاء کی طرح ہے اگر ایک عضو درد میں مبتلا ہو تو تمام بدنِ انسانی بے چین رہتا ہے اور فرمایا کہ مسلمان جب مسلمان ہوگا کہ جو چیز خود اپنے لئے پسند کرے وہی مسلمان بھائی کے لئے پسند کرے اور فرمایا کہ مسلمان وہ ہے کہ مسلمان اس کی ایذا رسانی سے محفوظ رہیں، کہاں تک بیان کیا جائے، مسلمان جب مسلمان سے ملے تو السلام علیکم کہے اور مسلمان کو چھینک آئے تو فوراً یرحمک اللہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کی آپ پر رحمت ہو، مسلمان کو گالی دینا فسق ہے، غرض قرآن احادیثِ نبویہ میں اتنی تفصیلات ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، یہ ہیں دینِ اسلام کی وہ امتیازی خصوصیات کہ کوئی دین ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا، مسلمان کا اکرام و اعزاز کرنا

اسلام کے بنیادی حقوق میں سے ہے، مسلمان کی خیر خواہی، اس کی نصرت، اس کی ہمدردی، اس پر نیک گمان کرنا وغیرہ وغیرہ، یہ دینِ اسلام کی وہ باتیں ہیں کہ تہذیب کی مدعی قومیں اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہیں.

جدید تہذیب کی برکات

افسوس کہ آج کل بالخصوص پارلیمانی انتخابات کا اعلان ہوتے ہی اسلامی اخوت اور مسلمانی کی وہ دھجیاں بکھری جا رہی ہیں کہ سن کر عقل حیران ہے، جھوٹ، غیبت، بہتان طرازی، افترا پردازی کون سا وہ گناہ ہے جو بر سرِ بازار بڑے بڑے عظیم الشان اجتماعات میں نہیں کیا جاتا، ایک طوفانِ بدتمیزی ہر محفل میں برپا ہے، نہ کسی کی آبرو محفوظ ہے، نہ کسی کی جان محفوظ، مال و دولت کو بُری طرح سے بہایا جا رہا ہے، بھائی بھائی کا دشمن بنا ہوا ہے، غرض کون سی بد تہذیبی ہے جس کا مظاہرہ نہ ہو رہا ہو، یہ ہے یورپ کی تہذیب، یہ ہے مغرب کا تحفہ، یہ ہیں مغرب زدگی کے کارنامے، پھر ہر شخص ہر فریق کی زبان پر یہ دعویٰ کہ ہماری جماعت کی کامیابی سے اسلام کا یہ فائدہ ہوگا، مسلمانوں کو یہ نفع پہنچے گا، آئندہ ہم اگر کامیاب ہوئے تو یہ کریں گے اور وہ کریں گے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

«یاأیها الذین آمنوا لم تقولون ما لا تفعلون کبر مقتاً عند الله أن تقولوا ما لا تفعلون»	اے ایمان والو! ایسی بات تم کیوں کہتے ہو جو نہیں کرتے، حق تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے والی ہے یہ بات کہ جو کہتے ہو کرتے نہیں۔

یہ ہے تہذیبِ جدید کی پیداوار اور اس قسم کے انتخابات سے یورپ کی جمہوریت جنم لیتی ہے جس کا حشر ملک ۳۰ برس سے دیکھ رہا ہے کہ ان دعویداروں نے اسلام کی کیا خدمت انجام دی اور کسی خدمت کی ابتداء کی بھی تو انجام کی خدا کو خبر، کیا اس ملک میں ایسا قانون بنا جس سے انسان کی شرافت محفوظ ہو، آبرو محفوظ ہو، مال محفوظ ہو، جان محفوظ ہو، کیا اللہ تعالیٰ کا قانونِ عدل نافذ کیا، کیا شراب کو بند کیا گیا، کیا زنا پر اسلامی سزا جاری کی گئی، کیا چور کے ہاتھ کاٹے گئے، کیا چکلے بند کر دیئے گئے، کیا شراب خانے ختم کر دیئے گئے، کیا قصاص جاری کیا گیا، نہیں! بلکہ بے حیائی، شراب خوری، آبرو ریزی کو دورِ حاضر کے ہنود ریعے سے اتنا اچھالا گیا کہ عقل دنگ رہ گئی، کیا مسلمانوں کی املاک محفوظ ہیں؟ کیا کارخانے محفوظ ہیں؟ کیا انڈسٹری محفوظ ہے؟ کیا اس قریبی دور میں ۲۲ سو فیکٹریاں قومیائی نہیں گئیں جن کی کم از کم تین ارب کی کمائی سے قوم محروم ہو گئی اور نا اہلوں کے سپرد کر کے معیشت تباہ ہو گئی خسارے میں چل رہی ہیں، یا

دکھلایا جارہا ہے کہ خسارہ ہے تاکہ حکومت کے خزانے میں ٹیکس نہ ادا کرنا پڑے، حکومت کا خزانہ بھی خالی ہو گیا قوم بھی فقر و فاقے میں مبتلا ہو گئی، یہ داستان نہ ہمارا موضوع ہے نہ ہمارا مزاج ورنہ بتلاتے کہ ان دعویداروں نے اس ملک اور ذرائع آمدنی کی کیا گت بنائی ہے، غرض نہ دین کی ترقی نہ دنیا کا سکون «خسر الدنیا والآخرۃ ذلک ھو الخسران المبین» دنیا تباہ، دین تباہ، اخلاق تباہ، انسانیت ختم، حیا کا جنازہ نکالا گیا، یہ ہیں جدید تہذیب کے برکات، یہ ہیں جمہوریت کے ثمرات، اور یہ ہے خدا فراموشی کی سزا، إنا للہ وإنا الیہ راجعون، حق تعالیٰ اس ملک خداداد پر رحم فرمائے اور صالح ہاتھوں میں حکومت آئے تاکہ اللہ تعالیٰ بھی راضی ہو اور قوم بھی خوش ہو، دل کو بھی سکون ملے، جان بھی محفوظ ہو۔ اللھم لا تسلط علینا من لا یرحمنا اللھم ولّ أمورنا خیارنا ولا تولّ أمورنا شرارنا واغفرلنا وارحمنا وأنت خیر الراحمین۔ آمین یارب العالمین۔

ربیع الاول ۱۳۹۶ھ
مارچ ۱۹۷۶ء

اسلام دینِ رحمت ہے

بلا شبہ اسلام دنیا میں دینِ رحمت ہے تمام ادیانِ الٰہیہ سماویہ میں رحمت بن کر آیا ہے، پوری انسانیت کی ہمدردی کا علمبردار ہے اس کے دامن میں رأفت و رحمت اور اخوت و شفقت کے وہ پھول ہیں جن سے مشام عالم معطر ہے، اسلام نے دنیا کو ہمدردی و محبت کا درس دیا ہے اسلام آنے کے بعد تمام اربابِ ادیان اپنے اپنے مذہب میں اصلاح کرنے پر مجبور ہوئے کہ اسلام کے آفتاب عالمتاب کے بعد وہ اس قابل نہ تھے کہ دنیا کے سامنے منہ دکھا سکیں، حدیث نبوی :-

«لا یبقیٰ بیت وبر ولا مدرٍ	کوئی خیمہ اور مٹی کا مکان باقی نہیں رہے گا مگر اللہ
إلا أدخله الله الإسلام	تعالیٰ وہاں اسلام کو داخل کر دے گا، کسی معزز کی
بعز عزیز وذل ذلیل»	عزت اور ذلیل کی ذلت کے ساتھ۔

کا اشارہ اس مضمون کی طرف بھی ہے کہ ہر ہر گھر میں اسلام پہنچا اور ہر ہر مذہب نے اس کی خوبیوں سے فائدہ اٹھایا۔

اسلام جانوروں پر بھی رحم کرنے کی تعلیم دیتا ہے

اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے یہ بتلایا کہ ایک پیاسے کتے کو پانی پلا کر بھی جنت حاصل کی جا سکتی ہے اور ایک بلی کو ناحق ایذا دینے سے انسان جہنم میں پہنچ سکتا ہے، اسلام ہی وہ مذہب ہے جو جانوروں پر بھی رحم سکھاتا ہے اور جانور ذبح کرنے کے لئے چھری تیز کرنے کا حکم دیتا ہے، اسلام ہی وہ مذہب ہے جو دنیا میں مظلوم بننے کو ذریعہ نجات سمجھتا ہے اور ناقابلِ برداشت تکالیف و مصائب میں صبر و حوصلہ کی تلقین کرتا ہے اور صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر و ثواب کی بشارت سناتا ہے، «إنما یوفّی الصابرون أجرهم بغیر حساب» انتقام لینے کا حکم اس وقت دیتا ہے جب پانی سر سے گذر جائے اور ظلم حد سے بڑھ جائے مگر انتقام کی بھی غیر محدود اجازت نہیں دیتا بلکہ یہ شرط عائد کرتا ہے کہ انتقام، ظلم کے مماثل ہو، اس سے متجاوز نہ ہو، ارشاد ہے :-

«فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدیٰ علیکم» یعنے جتنا ظلم تم پر کیا گیا بس اتنا ہی انتقام لے لو، اور «وجزاء سیئةٍ سیئةٌ مثلها» برائی کی سزا اتنی ہی برائی ہے اور اس کے باوجود بھی اعلان فرمایا :-

«فمن عفا و أصلح فأجره علی الله» کہ جو شخص درگذر کرے اور درستگی و اصلاح کی فکر کرے تو حق تعالیٰ ہی اجر عطا فرمائے گا۔

اسلام کا قانونِ رحمت و عدل

اسلام صرف اس وقت تلوار اٹھانے کا حکم دیتا ہے کہ جب اصلاح کے راستے بند ہو جاتے ہیں، تمام معاشرہ کے تباہ ہونے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے اور کوئی توقعِ خیر کی باقی نہیں رہتی، ہر طرف سے مایوسی ہی مایوسی ہوتی ہے، اس وقت شر و فساد سے عالمِ انسانیت کو بچانے کے لئے تلوار کا حکم دیتا ہے اور پھر بھی یہ اعلان کرتا ہے کہ بچوں کو بچاؤ، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل مت کرو، عبادت گاہوں میں بیٹھے ہوئے عبادت گذاروں سے درگذر کرو، کیا موجودہ تہذیب کے مدعی خواہ وہ فرانس ہو یا برطانیہ امریکہ ہو یا جرمنی، روس ہو یا چین، اسلام کے قانونِ رحمت و عدل کی نظیر پیش کر سکتے ہیں؟ اسلام کی رواداری و انسانی ہمدردی کی کوئی مثال وہاں مل سکتی ہے؟

اسلامی غزوات پر اعتراض کرنے والوں کے روح فرسا کارنامے

دنیا کی جنگِ عظیم دوم نے کیا کیا تباہی نہیں مچائی؟ دو ہزار میل لمبا اور چار سو میل چوڑا میدانِ کارزار گرم ہوا، تیس ہزار ٹینک اور پچاس ہزار ہوائی جہاز انسانی خون کی ہولی کھیلنے کے لئے امڈ آئے، ۶ برس تک انسانیت کی وہ مسلسل تباہی ہوتی رہی جس کی نظیر تاریخِ ظلم و استبداد میں نہیں مل سکتی اور جس کے سامنے چنگیز و ہلاکو شرمندہ ہیں، دس دس بارہ بارہ گھنٹے مسلسل ہوش ربا بمباری ہوتی رہی، سینکڑوں مربع میل میں نہ کوئی معصوم بچہ محفوظ رہا نہ کوئی ضعیف و ناتوان بوڑھا بچے، عورتیں اور بے گناہ حیوانات تمام کے تمام ہلاک ہوئے، پہلے ہٹلر و ہملر و گوبلز و مسولینی نے یہ کردار ادا کیا، پھر برطانیہ کے چرچل اور امریکہ نے اس درندگی کا ثبوت دیا، تقریباً تین کروڑ نسلِ انسانی تباہ ہوئی اور لاکھوں عورتیں بیوہ ہو گئیں، اسٹالن نے کتنے لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کو صرف اپنے عقیدے کیمونزم کی مخالفت کی وجہ سے تہ تیغ کیا، روس نے سمرقند و بخارا میں کیا کیا؟ فرانس نے الجزائر میں کیا کیا؟ ان مہذب بھیڑیوں اور انسان نما درندوں نے دنیا میں کیا کیا؟ اور کیا کر رہے ہیں؟ نسلِ انسانی کو تباہ و برباد کرنے کے لئے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے ذخائر جمع کرنے والوں نے پہلے کیا کچھ نہیں کیا، اور آئندہ کیا کچھ نہیں کریں گے، کیا ان درندوں کے دلوں میں رحمت و انسانیت کا ایک شمہ بھی موجود ہے! کیا ان کو شرم نہیں آتی

کہ اسلام کے مسئلہ جہاد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات پر اعتراض کرتے ہیں؟ جبکہ ان میں دس سال کے عرصہ میں فریقین کے چند سو افراد سے زیادہ قتل نہیں ہوئے، کفر کی یہ غیر منصفانہ دھاندلی کتنی عجیب ہے کہ خود تو مظلوم اور بے گناہ انسانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے کیا کیا ظلم کر رہے ہیں اور حکومتوں کے تختے الٹنے اور طرح طرح کے انقلابات لانے کے لئے کیا کیا ستم ڈھا رہے ہیں اور کیا کیا روح فرسا واقعات کرتے رہتے ہیں لیکن اگر اسلام عدل قائم کرنے کے لئے کسی بدترین مجرم کو قصاص کے طور پر قتل یا زنا جیسے قبیح جرم کے مرتکب کی سنگساری کا حکم دے تو تمام کافر چیخ اٹھتے ہیں کہ یہ عدل و انسانیت کے خلاف ہے، اگر عقول یہاں تک مسخ ہو جائیں تو پھر جنون کا کیا علاج؟ کیا آج کل عدالتیں پھانسی کی سزائیں نہیں دیتیں؟ صد حیف کہ اسلام کے نام سے سزا ہو تو جرم ہے اور اگر غیر اسلامی عدالت سے سزا ہو تو عینِ انصاف ہے ع "بریں عقل و دانش بباید گریست"۔

اسلام میں تو کفار کی قسمیں ہیں (۱) حربی کافر (۲) ذمی کافر (۳) مستأمن کافر (۴) مرتد کافر، سب کے الگ الگ احکام ہیں، پھر اسی طرح مملکتوں کے اقسام ہیں (۱) دارالاسلام (۲) دارالحرب (۳) دارالامان۔ سب کے علیحدہ علیحدہ شرعی احکام ہیں، بسا اوقات ان احکام کو نہ سمجھنے کی وجہ سے شبہات پیدا ہوتے ہیں، جو کافر میدانِ جنگ میں مسلمانوں سے معرکہ آراء ہوں ان کے ساتھ اسلام کا رویہ نسبتاً شدت آمیز ہے اسی طرح وہ کافر جو اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں اور سازشیں کرنے میں مصروف ہوں ان کے حق میں اسلام کا رویہ سخت ہے اور بلا شبہ اس موقعہ پر شدت و سختی ہی سراپا حکمت اور عینِ مصلحت ہے، جب ایک مسلمان زانی کے بارے میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

((ولا تأخذکم بھما رأفة فی دین اللہ))	اور دیکھو! زانی مرد و عورت پر اللہ کے دین کا حکم نافذ کرتے وقت تمہیں ان پر ترس نہیں آنا چاہیئے۔

تو مفسد کفار کے حق میں شفقت و رواداری کیونکر جائز ہو سکتی ہے؟ جب کبارِ صحابہ اور بدری صحابہ کے بارے میں مکمل مقاطعہ کا حکم شرعاً واجب ہو سکتا ہے تو کفار و مرتدین کے بارے میں اگر صحیح سزا کی قدرت نہ ہو تو بدرجہ مجبوری ان کے ساتھ مقاطعہ کیوں اسلامی اصول کے خلاف ہے؟ درحقیقت اسلام کی تمام سزائیں نہ صرف یہ کہ عدل و انصاف کے فطری اصول پر مبنی ہیں بلکہ خود مجرم کے حق میں عینِ رحمت اور سراپا حکمت ہیں تاکہ اسے غور و فکر کا موقع ملے اور اسلام جیسی نعمت سے محروم ہو کر ابد الآباد تک عذابِ

الٰہی میں گرفتار نہ ہو، دراصل اسلام ہی وہ دین سماوی ہے جس نے جرم وسزا کے درمیان فطری توازن قائم کر کے انسانیت پر عظیم الشان احسان کیا ہے جو لوگ جرائم پیشہ مفسدین اور کفار و مرتدین کے ساتھ معمولی سختی پر چیں بجبیں ہو جاتے ہیں ان کے نزدیک گویا مسلمانوں کے ساتھ ظلم کرنا تو قابلِ برداشت ہے لیکن کافروں اور مرتدوں کے ساتھ سختی کرنا اسلامی عدل و انصاف کے خلاف ہے، مسلمانوں کو فرضی جرائم پر مادر زاد عریاں کرنا انہیں سخت سے سخت سزائیں دینا اور ان سے انسانیت سوز سلوک کرنا تو ان کے نزدیک بالکل انصاف ہے لیکن موذی محارب کافر کو معمولی سزا دینا بھی اسلام کے خلاف ہے یعنی اسلام مسلمانوں کو اتنی بھی اجازت نہیں دیتا کہ وہ بد دین موذیوں سے قطعِ تعلق ہی کر لیں؟ نہ معلوم عقل و انصاف اور دین و دیانت کا جنازہ کیوں نکل گیا، موذی کافر کے ساتھ رحمدلی اور بے گناہ مسلمان کے ساتھ بے رحمی یہ کہاں کا فلسفہ ہے؟ کچھ محسوس ہوتا ہے کہ ایمان کا نور دلوں سے نکل چکا ہے اور کفر کی ظلمت ایسی چھا گئی ہے کہ حقائق کی تمیز مشکل ہو گئی ہے۔

شعبان المعظم ۱۳۹۴ھ، ستمبر ۱۹۷۴ء

اسلام کا دستور

"دینِ اسلام" یا "شریعتِ اسلامیہ" نام ہے اس عالمگیر نظامِ انسانیت کا جس میں تکمیلِ انسانیت کے کسی گوشہ کو نظر انداز نہیں کیا گیا، خالق سے رشتہ ہو یا مخلوق سے اور وہ بھی شخصی زندگی سے متعلق ہو یا اجتماعی زندگی سے، غرض عبادات ہوں یا معاملات، معیشت و معاشرت ہو یا احوال و اخلاق و اعمال ان سب کے لئے ایک علمی دستور اور ایک مقصد و نصب العین ہے، دینِ اسلام کا علمی دستور قرآنِ حکیم اور مقصود رضائے الٰہی ہے۔

قرآنِ حکیم انسانیت کی تکمیل چاہتا ہے اور اس کے لئے اس نے اسلام کے بنیادی اصول و احکام اور اساسی اغراض و مقاصد انتہائی محیر العقول اور معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ واضح کر دیئے ہیں، ان مقاصد و احکام کے سلسلہ بیان میں وہ مظاہرِ فطرت اور آثارِ قدرت کو بھی اگر بیان کرتا ہے تو اس کا مقصود بھی یہی ہے کہ انسان کے فکری اور اعتقادی پہلوؤں کی تکمیل کی جائے، اگر وہ تاریخی حقائق بیان کرتا ہے تو اس کی غرض بھی یہی ہوتی ہے کہ ان عبرت انگیز وقائع تکوینی اور آیاتِ الٰہیہ سے انسانی بصیرت و اعتبار کی تربیت و تکمیل کی جائے، اگر احکامِ الٰہیہ کا ذکر ہوگا تو اس سے بھی یہی مراد ہوگی کہ اشرف المخلوقات انسان کو اکرم المخلوقات بنانے کی تدبیر ہو جائے، ذات و صفات کی توحید و کمال کا بیان ہو یا تذکیر و موعظت کی داستان، قانونِ عدل و انصاف کی تنظیم و تفصیل ہو یا اصول و احکام کی تمہید و انضباط ان سب ہی سے انسان کو انسانیت کی معراجِ کمال تک پہنچانا مقصود ہے۔

قرآنِ کریم نہ تاریخی کتاب ہے کہ محض واقعات کی تفصیلات ہی بیان کرتا رہے اور نہ طبیعی نوامیس کی تفصیل و بیان پر مشتمل کتابِ طبیعات ہے کہ محض علمی اور ذہنی عیاشی کے افسانوں میں وقت ضائع کرے، وہ تاریخ کی روح پیش کرتا ہے اور طبیعات کے عقلی و فکری نتائج بیان کرتا ہے جن سے توحیدِ الٰہی، خلق و ربوبیت کے حقائق انسان کے دل و دماغ میں پیوست ہوں اور روح کو پاکیزگی حاصل ہو تاکہ وہ نظامِ عالم میں خلیفۃ اللہ کے منصبِ اعلیٰ کے تقاضوں کو پورا کرنے کا اہل بن جائے، قرآن اگر کائنات میں غور کرنے کی دعوت دیتا ہے تو اس کی غرض و غایت یہی ہوتی ہے کہ انسانی ذہن و فکر کے سامنے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا راستہ کھل جائے اور اس غور و فکر کے بصیرت آموز نتائج سے ایمان بالغیب کی تائید اور پرورش ہو، اس لئے کہ ان حقائقِ کونیہ اور حقائقِ الٰہیہ میں غور و خوض سے ایمان قوی ہوگا، وہ ان کی طرف

محض علم وفن کی حیثیت سے کبھی دعوت نہیں دیتا کہ محض فن کو مقصد بنالیا جائے۔

قرآن کے بعض جدید مفسرین کو اس سلسلہ میں بڑی غلط فہمی ہوئی ہے، انہوں نے ان موضوعات میں قرآنی مباحث کی تفسیر اور ان مباحث کی غایت وغرض بیان کرنے میں بڑے غلو سے کام لیا ہے اور یہ حقیقت ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے کہ قرآن اگر ان طبیعیات میں غور وفکر کی دعوت دیتا ہے تو اس کا مقصد بھی معرفتِ الٰہی تک پہنچنا ہے اور اگر کسی جگہ ان طبیعی وسائل کو دائرۂ عمل میں لانے کی طرف متوجہ کرتا ہے تو اس کی غرض وغایت یہی ہوتی ہے کہ ان وسائل کو خدمتِ خلق کا ذریعہ بنایا جائے صرف مال ودولت اور ثروت کا ذریعہ نہ بنایا جائے، ظاہر ہے کہ ذات وصفاتِ الٰہی کے بحرِ بیکراں میں شناوری کا صرف یہی ایک راستہ ہے کہ انسان ان حقائق میں غور کرے تاکہ اس وادی میں اس کی فکر ونظر کی صلاحیتیں زیادہ وسیع ہوں اور اس کے سامنے معرفتِ الٰہیہ کے نئے نئے ابواب کھلیں اور جب اس طرح قلب وروح کی تربیت ہو جائے اور انسانیت کا صحیح شعور بیدار ہو جائے تو عملی دائرہ کا صحیح مقصد بھی خود بخود متعین ہو جاتا ہے۔

تفسیر جواہر القرآن پر تبصرہ

تقریباً انتیس ۲۹ سال پہلے، ۱۳۵۷ھ ۱۹۳۸ء کے اوائل میں مصر جانے کا اتفاق ہوا تھا اور قاہرہ کے ایک دینی ہفتہ وار مجلہ "الاسلام" کے دفتر میں اپنے رفیق مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری کی معیت میں بسلسلہ اشاعتِ مضامین جانا ہوا تھا وہیں مجلہ "الاسلام" کے دفتر میں مصر کے ایک مشہور عالم اور مفسرِ قرآن (۱) شیخ جوہری طنطاوی مرحوم سے تعارف اور ملاقات کا موقع ملا، وہ بھی اس مجلہ میں کوئی مضمون شائع کرانے کی غرض سے تشریف لائے تھے، تعارف کے بعد علامہ موصوف نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ کیا میں نے ان کی تفسیر کا مطالعہ کیا ہے؟ میں نے جواباً عرض کیا کہ جی ہاں اس قدر مطالعہ کیا ہے، جس سے اس کے متعلق رائے قائم کر سکا ہوں کہ وہ کیسی تفسیر ہے، علامہ نے فرمایا کہ میں وہ رائے سننا چاہتا ہوں، میں نے عرض کیا کہ مشکلات القرآن (۲) کے مقدمہ میں آپ کی تفسیر کے متعلق مختصر طور پر اپنی رائے لکھ

---

(۱) علامہ شیخ جوہری طنطاوی نے "الجواھر فی تفسیر القرآن الکریم" کے نام سے تقریباً بیس جلدوں میں ایک ضخیم تفسیر لکھی ہے۔

(۲) "مشکلات القرآن" امام العصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری شیخ الحدیث کی ایک مختصر اور بے مثل تفسیر ہے جس میں قرآن کریم کے مشکل مسائل کا تفسیری حل پیش کیا گیا ہے اس پر امام العصر رحمہ اللہ کے تلمیذ خاص ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ نے مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔

چکا ہوں، وہ مختصر سی رائے تھی، اگر آپ اجازت دیں تو اب ذرا تفصیل سے عرض کروں، فرمایا بہت خوشی سے، اس کے بعد میں نے عرض کیا،

آپ نے علماءِ امت پر یہ تو بڑا احسان کیا کہ علوم جدیدہ خصوصاً طبیعیات و فلکیات و ہیئت وغیرہ کو جو یورپ کی زبانوں میں تھے اور علماء ان سے استفادہ نہیں کر سکتے تھے فصیح و بلیغ عربی میں منتقل کر دیا اور اس سے ہمارے لئے استفادہ کی راہیں کھل گئیں اس احسان کے ہم سب ممنون ہیں لیکن قرآنی دعوت کو آپ نے جس انداز سے بیان کیا ہے اس کا تو حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں نے ان قرآنی حقائق کو سمجھنے میں انتہائی تقصیر کی ہے اور یورپ کی قوموں نے ان کو خوب سمجھا ہے اور انہیں نے صحیح طور پر ان پر عمل کیا اور پورا فائدہ اٹھایا ہے، یورپین اقوام کی ترقی و تقدم اور مسلمانوں کی پستی و تأخر کا سب سے بڑا سبب یہی ہے، اگر آپ کے اس بیان کو بلا تاویل صحیح مان لیا جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس معاملہ میں سب سے زیادہ عملی تقصیر خود اس مقدس شخصیت سے ہوئی (معاذ اللہ) جس پر قرآن کریم نازل ہوا تھا اور سب سے زیادہ قرآنی حقائق کی عالم تھی اور اس کے بعد خلفاءِ راشدین اور صحابۂ کرام نے بھی یہی تقصیر کی (معاذ اللہ) اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ صحابۂ کرام سے زیادہ قرآنِ کریم پر صحیح عمل کرنے والی قوم روئے زمین پر پیدا نہیں ہوئی، لیکن آپ کے بیان کے مطابق حضراتِ صحابہ کی یہی قوم سب سے زیادہ مقصر (کوتاہی کرنے والی) ہوگی۔

آپ فرماتے ہیں کہ جو قوم ان حقائق کونیہ کو زیادہ جانے گی اللہ تعالیٰ کی معرفت کے میدان میں وہی قوم گوئے سبقت لے جائے گی گویا یورپ کا ایک سائنسدان آپ کے فرمانے کے مطابق صحابۂ کرام اور عارفینِ امت سے زیادہ اعرف باللہ ہوگا اور ایک یورپین کافر و فاسق سائنس دان آپ کے نزدیک سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی سے زیادہ عارف باللہ ہوگا۔

پھر آپ قرآنی آیات سے بسا اوقات ایسے طرز پر استدلال کرتے ہیں کہ قرآنِ حکیم کی شانِ رفیع اس واہی اور کمزور استدلال سے بہت اعلیٰ و ارفع ہوتی ہے، مثال کے طور پر میں نے سورۂ آلِ عمران کی تفسیر میں ایک موقعہ پر علامہ موصوف کے ایک استدلال کا حوالہ دیا جس میں موصوف نے فوٹو کے جواز پر استدلال کیا تھا میں نے اس کی کمزوری اور اس کے رکیک انداز کو اچھی طرح واضح کیا"۔

علامہ طنطاوی مرحوم بڑے غور سے میری سنتے رہے اور اس کے بعد ان کا جواب دینا شروع کیا

اور میں موصوف کی ان جوابی وضاحتوں کا رد و اعتراض اور جواب در جواب دیتا رہا، عجیب بات یہ تھی کہ مرحوم کوئی مؤثر اور وزنی بات نہیں فرما سکے اور اس سے زیادہ عجیب اتفاق یہ تھا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ اس طرح کھولا اور نہ بان و بیان میں ایسی طاقت و روانی عطا فرمائی جو میں نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی اور اس کا میں نے یہ اثر دیکھا کہ گرمیٔ بحث کے دوران علامہ طنطاوی مرحوم نے بے ساختہ فرمایا:۔

مَا أَنْتَ عَالِمٌ هِندِيٌّ إِنَّمَا أَنْتَ مَلَكٌ نَزَلَ مِنَ السَّمَاءِ لِإِصْلَاحِيْ!! — تم محض ایک ہندی عالم نہیں بلکہ درحقیقت فرشتہ ہو جو آسمان سے میری اصلاح کے لئے اترا ہے۔

اور بحث کے درمیان کبھی کبھی کانوں پر ہاتھ رکھ کر بہت ہی تعجب کے لہجہ میں فرماتے :۔

اَلْآنَ أَفْهَمُ مِنْكَ مَعْنَى هٰذَا الْحَدِيْثِ! — اس وقت میں تم سے اس حدیث کے معنی سمجھا ہوں۔

یہ اعتراف علامہ مرحوم کا حسنِ اخلاق تھا اور اس طرف یہ میرا کوئی کمال نہ تھا بلکہ اس جماعت کی برکت تھی جس کی طرف میرا انتساب تھا اور ان اکابر کی کرامت تھی جن کے جوتے میں نے اٹھائے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے رسوا نہیں فرمایا اور میرے جہل و نادانی سے میرے اکابر بدنام نہیں ہوئے۔

اس تمام بحث و تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ کائنات اور کونیات حق تعالیٰ کے کمالاتِ قدرت اور صفاتِ جلال و جمال کا ایک صحیفہ ہے جس کے مطالعہ سے اور اس میں غور و فکر کرنے سے ایمان میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور اس حیثیت سے طبیعیات کے جدید علوم ان اصحاب کے لئے بلاشبہ بصیرت افزا اور بیحد بصیرت افروز ہیں جن کو وحی و الہام اور مکاشفہ کی راہ سے وصول الی اللہ حاصل نہ ہو، معرفتِ الٰہیہ ان علوم پر منحصر نہیں ہے بلکہ ظاہر بین اصحاب کے لئے حصولِ معرفت کا یہی ایک راستہ باقی رہ گیا ہے۔

علمی معارف کے بعد عملی نتائج ہیں اور اس علم و عمل سے حقیقی فوائد حاصل کرنے کے لئے صحتِ مقصد کی ضرورت ہے اور تصحیحِ مقصد کے لئے ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرۃ کے سوائے کوئی دوسری راہ نہیں ہے، ایمان و یقین سے محرومی اور بے مقصد علم و عمل ہی کی وجہ ہے کہ روس امریکہ اور یورپ کی قومیں ان سائنسی ترقیات اور محیر العقول ایجادات و اختراعات کے باوجود انسانیت

کی صفوں سے نکل کر پوری درندگی کی حدوں تک پہنچ چکی ہیں، نبوت ختم ہو چکی ہے اس لئے معجزاتِ نبوت اور انبیاء کے خوارق کی جگہ اللہ تعالیٰ ان علمی راہوں سے ان پر اپنی حجت پوری کر رہا ہے اور خود انہیں کے ایجاد کردہ علوم سے ان حقائق کو اس نے واشگاف کر دیا ہے کہ بے شعور طبیعت اور اس کے ان حیرت انگیز مظاہر اور حیرت افزا خواص ومنافع میں کرشمۂ الٰہیہ کے اعتراف کے سوائے اور کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔

ایک طرف سائنس کی موجودہ ترقیات اور حیرت انگیز ایجادات واختراعات کو دیکھ کر عقل دنگ ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی عقل میں کیا کیا صلاحیتیں رکھی ہیں اور جب ان صلاحیتوں سے کام لیا گیا ہے تو عقل نے کہاں تک رسائی حاصل کر لی ہے، ان چیزوں کو دیکھ کر سائنس والوں کے کمال کا اعتراف کرنا پڑتا ہے لیکن یہ صورت کمال کا صرف ایک ہی رخ ہے اسی تصویر کا دوسرا رُخ دیکھئے کہ ان آیاتِ قدرت اور عجائباتِ تکوین کو دیکھنے کے بعد بھی وہ اب تک اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لائے، اور ایمان باللہ کی دولت سے محروم ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ یہی عقلاء فکر ونظر کے اس رُخ پر اس قدر جاہل کیسے رہ گئے، لیکن حق تعالےٰ ان کے کفر وانکار کی حقیقت سے بھی پردہ اٹھاتا ہے، ارشاد ہے:۔

«یعلمون ظاهراً من الحیوٰة الدنیا وهم عن الاٰخرة هم غافلون»	وہ حیات دنیا کے ظاہر ہی میں سے کچھ جانتے ہیں اور یہی لوگ آخرت سے تو بالکل غافل ہی ہیں۔

دنیا کا بھی ظاہر اور وہ بھی بہ ہمہ جہت محدود ومقدار میں جانتے ہیں، ان کا ذہن اور ان کی فکر و نظر اس طرف بالکل نہیں جاتی کہ اس حیرت انگیز کائنات اور پُراسرار وحقائق مخلوقات کے خالق پر ایمان لائیں، ایک طرف یہ ذہانت اور حیرت انگیز ذہانت اور دوسری طرف اس قدر عبادت اور غیر معمولی غباوت بجائے خود کس قدر عجیب اور حیرت ناک ہے اور حق تعالیٰ کے اس ارشاد کی صداقت کی کتنی سچی گواہی ہے:۔

«ومن لم یجعل الله له نوراً فماله من نور» .	اللہ تعالیٰ جس کو روشنی نہ دے تو اس کے لئے کہیں روشنی نہیں ہے۔

اسلام اور اس سے صحیح فائدہ اٹھانے کا راستہ

"اسلام" حق تعالیٰ کی وہ آخری نعمت ہے جس سے دنیا کو سرفراز کیا گیا ہے اس نعمتِ اسلام سے صحیح اور کامل فائدہ اسی وقت نصیب ہوتا ہے جب صحیح اسلامی حکومت دنیا میں قائم ہو اور اسلام کے احکام و قوانین جاری کرنے کے لئے اسلامی حکومت کی سرپرستی حاصل ہو، عہدِ نبوت میں بھی جب مدینہ طیبہ اسلامی مرکز بن گیا اور دار الاسلام وجود میں آ گیا تب جا کر دینِ اسلام کی برکات کا ظہور ہونا شروع ہوا، غرض اسلام اور حکومتِ اسلام کا تعلق چولی دامن کا سا تعلق ہے، ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتا، حکومتِ اسلامی ہی وہ عظیم الشان سرچشمۂ برکات ہے جس کی بدولت اسلام پر صحیح عمل کی توفیق میسر آتی ہے، حکومتِ اسلامی کے قیام کے بعد مسلمانوں کی جان و مال و آبرو کی حفاظت ہو جاتی ہے اور قلب کو سکون حاصل ہو جاتا ہے اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے اسلامی حدود و تعزیرات کے نافذ ہو جانے کے بعد پر سکون ماحول میسر آ جاتا ہے اسلامی حکومت کا حقیقی بیت المال قائم ہو جاتا ہے جس کی بدولت کوئی یتیم لاوارث، کوئی بیوہ، کوئی مسکین، کوئی فقیر، پریشان حال نہیں رہ سکتا، ان کی ہر قسم کی پریشانیوں اور تہیدستی و افلاس کا علاج ہو جاتا ہے، صحیح زکاۃ، صحیح عشر و خراج ادا کرنے کے بعد زمین کی پیداوار میں فوق العادۃ برکت ہونے لگتی ہے اور اس کے نتیجہ میں حقیقی اسلامی ہمدردی سے جمع شدہ اموال خرچ کرنے کی بنا پر مزید برکت نازل ہوتی ہے۔

اسلامی فتوحات کے بعد اسلامی مملکتوں کی تفصیلات تاریخوں میں پڑھ لیجئے، مصر و شام و عراق کی تاریخوں کی ورق گردانی سے یہ تمام حیرت افزا واقعات آپ کے سامنے آ جائیں گے، کسی بھی شوہر و بیوی کا قضیہ نامرضیہ باقی نہیں رہ سکتا، اسلامی عدالت سے صحیح چارہ جوئی ہوتی ہے اگر زوجین کے یا ان کے حکمین (ثالثوں کے) ذریعہ تصفیہ نہیں ہو سکتا تو پھر اسلامی حکومت مسلمان قاضی کے ذریعہ عدل و انصاف پر مبنی تصفیہ کرا دیتی ہے اور نزاع ختم ہو جاتا ہے، یہ تو ایک مثال ہے اسی طرح ہر مجرم کو قرارِ واقعی سزا مل جاتی ہے اس عدالتی نظام کے زیر سایہ خدا تعالیٰ کی مخلوق اطمینان کا سانس لیتی ہے کسی مظلوم کی دادرسی میں نہ دیر لگتی ہے نہ غیر اسلامی عدالتی

گورکھ دھندوں میں پریشان ہونا پڑتا ہے، معاشرے کی اصلاح ہو جاتی ہے نہ کوئی شراب پیتا ہے نہ شراب پینے کے بُرے نتائج پیش آتے ہیں، نہ زنا ہوتا ہے اور نہ اس کے نتیجہ میں قتل و غارت ہوتی ہے نہ کوئی نائٹ کلب یعنی بدمعاشی کا اڈا یا چکلہ باقی رہتا ہے، چوری کی شرعی سزاء ہاتھ کاٹنے کے دو چار واقعات ہی امن وامان کی فضا پیدا کر دیتے ہیں نہ حفاظت کے لئے پہرہ داروں کی ضرورت باقی رہتی ہے نہ جان و مال کی حفاظت کے لئے پولیس کی حاجت باقی رہتی ہے، حکومت کے خزانے پر جو حکومتی افسران و ملازمین کی بے تحاشا تنخواہوں اور غیر سرکاری مصارف کا ناقابلِ برداشت بوجھ پڑتا ہے سب ختم ہو جاتا ہے۔

سود کا کاروبار ختم ہونے کی وجہ سے قومی معیشت سے سرمایہ داری کی جڑ کٹ جاتی ہے، بیمہ، قمار اور تمام سودی معاملات کے بند ہونے سے غیر معمولی اور غیر فطری طبقاتی تفاوت ختم ہو جاتا ہے، اگر دس پندرہ سال میں کسی مرحلہ پر دولت کی فراوانی پیدا ہو جاتی ہے تو بہت جلد شرعی وراثت کے قانون کے ذریعہ تقسیم دولت ہو کر خاندان کے افراد میں دولت منقسم ہو جاتی ہے اور معاشرے کے تمام افراد میں ایک گونہ مساوات قائم ہو جاتی ہے، سوشلزم اور اشتراکیت کے لئے راستہ بند ہو جاتا ہے اور جب اسلامی احکام کی پابندی کی برکت سے بندگانِ خدا کے قلوب کا تزکیہ اور اصلاح ہو جاتی ہے تو اِنفاق فی سبیل اللہ کے دروازے بھی کھل جاتے ہیں دلوں میں رقت و ہمدردی اور ترحُّم و رأفت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ کوئی صاحبِ ثروت کسی کو غریب و محتاج دیکھ نہیں سکتا۔ الغرض اسی طرح غریبوں کے ساتھ ہمدردی و اعانت کے جذبات امیر و غریب کے درمیان محبت و مودّت کا ایک محکم رابطہ پیدا کر دیتے ہیں۔

اسلامی حکومت کا سربراہ و حکمران

یہ تو اس صالح نظام کی وہ برکات ہیں جن سے تمام باشندگانِ مملکت بہرہ یاب ہوتے ہیں لیکن اسی صالح نظام کو بدل وجان تسلیم کرنے کے بعد جو شخصیت اس خداوندی نظام کو ملک میں نافذ کراتی ہے وہی اسلامی حکمران ہے اور وہی ایسی اسلامی مملکت کا سربراہ ہوتا ہے اسلامی اصول پر انتخاب کے بعد تا حیات وہ سربراہ رہتا ہے پانچ دس سال کا عرصہ نہیں بلکہ

جب تک وہ زندہ رہتا ہے اور صریح کفر کا صدور اس سے جب تک نہ ہو وہ معزول نہیں ہو سکتا، ایسا شخص صحیح معنیٰ میں "ظل اللہ" (اللہ تعالیٰ کا سایۂ رحمت) ہوتا ہے اس کا منصب اسلام میں اتنا جلیل و عظیم ہوتا ہے کہ اللہ و رسول کی اطاعت کے بعد اس کی اطاعت کا حکم ہوتا ہے، اس کی مخالفت و نافرمانی اللہ اور رسول کی نافرمانی ہوتی ہے گویا جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی احکام کو نہ صرف تسلیم کرتا بلکہ اس کی تعمیل بھی کرتا ہے اور ملک میں اس کی تنفیذ بھی کرتا ہے اس کو اتنا عظیم المرتبت بنایا گیا ہے کہ تمام امت و رعیت پر اس کی اطاعت واجب ہوتی ہے اس کو بڑے بڑے اختیارات دیے جاتے ہیں، درحقیقت اسلامی قانون اور اسلامی آئین کا تصور بلا اسلامی حکمران کے ناتمام رہتا ہے اس لئے کہ اگر کسی وقت معاشرے کے افراد میں صحیح جذبہ ہمدردی باقی نہیں رہتا اور معاشی نظام میں توازن قائم نہیں رہتا تو اسلامی حکمران ہی کی شخصیت ایسی ہوتی ہے کہ اس کو حق حاصل ہے کہ مداخلت کر کے توازن قائم کرے اسلامی حکمران کے عادلانہ نظام کے یہ برکات ہوتے ہیں۔

اسلامی ممالک کی امتیازی خصوصیت

بہرحال اسلامی مملکت کی سب سے بڑی ممتاز خصوصیت ملک میں محاکمِ عدلیہ شرعیہ کا قیام اور اسلامی قانون کا اجراء ہے کوئی مملکت بھی مسلمانوں کی اسلامی مملکت نہیں بن سکتی جب تک کہ اس کے دستور و قانون کا تانا بانا اسلامی احکامِ شرعیہ سے نہ بُنا جائے، میں صاف لفظوں میں کہتا ہوں کہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اسلامی قوانین کا نفاذ اور اسلامی مملکت کے قیام کا خیال ہی حقیقی اسلامی سربراہ کے بغیر بے معنی ہے، گویا شرعی نظام کا سنگِ بنیاد ہی سچے مسلمان اور عادل حکمران کی ذات ہے کوئی بھی اصلاحی قدم بغیر اس کے نہیں اٹھایا جا سکتا نہ ہی کسی اور قسم کے حکمران کو رعایا کے جان و مال پر وہ اختیارات حاصل ہیں جو ایک صحیح معنی میں اسلامی حاکم کو حاصل ہیں۔

پاکستان کی سرزمین جب اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے اور ایک ایسی خود مختار مملکت وجود میں آگئی ہے جس کے باشندے اسی فیصد آج بھی صحیح نظامِ اسلام کے آرزومند ہیں اور اسے بے چون چرا تسلیم کرنے کے لئے آمادہ ہیں تو آخر کس بات کا انتظار ہے کیوں اسلامی قانون

جاری نہیں کیا جاتا ؟ اور آخر اس اسلامی دستور کا کیا نتیجہ ہوگا جس کا اول دن عہد کیا گیا تھا، خصوصاً اس ملک میں جب غیر اسلامی نظام کے تمام تجربے ناکام ہو چکے اور تمام دنیوی نظام جاری کرنے کے بعد بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا بلکہ دن بدن قوم قعرِ مذلت میں گرتی جارہی ہے دین بھی تباہ دنیا بھی تباہ اخلاق بھی برباد ملک کا امن و امان بھی برباد، تو آخر ایک مرتبہ اسلامی قوانین جاری کرکے اسلامی نظام کو کیوں نہیں آزمایا جاتا ؟ یاد رکھیئے اس ملک کا مزاج دینی ہے عوام سچے اور پکے مسلمان ہیں تمام باشندے حنفی ہیں مختصر سی ایک جماعت اہلِ حدیث حضرات کی ہوگی اور دو چار فیصد شیعہ حضرات ہوں گے، عبادات میں ہر شخص کو اپنے اپنے مسلک کی پیروی کرنے کی آزادی ہے اسی طرح شخصی معاملات و شخصی قوانین بھی تمام مذاہب کے مرتب موجود ہیں، بنیادی عقائد اور عبادات و معاملات میں تمام امتِ اسلامیہ متفق ہے اسلامی قانون بنا بنایا موجود ہے صرف محاکمِ عدلیہ کے چلانے والے جج اور قاضی کو ان کا علم ہونا ضروری ہے اگر اسلامی قانون کو جدید قانون سازی کی طرح مرتب کرنا ہی ضروری ہے تو چند ماہ سے زیادہ عرصہ اس کے لئے درکار نہیں، ایک بڑی راحت یہ ہے کہ اگر یہ اسلامی نظام نافذ کیا جائے تو روز بروز مارشل لاء نافذ کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی قوم کی آسودہ حالی اور خوش حالی نیز سکونِ قلب اور معاشرے کی پائیدار اصلاح بغیر اس کے ناممکن ہے ہزار تدبیریں کی جائیں اگر دلوں کی اصلاح نہیں ہوتی تو سب بے کار اور بے معنی ہے اور دلوں کی اصلاح کتاب و سنت کی ہدایات اور اسلامی عدلیہ کے بغیر ناممکن ہے اللہ تعالٰے توفیق عطا فرمائے کہ ان واشگاف حقائق کو سمجھیں اور اس پر عمل کرنے کی توفیق نصیب ہو۔

ربیع الاول ۱۳۸۹ھ

اُمّتِ محمّدیہ اور اسلام

هٰذَا بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (اعراف : ۲۰۲)

اسلام جس کامل ترین شکل میں امتِ محمدیہ کے سامنے آج موجود ہے یہ بڑی کٹھن منزلیں طے کر کے یہاں پہنچا ہے اور دینِ اسلام کا یہ خوب صورت باغیچہ جس شان میں آج موجود ہے اور جس طرح یہ عالمِ اسلام پر سایہ فگن ہو رہا ہے اور اس کے شیریں پھلوں اور پھولوں سے امت لذت اندوز ہو رہی ہے اور اس کی روح پرور خوشبوؤں سے قلب و دماغ کو سکون نصیب ہو رہا ہے یہ شہداءِ احد اور شہداءِ بدر کے پاکیزہ اور مقدس خونوں سے سینچ سینچ کر سرسبز و شاداب کیا گیا ہے اس کے پیچھے امتِ محمدیہ کے جان نثاروں کی عظیم الشان تاریخ ہے گھر بیٹھے بٹھلائے یہ نعمت ہمیں اور آپ کو آسانی سے میسر آگئی ہے ہمیں اس کی کیا قدر ہو سکتی ہے اس کی قدر و قیمت تو صدیق و فاروق، عثمان و علی، طلحہ و زبیر، سید الشہداء حمزہ و جعفر، ابن رواحہ و خالد بن ولید (رضی اللہ عنہم) سے پوچھئے، اس کی داستانیں ابو عبیدہ، سعد بن ابی وقاص اور ابو موسیٰ اشعری سے سنیے، خباب و خبیب بلال و عمار، سلمان و ابو فکیہہ کی المناک زبانوں سے معلوم کیجئے۔

آئیے آپ بھی اسلام کی تاریخ کے سنہری اوراق کی کچھ ورق گردانی کیجئے اور فاتحینِ اسلام کے عظیم الشان واقعات اور کارنامے پڑھئے شاید کچھ اسلام کی قدر و قیمت کا احساس ہو جائے کہنا یہ ہے کہ یہ نعمت بڑی مشکلوں سے ہم تک پہنچی ہے لیکن افسوس آج امت اس کی حفاظت کے فریضہ سے قطعاً قاصر بلکہ غافل نظر آرہی ہے۔

دینِ الٰہی کی تاریخ اور زیادہ گہرائی میں جائیے تو اس دینِ الٰہی کی تاریخ اس سے بھی زیادہ قدیم نظر آتی ہے، حضرت آدم علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس دینِ اسلام کی خشتِ اوّل رکھی ہے ان کے بعد آنے والے حضرات انبیاءِ کرام و رسولانِ عظام پر کیا کیا گذری ہے اس کا کچھ اندازہ حضرت رسالت پناہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی سے ہو سکتا ہے جو صحیح بخاری شریف میں امت کے سامنے ہے:۔

«الأنبياء أشد الناس بلاءً ثم الأمثل فالأمثل» سب سے زیادہ تکلیفیں انبیاءِ کرام کو اٹھانی پڑتی ہیں پھر جو ان کے جتنا زیادہ قریب و مماثل ہو اس کو۔

یعنی یہ "دینِ اسلام" ان تمام ادیانِ الٰہیہ سماویہ کی آخری کڑی ہے جو جامع ترین کامل ترین شکل وصورت میں ہم تک پہنچا ہے۔ پھر صحابہ کرام اور تابعین عظام رضی اللہ عنہم نے کس کس طرح اس چمن کی آبیاری فرمائی ہے، پھر محدثینِ کرام نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انفاسِ قدسیہ اور احادیثِ نبویہ کی کس شان سے حفاظت فرمائی ہے اور کیا کیا محنتیں اس سلسلہ میں کی ہیں، ایک ایک حدیث کے سننے اور محفوظ کرنے کے لئے کیسے کیسے طویل و شاق سفر کئے ہیں اور پھر اعداءِ اسلام کی سازشوں اور تحریفات و تلبیسات سے کس طرح بچا بچا کر امت کے سامنے یہ امانت پہنچائی ہے حتیٰ کہ اس کی حفاظت و صیانت کے لئے تقریباً ایک سو علوم ایجاد کئے، الغرض اس امانتِ الٰہی کو ان حضرات نے کس طرح سینوں سے لگایا اور کس طرح تصنیفی سفینوں (کتابوں) میں امت تک پہنچایا؟ یہ اسلامی تاریخ کا زریں دور ہے، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ دارمی وغیرہ تو اس گلستان کے چند پھول ہیں اور اسی بوستان کے چند باثمر پودے ہیں جن کے ثمرات سے آج امت فائدہ اٹھا رہی ہے۔

پھر اللہ جل مجدہ نے اس امانتِ الٰہی کے حِکَم و مصالح کو سمجھنے سمجھانے کے لئے اور اس کی روح کو محکم بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے حضرات فقہاءِ کرام کو پیدا فرمایا ہے کہیں علقمہ و اسود و شعبی و ابراہیم نخعی ہیں کہیں قاسم بن محمد بن ابی بکر و سلیمان بن یسار و عروۃ بن الزبیر و سعید بن المسیب ہیں کہیں عطاء بن ابی رباح ہیں کہیں ابن سیرین و حسن بصری ہیں کہاں تک گنوائیں مدینہ، مکہ، کوفہ، بصرہ، بغداد، شام، مصر وغیرہ بلادِ اسلامیہ کے فقہاءِ تابعین کی فہرست بہت طویل ہے اس امتِ مرحومہ کی ان نفوسِ طیبہ کی جن کو صحابہ و تابعین و محدثین نے یہ امانتِ الٰہیہ سپرد کی ہے پھر جو صحیح معنی ہیں ان اکابرِ امت کے علوم کے وارث بنے ہیں ان کی فہرست بھی بہت طویل ہے، شام میں امام عبدالرحمٰن اوزاعی، مصر میں یزید بن ابی حبیب و لیث بن سعد، کوفہ میں سفیان ثوری، امام ابو حنیفہ، محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، مدینہ میں امام مالک بن انس اور ان کے شیخ ربیعہ وغیرہ فقہاءِ سبعہ ہیں۔

پھر کچھ عرصہ بعد یہ امانت محمد بن ادریس شافعی اور احمد بن حنبل کو سپرد ہوئی جن کے آراء و افکار و اقوال امت کے سامنے مرتب و محفوظ اور مدون ہو کر پہنچے اور آج تک ان کے بتلائے ہوئے طریقوں اور مسلکوں پر امت عمل پیرا ہے ان میں جن کو زیادہ قبول نصیب ہوا بلکہ حدیثِ نبوی کی تعبیر کے مطابق «ثم یُوضع لہ القبول فی الأرض» کے مصداق بنے وہ امام ابو حنیفہ، امام مالک امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ ہیں۔

کوفہ کی علمی و دینی حیثیت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اتفاق سے اس سرزمین میں پیدا ہوئے جہاں علومِ نبوت کا سب سے زیادہ ذخیرہ پہنچا، چنانچہ خلافتِ فاروقی کے عہد میں جب اسلام مشرق و مغرب میں پھیل گیا اور عراق میں کوفہ ایک مستقل اسلامی بستی بسائی گئی اور اس کو مرکزیت حاصل ہوگئی تو سب سے زیادہ صحابۂ کرام اس سرزمین میں منتقل اور آباد ہوئے بلکہ کوفہ صحابہ کرام کا فوجی ہیڈ کوارٹر بن گیا، حروبِ قادسیہ میں یعنی ایران کی لڑائیوں میں آٹھ ہزار صحابہ کرام بتصریح مؤرخ ابن جریر طبری شہید ہوئے ہیں، وہ سب کے سب اسی سرزمین میں سکونت اختیار کر چکے تھے، کوفہ میں ایک علاقہ قرشیشیا کا تھا جس میں تبصریح شیخ ابن ہمام چھ سو صحابۂ کرام سکونت پذیر تھے اسلام کے اس عالمی مرکز کے لئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تمام فقہاءِ صحابہ میں سے حضرت عبد اللہ بن مسعود کو منتخب کر کے بھیجا تھا جن کے بارے میں حسبِ روایت طبقاتِ ابن سعد، فاروقِ اعظم کے یہ کلماتِ طیبہ انتہائی اہمیت رکھتے ہیں:۔

آثرتکم بہ یا أھل القادسیۃ	اے مجاہدینِ قادسیہ! تم کو وہ شخص دے رہا ہوں جس کا میں خود محتاج ہوں۔

عبد اللہ بن مسعود نے اس سرزمین میں کچھ ہی عرصہ میں ایک ایسی عظیم جماعت تیار کر دی جس کو دیکھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:۔

أصحاب عبد اللہ سُرج ھذہ القریۃ	عبد اللہ بن مسعود کے شاگرد اس شہر کے مشعل و چراغ ہیں۔

جس وقت حضرت علیؓ کوفہ تشریف لے گئے ہیں عبد اللہ بن مسعود تو وفات پا چکے تھے لیکن حضرت علی کے استقبال کے لئے ان کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ چار ہزار کی تعداد میں پہنچے تھے جس کا ذکر امام سرخسی نے مبسوط کی سولہویں جلد میں کیا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

ان کو دیکھ کر فرمایا:۔

رحم اللہ ابن اُم عبد قد ملأ ھذہ القریۃ علماً وفقھاً۔	ابن اُمّ عبد یعنی ابن مسعود پر اللہ تعالےٰ کی رحمتیں ہوں جنہوں نے اس شہر کو علم (حدیث) اور فقہ سے بھر دیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس قابلِ قدر اور سزاوارِ افتخار شہادت پر غور کیجئے۔

بہرحال خلافتِ فاروقِ اعظم کے بعد اسلامی ملکوں میں صحابہ کرام کی کثرتِ تعداد کے اعتبار سے دنیا کا کوئی ملک بھی کوفہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا، ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر صحابی حدیث اور علمِ دین کا ایک سرچشمہ ہے، اس لحاظ سے جہاں جتنے زیادہ صحابہ پہنچے وہاں اسی قدر زیادہ حدیث پہنچی اور جہاں جتنے زیادہ فقہاءِ صحابہ اور کبارِ صحابہ پہنچے وہاں اسی قدر زیادہ علومِ نبوت کے چشمے جاری ہوئے، یہی وجہ تھی کہ عہدِ بنی امیہ اور پھر عہدِ بنی عباس میں جس کثرت سے محدثین کوفہ میں موجود تھے کوئی ملک بھی اس کی ہمسری نہیں کر سکتا، محدثِ عجلی کا بیان ہے کہ کوفہ میں ایک ہزار پانچ سو صحابہ سکونت پذیر تھے: جن میں ستر صحابہ بدریین تھے، یہ تو ان اصحابہ کی تعداد ہے جو کوفہ کے مستقل باشندے تھے اور جو صحابہ دینی اور ملکی ضرورت کے تحت کوفہ تشریف لائے اور کچھ عرصہ عارضی طور پر قیام فرمایا ہے ان کی تعداد کا تو اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔

اور ظاہر ہے کہ ان سب کی علمی اور دینی وراثت اہلِ عراق کو ہی منتقل ہوئی ہے خصوصاً جب کوفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ وکرم اللہ وجہہ کے عہد میں مرکزِ اسلام و مرکزِ خلافت بھی بن گیا تھا، اسی وجہ سے حضرت علی اور حضرت ابن مسعود کے علوم کے حاملین اور تلامذہ کوفہ ہی میں زیادہ رہے ہیں۔

پھر باقاعدہ طور پر حضراتِ صحابہ میں سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ودرایت اور ان کے فقہ کو پورے طور پر محفوظ کرنے والے عبد اللہ بن مسعود کے تلامذہ ہی تھے اور پھر تلامذہ کے تلامذہ تھے، چنانچہ محمد بن جریر طبری مفسر و مورخ فرماتے ہیں:۔

لم یکن أحد لہ أصحاب معروفون حرّروا فتیاہ ومذاھبہ	حضرت عبد اللہ بن مسعود کے علاوہ کوئی صحابی ایسا نہیں جس کے تلامذہ نے باقاعدہ طور پر اس کے

فی الفقه غیر ابن مسعود، وکان یترك مذهبه وقوله لقول عمر، وکان لا یخالفه فی شیء من مذاهبه ویرجع من قوله إلی قوله اھ.

اقوال و فتاوی و مذہب کو مدون و مرتب کیا ہو اور ابن مسعود حضرت عمر کے قول کی بنا پر اپنے قول کو چھوڑ دیا کرتے تھے اور حضرت عمر کے مسلک کی کسی چیز میں بھی مخالفت نہیں کرتے تھے اور اپنے قول سے عمر کے قول کی طرف رجوع کر لیا کرتے تھے۔

مسروق بن الاجدع جو کبارِ تابعین کوفہ میں شمار ہوتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ:۔

میں نے صحابہ کرام کو قریب سے قریب تر ہو کر دیکھا ہے اور ان کی صحبت حاصل کی ہے، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تمام صحابۂ کرام کے مختلف علوم چھ صحابہ میں سمٹ آئے ہیں: عمر فاروقؓ، علی مرتضیٰؓ، عبد اللہؓ بن مسعود، ابو الدرداءؓ، زیدؓ بن ثابت، ابیؓ بن کعب پھر ان چھ حضرات کے علوم کو میں نے دو صحابہ میں مجتمع پایا ہے: حضرت علی اور حضرت ابن مسعود اور اس میں شک نہیں کہ ان دونوں حضرات کے علوم کے وارث کوفہ والے ہی ہیں۔

امام ابو حنیفہ اور ان کی خصوصیات بہر حال صحابۂ کرام کے علوم کے وارث تابعین بنے اور تابعین کے علومِ حدیث و فقہ کے وارث وہ ائمۂ اجتہاد ہوئے جن کے تفقہ اور مذاہب پر امت کی دینداری کا دار و مدار رہا ہے ان ائمہ مجتہدین کے دور میں جو امام سب سے زیادہ ممتاز تھے وہ سفیان ثوری، محمد بن عبد الرحمٰن بن ابی لیلی اور ابو حنیفہ ہیں پھر ان سب میں تفقہ اور اجتہاد کے اعتبار سے امام ابو حنیفہ سب سے زیادہ ممتاز اور مقبول ہوئے اور حق تعالٰی نے ان سے وہ خدمت لی کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، امام ابو حنیفہ کے کمالات و خصوصیات ہمارا موضوعِ بحث نہیں نہ ان کے کمالات کی تفصیل کی یہاں گنجائش ہے ؎

فی طلعة الشمس ما یغنیك عن زحل

آفتابِ عالمتاب کے طلوع ہونے کے بعد زحل ستارے کی روشنی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

یہ تو ظاہر ہی ہے کہ حضراتِ محدثین اور فقہاءِ مجتہدین میں سے جو مشائخ ابو حنیفہ کو میسر آئے کسی اور امام کو میسر نہیں آئے پھر فطرۃً جو دقتِ نظر، تو قدِ فکر اور ذکاء کا حصۂ وافر ابو حنیفہ کو

ملا ہے اس میں کوئی ان کا ہمسر نہیں، پھر صبر و استقامت اور خیر خواہی کا جذبہ، فیض رسانی کی حرص اس قدر کہ عقل حیران ہے، غرض حق تعالےٰ نے ابو حنیفہ کو وہ فطری ملکات عطا فرمائے جن کی نظیر ان کے معاصرین میں کہیں نہیں ملتی، ان کے مذاہب کی سب سے بڑی قابلِ قدر خصوصیت یہ ہے کہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہٗ کے بعد تاریخِ اسلام میں ابو حنیفہ پہلے امامِ دین ہیں جس نے "فقہی شورائی" نظام قائم کیا تھا اور چالیس فقہا، ومحدثین وائمہ کرام اس شوریٰ کے ارکان تھے ان میں سے چند کے اسماءِ گرامی حسب ذیل ہیں:۔

امام ابو یوسف، زفر، داؤد طائی، اسد بن عمرو، یوسف بن خالد سمتی، یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ عافیۃ ازدی، حمزۂ زیات، حبان بن مندل فضیل بن عیاض وغیرہ وغیرہ۔

یہ چالیس ارکان کی جماعت مسائلِ فقہیہ میں کامل غور و خوض کے بعد مسائل متفقہ طور پر طے کرتی تھی کبھی کبھی ہفتوں بحث و تمحیص میں لگ جاتے تھے، ابن ابی العوام سعدی اپنی کتاب "اخبار أبی حنیفۃ واصحابہ" میں لکھتے ہیں:۔

کان أصحاب أبی حنیفۃ الذین دوّنوا معہ الکتب أربعین رجلاً کبراء الکبراء۔

امام ابوحنیفہ کی فقہ کو مرتب کرنے والے چالیس حضرات ایسے تھے کہ جو اکابر کے اکابر تھے۔

موفق مکی، مناقب ابو حنیفۃ میں لکھتے ہیں:۔

وضع أبو حنیفۃ مذھبہ شوری بینھم لم یستبدّ فیہ بنفسہ دونھم اجتھاداً منہ فی الدین ومبالغۃً فی النصیحۃ للہ و رسولہ والمؤمنین فکان یلقی المسائل مسألۃً مسألۃً ویسمع ماعندھم ویقول ماعندہ ویناظرھم شھراً أو أکثر حتی یستقر أحد الأقوال فیھا

ابوحنیفہ نے اپنے مذہب کی بنیاد ان چالیس ارکان کے مشورہ اور اتفاقِ رائے پر رکھی تھی، ان کی آراء کو نظر انداز کر کے اپنی شخصی رائے کو کبھی بھی مدار نہیں بنایا، اس کا مقصد اپنی جانب سے دین کے معاملہ میں انتہائی جد وجہد کا اور اللہ، اس کے رسول اور اہلِ ایمان کی خیر خواہی کا حق ادا کرنا تھا، ابوحنیفہ فقہی مسئلے ایک ایک کر کے ان ارکینِ شوریٰ کے سامنے پیش کرتے ان کے دلائل سنتے، اپنے دلائل بیان کرتے مہینہ مہینہ بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ ان کے ساتھ بحث

ثم يثبتها أبو يوسف في الأصول حتى أثبت الأصول كلها، وهذا يكون أولى وأصوب، وإلى الحق أقرب والقلوب إليه أسكن وبه أطيب من مذهب من انفرد فوضع مذهبه بنفسه ويرجع فيه إلى رأيه اھ

ومباحثہ کرتے یہاں تک کہ متفقہ فیصلہ ہو جاتا تو اس کے بعد کتبِ اصول میں درج کراتے یہی سب سے بہتر، سب سے زیادہ درست اور حق سے سب سے زیادہ قریب طریقِ کار تھا اسی سے دل مطمئن اور خوش ہو سکتے ہیں، بمقابلہ ایک شخصی مذہب کے جس کو ایک فردِ اپنی شخصی رائے سے تجویز کرے اور اپنی رائے پر ہی اعتماد کرے اور اسی کو مدار بنائے۔

یہی وجہ ہے کہ امام محمد بن ادریس شافعی جیسے امام کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ :

الناس كلهم في الفقه عيال على أبي حنيفة

تمام امت فقہ میں ابو حنیفہ کی محتاج ہے !

اور اسی وجہ سے ابن خلدون جیسے محقق مؤرخ کو بھی جو خود مالکی المذہب تھے اور اندلس کے مسلّم عالم تھے کہنا پڑا کہ : جو پختگی مذہبِ ابو حنیفہ کو حاصل ہوئی مالکی مذہب کو حاصل نہ ہو سکی (تفصیل کے لئے مقدمہ ابن خلدون دیکھا جائے)

امام ابو حنیفہ اور شرعی مسائل امام ابو حنیفہ نے جو شرعی مسائل واحکام امت کے لئے املاء کر کے لکھوائے تھے ان کی تعداد کے بارے میں متعدد اقوال ہیں، ان میں ایک قول یہ ہے کہ یہ مسائل واحکام بارہ لاکھ ستر ہزار سے بھی زائد تھے، یہی وجہ ہے کہ ابو حنیفہ کے مذہب کو عالمِ اسلامی میں جو عروج وقبول نصیب ہوا ہے تصور سے بالاتر ہے چنانچہ کہا گیا ہے کہ تمام امت میں ابو حنیفہ کی متابعت واقتدار کرنے والے دنیائے اسلام کے نصف سے زائد مسلمان ہیں، نصفِ اقل میں بقیہ تمام ائمہ کے متبعین شامل ہیں۔

انہی حقائق کے پیشِ نظر امام یحییٰ بن سعید القطان اور امام یحییٰ بن معین اور وکیع بن الجراح وغیرہ وغیرہ کبارِ محدثین کے متعلق محققین علماءِ اسماءِ رجال کا بیان ہے کہ یہ ابو حنیفہ کا اتباع کرتے تھے، گویا "اجتہادِ مطلق" کا منصب اتنا اونچا اور اتنا دقیق وعمیق ہے کہ اتنے بڑے بڑے حضرات علماءِ محدثین بھی ابو حنیفہ کی اتباع سے بے نیاز نہ ہو سکے، بلا شبہ ان کا اتباع یا ان کی تقلید

عام امت جیسی نہیں ہے کہ ہر ہر مسئلے میں امام کی تقلید کریں بلکہ جو دقیق فقہی مسائل ایسے درپیش آتے تھے کہ یہ حضرات خود از روئے حدیث فیصلہ نہ کر سکتے تھے تو ان میں ابو حنیفہ کا مذہب اختیار کرتے تھے اور اسی پر فتویٰ دے دیا کرتے تھے اسی بنیاد پر امام ترمذی جیسے حضراتِ محدثین کو شافعی مذہب کا پابند بتلایا گیا ہے اور امام ابو داؤد جیسے محدث کو امام احمد بن حنبل کا متبع بتلایا گیا ہے بہرحال حدیث ہو یا فقہ دین کے الگ الگ شعبے ہیں ع ہر کسے را بہر کارے ساختند،

"لکل فن رجال" معروف قولہ ہے، اعمش جو ابو حنیفہ اور ابو یوسف کے شیخ تھے، ایک موقعہ پر ان سے ایک مسئلہ پوچھا گیا جواب سے عاجز آئے، ابو حنیفہ موجود تھے، عرض کیا: اجازت ہو تو جواب دوں" فرمایا: "جی ہاں" جب ابو حنیفہ نے اسی حدیث سے جواب دیا جو اعمش کو بھی یاد تھی تو اعمش کو اس پر حیرت ہوئی اور بے اختیار فرمانے لگے،

یامعشر الفقهاء نحن الصیادلة — اے فقہاء کی جماعت! ہم تو دوا ساز ہیں

وأنتم الأطباء — طبیب تو تم ہو۔

امام ابو یوسف کی موجودگی میں ایک دفعہ کسی نے کوئی مسئلہ دریافت کیا، پھر امام اعمش جواب سے خاموش رہے تو ابو یوسف نے باجازت شیخ جواب دیا، فرمایا کہ: اے یعقوب (امام ابو یوسف کا نام ہے) تمہارے والدین نے نکاح بھی نہیں کیا تھا اس وقت سے یہ حدیث مجھے معلوم تھی لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ اس حدیث سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے۔"

ان واقعات کو حافظِ حدیث حافظ ابن عبد البر مالکی نے "جامع بیان العلم" میں اپنی سند سے لکھا ہے اور اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں، عرصہ ہوا کہ "الفرقان" کے شاہ ولی اللہ نمبر میں راقم الحروف کا ایک طویل مقالہ اس موضوع پر شائع ہو چکا ہے، اس وقت قلم برداشتہ چند حروف لکھ دیئے تھے شاید اہلِ انصاف نے قدر فرمائی ہو، باقی جن حضرات نے نہ ماننے کا عزم ہی کر لیا ہو روئے سخن ان کی طرف نہیں ہے آج کل جہاں اور فتنے اس ملک کے مسلمانوں کو گھیرے ہوئے ہیں یہ بھی ایک فتنہ بن گیا ہے کہ ایک طرف ایک جماعت پوری جہالت کے ساتھ اتباعِ سنت کے خلاف کرتی ہے اور مذہبِ حنفی کی آڑ لیتی ہے اور اس طرح یہ مذہبِ حنفی کو بدنام کرتے ہیں، دوسری طرف ایسے حضرات بھی موجود ہیں جو مقلدینِ ائمہ اور متبعینِ مجتہدین کو مشرکین سے کم

نہیں سمجھتے اور ان کے خلاف لکھتے لکھتے ابو حنیفہ کے خلاف بھی اپنا زورِ قلم خرچ کر رہے ہیں، بڑی شدید خلیج درمیان میں حائل ہے۔ انصاف اور اخلاص کے فقدان سے یہ صورت حال پیدا ہوئی ہے آج امت کفر و الحاد کے بحران میں مبتلا ہے، نئی نسل بے دینی و بداخلاقی کے گہرے گڑھے میں گر رہی ہے اور ہمیں ایک دوسرے پر لعن وطعن سے ہی فرصت نہیں ملتی، آج کفر و اسلام کا مقابلہ ہے اسلام اور کمیونزم کا مقابلہ ہے اسلام اور سرمایہ داری کا مقابلہ ہے، تمام دین کی اقدار مسخ کی جا رہی ہیں ماسکو اور واشنگٹن کے ساتھ مہبطِ وحی البلد الامین مکہ مکرمہ اور مہبطِ جبرئیل امین مدینہ طیبہ کا موازنہ کیا جا رہا ہے، ایک طرف سے دہریت و الحاد کے ساتھ ساتھ جدید تہذیب و تمدن کا سیلاب آ رہا ہے، اور اسلامی اقدار کے مضبوط قلعوں کو برباد کرنے پر تلا ہوا ہے اور ہم تقلید اور عدمِ تقلید کے جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں ؎: بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون

رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ، نومبر ۱۹۷۱ء

اسلام "دینِ کامل" ہے، اس میں کسی بھی "ازم" کی گنجائش نہیں [1]

خطبۂ مسنونہ کے بعد آیتِ مندرجہ ذیل تلاوت فرمائی :۔

«الیوم اکملت لکم دینکم وأتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الإسلام دیناً» — آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل بنا دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کردی اور اسلام کو بحیثیت دین تمہارے لئے پسند کیا۔

عزیزانِ گرامی قدر اور محترم بزرگو! میں آپ سے تقریباً ۲۸ روز غیر حاضر رہا، ان دنوں میں آپ پر کیا گذری اس سے آپ سب حضرات خوب واقف ہیں، اس ملک میں اسلام پر جو کچھ بیت رہی ہے اور جو کچھ اس کے ساتھ کیا جا رہا ہے اس کے پیش نظر میں نے ایک عرصہ سے اخبار بینی تقریباً ترک کردی تھی کیونکہ ہر روز کوئی نہ کوئی دردناک خبر ملتی تھی اور کسی نہ کسی روح فرسا واقعہ سے سابقہ پڑتا تھا، پھر عریانی و فواحش اور ان کی تصاویر سے اخبارات بھرے ہوتے تھے، اس لئے جب یہاں تھا تو ان سے اجتناب کرتا تھا لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی خبر کان میں پڑ ہی جاتی تھی، یہاں سے جانے کے بعد رُخ ہی دوسری طرف تھا اس لئے خود کو خالی الذہن کر لیا تھا لیکن ان ۲۸ دنوں میں جو کچھ اس ملک پر گذرا اور برسوں کی مسافت جو چند دنوں میں طے ہوئی وہ ایسا واقعہ نہیں ہے کہ اس سے صرفِ نظر کیا جائے اور ذرا بھی غفلت برتی جائے ہم آپ ایک ہی کشتی کے سوار ہیں جب کشتی ڈوب رہی ہو تو ہر مسافر کو اس کے بچانے کی فکر میں لگ جانا چاہیئے، کچھ تو میں نے حرمین شریفین میں اس بدقسمت ملک کے بارے میں سنا اور کچھ یہاں آکر بعض کرم فرماؤں نے بتلایا، ان خبروں اور حالات کا خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان آج اپنی تاریخ کے انتہائی نازک ترین دور سے گذر رہا ہے، دنیا میں انقلابات آتے ہیں سازشیں ہوتی ہیں، طوائف الملوکی پھیل جاتی ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ آج کسی کے لئے تختِ سلطنت ہے تو کل اس کے لئے تختہ دار ہے، یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن ہمارا ملک اس

---

[1] حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کی ایک اہم تقریر جو آپ نے حرمین شریفین کی زیارت اور حج سے واپسی کے دوسرے دن بروز جمعہ ۲۱ مارچ ۶۹ء کو ایک مجمع کثیر کے سامنے جامع مسجد علامہ بنوری ٹاؤن میں فرمائی اور ماہنامہ بینات میں اس کا اختصار "بصائر و عبر" میں پیش کیا گیا۔

سے بھی شدید ترین خطرات سے دوچار ہے، داخلی اور خارجی فتنوں نے اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ اس کو گھیر رکھا ہے، امریکہ، برطانیہ، روس اور چین ایک عرصہ سے اس ملک کو اپنی چراگاہ بنائے ہوئے تھے اور اپنے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ عملِ جراحی میں مصروف تھے ان سب کا مقصد یہ تھا کہ اس ملک کو اپنی حالت میں رہنے نہ دیں اور یہ ملک جس مقصد کے لئے بنایا گیا تھا اس سے اس کو کوسوں دور ڈال دیں۔

برطانیہ ایک زہریلے بچھو کی طرح نیشن زنی میں مصروف رہتا ہی ہے، برطانیہ کی تاریخ جس قدر قدیم ہے اسلام اور مسلمانوں سے اس کی عداوت بھی اتنی ہی قدیم ہے، اس کی خواہش ہمیشہ سے یہ ہے کہ یہ ملک مسلمان ملک کی حیثیت سے زندہ نہ رہے، امریکہ دوسرا شیطان ہے جو اسی فکر میں ڈوبا ہوا ہے کہ پاکستان ختم ہو جائے اور ہندوستان اس پر حاوی اور قوی ہو جائے اس پر وہ کروڑوں ڈالر خرچ کر رہا ہے، روس بڑا بدمعاش ہے وہ چاہتا ہے کہ لگے ہاتھوں وہ بھی اپنے بلاک کو وسیع کرلے امریکہ کو شکست دے دے اور دنیا کو اپنے غیر فطری امور، خدا دشمن نظام کمیونزم کی لپیٹ میں لے لے، درمیان میں ایک نیا شیطان اور آ نکلا ہے جس کا نام چین ہے وہ بھی اپنی للچائی ہوئی نگاہیں پاکستان پر اور افریقہ وایشیا کے دوسرے ملکوں پر ڈال رہا ہے، یہ تمام دشمن ملک کے موجودہ حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں، ان کی توقعات اب وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہیں اور اپنے جالوں کے پھندے بڑے تیزی سے کس رہے ہیں، ادھر ملک میں کچھ حضرات جن کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جاتا ہے وہ ان بیرونی ملکوں کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں، صدر صاحب اپنے اعمال کا نتیجہ بھگت رہے ہیں اپنے دس سالہ کرتوتوں کی سزا پا رہے ہیں قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:۔

«قل اللّٰهم مالك الملك	آپ کہا کریں: اے اللہ تو ہی ہے بادشاہت کا مالک
تؤتي الملك من تشاء	جس کو چاہتا ہے سلطنت سے نوازتا ہے اور جس سے
وتنزع الملك ممن تشاء	چاہتا ہے سلطنت وحکومت کو چھین لیتا ہے جس کو چاہتا
وتُعِزّ من تشاء وتذل	ہے عزت سے سرفراز فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت و
من تشاء بيدك الخير	رسوائی سے ہمکنار کرتا ہے خیر تیرے ہی دستِ قدرت

انك علىٰ كُلِّ شیءٍ قدیر) آل عمران ع ۳)   بیشک بلاشبہ تو ہر چیز پر قدرتِ بیکراں رکھتا ہے۔

صدر صاحب آج معکوس حالت سے دوچار ہیں وہ کل تک عزیز تھے انہیں ملک کا نجات دہندہ سمجھا جارہا تھا اس زمانہ میں کہا جارہا تھا کہ سمندر نے بھی سونا اگلنا شروع کر دیا، سمندر نے سونا بے شک اگلا اور خوب اگلا یہ اور بات ہے کہ وہ سونا بعد میں پیتل بن گیا، پھر آپ کو وہ زمانہ بھی یاد ہوگا جب ہندوستان نے پاکستان کو اپنی جارحیت کا نشانہ بنایا تھا، صدر صاحب کی زبان سے کلمہ طیبہ نکلا اور تقریر سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کی عادت پڑی، ریڈیو بھی مسلمان ہو گیا، حکومت مسلمان ہو گئی، فوج بھی مسلمان ہو گئی، فوجیوں نے جام شہادت نوش کئے، اخلاص اور کامل اخلاص سے لڑے، مساجد نمازیوں سے بھر گئیں، آخر کار مسلمانوں کی جان میں جان آئی کہ اللہ تعالیٰ نے ملک کو بچالیا، پھر یکایک ملک کے حالات بدلے یا زبردستی ان کو بدلا گیا دینی فضا جو قائم ہوئی تھی اس کو فواحش و منکرات اور ٹیڈی ازم کے نرغے سے ختم کیا گیا۔

بہر حال اس وقت ملک جن خطرات سے دوچار ہے اس سے آپ بخوبی واقف ہیں اس وقت دو طبقے ہیں جن کے ذمہ میں فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ میدان میں اتر کر اس ملک کو خطراتِ کفر و الحاد اور بے دینی کے تسلط سے بچائیں اور اسلام اور امن و سلامتی کے راستہ پر ملک کو چلا کر عزت و سرفرازی سے ہمکنار کریں۔

علماء کی ذمہ داری اور ان کے فرائض

ایک طبقہ علماء کا ہے، علماء پر سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ کامل اخلاص اور پوری تندہی سے اس وقت کام کریں وہ یہ سوچیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ان کو عزت دی ہے وہ سب کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین مبین کا صدقہ ہے، مسلمانوں میں ہماری جو کچھ عظمت و احترام اور ادب ہے وہ سب اللہ کے دین سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ہے، آج اس ملک میں اسلام پر جو کچھ گذر رہا ہے یا گذرنے والا ہے اس میں علماء کیا کردار ادا کریں گے؟ دنیا کی آنکھیں اس کی طرف لگی ہوئی ہیں، علماء جو کچھ کریں گے تاریخ اپنے سفینوں میں اور قوم اپنے سینوں میں اس کو ہمیشہ محفوظ رکھے گی، آج علماء کے امتحان کا وقت آگیا ہے۔

ضرورت ہے کہ ہم حق کہیں اور حق کے لئے کہیں اور حق تعالےٰ جل مجدہٗ کی رضا وخوشنودی کے لئے کہیں اور جو کام کریں نفس کا شائبہ تک اس میں نہ ہو، وہ حدیث رسول علیہ الصلاۃ والسلام تو علماء کے سامنے ہوگی اور پڑھی اور پڑھائی ہوگی:۔

قیامت کے روز اللہ تعالےٰ کے یہاں سب سے پہلے علماء، مجاہدین، سخاوت کرنے والوں کی پیشی ہوگی سب سے پہلے علماء کی باری آئے گی اور ان سے کہا جائے گا کہ تم نے علم کس لئے حاصل کیا تھا؟ عرض کریں گے کہ تیری رضا کے لئے" ارشاد ہوگا: غلط کہتے ہو تم نے علم اس لئے حاصل کیا تھا کہ تم کو عالم کہا جائے اور لوگ تمہاری عزت کریں، چنانچہ ایسا ہو گیا (لوگ تمہیں عالم کہنے لگے) پھر حکم ہوگا ان کو اوندھے منہ جہنم میں ڈال دو اور وہ جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے۔

پھر اسی طرح مجاہدین کا نمبر آئے گا اور ان سے بھی یہی سوال وجواب ہو کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا، آخر میں سخاوت کرنے والے آئیں گے اور ان پر بھی یہی ماجرا گذرے گا۔

لہٰذا علماءِ ربانیین کا اہم فریضہ ہے کہ وہ سروں سے کفن باندھ کر میدان میں آجائیں، بہت بے حسی اور بےغیرتی کی بات ہوگی کہ دین پر نازک ترین وقت آجائے اور ہم خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہیں اور تاویلیں کرتے رہیں کہ ابھی عزیمت کا وقت نہیں، رخصت پر عمل کیا جا سکتا ہے۔
مجھے امید ہے کہ ایسا نہیں ہوگا، علماء خاموشی سے نہیں بیٹھیں گے، انشاء اللہ ثم انشاء اللہ۔
ہماری تو آرزو ہے کہ دین کے تقاضے ہم سے پورے ہو جائیں، الحمد للہ بیس ۲۰ سال سے شہادت کی آرزو سے اپنے سینہ کو گرم کر رکھا ہے اس سے بڑی کیا خوش نصیبی ہوگی کہ اس کی راہ میں شہادت نصیب ہو، لیکن ضرورت اس کی ہے کہ علماء کی طرف سے کام ہو مگر صحیح، درست، عقل اور تدبیر سے ہو اللہ کو راضی کرنے کے لئے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہو، وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

عوام کے فرائض وذمہ داریاں

دوسری ذمہ داری عام مسلمانوں کی ہے جن سے اس وقت میں مخاطب ہوں، اگرچہ اس

ملک میں ملاحدہ زنادقہ، بے دین اور اسلام سے منحرف لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے تاہم ملک کی بھاری اکثریت حلقہ بگوشِ اسلام ہے جو اس ملک میں اسلام کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتی ہے اور اسلام سے روگردانی اور انحراف کو سب سے بڑا گناہ تصور کرتی ہے ان ہی حضرات کے سامنے میں اپنی معروضات پیش کر رہا ہوں کہ :۔

آپ اس وقت سخت امتحان میں ڈال دیئے گئے ہیں، آپ علماءِ حق کی دعوت پر لبیک کہیں اور ان فتنوں سے نبرد آزما ہونے میں علماء کا ہاتھ بٹائیں، عوام مسلمین کی قربانیاں اسی وقت نتیجہ خیز ثابت ہوں گی جب یہ صحیح قیادت کے تحت کام کریں اور صحیح قیادت علماءِ ربانیین ہی کی ہو سکتی ہے :۔

لا یصلح الناس فوضیٰ لا سراۃ لھم
ولا سراۃ اذا جھالھم سادوا

(صحیح قیادت کے بغیر انتشار اور پراگندگی کی حالت میں لوگوں کی حالت بہتر نہیں ہو سکتی اور جاہلوں کی سیادت کو صحیح قیادت نہیں کہا جا سکتا)

آپ کو معلوم ہے کہ اس مسلمان ملک میں سوشلزم اور کمیونزم کے نعرے لگ رہے ہیں اور بڑے زور و شور کے ساتھ لگائے جا رہے ہیں جہنم کی طرف لے جانے والے ائمہ ضلال و فسق لوگوں کی قیادت کر رہے ہیں، اور خود بھی شرارت اور فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا رہے ہیں اور لوگوں کو بھی اس پر آمادہ کر رہے ہیں اب ہماری خاموشی بدترین جرم ہوگی، اگر دیندار مسلمان اسلام کی حفاظت و صیانت اور دفاع سے خاموش ہو گئے تو یہاں اسلام ختم ہو جائے گا اور دنیا کے نقشہ سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گا، اس موقع پر قرآنِ کریم آپ کو پکار رہا ہے اور کہہ رہا ہے :۔

(وجاھدوا فی اللہ حق جھادہ)	جہاد کرو اللہ کے راستہ میں جیسا کہ حق ہے اس کے راستہ میں جہاد کرنے کا۔

یہاں پر یہ دردناک حقیقت بھی سنتے جائیے کہ پچھلے دنوں ڈھاکہ میں حزبِ اختلاف کی آٹھ جماعتیں جمع ہوئیں اور ان کا اسلام پر اتفاق نہ ہو سکا چند سلبی چیزیں ان کے اتفاق و

ائتلاف کے نقطے بن سکیں لیکن نظامِ اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کالایا ہوا دین اتفاقی نقطہ نہ بن سکا۔

شروع میں میں نے آپ کے سامنے جو آیتِ کریمہ تلاوت کی ہے اس کے متعلق آپ جانتے ہوں گے کہ یہ آیت کس موقعہ پر نازل ہوئی؟ ذی الحجہ کا مہینہ تھا اور اس کی نویں تاریخ تھی، عرفہ کا دن تھا، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمرِ مبارک کا ۶۳ واں برس تھا، نبوت کا تیئیسواں سال تھا، جمعہ کا دن تھا، عصر کا وقت تھا، آپ اپنی اونٹنی قصویٰ پر سوار تھے مخاطبین میں ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، حسن، حسین رضی اللہ عنہم اور ایک لاکھ صحابہ موجود تھے، یہ ایک مجمع تھا کہ چشمِ فلک نے اس سے زیادہ مقدس، اس سے زیادہ پاکیزہ، اس سے زیادہ جاں نثار مجمع نہیں دیکھا اور نہ کبھی دیکھے گا، اسلامی تاریخ نے یہ سب کچھ محفوظ کر رکھا ہے اور اس طرح کہ اس سے زیادہ حفاظت کا تصور نہیں کیا جا سکتا، پھر مسلمانوں نے اپنے ہادیٔ برحق خاتم الأنبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپ کے انفاسِ قدسیہ کو تو اس طرح محفوظ کر رکھا ہے کہ کوئی قوم نہیں کر سکتی، آپ کی پاکیزہ زندگی کا ایک ایک لمحہ حدیث وسیرت میں محفوظ ہے۔

الغرض آیتِ کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ آج کے دن میں نے تمہارا وہ دین جس کا سلسلہ نہ صرف ۲۳ سال بلکہ ہزاروں سال پہلے حضرت آدم سے جاری تھا، مکمل وکامل کر دیا اور نعمت یعنی نعمتِ نبوت یا نعمتِ اسلام یا اللہ سے تعلق کو پورا کر دیا، اب دنیا میں تمہاری فلاح اور دنیا وآخرت دونوں میں تمہاری فلاح ونجات صرف دینِ اسلام سے وابستہ ہے تمہاری صلاح وفلاح کسی بھی ازم یا نظامِ حیات سے وابستہ نہیں ہے۔

غور فرمائیے: جب یہ آیت کریمہ اُتری ہے، اس وقت دنیا میں مختلف اور متعدد مذاہب اور نظامہائے حیات موجود تھے مختلف "ازم" موجود تھے جن سے دنیا آشنا تھی، آج جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے اس کی ابتدائی شکلیں اس وقت موجود تھیں لیکن ربِ کریم نے ان سب پر خطِ تنسیخ پھیر کر اسلام اور صرف اسلام کو ہماری خیر وفلاح کا ضامن ٹھہرایا ہے کیونکہ اس قانون کا بنانے والا ربّ العالمین، احکم الحاکمین، ارحم الراحمین ہے جس کی مدح وثناء ہم عاجز بندے کر ہی نہیں سکتے پھر نہ صرف یہ کہ اس نے اس دین کو پسند کیا بلکہ ساتھ

ہی ساتھ یہ بھی اعلان فرمایا :۔

((ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ وھو فی الآخرۃ من الخاسرین)) جو شخص اسلام کے علاوہ کسی نظام کو اپنا دین بنائے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں کی فہرست میں شمار ہوگا۔

کمالِ دین کا مطلب اور اس کے معنی

یہ بھی سمجھئے کہ کمالِ دین کا مطلب کیا ہے ؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دین میں عقائد، عبادات، احکام، معاملات، معاشرت، قانون صلح و جنگ، اقتصادیات، معاشیات، سیاسیات سب کچھ موجود ہو ورنہ اگر انسانی زندگی سے متعلق کوئی ایک شعبہ بھی نہ ہو تو وہ کامل نہیں ہوسکتا وہ ناقص اور محتاجِ تکمیل کہلائے گا۔

جب اللہ تعالےٰ اس دین کو کامل فرما رہے ہیں اور واقعتاً اس میں سب کچھ موجود ہے تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم امریکہ، روس یا چین سے کسی ازم کی بھیک مانگیں، درحقیقت کسی بھی دوسرے ازم سے بھیک مانگنا اور اسلام میں اس کا پیوند لگانا شرک فی الربوبیۃ ہے جو شرک کی بدترین قسم ہے اور جو شخص اس کو جائز سمجھتا ہے اس کو چاہیئے کہ وہ اپنے ایمان کی خیر منائے، نہ اس کا اللہ تعالےٰ پر ایمان ہے اور نہ آخرت پر۔

موجودہ حالات کے تحت اسلام کے معاشی نظام کی ترتیب و تنظیم زیرِ غور ہے، اللہ تعالیٰ توفیق دے تاکہ مثبت پہلو میں دین کا یہ نقشہ آپ کے سامنے آجائے۔

ساری ہی دنیا کا محور آج کل پیٹ کا مسئلہ ہے اسلام نے پیٹ کے مسئلہ کو حل کیا ہے لیکن اس کے پس منظر میں انسان کو حیوان سے اور جانوروں سے ممتاز کرنے کی غرض سے ایک مستقل نظامِ روحانیت یعنی عقائد و عبادات، اعمالِ صالحہ و اخلاقِ فاضلہ کو محفوظ رکھا ہے، اس کے برعکس امریکہ نے زراندوزی اور عیش کوشی کو ہی زندگی کا مقصد قرار دیا ہے، روس اور چین نے پیٹ کے مسئلہ کو جیسا تیسا حل کیا لیکن انسان کو جانور بنا کر ساری انسانی تکرمت اور توقیر چھین لی اور تمام اخلاقی اور روحانی اقدار کو پامال کر کے نرا حیوان بنا ڈالا، اسلام ہی وہ دینِ کامل ہے جس نے انسان کا صحیح مقام اس دنیا میں متعین کیا اور اس کو وہ نظامِ حیات دیا جو اس کے شایانِ شان ہے، اسلام میں صرف روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ جانوروں

کا نعرہ تو ہو سکتا ہے انسان کا نعرہ ہرگز نہیں ہو سکتا لہٰذا:۔

اسلام میں کسی بھی ازم کی گنجائش نہیں ہے نہ کیپٹل ازم کی نہ سوشلزم کی نہ نیشنلزم کی۔

آج ہمارے ملک میں جو مشکلات ہیں وہ معاذ اللہ اسلام کی پیدا کردہ ہرگز نہیں ہیں بلکہ لوگوں نے اسلامی نظام جس کے نام پر یہ ملک حاصل کیا تھا اس کو پس پشت ڈال کر اور مغربی سرمایہ دارانہ نظام کو اپنا کر یہ مشکلات خود پیدا کی ہیں، اس ملک میں اسلام کو ایک دن بھی اپنا معاشی نظام جاری کرنے کا موقعہ نہیں دیا گیا، اگر اسلام کے معاشی نظام کو یہاں جاری کیا جاتا تو اس کا امکان ہی نہیں تھا کہ ملک کی معاشی حالت اس درجہ پر پہنچتی اور یہ سوشلزم کے کافرانہ نعرے بلند ہوتے۔

اسلامی سوشلزم کا نعرہ

پھر ان سارے نعروں میں سب سے زیادہ دلچسپ یا تکلیف دہ نعرہ اسلامی سوشلزم کا ہے بھلا یہ بھی کوئی بات ہے یہ تو بالکل ایسا ہی ہے کہ کہا جائے "اسلامی دہریت" "اسلامی لادینی" "اسلامی شراب" "اسلامی قحبہ خانہ" بلکہ میرے نزدیک اسلامی سوشلزم اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے اس سے تو اسلام کے عقیدہ پر زد پڑتی ہے کہ دین مکمل نہیں ہے۔

اگر کوئی دین و ایمان سے کورا انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ موجودہ دور بدل گیا ہے اس لئے ہمیں نئے نظام کی ضرورت ہے تو ایسا شخص کافرانہ غلطی میں مبتلا ہے اور اس کا ایمان اللہ اور اس کے رسولِ برحق پر صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ قانون تو اللہ علیم و خبیر کا بنایا ہوا ہے جو قیامت تک آنے والی نسلوں، ان کے امراض و عوارض ان کی حاجات و ضروریات مرغوبات و میلانات کو جاننے والا تھا اور ہے، اس کا علم گذشتہ اور آئندہ سب پر محیط ہے اس کی قدرت کامل ہے، اس نے اپنے اس ابدی قانون میں اپنے علم اور قدرت دونوں کو سمو دیا ہے اب نہ کوئی قانون آنے والا ہے نہ کوئی نبی مبعوث ہونے والا ہے، اب ہماری ہدایت کے لئے یہی نسخہ کیمیا کافی و شافی ہے۔

اب اس وقت آپ کے سامنے کام کی ترتیب یہ ہے:۔

(الف) جہاد باللسان، یعنی زبان سے جہاد، علماء اس میں پہل کریں، آپ ان کی معاونت

کریں اور اپنے ماحول وگردوپیش میں اسلام کے لئے مسلسل کام کرتے رہیں۔

(ب) جہاد بالقلم جو شخص لکھنے کی قدرت وصلاحیت رکھتا ہے وہ ان فتنوں کے خلاف لکھے، اخبار نویس اخبارات میں مصنفین ومؤلفین رسائل وکتابوں میں۔

(ج) جہاد بالقوۃ یعنی ضرورت کے وقت اپنے دستِ بازو کی قوت کو کام میں لائیں اور ان فتنوں کی بیخ کنی کرکے ہی دم لیں۔

انشاء اللہ آپ مجھے اس کام میں پیچھے نہ پائیں گے آپ سپاہی ہوں گے اور میں آپ کا قائد، اسلام کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا، جلد ہی انشاء اللہ کچھ اور چیزیں اور پروگرام کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی، وآخر دعوانا اَن الحمد للہ رب العالمین۔

رحمتِ الٰہی کا ایک نفحہ (لہر)

۲۱ مارچ ۶۹ء جمعہ کو حسبِ معمول ایک مختصر سی تقریر کی تھی جو بعض حضرات نے ریکارڈ کرلی تھی اسی کا خلاصہ لبصائر وعبر کے لئے تجویز ہوا، اس درمیان میں ملکی حالات اور عوام میں انتشار واضطراب کی کیفیت ناگفتہ بہ ہوگئی خصوصاً مشرقی پاکستان میں تو خود غرض لیڈروں کی غلط قیادت سے ملک میں وہ روح فرسا اور دردناک صورت حال پیدا ہوگئی تھی جس کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، سنگ دلی اور بربریت ودرندگی کے وہ وحشت ناک مناظر پیش آئے جس کی نظیر تاریخ میں مشکل سے ملے گی، ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے ۲۵ مارچ کو سابق صدرِ مملکت کو توفیق عطا کی اور انہوں نے حیرت انگیز تدبیر کا ثبوت دیا اور ۲۵ مارچ ۶۹ء کو پورے ملک میں مارشل لاء نافذ کردیا، درحقیقت یہ حق تعالیٰ کی تکوینی مصلحت کا ظہور ہوا ہے جو تمام پاکستان کے لئے پیغام بن گیا ہے، اہلِ حق کی کوششوں کے لئے بھی سکون سے کام کرنے کا موقع مل گیا ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ تمام امور کے نتائج وعواقب بالخیر کرے۔

محرم الحرام ۱۳۸۹ھ

اسلامی حکومت اور اس کے اساسی قوانین

کون نہیں جانتا کہ اسلامی حکومت کے اساسی قوانین کیا ہیں؟ اور اس کے خدوخال کیسے ہوتے ہیں؟ کون سا ایسا مسلمان ہے جو اسلام کے بنیادی عقیدوں کو نہ جانتا ہو؟ مگر مسلمان کے لئے جہاں جاننا ضروری ہے وہاں ماننا بھی ضروری ہے۔ صرف جان لینے سے اسلام کی شہادت و سند نہیں مل سکتی۔ ابو طالب بھی اسلام کی حقانیت کا اقرار کر چکے تھے، عہدِ نبوت کے یہودی بھی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت بلکہ خاتم النبیین ہونے کو دل سے جانتے تھے جس پر وحیِ آسمانی و تعلیمات قرآنی کی تصریحات موجود ہیں لیکن باوجود جاننے کے مانتے نہیں تھے، اس لئے "مغضوب علیہم" کفار کی صفِ اول میں شمار ہوتے ہیں، الغرض جاننا اور پھر ماننا اسلام کی اولین شرط ہے، ماننے کے بعد عمل کرنا یہ اعلیٰ درجہ ہے۔

اسلام کیا ہے

"اسلام" کیا چیز ہے؟ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر (ذات میں ہو یا صفات میں یا افعال میں) ایمان لانا حضرت نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے پر ایمان لانا کہ آپؐ آخری نبی ہیں آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا اور اللہ تعالیٰ کے فرمانے سے اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے سے جو باتیں امت کو قطعی طور پر پہنچی ہیں جن کو علمی زبان میں "ضروریاتِ دین" کہا جاتا ہے ان سب کو بدل و جان تسلیم کر لینا۔ یہی خلاصہ ہے کہ کلمہ طیبہ کا جو اسلام کا پہلا کلمہ ہے۔ "لا الٰہ إلا اللہ محمدٌ رسول اللہ" یا دوسرا کلمہ شہادت ہے، اس کی یہ بھی تعبیر ہو سکتی ہے کہ "قرآن کریم پر ایمان لانا اور اس کو حق تعالیٰ کا آخری پیغام تسلیم کرنا اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس کی عملی تشریح کی ہے اسی طرز پر اس کو سمجھنا اور مان لینا۔" اسی طرح اس کی اور کئی طرح تعبیریں ہو سکتی ہیں، مثلاً یہ کہا جائے کہ "مسلمان وہ ہے جو قرآن کریم اور احادیثِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے" یا یہ کہا جائے کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دین کی باتیں بتلائی ہیں اور یقینی طور پر امت کو پہنچی ہیں" یا یہ کہ دینِ اسلام کی جتنی بنیادی باتیں ہیں ان پر ایمان لائے۔" یا یہ کہا جائے کہ "حق تعالیٰ کی الوہیت و توحید اور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت، نماز، روزہ، زکاۃ، حج وغیرہ پر ایمان لائے۔ یا یہ کہا جائے کہ "اللہ ورسول کی تمام ہدایات وتعلیمات پر ایمان لائے۔" یہ سب تعریفیں صحیح اور درست ہیں، صرف الفاظ وتعبیر کا اختلاف ہے۔

تعبیرات اور الفاظ کے اختلاف سے حقائق کا اختلاف سمجھنا یہ عناد ہے، یا جہل ہے یا پھر دونوں باتیں ہیں اب یہ کہنا کہ آج تک اسلام کی اتفاقی تعریف نہیں ہو سکی جو شخص یہ خیال کرتا ہے اس کا تو مطلب یہ ہے کہ اس کو اب تک اپنے ایمان واسلام پر یقین تو کجا اس کا علم بھی نہیں ہے، پاکستان کے ایک سابق جج کی رسوائے عالم رپورٹ میں جو کوشش کی گئی تھی اس کا تو مقصد یہی تھا کہ تعبیر کے اختلاف کا فائدہ اٹھا کر کافروں کو مسلمان ثابت کیا جاسکے۔ "إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون"۔

اسلامی حکومت کسے کہتے ہیں اب اسلامی حکومت وہی ہو گی جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے اور بتائے ہوئے احکامات کو نافذ کرے اور حکومت کی طاقت سے جاری کرے اور اس قسم کی کافرانہ رپورٹوں اور فیصلوں کے لئے اس میں کوئی جگہ نہ ہو اور اس میں اسلامی حکومت کا عنوانِ دستور یہی ہو گا کہ "حکومت کا مذہب دینِ اسلام ہو گا۔" آج تک جتنی اسلامی حکومتیں ہیں ان کے دستور کی پہلی دفعہ یہی ہے نہ ہمارا مزاج سیاسی ہے اور نہ ہمارے ماہنامے "بینات" کا موضوع سیاست ہے۔ بحیثیت ایک مسلمان اور بحیثیت ایک خادمِ دین ہم اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہمارا یہ ملک پاکستان اب تک کیوں اسلامی مملکت نہیں بن سکا بلکہ فقہی حیثیت سے اس کو "دارالاسلام" کہنا بھی مشکل ہے، اس لئے اگرچہ قدرت قانونِ اسلام جاری کرنے کی بظاہر موجود ہے (بظاہر اس لئے کہتا ہوں کہ شاید یہ خیال بھی صحیح نہ ہو بلکہ اندر اس جسدِ عنصر کو حرکت دینے والی کوئی خارجی روح مخفی ہو جو ہمیں نظر نہ آتی ہو، خیر ہم تو ظاہر کو جانتے ہیں باطن اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے بہر حال یہ قدرت اگرچہ ہے) لیکن اس قدرت سے نہ صرف یہ کہ احکاماتِ اسلام اور تعلیماتِ اسلام کو جاری نہیں کیا گیا بلکہ طرح طرح کی مشکلات وعقبات پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، متحدہ ہندوستان بلاشبہ علمی وفقہی اصطلاح

سے "دارالکفر" تھا، تقسیمِ ملک کے بعد وہ حصہ بالاتفاق دارالکفر رہا خصوصاً جب وہاں یہ اعلان بھی کر دیا گیا کہ "سیکولر" (لادینی) حکومت ہوگی۔ یہاں صرف اعلان تو نہیں کیا گیا لیکن عملاً کوئی فرق نہیں رہا بلکہ یہاں کفر و ارتداد کے ساتھ وہاں سے زیادہ رواداری برتی گئی۔ وہاں عیسائی مشنریوں کو کسی ہندوستان کے باشندے کو مسلمان ہو یا ہندو، عیسائی بنانے کی اجازت نہیں لیکن ہمارے ملک میں عیسائیوں کو عیسائی بنانے کی کھلی اجازت دی گئی اور سب سے زیادہ کسی مسلمان ملک میں اگر عیسائیت کی حوصلہ افزائی ہوئی تو ہمارا ملک ہے۔
اگر حکومت کا مذہب اسلام ہوتا تو کسی کو عیسائی بنانے کی کیا مجال تھی، تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں، اس ملک میں نہ صرف یہ کہ زنا کرنا جرم نہیں بلکہ اس کے لائسنس دئے جاتے ہیں، شراب پینا عام ہے، سودی کاروبار پر تمام زندگی کا ڈھانچہ قائم ہے، چور کے ہاتھ نہیں کاٹے جاتے، کوئی شرعی قانون نافذ نہیں بلکہ اسلام کو چھوڑ کر مرتد ہو جانا بھی جرم نہیں، حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین نہ سمجھنا بھی جرم نہیں بلکہ ملک کے اندر اور باہر حکومت کی اعانت و امداد سے قادیانیت کی دعوت و تبلیغ جاری ہے، اس ملک میں قرآنِ کریم کو برملا محرف کہا جاتا ہے، اکابرِ صحابہ پر تبرا بھیجا جاتا ہے۔
جس ملک میں زنا، شراب، سود، جوئے اور بیمے کا عام رواج ہو جس ملک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی و رسول نہ سمجھا جاتا ہو بلکہ جھوٹے مدعیانِ نبوت کو ماننے والے بیشتر کلیدی آسامیوں پر فائز ہوں، جس ملک میں ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ پر معاذ اللہ سب و شتم ہوتا ہو جہاں علمی و نظریاتی طور پر تمام بنیادی مسائل کو مجروح کیا جاتا ہو جہاں ہر کفر و الحاد کی نہ صرف اجازت ہو بلکہ اس کی پرورش ہوتی ہے جس ملک میں، ہر بے حیائی کو فروغ دیا جاتا ہو اور جہاں اسلام کے عادلانہ قانون کے مطابق نہ کسی کی جان محفوظ ہو نہ آبرو محفوظ ہو، نہ مال محفوظ ہو کیا وہ "دارالاسلام" ہے؟ کیا یہی اسلامی مملکت ہے! کیا پاکستان میں، ان کے سوا اور بھی کچھ ہے؟ کیا انہی چیزوں کی خاطر اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کرے؟

آج آسمان سر پر اٹھایا جاتا ہے، شادیانے بجتے ہیں اور شور برپا ہے کہ قومی اسمبلی قائم ہوگئی اور عبوری آئین نافذ ہو گیا، عبوری آئین جیسا کچھ ہے سب کے سامنے آچکا ہے، نہ معلوم مستقل آئین بھی (اگر بنا تو) اسی نوعیت کا ہوگا یا اس سے کچھ مختلف ؟. تاہم عبوری آئینہ میں مستقل آئین کے خدوخال نظر آرہے ہیں :

"قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا"

ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ لاکھ جمہوریت بحال کردی جائے مگر جب تک صاف اعلان نہیں کر دیا جاتا کہ حکومت کا مذہب اسلام ہوگا، اس ملک میں کسی کو مرتد بننے اور بنانے کی اجازت نہیں ہوگی، صدرِ مملکت (اور کلیدی اہمیت کے دیگر مناصب) کے لئے مسلمان ہونا لازمی شرط ہوگی. اسلامی احکام کا اجراء ہوگا، تمام شرعی تعزیریں نافذ کی جائیں گی، شراب ممنوع، زنا حرام اور سودی کاروبار بند ہوگا، قمار اور جوئے کی اجازت نہیں ہوگی، شراب نوشی اور عصمت دری پر شرعی سزائیں جاری کی جائیں گی، چور کے ہاتھ کاٹے جائیں گے، سرکاری مدارس میں اسلامی تعلیم لازمی ہوگی، عیسائی اسکولوں میں مسلمانوں کے بچوں کو انجیل کی تعلیم ممنوع ہوگی، جو لوگ حضرت ختمی مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی "ختم نبوت" کا انکار کرتے یا اس میں تاویل کرتے ہیں ان کے فرقہ کو مسلمانوں سے الگ ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے گا وغیرہ وغیرہ.

الغرض اسلامی شعائر کی بہت سی باتیں جن کو ہر مسلمان جانتا ہے اور جن سے کسی اسلامی مملکت کے خدوخال ہر شخص کو نظر آسکتے ہیں جب تک صاف دل ودماغ سے ان باتوں کو نہیں اپنایا جاتا اسلامی حکومت نہیں ہوگی، کسی اسلامی حکومت کی واضح علامت یہ ہے کہ وہ اسلامی شعائر کو بلند کرے اور کفر کے شعائر کو مٹائے، اس کے بغیر چاہے چار دانگ عالم میں اس امر کا اعلان کیا جائے کہ یہ اسلامی مملکت ہے، یہ دعویٰ ان حقائق کی روشنی میں نفاق ہے، دھوکا ہے، آنکھوں میں مٹی ڈالنے کے مترادف ہے اور خدا تعالیٰ اور خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکا دینا ہے.

صرف جمعیت علمائے اسلام کے ایک آدھ وزیر ہونے سے یا مفتی محمود اور مولانا

غلام غوث ہزاروی جیسے حضرات کے رکن اسمبلی بن جانے سے یہ ملک اسلامی نہیں بن سکتا، جہاں خدا اور رسولؐ کی تعلیمات کو جمہوری ووٹنگ سے طے کیا جائے اور جہاں قرآن وسنت کے صریح احکام بھی اکثریت واقلیت کے فیصلے کے رہینِ منت ہوں اس نقارخانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے؟ جمہوری فیصلوں کا دائرہ صرف انتظامی معاملات تک محدود ہے اور یہیں تک محدود رہنا چاہیئے، قرآنی تعلیمات اور اسلامی ہدایات اور قوانین واحکام کے سامنے ان کی کیا وقعت ہے؟

اسلامی مملکت کا دستوری ڈھانچہ

حکومت وسلطنت اگر مسلمانوں کے زیر اقتدار آئے تو ان کا طرزِ عمل کیا ہوگا؟ اور وہ اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہوئے کن چیزوں کو بروئے کار لائیں گے؟ اس سلسلہ میں قرآنِ حکیم نے چار باتوں کا ذکر کیا ہے: اقامتِ الصلاۃ (نمازوں کی پابندی) ایتاءِ زکاۃ (نظامِ زکاۃ کا قائم کرنا) امر بالمعروف (نیک کاموں کا حکم کرنا) نہی عن المنکر (برے کاموں سے منع کرنا) چنانچہ ارشاد ہے:-

(اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ.

(الحج ع ۶)

وہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دے دیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکاۃ دیں اور نیک کاموں کے کرنے کو کہیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے اختیار میں ہے (بیان القرآن)

یہی وہ "بنیادی نکات" ہیں جن پر اسلامی مملکت کا دستوری ڈھانچہ مرتب ہوگا، یہی وہ محور ہے جس کے گرد مسلمانوں کا نظم مملکت گردش کرے گا، یہی وہ روح ہے جو اسلامی حکومت کے ایک ایک شعبہ میں جاری وساری ہوگی اور یہی وہ اساسی مقاصد ہیں جنہیں اسلامی حکومت اپنے لئے نصب العین قرار دے گی، بلاشبہ اسلامی حکومت کو سینکڑوں قسم کے سیاسی مصالح، معاشرتی مسائل اور وقتی تقاضوں کا سامنا کرنا ہوگا لیکن وہ اس امر کی شدت سے پابند رہے گی کہ اس کا کوئی اقدام ان بنیادی اصولوں سے متصادم نہ ہو۔

مسلمان حکمران کے شرائط

مختصر یہ کہ ایک مسلمان حکمران کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ خود صالح، متقی اور خدا ترس ہو، اور کتاب و سنت کے بیان کردہ اصولوں کے مطابق تمام معاشرے کی اصلاح کر کے انہیں صالح اور خدا ترس بنائے، خود صالح ہونا اور دوسروں کو صالح بنانا یہ ہے اسلامی حکومت کا اساسی اصول، اس کی علمی تفصیلات کتاب و سنت میں محفوظ ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام ؓ کی اسی نہج پر تربیت فرمائی اور خلافتِ راشدہ کے بابرکت اور زرین عہد میں اس کا مثالی نمونہ عملی طور پر ظہور پذیر ہوا یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم کی ایک دوسری آیت میں اللہ تعالےٰ کی اطاعت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے بعد اولی الامر کی اطاعت کو بھی لازم قرار دیا گیا:۔

«وأطیعوا اللہ وأطیعوا الرسول وأولی الأمر منکم»[1] (اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں (از شیخ الہند)

لفظ "منکم" میں بتلا دیا گیا کہ اسلامی حکومت کے سربراہ کا مسلمان اور مومن ہونا شرط ہے، یعنی اس کی اطاعت اس وقت لازم ہوگی جب کہ وہ حق تعالےٰ کے احکام کا مطیع اور فرمانبردار ہو اور اگر وہ اللہ تعالےٰ سے باغی ہو جائے اس کے احکام سے سرتابی کرے اور اسلام کا زرین تاج اپنے سر سے اتار پھینکے تو اس کی اطاعت کا سوال باقی نہیں رہتا: «لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق»

اولی الامر کا اصل مصداق تو خلفاءِ راشدین ہیں جن میں صفاتِ جہانبانی کے ساتھ تفقہ فی الدین کا وصف بھی موجود تھا، وہ خلفاء بھی تھے اور فقہاء بھی، حاکم بھی تھے اور عالم بھی، اس لئے اولی الامر کی تنقیح میں علماءِ تفسیر کا اختلاف ہوا کہ اس سے مراد امراء و خلفاء ہیں یا علماء و فقہاء؟ ظاہر ہے علمی و دینی اعتبار سے فقہاء و علماء اس کا مصداق ہیں اور احکامِ خداوندی کو جاری اور نافذ کرنے کی طاقت و قوت اربابِ اقتدار کے پاس ہوتی ہے، اب اگر کسی شخصیت میں تفقہ فی الدین اور اقتدار کی دونوں صفات جمع ہو جائیں جیسا کہ خلفاءِ راشدین میں جمع تھیں تو اس کا وجود سراپا رحمت ہے لیکن جب یہ دونوں صفات کسی ایک ہستی میں جمع نہ ہوں

---

[1] النساء

توضروری ہوگا کہ حکومت دونوں قسم کے رجال کو جمع کرے جن میں مقتدر حکام بھی ہوں اور دین کی صحیح بصیرت رکھنے والے اصحابِ تفقہ بھی۔

خلافتِ راشدہ کا بابرکت دور علم و عمل، صلاح و تقویٰ، فقر و زہد، ایثار و قربانی اور اخوت و مساوات کے لحاظ سے انسانیت کا تابناک دور تھا، جس کے آثار و برکات نے عرصہ دراز تک دنیا کو منور رکھا۔

دینی مدارس اور ان کے ثمرات و اثرات

بعد کے دور میں مسلمان حکمرانوں کی عملی زندگی اگرچہ مجروح ہوتی چلی گئی تاہم اعتقادی پہلو ہمیشہ محفوظ رہا اور امت کی اصلاح اور دینی تقاضوں کی بجاآوری کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام بھی اپنے صحیح طریق کار اور تسلسل کے ساتھ جاری رہا، آج بھی، جبکہ اسلامی حکومت کے دھندلے نقوش بھی تدریجاً مٹتے چلے جارہے ہیں، "ھیئۃ الأمر بالمعروف والنھی عن المنکر" کے ادارے تھوڑا بہت کام کر رہے ہیں، مسلم حکمرانوں کی عملی زندگی سے قطع نظر یہ بات بالکل صاف ہے کہ اسلامی تاریخ کے سابقہ ادوار میں اسلامی قوانین سے عداوت اور بغض و عناد کا کہیں پتہ نہیں چلتا، البتہ آخری دور میں اس کا ظہور ٹرکی میں ہوا، خلافتِ اسلامیہ کے الغاء کے بعد جو قیادت ابھری اس نے اسلامی احکام سے علانیہ عداوت کا مظاہرہ کیا، یہاں اس ناخوشگوار بحث کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں، اس کے بعد دوسرے اسلامی ممالک میں بھی اس کا اثر پھیلتا گیا، تاہم بہت سے شعائرِ اسلام کا احترام اب تک بیشتر ممالک میں باقی ہے، ان ممالک کی بنیادی خرابی یہ تھی کہ امر بالمعروف کے اداروں کی سرپرستی مدارس و معاہد کی تاسیس اور مساجد کی تعمیر حکمرانوں کے فرائض میں شامل سمجھی جاتی تھی اور عامۃ المسلمین اس فریضہ سے سبکدوش ہوچکے تھے، جب ان حکمرانوں نے دین اور دینی مسائل سے غفلت یا عداوت کا رویہ اختیار کیا تو ان ممالک میں دین بے سہارا ہوکر رہ گیا، اس کی بنیادیں گرنے لگیں اور کوئی مؤثر قوت ایسی نہ رہی جو آگے بڑھ کر اسے سنبھالا دیتی۔

البتہ متحدہ ہندوستان اس خصوصیت میں منفرد ہے جو محض حق تعالیٰ کی عنایت کا ثمرہ ہے کہ یہاں جب مسلمان حکمران ختم ہوئے اور نظامِ اقتدار کفر کے ہاتھ آیا تو اس موقعہ پر اکابرِ

امت کی فراست نے محسوس کیا کہ شعائرِ دین کی بقاء، دینی اداروں کی تاسیس، مساجد و مدارس کی تعمیر کے لئے اگر عام مسلمانوں کو تربیت نہ دی گئی اور تعلیم و تربیت، فتویٰ و قضاء اور امامت وخطابت کے مناصب کا بطورِ خاص انتظام نہ کیا گیا تو اس خطہ میں اسلام باقی نہیں رہے گا، حق تعالیٰ نے ان کی مبارک توجہات کو بارآور فرمایا، عام مسلمانوں میں حفاظتِ دین کا جذبہ بیدار رہا اور اعدادِ دین کی دسیسہ کاریوں کے علی الرغم دین جوں کا توں محفوظ رہا۔

اربابِ اقتدار کے غلط رُخ اختیار کرنے کی ایک مثال

تقسیم ہند کے بعد بھی یہ سلسلہ رُکا نہیں بلکہ آگے بڑھا، ہند و پاک کے دین پسند عوام کی توجہ سے دینی فضا قائم رہی، قیام پاکستان کے بعد اگر یہاں کے حکمران اخلاص سے دینی نظام کو نافذ کرنے کا تجربہ کرنا چاہتے تو اس کے لئے ماحول کافی حد تک سازگار تھا اور یہ تجربہ پورے عالم میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا ذریعہ ثابت ہوتا اور آج کی دکھی انسانیت کے لئے رحمت کا پیغام بنتا، لیکن بدقسمتی سے یہاں کے حکمرانوں کو صحیح رُخ اختیار کرنے کی توفیق نہ ہوئی، ان کا طرزِ عمل بتدریج بگڑتا چلا گیا، دین سے انحراف کا راستہ اختیار کر لیا، موجودہ حکومت کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ اس نے لادینی نظام کو جہل یا عناد کی بنا پر تمام قوم پر مسلط کر دینے کی کوشش کی، "ملّا" لوگ تو خیر ان حقائق کو واشگاف کرنے میں ہمیشہ مصروف رہے مگر کرشمۂ قدرت دیکھئے کہ اب سرکاری مسلم لیگ کی ہائی کمان نے بھی امت کی ہمنوائی کی ہے، روزنامہ جنگ ۷، فروری کی اطلاع کے مطابق مسلم لیگ ہائی کمان کی پارلیمانی پارٹی کی مقرر کردہ ۲۵ رکنی جائزہ کمیٹی نے اعتراف کیا ہے کہ عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء کے ایکٹ نے عوام کے مختلف طبقات میں حکومت سے منافرت پیدا کی، عوام حکومت سے دور ہو گئے اور علماء کے احساسات و جذبات ان قوانین سے مجروح ہوئے، علمائے امت پہلے دن سے یہ واضح کرتے رہے کہ یہ قوانین کتاب و سنت کے منافی ہیں ان سے معاشرتی الجھنیں ختم نہیں ہوں گی بلکہ ان میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا لیکن اربابِ اقتدار اسے "چند ملاؤں کا شور و غوغا" کہہ کر ٹالتے رہے، مقامِ شکر ہے کہ اب پاکستان مسلم لیگ نے بھی بزعمِ خود پاکستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت تسلیم کر لیا کہ ملاؤں کا اندیشہ غلط نہیں تھا۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

دینی اعتبار سے ہمارے اربابِ اقتدار کے غلط رُخ اختیار کرنے کی یہ صرف ایک مثال ہے حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

یا أبا عبیدة! إذا طلبت العزة بالله أعزك الله، وإذا طلبت العزة بغیر الله أذلك الله۔	ابو عبیدہ! جب تم اللہ تعالیٰ کے ذریعہ عزت چاہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں باعزت کرے گا اور جب تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کے ذریعہ عزت طلب کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ذلیل کرے گا۔

موجودہ حکومت نے اپنے خیال میں عوام کی رضامندی کے لئے اللہ کے قانون سے انحراف کیا تھا اس کے تکوینی نتائج ظاہر ہو کر رہے۔

قل اللھم مالك الملك تؤتی الملك من تشاء و تنزع الملك ممن تشاء، و تعز من تشاء و تذل من تشاء بیدك الخیر إنك علیٰ كل شیء قدیر۔

ذی الحجہ ۱۳۹۸ھ

اسلامی آئین اور آئین پاکستان

بیتابی سے نگاہیں منتظر تھیں کہ پاکستان کا جمہوری آئین تیار ہو کر سامنے آئے آخر شدید د مزید انتظار کے بعد وہ منصۂ شہود پر آ ہی گیا بلاشبہ دورِ حاضر میں کسی مملکت کے صحیح خدوخال اور حقیقی حسن و جمال اس ملک کے آئین ہی سے عیاں ہوتے ہیں۔

پاکستان کے وجود میں آنے سے قبل سے لے کر آج تک تمام مسلمانوں کا یہی تصور بلکہ عقیدہ رہا ہے کہ پاکستان کا آئین صحیح اسلامی آئین ہوگا، صحیح اسلامی دستور ہوگا، صحیح اسلامی قانون ہوگا، صحیح اسلامی نظام کا مظہر ہوگا اور اس کے بابرکت سایۂ عاطفت میں امیر و فقیر یکساں طور پر زندگی بسر کریں گے اور آج بھی باوجود خرابی بسیار، تمام امت کی یہی خواہش ہے، یہی تمنا ہے اور یہی تڑپ ہے، موجودہ حکمران بھی مسلسل یہی اطمینان دلاتے رہے ہیں اور اسی بنا پر خیال تھا کہ پارٹی بندی کے سطحی اصول اور فرقہ وارانہ سیاست کی کشمکش سے بالاتر ہو کر یہ دیرینہ آرزوؤں کا گلدستہ قوم کے سامنے لایا جائے گا جس کی خوشبو دماغوں کو معطر کرے گی اور موجودہ حکمرانوں کا یہ کارنامہ تمام عالمِ اسلام سے خراجِ تحسین حاصل کرے گا لیکن وائے ناکامی کہ قومی اسمبلی کی آئین سازی کی جو صورت اس وقت تک سامنے آئی ہے وہ نہ صرف یہ کہ کچھ زیادہ امید افزاء نہیں بلکہ انتہائی مایوس کن ہے۔ یہ مانا کہ کچھ جاذبِ نظر اور جاذبِ توجہ اچھے اچھے عنوانات، عمدہ عمدہ تعبیرات، جگہ جگہ اسلام کا نام جگہ جگہ قرآن و سنت کا نام لیا جا رہا ہے اور ممکن ہے کہ ظاہر بین نگاہیں اس پر انتہائی خوش ہوں گی کہ ماشاء اللہ چشم بددور کیا عمدہ اسلامی آئین قوم کو دیا گیا ہے قدم قدم پر شاندار سفارشات، اسلامی رنگ میں ڈوبے ہوئے کلمات، بلکہ کہیں کہیں تو شبہ ہوتا ہے کہ اچھا خاصہ وعظ کیا گیا ہے گویا حکومت بھی ماشاء اللہ بجائے حکمران بننے کے نصیحت و وعظ پر اتر آئی ہے لیکن غور کرنے کے بعد چند انتظامی امور اور چند پاکیزہ عنوانات اور اسلامی تعبیرات کے علاوہ سابقہ آئینوں میں اور اس آئین میں کوئی بنیادی فرق نظر نہیں آتا۔ ان صفحات کا دامن ان تفصیلات کو برداشت نہیں کر سکتا، لکھنے والے بہت کچھ لکھ بھی چکے ہیں افسوس اور صد افسوس۔

ع ما خانہ رسید گانے ظلمیم
پیغامِ خوش از دیارِ ما نیست

اسلامی آئین کسے کہتے ہیں

ہم تو اسلامی آئین اسی کو سمجھتے ہیں جس میں تمام اسلامی شعائر کی حفاظت ہو اور تمام اسلامی قوانین کا اجرا، اس کا طرۂ امتیاز ہو اس آئین کی روشنی میں خود بخود ایسے اسلامی قوانین نافذ ہوں کہ ان کو دیکھ کر ہر شخص بآسانی فیصلہ کر سکے کہ یہ ہے اسلامی آئین اور یہ ہے اسلامی مملکت! جس آئین کے زیرِ سایہ بدستور شراب خانے قائم رہیں، چکلے موجود رہیں، نہ کسی چور کا ہاتھ کاٹا جائے، نہ زنا کی شرعی سزائیں رجم کرنا اور دُرّے لگانا جاری ہوں، سود و قمار کا بازار بدستور گرم ہو، بیمہ و انشورنس کی ترغیبات و اشتہارات بدستور شائع ہوں، حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین تسلیم کرنا ضروری نہ ہو، حضرت صدیقِ اکبر اور حضرت عمرِ فاروق کو گالیاں دی جا سکیں، جو چاہے مرتد ہو جائے، جو چاہے عیسائی ہو جائے، جو چاہے روزہ رکھے جو چاہے روزہ نہ رکھے، ہر لڑکی چاہے سرِ بازار ننگی ہو جائے اور مرد چاہے سرِ راہ شراب پی کر ناچے، نہ کوئی محاسبہ ہو نہ کوئی احتساب نہ باز پرس، جس کے تحت بے حیائی و عریانی کا سیلاب ہر طرف موجزن نظر آئے تو اسلام سے کیا تعلق اس آئین کا اور کیا رابطہ اس دستور کا؟ اگر کوئی کراچی اور لاہور کے بازاروں میں جا کر ہوشربا مناظر دیکھے یا کلفٹن و ہاکس بے جا کر حیا سوز مناظر دیکھے تو پیرس و لندن اور کراچی میں اس کو کیا فرق نظر آ سکتا ہے، سوائے انیس بیس کے فرق کے۔

اسمبلی میں جو چند اسلامی ترمیمات پیش کی جا سکیں ان کو بھی صرف اس لئے ٹھکرا دیا گیا کہ یہ ترمیمیں حزبِ اختلاف کی طرف سے آئی ہیں، حزبِ اقتدار کے لئے ان کو قبول کرنا توہین کے مترادف ہے یا یہ اکثریت کی رائے کے خلاف ہیں یا پارٹی کے اصولوں کے مخالف ہیں جہاں اسلامی تجاویز کے ردّ و قبول کا مدار اکثریت و اقلیت کے اصول پر ہو کر اس کو اسلامی ملک کہنا خود اپنے منہ پر طمانچہ مارنے کے مترادف ہے۔

اسمبلی کا فرضِ منصبی

درحقیقت اسمبلی کو شرعی مسائل میں توڑ لئے زنی کا حق نہیں ہے اس کا فرضِ منصبی تو صرف اتنا ہے کہ ان احکام کو ملک میں نافذ کرائے، دراصل اس قومی اسمبلی کا قانون ساز اسمبلی نام رکھنا ہی اسلامی اصول کے منافی ہے یہ نام تو اس سرزمین سے آیا ہے جہاں حاکمیتِ غیر اللہ کی بنیاد رکھی گئی ہے، اسلام میں حاکمیت و اقتدار صرف حق تعالیٰ کا حق ہے یا پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حق تعالیٰ کی طرف سے دینِ اسلام کی ترجمانی پر مامور ہیں اسمبلی کا دائرہ اختیار اسلامی اصول کے پیشِ نظر صرف تنفیذِ احکامِ شرعیہ کے انتظامی معاملات تک محدود ہے اللہ و رسول کے حکم اور فیصلہ کے بعد اس کے لئے سوائے تسلیم و انقیاد کے اور کوئی چارہ کار نہیں۔

اسلامی سوشلزم

عجیب تماشا ہے ایک طرف تو اسلام کا نام لیا جارہا ہے اور ایک ہی سانس میں اس کے ساتھ سوشلزم کا نام بھی لیا جاتا ہے اور عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے سوشلزم کے ساتھ "اسلامی" کا پیوند لگایا جاتا ہے اور "اسلامی سوشلزم" کی پُر فریب تعبیر اختیار کی جاتی ہے "اسلام" کے ساتھ تو کسی بھی پیوند لگانے کی ضرورت ہی نہیں، اسلام ایک کامل و مکمل نظامِ حیات ہے جس میں عبادات، معاملات، اقتصادیات، معاشیات اور معاشرت و معیشت کی تمام چیزیں خود بخود آجاتی ہیں، دراصل اس کفر کو چھپانے کے لئے یہ دھوکا دیا جاتا ہے اور پیوند کاری کی جاتی ہے تاکہ کمیونزم کے لئے زمین ہموار کی جائے اور کل کمیونزم کا نام اسلامی کمیونزم رکھا جاسکے، میں اسلامی سوشلزم پر کوئی فتویٰ تو نہیں لگانا چاہتا لیکن یہ واضح کردینا ضرور چاہتا ہوں کہ اسلامی تعبیرات کو چھوڑ کر اس قسم کی فریب کارانہ تعبیرات کو اختیار کرنا یقیناً کسی خطرناک فتنہ کی غمازی ضرور کرتا ہے ؎

حاجتِ مشاطہ نیست روئے دلارام را

مساواتِ محمدی

اسی طرح "محمدی مساوات" کی تعبیر بھی سراسر فریب ہے آخر عوام کو کون سی مساوات سمجھانا ہے؟ اسلام میں تو حقیقی مساوات یہ ہے کہ قانون کی گرفت کے لئے امیر و غریب کا کوئی فرق نہیں ہے، یہ مقصد تو ہرگز نہیں کہ تمام افراد

کو معیشت میں یکسانیت نصیب ہو، صدرِ مملکت اور کارخانے کا مزدور ایک حالت میں ہوں۔
یہ مساوات تو روس اور اس کے ہمنوا کمیونسٹ ممالک میں بھی موجود نہیں ہے، پھر اس پُر فریب
لفظ کو زبان وقلم پر لانے کا اور بار بار اعلان کرنے کا کیا مقصد ہے! درحقیقت ہمارے عوام
کو فریب دے کر اپنا اُلو سیدھا کیا جارہا ہے، الغرض جس آئین کے آئینہ میں یہ پُر فریب
چہرے دکھائی دیتے ہوں اُسے اسلام سے کیا نسبت ہوسکتی ہے، اللہ تعالیٰ صحیح نیت عطا
فرمائے اور دلوں کی اصلاح فرماکر اس نفاق کو ختم کرائے، اس سے بڑھ کر اسلام کی بے کسی اور بے بسی
اور کیا ہوسکتی ہے کہ ملک سے غداری تو شدید ترین جرم ہو اور اس کا مرتکب شدید ترین سزا کا
مستحق ہو اور اسلام سے غداری کی کھلی چھٹی ہو کہ جو چاہے اور جب چاہے اسلام کو چھوڑ کر کوئی بھی
دوسرا مذہب اختیار کرسکتا ہے، اسی طرح اگر کوئی قانون "بنیادی حقوق" کے خلاف نافذ ہوجائے
تو سپریم کورٹ میں اس کو چیلنج کرنے کا اختیار تو ہر شہری کو حاصل ہو لیکن اگر کوئی قانون قرآن و
حدیث کے خلاف نافذ ہوجائے تو اس کے خلاف مرافعہ دائر کرنے کا حق بڑی سے بڑی عدالت
میں بھی کسی بھی مسلمان کو حاصل نہ ہو اس کے باوجود حزبِ اقتدار اور اکثریتی پارٹی کا یہ کہنا کہ
"ہم کیا مسلمان نہیں ہیں" کس قدر شرمناک ہے تف ہے ایسی مسلمانی پر۔

مسودہ دستورِ پاکستان اور اربابِ علم وفکر کی تجاویزات و ترمیمات

مسودۂ دستور سامنے آنے کے بعد اربابِ علم اور اہلِ فکر کی ایک مجلس میں اس پر غور کیا
گیا اور چند ترمیمات تجویز کی گئیں لیکن جہاں خود ارکانِ اسمبلی کی تجاویز صرف اس وجہ سے کہ وہ
اقلیت میں ہیں یا حزبِ مخالف کی رائے ہے قبول نہیں کی جاسکتیں وہاں چند اربابِ علم وفکر کی
تجویزیں کیا درخورِ اعتناء سمجھی جاسکتی ہیں لیکن صرف اتمامِ حجت کے لئے چند حضرات نے اپنے اپنے
تصدیقی دستخطوں کے ساتھ ان مطبوعہ تجاویز کو ہر ایک رکن کے نام بذریعہ ڈاک ارسال کردیا
ہے نامناسب نہ ہوگا کہ "بینات" کے صفحات پر بھی ان ترمیمات کو شائع کردیا جائے جو مکتوب
ان تجاویز کے ساتھ بھیجا گیا ہے وہ بھی شائع کیا جاتا ہے ان ترمیمات پر حضرت مولانا مفتی محمد
شفیع صاحب، حضرت مولانا پیر محمد ہاشم مجددی، جناب الٰہی بخش سابق وزیرِ اعلیٰ سندھ اور

راقم الحروف[1] کے دستخط بھی ہیں وہ مکتوب اور تجاویز یہ ہیں :۔

محترمی و مکرمی ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

آج کل اسمبلی میں مسودۂ دستور پر بحث جاری ہے ہم نے پوری غیر جانب داری کے ساتھ اس مسودے کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ جہاں اس میں بعض امور اسلامی نقطۂ نظر سے قابلِ اطمینان ہیں وہاں بعض بنیادی امور کی اصلاح بھی بے حد ضروری ہے۔ ذیل میں ہم چند بنیادی امور کی مختصر نشاندہی کر رہے ہیں، ایک اسلامی مملکت کے رکنِ اسمبلی ہونے کی حیثیت سے یہ آپ کا دینی فریضہ ہے کہ ان نکات کے مطابق دستور میں ترمیم کرانے کی کوشش کریں، آپ کا تعلق حزبِ اقتدار سے ہو یا حزبِ اختلاف سے لیکن حزبِ اسلام سے ضرور ہو گا، امید ہے کہ آپ اپنی ذمہ داری کو محسوس فرمائیں گے اور ان چند خالص دینی اور قطعی غیر سیاسی امور میں صرف اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے حق کی حمایت کریں گے، انشاء اللہ آپ کی یہ کوشش آپ کے لئے فلاحِ دارین کا سبب ہو گی۔

اللہ تعالےٰ حق کے راستے میں آپ کی مدد فرمائے۔

تجاویز و ترمیمات

۱۔ دفعہ نمبر ۲۲۷ میں ذیلی فقرہ ۲ حذف کر کے اس کی جگہ یہ عبارت بڑھائی جائے :۔

" اگر کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نافذ ہو جائے تو ہر شہری کو حق ہو گا کہ وہ اسے خلافِ اسلام ہونے کی بنیاد پر سپریم کورٹ میں چیلنج کرے اور ایسے اعتراضات کی سماعت کا اختیار سپریم کورٹ میں صرف ایک خصوصی بنچ کو ہو گا جسے صدر اس مقصد کے تحت نامزد کرے گا اور جس کے ارکان کی اہلیت کے لئے وہی شرائط معتبر ہوں گی جو دفعہ نمبر ۲۲۸ ذیلی فقرہ نمبر ۳ میں اسلامی کونسل کے ارکان کے

[1] افسوس علماء و مجاہدین، ارباب علم و فکر، تقویٰ و ورع کا یہ قافلہ عالم آخرت کی طرف سفر کر گیا، صالحین ایک ایک کر کے یکے بعد دیگرے اٹھتے جا رہے ہیں لیکن الحمد للہ ان حضرات کے مجاہدے اور محنت کے ثمرات باقی ہیں اور رہتی دنیا تک باقی رہیں گے۔ اللہ تعالےٰ امت کو توفیق عطا فرمائے۔

لئے مقرر کی گئی ہیں۔"

۲۔ دفعہ نمبر ۲۲۸ ذیلی فقرہ ۳ شق (ب) میں اسلامی کونسل کے صرف چار ارکان کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ کم از کم پندرہ سال تک اسلامی تعلیم اور تحقیق کے کام میں مشغول رہا ہو۔ یہ "چار ارکان" کی تحدید ناکافی ہے، اس کے بجائے "ارکان کی اکثریت" لکھا جائے۔

۳۔ دفعہ نمبر ۲۲۹ میں اسلامی کونسل کے پاس سوال بھیجنے کے لئے اسمبلی کی قرارداد کو ضروری قرار دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ارکانِ اسمبلی کی اکثریت وہ سوال بھیجنے پر متفق ہو، اس کے بجائے یہ تصریح ہونی چاہیئے کہ دس ارکان کی تحریک پر بھی سوال بھیجا جا سکے گا۔

۴۔ دفعہ نمبر ۲۳۰ کا ذیلی فقرہ نمبر ۳ جس میں اسلامی کونسل کا مشورہ موصول ہونے سے قبل قانون سازی کی اجازت دی گئی ہے اسے حذف کر کے اس کی جگہ اسلامی کونسل کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ وہ اپنا جواب ایک محدود مدت میں بھیج دے۔

۵۔ دفعہ نمبر ۲۳۰ ذیلی فقرہ ۴ میں کہا گیا ہے کہ اسلامی کونسل کی رپورٹ خواہ عبوری ہو یا قطعی، اسمبلی میں غور کے لئے پیش کی جائے گی اور اسمبلی "اس کے بارے میں" (IN RESPECT THEREOF) قوانین وضع کرے گی، اس میں یہ امکان موجود ہے کہ اسلامی کونسل کے مرتب کردہ قوانین میں اسمبلی ایسی ترمیم کر دے جو قرآن و سنت کے خلاف ہو، اس لئے یہاں "اس کے بارے میں" کے بجائے "اس کی متابعت میں" (IN PURSUANCE THEREOF) کے الفاظ لکھے جائیں۔

۶۔ دفعہ نمبر ۱۹ شق (الف) کے الفاظ یہ ہیں:

"ہر شہری کو اپنے مذہب کو ماننے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا حق حاصل ہوگا الخ:"

اس میں یہ اضافہ ضروری ہے کہ "یہ دفعہ انسدادِ ارتداد سے متعلق کسی قانون پر اثر انداز نہیں ہوگی اور ایسی تبلیغ پر پابندی عائد کی جا سکے گی جس سے لوگوں کے

مُرتد ہونے کا اندیشہ ہو یا جو مملکت کے اساسی اصولوں کے انہدام کا باعث ہو۔"

۷۔ دفعہ نمبر ۲۳ میں حکومت کو جو گنجائش دی گئی ہے کہ وہ جائیدادوں کو بلامعاوضہ اپنی تحویل لے سکتی ہے، یہ اسلام کے خلاف ہے، اسلام میں اگر کوئی جائیداد حرام طریقے سے حاصل ہوئی ہے تو وہ بلاشبہ ناجائز قابض سے لے کر اصل مستحق کو پہنچانا ضروری ہے لیکن اگر کوئی جائداد کسی نے حلال طریقے سے حاصل کی ہے تو اسے چھین لینا کسی طرح جائز نہیں خواہ کتنی ہی ہو، مسجدِ نبویؐ کی توسیع کے لئے حضرت عمرؓ جیسے امیرالمومنین بھی حضرت عباسؓ کو جائیداد کو فروخت کرنے پر مجبور نہیں کر سکے، اس لئے حلال جائیدادوں کو بالجبر وصول کرنے کی گنجائش ختم کر کے یہاں صرف یہ تصریح کی جائے کہ:۔

"البتہ حرام طریقوں سے حاصل کی ہوئی جائیداد یا دولت کو قرآن و سنت کے احکام کے مطابق اصل مستحقین تک پہنچانے کے لئے قوانین وضع کئے جا سکیں گے اور حرام و حلال دولت کی تعیین کا اختیار عدالتِ عالیہ کو ہوگا۔"

۸۔ دفعہ نمبر ۵۲ ذیل ع۱ اور دفعہ نمبر ۵۲ ذیل ع۲ میں قائم مقام صدر کے لئے دفعہ نمبر ۵۶ میں اسپیکر کے لئے دفعہ ع۶۳ ذیل ع۱ میں چیرمین کے لئے، دفعہ ع۱۰۴ ذیل ع۱ میں گورنر کے لئے، دفعہ ع۱۳۱ ذیل ع۲ میں وزیرِاعلیٰ کے لئے، دفعہ ع۱۷۶ ذیل ع۱ میں چیف جسٹس کے لئے دفعہ ع۲۴۳ ذیل ع۲ شق (ب) میں افواج کے چیف آف اسٹاف کے لئے مسلمان ہونا ضروری قرار دیا جائے۔

۹۔ دفعہ نمبر ۲۵۳ جو ملکیت کی تحدید سے متعلق ہے، حذف کر دی جائے۔

۱۰۔ دفعہ نمبر ۲۵۱ میں قومی زبان کو سرکاری مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی مدت پندرہ سال بیان کی گئی ہے، اس کے بجائے تین سال کر دیا جائے۔

۱۱۔ دفعہ نمبر ۷ ذیل ع۱ میں اس شق کا اضافہ کیا جائے:۔

"اس باب کا کوئی حکم قرآن و سنت کی بنیاد پر قانون سازی کے لئے مانع

نہیں ہوگا۔"

۱۲۔ دفعہ نمبر ۳۱ ذیل ۲ شق (ب) کے الفاظ اس طرح کر دیئے جائیں :۔

"زکوٰۃ اور اوقاف کا نظام شرعی قواعد کے مطابق قائم کیا جائے گا اور مساجد کی حریت کا تحفظ کیا جائے گا۔"

۱۳۔ دفعہ نمبر ۳۹ ذیلی شقوں میں مندرجہ ذیل اضافہ کیا جائے:

(۱) ملک میں مروجہ نظام و نصابِ تعلیم کے ہر شعبہ کو اسلامی تعلیمات کے مطابق بنایا جائے۔

(۲) اسلامی روایات کے مطابق محکمۂ احتساب قائم کرے جو معروفات کو فروغ دے اور منکرات کو مٹائے۔

۱۴۔ دفعہ نمبر ۴ شق (ث) میں "ربا" کو ختم کرنے کی کوئی مدت مقرر نہیں کی گئی، اس لئے یہاں یہ عبارت ضروری ہے :۔

"ربا کو زیادہ سے زیادہ تین سال میں ختم کرے اور اس کے لئے ماہرینِ شریعت و معاشیات کی ایک ایسی کمیٹی بنائے جو موجودہ بنکاری کے نظام کو غیر سودی بنیادوں پر تبدیل کر دے۔"

دستور میں مزید ترمیمات بھی پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن اس وقت صرف وہ ترمیمات عرض کی گئی ہیں جو اسلامی نقطۂ نظر سے بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔

تحدیدِ ملکیت اور حکومت کا کسی دوسرے کی ملکیت پر زبردستی قبضہ کرنا

ترمیمات کی دفعہ ۲۳ میں یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ جائز ذرائع سے جو ملکیت حاصل کی گئی ہو زبردستی حکومت کے اس پر قبضہ کرنے یا اس کی تحدید کرکے عوام میں تقسیم کرنے کا کوئی شرعی جواز نہیں ہے، نہ معلوم کیوں ہمارے ایک کرم فرمانے جن کی ہمارے دلوں میں عزت و احترام ہے اس پر تنقید کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی قاضی کے حکم سے یہ سب کچھ کرنا جائز ہے اور افسوس ہے کہ اس دعوے کے ثبوت میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ

کی کتاب "ایضاح الادلہ" کی ایک عبارت بطورِ دلیل پیش کر کے اس سے ایک مجتہدانہ استنباط فرمایا ہے انا للہ۔

یہی تو آج کل کا سب سے بڑا فتنہ اور سب سے بڑی مصیبت ہے یقیناً ایک غیر عالم جب علمی دقیق فقہی مسائل میں دخل دے گا تو ایسی ہی خطرناک غلطیوں میں مبتلا ہو گا، اگر آج کوئی اردو دان صرف اُردو قانون کا مطالعہ کر کے قانون کی باریکیاں بیان کرے یا صرف انگریزی دان جو ایل، ایل بی نہ ہو صرف انگریزی زبان جاننے کی وجہ سے قانونی موشگافیوں میں دخل دے تو ہر عاقل اس کی تحمیق و تجہیل کرے گا۔ جب کسی انسانی قانون کے بارے میں یہ نزاکت کار فرما ہے تو خدائی قانون اور دقیق فقہی قانون میں کسی غیر مستند عالم کو اس قسم کا دخل دینا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ پھر کمال یہ ہے کہ ایضاح الادلہ میں وہ مضمون تقریباً پورے اسّی صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر مفصل بحث فرمائی ہے۔ اگر پوری بحث کو پڑھا اور سمجھا جاتا تو شاید اس خطرناک غلطی کا ارتکاب نہ ہوتا یہاں تو وہ مثل بالکل صادق آجاتی ہے کہ جیسے کوئی جاہل قرآن کریم کی آیت کریمہ لا تقربوا الصلاۃ وانتم سکاریٰ میں سے صرف پہلا جملہ لے لے اور دعویٰ کرے کہ قرآن کریم کا تو ارشاد یہ ہے کہ نماز کے قریب بھی مت جاؤ۔" ع۔ برین عقل و دانش بباید گریست

آج کل ٹھیک اسی قسم کے اجتہادات کا دروازہ کھل گیا ہے وہ مسئلہ فقہی جس پر حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ نے بحث فرمائی ہے اس کا فقہی عنوان یہ ہے۔

قضاء القاضی بشہادۃ الزور ینفذ ظاھراً و باطناً فی العقود والفسوخ دون الأملاك المرسلة، جس کا حاصل یہ ہے کہ کوئی شخص مثلاً کسی ایسی عورت پر جو نہ کسی دوسرے شوہر کی منکوحہ ہو اور نہ کسی دوسرے شوہر کی عدتِ طلاق وغیرہ میں ہو، یہ دعویٰ کرے کہ ،، یہ میری منکوحہ بیوی ہے" اور دو گواہ پیش کرے جو بالکل جھوٹے ہوں اور قاضی حقیقت حال سے بے خبر ہونے کی بنا پر یہ سمجھے کہ گواہ بالکل سچے ہیں اور اسی شہادت کی بناء پر قاضی یہ فیصلہ کر دے کہ جاؤ یہ تمہاری بیوی ہے تو یہ فیصلہ ظاہر و باطن میں اس لئے صحیح اور نافذ ہو گا کہ محل کے صالح ہونے کی وجہ سے قاضی کا یہ حکم خود بمنزلہ "عقدِ نکاح" کے ہو گیا،

گویا قاضی جانبین سے بمنزلہ وکیل کے ہو گیا اور یہ فیصلہ "عقدِ ازدواج" کے قائم مقام ہو گیا اب وہ عورت شرعاً اس کے لئے حلال ہے اور وہ عورت اس فیصلے کے بعد اس کی بیوی اسی طرح بن جائے گی جیسے عقدِ نکاح کے بعد بنتی، ہاں قیامت کے روز یہ مدعی جھوٹے دعوے اور کذب بیانی کی وجہ سے اور دونوں گواہ جھوٹی شہادت کی بنا پر شدید عذاب کے مستحق ہوں گے۔

یہ حکم صرف امام ابوحنیفہ کی اجتہادی رائے ہے امام ابویوسف اور محمد اور مالک وشافعی واحمد رحمہم اللہ سب اس کے خلاف ہیں بہرحال اس وقت تفصیلات میں جانے کی حاجت نہیں۔ زیر بحث مسئلہ تو یہ ہے کہ حکومت موجودہ جائز مالکان سے ان کی حلال طریق پر حاصل کردہ زمینوں، جائیدادوں کو ان سے بلا معاوضہ جبراً چھین لینا اور دوسرے مستحقین کو دینا چاہتی ہے اس مسئلہ سے مذکورہ بالا مسئلہ کا کیا تعلق؟ یہاں نہ کوئی مدعی ہے نہ مدعی علیہ نہ شہادت ہے نہ عدالت نہ قضاءِ قاضی ہے نہ شہادتِ زور ہے نہ قاضی کو شہادت کے جھوٹے ہونے کا علم، وہ مذکورہ بالا قاضی کا حکم ایک خاص مسئلے سے متعلق ہے جس میں متعدد قیود اور شرائط اور مخصوص صورت حال مؤثر ہے، چنانچہ اگر وہ عورت کسی دوسرے شخص کی منکوحہ بیوی ہو تو قاضی کا مذکورہ بالا حکم باطناً نافذ نہ ہو گا وہ عورت اس مرد پر حرام ہو گی اور وہ مرد اس عورت پر حرام ہو گا۔[1] اس خاص مسئلے کے دائرے کو وسیع کر کے اس سے زمین کی ملکیت کا مسئلہ نکالنا کتنا عجیب استنباط ہے؟ اور اگر اس بنیاد پر کہ ہر ہر چیز کا حقیقی مالک حق تعالیٰ ہے ہماری جان بھی اسی کی ہے ہمارا مال بھی اسی کا ہے ایک قاضی کو اس کا اختیار دیا جاتا

---

[1] علاوہ ازیں حلال طریق پر حاصل کردہ مملوک زمین کی ملکیت سے محروم کرنے کا جواز بھی اس مسئلہ سے نہیں نکل سکتا ہاں وہ زمین جو کسی کی مملوک نہ ہو اس کو کسی بھی مستحق کو دینے پر استدلال کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ امام ابوحنیفہ نے قضاءِ قاضی کے ظاہراً و باطناً نافذ ہونے کے لئے "محل کا صالح ہونا" شرط قرار دیا ہے لہٰذا جس طرح منکوحۂ غیر کے حق میں قاضی کا یہ فیصلہ باطناً نافذ نہ ہو گا اور وہ منکوحہ غیر مدعی کے لئے حرام رہے گی اسی طرح ایسی مملوک زمین جو حلال طریق پر حاصل کی گئی ہے حکومت کے کسی دوسرے شخص کو دے دینے سے اس کے لئے حلال نہ ہو گی بلکہ حرام رہے گی۔

ہے کہ جس کا مال جس کو چاہے دے دے اور اسی کا نام شریعت فہمی ہے تو اس طرح تو نہ کسی پر زکوٰۃ لازم ہوگی نہ عشر، نہ حج فرض ہوگا اور نہ قصاص لازم ہوگا۔ وائے افسوس کہ اتنی فہم بھی اس نام نہاد مجتہد کو نصیب نہیں کہ یہ سمجھ سکے کہ حکم شرعی کی علت کیا ہوتی ہے، اور حکمت کیا ہوتی ہے درحقیقت غیر عالم اس فرق کو سمجھ ہی نہیں سکتا، بحث کے تمام پہلو خود "ایضاح الادلہ" میں موجود ہیں اگر اس کو صحیح طور پر پڑھا اور سمجھا جاتا تو کبھی ایسی جرأت نہیں ہو سکتی تھی، ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ کسی بھی اسلامی مذہب میں چار اماموں کے مذاہب ہوں یا زیدیہ، جعفریہ، امامیہ، اباضیۃ، خارجیہ کے مذاہب ہوں اس کی اجازت قطعاً نہیں کہ کسی کی مملوک زمین اور جائز ملکیت اس سے بغیر اس کی رضا کے اور بغیر معاوضہ کے چھین کر کسی دوسرے کے حوالے کر دی جائے چاہے کوئی بھی اسلام کی دعویدار جماعت ہو یا اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگانے والی حکومت ہو، تحدید ملکیت کے غیر اسلامی نظام کا شرعی ثبوت پیش نہیں کر سکتا ہاں ظلم و جور اور طاقت و قوت کے بل بوتے پر جو چاہے کرے۔ وسیعلم الذین ظلموا أیّ منقلب ینقلبون۔

ربیع الاول ۱۳۹۳ھ، مئی ۱۹۷۳ء

دینِ اسلام سے مسلمانوں کی روگردانی

حق تعالےٰ کی ان تمام نعمتوں میں جو اس دنیا کو عطا کی گئی ہیں "صرف" دینِ اسلام" نعمتِ عظمیٰ ہے، اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوات والتحیات والتسلیمات کو اس نعمت سے سرفراز فرمایا گیا ہے جس طرح حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "ختم نبوت" اور سیادتِ انبیاء اور رسل کی نعمتِ کبریٰ سے مشرف کیا گیا اور تمام انبیاءِ کرام کی جماعت میں اعلیٰ ترین منصب پر فائز کیا گیا اسی طرح کتبِ الٰہیہ میں "قرآنِ حکیم" اعلیٰ ترین کتاب ان پر نازل فرمائی گئی اور ظاہر ہے جس امت میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جیسے رسول ہوں اور قرآنِ حکیم جیسی کتاب موجود ہو اور ان دونوں سرچشموں سے جس دین کا خمیر تیار ہوا ہو وہ دین بھی اعلیٰ ترین دین ہوگا تو ہر حیثیت سے "دینِ اسلام" اعلیٰ ترین ہوا اور اس امت کے ذریعہ تمام کائنات کو یہ اعلیٰ ترین نعمت دی گئی ہے اور اسی لئے وحیِ آسمانی الٰہی ابدی میں یہ اعلان کیا گیا ہے:-

«الیوم أکملت لکم دینکم وأتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الإسلام دینا» (مائدہ)

میں نے آج کے دن تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور اپنا احسان بھی پورا کر دیا ہے اور صرف اسلام کو تمہارے لئے دین پسند کیا ہے۔

اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا گیا :-

«ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الآخرۃ من الخاسرین» (آل عمران)

اور جو کوئی اسلام کو چھوڑ کر اور کوئی دین اختیار کرے گا وہ ہرگز قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں تباہ و برباد ہوگا۔

حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا :-

«لو کان موسیٰ حیاً لما وسعہ إلا اتباعی»

اگر حضرت موسیٰ (جیسے اولوالعزم پیغمبر) بھی زندہ ہوتے تو میرا ہی اتباع کرتے اور اس کے سوا چارۂ کار نہ ہوتا۔

اور ظاہر ہے کہ آفتابِ عالم تاب کے طلوع کے بعد تاروں کی روشنی تلاش کرنا یا چراغوں سے نور حاصل کرنا انتہائی غیر معقول حرکت ہے لیکن وائے محرومی اتنی بڑی نعمت کے ہوتے بھی آج مسلمان اس کو چھوڑ کر یورپ اور امریکہ و برطانیہ سے روشنی تلاش کر رہے ہیں، یہ حق تعالیٰ کی اس نعمتِ عظمیٰ، اس نعمتِ کبریٰ کی کتنی بڑی توہین ہے، اگر دینِ موسوی اور دینِ عیسوی مسیحی اپنی اصلی شکل میں محفوظ بھی ہوتے اور اس پر دنیا عمل بھی کرتی ہوتی تب بھی اسلام آنے کے بعد اس کی طرف توجہ کرنا اسلام کی بڑی تحقیر ہوتی اور جبکہ یہ ادیان تمام تر "تحریف" کی نذر ہو چکے ہیں کوئی آسمانی چیز ان میں محفوظ نہیں رہی پھر بھی اس کی پیروی بجز ضلالت و حماقت کے اور کیا ہو سکتی ہے۔

معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا مسلمان نہ صرف دینی شعائر، بلکہ وہ غیر دینی معاشرت کی چیزیں بھی اس قوم سے لے کر اپنا رہے ہیں جس پر حق تعالےٰ کا غضب نازل ہو چکا ہے، حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام کی زبانی ان پر لعنت نازل ہو چکی ہے پھر کاش کہ معاملہ یہیں تک محدود ہوتا، مسلمان قوم نے تو اپنی تمام اسلامی خصوصیات کو یک قلم چھوڑ دیا اور زندگی کے تمام ہی شعبوں میں ان کافروں کی نقالی شروع کر رکھی ہے لباس، پوشاک، خوراک، سونا جاگنا، چلنا پھرنا، دفتری نظام، گھریلو نظام، تعلیم کا نظام حتیٰ کہ تمام کے تمام طرزِ معیشت و معاشرت میں ان کی حیرت انگیز نقالی کو اپنے لئے سرمایۂ سعادت و فخر سمجھ لیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس سے بڑھ کر حق تعالیٰ کی نعمتوں کی کیا تحقیر و تذلیل ہوگی؟ فسق و فجور، لہو و لہب، تفریح و عیاشی میں بھی ایسی تقلید کہ عقل حیران ہے، فحاشی و عریانی، فواحش و منکرات میں انہماک اس درجہ ترقی پر ہے کہ نقل اصل سے بڑھ گئی، یہ تو ہو مسلمانوں کی زندگی اور یہ ہو ان کی تہذیب و معاشرت اس پر انتہائی بے حیائی سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ ہم کیوں ذلیل ہیں؟ کیوں خوار ہیں؟ کیوں روز بروز قعرِ مذلت میں گرتے چلے جا رہے ہیں؟

باقی یہ کہنا کہ یورپ پر عذابِ الٰہی کیوں نہیں آتا؟ اول تو یہ نظر کا فرق ہے، "وإنّ جهنم لمحيطة بالكافرين" وہ یقیناً جہنم کے شعلوں میں جل رہے ہیں ان کے ملک

قہرِ الٰہی کی آگ میں پھنک رہے ہیں، جس عذاب میں یورپ مبتلا ہے الامان والحفیظ، قلب کا سکون جو زندگی کی اصلی روح ہے وہ یورپین ممالک میں سراسر ختم ہو چکا ہے تقویٰ وطہارت کی زندگی سے جو قلوب میں نورانیت وطمانیت پیدا ہوتی ہے وہ یکسر ختم ہے وہ انتہائی حیران و پریشان ہیں قلب کو منشیات ومسکرات کے استعمال سے عارضی آرام پہنچانے کی کوشش وکاوش میں اپنی زندگیاں ختم کر رہے ہیں گویا قانون کی گرفت سے بچ کر خودکشی کر رہے ہیں، ان ممالک کی تفصیلات اگر ذرا بھی کسی کو معلوم ہو جائیں تو معلوم ہو کہ وہاں پوری زندگی جہنم بن چکی ہے اور اس سے پناہ مانگی جائے اور اگر کسی کو اس نمائشی چہل پہل اور تروتازگی پر کچھ شبہ ہو اور وہ قصداً حقائق سے چشم پوشی کرے تو اس کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ قومیں حق تعالےٰ کے محبوب دین "اسلام" سے منکر ومنحرف اور کافر ہیں حق تعالےٰ کے قانونِ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ جب آخرت کی نعمتوں سے ایک قوم سراسر محروم ہو تو دنیا کی نعمتیں تو اسے ملنی چاہئیں، یہی قرآن کہتا ہے یہی حدیث کہتی ہے۔

دینِ اسلام سے بغاوت اور اس کی سزا

سزا تو باغی قوم کو ملتی ہے مسلمانوں نے تو اسلام قبول کیا ہے اور پھر اسلام کو چھوڑا ہے جس کے دو ہی محمل ہو سکتے ہیں یا تو وہ باغی ہیں یا منافق ہیں، بغاوت کا جرم بھی انتہائی سخت ہے اور نفاق کا جرم بھی انتہائی شدید ہے اسی لئے قرآنِ کریم میں منافقین کے لئے جہنم کا آخری اور سب سے نچلا طبقہ تجویز کیا گیا ہے، گویا کفار سے بہت زیادہ سخت عذاب ان کو ہوگا، آج مسلمان قوم بھی یا تو عملی بغاوت میں مبتلا ہے یا پھر شدید نفاق کا شکار ہے۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ مسلمان قوم نے حق تعالےٰ کی نعمتِ عظمٰی کی شدید تحقیر کی ہے جو یقیناً ناقابلِ برداشت جرم ہے، یہ حق تعالےٰ کے دین کا استخفاف، یہ توہین، اتنا بڑا جرم ہے کہ اگر اللہ تعالےٰ حلیم نہ ہوتے اور ان کا حلم کارفرما نہ ہوتا تو ایک لمحہ کے لئے بھی ان کو روئے زمین پر رہنے نہ دیا جاتا اور اس صفحۂ ہستی سے اس قوم کا نام ونشان تک مٹ جاتا۔

بلادِ عربیہ کو دیکھئے حق تعالےٰ نے ان کو دنیا کی بھی عظیم نعمت نصیب فرمائی، دنیا کے کلیدی مقامات ان کے ہاتھوں میں ہیں زمینی خزانے ان کے دروازوں پر بہادیئے ہیں، یورپ و امریکہ ان کے محتاج ہیں لیکن خالقِ کائنات کی نعمت "اسلام" سے انحراف اور دنیا کے سامانِ تعیش میں انہماک کی وجہ سے کس بُری طرح یورپ کی گندی زندگی کی نقالی میں مبتلا ہیں اور چھانٹ چھانٹ کر تمام یورپین معاشرے اور تہذیب کی جو غلاظتیں ہیں ان کو اختیار کر رکھا ہے اور حیرت ہے کہ ان کی محنتیں، مشقتیں، جفاکشی و فرض شناسی وغیرہ جو بعض خوبیاں ہیں ان کو یکسر نظر انداز کردیا گیا ہے آخر سب عذابِ الٰہی میں مبتلا ہوگئے ہیں، باوجود عددی کثرت کے قلت میں ہیں. باوجود اسبابِ عزت کی فراوانی کے ذلت میں ہیں، باوجود ثروت و غنا کے فقر و تنگ دستی میں مبتلا ہیں، صرف اس لئے کہ تمام دولت و ثروت عیش پرستی و راحت کوشی کے نذر ہو رہی ہے. تازہ بتازہ نو ماڈل کاروں، یورپین طرز کی عمارتوں اور فرنیچر و سامانِ آرائش میں سارا سرمایہ جھونکا جارہا ہے، پیرس کو مات کرنے والے ہوٹل اور کلب روز افزوں ہیں افرنجیت کا ایک بھوت ہے جو دماغوں پر سوار ہوگیا ہے انہی کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں انہی کے کانوں سے سنتے ہیں، آخر اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا کہ کروڑوں افراد پر مشتمل عرب آبادی چند مٹھی بھر یہودیوں سے لرزہ براندام ہے مانا کہ یہودی طاقت کے پیچھے امریکہ اور روس کی طاقت ہے لیکن اگر یہی مسلمان آج حق تعالیٰ کی نصرت پر یقین رکھتے اور آسمانی ہدایات پر عمل پیرا ہوتے تو آج نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اور یہ روزِ بد نہ دیکھنا پڑتا، کون سی تنبیہ ہے جو قرآنِ حکیم نے نہیں کی اور کون سی نصیحت ہے جو خدا اور رسول نے نہیں کی لیکن اس سے استفادہ کے لئے گوشِ عبرت نیوش اور نگاہِ بصیرت افروز چاہیئے، اگر مسلمان قوم کو اب بھی عبرت نہیں ہوتی اور یہی خدا فراموش زندگی ہے یہی بے حیائی ہے یہی عریانی ہے یہی اسراف و تبذیر کی شیطانی زندگی ہے تو خاکم بدہن انہیں اپنی آخری تباہی و بربادی کا انتظام کرنا چاہیئے.

حق تعالےٰ رحمۃ للعالمین کے طفیل اپنی رحمت کاملہ سے اپنے عذاب سے بچالے اور ہمیں اپنی اصلاح کی توفیق عطا فرمائے، آمین.

آزادی اور اس کا مقصد

هٰذَا بَصَائِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (الاعراف: ۲۰۲)

کسی ملک کی آزادی یا کسی مسلمان قوم کی آزادی درحقیقت حق تعالیٰ کی نعمت ہے لیکن یہ آزادی بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں بلکہ یہ صحیح ترین اور اعلیٰ ترین مقاصد کے لئے بہترین وسیلہ ہے اور صحیح مقاصد تک پہنچنے کے لئے ایک راستہ ہے۔ چنانچہ مسلمان قوم کی آزادی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ کافرانہ اور ظالمانہ حکومت کے تسلط سے آزاد ہو کر اللہ تعالیٰ کی رحمت و عدل کے زیر سایہ آجائے تاکہ حق تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانینِ عدل و رحمت پر عمل کر کے دنیا و آخرت کی نعمتوں کی مستحق بن جائے اور دنیاوی زندگی کے اس عبوری دور میں قانونِ الٰہی پر عمل کر کے اس امتحان میں اعلیٰ کامیابی کے نمبر حاصل کرے تاکہ آخرت کی غیر فانی نعمتوں و برکتوں سے مالامال ہو سکے۔

اسی لئے جب کوئی مسلمان قوم آزادی کے صحیح مقصد کو فراموش کر دیتی ہے اور اس نعمت کو غلط طریقے پر ناجائز مقاصد و اغراض کے لئے استعمال کرتی ہے تو حق تعالیٰ کا قانونِ قدرت اس سے انتقام لے کر اس آزادی کی نعمت کو اس سے چھین لیتا ہے۔ یہی تمام اسلامی تاریخ کا لبِ لباب ہے اور یہی مسلمانوں کے عروج و زوال کا خلاصہ ہے۔

متحدہ ہندوستان کے مسلمان اپنے سیاہ کارناموں کی پاداش میں اس نعمتِ آزادی سے عرصہ دراز تک محروم رہے، لیکن پھر بعد خرابی بسیار ہوش آنے پر عرصہ دراز تک آہ و بکا میں مبتلا رہے اور ساتھ ہی اس نعمت کے حصول کے لئے مسلسل کوشش اور جد و جہد میں لگے رہے، آخر حق تعالیٰ کی رحمت نے مسلمانوں کو پھر اپنی آغوشِ رحمت میں لے کر ایک قطعۂ ملک دوبارہ ان کے حوالے کر دیا تاکہ دوبارہ امتحان لیا جائے۔ لینظر کیف تعملون۔

لیکن انتہائی صدمہ کی بات ہے کہ نہ صرف حکمران اور عوام بلکہ ہر خاص و عام سب کے سب اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی میں مقصر رہے۔ نہ صرف مقصر بلکہ اصل مقصد کے برعکس ہر شخص اس نعمت کے ذریعہ اپنی اپنی اغراض و خواہشات کے حصول میں مشغول ہو گیا جس کا نتیجہ خاکم بدہن نہایت خطرناک ہے حکمرانوں کا فرض تھا کہ وہ جلد سے جلد اسلامی قانون نافذ کرتے اور حکومت کی طاقت سے لوگوں

کو صحیح مسلمان بناتے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے، محاکمِ احتساب، تمام ملک میں قائم کرتے اور قرآنِ حکیم میں جو فرائض حکمرانوں کے ہیں پورے کرتے۔ (الذین إن مکنا ھم فی الارض۔

علماء کا فریضہ تھا کہ دعوت واصلاح کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیتے تاکہ دینی رہنمائی کا صحیح تقاضا پورا ہوتا، عوامِ امت کا فرض تھا کہ عقائد و عبادات، اسلامی تہذیب و اخلاق اور اسلامی معاشرت کے اختیار کرنے میں کوشش کرتے لیکن اس کے برعکس جو کچھ ہو رہا ہے ہم سب کچھ دیکھ رہے ہیں " عیاں را چہ بیان "

آج کل جو بحران ملک پر مسلط ہے اور اس کے نتیجہ میں جو انقلابات رونما ہو رہے ہیں یا ہونے والے ہیں یہ سب کچھ صرف اسی تقصیر و کوتاہی کے نتائج ہیں جو سامنے آرہے ہیں اگر حکمران اور کارکنان حکومت صحیح معنوں میں عادل و قوم پرور ہوتے اور خود اپنی زندگی میں ظاہر و باطن دونوں لحاظ سے اسلام کے تقاضے پورے کرتے تو آئے دن جو یہ بحران اور انقلابات رونما ہو رہے ہیں امت ان سے محفوظ رہتی، دیکھتے دیکھتے ان چند سالوں میں نہ صرف پاکستان بلکہ تمام ممالکِ اسلامیہ خصوصاً ممالکِ عربیہ کا کیا سے کیا نقشہ ہو گیا۔ یہ سب کچھ اسی خدافراموشی کے نتائج ہیں جو سامنے آ رہے ہیں، صبح شام روزانہ اخبارات کے صفحات میں کسی نہ کسی ملک میں تباہ کن انقلاب کی خبر نظر آتی ہے لیکن ان حقائق و واقعات کے مشاہدہ کے باوجود کسی کو بھی عبرت نہیں ہوتی۔

غیراللہ کو عزت وطاقت کا سرچشمہ سمجھنے کی سزا

مملکتِ پاکستان کو اللہ تعالےٰ نے دو مرتبہ ہندوستان اور اعداءِ اسلام کی متحدہ طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا نشانہ بننے سے محض اپنے فضل و کرم سے محفوظ فرمایا، اس نعمت کا شکر ادا کیا جانا چاہیئے اور وہ شکر یہی ہے کہ پاکستان کا خالص اسلامی دستور ہو حکومت صحیح اور خالص اسلامی قوانین ملک میں نافذ کرے تاکہ تمام امتِ پاکستان اسلامی قانون کی برکات سے مالامال ہو اور ہر طرح کے بحرانوں سے محفوظ رہے۔ بارہا ہم اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ اس ملک اور قوم کو کمیونزم اور سوشلزم کی لعنت سے یا سرمایہ دارانہ نظام کے شکنجے اور استحصال سے صرف اسلامی قانون ہی بچا سکتا ہے اور صرف اسلامی قانون پاس کر دینے سے نہیں بلکہ اسلامی قانون کی دیانت داری سے تنفیذ

اور اجراء اور پھر قوم کے ہر طبقہ کے اس پر عمل پیرا ہونے سے یہ لعنتیں دور ہو سکتی ہیں. صحیح اسلام ہی وہ نعمت ہے اور وہ دولت ہے جس کے حصول کے بعد خود ملک اپنی ضروریات کے لئے مکتفی ہو سکتا ہے اور اغیار سے بھیک مانگنے سے نجات پا سکتا ہے آج ہمارا ملک بے رحم دشمنوں سے لئے ہوئے قرضوں اور ان کے سود سے اتنا دبا ہوا ہے اور کراہ رہا ہے کہ نہ معلوم اس کا انجام کار کیا ہوگا جب تک اسلامی قانون کے محکمہ ہائے احتساب قائم نہ ہوں گے اور اس ملک سے رشوت کا خاتمہ نہ ہوگا نہ حکومت کا خزانہ حسب ضرورت بھر سکتا ہے نہ ٹیکسوں اور مال گذاریوں کی صحیح مقدار حکومت کو حاصل ہو سکتی ہے چاہے کتنے ہی بھاری ٹیکس حکومت لگائے عوام ضرور تباہ ہوں گے مگر حکومت کی ضرورتیں ہرگز پوری نہ ہوں گی اور عوام کی قربانیوں اور فداکاریوں کے باوجود دشمنوں سے قرض کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو گی.

آج اگر سرکاری محکموں میں رشوت لینی اور دینی ختم ہو جائے اور بیرونی ممالک کے بینکوں میں خفیہ اور علانیہ جمع کرایا ہوا سرمایہ ملک میں واپس آجائے اور زندگی کی غیر ضروری اشیاء یعنی تعیشات ہر طبقہ کی زندگی سے خارج کر دی جائیں تو حکومت ان دشمنان اسلام کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور قرض کی بھیک مانگنے کی لعنت سے بآسانی بچ سکتی ہے۔ آج انہی دشمنانِ اسلام اور درپئے آزار طاقتوں کے ہم رہین منت ہیں اور ہمیشہ ان سے بھیک مانگتے رہتے ہیں اور اس بھیک کی وہ اتنی بڑی قیمت پاکستان سے وصول کر رہے ہیں کہ عقل حیران ہے اور صرف اسی وجہ سے وہ ہمارے اندرونی معاملات میں نہایت دلیری کے ساتھ دخل اندازی کرتے ہیں اپنی پارلیمنٹوں میں ہماری داخلی معاملات میں بحثیں کرتے رہتے ہیں اور نہ صرف مشورے دیتے ہیں بلکہ مغرورانہ انداز سے اوامر و احکامات صادر کرتے ہیں اور ان احکامات کی تعمیل میں ذرا بھی کوتاہی دیکھتے ہیں تو طرح طرح کی دھمکیاں دیتے ہیں اور ہمارے خلاف پروپیگنڈے کر کے آسمان سر پر اٹھاتے ہیں، دراصل ان کی امدادوں اور قرضوں نے جہاں ان کے حوصلے بڑھا دیئے ہیں وہاں ہمارے حوصلے پست کر دیئے ہیں اسی وجہ سے ان کو یہ جرأت ہوتی ہے کہ تحقیقات کے لئے اپنے وفود بھیجتے ہیں خود ساختہ صحافی بھیجتے ہیں اور وہ ان کے حسب منشا ان کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرتے اور آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں، اس کے علاوہ یہ صحافی ہمارے دشمنوں کے لئے مخبری بھی کرتے ہیں اور ہمارے کمزور پہلوؤں سے ان کو آگاہ کرتے ہیں تاکہ بصورتِ جنگ ہمیں خاطر خواہ

نقصان پہنچا سکیں۔

کیا اسی کا نام آزادی ہے اس سے بڑھ کر اور کیا غلامی ہو سکتی ہے یہ سب کچھ اسی کے نتائج ہیں کہ ہم ان کے محتاج ہیں قرضوں کے علاوہ اپنی ضروریات زندگی کی ہر چیز ان سے درآمد کرتے ہیں انا للہ۔

جہاں ہماری بڑی بڑی اسلامی حکومتیں اس لعنت میں گرفتار ہیں وہاں بعض چھوٹی چھوٹی حکومتیں اس لعنت سے محفوظ ہیں۔ روزنامہ جنگ مورخہ ۲۹ جون ۱۹۷۱ء پیر علی محمد راشدی صاحب کے مضمون سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو، ممکن ہے اس سے ہماری حکومت کی آنکھیں کھل جائیں۔

شروع میں جیسے ہی مشرقی پاکستان کے حالات نے ناگوار صورت اختیار کی میں نے جنگ کی دو اشاعتوں مورخہ ۱۷، اپریل اور ۲۰، اپریل میں اپنی ناچیز رائے پیش کرتے ہوئے یہ بتا دیا تھا کہ اس صورتِ حال سے نمٹنے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے، اس کے بعد میں ملکی حالات پر لکھنے سے احتراز کرتا رہا ہوں، وجہ یہ ہے کہ جب ملکی معاملات ذمہ دار قابلِ اعتماد اور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں جو ہر مشکل کا حل نکالنے کے اہل ہیں تو پھر ایسے موقعہ پر ہم باہر سے دیکھنے والے لوگوں کے لئے مناسب نہیں ہے کہ ہم خواہ مخواہ اپنی غیر مکمل اور سیکنڈ ہینڈ (SECOND HAND) معلومات کی بنا پر موقعہ بے موقعہ رائے زنی کرتے پھریں اور بے وجہ ذہنی الجھاؤ میں اضافہ کرتے رہیں وقت یقیناً نازک ہے مگر ہماری طرف سے جو لوگ کام چلا رہے ہیں اور حالات کا مقابلہ کر رہے ہیں وہ بے شک وشبہ ہر لحاظ سے وقت کی ضروریات کو پہچاننے اور پورا کرنے کے اہل ہیں لہٰذا ہم کو مطمئن ہو کر ان کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے اور جو تدبیر وہ کریں اس کی تائید کرنی چاہیئے، بحران کی کیفیت میں ہر ایک کو فلاسفر نہیں بننا چاہیئے اس طرح سے ذہنی انتشار بڑھتا ہے اور اصل مسئلہ کے حل میں رکاوٹ پڑتی ہے۔

مگر حال ہی میں مسئلہ کا ایک پہلو ایسا نکل آیا ہے جس پر میں لکھنا اپنا فرض سمجھتا ہوں، وہ پہلو یہ ہے کہ آئے دن باہر کے ملکوں کے نمائندے ہمارے یہاں ہمارے حالات کا جائزہ لینے آنے لگے اور ہمارے اندرونی انتظامی معاملات کے بارے میں دوسرے ملکوں کی پارلیمنٹوں میں بحثیں ہونے لگی ہیں نہ صرف یہ بلکہ صورتِ حال ایسی بنی ہے کہ آج کل باہر کے ملک ہم کو براہِ راست "ڈکٹیٹ" کرنے لگے ہیں کہ ہم کو ہمارے داخلی معاملات کے سلسلہ میں کیا کرنا چاہیئے، بھارت والے تو یہاں تک چلے گئے ہیں کہ وہ

ہم پر احکامات صادر فرمانے لگے ہیں کہ ہم کو فلاں پارٹی سے سمجھوتہ کرنا چاہیئے ورنہ وہ دخل اندازی سے باز نہیں آئیں گے، دو دن ہوئے کنسورشیم والوں نے اسی اسپرٹ کا مظاہرہ کیا ہے ان کا ارشاد ہے کہ وہ ہماری کوئی امداد کریں اس سے پہلے وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہمارے صدر ملک کے سیاسی اور آئینی معاملات کے بارے میں کس قسم کا اعلان کرتے ہیں۔

اصولی طور پر میں اس ساری صورتِ حال کو جائز اور معقول نہیں سمجھتا، بنیادی سوال یہ ہے کہ ہماری ریاست ایک آزاد ریاست ہے یا بین الاقوامی دنیا کی نظروں میں ہماری وہی حیثیت ہے جو کسی زمانہ میں انگریز کے تحت برصغیر کی "دیسی ریاستوں" راجوں مہاراجوں کی ہوتی تھی؟ یعنی نیچے راجہ صاحبان کا راج اور اوپر وائسرائے ہند کا ڈنڈا؟

بین المملکتی تعلقات کی تاریخ میں مجھے ایسی کوئی مثال نہیں مل رہی ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ کسی آزاد ریاست کے اندرونی معاملات کے بارے میں تحقیقات کرنے کے لئے باہر سے لوگ آتے ہوں یا ان پر باہر کی پارلیمنٹوں میں بحثیں ہوتی رہی ہوں یا باہر کی ریاستیں ڈکٹیٹ کرتی رہی ہوں کہ فلاں سیاسی پارٹی سے سمجھوتہ ہونا چاہیئے یا نہیں ہونا چاہیئے، اقتدار منتقل ہونا چاہیئے یا نہیں؟

یمن میں کئی سال تک خانہ جنگی جاری رہی، کیا باہر کی کسی پارلیمنٹ میں اس پر بحث ہوئی؟ کسی باہر کے ملک نے کوئی تحقیقاتی کمیشن وہاں بھیجا؟

یونان میں چند سال سے فوجی حکومت قائم ہے، اس حکومت کی کارگذاریوں کے بارے میں باہر کے اخبارات میں عجیب وغریب مواد شائع ہوتا رہا ہے مگر امریکہ نے جس کی امداد پر یونان کا یہ سارا کاروبار چل رہا ہے کبھی نہیں کہا کہ "اقتدار قومی نمائندوں کو منتقل کردو ورنہ امداد بند کر دی جائے گی"۔ یونان کے یہ حکمران کھل کر امریکہ سے کہتے رہتے ہیں کہ "ہم وہی کریں گے جو ہمارے ملک کے لئے موزوں ہوگا، آپ کو اگر امداد دینا ہے تو مہربانی ورنہ بند کردو"۔ امریکہ خاموش ہے۔

برطانیہ کے اپنے علاقے شمالی آئرلینڈ میں مدتوں سے اندرونی گڑبڑ، بدامنی اور خونریزی چل رہی ہے، گڑبڑ کا سبب قریب قریب وہی ہے جس سے مشرقی پاکستان میں ہمارا سابقہ پڑا ہے، برطانیہ کی مرکزی حکومت کو مجبور ہو کر وہاں فوجی کاروائی کرنی پڑی ہے مگر کیا ہم نے یا کسی رومن کیتھلک ملک

نے کبھی اپنے آدمی وہاں بھیج کر تحقیقات کروائی کہ وہاں کیا ہورہا ہے؟ کیا دنیا کے کسی ملک نے برطانیہ سے یہ مطالبہ کیا کہ "تم شمالی آئرلینڈ سے فوج ہٹادو ورنہ تمہارے ساتھ راہ ورسم منقطع؟ کیا جنوبی آئرلینڈ کی آزاد حکومت نے اس معاملے میں مداخلت کی؟

سوڈان کے جنوبی حصہ میں "تحریکِ آزادی" کے نام سے بغاوت کی سی کیفیت رہی ہے، وقتاً فوقتاً سوڈان کی حکومت جو ایک فوجی حکومت ہے فوجیں بھیج کر بغاوت کو کچلنے کی کوشش کرتی رہی ہے مگر کیا اس بنا پر بین الاقوامی برادری نے سوڈان سے کبھی کوئی باز پرس کی؟

اریٹریا کے لوگ ایبے سینیا سے الگ ہونا چاہتے ہیں ایبے سینیا کی حکومت ان کو مار مار کر اپنی بات منوانے کے لئے فوج استعمال کرتی رہی ہے، کیا "سیلف ڈٹرمینیشن" یا "جمہوری حقوق" والے اصول کی خاطر کسی باہر کے ملک نے کبھی کوئی تحقیقاتی کمیشن یا پارلیمانی وفد اریٹریا بھیج کر وہاں کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی؟ اریٹریا کا علاقہ، انگریزوں نے ہی ایتھوپیا کے حوالے کیا ہوا ہے، اس بنا پر وہاں جو کچھ ہوتا رہا ہے اس کے بارے میں اخلاقی ذمہ داری کسی حد تک برطانیہ پر بھی عائد ہوتی تھی مگر کیا اس مسئلہ کے بارے میں برطانیہ کی پارلیمنٹ میں کبھی کوئی بحث ہوئی؟ کیا برطانیہ نے کبھی ایبے سینیا سے یہ مطالبہ کیا کہ تم اریٹریا کے لوگوں سے سیاسی سمجھوتہ کرلو ورنہ ہم تمہاری مدد نہیں کریں گے اور ہمارے اخبار تمہارے خلاف رات دن اودھم مچاتے رہیں گے؟"

عراق میں کردوں نے بغاوت کی جو کئی سال جاری رہی، اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے عراق آزادی سے اپنی فوجی قوت سے کام لیتا رہا مگر کیا اس کی وجہ سے باہر کے ملکوں نے کبھی عراق پر کردوں کی خاطر دباؤ ڈالنے کی ہمت کی؟

نائیجریا اور کانگو کے واقعات ہر ایک کے علم میں ہیں وہاں بھی صوبوں نے بغاوت کی اور مرکزی حکومتوں نے اس بغاوت کو فوجی قوت سے ختم کر دیا مگر کیا ان معاملات میں باہر کی حکومتوں نے کبھی کوئی مداخلت کی؟"

بہر حال کہنا یہ ہے کہ جو دردناک صورتِ حال اس وقت پیش آرہی اس کی اصلی وجہ یہی ہے کہ عزت وطاقت کا سرچشمہ اعداءِ اسلام کو سمجھا گیا ہے آج اگر مسلمان حکومتیں حق تعالیٰ کی ذات کو عزت وطاقت کا سرچشمہ سمجھیں اور اس حقیقت کو سمجھ لیں جو حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

"وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ عزت تو اللہ کے اس کے رسول کے اور مسلمانوں ہی کے لئے ہے لیکن منافق سمجھتے نہیں۔

ان حکومتوں کی ظاہری مادی ترقیات نے ہماری نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے اور اپنی "ترقیات" کی وجہ سے جس اخلاقی بحران میں یہ قومیں مبتلا ہیں اس سے ہم قطعاً غافل ہیں۔

بالفرض اگر باہر کی امدادوں اور قرضوں کے ہم محتاج ہی ہیں اور بغیر قرضوں کے ہمارا کام نہیں چل سکتا تو پھر ہماری متعدد عرب حکومتوں کو اللہ تعالےٰ نے اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ ان سے با آسانی سود کے بغیر قرض لے سکتے ہیں تو پھر ہم ان سے قرضے کیوں نہ لیں؟ ایک کویت کی دولت اللہ کے فضل سے اتنی ہے کہ اگر انگلستان کے بنکوں سے اس کی دولت نکال لی جائے تو انگلستان کا دیوالیہ نکل جائے اگر بھیک مانگنا ضروری ہی ہے تو پھر اپنوں سے کیوں نہ مانگیں وہ یقیناً ہمارے دشمن ہیں نہ ان کی طرح بے رحم، ہماری تمام مشکلات ان کے تعاون سے حل ہو سکتی ہیں، آج اگر ایک طرف حکومت کو ان اعداءِ اسلام کے سودی قرضوں نے تباہ کر رکھا ہے اور سرمایہ دارانہ سودی نظام نے قوم کو ہلاکت کے گڑھے میں پہنچا دیا ہے تو دوسری طرف شراب کے لائسنسوں نے اور عریاں کلبوں کے اجازت ناموں نے فواحش و منکرات کو فروغ دینے کی نت نئی تدبیروں اور فریب کاریوں نے تمام امت کو بے حیائی و بے شرمی اور بربادی و تباہی میں مبتلا کر دیا ہے۔ یہ ہے وہ بدترین صورتِ حال جس کے تصوّر سے دماغ پھٹا جا رہا ہے قلم تحریر سے عاجز ہے زبان بیان سے قاصر ہے کیا کیا لکھا جائے اور کیا کیا کہا جائے؟

خدارا اپنی حالت پر رحم کرو! ابھی وقت ہے اس ملک کو تباہی سے بچانے کا عزم کر لو، اسلامی قانون قانون نافذ کر دو، اسلامی تعزیرات جاری کر کے صالح معاشرے کی تشکیل کر لو، غیر اسلامی تعزیرات کے ذریعہ جان و مال و آبرو کی حفاظت کی توقع بالکل بے معنی ہے، رشوت پر بلا رو رعایت سخت سے سخت سزا دو، یورپ و امریکہ کی خدا فراموش تہذیب کی بیخکنی کرو، فوجیوں اور نوجوانوں میں جہاد کی روح پیدا کرو قوم کو ایثار سکھاؤ اس اسراف و تبذیر کی بنیاد پر قائم شیطانی معاشرے کو ملک سے باہر کرو جب تک ان باتوں پر عمل نہیں کیا جائے گا اسلامی ترقی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔

اللّٰھم اھد قومی فانھم لا یعلمون

جمادی الثانیہ ۱۳۹۱ھ، اگست ۱۹۷۱ء

اُمّتِ محمدیہ اور فتنے

حضرت رسالت پناہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ آباءنا و اُمھاتنا) نے ایک حدیث میں فرمایا تھا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمھارے گھروں میں فتنے ایسے آرہے ہیں جیسے بارش کے قطرے برستے ہیں عہدِ نبوت کے دورِ مبارک کے کچھ عرصہ بعد سے ہی ان فتنوں کا دور شروع ہوا ہے اور ہمیشہ مومنین و مخلصین کا امتحان ہوتا رہا ہے، لیکن عہدِ نبوت کے قرب کی وجہ سے ایمان اتنا قوی رہا کہ زیادہ تر فتنوں کا دائرہ صرف "عمل" تک محدود رہا، دلوں کا یقین بڑی حد تک محفوظ رہا لیکن عہدِ نبوت سے جتنا بُعد ہوتا گیا، ایمان و یقین میں بھی ضعف رونما ہونے لگا، یہاں تک کہ عصرِ حاضر میں تو دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں فتنوں کا ایک سیلاب" اُمڈ آیا ہے، علمی، عملی، دینی، اخلاقی، معاشرتی، تمدنی، اتنے فتنے ظاہر ہو چکے ہیں کہ عقل حیران ہے اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد:

«لتتبعُن سنن من کان قبلکم ذراعاً بذراعٍ وشبراً بشبرٍ حتی لو دخل أحدھم جحر ضبٍ لدخلتموہ»

یعنی تم بھی پہلی امتوں یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے نقش قدم پر چل کر رہو گے اور ان کے اتباع میں اتنا غلو ہو جائے گا کہ اگر بالفرض کوئی کسی گوہ کے سوراخ میں گھسا ہے تو تم بھی اس میں ضرور داخل ہو گے یعنی فضول ولایعنی اور عبث حرکات میں بھی ان کا اتباع کرو گے۔

آج جب ہم دنیائے اسلام کا جائزہ لیتے اور مسلمانوں کے تمدن و معاشرت کو دیکھتے ہیں تو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے، مسلمانوں کے موجودہ معاشرے کو جب دیکھتے ہیں خصوصاً بلادِ عربیہ اسلامیہ کا جب جائزہ لیتے ہیں تو بے حد افسوس ہوتا ہے کہ بمشکل کوئی خدوخال ایسا نظر آتا ہے جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ یہ مسلمان ہیں" مغربیت" کے اس سیلاب میں اس طرح بہہ جانا انتہائی دردناک ہے، پھر کاش یہ مغربیت اور یورپ پرستی ظاہر تک ہی منحصر ہوتی، اب تو یہ زہر ظاہر سے تجاوز

کر کے باطن تک سرایت کر چکا ہے، خیالات، افکار، نظریات، احساسات سب ہی میں یورپ کا چربہ اتارا جانے لگا ہے، مسلمان ملکوں کی یہ تباہی و بربادی دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے، ستم بالائے ستم یہ ہے کہ "قومیت" کی لعنت اس تیزی سے ابھر رہی ہے کہ الأمان الحفیظ، اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں، نہ معلوم اس آغاز کا انجام کیا ہوگا؟

سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ مغربیت کے ان زہریلے اثرات سے "حرمین شریفین" بھی محفوظ نہیں رہے لڑکیوں کی تعلیم جبری ہو چکی ہے، تھیٹر کی بنیاد پڑ چکی ہے، ٹیلی ویژن جدہ مکہ مدینہ تک آگیا ہے اور اس دردناک صورت میں کہ مدینہ منورہ میں ٹیلیویژن کا افتتاح کسی امریکی فلم سے کیا گیا ہے إنا اللہ، مسجدِ نبوی کے بالکل سامنے ٹیلی ویژن لگا ہوا ہے، نماز عشاء کے بعد جب لوگ نماز سے فارغ ہو کر آتے اور صلاۃ وسلام کا تحفہ بارگاہِ قدس میں پیش کر کے نکلتے ہیں تو دلوں میں جو رقت و نور پیدا ہوتا ہے، ٹیلی ویژن کی ظلمتیں اس کو یکسر ختم کر دیتی ہیں اس سے بھی بڑھ کر دردناک واقعہ یہ ہے کہ "غزوہ بدر کبریٰ" کا ڈرامہ خاص مکہ مکرمہ میں "عبداللہ بن الزبیر" کے مدرسہ میں طلبہ کے ذریعے کھیلا گیا ہے،، ارمضان المبارک دوشنبہ کی رات میں اس کا اہتمام کیا گیا ہے مکہ مکرمہ کے بہت سے شرفاء ومعززین نے یہ ڈرامہ دیکھا ہے طلبہ نے حضرت سعد بن معاذ، حضرت مقداد بن الاسود، حضرت عباس بن عبدالمطلب حضرت حکیم بن حزام، ابوجہل، ولید بن المغیرۃ کے کردار ادا کئے ہیں، اس ڈرامہ میں بار بار حضرت مقداد، حضرت بلال کو پردے کے پیچھے بھیجا جاتا ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر کے آئیں کہ ان کی کیا رائے ہے؟ ستم یہ ہے کہ یہ ڈرامہ مکہ مکرمہ کے تمام اخبارات میں دیکھنے والوں اور دکھلانے والوں کی تصویروں کے ساتھ شائع ہوا ہے اور تمام جرائد و اخبارات اس رُسوا کن ڈرامہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

اس وقت جریدہ "الندوۃ" شمارہ ۱۸، رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ کی یہ کٹنگ میرے سامنے ہے بعض دیکھنے والوں کا تو یہ کہنا ہے کہ اس سے کہیں زیادہ دردناک پہلو اس ڈرامہ کا یہ تھا کہ ڈرامہ کی رُوح یہ تھی کہ صحابۂ کرام کی زندگی ابتداءِ اسلام میں اسی طرح بسر ہوتی تھی کہ کفار کے قافلوں کو لوٹ کر اپنا گذارہ کریں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ؔ "چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی"

اسلام اور تاریخِ اسلام کے خلاف امریکہ اور یورپ کے شیاطین جو کام خود نہ کر سکے تھے وہ مسلمانوں سے کرا دیا فیاغربۃ الاسلام ویاغربۃ المسلمین۔ حرمین شریفین کے وہ علماء اور نجد و ریاض کے وہ مشائخ جن پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دارومدار ہے اور انہی کے فتاویٰ کی پورے ملک میں وقعت ہے بلکہ دینی ذمہ داری اور شرعی احتساب کا دارومدار انہی پر ہے وہ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ حکومت کی سیاسی مصالح اس تمدن و تہذیب کے اپنانے کی مقتضی ہیں ہم کچھ نہیں کر سکتے یا کچھ نہیں کہہ سکتے ؎

لمثل هذا يذوب القلب عن كمد

إن كان في القلب إسلام و إيمان!

ان فتنوں کو دیکھ کر، خصوصاً منبعِ وحی اور مرکزِ ایمان، ان بقاعِ مقدسہ، کے فتنوں کو دیکھ کر، یقین ہوتا جا رہا ہے کہ "قیامتِ کبریٰ" اب بالکل قریب آ چکی ہے۔ اصلاح کی کوئی اُمید نظر نہیں آتی اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں، انتہائی فکر اور تشویش اس کی ہے کہ حُجّاجِ کرام اور زائرین حرمِ اقدس ان حالات کو دیکھ کر کیا تاثرات اپنے دلوں میں لے کر آئیں گے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دین قرآن و سنت ہے وہ یقیناً محفوظ ہے، صحابہ کرام کی حیاتِ مقدسہ تاریخِ اسلام کے صفحات پر عیاں اور روشن ہے صحیح دین پر عمل کرنے والوں کی جماعتیں اور افراد بھی دنیا میں موجود ہیں لیکن بشریت کی کمزوری، نفس اور شیطان کی فریب کاری کے تحت یہ "بے علم" حجاج و زائرین ان قبیح مناظر کو دیکھنے کے بعد کیا تاثرات اختیار کریں گے؟ خدا ہی جانتا ہے، بس اللہ تعالیٰ کی ہی قدرت میں ہے کہ کوئی لطیفۂ غیبی ظاہر ہو اور دینی انقلاب آ جائے، وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

مسلمان کسے کہتے ہیں؟

"الرحیم" شمارہ ۸ ج ۵ بابت ماہِ رمضان ۱۳۸۷ھ کے "شذرات" پڑھ کر افسوس ہوا کہ مولانا

غلام مصطفیٰ صاحب جیسے عالم دین کی "ادارت" میں اور جناب ڈاکٹر عبدالواحد حالی پوتا کی "نگرانی" میں ایسی کھوکھلی باتیں لکھی گئی ہیں؟ تعجب ہے امام ابو یوسف کی کتاب الخراج سے صحیحین کی مشہور اور معروف حدیث کا ترجمہ نقل کیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اسلام صرف یہ ہے کہ "جو شخص بھی مسلمانوں کی طرح نماز پڑھے اور مسلمانوں کا ذبیحہ کھائے وہ مسلمان ہے۔" اور پھر اس حدیث کو امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا فتویٰ بتلایا ہے کہ امام موصوف نے اسلام کی یہی تعریف کی ہے بعد ازاں اس تحقیق سے یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ جب مدارِ اسلام اتنی ہی بات پر ہے تو موجودہ نام کے اسلامی فرقوں میں یہ "وحدت" اگر موجود ہے تو پھر کسی ایک فرقہ کو دوسرے فرقہ کی تکفیر کا حق نہیں ہے سب ہی مسلمان ہیں، نیز حکومت کو چاہیئے کہ وہ ایسا قانون بنائے کہ پاکستان کے سب فرقے مسلمان ہیں ان میں سے کسی کے کفر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ایسی صورت میں کوئی بھی اہل حق کسی بھی اہل باطل کو "کافر" کہنے کا قانوناً مجاز نہیں، اگر کہیں محترم مقالہ نگار کی نظر صحیح مسلم کی حدیث ((من قال لا إلٰه إلا الله دخل الجنة)) پر پڑ جاتی تو ان کے لئے معاملہ اس سے بھی زیادہ آسان ہو جاتا یعنی وہ کہہ دیتے کہ بس سارا اسلام یہی ہے کہ جو کوئی زبان سے لا إلٰه إلا الله کہہ دے وہ مسلمان ہے، لیجئے سارا جھنجٹ ہی ختم ہوا، افسوس کہ "دینی حقائق" پر لکھنے والے اور "دینی مجلّوں" میں لکھنے والے ایسے حضرات؟ پھر "علمی مجلّوں" میں اس قسم کی تحقیقات؟ حیرت انگیز نہیں تو کیا ہے؟ کیا صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور ان کے علاوہ کتبِ حدیث کی مستند و مشہور حدیث ابن عمرؓ بنی الإسلام علی خمس، شهادة أن لا إلٰه إلا الله، وأن محمد رسول الله، وإقام الصلاة وإيتاء الزكاة، وصوم رمضان والحج)) نظر سے نہیں گذری؟ اور صحیح بخاری و صحیح مسلم کی وہ حدیث جس میں حضرت صدیق اکبرؓ فرماتے ہیں: ((والله لأقاتلن من فرق بين الصلاة والزكاة)) اور اس کے بعد یہ فرمایا والله لو منعوني عناقاً كانوا يؤدونه إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم لقاتلتهم کیوں نظر نہیں آئی؟ تمام کے تمام ذخیرہ حدیث کو نظر انداز کر کے صرف کتاب الخراج کی ایک حدیث کو مدارِ استدلال بنا کر فیصلہ کر دینا، کیا یہی علمی تحقیق اور دیانت ہے؟ حدیثِ نبوی علیہ الصلاۃ والسلام کو اس طرح "بازیچۂ اطفال" بنانا کتنا افسوسناک امر ہے، نہ

صرف یہ بلکہ اسی بنیاد پر اپنے دلوں کی بھڑاس نکالنا اور حکومت کو مشورہ دینا کہ وہ ایسا قانون بنائے اور نافذ کرے کہ کوئی کسی کافر کو بھی کافر نہ کہہ سکے، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ قرآنِ کریم میں سے ایمان وکفر سے متعلق آیتوں کو بھی نکال دینا چاہیئے جن آیات میں «أولئك هم الكافرون حقاً» وغیرہ آیا ہے ان سب کو حذف کر دینا چاہیئے، اگر ایمان وکفر دو حقیقتیں ہیں جنت بھی ہے دوزخ بھی ہے تو کفر کے وجود سے استبعاد و انکار کے کیا معنی؟ اتنا بھی غور نہیں کیا گیا کہ علماءِ دین اگر حفاظتِ دین کی خاطر کسی "کافر" کے کفر کا "اظہار کرتے ہیں تو یہ ان کے دینی منصب کا تقاضا ہے وہ خود کسی کو کافر نہیں "بناتے" بلکہ وہ تو ایک کافر کو کافر "بتاتے" ہیں، پھر حکومت کو مشورہ دینا کہ تکفیر کو ممنوع قرار دیا جائے اس سے بہتر تو یہ ہے کہ یہ مشورہ دیا جائے کہ حکومت پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ بنا دیا جائے اور پاکستان کو لادینی مملکت قرار دے دیا جائے، لیکن مقالہ نگار خوب جانتے ہیں کہ سیکولر اسٹیٹ سے ان کا منشاء پورا نہیں ہوتا کیونکہ سیکولر اسٹیٹ میں ہر ہر شخص اپنے مسلک اور مذہب پر عمل کرنے کا مجاز ہوتا ہے اور خود حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، تمام اہل ملک کو مذہبی آزادی ہوتی ہے وہ تو پاکستان کو اس سے بھی آگے دیکھنا چاہتے ہیں کہ کسی کو بھی اس سرزمین پر مذہب پر عمل کرنے کا موقع ہی نہ دیا جائے، یہ بات تو لندن وامریکہ میں بھی نہیں ہے البتہ روس کی مملکت کی یہ خصوصیت ضرور ہے کہ وہاں کوئی بھی مذہب برداشت نہیں کیا جا سکتا، لہذا محترم مقالہ مقالہ نگار کے مشورے کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ حکومت کو کمیونسٹ بنانے کا مشورہ دے رہے ہیں بہت ممکن ہے کہ موصوف کی ضمیر کی آواز یہی ہو لیکن وہ اپنے مطلب کو ذرا عنوان بدل کر "در حدیثِ دیگراں" کے طور پر اس طرح کہنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو محسوس نہ ہو سکے، اللہ تعالیٰ اس ملک پر رحم فرمائیں اور مشیرانِ سوء سے حکومت کو بچائیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مملکت کا بڑا طبقہ دینِ اسلام کا حلقہ بگوش ہے اور اسلام کے نام پر ہی یہ مملکت وجود میں آئی ہے، صدرِ مملکت کا مسلمان ہونا بھی ضروری ہے لہذا دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ صدرِ مملکت کو صحیح اسلام پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں اور حقیقی اسلامی قانون کی تنفید کی توفیق ان کی رفیق کار ہو اور اسلام کے صحیح خد و خال اس ملک میں نمایاں ہوں اور ملاحدہ زنادقہ

ذلیل وخوار ہوں، نیز کمیونسٹوں اور امریکہ و برطانیہ کی سازشوں سے یہ مملکت محفوظ رہے۔

امت مرحومہ اور فتنے

(۱) حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ امتِ مرحومہ رحمۃ للعالمین کی برکت سے اگرچہ بہت سے ان عمومی امراض اور عمومی عذاب سے نجات پا چکی ہے جن میں پہلی امتیں مبتلا ہوئی ہیں لیکن اس کے باوجود مومنین کے ایمانی امتحان کے لئے اس امت کے ہر دور میں فتنوں کا ایک مسلسل تکوینی نظام جاری ہے حتیٰ کہ "فتنہ" نام ہی آزمائش کا ہو گیا اور جب بھی کوئی فتنہ عالمگیر صورت اختیار کر لیتا ہے تو روئے زمین کے تمام مخلصین و صالحین کے قلوب بھی اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتے اگرچہ وہ عملی طور پر اس سے ہر طرح محفوظ رہتے ہیں تاہم اعتقادی طور پر ان میں وہ ایمانی قوت و شدت باقی نہیں رہتی جو پہلے ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ عہدِ نبوت سے جتنا بُعد ہوتا جاتا ہے ان فتنوں کی اتنی ہی کثرت ہوتی جاتی ہے اور اسی نسبت سے ایمانوں میں ضعف نمایاں ہو جاتا ہے، جب بارشیں کثرت سے ہو جاتی ہیں تو ساری ہی فضا اور ہوا مرطوب اور نم ہو جاتی ہے اور جہاں جہاں ہوا کا نفوذ ہوتا ہے رطوبت اور نمی سرایت کر جاتی ہے دیکھا ہو گا کہ برسات کے موسم میں بارش کی کثرت سے بکسوں کے اندر بند لپٹے ہوئے کپڑوں میں بھی نمی پہنچ جاتی ہے ٹھیک اسی طرح فسق و فجور اور بداعمالی کے فتنوں کے دور میں صالحین کے قلوب بھی ان سے متأثر ہو جاتے ہیں اور حدیثِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام :-

"اللّٰھم إذا أردت بقوم فتنۃً فاقبضنی إلیك غیر مفتون"	الٰہی! جب تو کسی گروہ کو کسی فتنہ (آزمائش) میں ڈالنا چاہے تو مجھے (اس سے پہلے ہی) فتنہ (آزمائش) کے بغیر اپنے پاس اٹھا لے۔

میں شاید اسی مضمون کی طرف اشارہ ہو۔

فتنوں کی قسمیں ہر دور میں فتنوں کی مختلف صورتیں رہی ہیں لیکن بنیادی طور پر فتنے دو قسم کے ہوتے ہیں، (۱) ایک عملی فتنے (۲) دوسرے علمی فتنے۔

عملی فتنے گناہوں کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں جو امت میں عام ہو جاتی ہیں، زنا اور شراب کی کثرت، سود خوری ورشوت ستانی، بے حیائی وعریانی، رقص وسرود، اس کے نتیجہ میں استبداد، کذب وافترا، بدعہدی وبدمعاملگی وغیرہ یہ اخلاقی بیماریاں جو معاشرہ میں پیدا ہو جاتی ہیں ان کے مختلف اور متنوع وجوہ واسباب ہوتے ہیں، بہرصورت ان بداخلاقیوں اور بداعمالیوں کے اثرات نماز، روزہ زکاۃ، حج وغیرہ سارے ہی اعمالِ صالحہ پر پڑتے ہیں جتنی ان برائیوں میں کثرت وہمہ گیری پیدا ہوتی ہے اتنی ہی ان نیکیوں میں ضعف واضمحلال اور کمی آجاتی ہے۔

علمی فتنے علمی فتنے وہ ہوتے ہیں جو علوم وفنون کی راہ سے آتے ہیں تاریخِ اسلام میں ان علمی فتنوں کی مختلف صورتیں رہی ہیں، بہرصورت ان علمی فتنوں کا اثر براہِ راست اعتقاد پر پڑتا ہے۔ ان فتنوں میں سب سے زیادہ خطرناک فتنہ باطنیہ کا تھا جو قرامطہ کے دور میں ابھرا اور خوب پھلا پھولا، اس فتنہ کا سب سے بڑا اور بُرا نتیجہ یہ نکلا کہ دین میں الحاد وتحریف کا دروازہ کھل گیا اور اسلامی حقائق ضروریاتِ دین، متواتراتِ اسلام، بنیادی عقائد واعمال، مجمع علیہ شعائرِ اسلام میں تأویلوں اور تحریفوں کے دروازے کھل گئے۔

اس آخری دور میں یہ فتنہ بہت بڑے پیمانے پر تمام اسلامی ممالک میں یورپ سے درآمد ہونا شروع ہوا اور مستشرقینِ یورپ نے تو اس کو ایسا اپنا نصب العین بنالیا کہ درس وتدریس، تصنیف وتالیف، نشرواشاعت، تحقیق وریسرچ غرض ہر دلکش اور پُرفریب عنوان سے اس کے پیچھے پڑ گئے اپنی زندگیاں اس کے لئے وقف کردیں اور اسلام سے انتقام لینے کا اس کو ایک کارگر ترین حربہ قرار دے لیا، یہاں تک کہ جو طلبہ اسلامی ممالک سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگریاں حاصل کرنے کی غرض سے یورپین ممالک کا سفر کرتے ہیں، ان درس گاہوں میں ان طلبہ سے اسلامی موضوعات پر ایسے "مقالات" ومضامین" لکھواتے ہیں کہ وہ مسلمان طلبہ بھی اسلامی معتقدات کے بارے میں کم ازکم "تشکیک" کے اندر ضرور مبتلا ہو جاتے ہیں، یہ وہ دردناک داستانیں ہیں جن کی تفصیل کے لئے بے پایاں دفتر درکار ہیں، "مجمع الزوائد" میں حافظ نورالدین ہیثمی نے بحوالہ "معجمِ طبرانی" ایک حدیث بروایت

عصمة بن قیس سلمی صحابی نقل کی ہے :۔

إنه کان یتعوذ من فتنة المشرق ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فتنۂ مشرق سے پناہ مانگا کرتے تھے۔

قیل فکیف فتنة المغرب ؟ قال : آپ سے دریافت کیا گیا کہ مغرب میں بھی فتنہ ہوگا ؟

«تلك أعظم وأعظم » آپ نے فرمایا کہ وہ تو بہت ہی بڑا ہے بہت ہی بڑا ہے۔

یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کی مراد فتنۂ مغرب سے کیا ہے ہو سکتا ہے کہ سقوطِ اندلس کی طرف اشارہ ہو کہ وہاں اسلام کا پورا بیڑہ ہی غرق ہو گیا اور نام کا مسلمان بھی کوئی اس ملک میں نہ رہا، تمام ملک پر کفر کا استیلاء ہو گیا لیکن ہو سکتا ہے کہ بلادِ مغرب کے اس "فتنۂ استشراق" کی طرف بھی اشارہ ہو کہ الحاد و تحریف کا یہ فتنہ مغربی دروازوں سے ہی تمام دنیا کے مسلمان ملکوں میں داخل ہوگا جو سب فتنوں سے زیادہ خطرناک اور عالمگیر ہوگا، بہرحال الفاظِ حدیث کے عموم میں تو یہ داخل ہے ہی۔

فتنوں کا انسداد (۳) الغرض اس دور میں یہ علمی و عملی فتنے پورے زور و شور اور طاقت و قوت کے ساتھ اسلامی ممالک میں پھیل رہے ہیں، ہمارا ملک نسبتاً ان سے مامون و محفوظ تھا لیکن کچھ تو جدید تعلیم کے اثرات سے کچھ مستشرقین کی دسیسہ کاریوں سے نیز مواصلات کی آسانیوں سے اور مال و دولت کی فراوانی سے اب تو یہ ملک کچھ بعید نہیں کہ اس معاملہ میں دوسرے ممالک سے گوئے سبقت لے جائے۔

عرصہ سے جب بھی ان حالات کا جائزہ لیا گیا اور صورت حال پر غور و خوض کیا گیا کہ اس سیلاب کی روک تھام کے لئے یا عمومی اصلاح احوال کے لئے کون کون سے افراد یا جماعتیں کام کر رہی ہیں؟ اور یہ فرض کفایہ انجام پذیر ہو رہا ہے یا نہیں ؟ اور یہ دینی درسگاہیں جو پشاور سے لے کر چاٹگام تک پھیلی ہوئی ہیں یہ موجودہ ملک گیر امراض کے لئے "نسخۂ شفا" ہیں یا نہیں ؟ جب بھی پورا جائزہ کامل غور و خوض سے لیا گیا نتیجہ یہی نکلا کہ "مرض کا پورا علاج نہیں ہو رہا" حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کے خلفِ رشید حضرت مولانا محمد یوسف رحمہما اللہ کی جماعت جس کا بعد میں جاکر تبلیغی جماعت" نام پڑ گیا ہے سب جماعتوں سے بہتر خدمت انجام دے رہی ہے اور اس کے برکات دور دراز تک پہنچ رہے ہیں اور معاشرے میں جو عملی فتنے پیدا ہو رہے ہیں ان کے ازالہ کے لئے "اکسیری علاج" کا کام کر رہی ہے لیکن موجودہ حالات میں انقلاب برپا کرنے اور مکمل اصلاحِ

احوال کے لئے جس عمومی اور ہمہ گیر جدو جہد کی ضرورت ہے ابھی تک اس معیار پر کام نہیں ہو رہا، بایں ہمہ اگر یہ جماعت کچھ اور عموم اور مزید توجہ و اہتمام کے ساتھ بھی یہ خدمت انجام دینے لگے، تب بھی اس کا دائرۂ کار "عملی فتنوں" کی اصلاح تک محدود رہے گا، "علمی فتنے" اس جماعت کے دائرۂ اصلاح سے بالکل باہر ہیں۔

اس لئے آرزو تھی کہ کوئی جماعت ایسی جامع ہو کہ علمی اور عملی دونوں قسم کے فتنوں کی اصلاح کی طرف قدم اٹھائے لیکن اس کا تانا بانا اسی تبلیغی جماعت کے طریق کار پر رکھا جائے کہ نہ اس کا کوئی صدر و سیکرٹری ہو نہ کہیں اس کا دفتر ہو نہ خزانہ ہو۔

اس سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم سے مختلف اوقات میں گفتگو ہوتی رہی اور ہم دونوں اس نتیجہ پر پہنچے کہ جو دینی درس گاہیں ہم چلا رہے ہیں اگرچہ وہ بھی ایک ٹھوس اور بنیادی خدمت ہے اور دہریت کے سیلاب کے دفاع کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار بھی نہیں ہے لیکن بحالت موجودہ ہماری مسئولیت اس پر ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس سے زیادہ محنت اور وسعت کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے اور جب تک ان علمی اور عملی فتنوں کے دفاع کے لئے اپنے "مدرسہ" اور دارالعلوم میں جتنی اہمیت و توجہ کے ساتھ کام نہ کیا جائے گا یہ مقصد انجام پذیر نہ ہوگا اور ہم مسئولیت سے سبکدوش نہ ہوں گے۔

کام کی وسعت اور ہمہ گیری اور اس کے مقابلہ پر اپنی کم ہمتی اور اس سے بھی زیادہ کوتاہ دستی کی طرف جب نظر جاتی تھی تو حوصلہ پست ہو جاتا، لیکن جتنا سوچا آخرت کی مسئولیت اور جواب دہی کا احساس شدت کے ساتھ بڑھتا رہا تا اینکہ بہر صورت پہلو تہی اور روگردانی کی کوئی گنجائش نہ رہی اور عزم مصمم کر لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا تو توکلاً علی اللہ اس بے سرو سامانی سے قطع نظر کر کے حضرت مفتی صاحب کی قیادت میں قدم اٹھانے کا عزم کر لیا۔

اور ہم دونوں نے چند اپنے ہمنوا اور شریک احساس علما، اور ارباب صحافت کو بالکل "غیر رسمی" طور پر کراچی میں جمع کر کے اس جماعت کا ایک ابتدائی ڈھانچہ تیار کر لیا جس کی تفصیلات حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کی افتتاحی تقریر، اس جماعت کے اغراض و مقاصد، نظام اور طریق کار میں آپ ملاحظہ فرمائیں:۔

مجلس دعوت و اصلاح کا قیام

علماء کے اجتماع میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی افتتاحی تقریر

اہلِ علم اور اہلِ دین کو یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت مسلمان اپنی غیر معمولی عددی اکثریت اور بہت سی آزاد و خود مختار سلطنتوں کے مالک ہونے کے باوجود کن دل دوز حالات سے گذر رہے ہیں، دینی، علمی، اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی جس حیثیت سے بھی پوری مسلم قوم کا جائزہ لیا جائے تو ایک ایسا بھیانک منظر سامنے آجاتا ہے کہ اس کے عواقب کے تصور سے رُوح کانپ اٹھتی ہے۔

ظہر الفساد فی البر و البحر بما کسبت أیدی الناس (ظاہر ہو گیا فساد خشکی اور تری میں لوگوں کے اپنے اعمال کی وجہ سے) ع پنبہ کجا کجا نہم تن ہمہ داغدار شد

ہمارے اپنے ملک میں ہماری آنکھوں کے سامنے عیسائی مشنریوں نے پورے ملک پر یلغار کی ہوئی ہے، طرح طرح کے لالچوں اور مختلف حیلوں سے بڑی تیزی کے ساتھ لوگوں کو دینِ حق سے مرتد بنا رہے ہیں۔

دوسری طرف مسلمانوں کی صفوں میں کچھ ایسے عناصر پیدا ہو گئے ہیں جو اصلی اسلام کو مسخ و محرف کر کے اپنی اغراض و اہواء کے مطابق "اسلام کا جدید ایڈیشن" تیار کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ "اسلامی ریسرچ" اور "اسلامی ثقافت" کے نام پر وہ سب کچھ کیا جا رہا ہے جو "مستشرقین" کے اسلام دشمن حلقے اب تک نہ کر سکے تھے۔ "شعائر اسلام" کو مجروح اور اسلام کے "اجماعی" اور "متفق علیہ" اصول و احکام کو مشکوک بنانے کی "سعی پیہم" قوم کے لاکھوں روپے کے صرفہ سے جاری ہے۔

اس صورتِ حال کے نتیجہ میں بے حیائی، عریانی، رقص و سرود، بے حجابی، اغوا، بدکاری، شراب نوشی، قمار بازی، معاشرتی افراتفری اور خاندانی نظم کی ابتری کا ایک سیلاب ہے جو مسلمانوں میں امڈا چلا آرہا ہے۔ سُود، دھوکہ فریب، جعلسازی اور دوسرے اخلاقی معائب معاشرے کی ایمانی اور اخلاقی حس کو مضمحل سے مضمحل تر کئے جا رہے ہیں اور عام "نظم و نسق" کا تعطل اس حد تک شدید ہو چکا ہے کہ ایک عام آدمی کے لئے حصولِ انصاف تقریباً ناممکن ہو چکا ہے۔

یہ سیلاب مغربی تہذیب کے گہواروں سے شروع ہوا اور اب دیندار مسلمانوں تک کے گھروں میں گھس چکا ہے اور اکابرِ علماء و اتقیاء کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے اور یہ بات یقینی دکھائی دے رہی ہے کہ اگر اس سیلاب کو روکنے کی جدوجہد میں اہلِ حق نے اپنے تمام وسائل داؤں پر نہ لگا دیئے تو چند سالوں کے بعد ہلاکت آفرین طوفان کے مقابلہ کی سکت ہی باقی نہ رہے گی۔

دینی درسگاہوں اور اداروں کی اول تو کوئی معتدبہ تعداد ہی نہیں اور جو ہیں وہ بھی کسمپرسی کے عالم میں ہیں اور جو کچھ کام کر رہے ہیں ان کا بھی حلقۂ اعانت و ہمدردی روز بروز سمٹ رہا ہے، اسی لئے ان اداروں کے اثرات مدھم سے مدھم تر ہوتے جا رہے ہیں اور ان اداروں سے اب ایسی شخصیتیں نہیں ابھر رہیں جو الحاد و زندقہ اور ضلالتِ جدیدہ کے علی الرغم علمِ اسلام " کو ہمت وجرأت سے بلند کر سکیں اور دعوت الی اللہ کے تقاضے کو پورا کر سکیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دینی درسگاہوں اور اداروں میں بھی فکرِ آخرت سے زیادہ جاہ ومال کی طلب غالب ہونے لگی ہے اور روحانی قدروں پر مادیت غالب آتی جا رہی ہے۔

ان حالات میں نگاہیں بار بار ان چند اصحابِ فکر وعمل کی جانب اٹھتی ہیں جو ماحول کی نامساعدت کے علی الرغم عند اللہ مسئولیت کا احساس رکھتے ہیں جن کی نظریں ان فتنوں پر بھی ہیں جن کی نشاندہی ابھی کی گئی ہے اور جو اپنی اپنی حد تک ادائیگی فرض میں کوشاں بھی ہیں۔

ان حضرات کی اکثریت دینی اداروں سے متعلق ہے کچھ دینی تعلیمی اداروں کو چلا رہے ہیں اور کچھ تصنیف وتألیف افتاء، اور اپنے افکار کی نشر واشاعت نیز لادینی، الحاد اور تجدد کی تردید میں مصروف ہیں، بلاشبہ ان حضرات کی تعداد بہت کم ہے لیکن اگر ان کی مساعی حسنہ کو منظم کر لیا جائے تو یہ امید بندھتی ہے کہ اس الحاد وبے دینی اور اشاعتِ فواحش ومنکرات کے سیلاب کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کچھ بعید نہیں کہ ہمارے ضعف و ناتوانی کو دیکھ کر وہ ان حقیر مساعی میں حالات کا رُخ بدلنے کی قوت واستعداد پیدا فرما دیں۔ وما ذٰلک علی اللہ بعزیز۔

یہاں یہ عرض کرنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ ہم دین کی خدمت کرنے والے چند ایسی الجھنوں میں بھی پھنسے ہوئے ہیں جو ہماری دینی مساعی کے ثمر آور ہونے میں مانع ہیں بلکہ بے دینی کے اس

سیلاب کو ہمارے ان "مشاغل" سے مدد بہم پہنچ رہی ہیں.

موانعات کے اس سلسلہ کی پہلی کڑی یہ ہے کہ دین کے نام پر کام کرنے والے بہت سے اہلِ علم خود فروعی مسائل پر مناظروں مباحثوں اور ان کے نتیجہ میں جنگ وجدال کے اندر ایسے گرفتار ہیں کہ اولاً تو یہ جھگڑے انہیں یہ سوچنے کی فرصت ہی نہیں دیتے کہ اسلام اور قرآن ان کو کس محاذ پر اپنی طاقت صرف کرنے کے لئے پکار رہا ہے اور وہ کہاں اپنی توانائی ضائع کر رہے ہیں ثانیاً الحاد و بے دینی اور تجدد پسندی اور بداعمالی و بداخلاقی کا جو طوفان پورے عالمِ اسلام کو اپنے لپیٹ میں لئے ہوئے ہے. یہ تگ ودو جو باہمی مناقشات کی صورت میں کر رہے ہیں اس طوفان سے صرفِ نظر کا سبب بن رہی ہے اور ہم اس کی ہلاکت و بربادی کے صحیح شعور سے ہی محروم ہوتے چلے جا رہے ہیں.

یہ صورتِ حال اس امر کی متقاضی ہے کہ دین کا علم اور عند اللہ مسئولیت کے قوی احساس کے تحت اس عالمگیر فساد کی اصلاح کا قومی داعیہ رکھنے والے حضرات کی دینی مساعی کو ایک ایسے اجتماعی نظم کے تحت منظم کیا جائے جو مروجہ قسم کی جماعت سازی کے بجائے اسلام کے اصولِ اجتماعیت تعاونوا علی البر والتقوی اور ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم کے تحت قائم ہو، رسمی تکلفات اور پابندیوں سے مبرا ہو اور امت میں کسی قسم کے تحزب اور تشتت کا باعث بننے کے بجائے باہمی ائتلاف و اتحاد کا ذریعہ ہو.

مگر افسوس ہے کہ میں اپنی عمر کے اس حصہ سے گذر رہا ہوں کہ جس میں عادتاً سابقہ مشاغل بھی چھوڑ کر یکسوئی کی زندگی موزوں ہوتی ہے، قویٰ کا انحطاط ہے، حافظہ غائب ہوتا جا رہا ہے، ایسی حالت میں کسی نئے کام کے آغاز کی کوئی صورت نہ تھی مگر اس وقت میرے محب محترم مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے (بارک اللہ فی علمہ وعافیتہ) ہمت بندھائی اور اس کام کا بار اٹھانے کے لئے مخلصانہ جدوجہد پر کمربستہ ہوگئے، ان کا علم وفضل محتاج تعارف نہیں، اصلاحِ مفاسد کے لئے ان کی بے چینی کا جذبہ مجھ جیسے بوڑھے کے لئے ایک "طاقت کا انجکشن" بن گیا اور دونوں نے مل کر کچھ اور اہلِ فکر حضرات کو جمع کرنے کا پروگرام بنایا.

یہ ظاہر ہے کہ یہ دعوت تمام رسمی تکلفات تنظیمی اور جماعتی بندھنوں سے بالاتر ہے، اسی لئے وقتی طور پر جن حضرات اہلِ فکر و عمل کے اسماءِ گرامی زیرِ مشورہ آئے ان کو دعوت دی گئی نہ اس میں حضرات علماء کا انحصار ہے نہ اہلِ فکر و بصیرت کا بلکہ ایک کام کو سادگی کے ساتھ شروع کرنے کے لئے چند حضرات کا مشورہ اس وقت کافی سمجھا گیا، آگے اللہ تعالےٰ اس کام کو بڑھائیں اور قبول فرمائیں تو اس حلقہ کی توسیع اور دوسرے حضرات کا اشتراک و اجتماع انشاء اللہ بڑھتا رہے گا۔

اس نظام کو چونکہ سیاسی اور رسمی تنظیموں سے مختلف بالکل سادہ رکھنا مطلوب ہے اس لئے ابتدا میں تو خیال تھا کہ اس نظام کا کوئی خاص نام بھی نہ رکھا جائے مگر کام کی سہولت کے پیشِ نظر بعض حضرات کے مشورہ سے اس رائے کو ترجیح حاصل ہوئی کہ اس نظام کا نام "مجلسِ دعوت و اصلاح" رکھ دیا جائے۔

مجلس دعوت واصلاح کے مقاصد

مقاصد (۱) الحاد و ارتداد بے دینی اور تحریفِ دین اور مجمع علیہ منکرات کے سدباب کے لئے زبانی اور تحریری جدوجہد۔

(۲) مسلمانوں کے مختلف طبقات کے گروہی اختلافات کو معتدل کرکے سب کو مجمع علیہ فواحش و محرمات اور تحریف و الحاد کی مدافعت پر جمع کرنا۔

(۳) جدید پیش آنے والے مسائل میں انفرادی فتوؤں کے بجائے باہم مشورہ سے تحقیقی اور اجتماعی فیصلے پیش کرنا۔

تشریح (۱) الحاد و ارتداد کے ذیل میں عیسائی مشنریوں کی یلغار، انکارِ حدیث، انکارِ ختمِ نبوت وغیرہ کے فتنے بھی شامل ہیں۔

(۲) بے دینی اور تحریف دین کے ذیل میں "اسلامی ثقافت" اسلامی ریسرچ کے نام پر پیدا کئے ہوئے شکوک و شبہات جن کے ذریعہ سود، شراب، قمار، بے حیائی وغیرہ محرمات شرعیہ کے جواز کے راستے نکالے جارہے ہیں اور مغربی تہذیب و تمدن کی پیداوار منکرات مثلاً بے حجابی، بادہ نوشی، مرد و زن کا بے محابہ اختلاط، عریانی فحاشی، رقص و سرود کی محفلیں، اسراف وغیرہ منکرات شامل ہیں۔ دین اور علم دین سے عام بیگانگی اور عقیدۂ آخرت و فکرِ آخرت سے غفلت کے پیدا کردہ جرائم

مثلاً جھوٹ، فریب، رشوت دھوکا دہی، جعلسازی اور ترکِ نماز و روزہ وغیرہ شامل ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ مقاصد اتنے کثیر اور وسیع ہیں کہ کوئی ایک جماعت یا ملک کا کوئی ایک حصہ ان سب کا بیک وقت احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ پاکستان کے ہر ہر حصہ میں اہلِ حق کی جماعتوں کے لئے اشتراکِ عمل کا دروازہ کھلا رکھا جائے اور الاھم فالاھم کے قاعدہ سے انتخاب اور پھر تقسیمِ کار کے اصول پر کام کیا جائے اور عملی قدم اٹھایا جائے اور جماعت کے چند ذمہ دار افراد اس کی تعیین کا کام کریں۔

نوعیتِ نظام (۱) یہ نظام خالصاً تبلیغی اور اصلاحی ہوگا، مروجہ سیاسی طریقوں سے بالخصوص انتخابات کے ذریعہ نمائندگی، نیز حصولِ اقتدار کی کشمکش میں حصہ لینے سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔

(۲) ملک کے حالات اور عوامی جماعتوں کے طویل تجربہ کی بنیاد پر اس نظام کے لئے کوئی رسمی قسم کی جمہوری جماعت بنانا پیش نظر نہیں جس کے لئے ممبر سازی اور عہدوں، منصبوں کی ضرورت پیش آئے بلکہ ملک کے اطراف میں جہاں جہاں جو مخلص حضرات اس کام کی فکر رکھتے ہیں وہ اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اپنے کام میں آزاد و خودمختار رہتے ہوئے اس کام کی نوعیت اور طریقِ کار میں ایک معاہدہ کے پابند ہوں گے جس کی تفصیل ذیل میں درج ہے، اس طرح یہ نظام ایک "معاہداتی وفاق" کی حیثیت رکھے گا اور عند اللہ مسئولیت کی اساس پر قائم اور جاری رہے گا۔

اس نظام کے شرکاء مندرجہ ذیل امور کا معاہدہ کریں گے:۔

(الف) ہم خالصاً لوجہ اللہ مقاصدِ ثلاثہ مذکورہ کو اپنے سب کاموں سے زیادہ اہمیت دیں گے اور موجودہ مشاغل میں سے اس کام کے لئے معتد بہ وقت نکالیں گے۔

(ب) الحادِ بے دینی اور مجمع علیہ منکرات و محرمات کے ازالہ کی جد و جہد اور اپنے اپنے اقربا و احباب نیز معاشرہ کے ہر طبقہ بشمول حکمران و فرمانروایانِ ملک سب کی اصلاح ہمارا مقصدِ اول ہوگا۔

(ج) فروعی اور گروہی مسائل کی بحثوں کو معتدل کرنے اور گرانے کی جد و جہد کریں گے جس کی صورت یہ ہوگی کہ ان بحثوں کو صرف حلقۂ درس و فتویٰ اور خالص علمی مجالس تک محدود رکھا جائے گا۔ اس کے لئے عام اخباری اور عوامی ذرائع استعمال نہ کئے جائیں گے، مجتہد فیہ مسائل میں اپنے اپنے مختار مسلک پر عمل کریں گے مگر مخالف پر نکیر نہ کریں گے اور منکراتِ شرعیہ پر نکیر میں بھی حکمت و موعظت

اور مجادلة بالتی ھی أحسن کے اصول کو نظر انداز نہ کریں گے، طنز اور طعن وتشنیع سے ہمیشہ گریز کریں گے۔

(۳) اس نظام کو قائم کرنے اور برقرار رکھنے کے لئے ایک مختصر سی اساسی مجلس شوریٰ ایسے علماء پر مشتمل ہوگی جن کے علمی کارنامے معروف ہوں اور ان کے تقویٰ و دیانت پر عام طور سے اعتماد پایا جاتا ہو، یہ جماعت اپنا ایک امیر منتخب کرے گی اور اپنے اصولِ کار خود طے کریگی۔ ملک میں کام کرنے والے حلقے اس جماعت سے منسلک ہوں گے۔ اہم امور میں اس مرکزی نظم قائم کرنے والی جماعت سے مشورہ لیا کریں گے۔

(۴) یہ مجلس ان کام کرنے والے حلقوں کی ضروری نگرانی اور دوسرے جدید حلقے پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہے گی۔

(۵) یہ جماعت اپنے تمام حلقہ ہائے کار کے ذمہ داروں کا زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کے بعد ملک کے مختلف شہروں میں اجتماع کرنے کا انتظام کرے گی جن میں سابقہ کارکردگی کا جائزہ اور آئندہ کے کام کا پروگرام باہمی مشورہ سے طے کیا جائے گا۔

(۶) دعوت واصلاح کے اس نظام میں ملک کے دونوں بازو مغربی اور مشرقی شریک ہوں گے، سہولتِ کار کی غرض سے مشرقی پاکستان میں اسی طرح کی ایک مجلس شوریٰ بنائی جائے گی اور دونوں مجلسوں کے باہمی مشورہ اور اشتراک وارتباط کا طریقہ مشورہ سے طے کرلیا جائے گا۔

(۷) یہ جماعت اس کا بھی انتظام کرے گی کہ نئے پیش آنے والے مسائل میں انفرادی فتاویٰ کے بجائے ملک کے ارباب فتویٰ کی رائیں حاصل کرے اور ضرورت ہو تو ان حضرات میں سے جن کی ضرورت محسوس ہو، ان کو جمع کرکے کسی ایک نتیجہ پر پہنچے اور پھر علماء کی تصدیقات حاصل کرکے ان کو شائع کرے تاکہ عوام بھی انتشار میں مبتلا نہ ہوں اور علماء کو بھی زیر بحث مسئلے کے تمام پہلو سامنے آجانے کے بعد صحیح رائے قائم کرنے میں مدد ملے، اس کام کے لئے اگر کسی مسئلہ کی تحقیق میں کسی خاص فن کی تحقیق ضروری ہو تو اس فن کے ماہرین کو بھی علماء کی مجلس میں جمع کرکے ان کی تحقیق سے فائدہ اٹھایا جائے، نیز مشکلات کے حل میں بحیثیتِ مجموعی کتاب وسنت اور پوری فقہ اسلامی کو بطور اساس سامنے رکھا جائے گا جیساکہ ہر اسلامی دور میں ہوتا رہا ہے، اسی طرح کوئی طبی مسئلہ ہوگا

تو ماہرین فن اطباء اور ڈاکٹروں سے اور سائنسی مسئلہ ہے تو ماہرینِ سائنس سے علیٰ ہذا دوسرے فنون کے ماہرین سے اس کے حل کرنے میں مدد لی جائے گی۔

(۸) سردست یہ اساسی شوریٰ "مجلسِ دعوت و اصلاح مغربی پاکستان کے مندرجہ ذیل افراد سے تشکیل کی جاتی ہے۔

(۱) مفتی محمد شفیع (۲) حضرت مولانا محمد یوسف بنوری (۳) حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی۔
(۴) حضرت مولانا عبدالحق صاحب اکوڑہ خٹک (۵) حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب گوجرانوالہ۔
(۶) حضرت مولانا امین احسن صاحب اصلاحی (۷) حضرت مولانا خان محمد صاحب کندیاں شریف۔

طریقِ کار (۱) ملک کے جن حصوں میں اصلاحِ مفاسد کا کچھ کام ہو رہا ہے اس کو فروعی اور گروہی مسائل میں صرف کرنے کے بجائے مجمع علیہ منکرات اور الحاد و تحریف دین کے فتنوں کی طرف متوجہ کرنا اور "پیغمبرانہ طریقِ دعوت" کے اصول کو اپنانے کی دعوت دینا۔

(۲) ملک کے عام علماء سے روابط پیدا کرنا اور ان کو مذکورہ بالا طریق پر کام کرنے کے لئے آمادہ کرنا۔

(۳) خطباتِ جمعہ اور عام مجلس میں عوام کو ان فتنوں سے متنبہ کرنا اور ان میں فکرِ آخرت اور ان کا دینی شعور بیدار کرنا خصوصاً نماز باجماعت کی پابندی اور ضروری علمِ دین سیکھنے اور اپنے گھر والوں کو سکھانے کی دعوت دینا، اخلاق، معاملات اور ادائے حقوق اور اسلام کی سادہ معاشرت اختیار کرنے کی جانب متوجہ کرنا مسلمانوں کو مغرب کی مہنگی اور گندی معاشرت سے نجات دلانے کی جدوجہد کرنا۔

(۴) دینی مدارس اور اداروں سے ارتباط پیدا کر کے ان کو مندرجہ ذیل امور کے لئے آمادہ کرنا۔

(الف) ضروریاتِ دین اور ناظرہ قرآن کی تعلیم کے مکاتب حسبِ استطاعت ہر محلہ میں قائم کرنا۔

(ب) بڑی بڑی مساجد میں عوامی درسِ قرآن اور درسِ حدیث جاری کرنا۔

(ج) مغربی تعلیم یافتہ حضرات کو دینی معلومات بہم پہنچانے اور تحریف دین کے دسائس سے آگاہ کرنے کے لئے شبینہ کلاسیں جاری کرنا اور خصوصی مجالس میں ان موضوعات پر مذاکرے اور مباحثے منعقد کرنا۔

(د) ناخواندہ عوام کو ضروریات دین سے واقف کرنے کے لئے عوامی شبینہ کلاسوں کا انتظام کرنا، جن میں ایسا نصاب پڑھایا جائے جو محدود وقت میں دین کی بنیادی معلومات بہم پہنچانے

کا ذریعہ ہو۔

(۴) خطباء کی خصوصی تربیت کا انتظام کرنا تاکہ وہ بھی دعوت اِلی اللہ اور تبلیغِ دین کا کام مؤثر اور نتیجہ خیز طریق پر انجام دے سکیں۔

(۵) تعلیم یافتہ اور مغربی تعلیم کے اداروں، حکمراں طبقوں، تجارتی حلقوں اخبارات وجرائد اور معاشرہ کے دوسرے عناصر کو ان کے فرائض اور ذمہ داریوں کی جانب متوجہ کرنے کے لئے تحریر وتقریر کا خصوصی مجلسوں ملاقاتوں وغیرہ کے ذریعہ اہتمام وانصرام کرنا۔

جمادی الاولیٰ ۱۳۸۵ھ، ستمبر ۱۹۶۵ء

فتنے اور اُمّتِ محمّدیہ

حق تعالیٰ جلّ ذِکرُہٗ نے اُمتِ محمدیہ کے لئے جس ہادی ورسول کا انتخاب فرمایا، (صلی اللہ علیہ وسلم) اسے رَحمۃً لِلعٰلمِین بنایا، اس رحمت کا ظہور بہت سی شکلوں میں ہوا، ان میں سے ایک یہ ہے کہ تمام اُمت ــــ خواہ وہ دعوتِ محمدیہ کے سایہ میں آئی ہو یا نہ آئی ہو ــــ اس رحمتِ عامہ کی بدولت عام عذابِ الٰہی سے محفوظ ہو گئی، پہلی امتوں پر طرح طرح کے عذابِ عام نازل ہوئے جن سے پوری پوری امتیں تباہ وبرباد کر دی گئیں، بعض کو بندر اور خنزیر کی شکل میں مسخ کر دیا گیا، بعض پر آسمان سے پتھر برسائے گئے، بعض کو زمین میں دھنسا دیا گیا، بعض کو طوفان کی نذر کر دیا گیا۔ اور بعض کو سمندر میں غرق کر دیا گیا، حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو ان سے محفوظ رکھا۔

صحیح بخاری وغیرہ کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی:ــــ

(قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْکُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِکُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِکُمْ اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا وَّیُذِیْقَ بَعْضَکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ) (الانعام ع ۸)	تو کہہ اس کو قدرت ہے اس پر کہ بھیجے تم پر عذاب اوپر سے (جیسے پتھر برسنا یا طوفانی ہوا اور بارش، یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے (جیسے زلزلہ اور سیلاب وغیرہ) یا بھڑا دے تم کو مختلف فرقے کر کے اور چکھا دے ایک کو لڑائی ایک کی (ترجمہ شیخ الہند)

جس میں تین قسم کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے: آسمانی عذاب، زمین کا عذاب اور باہمی

اختلاف کا عذاب .) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی قسم کے عذاب سے نجات کی دعا فرمائی اور وہ قبول ہوئی، پھر دوسری قسم کے عذاب سے نجات کی دعا کی اور وہ بھی قبول ہوئی، جب تیسری قسم کے عذاب سے نجات کی دعا فرمائی تو قبول نہیں ہوئی، جس سے معلوم ہوا کہ اس اُمت کا عذاب آپس کا اختلاف و نزاع ہوگا۔

اس اختلاف کی صورتیں مختلف رہی ہیں۔ یہ کبھی باہمی خانہ جنگی اور قتل و قتال کی صورت میں ظاہر ہوا، کبھی باہمی نزاع و جدال کی صورت میں نمودار ہوا، کبھی شقاق و افتراق کے راستے سے آیا اور کبھی بدظنی و بدگمانی، طعن و تشنیع اور لعنت و ملامت کی صورت میں اُبھرا۔

اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ خلیفۂ مظلوم سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اس امت پر فتنوں کا دروازہ کھل گیا، جنگِ جمل، جنگ صفین، واقعہ حرہ، واقعہ دیر الجماجم، واقعہ کربلا اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت وغیرہ اسی دردناک سلسلہ کی کڑیاں ہیں، بہرحال اس امت میں ابتدا ہی سے فتنوں کا دور شروع ہوا اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اُمت میں فتنوں کا دور کم و بیش برابر جاری رہے گا، فرق یہ ہے کہ دورِ اول میں عہدِ نبوت کے قُرب کی وجہ سے امت کا ایمان قوی تھا، یہی وجہ ہے کہ شدید ترین اختلاف اور جدال و قتال کے باوجود دورِ اول کے تمام فتنے اُمت کے ایمان کو متزلزل نہیں کرسکے۔ بلکہ تمام مسلمانوں کا ایمان اپنی جگہ قائم و راسخ رہا۔

سب سے بڑا اور خطرناک فتنہ وہ ہوتا ہے جس سے زوالِ ایمان کا خطرہ پیدا ہو جائے، اگرچہ اپنی ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے وہ معمولی معلوم ہوتا ہو، چنانچہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کا سب سے بڑا فتنہ دجالِ لعین کا فتنہ ہوگا جو خدائی کا دعویٰ کرے گا اور ہر قسم کے دجل و فریب سے لوگوں کے ایمان کو غارت کرے گا، یہ فتنہ اگرچہ قیامت کے بالکل قریب ہوگا، اور قیامت کی علاماتِ کبریٰ میں سے ہوگا تاہم اس کی شدت و اہمیت کی بنا پر ہر نبی و رسول نے اپنی اپنی امتوں کو اس فتنہ سے ڈرایا اور اس کے ایمان سوز نتائج و عواقب سے آگاہ کیا مگر چونکہ اس فتنہ کا ظہور امتِ محمدیہ کے عہد میں ہونا تھا اور اس فتنۂ کبریٰ سے براہ راست اسی

اُمّت کا تعلق تھا، اس لئے حضرت رسالت پناہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت وضاحت و صراحت کے ساتھ اس سے ڈرایا اور اس کی واضح علامتیں بیان فرمائیں تاکہ ہر شخص دجّالی فتنہ کو پہچان سکے اور امت گمراہی سے بچے۔ الغرض زوالِ ایمان کا فتنہ تو سب سے بڑا فتنہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے۔ اور اس کا ظہور بھی اُمت کے بالکل آخری دور میں ہوگا۔ لیکن اس کے علاوہ ہر دور میں جن فتنوں کا ظہور ہوتا رہا ہے۔ وہ اعمال و اخلاق، بدعت و الحاد اور تشتّت و افتراق کے فتنے ہیں۔

ہمارا یہ دور جس سے ہم گذر رہے ہیں، گوناگوں فتنوں کی آماجگاہ ہے، ہر طرف سے مختلف قسم کے فتنوں کی یورش ہے ان میں سب سے زیادہ جن فتنوں سے اُمت کو واسطہ پڑا ہے وہ اخلاقی و عملی فتنے ہیں، عوام زیادہ تر اخلاقی فتنوں میں مبتلا اور بدعملی کے فتنوں کا شکار ہیں، فریضۂ نماز میں تساہل، فریضۂ صیام سے تغافل، فریضۂ حج و زکوٰۃ میں تکاسل، وغیرہ وغیرہ۔ عبادات ہوں یا اخلاق، معاملات ہوں یا معاشرت ہر شعبۂ دین میں بدعملی کا دور دورہ ہے اور بہت سے فتنے اس بدعملی کے نتائج ہیں۔

ملک میں شراب نوشی، عریانی و بیحیائی، فواحش و منکرات، مرد و زن کے مخلوط اجتماعات، مخلوط تعلیم، تھیٹر اور سینما، ریڈیو اور ٹیلیویژن، زنا اور بدمعاشی، بداخلاقی و بداطواری، لوٹ مار، چوری اور ڈاکہ، رشوت و خیانت، جھوٹ اور بہتان طرازی، غیبت اور چغلی، حرام خوری کی نت نئی صورتیں، حرصِ دنیا کی خاطر اشیاءِ خوردنی میں ملاوٹ۔

کہاں تک شمار کیا جائے، بے شمار برائیاں ہیں جو دورِ حاضر میں اس کثرت سے ظاہر ہوئیں کہ پچھلے زمانوں میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، عقل حیران اور انسانی ضمیر انگشت بدنداں ہے کہ یا اللہ! دنیا کیا سے کیا ہو گئی؟ اگر آج قرونِ اولیٰ کے مسلمان زندہ ہو کر آجائیں اور اس دور کے مدعیٔ اسلام مسلمانوں کے اخلاق و عمل کا یہ نقشہ دیکھیں تو خدا جانے کیا کہیں اور ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کریں، نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۔

بہرحال یہ فتنے اور یہ امراض تو وہ ہیں جن میں زیادہ عوام مبتلا ہیں، اب ذرا خواص اُمت پر بھی سرسری نگاہ ڈالئے۔ یہ حقیقت ہے کہ علماءِ کرام اس عالم کا دل و دماغ ہیں اور عوامِ امت

بمنزلہ اعضائے انسانی کے ہیں، علمائے امت کا مقام وہی ہے جو انسانی جسم میں قوائے رئیسہ ۔ دل و دماغ جگر اور گردوں کا ہے۔ اعضائے رئیسہ اپنا کام ٹھیک ٹھیک کر رہے ہوں تو جسم کسی اندرونی مرض کا شکار نہیں ہوتا اور بیرونی آفات و صدمات کے مقابلہ میں پوری قوتِ مدافعت رکھتا ہے، عام اعضائے انسانی کا نقص، اعضائے رئیسہ کے اختلال کی نشاندہی کرتا ہے اور ظاہر جسم کی خرابی اکثر و بیشتر جسم کی اندرونی قوتوں کی خرابی سے ہوتی ہے، اسی طرح عوام امت میں خرابی زیادہ تر علماء اُمت کی خرابی و فساد سے ظہور میں آتی ہے، جب علمائے امت اپنا فرضِ منصبی ادا کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو عوام میں فساد کے دَر آنے کا راستہ کھل جاتا ہے۔

اس جماعت کا پہلا فرض یہ ہے کہ خود صحیح ہوں اور ایمان و تقویٰ اور اخلاق و عملِ صالح سے آراستہ ہوں اور دوسرا فرض یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے منصب پر فائز ہوں اور صراطِ مستقیم کی طرف اُمت کی راہنمائی کریں اور کسی قسم کا نقص ۔ اعتقادی، اخلاقی یا علمی۔ امت میں واقع ہو تو اس کے لئے بے چین ہو جائیں اور اس کی اصلاح کے لئے صحیح تدابیر کریں، اگر خود ان ہی میں نقص آ جائے تو اُمت کے عوام کا خراب ہونا لازمی ہے، اسی طرح اگر وہ اپنے مقام و مسند کو چھوڑ بیٹھیں، دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تزکیہ کی خدمت سے دستکش ہو جائیں اور اصلاحِ امت کی فکر کو بالائے طاق رکھ دیں تو اس کے نتیجہ میں پوری امت فساد اور بدعملی کی لپیٹ میں آ جاتی ہے۔

بہر کیف اُمت کے لئے سب سے بڑا فتنہ یہ ہوتا ہے کہ مصلحینِ اُمت اپنے فریضۂ منصبی سے غافل ہو جائیں اور جب رفتہ رفتہ یہ مرض یہاں تک بڑھ جاتا ہے کہ علماء امت خود اپنی اصلاح سے بھی غافل اور مختلف امراض اور فتنوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو اس کے نتیجہ میں امت پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اُمت، امراض کے انتہائی خطرناک درجہ تک پہنچ جاتی ہے اور اس وقت کوئی توقع باقی نہیں رہتی کہ دعوت و تبلیغ اور اصلاح کی کوشش مثمر ہو سکے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک کلمات میں اسی کا نقشہ یوں پیش کیا گیا ہے:۔

«اِذَا رَأَيْتَ هَوًى مُتَّبَعًا وَّ	جب تم دیکھو کہ نفسیاتی خواہشات کی اتباع ہو رہی
شُحًّا مُطَاعًا وَّ دُنْيَا مُؤْثَرَةً	ہے، طبیعت کی حرص قابلِ اطاعت بن گئی ہے
وَّ اِعْجَابَ كُلِّ ذِي رَأْيٍ	ہر کام میں دنیا کی مصلحت بینی کا خیال رکھا جا

بِرَأیِہٖ (سنن ابی داؤد) ہے اور ہر شخص کو اپنی رائے پر ناز ہے اور اپنی رائے کے خلاف ہر بات کو ہیچ سمجھتا ہے۔

جب نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے تو پھر اپنی فکر کرنی چاہیئے، دنیا کی اصلاح کی فکر ختم کر دینی چاہیئے، یا یہ کہ تبلیغی فریضہ ساقط ہو جاتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ انتہائی اولوالعزمی سے کام لیا جائے اور اس وقت بھی میدان میں آ کر اس خدمت کو انجام دیا جائے، بہر حال جب حالات اتنے مایوس کُن نہ ہوں تو قدم کو جادۂ دعوت و اصلاح سے نہیں ہٹنا چاہیئے۔

عُلماء و مصلحین اور اُن کے فتنے

سب سے بڑا صدمہ اس کا ہے کہ مُصلحین کی جماعتوں میں جو فتنے آج کل رونما ہو رہے ہیں نہایت خطرناک ہیں، تفصیل کا موقعہ نہیں لیکن فہرست کے درجہ میں چند باتوں کا ذکر ناگزیر ہے:-

۱- مصلحت اندیشی کا فتنہ | یہ فتنہ آج کل خوب برگ و بار لا رہا ہے، کوئی دینی یا علمی خدمت کی جائے اس میں پیشِ نظر دنیاوی مصالح رہتے ہیں، اس فتنہ کی بنیاد نفاق ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت سی دینی و علمی خدمات برکت سے خالی ہیں۔

۲- ہر دلعزیزی کا فتنہ | جو بات کہی جاتی ہے اس میں یہ خیال رہتا ہے کہ کوئی بھی ناراض نہ ہو، سب خوش رہیں اس فتنہ کی اساس حُبِّ جاہ ہے۔

۳- اپنی رائے پر جمود و اصرار | اپنی بات کو صحیح و صواب اور قطعی و یقینی سمجھنا، دوسروں کی بات کو درخورِ اعتناء اور لائقِ التفات نہ سمجھنا بس یہی یقین کرنا کہ میرا موقف سو فیصد حق اور درست ہے اور دوسرے کی رائے سو فیصد غلط اور باطل۔ یہ اعجاب بالرائے کا فتنہ ہے اور آج کل سیاسی جماعتیں اس مرض کا شکار ہیں۔ کوئی جماعت دوسرے کی بات سُننا گوارا نہیں کرتی، نہ حق دیتی ہے کہ ممکن ہے کہ مخالف کی رائے کسی درجہ میں صحیح ہو یا یہ کہ شاید وہ بھی یہی چاہتے ہوں جو ہم چاہتے ہیں، صرف تعبیر اور عنوان کا فرق یا الاہم فالاہم کی تعیین کا اختلاف ہو۔

۴- سوءِ ظن کا فتنہ | ہر شخص یا ہر جماعت کا خیال یہ ہے کہ ہماری جماعت کا ہر فرد مخلص ہے اور ان کی نیت بخیر ہے اور باقی تمام جماعتیں جو ہماری جماعت سے اتفاق نہیں رکھتیں

وہ سب خود غرض ہیں، ان کی نیت صحیح نہیں بلکہ اغراض پر مبنی ہیں اس کا منشا بھی عُجب و کبر ہے۔

۵۔ سوءِ فہم کا فتنہ | کوئی شخص کسی مخالف کی بات جب سُن لیتا ہے تو فوراً اسے اپنا مخالف سمجھ کر اس سے نہ صرف نفرت کا اظہار کرتا ہے بلکہ مکروہ انداز میں اس کی تردید فرض سمجھی جاتی ہے، مخالف کی ایک ایسی بات میں جس کے کئی محمل اور مختلف توجیہات ہو سکتی ہیں، وہی توجیہ اختیار کریں گے جس میں اس کی تحقیر و تذلیل ہو کیا اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ[1] اور ۔ اِیَّاکُم وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الحَدِیْثِ[2] کی نصوص مرفوع العمل ہو چکی ہیں؟۔

۶۔ بہتان طرازی کا فتنہ | مخالفین کی تذلیل و تحقیر کرنا بلا سند ان کی طرف گھناؤنی باتیں منسوب کرنا۔ اگر کسی مخالف کی بات ذرا بھی کسی نے نقل کر دی بلا تحقیق اس پر یقین کر لینا اور مزے لے لے کر محافل و مجالس کی زینت بنانا، بالفرض اگر خود بہتان طرازی نہ بھی کریں دوسروں کی سُنی سنائی باتوں کو بلا تحقیق صحیح سمجھنا کیا یہ نص قرآنی اِنْ جَاءَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا[3] الآیۃ کے خلاف نہیں؟

۷۔ جذبۂ انتقام کا فتنہ | کسی شخص کو کسی شخص سے عداوت و نفرت یا بدگمانی ہے لیکن خاموش رہتا ہے لیکن جب ذرا اقتدار مل جاتا ہے، طاقت آجاتی ہے تو پھر خاموشی کا سوال پیدا نہیں ہوتا، گویا یہ خاموشی، معافی اور درگذر کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ بیچارگی و ناتوانی اور کمزوری کی وجہ سے تھی جب طاقت آگئی تو انتقام لینا شروع کیا، رحم و کرم اور عفو و درگذر سب ختم۔

۸۔ حُبِّ شہرت کا فتنہ | کوئی دینی یا علمی یا سیاسی کام کیا جائے، آرزو یہی ہوتی کہ زیادہ سے زیادہ داد ملے اور تحسین و آفرین کے نعرے بلند ہوں، درحقیقت اخلاص کی کمی یا فقدان سے اور خود نمائی و ریاکاری کی خواہش سے یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے صحیح کام کرنے والوں میں یہ مرض پیدا ہو گیا اور

---

[1] اور یقیناً بعض گمان گناہ ہیں

[2] بدگمانی سے بچا کرو کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے داور بڑے بڑے جھوٹ اسی سے پیدا ہوتے ہیں،

[3] اگر آئے تمہارے پاس کوئی گنہ گار خبر لے کر تو تحقیق کر لو۔

درحقیقت یہ شرک خفی ہے حق تعالیٰ کے دربار میں کسی دینی یا علمی خدمت کا وزن اخلاص سے ہی بڑھتا ہے اور یہی تمام اعمال میں قبول عند اللہ کا معیار ہے۔ اخبارات، جلسے، جلوس، دورے زیادہ تر اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

۹۔ خطابت یا تقریر کا فتنہ | یہ فتنہ عام ہوتا جارہا ہے کہ لن ترانیاں انتہا درجہ میں ہوں، عملی کام صفر کے درجہ میں ہوں قوالی کا شوق دامن گیر ہے عمل و کردار سے زیادہ واسطہ نہیں۔

"لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ" کیوں کہتے ہو منہ سے جو نہیں کرتے بڑی بیزاری کی بات ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ چیز جو نہ کرو (ترجمہ شیخ الہندؒ)

خطیب اس انداز سے تقریر کرتا ہے گویا تمام جہاں کا درد اس کے دل میں ہے لیکن جب عملی زندگی سے نسبت کی جائے تو درجہ صفر ہوتا ہے۔

۱۰۔ دعایۃ یعنی پروپیگنڈہ کا فتنہ | جو جماعتیں وجود میں آئی ہیں خصوصاً سیاسی جماعتیں ان میں غلط پروپیگنڈہ اور واقعات کے خلاف جوڑ توڑ کی وبا اتنی پھیل گئی ہے جس میں نہ دین ہے، اور نہ اخلاق، نہ عقل ہے نہ انصاف، محض یورپ کی دین باختہ تہذیب کی نقالی ہے۔ اخبارات اشتہارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن تمام اس کے مظاہر ہیں۔

۱۱۔ مجلس سازی کا فتنہ | چند اشخاص کسی بات پر متفق ہو گئے یا کسی جماعت سے اختلاف رائے ہو گیا، فوراً ایک نئی جماعت کی تشکیل ہو گئی، طویل و عریض اغراض و مقاصد بتائے جاتے ہیں، پروپیگنڈا کے لیے فوراً اخبار نکالا جاتا ہے، بیانات چھپتے ہیں کہ اسلام اور ملک بس ہماری جماعت کے دم قدم سے باقی رہ سکتا ہے۔

نہایت دل کش عنوانات اور جاذب نظر الفاظ و کلمات سے قرار دادیں اور تجویزیں چھپنے لگتی ہیں، امت میں تفرق و انتشار اور گروہ بندی کی آفت اسی راستے سے آئی ہے۔

۱۲۔ عصبیت جاہلیت کا فتنہ | اپنی پارٹی کی ہر بات خواہ وہ کیسی ہی غلط ہو، اس کی حمایت و تائید کی جاتی ہے اور مخالف کی ہر بات پر تنقید کرنا سب سے اہم فرض سمجھا جاتا ہے، مدعی اسلام جماعتوں کے اخبار و رسائل تصویریں، کارٹون، سینما کے اشتہار، سود اور قمار کے اشتہار اور گندے مضامین شائع کرتے ہیں مگر چونکہ اپنی جماعت کے حامی ہیں اس لئے جاہلی تعصب کی بنا پر

ان سب کو بنظرِ استحسان دیکھا جاتا ہے، الغرض جو اپنا حامی ہو وہ تمام بدکرداریوں کے باوجود پکا مسلمان ہے اور جو اپنا مخالف ہو اس کی نماز روزہ کا بھی مذاق اڑایا جاتا ہے۔

۱۳۔ حُبِّ مال کا فتنہ حدیث میں تو آیا ہے کہ "حُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ" دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے، حقیقت میں تمام فتنوں کا قدر مشترک حُبِّ جاہ یا حُبِّ مال ہے، بہت سے حضرات "رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً" کو دنیا کی جستجو اور محبت کے لئے دلیل بناتے ہیں حالانکہ بات واضح ہے کہ ایک ہے دنیا سے تعلق اور ضروریات کا حصول۔ اس سے انکار نہیں نیز ایک ہے طبعی محبت، جو مال اور آسائش سے ہوتی ہے اس سے بھی انکار نہیں۔ مقصد تو یہ ہے کہ حُبِّ دنیا یا حُبِّ مال کا اتنا غلبہ نہ ہو کہ شریعتِ محمدیہ اور دینِ اسلام کے تمام تقاضے ختم یا مغلوب ہو جائیں۔ اقتصاد و اعتدال کی ضرورت ہے عوام سے شکایت کیا کی جائے آج کل عوام سے یہ فتنہ گذر کر خواص کے قلوب میں بھی آ رہا ہے الا ما شاء اللہ اس فتنے کی تفصیلات کے لئے ایک طویل مقالے کی ضرورت ہے۔ حق تعالیٰ توفیق عطا فرمائے ہم ان مختصر اشاروں کو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی ایک دعا پر ختم کرتے ہیں:۔

"اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ وَحُبَّ عَمَلٍ یُّقَرِّبُنِیْ اِلَیْکَ اَللّٰھُمَّ مَا رَزَقْتَنِیْ مِمَّا اُحِبُّ فَاجْعَلْہُ قُوَّۃً فِیْمَا تُحِبُّ وَمَا زَوَیْتَ عَنِّیْ مِمَّا اُحِبُّ فَاجْعَلْہُ فَرَاغًا لِّیْ فِیْمَا تُحِبُّ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ الْاَشْیَاءِ اِلَیَّ مِنْ نَّفْسِیْ وَاَھْلِیْ وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ۔"

ربیع الثانی ۱۳۹۰ھ، جون ۱۹۷۰ء

فتنے اور ان سے بچاؤ کا راستہ

حضرتِ صادق و مصدوق سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی وامی) کا ارشاد گرامی ہے کہ خیر و سعادت کے تمام ابواب میں روز افزوں تنزل ہی تنزل ہے، صرف "شر" ہی ایک ایسی چیز ہے جس میں برابر ترقی ہوتی جائے گی۔

حدیث کے الفاظ جو مسندِ احمد میں حضرت ابو الدرداءؓ سے مروی ہے، یہ ہیں:۔

"کُلُّ شَیْئٍ یَنْقُصُ اِلَّا الشَّرَّ — دنیا کی ہر چیز رُو بہ تنزل ہے، سوائے شر کے،

فَاِنَّہٗ یُزَادُ فِیْہِ" — کہ اس میں برابر اضافہ و ترقی ہوتی رہے گی۔

صحیح بخاری شریف میں ایک حدیث ہے، زبیر بن عدی کہتے ہیں کہ:۔ "ہم نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہٗ کی خدمت میں حجاج بن یوسف ثقفی کے مظالم کی شکایت کی، فرمایا: صبر کرو! میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ تم پر جو زمانہ بھی آئندہ آئے گا وہ پہلے سے بدتر ہوگا۔"

آج نقشۂ عالم کو سامنے رکھ کر دیکھئے، مرکزِ عالم (مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور حجازِ مقدس) سے لے کر تمام عرب، تمام ایشیا، تمام یورپ اور امریکہ کے جس جس خطے پر نظر جاتی ہے وہ شرور و فتن کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ آفات و مصائب کا ایک عالمی طوفان ہے جو تھمتا نظر نہیں آتا، اضطراب و قلق، بے چینی و پریشانی اور حیرانی و سراسیمگی کا ایک کوہِ آتش فشاں ہے جس کے عالمگیر شعلوں نے پورے عالم کے امن و سکون اور حقیقی مسرت کو خاکستر کر ڈالا ہے، فتنوں پر فتنے اُٹھ رہے ہیں دینی و علمی فتنے، ملکی و قومی فتنے، تہذیب و تمدن کے فتنے، آرائش و آسائش کے فتنے، سرمایہ داری کے فتنے، غربت و افلاس کے فتنے، اخلاقی و سیاسی فتنے۔

دنیا کا کوئی گوشہ فتنوں کی یورش سے خالی نہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام دنیا، آخرت فراموشی، دنیا طلبی اور خدا تعالیٰ کو بھول جانے کی سزا بھگت رہی ہے۔

"وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اَعْمٰی" (طٰہٰ۔ ۱۲۴) — اور جو شخص میری یاد سے منہ موڑے گا، پس یقینی طور پر اسے "تنگ زندگی" نصیب ہوگی اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے۔

شقاق و نفاق کی حد ہو گئی، جو مجاہدین "قدس اور عمان کے محاذ پر" اسرائیل "سے برد آزما تھے ان کا رُخ یہودیوں سے ہٹ کر اپنوں کی طرف مڑ گیا" باہم دست و گریباں ہو کر ہزاروں نوجوان "اپنوں" کا نشانہ بن گئے اور ایک بڑی طاقت جو اعداء اسلام کے مقابلہ میں سینہ سپر تھی وہ خانہ جنگی کی نذر ہو گئی، اناللہ اس سے بڑھ کر عبرت کی کیا خبر ہو گی؟ کہ ایک ہی ملک و ملت اور ایک ہی قوم کے افراد کے باہمی نفاق و عناد کا جب یہ حال ہو تو ان سے دوسروں کے ساتھ خیر کی کیا توقع کی جا سکتی ہے؟ ظاہر ہے اس صورتِ حال سے امریکہ اور روس ۔ خدا دشمن ۔ فائدہ اٹھائیں گے ایک طاقت ایک فریق کو شہ دے گی اور دوسری دوسرے فریق کو ابھارے گی اور یوں مشرق وسطیٰ کو ایک نیا "ویٹ نام" بنایا جائے گا، بچے مسلمانوں کے کٹ رہے ہیں، قوت مسلمانوں کی پامال ہو رہی ہے افسوس! "از ما است کہ بر ما است"۔

ان حالات میں کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ سوریا، عراق اور مصر کے عرب متحد ہو کر اعداءِ اسلام کے سامنے سینہ سپر ہو سکیں گے بلکہ عرب ممالک میں خانہ جنگی کا ایک نیا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

سنا ہے کہ لیبیا سے جو امریکہ کا عظیم الشان ہوائی اڈہ اٹھایا جا رہا ہے اسے سرزمینِ مقدس حجاز میں مکہ و مدینہ کے درمیان منتقل کیا جائے گا، اگر یہ خبر صحیح ہے تو اس سے بڑھ کر دردناک صورتِ حال اور کیا ہو گی؟ نہ معلوم دورِ حاضر کے مسلمان سلاطین و حکام کی عقلوں پر کیسے پردے پڑ گئے ہیں کہ عواقب کا احساس ہی ختم ہو گیا۔

خیر یہ داستان تو جتنی دردناک ہے اس سے زیادہ طویل ہے، کہنا یہ ہے کہ تمام عالم اور عالمِ اسلام خصوصاً فتنوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے اور یہ تشتت و افتراق کا فتنہ تو اتنا الم انگیز ہے کہ اس سے ۔ اِلّا ماشاء اللہ ۔ کوئی بھی محفوظ نہیں رہا، عوام و خواص، عالم و جاہل اور ملوک و رعایا سب میں سرایت کر گیا ہے، اتحاد و اتفاق اور خدا تعالیٰ کے لئے ایک دوسرے سے سچی محبت کرنا قصۂ پارینہ بن کر رہ گیا ہے [1]

---

[1] حضرت حکیم الامۃ تھانوی (نور اللہ مرقدہٗ) فرماتے ہیں کہ ہمارے حاجی صاحب (قطب العالم مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ) فرمایا کرتے تھے، "اتفاق کی جڑ تواضع ہے اور افتراق کی بنیاد کبر ہے۔" (جب ہر شخص اپنی جگہ "بقراط" اور "فرعون" ہو تو اتحاد کہاں سے آئے۔

باہر کی دنیا کو جانے دیجئے، خود ہمارے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سیاسی جماعتوں میں جس طرح سر پھٹول اور رسہ کشی ہو رہی ہے اس سے عقل حیران ہے، ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا اور خدا کے بے گناہ بندوں کی طرف گھناؤنے فرضی افسانے منسوب کرنا، سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنا، سیاسی کارنامہ سمجھا جاتا ہے جن جماعتوں کے افراد کی اسلام دشمنی، روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ وہ بھی لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنے آپ کو سب سے زیادہ اسلام کا ہمدرد اور خیر خواہ ظاہر کر رہے ہیں اور اپنے مخالفین کو نہ معلوم کیا کیا خطاب دے رہے ہیں[۱]۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس عالمِ کون و فساد کا خمیر ہی خیر و شر کے مرکب سے اٹھایا گیا ہے، دنیا کا مزاج خیر و شر کے امتزاج سے بنا ہے، دونوں کا سلسلہ چلا آیا ہے اور قیامت تک جاری رہے گا لیکن ان دنوں شر اتنا غالب اور خیر اتنی مغلوب ہو رہی ہے کہ عذابِ الٰہی کے نازل ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے، دراصل عہدِ نبوت سے جتنا بُعد ہوتا جائے گا خیر کم ہوتی جائے گی، فقیہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وارضاہ دورِ نبوت اور بعد کے زمانے کا فرق بیان کرتے ہوئے خلافتِ راشدہ کے دور میں فرما رہے ہیں کہ دنیا کی مثال ایسی ہے:۔

"کالثغب شرب صفوہٗ وبقی کدرہٗ۔"

جیسے وہ تالاب جس کا صاف اور ستھرا ہوا پانی پی لیا گیا ہو اور گدلا پانی باقی رہ گیا ہو۔

یہ جلیل القدر صحابی عہدِ عثمانی میں وفات پا چکے ہیں، اگر وہ جمل و صفین کے ہولناک مناظر دیکھ لیتے تو کیا فرماتے؟ اور خدانخواستہ ہماری حالتِ زار ان کے سامنے آتی تو ان کا کیا حال ہوتا؟ رائے اور ذوق کا اختلاف پہلے بزرگوں میں بھی رہا ہے لیکن بہتان طرازی، افتراء پردازی، سب و شتم اور لعن طعن کا جو طوفان اس دور میں برپا ہے وہ انتہائی دردناک ہے، موجودہ صورتِ حال نے جو شکل اختیار کر لی ہے اس سے نہ کسی کی عزت و حرمت باقی ہے نہ جان و مال محفوظ ہے، پوری اُمت کے خرمنِ امن و سکون کو آگ لگا دی گئی ہے، سب جانتے ہیں اور ہمیشہ سے یہ بات مسلم چلی آتی ہے کہ

---

[۱] یہاں یہ لطیفہ قابلِ ذکر ہے کہ ایک سیاسی جماعت کے یومِ تاسیس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ جماعت کے نام میں "اسلام" کا لفظ نہیں آئے گا چنانچہ خالص "انگریزی نام" رکھا گیا جس کا صحیح تلفظ شاید خود جماعت کے بیشتر ارکان بھی نہیں کر سکتے، عوام بیچارے کیا کریں گے۔ لیکن اسلام سے اتنی نفرت کے باوجود سیاسی طور پر "غریب اسلام" کی حمایت میں ماشاء اللہ وہ بھی کسی سے پیچھے نہیں۔

بعض دفعہ ایک انتہائی مخلص اور سراپا اخلاص شخصیت کی رائے بھی غلط ہو سکتی ہے، کسی مخلص کے لئے ضروری نہیں کہ وہ صاحب الرائے بھی ہو، اس کے برعکس بعض دفعہ ایک غیر مخلص کی رائے صحیح بھی ہو سکتی ہے، اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ہماری شریعت نے "شوریٰ" کا طریق تجویز کیا تھا، کہ جو قدم اٹھایا جائے اہلِ صلاح اور اہلِ دانش کے مشورہ سے اٹھایا جائے، مگر افسوس ہے کہ خود غرضی اور نفسا نفسی کی کیفیت نے امت سے یہ نعمت بھی چھین لی ہے اور اس کے نتیجہ میں پوری امت کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے، ہر جماعت اپنی رائے پر اڑی ہوئی ہے اور جماعت کا ہر فرد اپنے کو عقل کل سمجھتا ہے جس سے آئے دن جماعتیں تقسیم ہو ہو کر جماعت در جماعت کا عمل جاری ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاں فتنوں سے پناہ مانگتے تھے وہاں یہ دعا بھی فرماتے تھے:۔

«وَإِذَا أَرَدْتَ بِقَوْمٍ فِتْنَةً فَتَوَفَّنِيْ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ» — اے اللہ جب تو کسی قوم کو فتنے میں مبتلا کرنا چاہے تو مجھے فتنہ میں ڈالے بغیر اٹھا لینا۔

فتنے سے محفوظ رہ کر دنیا سے رخصت ہونے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں کہ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو فتنہ کے زمانے سے پہلے ہی دنیا سے اٹھا لے، دوسری یہ کہ فتنوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کسی پر اپنی رحمت فرمائے اور اسے فتنہ میں مبتلا کئے بغیر دنیا سے اٹھا لے۔

ہمارے دور میں فتنے شروع ہو چکے ہیں، بلکہ ہم سے بہت پہلے شروع ہو چکے تھے، اس لئے پہلی صورت تو نہیں ہو سکتی، البتہ دوسری صورت ممکن ہے کہ آدمی ایسا طرزِ عمل اختیار کرے جس کے ذریعہ فتنوں سے محفوظ رہ سکے، بہت سے مخلصین کے خطوط آ رہے ہیں کہ ہمیں فتنوں کی اس موجودہ فضا میں کیا کرنا چاہیے، اس لئے فتنوں سے حفاظت کا ایک مختصر دستور العمل عرض کیا جاتا ہے۔

اول: شورائیت: کسی بھی قسم کا دینی، دنیاوی یا سیاسی قدم اٹھائیں تو اہلِ خیر و صلاح اور اہلِ دانش و خرد سے مشورہ کئے بغیر نہ اٹھائیں اور اہلِ شوریٰ میں سے ہر شخص نہایت اخلاص کے ساتھ فی ما بینہ و بین اللہ اپنا مشورہ دے، اپنی بات منوانے کی فکر نہ کرے، نہ اپنی رائے پر خواہ مخواہ کا اصرار کرے، اگر صحیح اسلامی شوریٰ پر عمل کیا جائے تو ان شاء اللہ بہت سی گمراہیوں اور فتنوں کا سدباب ہو سکتا ہے، ان سب میں بڑا فتنہ عُجب اور اعجاب بالرائے

کا ہے۔ الغرض مخلصین کے لئے لازم ہے کہ اپنی رائے پر اصرار نہ کریں، بلکہ اپنی رائے کو متہم سمجھیں مبادا اس میں نفس و شیطان کا کوئی مخفی کید چھپا ہوا ہو۔

دوم: اعتدال:۔ اگر پوری کوشش کے باوجود سب کی رائے متفق نہ ہو سکے اور اہلِ حق کی دو جماعتیں وجود میں آ ہی جائیں تو ہر جماعت اپنے کو قطعی حق پر اور دوسرے کو قطعی باطل پر نہ سمجھے، زیادہ سے زیادہ جس بات کی گنجائش ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے مؤقف کو "صواب محتمل خطا"، اور دوسرے کے مؤقف کو "خطا محتمل صواب" سمجھے اور دونوں طرف سے برابر یہ خواہش رہنی چاہیئے اور کوشش بھی کہ تمام اہلِ حق ایک کلمہ پر متفق ہو جائیں۔

سوم: حکایات و شکایات سے احتراز:۔ آج کل پروپیگنڈے کا دور ہے، پروپیگنڈے کے کرشمہ سے رائی کو پربت اور تنکے کو شہتیر بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ غلط افواہیں اور جھوٹی خبریں پھیلا کر ایک دوسرے کے درمیان منافرت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جو شخص اس فتنہ سے محفوظ رہنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ جب تک کسی حکایت و شکایت کے صحیح ہونے کا پورا وثوق نہ ہو جائے اس وقت تک اس پر کان نہ دھرے نہ اس پر کوئی کارروائی کرے، امیر المومنین سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے لوگوں نے شکایت کی کہ ابن ملجم آپ کے قتل کا منصوبہ بنا رہا ہے اور قتل کی دھمکیاں دیتا ہے۔ آپ اسے قتل کرا دیجئے۔" فرمایا:

"کیا میں اپنے قاتل کو قتل کر دوں"؟

اسی طرح اس قسم کی حکایات و شکایات کو نقل کرنا بھی اُمت کو فتنے میں ڈالنا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو اسی قسم کے فتنوں کے بارے میں ہدایت فرمائی تھی:۔

"ستکون فتن، القاعد فیها خیر من القائم والقائم فیها خیر من الماشی، والماشی فیها خیر من الساعی"	بہت سے فتنے ہوں گے، ان میں بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہوگا، کھڑا ہونے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا۔

اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے:۔

"النائم فیها خیر من الیقظان"	جو ان میں سو رہا ہوگا وہ جاگنے والے سے بہتر ہوگا اور

والیقظان فیھا خیر من القائم» جو جاگ رہا ہوگا وہ اُٹھنے والے سے بہتر ہوگا۔

ہر شخص کو کوشش کرنی چاہیئے کہ میرے کسی قول و عمل سے امت کے درمیان افتراق کی خلیج وسیع نہ ہو۔ نیز اہلِ حق کو اس بات سے چوکنا رہنا چاہیئے کہ اہلِ باطل ان کے درمیان اختلافات کو ہوا دے کر اپنا الوسیدھا نہ کر سکیں، جب اہلِ حق آپس ہی میں لڑنے لگتے ہیں تو اہلِ باطل کے لئے میدان صاف ہو جاتا ہے، اس لئے اہلِ حق کو اہلِ باطل کے ہاتھ کا کھلونا نہیں بننا چاہیئے، کہ جوش میں اپنوں ہی کو بدنام کرنے لگیں، افسوس ہے کہ مسلمانوں میں سب سے بڑا مرض یہی ہے کہ اپنوں سے بدگمانی رکھیں گے اور حق کے نام پر اہلِ حق سے لڑیں گے لیکن اہلِ باطل کے ساتھ مسامحت اور رواداری برتی جائے گی، اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمائے۔

چہارم: اکرام و احترام:۔ ایک مسلمان اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھنے کی وجہ سے اکرام و احترام کا مستحق ہے اور ہماری باہمی رنجشوں سے اس کے احترام کا حکم منسوخ نہیں ہو جاتا، سنن ابوداؤد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے کہ:۔

«إن من إجلال اللہ تعالیٰ إکرام ذی الشیبۃ المسلم وحامل القرآن غیر الغالی فیہ والجافی عنہ وإکرام السلطان المقسط» (مشکوٰۃ ص۴۲۳)

تین چیزیں اللہ تعالیٰ کی تعظیم میں داخل ہیں: سفید ریش مسلمان کی عزت کرنا، حامل قرآن کی عزت کرنا، جو نہ قرآن میں غلو کرے نہ بے پروائی کرے اور عادل حاکم کی عزت کرنا۔

بہرحال اختلاف کی بنا پر کسی بھی مسلمان کی ہتکِ عزت جائز نہیں اور خاص طور پر علمائے دین کی بے حرمتی کرنا تو بہت ہی بری بات ہے کوئی مخلص عالمِ دین ایک رائے رکھتا ہو تو اس پر سب و شتم کرنا اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انتقام کا نہایت خطرہ ہے، ایسا شخص مخذول اور بے توفیق ہو جاتا ہے اور ایمان کی سلامتی مشکل ہو جاتی ہے۔

پنجم: استخارہ کرنا:۔ دورِ حاضر میں اُمت کا شیرازہ جس بُری طرح بکھر گیا ہے، مستقبل قریب میں اس کی شیرازہ بندی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا جب انتشار کے کا راستہ بند ہو گیا تو اب صرف استخارہ کا راستہ ہی باقی رہ گیا ہے، حدیث شریف میں تو فرمایا تھا:

«ما خاب من استخار ولا ندم من استشار» جو استخارہ کرے گا خائب و خاسر نہ ہوگا اور جو مشورہ کریگا پشیمان نہ ہوگا۔

عوام کے لئے یہی دستور العمل ہے کہ اگر کوئی ان فتنوں میں غیر جانبدار نہیں رہ سکتا ہے تو مسنون استخارہ کر کے عمل کرے اور اُمید ہے کہ استخارہ کے بعد اس کا قدم صحیح ہوگا، مسنون استخارہ کا مطلب یہی ہے کہ انسان جب کسی امر میں متحیر اور متردد ہوتا ہے اور کوئی واضح و صاف پہلو نظر نہیں آتا۔ اس کا علم رہنمائی سے قاصر رہتا۔ اور اس کی طاقت بہتر کام کرنے سے عاجز تو حق تعالیٰ کی بارگاہ رحمت و الطاف میں التجاء کرتا ہے اور حق تعالیٰ کی بارگاہ سے دعا توکل تفویض اور تسلیم و رضا بالقضاء کے راستوں سے کرتا ہے کہ وہ اس کی دستگیری اور رہنمائی فرمائے، بہتر صورت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

فتنوں کا اصل علاج قرآن کریم حق تعالیٰ شانہٗ کی وہ آخری اور عظیم ترین نعمت ہے جو اس دنیا کو دی گئی ہے، قرآن کریم ہی وہ قانونِ الٰہی ہے جو انسانوں کو اعلیٰ ترین سطح پر پہنچانے کا ضامن ہے اور جو قوموں کی سربلندی اور حکومتوں کی عزت و مجد کا بہترین ذریعہ ہے، دورِ حاضر کے جتنے بھی فتنے ہیں ان سب کا واحد علاج قرآنی دستور ہے، اسلامی ممالک میں آج کل جو فتنے رونما ہو رہے ہیں ان کا اصلی سبب قرآن کریم کی تعلیمات سے انحراف و اعراض ہے:۔

«نسوا الله فأنساهم أنفسهم أولٰئك هم الفاسقون» ۔	انہوں نے اللہ کو بھلا دیا، پھر اللہ نے ان کو اپنی جانوں سے بھلا دیا یہی لوگ ہیں نافرمان ۔

شام ہو یا مصر، انڈونیشیا ہو یا افریقہ ان سب میں روز روز کے انقلابات اور بے چینی اور اضطراب کا اصلی سبب یہی ہے کچھ ظاہری اسباب بھی ہیں جن میں روس و امریکہ کی ریشہ دوانیاں سرِفہرست ہیں لیکن ان اسباب میں کوئی تزاحم و تعارض نہیں، ظاہر بین ظاہری اسباب کو دیکھتے ہیں اور حقائق بین نگاہیں باطن تک پہنچتی ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ قرآنِ کریم میں سورۂ حشر کے آخری رکوع میں یہ مضمون بالکل واضح کر دیا گیا ہے، سورۂ حشر جس میں یہود کی تباہی و بربادی کی داستان اور ان کا حشر یہ سب کچھ نعمتِ قرآن کی ناشکری اور اس عظیم نظامِ قرآنی سے انکار و جحود کا نتیجہ تھا، الغرض سورۂ حشر کا محور بھی قرآنی دعوت ہے اور یہود کی عبرت انگیز تاریخی داستان پیش کرنے سے مقصد بھی یہی ہے کہ قرآن کریم پر عمل نہ کرنے کا انجامِ کار آخر کیا ہوتا ہے اس لئے ابتداءِ سورت میں حق تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کا بیان ہے اور انتہاء میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال جمال و جلال کا ذکر ہے تاکہ دعویٰ و دلیل دونوں کا ساتھ ہی ساتھ ذکر ہو:۔

"کتاب اُنزلناہ إلیك مُبارك	ایک کتاب ہے جو اتاری ہم نے تیری طرف
لیدّبّروا آیاتہ ولیتذکر	برکت کی تاکہ لوگ اس میں تدبر کریں اور عقل
اُولوا الألباب"۔	والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔

لفظ و معنی و حروف و نقوش سب ہی بابرکت ہیں جن کی تفصیلات احادیث میں ہیں" تدبرِ عمل بکتاب" ہے علمی درجہ میں حکیمانہ حقائق پر غور کرنا ہے"، "تذکرۂ اُولی الألباب" عملی قانون بنانا ہے اور جب تک اسلامی ممالک کا قانون قرآنِ کریم رہا سارے عالم پر ان کا جھنڈا لہراتا رہا اور ایک ہزار برس تک ان کا سکہ چلتا رہا، آخر بے عمل و بد عملی کے نتائج سامنے آگئے۔

"جامع ترمذیؒ اور "مسند دارمی" میں بروایتِ حارث الأعور حضرت علیؓ کی مرفوع حدیث میں ان سب حقائق کا بیان موجود ہے، حدیث کا یہ جملہ انتہائی قابلِ غور ہے:-

من ترکہ من جبّار	یعنی اگر کوئی طاقتور حکمران بھی اس قانونِ الٰہی کو ترک
قصمہ اللہ۔	کرے گا تو اللہ اس کو ریزہ ریزہ کردے گا۔

انتہائی صدمہ یہ ہے کہ عالمِ اسلام کی سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان جس میں دنیا کی قیادت کی صلاحیت تھی اور ہے وہ آج قرآنِ حکیم سے دردناک بے اعتنائی کر رہی ہے اور افسوس کہ نہ صرف بے اعتنائی بلکہ اس دور میں قرآنی حقائق کے مسخ کرنے اور تحریف کرنے کا جو منظم و پیہم سلسلہ جاری ہے اس کو نہ صرف یہ کہ برداشت کیا جا رہا ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے ان اٹھارہ سال میں دینِ اسلام کی سربلندی کے لئے ایک اِنچ بھی آگے نہیں بڑھے بلکہ جہاں تھے اس سے بھی پیچھے ہٹ کر پوری طرح قعرِ مذلت میں جا پڑے، پرویز اور پھر اس کے نقشِ قدم پر چلنے والے ڈاکٹر فضل الرحمٰن ڈائرکٹر ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ نے سابق تحریفات کا ریکارڈ توڑ دیا، ادارہ پر حکومت کا لاکھوں روپیہ سالانہ خرچ ہو رہا ہے، کیا پاکستان اس لئے بنا تھا کہ برطانوی دورِ استعمار میں جو کام نہ ہو سکا وہ پاکستان پورا کردے، إنا للہ وإنا إلیہ راجعُون!

پاکستان کے موجودہ صدرِ محترم سے کچھ توقعات وابستہ ہوگئی تھیں اور خیال تھا کہ جس طرح مملکت کا نظم و نسق پہلے سے بہتر ہو گیا ہے، دینی اعتبار سے بھی یہ حکومت گوئے سبقت لے جائے گی اور دینی اعتبار سے بھی ایوبی عہد مبارک ثابت ہوگا، فریضۂ جہاد حق تعالیٰ نے میسر فرمایا اور امت نے

اس کی برکات کا بھی معائنہ کیا لیکن ان اثرات کو مٹا دیا گیا، ہم بارہا ان حقائق کو واشگاف الفاظ میں بیان کر چکے ہیں لیکن سب کچھ صدا بصحرا ثابت ہوا، کوئی نتیجہ ابھی تک ظاہر نہیں ہے اگر ہماری آواز نہیں پہنچتی تو افسوس ہے اور اگر پہنچتی ہے اور پھر اس پر غور نہیں ہوتا تو صد افسوس، نتیجہ دونوں صورتوں میں ظاہر ہے، ہماری آرزو و خواہش ہے کہ جس طرح ظاہری اعتبار سے پاکستان عہدِ حاضر میں قابلِ فخر بن گیا ہے کاش دینی اعتبار سے بھی ایسا ہی ہوتا تاکہ اقوامِ عالم میں ہمارا سر اونچا ہوتا اور ایک معیاری اسلامی حکومت ہوتی لیکن از ماست کہ بر ماست۔

مادیت کا فتنہ اور اس کا علاج

آج کل دنیا طرح طرح کے فتنوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے، ان سب فتنوں میں ایک بنیادی اور بڑا فتنہ "پیٹ" کا ہے، شکم پروری و تن آسانی زندگی کا اہم ترین مقصد بن کر رہ گیا ہے، ہر شخص کا شوق یہ ہے کہ لقمۂ تر اس کی لذتِ کام و دہن کا ذریعہ بنے اور یہ فتنہ اتنا عالمگیر ہے کہ بہت کم افراد اس سے بچ سکے ہیں، تاجر ہو یا ملازم، اسکول کا ٹیچر ہو یا کالج کا پروفیسر، دینی درس گاہ کا مدرس ہو یا مسجد کا امام اس آفت میں سبھی مبتلا نظر آتے ہیں، ہاں فرقِ مراتب ضرور ہے زہد و قناعت، ورع و تقویٰ اور اخلاص و ایثار جیسے اخلاق و فضائل اور ملکات کا نام و نشان نہیں ملتا، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج کا پورا عالم ساز و سامان کی فراوانی کے باوجود حرص و آز، طمع و لالچ اور زر طلبی و شکم پروری کی بھٹی میں جل رہا ہے اور کرب و اضطراب، بے چینی و بے اطمینانی اور حیرت و پریشانی کا دھواں ہر چہار سمت پھیلا ہوا ہے۔

دراصل اس فتنۂ جہاں سوز کا بنیادی سبب یہی ہے جس کی نشاندہی رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی، آخرت کا یقین بے حد کمزور اور آخرت کی نعمتوں اور راحتوں کا تصور قریباً ختم ہو چکا ہے، مادی نعمتیں اور ان کا تصور اس قدر غالب ہے کہ روحانی قدریں مضمحل ہو چکی ہیں، یہی وجہ ہے آج انسانوں کی چھوٹائی بڑائی، عزت و ذلت اور بلندی و پستی کی پیمائش ((إن أكرمكم عند الله أتقاكم)) کے پیمانے سے نہیں ہوتی بلکہ "پیٹ اور جیب" کے پیمانے سے ہوتی ہے، مادیت کے اس سیلاب میں پہلے ایمان و یقین رخصت ہوا، پھر انسانی اخلاق ملیامیٹ ہوئے، پھر اسوۂ نبوت سے وابستگی کمزور ہو کر اعمالِ صالحہ کی فضا ختم ہوئی، پھر معاشرت و معاملات کی گاڑی لائن سے اتری،

پھر سیاست و تمدن تباہ ہوا اور اب مادیت کا یہ طوفان انسانیت کو بہیمیت کے گڑھے میں دھکیل رہا ہے، افراتفری اور بے اصولی، آوارگی و بے راہ روی اور بے رحمی و شقاوت کا وہ دور دورہ ہے کہ الامان والحفیظ۔

الغرض اس "پیٹ" کے فتنہ نے ساری دنیا کی کایا پلٹ کر ڈالی، دنیا بھر کے عقلاء "پیٹ" کی فتنہ سامانی کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں وہ اس فتنہ کے ہولناک نتائج کا تدارک بھی کرنا چاہتے ہیں مگر صد حیف کہ علاج کے لئے ٹھیک وہی چیز تجویز کی جاتی ہے جو خود سبب مرض ہے، درحقیقت انبیاء علیہم السلام ہی انسانیت کے نباض ہیں اور انہی کا تجویز کردہ علاج اس مریض کے لئے کارگر ہوتا ہے۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہولناک مرض کی صحیح تشخیص بہت پہلے فرمادی تھی، چنانچہ ارشاد فرمایا:۔

«واللہ لا الفقر أخشیٰ علیکم ولکن أخشیٰ علیکم أن تبسط علیکم الدنیا کما بسطت علی من کان قبلکم فتنافسوھا کما تنافسوھا فتھلککم کما أھلکتھم (بخاری ومسلم)»	بخدا! مجھے تم پر فقر کا اندیشہ قطعاً نہیں، بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ تم پر دنیا پھیلائی جائے، جیسا کہ تم سے پہلوں پر پھیلائی گئی پھر تم پہلوں کی طرح ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر اسے حاصل کرنے کی کوشش کرو، پھر اس نے جیسے ان کو برباد کیا تمہیں بھی برباد کر ڈالے۔

لیجئے یہ تھا وہ نقطۂ آغاز جس سے انسانیت کا بگاڑ شروع ہوا یعنی دنیا کو نفیس اور قیمتی چیز سمجھنا اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اس پر جھپٹنا، پھر آپ نے تشخیص پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے لئے ایک جامع نسخۂ شفاء بھی تجویز فرمایا جس کا ایک جزء اعتقادی ہے اور دوسرا عملی۔

اعتقادی جزیہ کہ اس حقیقت کو ہر موقع پر مستحضر رکھا جائے کہ اس دنیا میں ہم چند لمحوں کے مہمان ہیں، یہاں کی ہر راحت و آسائش بھی فانی ہے اور ہر تکلیف و مشقت بھی ختم ہونے والی ہے، یہاں کے لذائذ و شہوات آخرت کی بیش بہا نعمتوں اور ابدالآباد کی لازوال راحتوں کے مقابلہ میں کالعدم اور ہیچ ہیں، قرآن کریم اس اعتقاد کے لئے سراپا دعوت ہے اور سینکڑوں جگہ اس حقیقت کو بیان فرمایا گیا ہے، سورۂ الاعلیٰ میں نہایت بلیغ، مختصر اور جامع الفاظ میں اس پر متنبہ فرمایا:۔

"كَلَّا بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى" کان کھول کر سن لو کہ تم آخرت کو اہمیت نہیں دیتے) بلکہ دنیا کی زندگی کو (اس پر) ترجیح دیتے ہو۔ حالانکہ آخرت (دنیا سے) بدرجہا بہتر اور لازوال ہے۔

اور عملی حصہ اس نسخہ کا یہ ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کی تیاری میں مشغول ہوا جائے اور بطور پرہیز کے حرام اور مشتبہ چیزوں کو زہر سمجھ کر ان سے کلی پرہیز کیا جائے اور یہاں کے لذائذ و شہوات میں انہماک سے کنارہ کشی کی جائے، دنیا کا مال و اسباب، زن و فرزند، خویش و اقرباء اور قبیلہ و برادری کے سارے قصے زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت سمجھ کر صرف بقدرِ ضرورت ہی اختیار کئے جائیں، ان میں سے کسی چیز کو بھی دنیا میں عیش و عشرت اور لذت و تنعم کی زندگی گذارنے کے لئے اختیار نہ کیا جائے نہ یہاں کی عیش کوشی کو زندگی کا مقصد اور موضوع بنایا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

"إِيَّاكَ وَالتَّنَعُّمَ، فَإِنَّ عِبَادَ اللهِ لَيْسُوا بِالْمُتَنَعِّمِيْنَ" عیش و تنعم سے پرہیز کرو، کیونکہ اللہ کے بندے عیش پرست نہیں ہوتے۔

عجیب متضاد طرزِ عمل

تعجب ہے کہ اگر کسی ڈاکٹر کی رائے ہو کہ دودھ، گھی، گوشت، چاول وغیرہ کا استعمال مضر ہے تو اس کے مشورے اور اشارے سے تمام نعمتیں ترک کی جاسکتی ہیں لیکن خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح ارشادات اور وحیِ آسمانی کے صاف احکام پر ادنیٰ سے ادنیٰ لذت کا ترک کرنا گوارا نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل و اصحابؓ کی زندگی اور معیارِ زندگی کو اوّل سے آخر تک دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کی نعمتوں سے دل بستگی سراسر جنون ہے۔ "صحیح بخاری شریف" میں حضرت ابوہریرہؓ کا قصہ مروی ہے کہ کچھ لوگوں پر ان کا گذر ہوا، جن کے سامنے بھنا ہوا گوشت رکھا تھا، انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ کو کھانے کی دعوت دی، آپؓ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوئے کہ جو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہ کھائی۔" مہینوں پر مہینے گذر جاتے مگر کاشانۂ نبوت میں نہ رات کو چراغ جلتا نہ دن کو چولہا گرم ہوتا، پانی اور کھجور پر گذر بسر ہوتی وہ بھی کبھی میسر آئیں کبھی نہیں، تین تین دن کا فاقہ ہوتا، کمر سیدھی رکھنے کے لئے پیٹ پر پتھر باندھے جاتے اور اسی حالت میں جہاد و قتال کے معرکے ہوتے، الغرض زہد

وقناعت، فقر وفاقہ، بلند ہمتی وجفاکشی اور دنیا کی آسائشوں سے بے رغبتی اور نفرت و بیزاری سیرت طیبہ کا طغرائے امتیاز تھی، اپنی حالت کا اس "پاک زندگی" سے مقابلہ کرنے کے بعد ہم میں سے ہر شخص کو شرم آنی چاہیئے، ہمارے یہاں سارا مسئلہ روٹی اور پیٹ کا ہے اور وہاں یہ سرے سے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا، ظاہر ہے کہ یہ زندگی بالقصد اختیار کی گئی تھی تاکہ آئندہ نسلوں پر خدا کی حجت پوری ہو جائے ورنہ آپؐ چاہتے تو آپؐ کو منجانب اللہ کیا کچھ نہ دیا جا سکتا؟ مگر دنیا کا یہ ساز وسامان جس کے لئے ہم مرکھپ رہے ہیں اللہ تعالیٰ کی نظر میں اس قدر حقیر و ذلیل ہے کہ وہ اپنے محبوب اور مقرب بندوں کو اس سے آلودہ نہیں کرنا چاہتا، بعض انبیاء علیہم السلام کو عظیم الشان سلطنت بھی دی گئی مگر ان کے زہد وقناعت اور دنیا سے بے رغبتی و بیزاری میں فرق نہیں، ان کے پاس جو کچھ تھا دوسروں کے لئے تھا، اپنے نفس کے لئے کچھ نہ تھا۔

الغرض یہ ہے "فتنۂ پیٹ" کا صحیح علاج جو انبیاء کرام علیہم السلام اور بالخصوص سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز فرمایا، اور اگر انسان "پیٹ کی شہوت" کے فتنہ سے بچ نکلے تو انشاء اللہ "شہوتِ فرج" کے فتنہ سے بھی محفوظ رہے گا کہ یہ خرمستی پیٹ بھرے آدمی کو ہی سوجھتی ہے، بھوکا آدمی اس کی آرزو کب کرے گا، ان ہی دو شہوتوں سے بچنے کا نام اسلام کی اصطلاح میں "تقویٰ" ہے جس پر بڑی بشارتیں دی گئی ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح ضعیف مریض کو بقائے حیات کے لئے ہلکی پھلکی معمولی غذا کا مشورہ دیا جاتا ہے اور زبان کے چسکے سے بچنے کی سخت تاکید کی جاتی ہے تاکہ مطلوبہ اعلیٰ صحت نصیب ہو، بس یہی حیثیت اسلام کی نظر میں دنیا کی ہے۔

انسانی مشکلات کا حل صرف اسلام اور اسلامی نظام میں ہے:۔

"بینات" کے گذشتہ سے پیوستہ شمارے میں مصری حکومت کے نائب صدر جناب حسین شافعی کے ایک مضمون کا ترجمہ دیا گیا تھا، افسوس ہے کہ اس قیمتی مقالے کا ایک اہم قطعہ کتابت واشاعت سے رہ گیا، اس میں صاف اور جلی عنوان سے یہ مضمون تھا کہ "کمیونزم یا سوشلزم یا کیپٹل ازم، انسانی مشکلات کے حل کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ صرف اسلامی نظام ہی اس کا صحیح حل ہے۔" مصر کی حکومت میں جہاں کمیونزم اور سوشلزم کا ڈھنڈورا بڑی بلند آہنگی کے ساتھ پیٹا گیا تھا، یہ اعتراف حقیقت بہت ہی قابلِ قدر اور لائق توجہ ہے، ہمارے یہاں کے اربابِ اقتدار کو بھی مصر کے اس تجربہ سے عبرت پکڑنا

چاہیئے جو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اعلان کرتے رہتے ہیں کہ ہماری منزلِ مقصود "اسلامی سوشلزم" ہے، "بینات" کے صفحات میں بارہا عرض کیا جا چکا ہے کہ اسلام کی ریشمی قبا پر کسی "ازم" کے ٹاٹ کا پیوند نہیں لگایا جا سکتا، نہ کسی باطل "ازم" کو اس ترکیب سے مشرف بہ اسلام کیا جا سکتا ہے۔

قابلِ تقلید مثال:۔

گذشتہ دنوں شیخ الازہر یہاں تشریف لائے تو ان سے معلوم ہوا کہ حکومتِ مصر کے نائب صدر اور شیخ الازہر کی تحریک پر قاہرہ میں حفظِ قرآن کے لئے ایک انجمن بنائی گئی ہے جس کے ہر فرد پر قرآنِ کریم حفظ کرنا اور اس کے مطابق زندگی ڈھالنے کی پابندی لازم ہے، ہر شخص کو قرآنِ کریم کا ایک نسخہ دیا جاتا ہے اور ہفتہ میں کتنا یاد کرنا ہے اس کی نشاندہی کی جاتی ہے، جمعہ کے دن ازہر کی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ سے قبل تین گھنٹے تک شیخ الازہر اور جناب حسین شافعی نائب صدرِ حکومت، تجوید کے ساتھ عوام سے قرآن سنتے ہیں اور آئندہ ہفتہ کے لئے مقدارِ حفظ کی نشاندہی کرتے ہیں، سبحان اللہ! مصر کی سرزمین اور یہ نظام؟ اللہ تعالیٰ ہمارے اربابِ اقتدار اور علماء و مشائخ کو بھی اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۴ھ، جون ۱۹۷۴ء

سب سے بڑا فتنہ حبِّ دُنیا

عصرِ حاضر کا سب سے بڑا فتنہ دنیا کی محبت ہے دنیا سے میری مراد عام ہے دولت وثروت ہو، جاہ و منزلت ہو شہوات و لذائذ ہوں، راحت وآسائش ہو، بود وباش ہو، غرض معاشرت ومعیشت کا کوئی شعبہ بھی ہو، غیر شعوری طور پر اس کی رغبت ہوتی ہے، اس کے لئے محنت کی جاتی ہے، ان چیزوں کو قرآن وحدیث میں متاعِ دنیا کہا گیا ہے اور جب دنیا کی محبت کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کے حصول کے لئے عام ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں، حلال ہوں یا حرام ہوں اور جب یہ حالت ترقی کر جاتی ہے تو پھر اس کے حصول کے لئے کوئی چیز مانع نہیں ہوتی، بے حیائی، بے رحمی، ناانصافی سب آجاتی ہیں اور رفتہ رفتہ طبیعت مسخ ہو جاتی ہے اور حقائق معکوس ہو جاتے ہیں، صحیح کو غلط سمجھنے لگتا ہے اور غلط کو صحیح، حق کو باطل اور باطل کو حق، حق تعالیٰ کا ارشاد صادق آجاتا ہے ((فإنها لا تعمى الأبصار ولكن تعمى القلوب التي في الصدور)) یعنی سر کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، دل کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ اس لئے حدیثِ نبوی میں یہ ارشاد ہے کہ ((حب الدنيا رأس كل خطيئة)) یعنی دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے، بہر حال حُبِ دنیا کا فتنہ اتنا عام ہو گیا ہے کہ ہر شخص پر کچھ نہ کچھ اثر اس کا پڑتا ہے، إلا ما شاء اللہ۔ پھر نفس کی ان خواہشات کو شیطانِ لعین ہوا دیتا ہے، اس کی اہمیت ومعقولیت طبیعت میں راسخ کرتا ہے ((وزين لهم الشيطان أعمالهم)) کہ شیطان ان کے کاموں کو ان کے لئے خوبصورت وآراستہ کرتا ہے۔ جب نفس وشیطان کا پورا استیلاء ہو جاتا ہے تو انسان اچھا خاصا حیوان بن جاتا ہے، اس کے لئے شراب نوشی، بدکاری، بے حیائی، عریانی و فحاشی سب میں انتہائی جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے إنا للہ۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے اس صورتِ حال میں اگر بدقسمتی سے انسان خدا فراموش ماحول میں پہنچ جاتا ہے جہاں کی دنیا یہی ہو، جہاں قدم قدم پر یہ روح فرسا مناظر ہوں، دل دماغ پر نفس وشیطان کا سحر اثر کر گیا ہو، ہر وقت متاع دنیا کی ہوس سوار ہو تو معاملہ مایوس کُن مرحلہ میں داخل ہو جاتا ہے یا انسان کسی ایسی مملکت میں سکونت پذیر ہو کہ حکومت کی خواہش یہی ہو کہ خدا تعالیٰ کی تمام مخلوقات خدا فراموش زندگی اختیار کرے، ہر بے حیائی کی حوصلہ افزائی ہو، تھیٹر، سینما، ٹی وی اور فواحش مناظر ہوں، تعلیم ہو تو مخلوط ہو، اجتماعات ہوں تو مشترک ہوں، اس دردناک صورتحال میں کیا کوئی خیر کی توقع باقی رہ سکتی ہے؟

یہ تو عملی فتنوں کی حالت ہے اگر اس پر مستزاد علمی فتنے بھی شامل ہوں مثلاً سیرت ہو تو فرائیڈ کی تاریخ ہو تو ہیگل و مارکس اور لینن کی، نہ ذکرو عبادت کی فکر ہو نہ تقویٰ کا خیال ہو، ظلمات بعضها فوق بعض، اوپر نیچے اندھیرا ہی اندھیرا ہو تو خیر کی کیا امید؟۔

آج کل اکثر اسلامی ممالک کی یہی صورتِ حال ہے مال و دولت کی فراوانی نہیں بلکہ سیلاب ہے، مال و دولت کی فراوانی کے جو لوازم ہیں یعنی عیش پرستی، اسراف و تبذیر، کرّ و فر، نخوت و غرور کا وہ عالم کہ الامان والحفیظ، افسوس کہ فقر و تنگدستی میں ان کا ایمان محفوظ رہا اور انسانی اخلاق و ملکات قائم رہے لیکن اس پُر آشوب صورت نے تو ان کی کایا پلٹ دی، نہ معلوم یہ سیلاب کہاں رکے گا اور کیسے رُکے گا؟

خدا فراموشی کا نتیجہ!

آج بیروت کا خوبصورت شہر اور لبنان کے علاقے کیوں جہنم کدہ بنے ہوئے ہیں؟ عبرت کا مقام ہے، عیاشی و بدمعاشی، بے حیائی و عریانی وغیرہ فواحش و منکرات کے قبیل کی کون سی چیز ہے جس کا وجود وہاں نہ ہو؟ آخر نام اسلام کا ہو اور تمام کام کفر کے ہوں یہ نفاق حق تعالیٰ کے یہاں برداشت نہیں مانا کہ اس عذاب کے کچھ ظاہری اسباب بھی ہیں لیکن تکوینی اسباب اور ظاہری اسباب میں تعارض نہیں ظاہری اسباب کچھ بھی ہوں لیکن باطنی اسباب کچھ اور ہوتے ہیں، ہم بینات کے "بصائر و عبر" کے صفحات میں بارہا یہ عبرت انگیز تلخی آمیز حقائق واشگاف بیان کر چکے ہیں، (ولکن لا حیات لمن تنادی (تم جس کو پکار رہے ہو وہ موت کی نیند سو چکا ہے) کون سنتا ہے؟ نقارخانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں، نہ معلوم کہ دنیا کو یہ جنون کیوں سوار ہے؟ ہوش کیوں نہیں آتا؟ "حیاتِ طیبہ" پاکیزہ زندگی کی برکات کا کیوں احساس نہیں ہے؟ دنیا کی اس خدا فراموش زندگی کا پہلا نتیجہ اضطرابِ قلب ہے، چنانچہ آج دنیا سے سکون مفقود ہے، دنیا کی نعمتوں میں سب سے زیادہ قابلِ اہمیت نعمت سکونِ قلب ہے اگر یہ حاصل ہے تو سب کچھ ہے، ورنہ تمام باغ و بہار ہیچ ہے، اگر غور کیا جائے تو انسان اس یقین تک پہنچ سکتا ہے کہ پاکیزہ زندگی کے ذریعہ دنیا بھی جنت ہے اور خدا فراموش زندگی میں دنیا جہنم ہے «الا إن جهنم محيطة بالكافرين» کی ایک توجیہ یہ بھی ہے بلاشبہ اگر دنیا کو آخرت کی نعمتوں کا ذریعہ بنایا جائے تو دنیا دنیا نہیں ہوگی بلکہ یہی دنیا آخرت بن جائے گی اور ہر لمحہ اجر و ثواب نصیب ہوگا اور اسی لئے حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ «لا تسبوا الدنیا» یعنی دنیا کو بُرا مت کہو۔ اس کی مراد یہی ہے کہ دنیا آخرت کا مزرعہ اور کھیتی ہے، اگر

یہ دنیا نہ ہو تو آخرت کی نعمتیں کیوں کر حاصل ہوں گی؟ دنیا ہی کے ذریعہ آخرت کی تمام نعمتیں حاصل ہوسکتی ہیں ہاں اگر دنیا کا مقصد صرف دنیا کی نعمتیں ہیں تو پھر دنیا لعنت ہی لعنت اور غضب ہی غضب کی مستحق ہے اور اسی لئے حدیث شریف میں آیا ہے جو جامع ترمذی ابو داؤد وغیرہ میں ہے ”الدنیا ملعونۃ، ملعون ما فیہا الا ذکر اللہ أو ما والاہ أو عالم أو متعلم“ کہ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے تمام لعنت کے مستحق ہیں، بجز چار چیزوں کے (۱) حق تعالیٰ کی یاد، اور یادِ الٰہی کے حکم میں ہر پاکیزہ زندگی ہے (۲) اور جو چیز دنیا کی اللہ تعالیٰ کو پسند ہو، یعنی عملِ صالح، عبادات اور مکارمِ اخلاق وغیرہ (۳) عالم اور علمی زندگی (۴) علم دین حاصل کرنے کی زندگی۔ یہ چار چیزیں گویا آخرت کی نعمتیں ہیں اگرچہ دنیا میں ہیں۔ ان چار چیزوں کو اگر نکال دیا جائے تو دنیا ملعون ہے قابلِ لعنت ہے اس میں کوئی خوبی نہیں۔

یہ میں نہیں کہتا ہے کہ یکسر دنیا کو چھوڑ کر رہبانیت اختیار کی جائے، نہیں! ہرگز نہیں! تجارت، زراعت کسب حلال، حصولِ نفقہ اور صحیح معاشرہ کے تمام وسائل یہ سب کچھ عین دین ہے۔ ان چیزوں کا مقصد اگر صحیح ہے تو یہ سب چیزیں دنیا نہیں بلکہ آخرت کی ہیں اور باعثِ اجر و ثواب ہیں، شریعت ان چیزوں پر پابندی نہیں لگانا چاہتی ہے بلکہ ان کا رُخ صحیح کرنا چاہتی ہے، مقصد کی اصلاح کرنا چاہتی ہے، اس طرح تمام دنیا آخرت کی زندگی بن سکتی ہے، اگر تمام زندگی عبادت میں گذار دے اور تمام اوقات درس و تدریس میں یا وعظ و تبلیغ میں گذار دے لیکن مقصد جاہ و منزلت ہو یا حصولِ مال و دولت ہو تو یہ ساری چیزیں دنیا بن جاتی ہیں، الغرض ایک گناہ ہی ایسی چیز ہے کہ حسنِ نیت سے طاعت نہیں بن سکتی ہے، باقی تمام دنیا کی جائز و حلال چیزیں حسنِ نیت سے آخرت کے حکم میں داخل ہوسکتی ہیں، صالحینِ امت کے لئے دنیا جنت ہے، فاسقین کے لئے یہ دنیا بھی جہنم ہے، میرا مقصد کوئی وعظ نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ جس کو حق تعالیٰ نے ذرا بھی عقل دی ہو اور وہ ذرا بھی عقلِ سلیم کے تقاضے کو پورا کرے تو دنیا کی حقیقت اس پر واضح ہوجائے گی، حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں عجیب و غریب اسلوب سے دنیا کی اس حقیقت کو مختلف مقامات میں بیان فرما کر اربابِ عقول پر اپنی حجت پوری کر دی ہے، آج کل جو کچھ اضطراب اور پریشانی کا نقشہ دنیا میں نظر آرہا ہے، یہ سب کچھ حبِّ دنیا کے ثمرات ہیں، کاش مسلمان قرآن کریم کا ہی ترجمہ سمجھتے اور تدبر سے تلاوت کرتے تو یہ دانشگاف حقائقِ الٰہیہ ان کے سامنے آتے، لیکن آج مسلمانوں کو اخبار بینی، ریڈیو اور ٹی وی سے فرصت کہاں ملتی ہے؟ بہت کچھ تیر مارا تو ریڈیو پر اسلامی زندگی

کا کچھ مضمون خاص سانچے میں ڈھلا ہوا سن لیا اور سمجھ لیا کہ بس بہت کچھ درس حاصل ہو گیا، کاش مسلمانوں کا تعلق براہِ راست اللہ تعالیٰ کے اس پیغام سے ہوتا اور سمجھ کر بغور تلاوت نصیب ہوتی تو مسلمانوں کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ قرآن کریم عظیم ترین نعمت ہے، یہ وہ ذکر اللہ ہے جس کے ذریعہ ایمان میں نورانیت پیدا ہوتی ہے اور جس سے قلب و روح کو غذا ملتی ہے، دماغ کی تربیت ہوتی ہے، زندگی کی اصلاح ہوتی ہے۔ "ہم خرما و ہم ثواب" والی صورت ہے۔ لیکن مرض موجود ہو اور مرض کا علاج نہ ہو بلکہ مرض ہی کو صحت سمجھ لیا جائے تو شفاء کیوں کر ہو گی؟ بد پرہیز مریض کا انجام بجز ہلاکت اور کیا ہو سکتا ہے؟ زہر کو تریاق سمجھ کر استعمال کرنے کا جو نتیجہ ہے وہ ظاہر ہے، حق تعالیٰ مسلمانوں کو صحیح فہم عطا فرمائے اور حق بات سننے کی توفیق نصیب فرمائے اور اس پر عمل کی مزید توفیق ہو، اور ان مختصر اشارات سے فائدہ اٹھانے کی توفیق ہو۔ آمین

صفر المظفر ۱۳۹۶ھ، مارچ ۱۹۷۶ء

قرآنِ کریم، دین و دنیا کی کامرانیوں کا کفیل

قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی وہ عظیم الشان نعمت ہے جو دین و دنیا کی سعادتوں اور کامرانیوں کی کفیل ہے، نزولِ قرآن کے بعد فلاح و نجاح، مجد و شرف قرآن ہی سے وابستہ کیا گیا ہے جو قوم اس کتابِ عظیم پر عامل ہو گی وہ دین و دنیا کی بلندیوں پر سرفراز ہو گی، اس کے برخلاف جو قوم اس سے اعراض کرے گی وہ آخرت کی ذلتوں اور نکبتوں کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی عزت اور اقتدار سے محروم ہو گی، صحیح مسلم میں حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

«إنَّ اللهَ یرفعُ بهذا الکتاب أقواماً ویضع به آخرین» | بلاشبہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے ذریعہ قوموں کو سربلند کرتا ہے (یعنی جو عمل کریں) اور قرآن کریم کے ذریعہ قوموں کو گراتا ہے (یعنی جو عمل نہ کریں)

مسند دارمی اور جامع ترمذی میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے جو مذکورہ بالا حدیث کی شرح و تفسیر ہے اس کا ماحصل درج ذیل ہے:-

اس دنیا میں فتنے آئیں گے، ان فتنوں سے محفوظ رہنے کا راستہ صرف قرآنِ حکیم ہے، قرآنِ حکیم میں پچھلی امتوں کے عبرت آموز واقعات ہیں، اسی طرح آئندہ آنے والے واقعات کی نشان دہی اس کتابِ حکیم میں فیصلہ کن صحیح ترین احکامِ الٰہی ہیں جو جابر حکومت اس قرآن کو چھوڑے گی وہ تباہ ہو جائے گی، جو لوگ قرآنِ حکیم کے علاوہ کسی اور جگہ رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے وہ منزلِ مقصود پر نہیں پہنچیں گے۔

قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی ہے اس میں حکیمانہ نصائح ہیں اور یہی صراطِ مستقیم ہے۔

یہ کتابِ عظیم اھواءِ انسانی کے زیغ و ضلال سے بالاتر ہے (اسی طرح، انسانی زبانوں کی تلبیسات سے برتر ہے، اہلِ علم اس کے علوم و معارف سے کبھی سیر نہیں ہوں گے، پڑھنے والا بار بار پڑھنے سے بھی نہیں اکتائے گا۔

بار بار پڑھنے سے اس کے حقائق پرانے نہیں ہوتے اور اس کے علوم و معارف کا خزانہ کبھی ختم نہیں ہونے پاتا، جنّات نے قرآن سننے کے بعد اعتراف کیا:۔

ہم نے تو عجیب قرآن سنا جو رشد و ہدایت کا راستہ بتلاتا ہے
اس پر ہم ایمان لاتے ہیں۔

اس قرآن پر جس نے یقین کیا وہی سچا ہے، جس نے عمل کیا وہ اجر کا مستحق ہے، جس نے اس پر فیصلہ کیا اس نے عدل و انصاف اختیار کیا، جس نے اس کی طرف دعوت دی اس نے صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کی۔

ان حکیمانہ حقائق سے لبریز کلماتِ نبوت نے کیا کسر چھوڑی ہے؟ کیسی وضاحت اور صراحت سے بتلایا گیا کہ قرآنِ حکیم پر عمل کرنے پر کیا کیا ثمرات مرتب ہوں گے اور اس سے روگردانی کے کیا کیا عواقب حاصل ہوں گے، پھر اس کتاب مقدس کے مقامِ رفیع کو کس طرح واضح کیا گیا کہ یہ قرآنِ کریم رشد و ہدایت، علوم و حقائق کا سرچشمہ ہے، اسی کے قوانین میں سعادت و خیر موجود ہے اس کے سوا خود ساختہ قوانین خواہ یورپ و امریکہ کے ہوں یا روس اور اس کے ہمنواؤں کے وہ سراپا زیغ و ضلال ہیں، ان پر عمل کرنا خسران و ذلت کو دعوت دینا ہے۔

کاش ہماری اسلامی حکومتیں آنکھیں کھولیں اور حقائقِ نبویہ پر عمل پیرا ہوں، یہ حکومتیں آج جس ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں اور اس کے نتیجہ میں ذلت آمیز تعلقات و معاہدات پر مجبور ہیں اگر یہ حکومتیں قرآنی تعلیمات کو اپنا نصب العین بنالیں تو ان کی زندگیوں کا نقشہ ہی کچھ اور ہو جائے اور ذلت آمیز قومی زندگی سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے۔

(۲)

حکومتِ جمہوریۂ عربیہ متحدہ لائقِ ستائش ہے کہ اس نے ماہِ رمضان المبارک میں جو نزولِ قرآن کا یادگار مہینہ ہے ممالکِ اسلامیہ میں گیارہ سو مصری قراء کو بھیجا تاکہ ہر جگہ مساجد میں تراویح کے بعد قرأت کی محفلیں آراستہ ہوں اور مسلمان

وجد آفرین تلاوتِ قرآن سے محظوظ ہوں، ظاہر ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر قراءِ کرام کو دُور دراز ملکوں میں بھیجنا اور مصارفِ سفر برداشت کرنا، پُرتکلّف ہوٹلوں میں ٹھہرانا ایک چھوٹی سی حکومت کے لئے قابلِ صد تحسین ہے، پاکستان میں بھی دو ممتاز قاری پہنچ چکے ہیں ایک تو شیخ القراء الشیخ محمود خلیل حصری ہیں اور دوسرے الشیخ احمد الایاسیتی ہیں، سُنا ہے کہ فی کس دو دو ہزار پونڈ سفر خرچ اور حق الخدمت کے طور پر حکومت کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔

حکومتِ متحدہ عربیہ کا یہ جذبہ قابلِ قدر ہے، رقاصات اور مغنّیات کو خراجِ تحسین حاصل کرنے کے لئے باہر دوسرے ملکوں میں بھیج کر زرِ مبادلہ خرچ نہیں کیا گیا بلکہ دینی روح اور جذبۂ ایمانی ابھارنے کے لئے قاریوں کو بھیجا گیا، کاش! اس قسم کی خدمات سیاسی مصلحتوں سے بالاتر ہوں اور محض دینی سطح پر ہوں، ہمیں تو بہرحال حسن ظن ہی رکھنا چاہیئے دوسرے ممالکِ اسلامیہ کو اس سلسلہ میں حکومتِ متحدہ عربیہ کی مثال سامنے رکھتے ہوئے تبلیغِ دین اور اسلامی روابط کو مستحکم و مضبوط کرنے کے لئے وفود بھیجنا چاہیئے۔

غالباً فروری ۱۹۶۷ء میں پاکستان میں بین الاقوامی طرز پر محفلِ قراءت کا انتظام ہو رہا ہے حکومتِ پاکستان اس سلسلہ میں جو حصہ لے سکتی ہے وہ یہ کہ اس کے مصارف اربابِ ثروت سے چندہ لینے کے بجائے خود برداشت کرے، اس طرح بعض افسوسناک واقعات کا اعادہ بھی نہ ہو اور حکومت کی ایک نیک کام میں شرکت مسلمانوں کے نزدیک قابلِ ستائش ہو۔

بہرحال جو کچھ کیا جا رہا ہے اور سوچا جا رہا ہے اس کی افادیت سے انکار نہیں لیکن اصل میں جو کام کرنے کا ہے اس سے اسلامی حکومتیں نہ صرف غافل بلکہ معاند ہیں، اصل کام قرآنی زندگی ہے، قرآنی حکومت بنانے کی تدبیر ہے، قرآنی احکام نافذ کرانے ہیں قرآنی ارشادات کے مطابق معاشرے کی اصلاح کرنی ہے، قرآنی حدود و تعزیرات جاری کرانے ہیں تاکہ اسلامی حکومتیں بنیں اور قانونِ الٰہی پر عمل کرانے کی برکات سے بہرہ مند ہوں اور دین و دنیا کی سعادتوں سے سرفراز ہوں اور ہر طرح کی فلاح و کامرانی سے

ہمکنار ہوں، دنیا کی زندہ قوموں کی صف میں شمار ہوں اور آخرت میں حق تعالےٰ کی نعمتوں کے مستحق بنیں۔

صحیح اسلامی روح تو قرآنی زندگی سے ہی پیدا ہوگی لیکن افسوس صد افسوس کہ اسلامی مملکتوں میں صحیح اسلامی روح کو کچلا جا رہا ہے۔ سوچیئے اور بار بار سوچیئے کہ ان اسلامی ملکوں میں قرآن اور اسلام کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا جا رہا ہے، قدم قدم پر حیا سوز مظاہر ہیں فواحش و منکرات کا سیلاب امڈ رہا ہے۔ اباحیت و الحاد اور نفاق کے منحوس سائے متحرک ہیں۔ کیا اس صورت میں یہ حکومتیں اسلامی حکومت کہلانے کی مستحق ہیں؟ مصر ہو یا شام، پاکستان ہو یا افغانستان جب تک اسلامی قوانین اساس و بنیاد نہیں بنیں گے ان میں سے کوئی بھی صحیح معنی میں اسلامی حکومت کہلانے کی مستحق نہیں ہوگا البتہ ان کو مسلم حکومتیں کہا جا سکتا ہے۔

شوال ۱۳۸۶ھ فروری ۱۹۶۷ء

امتِ محمدیہ اور قرآنِ کریم

امتِ محمدیہ - علی صاحبہا الصلوات والتحیات - کی نجات و سعادت دارین کا ایک نسخہ "قرآنِ عظیم" ہے یعنی قرآن کریم پڑھنا پڑھانا اور اس پر عمل کرنا، اس قرآن کریم ہی کے ذریعہ اس امت کے پہلے دور کی اصلاح ہوئی ہے اور اس آخری دور کی اصلاح بھی بغیر اس کے ناممکن ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے، جیسے کہ "الریاض النضرۃ" میں محب طبری نے نقل کیا ہے :-

لن یُصلح آخر ھٰذہ الأمة إلا ما أصلح أولھا.

معلوم ہوا تھا کہ حکومتِ سعودیہ میں پہلی مرتبہ قرآنِ کریم کے حفظ و تجوید کے مدارس مساجد میں عوامی سطح پر قائم ہونے شروع ہوگئے ہیں اور اس کا سہرا بھی ہمارے محترم سیٹھی محمد یوسف صاحب پاکستانی کے سر ہے کہ اس کے محرک موصوف ہی بنے ہیں ان حضرات کی حوصلہ افزائی کے لئے میں نے ایک مکتوب مکہ مکرمہ لکھا تھا جس میں خلفاءِ راشدین ثلاثہ: حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم کی روایات میں سے تین مرفوع حدیثیں کتبِ حدیث سے نقل کی تھیں اور ان سے واضح نتائج نکالے تھے، معلوم ہوا کہ اس مکتوب کی ان حضرات نے بڑی قدر کی اور ٹائپ کروا کر مختلف جہات میں سرکاری اداروں تک بھیجا۔ احباب کی خواہش تھی کہ ناظرین "بینات" کے لئے بھی اس مکتوب کو شائع کیا جائے تاکہ ہمارے حکمران طبقے بھی اس پر غور فرماسکیں اور مسلمانوں کے مکتبوں میں جو "قرآنی خدمت" انجام دی جارہی ہے اس کی قدر کرسکیں، واللہ سبحانہ ولی کل توفیق وسعادۃ۔ (بنوری)

مکتوب بنام صدر و اراکین انجمن اشاعتِ حفظِ قرآنِ عظیم مکہ مکرمہ (صانہا اللہ)

الی حضرۃ رئیس جمعیۃ تحفیظ القرآن الکریم بمکۃ المکرمۃ وأعضائھا حفظھم اللہ ورعاھم تحیۃً وسلامًا.

انجمن حفظ قرآن کریم مکہ مکرمہ کے صدر محترم اور معزز اراکین کے نام! اسلامی تحیہ اور سلام مسنون!

وبعد: فقد أُنبئت أنہ انعقدت جمعیۃ تحفیظ القرآن الکریم فی مکۃ وربوع الحجاز المقدس وفعلاً قد طال فروعھا، فقد زاد سروری

مجھے بتلایا گیا ہے کہ مکہ مکرمہ اور حجاز مقدس کے دوسرے خطوں میں حفظ قرآن کریم کی ایک انجمن کی تشکیل کی گئی ہے اور اب اس کی شاخیں دور دور تک پھیل چکی ہیں (اور نہایت سرگرمی سے کام ہو رہا ہے)

وطمأنينتي بأن المملكة وأهلها تشملهم العناية الربانية ويزداد بذلك مجدها وعزتها وهناك أحاديث ثلاثة :

(۱) فحديث عثمان رضي الله عنه أنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:

«خيركم من تعلّم القرآن وعلّمه»

(رواه البخاري)

دل على أن كل أمة قامت بنشر القرآن تعليمًا وتعلمًا هو خير أمة، في لسان الرسول صلى الله عليه وسلم وأن هذه الخدمة قد فاقت كل خدمة دينية مهما كانت عظيمة، وإن خيرًا لأمة وظيفتها ومنصبها تعليم القرآن وتعلّمه وبذلك تستحق هذا اللقب الجليل .

میری مسرت و اطمینان میں یہ معلوم کرکے مزید اضافہ ہوا کہ توفیقِ ربانی حکومتِ سعودیہ عربیہ اور اراکینِ سلطنت کے بھی شاملِ حال ہے (کہ وہ اس تنظیم کی سرپرستی کر رہے ہیں) اور یہ توجہ اور سرپرستی حکومت کی عزت وعظمت میں ترقی و اضافہ کا باعث بن رہی ہے۔

اس سلسلہ میں تین اہم احادیث (غور وفکر اور خوشخبری کی غرض سے) آپ کے سامنے پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں :-

(۱) ایک خلیفۂ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی حدیث وہ کہتے ہیں کہ : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ : تم میں سب سے بہتر وہ (شخص یا جماعت) ہے جو خود قرآن کا علم حاصل کرے اور پھر دوسروں کو اس کی تعلیم دے (بخاری شریف)

اس حدیث میں اس امر کی بشارت ہے کہ جو قوم قرآنِ عظیم کی تعلیم (پڑھنے پڑھانے) کی اشاعت میں سرگرم ہوگی وہ لسانِ نبوت (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی تصدیق کے مطابق بہترین قوم ہے اور یہ تعلیم وتعلمِ قرآن کی خدمت بڑی سے بڑی دینی خدمت پر بھی فوقیت رکھتی ہے، نیز معلوم ہوا کہ اسلام میں بہترین امت کا امتیازی فریضہ اور منصب "تعلیم وتعلمِ قرآنِ عظیم" ہے اور اسی فریضہ کی بنا پر وہ اس عظیم لقب (بہترین قوم) کی مستحق ہوتی ہے۔

(خلافتِ راشدہ خصوصًا شیخین ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہم کے زرین عہدِ خلافت اس کے شاہد ہیں)

(٢) وحديث عمر الفاروق رضي الله عنه أنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «إن الله يرفع بهذا الكتاب أقواماً ويضع به آخرين» (رواه مسلم) قد دلّ على أن كل أمة قامت بتعاليم القرآن يرفع الله علمها ويحفظ كيانها ومجدها وعزتها وأن كل أمة قد انقطعت صلتها بالقرآن خابت وخسرت ذهانت وذلّت.

(٢) دوسری حدیث حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: بیشک اللہ تعالیٰ شانہ اس کتابِ الٰہی (کی تعلیم و تعمیل اور اتباع کے ذریعہ بہت سی قوموں کو (دینی و دنیاوی) رفعت و علوِ مرتبت کے اعلیٰ مقام پر پہنچائے گا اور بعض قوموں کو اسی کتاب کو (پس پشت ڈال دینے) کی بنا پر ذلت اور پستی کے گڑھے میں ڈال دے گا، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث واضح طور پر بتلا رہی ہے کہ جو قوم قرآنِ عظیم کی تعلیمات کو دنیا میں قائم کرے گی (اس کو اپنا نصب العین بنائے گی) اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اس کی عظمت و شوکت کے جھنڈوں کو بلند سے بلند تر فرمائیں گے اور اس کے قومی وجود و استحکام اور (اقوامِ عالم میں) اس کی عزت و عظمت کی حفاظت فرمائیں گے اور جس قوم کا رشتہ قرآن سے ٹوٹ جائے گا (اور وہ قرآنی تعلیمات سے صرفِ نظر کرے گی) وہ ذلیل و خوار اور تباہ و برباد ہو جائے گی.

(٣) وحديث علي رضي الله عنه أنه قال: أما إني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: «ألا إنها ستكون فتنة» قلت: ما المخرج منها يا رسول الله؟ قال: «كتاب الله، فيه نبأ ما قبلكم وخبر ما بعدكم وحكم ما بينكم

(٣) تیسری حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہے وہ فرماتے ہیں: (مسلمانو) سن لو! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ وحی ترجمان سے سنا ہے، آپ ارشاد فرما رہے تھے: آگاہ ہو جاؤ، عنقریب عظیم فتنوں کا دور آنے والا ہے: میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ان سے نکلنے اور بچنے کا راستہ کیا ہے؟ (وہ بھی تو بتلائیے) آپ نے ارشاد فرمایا: کتاب اللہ (قرآنِ عظیم) ہے اس کتابِ الٰہی میں تم سے پہلی امتوں کے (عبرت آموز) اخبار و واقعات موجود ہیں اور تمہارے بعد آنے والی قوموں کی (سبق آموز عواقب کی) خبریں اور علامتیں بھی بیان کی گئی ہیں، اس کتابِ آسمانی

هو الفصل ليس بالهزل
من تركه من جبار
قصمه الله، ومن ابتغى
الهدى في غيره أضله
الله، وهو حبل الله
المتين، وهو الذكر الحكيم
وهو الصراط المستقيم،
هو الذي لا تزيغ به
الأهواء، ولا تلتبس به
الألسنة، ولا يشبع منه
العلماء، ولا يخلق من كثرة
الرد، ولا ينقضي عجائبه
هو الذي لم تنته الجن إذ
سمعته حتى قالوا: ((إنا سمعنا
قرآناً عجباً يهدي إلى الرشد
فآمنا به)) من قال به صدق
ومن عمل به أجر ومن حكم
به عدل، ومن دعا إليه هدى
إلى صراط مستقيم (رواه الترمذي)
يدل على أن أكبر فتنة أن تحرم
الأمة عن نور الإيمان والإسلام،
وأن سبب النجاة والعصمة
ليس إلا القرآن الكريم والتمسك

میں تمہارے درمیان (پیدا ہونے والے) اختلافی امور کے واضح
احکام بھی موجود ہیں یہ قطعی اور فیصلہ کن" اللہ کا کلام ہے، ہنسی
دل لگی کی داستان نہیں ہے جس (شخص یا قوم) نے اس کو ازراہِ
تحقیر ٹھکرایا اللہ اس کی کمر توڑ ڈالے گا اور جو کوئی اس کے علاوہ
کسی اور دستور و آئین سے رہنمائی حاصل کرے گا اللہ تعالےٰ
اس کو (دنیا و آخرت دونوں) میں گمراہ کردیں گے (یاد رکھو یہی
کلامِ الٰہی اللہ تعالیٰ کا مضبوط و پائیدار رشتہ ہے اور یہی (حکمتوں
اور مصلحتوں پر مشتمل) حکیمانہ ذکر (یادداشت) ہے، اور
یہی سیدھا راستہ ہے اور یہ وہ (محکم و واضح قانون
قدرت) ہے کہ نہ انسانی اغراض وخواہشات اس میں کوئی
کجی پیدا کرسکتی ہیں اور نہ انسانی زبانیں اس کی تعبیر و تشریح
میں کوئی شک وشبہ ڈال سکتی ہیں (تحریف و تلبیس کرسکتی
ہیں)، اور نہ (حقائق کے متلاشی) علماء (اس کے علوم سے)
کبھی (بھی اور کسی بھی زمانہ (اور ملک میں) سیر (اور مستغنی) ہو
سکتے ہیں اور نہ یہ کثرت استفادہ (اور تفکر و تدبر کی زیادتی
سے (کسی بھی زمانہ اور ظروف واحوال میں) کہنہ (از کار رفتہ
اور ناقابلِ عمل) ہو سکتا ہے اور نہ اس کے عجائبات
(نو بنو انکشافات) کبھی ختم ہو سکتے ہیں اور یہ تو وہ کلامِ
الٰہی ہے کہ جن جیسی (سرکش اور ناری) مخلوق بھی اس کو
سنتے ہیں بیساختہ یہ کہنے سے باز نہ رہ سکی کہ بے شک ہم
نے تو ایک عجیب و غریب قرآن سنا ہے جو نیکی اور بھلائی
کی (واضح اور قطعی) رہنمائی کرتا ہے اسی لئے ہم اس پر ایمان
لے آئے: (یاد رکھو، جس (شخص یا قوم) نے صدقِ دل سے،

به والاعتصام به، ويدل على أن كل دولة إسلامية لم تتمسك بالقرآن الكريم لا أنها خابت وخسرت فقط بل تصاب بالبوار والدمار والذلة والهوان، والعياذ بالله؛

اس پر اعتقاد رکھا (اور ایمان لایا) وہ سچا ہے اور جس نے اس پر عمل کیا وہ (یقیناً دنیا و آخرت میں) اجر و ثواب کا مستحق ہوا، اور جس نے اس کے مطابق فیصلہ کیا اس نے (یقیناً) عدل و انصاف (قائم) کیا اور جس نے اس کی تعلیم و تعلّم عمل کی) طرف (مخلوق کو) دعوت دی (سمجھ لو) اس کو صراط مستقیم کی ہدایت کر دی گئی.

فأمام هذه الأحاديث وأمثالها نثق والحمد لله، على أن تلك الحركة في البلاد العربية المقدسة فاتحة خير وطليعة سعادة وبشائر رحمة وتباشير مجد وعزة وازدهار.

یہ حدیث ہمیں واضح طور پر بتلاتی ہے کہ اسلام میں سب سے بڑا فتنہ یہ ہے کہ ملتِ مسلمہ ایمان و اسلام کے نور سے محروم ہو جائے اور اس فتنے (اور اس کے نتیجہ میں دوسرے تمام فتنوں) سے نجات حاصل کرنے اور محفوظ رہنے کا واحد راستہ قرآنِ کریم اور اس کو دانتوں سے پکڑ لینے اور اس کی علماً و عملاً پابندی کرنے کے سوا اور کوئی نہیں ہے. نیز یہ حدیث اس پر بھی قطعی طور پر دلالت کرتی ہے کہ جو کوئی بھی اسلامی حکومت قرآنِ کریم کو دانتوں سے نہ پکڑے گی نہ صرف یہ کہ وہ (فوز و فلاح سے) محروم ہو گی اور خسارہ میں پڑے گی بلکہ قطعی ہلاکت و تباہی اور ذلت و خواری اور رسوائی کا نشانہ بنے گی، خدا کی پناہ.

نسأل الله سبحانه أن يديم هذه الحركة وليستمر في ربوع المملكة نشاطها، وتزيد شعبها وفروعها، وتستفيد منها أبناؤها وتستمر أثمانها وأغصانها كي تعيش الأمة العربية في هناء وسعادة ترفرف عليها أعلام المجد

لہٰذا ان تینوں حدیثوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کو پورا وثوق و اعتماد ہے کہ مقدس عرب ممالک میں اس تحریک "حفظ و تعلیمِ قرآن" کا ظہور و عروج "حکومتِ سعودیہ" کے لئے ایک خوش آئند آغاز اور سعادت و خوش بختی کا پیش خیمہ ہے اور گوناگوں خداوندی رحمت کی بشارت ہے اور عزت و عظمت اور

والمفخرة.
فأهنئ القائمين بهذا
الأمر والساعين في
سبيله خير تهنئة
من أعماق قلبي،
والله سبحانه ولي
كل توفيق وكل نعمة
وهو حسبنا ونعم الوكيل
والسلام.
محمد يوسف البنوري
عميد المدرسة العربية
الإسلامية وخادم الحديث
النبوي بها، كراچي رقم-٥

شوکت و جلالت کی صبحِ صادق کی (آفاقِ عالم میں پھیلنے والی
روشنی ہے. ہم اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے صدقِ دل سے دعا کرتے
ہیں کہ وہ اس تحریک کی سرگرمی برابر قائم و دائم رکھے اور مملکت سعودیہ
کے علاقوں میں یہ تحریک برابر جاری و ساری رہے اور اس کی
شاخوں اور شعبوں میں روز افزوں اضافہ ہو اور امتِ عربیہ کی
نسلیں اس سے مستفید ہوتی رہیں اور یہ تحریک زیادہ سے زیادہ
بار آور ہو تاکہ عرب قوم سعادت و خوشبختی کی زندگی عظمت و فخر
کے جھنڈوں کے زیر سایہ بسر کرتی رہے اور اب اس انجمن کے بانی
اور تحریک کو چلانے والے حضرات اور اس کے کارکنوں کی خدمت
میں تہنیت اور عقیدت کا تحفہ پیش کرتا ہوں اور اللہ سبحانہ تعالیٰ ہی
ہر توفیقِ خیر اور ہر نعمت کے متولی ہیں اور وہی ہمارے لئے کافی
ہیں اور بہت اچھے کارساز ہیں. والسلام
محمد یوسف بنوری مہتمم و استاذ حدیث مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی نمبر (٥)
جمادی الثانیہ ١٣٨٥ھ ، اکتوبر ١٩٦٥ء

اسلام میں سنّت اور حدیث کا مقام

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سیدنا محمدٍ
خاتم النبیین وعلیٰ آلہٖ وأصحابہٖ أجمعین۔

امابعد! حق تعالیٰ نے بنی نوعِ انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے وحیِ آسمانی کا سلسلہ جاری فرمایا، اس کے لئے جن برگزیدہ نفوسِ قدسیہ کا انتخاب فرمایا، اسلامی زبان میں انہیں انبیاء و رسل کہتے ہیں، ان مقدس ہستیوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے "عصمت" کی ضمانت دی جاتی ہے یعنی ان کا ہر قول و فعل شیطانی تسلط اور نفسانی خواہش سے پاک ہوتا ہے:۔

((وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى)) النجم	اور نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے، وہ تو حکم ہے بھیجا ہوا۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

ان کی صداقت و حقانیت کو قطعی دلائل و شواہد سے ثابت کیا جاتا ہے تاکہ مخلوق پر حجت قائم ہو اور وہ پوری طرح یقین و اطمینان کے ساتھ ان پر ایمان لائیں اور ان کی تصدیق کر سکیں، انہی دلائل کا نام "معجزات" و "بینات" ہے، ان کی نبوت و رسالت، ان کی صداقت و حقانیت اور ان کی عصمت و ضمانت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کی اطاعت تمام انسانوں کے لئے فرض ہو جاتی ہے۔

((وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ)) النساء	اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی واسطے کہ اس کا حکم مانیں اللہ کے فرمانے سے (ترجمہ شیخ الہندؒ)

الغرض آسمانی ہدایت کا اصل منبع وہ ربط و تعلق ہے جو انبیاء کرام علیہم السلام کا بارگاہ قدس سے قائم ہوتا ہے اور جسے نبوت و رسالت سے تعبیر کیا جاتا ہے انہیں حق تعالیٰ کی طرف سے برابر پیغامات دیئے جاتے ہیں، پیغام رسانی کبھی فرشتہ کے ذریعہ ہوتی ہے اور کبھی براہِ راست جس فرشتہ کو اس کے لئے منتخب فرمایا گیا ہے ان کا نام جبریل ہے:۔

((مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ)) (الشوریٰ)	اور کسی آدمی کی طاقت نہیں کہ اس سے باتیں کرے اللہ، مگر اشارہ سے یا پردہ کے پیچھے سے یا بھیجے کوئی پیغام لانے والا پھر پہنچا دے اس کے حکم جو وہ چاہے۔

منبعِ وحی | یہ پیغام عام طور سے کسی صحیفہ یا کتاب کی صورت میں نہیں بلکہ فرشتہ کی زبانی یا القاء فی القلب کی شکل میں ہوتا ہے اور کبھی اس پیغام کو الفاظ کی صورت میں منضبط کر کے بھیجا جاتا ہے جسے "صحیفہ" یا کتاب" کہا جاتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے اور تورات، زبور، انجیل، قرآنِ کریم چار مشہور کتابیں اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، ظاہر ہے کہ انبیاءِ کرامؑ کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز ہے اور صحیفوں اور کتابوں کی تعداد نہایت قلیل، اس سے صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ وحی صرف کتاب یا صحیفے میں منحصر نہیں بلکہ نبی و رسولؑ کی ذات گرامی منبع وحی ہے، امت کے لئے جس طرح کتاب واجب القبول اور واجب الاتباع ہے ٹھیک اسی طرح نبی و رسول کا ہر حکم و ارشاد اور ہر قول و فعل امت کے لئے حجت اور واجب الاتباع ہے، البتہ اتنا فرق ہے کہ کتاب بعد کی امت تک قطعی ذرائع سے پہنچتی ہے اس لئے اس کے احکامات کا ثبوت قطعی ہوتا ہے اور بقیہ پیغامات کبھی تواتر یا عملی توارث جیسے قطعی ذرائع سے پہنچتے ہیں اور کبھی وہ ذرائع قطعی نہیں ہوتے اس لئے اس دوسری قسم کا درجہ قرآنِ کریم کی سی قطعیت کا نہیں ہو گا مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآنِ کریم تو امت کے لئے قابل قبول ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے پیغامات کی معاذ اللہ کوئی قیمت نہ ہو، قرآنِ کریم بار بار اعلان کرتا ہے کہ قرآنِ کریم کا سمجھانا، سکھانا اور اس پر عمل کرانا یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ہے، قرآنِ کریم کے اجمال کی تفصیل، اس کے ابہام کی توضیح، اس کے اشارات کی تشریح، اس کے مقصد و منشاء کی تعیین، اس کی مشکلات کا حل اور اس کے احکام کی عملی تشکیل یہ سب کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ہیں جو وحیِ الٰہی کے ذیل میں آتے ہیں اور امت کے لئے واجب القبول ہیں۔

تعلیماتِ انبیاء | بہر حال یہ حقیقت واضح اور مسلم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پیغاماتِ الٰہیہ جس طرح قرآن کی صورت میں نازل ہوئے اسی طرح بہت سے پیغاماتِ الٰہیہ قرآن کے علاوہ بھی آپؐ پر نازل ہوئے جن کی تعلیم اُمت کو دی گئی، قرآنِ کریم کی اصطلاح میں انبیاءِ کرام کی ان تعلیمات کا نام "الحکمۃ" ہے اور قرآنِ کریم نے متعدد مقامات میں اسے "انزل" سے تعبیر فرمایا ہے۔

دین کا منبع اور مدار | ان اشارات سے یہ بات سمجھنی آسان ہو گئی کہ دین کا اصل مدار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے اور دین کا اصل منبع نبوت کی تعلیمات و ہدایات ہیں خواہ قرآنِ کریم میں ان کا ذکر ہو یا نہ ہو، اسلام کے تشریعی نظام پر غور کرنے کا موقع جن لوگوں کو ملا ہے وہ جانتے

ہیں کہ بہت سے بنیادی اور اہم احکامات حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحیِ خفی کے اشارے سے امت کو دیئے اور مدت کے بعد قرآن کریم میں ان احکام کی آیات نازل ہوئی جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان فرمودہ احکام کی تصدیق وتائید کی گئی، اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے :-

۱۔ توحید ورسالت کے اقرار کے بعد اسلام میں سب سے پہلی عبادت صلاۃ یعنی نماز ہے، اس عبادت کا سلسلہ ابتداءِ اسلام ہی سے قائم ہو گیا تھا، معراج سے پہلے صبح وشام کی دو نمازیں فرض تھیں اور اسراء کے بعد پانچ نمازوں کی فرضیت نازل ہوئی، مگر قرآنِ کریم میں اس وقت تک نماز کے اوقات کی تفصیل نہ تھی، اس فریضہ کو امت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے لیا اور اس پر عمل کیا۔

۲۔ نماز کا جو نقشہ آپؐ نے قولاً وعملاً پیش فرمایا کہ اللہ اکبر سے شروع ہو اور السلام علیکم پر ختم ہو، اس میں قیام ہو، قرأت ہو، رکوع وسجود ہو، جلسہ وقومہ ہو اور رکعتیں کبھی دو ہوں کبھی تین کبھی چار وغیرہ وغیرہ ان تمام تفصیلات کی طرف قرآنِ کریم میں کہیں کہیں اشارے تو موجود ہیں لیکن یہ مفصل نقشہ امت نے آپؐ ہی کے قول وعمل سے سیکھا اور اس پر عمل کیا، نہ قرآنِ کریم پر اس کا مدار نہ اس میں ذکر کا انتظار۔

۳۔ نماز کے لئے طہارت ووضو وغیرہ کے لئے آپؐ نے ہی ہدایت فرمائی اور امت نے اس پر عمل کیا، تقریباً اٹھارہ سال بعد سورۂ مائدہ میں آیتِ وضو نازل ہوئی جبکہ امت اٹھارہ سال سے آپؐ کی ہدایت پر عمل پیرا تھی۔

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو امت کو نماز میں بیت المقدس کے استقبال کا حکم فرمایا، سولہ، سترہ مہینے اس پر عمل رہا، اس کے بعد قرآنِ کریم میں بیت اللہ شریف کے استقبال کا حکم ہوا، بیت المقدس کے استقبال کا حکم قرآن میں نازل نہیں ہوا تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان فرمودہ حکم کی قرآنِ کریم نے تصدیق کی «سیقول السفہاءُ من الناس» الآیۃ

۵۔ جب بنی النضیر سے جہاد کا حکم ہوا تو جنگی مصلحت کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے کھجور کے بعض درختوں کو کاٹنے کا حکم فرمایا، یہود نے اس پر اعتراض کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تصدیق وتصویب کے لئے قرآن نازل ہوا اور ان درختوں کے کاٹنے کو باذن اللہ

فرمایا :-

« مَا قَطَعْتُم مِّن لِّينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ » جو کاٹ ڈالا تم نے کھجور کا درخت یا رہنے دیا کھڑا اپنی جڑ پر سو اللہ کے حکم سے (ترجمہ شیخ الہندؒ)

ان چند مثالوں سے یہ بات بخوبی واضح ہو گئی کہ امت کی راہنمائی کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سرچشمۂ ہدایت ہے کسی بھی معاملہ میں نہ قرآن پر توقف ہے نہ اس کا انتظار، صحابہ کرام جو قرآنِ کریم کے سب سے پہلے اور براہِ راست مخاطب تھے، ان کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں حیثیتیں مسلم تھیں کہ آپ نبی معصوم بھی ہیں اور ہر معاملہ میں مطاعِ مطلق بھی اسی لئے وہ قرآنِ حکیم اور حدیثِ نبوی کے احکام کو یکساں طور پر واجب الاتباع مانتے تھے اور ان پر عمل کرتے تھے۔

احادیثِ نبویہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کافی بڑا حصّہ تو وہ ہے جو قرآنی احکام کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہے، قرآنِ کریم نے أَقِيمُوا الصَّلَاةَ فرمایا، آپؐ نے اقامتِ صلاۃ کی قولاً و عملاً تعلیم دیتے ہوئے فرمایا : « صلوا كما رأيتموني أصلي » تم بھی ایسی نماز پڑھو جیسی میں پڑھتا ہوں « وَآتُوا الزَّكَاةَ » کا حکم نازل ہوا تو آپؐ نے اس کی تفصیل بیان فرمائی کہ کن کن اموال میں زکاۃ ہوگی، ہر ایک کا نصاب کیا ہوگا، مقدار زکاۃ کیا ہوگی، اس کے اصول و شرائط کیا ہوں گے؟ اس اعتبار سے آپؐ کا وجود باجود اور آپؐ کی حیاتِ طیبہ عملی قرآن ہے یعنی احکامِ قرآن کا عملی نمونہ اور مثال ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب آپؐ کا خُلُق دریافت کیا گیا تو فرمایا : « كان خُلُقُه القرآن » آپؐ کا خلق قرآن تھا. شریعتِ محمدیہ کا وسیع نظام جو سب کے سامنے ہے اور جس میں عقائد و عبادات اخلاق و معاشرت، سنن و آداب، جہاد و قتال، صلح و جنگ، سیاست و معیشت سبھی کچھ آجاتا ہے، ان میں بہت سے احکام ایسے ہیں جو قرآن کریم میں نہیں ہیں، آپؐ ہی نے امت کو ان کی تعلیم فرمائی ہے، ظاہر ہے کہ دینِ اسلام کا تفصیلی نقشہ قرآن کریم کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انفاسِ قدسیہ اور احادیث طیبہ کو ملانے ہی سے تیار ہوتا ہے اور اسی سے الحاد و تحریف اور رکیک تاویلات کے راستے بند ہوتے ہیں، اگر قرآن کریم کو نبیؐ کی عملی زندگی اور آپؐ کے ارشادات و ہدایات سے الگ کر لیا جائے تو قرآنِ کریم ملحدین کی غلط تعبیرات کا تختۂ مشق بن جائے گا اور تحریف و تاویل کا انسداد دشوار ہو گا۔

مستشرقین اور اعداءِ اسلام کی قرآنِ کریم میں معنوی تحریف کی کوشش

متنِ قرآنِ کریم کی حفاظت کا تو اعلان ہو چکا ہے، اس کا امکان نہیں تھا کہ قرآن کے الفاظ میں ردّ و بدل کیا جا سکے، اس لئے دشمنانِ اسلام جو ہمیشہ اسلام کو مٹانے کے درپے رہے، قرآنِ کریم سے تو مایوس ہو گئے، انہوں نے قرآن کی معنوی تحریف کے لئے یہ چور دروازہ تلاش کیا کہ حدیثِ نبوی کو جو معانیٔ قرآن کی محافظ ہے ناقابلِ اعتبار ثابت کریں۔ یورپ کے مستشرقین اور دشمنِ اسلام ملاحدہ نے اپنے تمام وسائل اور دماغی و قلمی تمام طاقتیں احادیث کو بے وقعت بنانے کے لئے صرف کرنا شروع کر دیں اور مسلمانوں میں "منکرینِ حدیث" کے نام سے منافقین کا جو گروہ آج موجود ہے غلام احمد پرویز وغیرہ انہوں نے انہی دشمنانِ اسلام کی راہنمائی میں اس مہم کو اور آگے بڑھایا (ولقد صدق علیھم ابلیس ظنہ) چنانچہ نئی نسل کے بہت سے افراد جو دینی تعلیم و تربیت سے بے بہرہ تھے ان خیالات کا شکار ہو گئے۔

تاریخ فتنۂ انکارِ حدیث انکارِ حدیث کے فتنہ کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ سب سے پہلے خوارج نے اس کی بنیاد رکھی، صحابۂ کرام کی تکفیر کر کے ان کی روایت کردہ احادیث کا انکار کیا اور صرف کتاب اللہ کو مانا، ان کے بالمقابل شیعہ نے کتاب اللہ کی تحریف اور احادیث کے انکار کا راستہ کھولا اور دین کا انحصار اپنے ائمہ کی روایت پر رکھا معتزلہ نے تاویل کے راستہ سے فتنۂ انکارِ حدیث کو مزید قوت بہم پہنچائی مگر یہ دور اسلام کی شوکت و عزت کا دور تھا۔ ان کی مساعی ناکام رہیں اور مسلمانوں نے جس طرح قرآن کو سینے سے لگایا اور علوم قرآن کی خدمت کو سرمایۂ سعادت سمجھا اسی طرح احادیثِ نبویہ کو سر آنکھوں پر رکھا اور علومِ حدیث کی خدمات اس محنت و عقیدت سے انجام دیں کہ تاریخِ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انفاسِ قدسیہ کی وہ حفاظت کی کہ عقل حیران ہے۔

حدیثِ نبویؐ سے مسلمانوں کا شغف دیکھ کر اس وقت اعداءِ اسلام نے وضعِ احادیث کا چور دروازہ نکالا اور منگھڑت روایات پھیلانا شروع کیں تاکہ حق و باطل خلط ملط ہو کر حقیقت ملتبس ہو جائے، مگر حق تعالےٰ نے اپنے دین کی حفاظت کے لئے ایسے رجالِ کار پیدا کئے جنہوں نے دودھ کا دودھ

اور بانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا، انہوں نے فنِ رجال اور جرح و تعدیل مرتب کیا اور روایات کی چھان بین کر کے تمام اعداءِ اسلام یہودیوں، سبائیوں اور ملحدوں کی اس سازش کو خاک میں ملا دیا، امتِ محمدیہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی حفاظت کے کام کو اتنا آگے بڑھایا کہ اصولِ حدیث کے مختلف فنون کی تعداد ایک سو کے قریب پہنچ گئی، بلاشبہ دینِ اسلام ابدی دین تھا، قیامت تک کی نسلِ انسانی کے لئے سرچشمۂ ہدایت تھا، ضروری تھا کہ دینِ اسلام کی یہ دونوں مشعلیں کتاب و سنت قیامت تک روشن اور ہر قسم کی آندھیوں اور جھگڑوں سے محفوظ رہیں تاکہ ہر دور میں اللہ کی حجت قائم رہے اور قرآنِ کریم کی یہ آیت ہر وقت صادق رہے :-

‹‹ وکیف تکفرون وانتم تتلی علیکم آیات اللہ وفیکم رسولہ ›› آل عمران	اور تم کس طرح کافر ہوتے ہو اور تم پر تو پڑھی جاتیں ہیں آیتیں اللہ کی اور تم میں اس کا رسول ہے ۔

فرمانِ نبوی میں اس حقیقت کا اظہار اس طرح فرمایا گیا ہے :-

‹‹ ترکت فیکم أمرین لن تضلوا ما تمسکتم بہما کتاب اللہ وسنۃ رسولہ ›› (موطأ مالک[1])	میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک ان کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے ایک کتاب اللہ اور دوسری اس کے رسول کی سنت ۔

قرآنِ کریم اور حدیثِ نبویؐ الغرض اس کا کوئی امکان نہیں کہ قرآن و حدیث کو ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکے نہ یہ ممکن ہے کہ قرآنِ کریم پر ایمان ہو اور حدیثِ نبوی سے انکار، کیونکہ قرآنِ کریم بار بار اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں تمہاری نجات ہے اور آپؐ کی نافرمانی تباہی و بربادی کا موجب ہے، آپ کی مخالفت پر قرآنِ کریم سخت سے سخت وعیدیں سناتا ہے، آپ کی زندگی کو اُمت کے لئے اسوہ و نمونہ قرار دیتا ہے، قرآن کی تعلیم و تشریح اور اس کے اجمال کی تفصیل کو قرآن آپ کا فرضِ منصبی بتاتا ہے، حاصل یہ کہ دنیا و آخرت کی نجات و سعادت اور فلاح و بہبودی آپ کی پیروی میں ہے اور حق تعالےٰ کی محبت و اطاعت کا معیار بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کے سوا کچھ نہیں :-

---

[1] یہ حدیث سند کے اعتبار سے معضل ہے یعنی دو واسطے ساقط ہیں لیکن مستدرکِ حاکم میں ابن عباسؓ کی روایت اور سننِ بیہقی میں ابوہریرہؓ کی روایت اور مستدرک میں معقل بن یسار کی حدیث اس حدیث کی صحت کے شاہد ہیں۔

«قل إن كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله ويغفر لكم ذنوبكم» (آل عمران)

ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تعالےٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمائے گا۔

فرقِ باطلہ اور حدیث بہرحال تمام فرق باطلہ خوارج، شیعہ، معتزلہ، قدریہ، جہمیہ اور مرجئہ وغیرہ نے احادیث کے خلاف جو ہرزہ سرائی کی تھی (اور امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام احمد اور دیگر محدثین و متکلمین نے جس کا دندان شکن جواب دے کر ان کے حوصلے پست کر دیئے تھے)، ہر دور میں ملاحدہ اسے جدید شکل وصورت میں پیش کرتے رہے ہیں چنانچہ مستشرقین یورپ نے بھی اسی محاذ سے اسلام کی بیخ کنی شروع کی اور اس کے لئے ایک منظم مہم چلائی جو زہر قدیم باطل پرستوں نے اگلا تھا اسی کو دوبارہ نئی بوتلوں میں بھر بھر کر جدید نسل کے حلق سے اتارنے کی کوشش کی، کبھی کہا کہ احادیث تو دو سو سال بعد قلم بند ہوئی ہیں ان کا کیا اعتبار؟ کبھی حاملین حدیث پر اعتراضات کئے، کبھی عقلی شبہات ووساوس پیش کئے اور ان راستوں سے نماز، اس کے اوقات، زکاۃ، روزہ، حج قربانی وغیرہ تمام عبادات میں شکوک وشبہات پیدا کئے، احکامِ شرعیہ کو اعتراضات کا نشانہ بنایا، ملائکہ جنات، شیاطین، ارواح وغیرہ میں تاویلِ باطل کا راستہ کھولا، اس طرح کوشش کی گئی کہ خدانخواستہ اسلام کی بنیادوں کو ہلا دیا جائے مگر لسانِ نبوت سے یہ اعلان پہلے صادر ہو چکا تھا:۔

«يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتأويل الجاهلين»

ہر آنے والی نسل میں کچھ عادل وثقہ حضرات اس علمِ دین کے حامل ہوں گے جو غلو کرنے والوں کی تحریف، باطل پرستوں کے غلط ادعا اور جاہلوں کی تاویل کو صاف کریں گے۔

سنت وحدیث پر مطبوعہ کتابیں

الحمدللہ! اللہ تعالےٰ نے ہر دور میں ایسے رجالِ کار پیدا کئے جنہوں نے باطل پرست جاہلوں کے اٹھائے ہوئے گرد وغبار سے سنت کا چہرہ صاف کیا، امام شافعیؒ سے ابن وزیر یمانی صاحب الروض الباسمؒ اور شیخ جلال الدین السیوطی صاحب مفتاح الجنۃ فی الاحتجاج بالسنۃ تک اور ان سے آج تک، نہ صرف عربی اردو میں بلکہ انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی قابلِ قدر تالیفات وجود میں آئیں۔ گذشتہ پچاس سال کے عرصہ میں اہل علم نے بیسیوں گرانقدر تصنیفات سے علمی کتب خانوں میں

بیش بہا اضافہ کیا، قدمائے امت نے جو کتابیں تصنیف فرمائیں ان کی طویل فہرست راقم الحروف کی کتاب "عوارف المنن مقدمہ معارف السنن" میں مذکور ہے جو انشاء اللہ عنقریب طبع ہوگی، اس تیس چالیس برس میں جو ذخیرہ اس موضوع پر مدوّن ہوا ان میں چند کتابوں کا نام بطورِ نمونہ درجِ ذیل ہے۔

(۱)	الحدیث والمحدثون	محمد محمد أبوزہو	عربی
(۲)	السنۃ قبل التدوین	محمد عجاج خطیب	〃
(۳)	الأنوار الکاشفۃ	شیخ عبدالرحمٰن یمانی	〃
(۴)	ظلمات أبی ریۃ	شیخ محمد عبدالرزاق حمزہ	〃
(۵)	کتاب السنۃ	موسیٰ جار اللہ قازانی	〃
(۶)	فی الحدیث النبوی	شیخ مصطفےٰ زرقاء شامی	〃
(۷)	تدوینِ حدیث	مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم	اُردو
(۸)	بصائر السنۃ	مولانا امین الحق صاحب طوری	〃
(۹)	فتنۂ انکار حدیث	افتخار احمد بلخی	〃
(۱۰)	فتنۂ انکار حدیث	مولانا سرفراز صاحب	〃
(۱۱)	سنت قرآن کریم کی روشنی میں	مولانا غفار حسن	〃
(۱۲)	حدیث قرآن کریم کی نظر میں	از راقم الحروف	اردو[۱]
(۱۳)	احادیث النبی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم	پروفیسر ردحی	〃
(۱۴)	سنت کا تشریعی مقام	مولانا محمد ادریس میرٹھی	〃

(۱۵) Studies in Early Hadith Literature.

〃 ڈاکٹر مصطفےٰ اعظمی انگریزی

مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی کے درجہ تخصص کے رفقاء نے حسب ذیل مقالات کتابی شکل میں مرتب کئے ہیں:۔

---

[۱] مقالہ شائع شدہ ماہ نامہ دار العلوم دیوبند ۱۳۵۶ھ۔

(الف) السنة النبوية والقرآن الكريم :	للأستاذ محمد حبيب الله المختار	عربی، اُردو
(ب) وسائل حفظ الحدیث وجهود الأمة في ذلك	از مولوی عبد الحکیم سلہٹی	اُردو
(ج) علم مصطلح الحديث وأسماء الرجال وثمراته	از مولوی عبد الحق دیروی	عربی
(د) کتابة الحدیث وأدوار تدوینه	از مولوی محمد اسحٰق سلہٹی	اردو
(ھ) الكتب المدونة في الحديث وأصنافها وخصائصها	از مولوی محمد زماں کلاچوی	عربی
(و) الصحابة وماروده من الأحاديث	مولوی حبیب اللہ مهندی	عربی

یہ چھ کتابیں ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئیں جس وقت امت کے سامنے یہ ذخیرہ آئے گا دنیا حیرت میں رہ جائے گی۔

اسی قیمتی ذخیرہ کی ایک قابلِ قدر کتاب الشیخ مصطفیٰ سباعی مرحوم کی تالیف، السنة ومكانتها في التشريع الإسلامي اپنے موضوع پر اہم ترین کتاب ہے جو گیارہ سال قبل قاہرہ میں طبع ہوئی تھی، مؤلفِ موصوف اپنے وقت کے بہترین خطیب اور پُرجوش صاحبِ قلم تھے، موصوف نے ازہر سے عالمیت و استاذیت کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے یہ موضوع اختیار کیا تھا، چنانچہ پورے ایک سو مآخذ سے یہ کتاب نہایت فصیح و بلیغ زبان اور شیریں و شگفتہ اسلوب میں تحریر کی، یہ کتاب تیس کے قریب بڑے بڑے عنوانات پر مشتمل ہے جن میں سنتِ نبوی کے ہر گوشہ پر شافی بحث کی گئی ہے، ضمنی بحثیں نہایت عمدہ اور عجیب و غریب آتی ہیں، مستشرقین کی خرافات و شبہات کے نہایت مؤثر اور فاضلانہ و محققانہ جوابات کتاب کا بہترین اور قیمتی حصہ ہیں، اگر اس کتاب میں اس کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تو اس کتاب کی قیمت کے لئے کافی تھا۔

مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی کے دار التصنیف نے چاہا کہ اس گنجِ گراں مایہ کو اردو میں منتقل کیا جائے تاکہ نئی نسل میں یورپ کے پھیلائے ہوئے زہر کے لئے تریاق کا کام دے اور جدید

افکار میں سرایت کردہ سمیّت کے لئے اکسیر اعظم اور کبریت احمر ثابت ہو، ترجمہ کے لئے ہمارے مدرسہ کے درجۂ تکمیل کے فارغ التحصیل مولانا احمد حسن ایم اے کا انتخاب کیا گیا اور اس پر مولانا محمد ادریس میرٹھی استاذِ حدیث مدرسہ عربیہ کی نظرِ اصلاحی نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا، جلدِ اول طبع ہو چکی اور جلدِ دوم عنقریب زیورِ طبع سے آراستہ ہو گی، دعا ہے کہ حق تعالیٰ ہماری نئی نسل کو نئے فتنوں سے بچائے اور شیاطینِ یورپ ان کی متاعِ ایمانی کو لوٹنے کی جو تدبیریں کر رہے ہیں انہیں خاک میں ملا دے، وصلی اللہ تعالےٰ علیٰ خیر خلقہ صفوۃ البریۃ سیدنا محمد وآلہ وصحبہ وبارک وسلم۔

جمادی الثانیہ ۱۳۹۱ھ، اگست ۱۹۷۱ء

منصب نبوت کی اجمالی تشریح

یہ تحریر تقریباً ۱۸ برس پہلے کی ہے اور اٹھارہ سال قبل ماہنامہ "بینات" میں پہلی مرتبہ اشاعت پذیر ہوئی جو دراصل ایک گرانقدر تمہید کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس موضوع پر مفصل مضمون کی نہیں۔

نبوت کی حقیقت | نبوت کی اصلی حقیقت تو اسی رب العزت قدوس وسبوح جلّ ذکرہ کو معلوم ہے جس نے نظام عالم کی ظاہری و باطنی اصلاح کے لئے اس ربانی عطیہ کی سنت عالم میں جاری کر دی تھی، یا پھر اس کو جو اس عطیۂ الٰہی سے سرفراز کیا گیا ہو کسی اور پر اس کی پوری حقیقت کا روشن ہونا حقیقت سے بعید ہے، اس لئے کہ انسان کے پاس حقائقِ اشیاء کے معلوم کرنے کے لئے عقل ہے اور نبوت ایک ایسی حقیقت ہے جو عقل سے وراء الوراء ہے۔ عقل و عقلیات کی سرحد جہاں ختم ہوتی ہے۔ وہاں سے نبوت کی سرحد شروع ہوتی ہے، لیکن محققین اسلام اور اکابر امت نے قرآن کریم کی روشنی میں اور امام الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کے آثار و احوال کے مشاہدہ و علم کے بعد جو تحقیقات پیش کی ہیں وہ یقیناً ایک حد تک اس حقیقتِ کبریٰ کی جلوہ نمائی کے لئے کافی ہیں اور ان کی عقولِ سلیمہ نے اس حقیقت کی تفہیم میں جو عقلی پیرائے اختیار کئے ہیں اور نظائر و شواہد سے اس کو سمجھایا ہے وہ ہمارے "علمِ کلام" کا اہم ترین جزء ہیں۔ امام ابوالحسن اشعری، ابن حزم ظاہری، قاضی ابوبکر باقلانی، ابواسحاق اسفرائینی ابویعلیٰ، ابوالمعالی امام الحرمین عبدالکریم شہرستانی، امام غزالی، فخرالدین رازی، سیف الدین آمدی، ابن خلدون عزالدین بن عبدالسلام، ابن تیمیہ وغیرہ وغیرہ محققینِ اسلام نے تیسری صدی ہجری کے وسط سے لے کر آٹھویں صدی کے وسط تک اس موضوع پر گرانبہا علمی جواہرات کا ایک نادر ترین ذخیرہ چھوڑا ہے[1]۔ محققینِ ہند اور متاخرین علماءِ اسلام میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی

---

[1] بعض قدماء معتزلہ اور قدماء شیعہ کی بھی اس موضوع پر مستقل تصانیف ہیں چونکہ جمہور امت محمدیہ کے مسلک کے وہ خلاف ہیں اور زیادہ تر ان کا طرز اس موضوع میں محض فلسفیانہ ہے۔ اس لئے ان کا ذکر نہیں کیا گیا۔

اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی دیوبندی کے اسمائے گرامی اس سلسلہ کی صف اول میں درج ہونے چاہئیں! اور سچ تو یہ ہے کہ اس موضوع پر جو جواہر پارے شاہ دہلی نے پیش کئے ہیں ان کی ہمسری کرنے کے لئے قدیم ادب میں سوائے حجۃ الاسلام غزالیؒ کوئی دوسری ہستی زیادہ نمایاں نظر نہیں آتی یا تو یہ واقعہ ہے یا ہماری نظر کا قصور ہوگا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک ہزار برس کی تحقیقات کا عطران کے سامنے موجود تھا اور ان کی تحقیقات کی تیز شعاعوں میں منزل مقصود کی رہنمائی آسان ہوگئی۔

تاہم حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے حقائق کی تفہیم و افہام کے لئے جس سرچشمہ کی ضرورت تھی شاہ دہلی خود اس سے سرشار تھے۔ امام غزالی کی کتابوں میں یہ بحث "المنقذ من الضلال" و "معارج القدس" میں سب سے عمدہ شکل میں موجود ہے۔ امام رازی کی "تفسیر کبیر" و "مطالب عالیہ" میں کافی سامان ہے۔ شاہ دہلی نے چند کتابوں میں اس کی پوری تحلیل اور کامل تجزیہ کیا ہے۔ بالخصوص اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کی پہلی جلد کے مختلف ابواب میں نبوت کی حقیقت، منصب نبوت کی تشریح، نبوت کے خواص و لوازم، انبیاء و مصلحین کے فروق وغیرہ کو خوب واضح کیا ہے[۱]۔

امیر یمانی کی "ایثار الحق علی الخلق" میں اس موضوع میں کافی لمبی بحث موجود ہے۔ ابن تیمیہ کی اس موضوع پر "کتاب النبوات" تقریباً تین سو صفحات میں موجود ہے لیکن حق یہ ہے کہ ابن تیمیہ نے باوجود علمی تبحر و تدقیق اور باوجود جلیل القدر محقق ہونے کے اس موضوع کا حق نہیں ادا کیا۔ غزالی کے چند صفحے اور شاہ دہلی کے چند ورق کو میں اس ساری کتاب پر ترجیح دیتا ہوں چند ضمنی فوائد و نکات کے سوا اس میں کوئی اہم بات یا علمی تحقیق اس موضوع پر نہیں جس کی ان سے توقع تھی مجھے اس وقت نبوت کی عقلی تشریح کرنی منظور نہیں کیونکہ اس کی تشریح سے پہلے "روح" کی حقیقت سمجھانی ہوگی جو بجائے خود ایک مستقل دقیق و غامض علمی مضمون ہے جس میں ارسطو نے کتاب النفس لکھی ہے اور اس کی تلخیص و تراجم و شروح ثامسطیوس، لامقیدوروس، استیلقوس، اسکندر افرودوسی، ابن بطریق وغیرہ وغیرہ نے کی ہیں[۲]۔

---

[۱] ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ کے حسب ذیل ابواب ذکر الملا الاعلیٰ ص ۱۲، باب التکلیف ص ۱۵، انشقاق التکلیف من التقدیر ص ۱۶، اقتضاد التکلیف من المجازاۃ ص ۱۹، اختلاف الناس فی جبلتہم ص ۲۰، حقیقۃ السعادۃ ص ۳۹، اختلاف الناس فی السعادۃ ص ۴۰، الحاجۃ الی ہداۃ السبل ص ۶۵، حقیقۃ النبوۃ ص ۶۶، کیفیۃ الاستنباطات ص ۳۰ و ۳۱، باب الارتفاق الاول ص ۳۰۔ [۲] ملاحظہ ہو تفصیل کے لئے کشف الظنون ج ۲ ص ۱۲۴۸، ۳۰۴۱۔

اسلامی دور میں ابوالعباس احمد سرخسی (المتوفی ۳۸۶ھ) صدقہ بن منجا الدمشقی (۲۶۰ھ) مؤرخِ مشہور مسعودی (۳۴۶ھ) امام غزالی (۵۰۵ھ) امام رازی (۶۰۶ھ) ابن القیم (۷۵۲ھ) برہان الدین بقاعی (۸۸۵ھ) وغیرہ وغیرہ متکلمین اسلام اور علماء امت نے "روح" پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے "معارج القدس" غزالی کی اور "کتاب الروح" ابن القیم کی اور "سر الروح" بقاعی کی اور "کتاب الفتوح لمعرفۃ احوال الروح" بعض علماء عصر کی اور "الطاف القدس" شاہ ولی اللہ کی ہمارے سامنے مطبوعہ موجود ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ حقیقتِ نبوت کی تشریح کے لئے "حقیقت روح" بیان کرنا ضروری ہوگی۔ اس وقت ان غامض و دقیق علمی موضوعات کی طرف جانا نہیں اور نہ فیصلہ کرنا ہے۔ صرف اپنے سلف صالحین کے چند علمی کارناموں سے طلبہ کو واقف کرانا تھا، کوئی مشکل سے مشکل دقیق سے دقیق علمی موضوع اور خصوصاً جس کا تعلق دین اسلام سے ہو ایسا نہیں ہوگا جس پر کہ ہمارے اکابر نے اپنی بیش بہا تحقیقات کا ذخیرہ جمع نہ کیا ہو۔ اس وقت مقصود صرف اتنا ہے کہ یہ بتلایا جائے کہ "نبی" (پیغمبر) کسے کہتے ہیں؟ اور قرآن کریم میں "انبیاء" اور "نبوت" کے کیا کیا خواص بتلائے گئے ہیں؟ تاکہ آیات بینات کی روشنی میں ایک مسلمان صحیح عقیدہ کو سمجھ سکے، اور جب کسی کی نبوت ثابت ہو جائے مسلمان کے لئے ان کی نبوت پر ایمان لانا ضروری ہوگا اور جب ایمان لایا گیا اس وقت "نبی" ایک امتی کے لئے ایک برگزیدہ مقدس واجب الاطاعت ہستی ہوگی۔ اس کے احکام اس کی مرضیات اس کے اوضاع و اطوار اس کے اخلاق و عادات، غرض کل نظام حیات میں اس کی سنت افراد امت میں سے ہر فرد کے لئے دلیل راہ ہوگی۔ پھر وہاں کیوں؟ اور کیوں کر؟ کا سلسلہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ سوائے تسلیم و انقیاد و اطاعت و فرمانبرداری کے کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ اس کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس کی رضامندی خدائے تعالیٰ کی رضامندی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ خود حق تعالیٰ یوں ہی فرما چکے ہیں۔ جیسا کہ آئندہ انشاء اللہ تعالیٰ واضح ہو جائے گا۔ ہاں عبادت بہر حال اللہ تعالیٰ کی ہوگی۔ رسول کی اطاعت سے اس کی عبادت لازم نہیں آتی۔ عبادت و بندگی اور چیز ہے۔ اطاعت و تسلیم اور چیز ہے دونوں میں خلط نہ کرنا چاہیئے۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ رسول کی رہنمائی میں اللہ تعالیٰ شانہ کی عبادت و بندگی کی جائے۔ اب وہ رہنمائی مختلف صورتوں میں ہوگی۔ کبھی

اللہ تعالیٰ کی طرف صاف طور پر نسبت کر کے ارشاد فرمایا جائے گا، کبھی اپنی طرف سے کچھ ارشاد فرمائیں گے گو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوگا۔ لیکن لفظوں میں اللہ تعالیٰ کی نسبت نہیں ہوگی، کبھی ان کے اتباع ان کے طرز وطریقہ کو دیکھ کر رہنمائی حاصل کریں گے۔ غرض کہ رہنمائی حاصل کرنے کے طریقے مختلف ہوں گے۔

نبی و رسول یا پیغمبر لغت عرب میں "نبأ" اس خبر کو کہتے ہیں جس میں فائدہ ہو اور فائدہ بھی عظیم اور اس خبر سے سننے والے کو علم و اطمینان بھی حاصل ہو[ل]۔ غرض کہ تین چیزیں اس میں ضروری ہوں (۱) خبر فائدے کی ہو (۲)، فائدہ بھی عظیم الشان ہو (۳)، سننے والے کو یقین کامل یا اطمینان قلب حاصل ہو جائے۔ قرآن کریم نے اسی لغت سے "نبی" کا لفظ ایک ایسے انسان کے لئے استعمال کیا جس نے اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے فائدے اور نفع کی ایسی عظیم الشان خبریں سنائیں جن سے ان کی عقول قاصر ہیں صرف اپنی عقل نارسا سے وہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ ایسی باتیں وہی ہوں گی جو اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہوں گی اور پھر ان خبروں پر اطمینان یا علم جب حاصل ہو سکتا ہے کہ خبر دینے والا اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی دلیل بھی پیش کرے یا صرف اس کی زندگی ہی اتنی پاکیزہ اتنی اعلیٰ و مقدس ہو کہ اس پر جھوٹ کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکے۔ اس کی بات سنتے ہی لوگوں کو یقین آجائے۔ اب صرف "نبی" کا لفظ ہی لغت عرب کے مطابق ان سب حقائق پر روشنی ڈالتا ہے جس کی تفصیل و تحقیق کے لئے صفحات بھی ناکافی ہیں۔ شیطانی وساوس یا طبعی جمود و عناد اگر قبول سے مانع آجائے یہ دوسری بات ہے۔

"رسالة" لغت عرب میں "رسالت" کے معنی ایک پیغام کے ہیں اور "رسول" کہتے ہیں پیغام پہنچانے والے کو قرآن کریم نے اس لفظ کو اس پیغام پہنچانے والے کے لئے استعمال کیا جو اللہ تعالیٰ شانہ کی جانب سے دین و دنیا کے مصالح کے بارے میں پیغامات اس کے بندوں تک پہنچائے۔

اب خلاصہ یہ ہوا کہ اسلام کی زبان میں "نبی و رسول" وہ سفیر ہے جس کا خود اللہ تعالیٰ نے انتخاب فرمایا ہو۔ خدائے تعالیٰ کے پیغامات اس کے بندوں تک پہنچاتا ہو، دین و دنیا کے مصالح و منافع کے لئے ایک "قانون حیات" ایک "نظام العمل" ایک "دستور اساسی" پیش کرتا ہو، ایسے احکام ایسے

ل ملاحظہ ہو مفردات راغب" ص ۴۹۹ ابن تیمیہ نے "النبوات" میں اسی کو دوسرے عنوان سے بیان کیا اور کسی قدر اور لطیف کر دیا۔ دیکھو "النبوات" ص ۲۲۲ الخ

حقائق ایسے امور ان کو ارشاد کرتا ہو جن سے ان کی عقول قاصر ہوں۔ ایسی دقیق و غامض باتوں کی اطلاع دیتا ہو جہاں ان کا طائرِ عقل پرواز نہ کرسکتا ہو، ان کے شکوک و شبہات کا ازالہ کرتا ہو، نہ کرنے پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی و عذاب سے ڈراتا ہو جو حکم دیتا ہو وہ خود کرتا ہو خود ان کے لئے مجسم پیکرِ عمل ہو۔ اس قانونِ حیات و نظام العمل کے لئے اس کا وجود آئینہ ہو یہ ہیں اسلام کی زبان میں شریعت کی لغت میں "رسول و نبی" کے معنی، اسی کو ہم اپنی زبان میں پیغمبر کہتے ہیں۔ "رسول" و "نبی" میں کیا فرق ہے یہ ایک محض علمی چیز ہے۔ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ لیکن اجمالاً اتنا واضح رہے کہ حافظ ابن تیمیہ نے "کتاب النبوات" میں جو فرق بیان کیا وہ ہمیں سب سے بہتر معلوم ہوتا ہے جس کا خلاصہ صرف اتنا ہے: "کہ جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے صرف غیب کی خبروں سے قوم کو اطلاع دیتا ہو، ان کو نصیحت کرتا ہو، ان کی اصلاح کرتا ہو اور اللہ تعالےٰ کی جانب سے اس کو "وحی" ہوتی ہو، وہ "نبی" کہلاتا ہے۔ اگر ان اوصاف کے ساتھ وہ کفار کی طرف اور نافرمان قوم کو تبلیغ پر مامور بھی کیا جائے تو وہ "رسول" بھی ہوگا۔"[۱]

اب ہم قرآن کریم کی روشنی میں "انبیاء و رسل" کے خواص و لوازم پیش کرتے ہیں لیکن معلوم رہے کہ "انبیاء و رسل" کے عام خصائص بحیثیت نبوت و رسالت سب مشترک ہیں، قرآن کریم نے جتنے کمالات اور اوصاف انبیاء و رسل کے بیان کر دیئے ہیں وہ سب حضرت خاتم الانبیاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بوجہ کمال موجود ہیں کیونکہ آپ سب انبیاء و رسل سے افضل ہیں۔ آپ سید الانبیاء ہیں، خاتم الانبیاء ہیں۔ یہ نصوصِ قطعیہ کا مفاد ہے اور امتِ مرحومہ کا "اجماعی عقیدہ" ہے اور تاریخ عالم کی "حقیقتِ ثابتہ" ہے اور اسلامی دور کے حیرت انگیز کارنامے اس کے شاہد عدل ہیں۔ قرآن کریم نے بہت سے انبیاء و رسل کے خصائص و کمالات بیان کرنے کے بعد آپ کو حکم دیا اور فرمایا۔

((اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ)) (الانعام) "یہ حضرات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی ہے۔ آپ بھی انہیں کے طریقہ پر چلئے۔"

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب النبوات" صہ ۲۶۳ تا صہ ۲۶۴)

اس سے یہ صاف معلوم ہوا کہ انبیاء کے جتنے عملی و علمی کمالات تھے، آپ ان سے مالا مال تھے۔ اس لئے ہم جتنی آیات کریمہ مختلف انبیاء و رسل کے خصائص و اوصاف میں پیش کریں گے مقصود ان سے صرف نبوت کے کمالات و خصائص ہوں گے جو اصل نبوت کی وجہ سے قدر مشترک سب میں موجود ہیں۔

منصبِ نبوّت و رسالت

نبوت ایک عطیہ ربّانی ہے جس کی حقیقت تک رسائی غیر نبی کو نہیں ہو سکتی، اس کی حقیقت کو یا تو حق تعالےٰ جانتا ہے جو نبوت عطا کرنے والا ہے یا پھر وہ ہستی جو اس عطیہ سے سرفراز ہوئی۔ مخلوق بس اتنا جانتی ہے کہ اس اعلیٰ و ارفع منصب کے لئے جس شخص کا انتخاب کیا گیا ہے وہ:

۱۔ معصوم ہے، یعنی نفس کی ناپسندیدہ خواہشات سے پاک صاف پیدا کیا گیا ہے اور شیطان کی دسترس سے بالاتر۔ عصمت کے یہی معنیٰ ہیں کہ ان سے حق تعالیٰ کی نافرمانی کا صدور ناممکن ہے۔

۲۔ آسمانی وحی سے ان کا رابطہ قائم رہتا ہے اور وحی الٰہی کے ذریعہ ان کو غیب کی خبریں پہنچتی ہیں۔ کبھی جبریلِ امین کے واسطہ سے اور کبھی بلا واسطہ، جس کے مختلف طریقے ہیں۔

۳۔ غیب کی وہ خبریں عظیم فائدہ والی ہوتی ہیں اور عقل کے دائرے سے بالاتر ہوتی ہیں، یعنی انبیاء علیہم السلام بذریعہ وحی جو خبریں دیتے ہیں ان کو انسان نہ عقل و فہم کے ذریعہ معلوم کرسکتا ہے نہ مادی آلات و حواس کے ذریعہ ان کا علم ہو سکتا ہے۔

ان تین صفات کی حامل ہستی کو مخلوق کی ہدایت کے لئے مبعوث و مامور کیا جاتا ہے۔ گویا حق تعالےٰ اس منصب کے لئے ایسی شخصیت کا انتخاب فرماتا ہے جو افرادِ بشر میں اعلیٰ ترین صفات کی حامل ہوتی ہے، اس انتخاب کو قرآنِ کریم کہیں اجتباء سے، کہیں اصطفاء سے اور کبھی لفظ اختیار سے تعبیر فرماتا ہے۔ یہ عام صفات و خصوصیات تو ہر نبی و رسول میں ہوتی ہیں، پھر حق تعالےٰ ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرما کر وہ درجات عطا کرتا ہے جن کے تصور سے بھی بشر قاصر ہے گویا نبوت، انسانیت کی وہ معراج کمال ہے جس سے کوئی بالاتر منصب اور کمال عالم امکان میں نہیں، ان صفاتِ عالیہ سے متصف ہستی کو ہدایت و اصلاح کے لئے مبعوث کرکے انہیں تمام

انسانیت کا مُطاعِ مطلق ٹھہرایا جاتا ہے، ارشاد ہے ((وما أرسلنا من رسول إلا ليطاع بإذن الله)) یعنی ہم نے ہر رسول کو اسی لئے بھیجا کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے پس حکم خداوندی یہی ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، وہ مطاع اور واجب الاطاعت متبوع ہے، اور امت اس کی ہدایت کے تابع اور مطیعِ فرمان۔

نبی ہر نقص و کوتاہی سے بالاتر ہوتا ہے

جب نبوت و رسالت کے بارے میں یہ صحیح تصور قائم ہو گیا کہ وہ ایک عطیۂ ربانی ہے، کسب و محنت اور مجاہدہ و ریاضت سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ حق تعالیٰ اپنے علمِ محیط، قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ سے پاک اور معصوم و مقدس ہستی کو پیدا فرما کر اس کو وحی آسمانی سے سرفراز فرماتا اور مخلوق کی ہدایت و ارشاد کے منصب پر اسے کھڑا کرتا ہے تو اس سے عقلی طور پر خود بخود یہ بات واضح ہو گئی کہ نبی و رسول کی شخصیت ہر نقص سے، ہر کوتاہی سے اور ہر انسانی کمزوری سے بالاتر ہوتی ہے، کیونکہ اگر خود اس کی شخصیت انسانی کمزوریوں میں ملوث ہو تو وہ ہدایت و اصلاح کی خدمت کیسے انجام دے سکے گا: "آنکہ خود گم است کرا رہبری کند"

چنانچہ سنت اللہ یہی ہے کہ نبی کا حسب و نسب، اخلاق و کردار، صورت و سیرت خلوت و جلوت اور ظاہر و باطن ایسا پاک اور مقدس و مطہر ہوتا ہے جس سے ہر شخص کا دل و دماغ مطمئن ہو اور کسی کو انگشت نمائی کا بال برابر بھی موقعہ نہ مل سکے، یہ الگ بات ہے کہ کوئی شخص شقاوتِ ازلی کی وجہ سے اس کی دعوت پر لبیک نہ کہے اور جحود و انکار میں مبتلا ہو کر ہدایت سے محروم رہ جائے، لیکن یہ ممکن نہیں کہ بد تر سے بد تر دشمن بھی نبی میں کسی انسانی کمزوری کی نشاندہی کر سکے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص و اوصاف

قرآنِ کریم میں انبیاءِ کرام اور رسولانِ عظام علیہم الف الف صلاۃ وسلام کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے اور ان کے جن جن خصائص و کمالات اور اخلاق و اوصاف کی نشاندہی فرمائی ہے یہ جگہ ان کی تفصیل کے لئے کافی نہیں، یہاں اس سمندر کے چند قطرے پیش کئے جاتے ہیں جو حق تعالیٰ شانہٗ

---

[1] النساء — ۶۴

نے اپنے حبیب حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

«یا أیہا النبی إنا أرسلناك شاهداً ومبشراً ونذیراً وداعیاً إلی اللہ بإذنہ وسراجاً منیراً»[۱]

اے نبی! بے شک ہم نے آپ کو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا ہے کہ آپ گواہ ہوں گے اور آپ بشارت دینے والے ہیں اور ڈرانے والے ہیں اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور آپ ایک روشن چراغ ہیں۔

«إنا أرسلناك شاهداً ومبشراً ونذیراً لتؤمنوا باللہ ورسولہ وتعزروہ وتوقروہ»[۲]

ہم نے آپ کو گواہی دینے والا اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا کر کے بھیجا ہے تاکہ تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو اور اس کی تعظیم کرو۔

«یس والقرآن الحکیم إنك لمن المرسلین علی صراط مستقیم»[۳]

یٰس، قسم ہے قرآن باحکمت کی کہ بے شک آپ منجملہ پیغمبروں کے ہیں، سیدھے رستہ پر ہیں۔

«ن والقلم وما یسطرون ما أنت بنعمة ربك بمجنون وإن لك لأجراً غیر ممنون وإنك لعلی خلق عظیم»[۴]

ن، قسم ہے قلم کی اور ان (فرشتوں) کے لکھنے کی کہ آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں، اور بے شک آپ کے لئے ایسا اجر ہے جو ختم ہونے والا نہیں اور بے شک آپ اخلاق (حسنہ) کے اعلیٰ پیمانہ پر ہیں۔

«قد جاءکم من اللہ نور وکتاب مبین»[۵]

تحقیق تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور کتاب واضح (یعنی قرآن مجید)

«فالذین آمنوا بہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی أنزل معہ أولئك هم المفلحون»[۶]

سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں۔

---

[۱] ... [۲] الفتح - ۹،۸ [۳] یٰس - ۴ [۴] ن [۵] المائدہ - ۱۵ [۶] الاعراف - ۱۵۷

«ورفعنا لك ذكرك[7]»

اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا آوازہ بلند کیا

«قل إن كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله[8]»

آپ فرما دیجئے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو خدا تعالےٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔

«وإن تطيعوه تهتدوا[9]»

اور اگر تم نے ان کی اطاعت کر لی تو راہ پر جا لگو گے۔

«لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة لمن كان يرجو الله واليوم الآخر وذكر الله كثيراً[1]»

تم لوگوں کے لئے یعنی ایسے شخص کے لئے جو اللہ سے اور روزِ آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکر الٰہی کرتا ہو رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود تھا۔

«فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في أنفسهم حرجاً مما قضيت ويسلموا تسليماً[2]»

پھر قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کرا دیں پھر آپ کے تصفیہ سے دلوں میں تنگی نہ پاویں اور پورا پورا تسلیم کریں۔

«لقد من الله على المؤمنين إذ بعث فيهم رسولاً من أنفسهم يتلوا عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة وإن كانوا من قبل لفي ضلال مبين[3]»

حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جب کہ ان میں انہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالےٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں اور ان کو کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ اس سے قبل صریح غلطی میں تھے۔

«وأنزل الله عليك الكتاب والحكمة وعلمك ما لم تكن تعلم وكان فضل الله عليك عظيماً[4]»

اور اللہ تعالےٰ نے آپ پر کتاب اور فہم کی باتیں نازل فرمائیں اور آپ کو وہ وہ باتیں بتلائی ہیں جو آپ نہ جانتے تھے اور آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے۔

---

[7] الم نشرح   [8] آل عمران - ۳۱   [9] النور - ۵۴

[1] احزاب ۲۱   [2] النساء ۶۵   [3] آل عمران ۱۶۴   [4] النساء ۱۱۳

ترجمہ آیات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صفات و کمالات کا نقشہ سامنے آگیا ہوگا جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت الی اللہ کا آفتاب عالم تاب بنایا ہے تاکہ امت ان پر ایمان لائے ان کی توقیر کرے اور ان کی امداد کرے بلا شبہ آپ سراسر صراط مستقیم پر ہیں تاریخ عالم اس کی شہادت دیتی ہے کہ آپ خلق عظیم سے آراستہ ہیں جو ان پر ایمان لائیں اور ان کی توقیر و نصرت کریں اور جو آسمانی وحی کا نور الٰہی ان کے ساتھ ہے اس کا بھی اتباع کریں آخرت کی فلاح انہی کے لئے ہے ان کی اتباع سے حق تعالیٰ کی محبوبیت کی سعادت عظمیٰ ملتی ہے۔

انہی کی اطاعت سے ہدایت ملتی ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کے اور آخرت کے امیدوار ہیں وہ انہی کو اپنا مقتدا و پیشوا بنائیں گے جو لوگ اپنے نزاعات و مخاصمات میں بھی ان کے فیصلوں کو بدل و جان تسلیم نہ کریں خدا کی قسم کبھی مومن نہیں ہو سکتے، حق تعالیٰ کا امت محمدیہ پر بڑا احسان ہے جن میں ایسی ہستی مبعوث فرمائی کہ حق تعالیٰ کی آسمانی وحی ان کو پڑھ کر سنائیں، ہر قسم کے شرک و کفر، معصیتوں اور جاہلیت کی رسموں سے ان کا تزکیہ کریں، ان کو کتاب و سنت کی تعلیم دیں، اللہ تعالیٰ نے ان پر بڑا فضل فرمایا کہ کتاب و حکمت کے وہ تمام علوم ان کو سکھائے جو نہ جانتے تھے، چند آیات بینات کا یہ سرسری خاکہ ہے حق تعالیٰ کی اس آسمانی شہادت کے بعد کیا کوئی کمال اب ایسا باقی ہے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیا گیا ہو؟ اسی آسمانی وحیِ ربانی میں تمام امت کو یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے تمام فرشتے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت و درود بھیجتے ہیں اس لئے تمہیں حکم ہے کہ تم بھی ان پر درود بھیجو پانچوں وقت اذان میں ان کی رفعت و بلندیٔ مقام کا اعلان ہوتا ہے۔ ہر نماز میں ان پر درود و سلام کا مخصوص انداز میں حکم ہے گویا کوئی نماز جو حق تعالیٰ شانہٗ کی مخصوص عبادت ہے اور حق تعالیٰ کے ساتھ خصوصی مناجات ہے آپ کے ذکر خیر اور درود و سلام سے خالی نہیں بلکہ اسی پر نماز کا اختتام ہوتا ہے اس لئے تمام امت اور آسمانی کتابوں کا بھی فیصلہ ہے:-

ع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی

بہر حال یہ مسلمات میں سے ہے کہ افرادِ بشر میں جن نفوسِ قدسیہ کو حق تعالیٰ نے اصلاحِ نفوس اور ہدایت و ارشادِ عالم کے لئے منتخب فرمایا ہے ان سب کے سرتاج سید الانبیاء والمرسلین امام المتقین

خاتم النبیین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدس ہے اگر ان میں کوئی کوتاہی اور کمی رہ جائے تو پھر سارے انبیاءِ کرام کوتاہیوں سے مبرّا کیسے ہو سکتے ہیں اور امت کی ہدایت کے لئے وہ کیسے اسوہ و قدوہ بن سکتے ہیں اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جس ذاتِ اقدس نے ہدایت وارشاد کے لئے ان کی بعثت فرمائی ہے وہ العیاذ باللہ قاصر ہے اور ان کی قدرت سے ایسے افراد کا انتخاب بالاتر ہے انا للہ وانا الیہ راجعون، بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، پھر نہ خدائی رہی، نہ نبوت ورسالت، نہ آسمانی وحی، نہ دین۔ سارا معاملہ ہی ختم ہو گیا، ان حقائق کی روشنی میں "ترجمان القرآن" جلد ۸۵ شمارہ اپریل ۱۹۷۶ء میں لبعنوان "اسلام کس چیز کا علمبردار ہے" مودودی صاحب کا مقالہ مطالعہ کیجئے، صفحہ ۳۰ پر موصوف یوں رقمطراز ہیں "وہ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نہ فوق البشر ہے نہ بشری کمزوریوں سے بالاتر ہے"۔ کس جاہل نے کہا ہے کہ وہ فوق البشر ہے ہاں تمام اولین وآخرین اور حق تعالے جو خالق الانبیاء والمرسلین ہیں ان کا فیصلہ ہے کہ وہ اتقی البشر ہیں سید البشر ہیں، تمام نسلِ انسانی میں سب سے بڑھ کر متقی اور کامل ترین افرادِ بشر میں سے ہیں، آفتابِ عالمتاب اور بدرِ منیر کے انوار کو ان کے انوار سے کیا نسبت؟ آسمان ہو یا زمین، چاند ہو یا سورج حتی کہ عرشِ رحمٰن بھی آپ کی منزلت سے قاصر ہے، تمام مخلوقاتِ خداوندی میں افضلیت وکمال کا تاج آپ ہی کے سر باندھا گیا ہے "نہ فوق البشر ہے" یہ جملہ بھی جو غمازی کرتا ہے کہ فوق البشر کہنا بھی ناقابلِ برداشت ہے لیکن "نہ بشری کمزوریوں سے بالاتر ہے" کے فقرے سے جو کچھ دل میں تھا ابھر کر آ گیا جو شخص بشری کمزوریوں میں ملوث ہے وہ بشر کی ہدایت کے لئے کیسے موزوں ہو سکتا ہے؟ اردو کے عرف میں اور عام تعبیرات کے پیشِ نظر بشری کمزوریوں کا اطلاق ان صفاتِ بشریہ پر ہوتا ہے جو صفات ذمیمہ اور قبیحہ ہیں، لوازمِ بشریت مراد ہو ہی نہیں سکتے لوازمِ بشریت کھانا پینا سونا جاگنا خوشی، غم صحت ومرض وفات وغیرہ بلاشبہ یہ لوازمِ بشریت ہیں خواصِ بشریت ہیں اور صفاتِ بشریہ ہیں، عرف میں اس کو کوئی بشری کمزوریوں سے تعبیر نہیں کرتا، لوازمِ بشریت سے تو ملائکۃ اللہ اور حق تبارک وتعالے منزہ ہیں، کہنا یہ ہے کہ یہ جملہ خطرناک حقیقت کی غمازی کر رہا ہے اسلام کی پوری بنیاد منہدم ہو جاتی ہے، حق تعالے تو ان کو یہ شرفِ قبولیت عطا فرماتا ہے کہ کلمۂ اسلام میں کلمۂ شہادت میں اذان واقامت میں حق تعالے کے نام کے ساتھ آپ کا نام آئے، نماز میں درود وسلام بھیجنے کا حکم ہو اور اس انداز سے ہو کہ چونکہ حق

تعالیٰ اور ان کے فرشتے آپ پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم بھی درود بھیجو، بارگاہ قدس سے اتنا اونچا منصب عطا کیا گیا ہو، اور مودودی صاحب کی نگاہ میں وہ بشری کمزوریوں سے بالاتر نہیں جو شخصیت بشری کمزوریوں میں مبتلا ہو کیا وہ اس منصبِ جلیل کی مستحق ہو سکتی ہے؟ بظاہر تو یہ ایک جملہ ہے لیکن اس ایک جملہ سے ان کے تمام کمالات اور منصبِ نبوت پر پانی پھر جاتا ہے اور ہر ناقد کے لئے تنقید کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے، بشری کمزوری میں جھوٹ بولنا خود غرضی بقایا جاہلیت کے آثار کا نمایاں ہونا، مصلحت اندیشی کا کارفرما ہونا، بنی عبد مناف اور بنی ہاشم کو بنی امیہ پر ترجیح دینا، قریش و مہاجرین کو وہ مقام عطا کرنا جس سے انصار محروم تھے وغیرہ وغیرہ کون سی کمزوری ہے جو اس اجمال میں نہیں آ سکتی؟ کیا اچھا ہوتا کہ مودودی صاحب ان کمزوریوں کی نشاندہی خود فرما دیتے کہ وہ کون سی کمزوریاں ہیں جو آپ کی ذات گرامی میں موجود رہیں: اس قسم کے نظریات یا قلمی طغیانی اس شخص کا شیوہ ہے جو نہ اہل اللہ کا صحبت یافتہ ہو، نہ اسے علم دین میں کمال حاصل ہو، عجب و کبر میں مبتلا ہو، اعجاب بالرائے کی وبائے عظیم میں ملوث ہو۔ جس ذات گرامی پر ایمان لانے کا حکم ہو حق تعالیٰ پر ایمان کے بعد جس پر ایمان کا مرتبہ ہو جسے ہدایتِ امت کے لئے سراجاً منیراً بنایا گیا ہو، جو دعوت الی اللہ پر مامور ہو جس کی شخصیت کو امت کے لئے اسوہ بنایا گیا ہو، جس کی صفات و کمالات اور خصائص و اخلاقِ عظیمہ کا اعلان کیا گیا ہو، مودودی کی نگاہ میں ان کی شخصیت اتنی شدید مجروح ہو کہ بشری کمزوریوں سے بالاتر نہیں۔ اب تک تو ہم یہی سمجھتے تھے کہ مودودی صاحب سلفِ صالحین کو مجروح کرتے چلے آئے ہیں، صحابہ کرامؓ کی شخصیت کو مجروح کرتے چلے آئے ہیں اور انبیاء کرام کی شخصیت پر بھی کچھ نہ کچھ اشارات جرح کے موجود تھے۔ یونس علیہ السلام سے فریضۂ نبوت پر تقصیر ہوئی جیسے کہ "تفہیم القرآن" میں ہے وغیرہ وغیرہ، ایک حضرت سید المرسلین خاتم النبیین امام المتقین کی ذاتِ گرامی باقی رہ گئی تھی وہ بھی اب مجروح ہو گئی، تعجب کا مقام ہے کہ مودودی صاحب نے ہر پیراگراف کو قرآنی حوالہ دے کر بیان کیا اور شاید مقالہ اور اس کی تعلیمات کو پڑھنے والے کو یہ غلط فہمی ہو کہ یہ جملہ بھی بقیہ قرآنی حوالوں سے معمور ہو گا لیکن بغیر جوڑ کے قرآنی تعبیرات کے درمیان سطر ۱۲، اشارہ ۳۰ صہ ۳۱ پر یہ دل کی بات قلم سے نکل گئی، قرآن کریم میں جہاں یہ حکم ہو کہ آپ اعلان کریں کہ میں بشر ہوں ساتھ ہی "یوحیٰ الیّ" کا وصف لگایا گیا تاکہ کوئی قاصر الفہم قاصر العقل بشر کے ساتھ بشری کمزوریوں کا خیال نہ کرے، چنانچہ ارشاد ہے :۔

((قل إنما أنا بشر مثلكم یوحی إلی أنما إلٰھکم إلٰہ واحد)) کہف ۱۱۰ فصلت ع ۱ سورہ اسراء میں ہے ((قل سبحان ربی ھل کنت إلا بشراً رسولاً)) بشر کے ساتھ رسول کی صفت لگائی گئی ہے جہاں محض بشریت کا ذکر کیا ہے یا صفاتِ بشریت کا ذکر ہے وہ تمامتر مشرکین و کفار کے کے قول کی نقل ہے ((قالوا إن أنتم إلا بشر مثلنا)) ابراہیم ((ھل ھذا إلا بشر مثلکم)) الانبیاء، ((ما ھذا إلا بشر مثلکم)) المومنون، ((ما أنتم إلا بشر مثلنا)) یٰس، ((ما نراك إلا بشراً مثلنا)) ہود، کفار نے بلاشبہ طعنے کے طور پر کہا کہ یہ ہم جیسے بشر ہیں بلکہ ان کو بھی اس کی جرأت نہیں ہوئی کہ یہ جرم بھی عائد کر سکیں کہ بشری کمزوریوں سے بالاتر نہیں اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ انبیاء کرام کی پاکیزگیٔ اخلاق، کرامت و شرافت اتنی بدیہی اور واضح ہے کہ انکار کی مجال نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ طعنہ دیا کہ کھاتا پیتا ہے، بازاروں میں جاتا ہے، گویا فرشتہ نہیں کہ ان چیزوں سے بالاتر ہو، کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ موصوف کے دل میں اس سے بھی زیادہ کچھ ہے لیکن خوف مانع ہے، پوری دل کی بات کا اظہار نہ کر سکے ((وما تخفی صدورھم أکبر)) اللہ تعالےٰ زیغ و ضلال سے بچائے، بشری کمزوری دو راستوں سے ہوتی ہے: (۱) نفس (۲) شیطان۔ جب نبی و رسول نفس کی غیر مستحسن اور ناپسندیدہ خواہشات سے مبرا ہے اور پاک ہے تو اس کے عواطف و رجحانات ناپسندیدہ نہیں ہو سکتے، ان کا نفس نفسِ مطمئنہ ہے، نفسِ ملکی ہے، نفس کی صفاتِ رزیلہ سے یکسر بالاتر ہے، ادنیٰ سے ادنیٰ رزیلۂ نفسانی کا وہاں گذر نہیں اور نفس کے جتنے صفاتِ کمال ہیں، تقویٰ و طہارت شکر و صبر، عفت و رأفت، رحمت و جود اور سخاوکرم وغیرہ وغیرہ تمام کے تمام وہاں موجود ہوتے ہیں اور شیطانِ لعین کے وساوس سے یکسر حفاظت ہوتی ہے شیطان نبی و رسول کو کبھی بھی غلط کام پر آمادہ ہی نہیں کر سکتا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرا شیطان مجھے خیر ہی کا حکم دیتا ہے، بہر حال جب دونوں راستوں سے حفاظت ہو گئی تو بشری کمزوری خود بخود ختم ہو جاتی ہے، صحیح مسلم میں عائشہ صدیقہؓ کی روایت میں تو یہ آیا ہے کہ ((کان خلقہ القرآن)) آپ کے اخلاقِ کریمہ قرآن کریم کا مرقع ہیں گویا آپ کی حیاتِ مقدسہ زندہ قرآن ہے۔ آپ کا وجودِ مقدس زندہ قرآن ہے اور یہی تمام عالم کا فیصلہ ہے، لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ بشری کمزوریوں سے آپ بالاتر نہیں، پھر سنت اللہ جاری ہے کہ انبیاء کرامؑ کے عام قوایٰ بشری بھی عام انسانوں سے بالاتر ہوتے

ہیں، ان کی جسمانی صلاحیتیں جسمانی قوتیں برتر اور عام افرادِ بشر سے بالاتر ہوتی ہیں بلکہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چالیس افراد جنت کی قوت عطا فرمائی گئی ہے اور ایک حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ جنت میں ہر فرد بشر کو سو اشخاص کی قوت عنایت کی گئی ہے بلکہ قاضی عیاض "شفاء" میں اور سیوطی کی "خصائص کبریٰ" میں حضرت عائشہ صدیقہ کی روایت سے ایک حدیث ہے کہ آپ نے فرمایا ہے ((أما علمت أن أجساد نانبتت علی أرواح أهل الجنة)) یعنی ہمارے اجساد میں ارواح اہل جنت کی، ہیں ان تفصیلات کا یہاں موقع نہیں ہے، بہر حال نہ معلوم کہ اتنی صاف اور واضح حقیقت کیوں سمجھ میں نہیں آتی کہ جب کوئی شخص بشری کمزوریوں میں مبتلا ہو وہ کیونکر ہادی و رہنما بنے گا اور اس کی دعوت و تبلیغ کیونکر کامیاب ہو سکتی ہے؟ قرآنِ کریم تو صاف اعلان فرماتا ہے ((أتأمرون الناس بالبر وتنسون أنفسكم وأنتم تتلون الكتاب أفلا تعقلون)) کیا تم لوگوں کو حکم دیتے ہو نیکی کا اور اپنے نفسوں کو بھولتے ہو اور تم کتاب اللہ پڑھتے ہو کیا اتنا بھی تم نہیں جانتے کہ اس کا کیا اثر ہو گا، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تو سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ جو کیا اسی کا حکم دیا تاکہ قول و عمل میں کوئی تضاد نہ ہو، مقامِ افسوس ہے کہ مودودی صاحب کو اتنی واضح اور صاف بات بھی سمجھ میں نہیں آتی، بہر حال جہاں مودودی صاحب کے بہت سے قابلِ شدید اعتراض مباحث ہیں یا تعبیرات ہیں اور ان کی تصنیفات میں بکھری پڑی ہیں یہ جملہ اور مضمون بھی قباحت میں گوئے سبقت لے گیا ہے مودودی صاحب اپنی تفسیر سورۂ آلِ عمران میں حضراتِ صحابہ کے بارے میں رقمطراز ہیں "سود خوری جس سوسائٹی میں موجود ہوتی ہے اس کے اندر سود خوری کی وجہ سے دو قسم کے اخلاقی امراض پیدا ہوتے ہیں، سود لینے والے میں حرص و طمع بخل خود غرضی اور سود دینے والوں میں نفرت، غصہ اور بغض حسد، احد کی شکست میں ان دونوں قسم کی بیماریوں کا کچھ نہ کچھ حصہ شامل تھا" اسی سورۂ آلِ عمران کے آخر میں ان صحابہ کے بارے میں حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں:۔

((فالذين هاجروا وأخرجوا من	سو جن لوگوں نے ترکِ وطن کیا اور اپنے گھروں سے
ديارهم وأوذوا في سبيلي وقاتلوا	نکالے گئے اور تکلیفیں دیئے گئے میری راہ میں، اور
وقتلوا لأكفرن عنهم سيأتهم	جہاد کیا اور شہید ہو گئے ضرور ان لوگوں کی تمام خطائیں

ولأدخلنهم جنٰت تجري من
تحتها الأنهار ثوابًا من عند الله
والله عنده حسن الثواب» ؎۱

معاف کردوں گا اور ضرور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، یہ عوض ملے گا اللہ کے پاس سے اور اللہ ہی کے پاس اچھا عوض ہے۔"

حق تعالیٰ نے تو ان کو یہ داد دی ہے اور مودودی صاحب کی نگاہ میں وہ حریص طماع بخیل خود غرض ایک دوسرے سے نفرت کرنے والے بغض و حسد رکھنے والے اور ان بیماریوں میں مبتلا تھے ان میں جہل و عناد کی بھی انتہا ہو گئی، غزوۂ احد کے بعد غزوہ بنی النضیر میں جو سورۂ حشر نازل ہوئی اس میں حق تعالیٰ شانہ یوں ارشاد فرماتے ہیں:۔

«للفقراء المهاجرين الذين أخرجوا
من ديارهم وأموالهم يبتغون
فضلاً من الله ورضوانًا وينصرون
الله ورسوله أولئك هم الصادقون
والذين تبوؤا الدار والإيمان من
قبلهم يحبون من هاجر إليهم
ولا يجدون في صدورهم حاجةً
مما أوتوا ويؤثرون على أنفسهم
ولو كان بهم خصاصة ومن
يوق شح نفسه فأولئك هم
المفلحون» ؎۲

ان فقراء مہاجرین کا حق ہے جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے جدا کردیئے گئے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کے طالب ہیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں اور ان لوگوں کا حق ہے جو دار الاسلام میں ان (مہاجرین کے آنے) سے قبل قرار پکڑے ہوئے ہیں اور جو ان کے پاس ہجرت کرکے آتا ہے اس سے یہ لوگ محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو جو کچھ ملتا ہے اس سے یہ لوگ اپنے دلوں میں کوئی رشک نہیں پاتے اور اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ ان پر فاقہ ہی ہو اور واقعی جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

حق تعالیٰ تو ان مہاجرین و انصار کو صادقون و مفلحون جیسے شاندار الفاظ میں اس عجیب انداز سے داد دیں اور مودودی صاحب ان کو طماع و حریص ایک دوسرے سے متنفر بتلائیں اس وقت تو بطور مثال ایک سرسری اشارہ کردیا گیا اور یہ موضوع ابھی بہت کچھ لکھنے کا محتاج ہے، اسی مضمون و مقالہ کے شروع میں جو تحقیق فرمائی گئی کہ "ہمارے عقیدے کے مطابق اسلام کسی ایسے دین کا نام نہیں

۱؎ ۲؎ الفتح

جس کو سب سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا ہو اور اس بناء پر آپ کو بانیٔ اسلام کہنا صحیح ہو۔ انبیاء میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت دراصل یہ ہے کہ (۱) وہ خدا کے آخری نبی ہیں (۲) ان کے ذریعہ خدا نے اسی اصل دین کو پھر تازہ کر دیا جو تمام انبیاء کا لایا ہوا تھا الخ" اس مضمون میں بھی ان کو ٹھوکر لگی ہے اور غلط موڑ پر پہنچ گئے جو نہایت خطرناک ہے، اب دیانت اور دین کی خیر خواہی کا تقاضا یہی ہے کہ ان مضامین پر بے لاگ تبصرہ ایسا کیا جائے کہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی سامنے آجائے جو ایک دو مولوی ان کی ہم نوائی کرتے چلے آئے ہیں ان کے ایمانی امتحان کا وقت بھی آگیا ہے واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام عالی کا کیا کہنا، آپ کی صحبت، فیض خدمت اور توجہاتِ مبارکہ سے صحابہ کرام جس مقام پر پہنچ گئے ہیں اس کا ادراک بھی ہم جیسوں کے لئے ناممکن ہے قرآنِ کریم کی سورۂ فتح میں ارشاد ہے:۔

((محمد رسول اللہ والذین معہ	محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے صحبت
أشداء علی الکفار رحماء بینھم	یافتہ ہیں وہ کافروں کے مقابلہ میں تیز اور آپس میں
تراھم رکعا سجداً	مہربان ہیں اے مخاطب تو ان کو دیکھے گا کہ کبھی رکوع
یبتغون فضلاً من اللہ	کر رہے ہیں اور کبھی سجدہ کر رہے ہیں، اللہ تعالےٰ
ورضواناً سیماھم	کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں لگے ہیں، ان کے
فی وجوھھم من أثر السجود[1]))	آثار بوجہ تاثیرِ سجدہ کے ان کے چہرے سے نمایاں ہیں۔

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ آج "ترجمان القرآن" بابت ماہ جون ۷۶ء میں "رسائل ومسائل" کے عنوان سے اس کے جواب کی کوشش کی گئی، ظاہر بات ہے کہ بات ناقابل برداشت تھی اور اس میں پوری رسوائی ہو رہی تھی اس لئے موصوف کے حواریوں میں سے کسی نے موصوف کو متنبہ کیا اور اس کا جواب دیا گیا کیا اچھا ہوتا کہ مودودی صاحب اپنی غلطی کا اعتراف کر کے توبہ کرتے اور اعلان کرتے کہ میں نے یہ بات غلط کی ہے لیکن مودودی صاحب کی تاریخِ زندگی میں اس بات کا امکان نہیں، یہ تو ہوا کہ جب کسی ہمدرد حواری نے کسی غلطی پر متنبہ کیا تو دوسرے ایڈیشن میں وہ بات نکال دی گئی لیکن اس کی توفیق نہ ہوئی کہ اعتراف کر کے غلطی کا اعلان ہوتا اور غلط بات سے رجوع کرتے تاکہ وہ لوگ جن کے پاس پہلا

---

[1] الفتح

ایڈیشن سے وہ بدستور گمراہ نہ ہوتے، مثلاً "تفسیر تفہیم القرآن" کے پہلے ایڈیشن میں حضرت یونس علیہ الصلاۃ والسلام کو فرائضِ نبوت میں تقصیر کا مرتکب مانا تھا لیکن اعتراض کے بعد دوسرے ایڈیشن پر اس عبارت کو حذف کر دیا گیا، کیا یہ دیانت ہے؟ اور کیا یہ حق ہے؟ اور کتنی مثالیں ہیں، مودودی صاحب کے نزدیک انبیاءِ کرام ایسے معصوم نہیں ہیں کہ غلطی نہ ہوسکتی تھی وہ تو فرماتے ہیں کہ بشریت کے اظہار کے لئے کوئی وقت ایسا ضرور ہے تو کیا مودودی صاحب معصوم ہیں کہ ان کی عصمت انبیاءِ کرام سے بھی زیادہ ہے، بہرحال جب عذر کر کے جواب دیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی بالکل لچر اور بے معنی ہے، اردو محاورات میں کوئی بتلادے کہ لوازمِ بشریت کو بشری کمزوریوں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے؟ مولانا مودودی صاحب بشری کمزوریوں سے عیوب و نقائص ہی مراد لیتے ہیں، اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ سورۂ آلِ عمران کی تفسیر میں انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر یہ الزام لگایا ہے کہ ان میں سود خوری کی وجہ سے دو قسم کی بیماریاں تھیں، حرص و طمع بخل و خود غرضی اور حسد نفرت بغض اور غزوہ احد کی شکست میں دونوں کو دخل ہے اس کے ثبوت میں قرآن کے لفظ (ببعض ما کسبوا) کا ترجمہ "بعض کمزوریوں سے کیا گیا جس پر نہایت عالمانہ و محققانہ انداز سے حضرت مولانا محمد اسحاق صدیقی سندیلوی تنقید فرما چکے ہیں (ملاحظہ ہو "بینات" بابت ماہ جون ۱۹۷۶ء) مودودی صاحب کی اس تفسیر و تشریح سے واضح ہے کہ کمزوریوں سے مراد وہ بیماریاں لیتے جو عیوب اور بدترین عیوب ہیں، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے اور صحیح توبہ کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

جمادی الاخری ۱۳۹۶ھ، جولائی ۱۹۷۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عصمتِ انبیاء و حرمتِ صحابہ

یہ حقیقت مسلّم اور ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ نبوّت و رسالت وہ اعلیٰ ترین منصب ہے جو حق تعالےٰ ذکرہٗ کی طرف سے مخصوص بندوں کو عطا کیا جاتا ہے، تمام کائنات میں انسان اشرف المخلوقات ہے اور نبوّت انسانیّت کی آخری معراجِ کمال، انسانیت کے بقیہ تمام مراتب و کمالات اس سے پست اور فروتر ہیں، انسانی فکر کی کوئی بلندی نبوّت کی حدوں کو نہیں چھو سکتی، نہ انسانیت کا کوئی شرف و کمال اس کی گردِ راہ کو پہنچ سکتا ہے، اس سے اوپر بس ایک ہی مرتبہ ہے اور وہ ہے حق تعالےٰ کی ربوبیت و الوہیت کا مرتبہ! منصبِ نبوّت عقولِ انسانی سے بالاتر ہے، اس کی پوری حقیقت صرف وہی جانتا ہے جس نے یہ منصب عطا فرمایا یا پھر ان مقدس ہستیوں کو معلوم ہو سکتی ہے جن کو اس منصبِ رفیع سے سرفراز کیا گیا، ان کے علاوہ تمام لوگوں کا علم و فہم سرِّ نبوت کی دریافت سے عاجز اور عقل اس کی ٹھیک ٹھیک حقیقت و کُنہ کے ادراک سے قاصر ہے، جس طرح ایک جاہل علم کی حقیقت سے بے خبر ہے، اسی طرح غیر نبی نبوت کی حقیقت سے ناآشنا ہے، اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو گی کہ رسالت و نبوت کا منصبِ رفیع تو درکنار معمولی ہنر و فن کا بھی یہی حال ہے، کسی فن کی صحیح حقیقت تک رسائی اسی صاحبِ کمال کے لئے ممکن ہے جسے وہ فن حاصل ہو اور اسی حد تک ممکن ہے جس حد تک اسے فنی رسوخ و کمال حاصل ہو۔

ہمارے حضرت استاذ امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری دیوبندی (نور اللہ مرقدہٗ) فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"نبوت تو کیا اجتہاد کی حقیقت کے ادراک سے بھی ہم قاصر ہیں"۔

یعنی "اجتہاد" کے بارے میں جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ محض اس کی ظاہری سطح ہے اور جتنی معلومات ہمیں حاصل ہیں وہ صرف سطحی معلومات ہیں (اسے منطقی اصطلاح میں علم بالوجہ کہتے ہیں)، ورنہ اجتہاد کی حقیقت کا صحیح ادراک صرف مجتہد کو ہو سکتا ہے جسے یہ ملکہ حاصل ہو، اسی طرح نبوت کا علم بھی عام انسانوں کو محض آثار و لوازم کے اعتبار سے ہے، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ:

نبوت کے لئے حق تعالیٰ جل ذکرہ ایک ایسی برگزیدہ اور معصوم شخصیت کا انتخاب فرماتا ہے جو اپنے ظاہر و باطن، قلب و قالب، روح و جسد ہر اعتبار سے عام انسانوں سے ممتاز ہوتا ہے، وہ ایسا پاک طینت اور سعید الفطرت پیدا کیا جاتا ہے کہ اس کی تمام خواہشات رضاء و مشیتِ الٰہی کے تابع ہوتی ہیں، ردائے عصمت اس کے زیب تن ہوتی ہے، حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ ہر دم اس کی نگرانی کرتی ہے۔ اس کی ہر حرکت و سکون پر حفاظتِ خداوندی کا پہرہ بٹھا دیا جاتا ہے اور وہ نفس و شیطان کے تسلّط و استیلاء سے بالاتر ہوتا ہے، ایسی شخصیت سے گناہ و معصیت اور نافرمانی کا صدور ناممکن اور منطقی اصطلاح میں محال و ممتنع ہے، اسی کا نام عصمت[1] ہے اور ایسی ہستی کو معصوم کہا جاتا ہے، عصمت لازمۂ نبوت ہے، جس طرح یہ تصور کبھی نہیں کیا جا سکتا کہ کسی لمحہ نبوت نبی سے الگ ہو جائے اسی طرح اس بات کا وہم و گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ عصمت نبوت اور نبی سے ایک آن کے لئے بھی جدا ہو سکتی ہے، معاذ اللہ۔

حضراتِ علماء نے تحقیق فرمائی ہے کہ ایک ہے معصوم اور ایک ہے محفوظ، معصوم وہ ہے

---

[1] اس کے یہ معنی نہیں کہ انبیاءِ کرام علیہم السلام سے قدرت سلب کر لی جاتی ہے بلکہ عصمت کا مدار ان ہی دو چیزوں پر ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا یعنی اول تو ان کی فطرت اتنی پاکیزہ اور مصفیٰ مزکیٰ ہوتی ہے کہ وہ گناہ و معصیت کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور گناہ کا تصور فطرۃً ان کے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ دوم یہ کہ حفاظتِ الٰہی کی نگرانی ایک لمحہ کے لئے ان سے جدا نہیں ہوتی، ظاہر ہے کہ ان دو باتوں کے ہوتے ہوئے صدورِ معصیت کا امکان نہیں رہتا۔ (مدیر)

جس سے گناہ ومعصیت کا صدور محال ہو، اور محفوظ وہ ہے جس سے صدورِ معصیت محال تو نہ ہو لیکن کوئی معصیت صادر نہ ہو یا آسان اور سادہ لفظوں میں یوں تعبیر کریں گے کہ معصوم وہ ہے جو گناہ کر ہی نہیں سکتا اور محفوظ کے معنی یہ ہیں کہ گناہ کر تو سکتا ہے لیکن کرتا نہیں، اس لئے کہا جاتا ہے کہ انبیاءِ کرام علیہم السلام معصوم ہیں اور اولیاءِ کرام رحمہم اللہ محفوظ ہیں.

الغرض نبوت ورسالت کے عظیم ترین منصب کے لئے حق تعالےٰ اسی شخصیّت کو بحیثیت نبی و رسُول کے منتخب کرتا ہے جو حسب ونسب، اخلاق واعمال، عقل وبصیرت، عزم وہمت اور تمام کمالات میں اپنے دور کی فائق ترین شخصیت ہو، نبی تمام جسمانی وروحانی کمالات میں یکتائے زمانہ ہوتا ہے اور کسی غیر نبی کو کسی معتد بہ کمال میں اس پر فوقیت نہیں ہوتی، قرآنی وشرعی الفاظ میں اس شخصیّت کا انتخاب اجتباء اور اختیار خود حق تعالےٰ فرماتا ہے، کون نہیں جانتا کہ حق تعالےٰ کا علم کائنات کے ذرہ ذرہ کو محیط ہے، اس کے لئے ظاہر و باطن اور سر وجہر سب عیاں ہے، ماضی ومستقبل اور حال کے تمام حالات بیک وقت اس کے علم میں ہیں، اس میں نہ غلطی کا امکان نہ جہل کا تصور، قرآنِ کریم کی بے شمار آیات میں یہ حقیقت بار بار بیان کی گئی ہے:-

«اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمًا»[1]	اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔
«وَلَا یَعۡزُبُ عَنۡ رَّبِّکَ مِنۡ مِّثۡقَالِ ذَرَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ»[2]	اور غائب نہیں تیرے رب سے کوئی ذرہ بھر چیز بھی، نہ زمین میں نہ آسمان میں۔
«یَعۡلَمُ سِرَّکُمۡ وَجَھۡرَکُمۡ»[3]	وہ جانتا ہے تمہارے پوشیدہ کو اور ظاہر کو۔

ظاہر ہے کہ جب حق تعالیٰ کا علم محیط نبوت ورسالت کے لئے کسی شخصیّت کو منتخب کرے گا تو اس میں کسی نقص کے احتمال کی گنجائش نہیں رہ جاتی، اس منصب کے لئے جس مقدس ہستی پر حق تعالیٰ کی نظرِ انتخاب پڑے گی اور جسے تمام انسانوں سے چھانٹ کر اس عہدہ کے لئے

---

[1] النساء - ع ۵ [2] یونس - ع ۷ [3] الانعام - ع ۱

چنا جائے گا، وہ اپنے دور کی کامل ترین، جامع ترین، اعلیٰ ترین اور موزوں ترین شخصیت ہوگی،
البتہ خود انبیاء و رسل کے درمیان کمالات و درجات میں تفاوت اور فرقِ مراتب اور بات ہے۔

نیز یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ نبوت و رسالت محض عطیۂ الٰہی ہے، کسب و اکتساب سے اس کا تعلق نہیں کہ محنت و مجاہدہ اور ریاضت و مشقت سے حاصل ہو جائے، دنیا کا ہر کمال محنت و مجاہدہ سے حاصل ہو سکتا ہے لیکن نبوت و رسالت حق تعالیٰ کا اجتبائی عطیہ ہے وہ جس کو چاہتا ہے اس منصب کے لئے چن لیتا ہے، قرآنِ کریم کی متعدد آیات میں یہ تصریحات موجود ہیں:۔

«اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ [1]» — اللہ چن لیتا ہے فرشتوں سے پیغامبر اور انسانوں سے۔

«اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ [2]» — اللہ کو خوب علم ہے جہاں رکھتا ہے وہ اپنے پیغامات۔

ان حقائقِ شرعیہ کو سمجھ لینے کے بعد یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی نبی و رسول فرائض نبوت میں کوتاہی بھی کر سکتا ہے، کجا کہ کسی نبی نے۔ معاذ اللہ۔ اپنے فرائضِ منصبی میں کوتاہیاں کی ہوں، اس لئے یہ کہنا کہ "فلاں نبی سے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں"۔ "نبی ادائے رسالت میں کوتاہی کر گیا"۔ یا یہ کہ "فلاں نبی بغیر اذنِ الٰہی کے اپنی ڈیوٹی سے ہٹ گیا"۔ انتہائی کوتاہی کی بات ہے اور وہ اپنے اندر بڑے سنگین مضمرات رکھتی ہے۔ اسی طرح کسی مشکل مقام کی تہ کو نہ پہنچنے کی بنا پر یہ اٹکل پچو کلیہ گھڑ لینا کہ "عام انسانوں کی طرح نبی بھی مومن کے بلند ترین معیارِ کمال پر ہر وقت قائم نہیں رہ سکتا، وہ بھی بسا اوقات تھوڑی دیر کے لئے اپنی بشری کمزوری سے مغلوب ہو جاتا ہے اور جب اللہ کی طرف سے اسے متنبہ کیا جاتا ہے کہ یہ عمل محض ایک "جاہلیت کا جذبہ" ہے تو نبی فوراً اسلامی طرزِ فکر کی طرف پلٹ آتا ہے۔" نہایت خطرناک بات اور مقامِ نبوت سے ناشناسائی کی عبرتناک مثال ہے۔ ؏

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

---

[1] الحج ع ۱۰ [2] الانعام ۔ ع ۱۵

اسی طرح یہ کہنا کہ "نبی اور رسول پر کوئی وقت ایسا بھی آتا ہے — اور آنا چاہیئے — جبکہ اس سے عصمت کا پردہ اٹھا لیا جاتا ہے اور اس سے ایک دو گناہ کرائے جاتے ہیں تاکہ اس کی بشریت ظاہر ہو۔" یہ ایک ایسا خطرناک قسم کا غلط فلسفہ (سوفسطائیت) ہے جس سے تمام شرائعِ الٰہیہ اور ادیانِ سماویہ کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔

نبوت سے عصمت کے جُدا ہو جانے کے معنیٰ یہ ہوئے کہ عین اس وقت نبی کی حیثیت ایک ایسی شخصیت کی نہیں ہوتی جو امت کے لئے اسوہ اور نمونہ ہو، اور جسے امین و مامون قرار دیا گیا ہو، اس وقت اس کی حیثیت ایک عام انسان کی سی ہو گی یا زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہیئے کہ عین اس حالت میں جبکہ نبی سے عصمت اٹھا لی جاتی ہے وہ نبوت اور لوازمِ نبوت سے موصوف نہیں ہوتا، ظاہر ہے کہ اگر یہ غلط منطق تسلیم کر لی جائے تو سارا دین ختم ہو جاتا ہے نبی اور رسول کی ہر بات — معاذ اللہ مشکوک ہو جاتی ہے اور اس کا کوئی قول و عمل اور تلقین و تعلیم قابلِ اعتماد نہیں رہتی کیونکہ ہر لمحہ یہ احتمال رہے گا کہ شاید یہ ارتفاعِ عصمت اور انخلاع عن النبوت کا وقت ہو — بظاہر یہ بات جو بڑے حسین و جمیل فلسفہ کی شکل میں پیش کی گئی ہے، غور کیجئے تو یہ اس قدر غیر معقول اور ناقابلِ برداشت ہے کہ کوئی معقول آدمی جو شریعتِ الٰہی کو سمجھتا ہو، اس کی جرأت تو کجا اس کا تصور تک نہیں کر سکتا؟ جن لوگوں کی زبان و قلم سے یہ بات نکلی ہے — اور افسوس ہے کہ بڑے اصرار و تکرار سے مسلسل نکلتی جا رہی ہے — ان کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہیں ہو گا کہ انہیں نہ علم کی حقیقت تک رسائی ہوئی ہے نہ نبوت کے تقاضوں کو انہوں نے صحیح سمجھا ہے۔

اور یہ بات بھی کسی علم و دانش کا پتہ نہیں دیتی کہ جب تک ہم انبیاءِ کرام علیہم السلام کو عام انسانوں کی طرح دو چار گناہوں میں مبتلا نہ دیکھ لیں اس وقت تک ہمیں ان کی بشریت کا یقین ہی نہیں آئے گا — کون نہیں جانتا کہ انبیاءِ کرام (علیہم السلام) کھاتے ہیں، پیتے ہیں، انہیں صحت و مرض جیسے بیسیوں انسانی عوارض لاحق ہوتے ہیں، وہ انسانوں سے پیدا ہوتے ہیں اور ان سے انسانی نسل چلتی ہے، علاوہ ازیں وہ بار بار اپنی بشریت کا

اعلان فرماتے ہیں، کیا ان تمام چیزوں کے بعد بھی اس بات کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ جب تک ان سے عصمت نہیں اٹھالی جاتی اور دو ایک گناہ نہیں ہونے دیئے جاتے تب تک ان کی بشریت مشتبہ رہے گی؟ اور ہمیں ان کی بشریت کا یقین نہیں آئے گا؟

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ بھول چوک اور خطأ و نسیان تو خاصۂ بشریت ہے، مگر گناہ و معصیت مقتضائے بشریت نہیں بلکہ خاصۂ شیطانیت ہے، انسان سے گناہ ہوتا ہے تو محض تقاضائے بشریت کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ شیطان کے تسلط و اغوا سے ہوتا ہے، اس لئے گناہوں کے ارتکاب سے انبیاء علیہم السلام کی بشریت ثابت نہیں ہوگی بلکہ اور ہی کچھ ثابت ہوگا اور جو لوگ بھول چوک اور "معصیت" کے درمیان فرق نہیں کرسکتے انہیں آخر کس نے کہا ہے کہ وہ ان نازک علمی مباحث میں الجھ کر "ضلوا فأضلوا" (خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا) کا مصداق بنیں۔

بہرحال یہ عصمت اور کمالاتِ نبوت تو ہر نبی کے لئے لازم و ضروری ہیں اب غور فرمایئے کہ جس مقدس ترین شخصیت کو تمام انبیاء و رسل کی سیادت و امامت کے مقام پر کھڑا کیا گیا ہو، جسے ختمِ نبوت و رسالتِ کبریٰ کا تاج پہنایا گیا ہو، اور جسے "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" کے اعلیٰ ترین منصب سے سرفراز کیا گیا ہو (بآبائنا و امہاتنا صلی اللہ علیہ وسلم)، کائنات کی اس بلند ترین ہستی کے شرف و کمال، طہارت و نزاہت، حرمت و عظمت، عفت و عصمت اور رسالت و نبوت کا مقام کون معلوم کرسکتا ہے؟ اگر ایسی فوق الادراک ہستی کے بارے میں بھی کوئی ایسا کلمہ کہا جائے کہ کسی وقت غیر معصومیت ان پر بھی آسکتی ہے تو کیا اس عظیم ترین جرم کی انتہا معلوم ہوسکتی ہے؟

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خاتم النبیین ہوئے، اور منصبِ رسالت و نبوت کی سیادتِ کبریٰ سے مشرف ہوئے اور آپؐ کی شریعت کو آخری شریعت اور قیامت تک آنے والی تمام قوموں اور نسلوں کے لئے آخری قانون بنایا گیا تو اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت تھی، ایک یہ کہ آسمانی قانون قیامت تک جوں کا توں محفوظ رہے۔ ہر قسم کی تحریف

وتبدیل سے اس کی حفاظت کی جائے، الفاظ کی بھی اور معانی کی بھی کیونکہ اگر الفاظ کی حفاظت ہو اور معانی کی حفاظت نہ ہو، تو یہ حفاظت بالکل بے معنی ہے۔ دوم یہ کہ جس طرح علمی حفاظت ہو اسی طرح عملی حفاظت بھی ہو، اسلام محض چند اصول و نظریات اور علوم وافکار کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ اپنے جلو میں ایک نظامِ عمل لے کر چلتا ہے، وہ جہاں زندگی کے ہر شعبہ میں اصول وقواعد پیش کرتا ہے وہاں ایک ایک جزئیہ کی عملی تشکیل بھی کرتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری تھا کہ شریعتِ محمدیہ (علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ وسلام) کی علمی وعملی دونوں پہلوؤں سے حفاظت کی جائے اور قیامت تک ایک ایسی جماعت کا سلسلہ قائم رہے جو شریعتِ مطہرہ کے علم وعمل کی حامل وامین ہو، حق تعالےٰ نے دینِ محمدی کی دونوں طرح حفاظت فرمائی، علمی بھی اور عملی بھی۔

حفاظت کے ذرائع میں صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی جماعت سرِفہرست ہے، ان حضرات نے براہِ راست صاحبِ وحی صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کو سمجھا، دین پر عمل کیا اور اپنے بعد آنے والی نسل تک دین کو من وعن پہنچایا، انہوں نے آپؐ کے زیرِ تربیت رہ کر اخلاق واعمال کو ٹھیک ٹھیک منشائے خداوندی کے مطابق درست کیا، سیرت وکردار کی پاکیزگی حاصل کی، تمام باطل نظریات سے کنارہ کش ہوکر عقائدِ حقّہ اختیار کیے، رضائے الٰہی کے لئے اپنا سب کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر نچھاور کر دیا۔ ان کے کسی طرزِ عمل میں ذرا خامی نظر آئی تو فوراً حق جل مجدہ نے اس کی اصلاح فرمائی، الغرض حضراتِ صحابہ کرامؓ کی جماعت اس پوری کائنات میں وہ خوش قسمت جماعت ہے جن کی تعلیم وتربیت اور تصفیہ وتزکیہ کے لئے سرورِ کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلم ومزکّی اور استاذ واتالیق مقرر کیا گیا۔ اس انعامِ خداوندی پر وہ جتنا شکر کریں کم ہے، جتنا فخر کریں بجا ہے:-

"لقد من اللہ علی المؤمنین إذ بعث	بخدا بہت بڑا احسان فرمایا اللہ نے مومنین پر کہ بھیجا
فیہم رسولاً من أنفسہم یتلو علیہم	ان میں ایک عظیم الشان رسول ان ہی میں سے، وہ
آیٰتہٖ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب	پڑھتا ہے ان کے سامنے اس کی آیتیں اور پاک کرتا ہے

والحکمۃ وإن کانوا من قبل لفی ضلٰل مبین[1]

ان کو اور سکھاتا ہے ان کو کتاب اور گہری دانائی۔ بلاشبہ وہ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی و عملی میراث اور آسمانی امانت چونکہ ان حضرات کے سپرد کی جارہی تھی، اس لئے ضروری تھا یہ حضرات آئندہ نسلوں کے لئے قابلِ اعتماد ہوں، چنانچہ قرآن و حدیث میں جابجا ان کے فضائل و مناقب بیان کئے گئے، چنانچہ:-

الف:- وحیِ خداوندی نے ان کی تعدیل فرمائی، ان کا تزکیہ کیا، ان کے اخلاص و للّٰہیت پر شہادت دی اور انہیں یہ رتبۂ بلند ملا کہ ان کو رسالتِ محمدیہ (علی صاحبہا الف صلاۃ وسلام) کے عادل گواہوں کی حیثیت سے ساری دنیا کے سامنے پیش کیا:-

"محمد رسول اللہ والذین معہٗ أشداء علی الکفار رحماء بینھم، تراھم رکعاً سجداً یبتغون فضلاً من اللہ ورضواناً، سیماھم فی وجوھھم من أثر السجود"[2]

محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں اور جو ایماندار آپؐ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں شفیق ہیں، تم ان کو دیکھو گے رکوع، سجدے میں۔ وہ چاہتے ہیں صرف اللہ کا فضل واس کی رضامندی ان کی علامت ان کے چہروں میں سجدے کا نشان ہے۔

گویا یہاں محمد رسول اللہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں) ایک دعویٰ ہے اور اس کے ثبوت میں حضرات صحابہ کرامؓ کی سیرت و کردار کو پیش کیا گیا ہے کہ جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت میں شک وشبہ ہو، اسے آپؐ کے ساتھیوں کی پاکیزہ زندگی کا ایک نظر مطالعہ کرنے کے بعد خود اپنے ضمیر سے یہ فیصلہ لینا چاہیئے کہ جس کے رفقاء اتنے بلند سیرت اور پاکباز ہوں وہ خود صدق وراستی کے کتنے اونچے مقام پر فائز ہوں گے ع

"کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا"

ب:- حضراتِ صحابہؓ کے ایمان کو "معیارِ حق" قرار دیتے ہوئے نہ صرف لوگوں کو اس کا نمونہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی بلکہ ان حضرات کے بارے میں لب کشائی کرنے والوں پر نفاق و

---

[1] آل عمران ع ۱۷ [2] الفتح ع-۴

سفاہت کی دائمی مہر ثبت کر دی گئی :۔

"واذا قیل لھم اٰمنوا کما اٰمن الناس قالوا انؤمن کما اٰمن السفھاء الا انھم ھم السفھاء ولٰکن لا یعلمون"[1]

اور جب ان (منافقوں) سے کہا جائے "تم بھی ایسا ہی ایمان لاؤ جیسا دوسرے لوگ (صحابہ کرام) ایمان لائے ہیں" تو جواب میں کہتے ہیں "کیا ہم ان بے وقوفوں جیسا ایمان لائیں"؟ سن رکھو یہ خود ہی بے وقوف ہیں مگر نہیں جانتے۔

ج :۔ حضرات صحابہ کرام کو بار بار "رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ" (اللہ ان سے راضی ہوا، وہ اللہ سے راضی ہوئے) کی بشارت دی گئی اور امت کے سامنے یہ اس شدت وکثرت سے دہرایا گیا کہ صحابہ کرام کا یہ لقب امت کا تکیۂ کلام بن گیا، کسی نبی کا اسمِ گرامی آپ "علیہ السلام" کے بغیر نہیں لے سکتے اور کسی صحابی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام نامی "رضی اللہ عنہ" کے بغیر مسلمان کی زبان پر جاری نہیں ہو سکتا، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف ظاہر کو دیکھ کر راضی نہیں ہوا، نہ صرف ان کے موجودہ کارناموں کو دیکھ کر، بلکہ ان کے ظاہر و باطن اور حال و مستقبل کو دیکھ کر ان سے راضی ہوا ہے، یہ گویا اس بات کی ضمانت ہے کہ آخر دم تک ان سے رضائے الٰہی کے خلاف کچھ صادر نہیں ہو گا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جس سے خدا راضی ہو جائے خدا کے بندوں کو بھی اس سے راضی ہو جانا چاہیے کسی اور کے بارے میں تو ظن و تخمین ہی سے کہا جا سکتا ہے کہ خدا اس سے راضی ہے یا نہیں ؟ مگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں تو نصِ قطعی موجود ہے، اس کے باوجود اگر کوئی ان سے راضی نہیں ہوتا تو گویا اسے اللہ تعالیٰ سے اختلاف ہے اور پھر اتنی بات کو کافی نہیں سمجھا گیا کہ "اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا" بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ سے راضی ہوئے، یہ ان حضرات کی عزت افزائی کی انتہا ہے۔

د :۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مسلک کو "معیاری راستہ" قرار دیتے ہوئے اس کی مخالفت کو براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے ہم معنی قرار دیا گیا اور ان کی مخالفت کرنے

---

[1] البقرہ۔ ع ۲

والوں کو وعید سنائی گئی:۔

«ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدیٰ ویتبع غیر سبیل المؤمنین نوله ما تولیٰ» الآیۃ[1]

اور جو شخص مخالفت کرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کی جبکہ اس کے سامنے ہدایت کھل چکی اور چلے مومنوں کی راہ چھوڑ کر ہم اسے پھیر دیں گے جس طرف پھرتا ہے۔

آیت میں "المؤمنین" کا اولین مصداق اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس جماعت ہے، رضی اللہ عنہم۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اتباعِ نبوی کی صحیح شکل صحابہ کرامؓ کی سیرت، وکردار اور ان کے اخلاق و اعمال کی پیروی میں منحصر ہے اور یہ جب ہی ممکن ہے جبکہ صحابہؓ کی سیرت کو اسلام کے اعلیٰ معیار پر تسلیم کیا جائے۔

۷۔ اور سب سے آخری بات یہ کہ انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سایۂ عاطفت میں آخرت کی ہر عزت سے سرفراز کرنے اور ہر ذلت و رسوائی سے محفوظ رکھنے کا اعلان فرمایا:۔

«یوم لا یخزی اللہ النبی والذین آمنوا معه نورهم یسعیٰ بین أیدیهم وبأیمانهم»

جس دن رسوا نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ نبی کو اور جو مومن ہوئے آپؐ کے ساتھ، ان کا نور دوڑتا ہوگا ان کے آگے اور ان کے داہنے۔

اس قسم کی بیسیوں نہیں بلکہ سینکڑوں آیات ہیں صحابہ کرام کے فضائل و مناقب مختلف عنوانات سے بیان فرمائے گئے ہیں اور اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ دین کے سلسلۂ سند کی یہ پہلی کڑی اور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ حضرات کی جماعت۔ معاذ اللہ۔ ناقابل اعتماد ثابت ہو، ان کے اخلاق و اعمال میں خرابی نکالی جائے اور ان کے بارے میں یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ دین کی علمی و عملی تدبیر نہیں کر سکے تو دینِ اسلام کا سارا ڈھانچہ ہل جاتا ہے اور حاکم بدہن رسالتِ محمدیہ مجروح ہو جاتی ہے۔

دنیا کا ایک معروف قاعدہ ہے کہ اگر کسی خبر کو رد کرنا ہو تو اس کے راویوں کو جرح و قدح کا نشانہ بناؤ، ان کی سیرت وکردار کو ملوث کرو اور ان کی ثقاہت و عدالت کو مشکوک ثابت کرو، صحابہ کرام چونکہ دینِ محمدی کے سب سے پہلے راوی ہیں، اس لئے چالاک فتنہ پردازوں

[1] النساء ع ۱۷

نے جب دینِ اسلام کے خلاف سازش کی اور دین سے لوگوں کو بدظن کرنا چاہا تو ان کا سب سے پہلا ہدف صحابہ کرامؓ تھے، چنانچہ تمام فرقِ باطلہ اپنے نظریاتی اختلاف کے باوجود جماعتِ صحابہ کو ہدفِ تنقید بنانے میں متفق نظر آتے ہیں، ان کی سیرت و کردار کو داغدار بنانے اور ان کی شخصیت کو نہایت گھناؤنے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی، ان کے اخلاق و اعمال پر تنقیدیں کی گئیں، ان پر مال وجاہ کی حرص میں احکامِ خداوندی سے پہلو تہی کرنے کے الزامات دھرے گئے، ان پر خیانت، غصب اور کنبہ پروری، اقربا نوازی کی تہمتیں لگائی گئیں اور غلو و انتہاپسندی کی حد ہے کہ جن پاکیزہ ہستیوں کے ایمان کو حق تعالیٰ نے "معیار" قرار دے کر ان جیسا ایمان لانے کی لوگوں کو دعوت دی تھی «آمنوا کما آمن الناس» انہی کے ایمان و کفر کا مسئلہ زیرِ بحث لایا گیا، اور تکفیر و تفسیق تک نوبت پہنچا دی گئی، جن جانبازوں نے دینِ اسلام کو اپنے خون سے سیراب کیا تھا، انہی کے بارے میں چیخ چیخ کر کہا جانے لگا کہ وہ اسلام کے اعلیٰ معیار پر قائم نہیں رہے تھے، جن مردانِ خدا کے صدق و امانت کی خدا تعالیٰ نے گواہی دی تھی:۔

«رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا»

یہ وہ "مرد" ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا جو عہد انہوں نے اللہ سے باندھا، بعض نے تو جانِ عزیز تک اسی راستہ میں دے دی اور بعض رہے جینے سے، اس کے منتظر ہیں اور ان کے عزم و استقلال میں ذرا تبدیلی نہیں ہوئی۔

انہی کے حق میں بتایا جانے لگا کہ نہ وہ صدق و امانت سے موصوف تھے، نہ اخلاص و ایمان کی دولت انہیں نصیب تھی جن مخلصوں نے اپنے بیوی بچوں کو، اپنے گھر بار کو، اپنے عزیز و اقارب کو، اپنے دوست احباب کو، اپنی ہر لذت و آسائش کو، اپنے جذبات و خواہشات کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ــــ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کر دیا تھا، انہی کو یہ طعنہ دیا گیا کہ وہ محض حرص و ہوا کے غلام تھے اور اپنے مفاد کے مقابلے میں خدا اور رسولؐ کے احکام کی انہیں کوئی پروا نہیں تھی، لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا۔

ظاہر ہے کہ اگر امت کا معدہ ان بے ہودہ نظریات کی مردہ مکھی کو قبول کر لیتا اور ایک بار بھی صحابۂ کرام امت کی عدالت میں مجروح قرار پاتے تو دین کی پوری عمارت گر جاتی، قرآنِ کریم اور احادیثِ نبویہ سے امان اٹھ جاتا اور یہ دین جو قیامت تک رہنے کے لئے آیا تھا، ایک قدم آگے نہ چل سکتا. مگر یہ سارے فتنے جو بعد میں پیدا ہونے والے تھے علمِ الٰہی سے اوجھل نہیں تھے، اس کا اعلان تھا:۔

«وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ»	اور اللہ اپنا نور پورا کر کے رہے گا، خواہ کافروں کو کتنا ناگوار ہو۔

یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے بار بار مختلف پہلوؤں سے صحابہ کرام کا تزکیہ فرمایا، ان کی توثیق و تعدیل فرمائی اور قیامت تک کے لئے یہ اعلان فرما دیا:۔

«اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ»	یہی وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے لکھ دیا ان کے دل میں ایمان اور مدد دی ان کو اپنی خاص رحمت سے۔

ادھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابۂ کرام کے بے شمار فضائل بیان فرمائے۔ بالخصوص خلفائے راشدین، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان ذی النورین، حضرت علی مرتضیٰ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فضائل کی تو انتہا کر دی، جس کثرت و شدت اور تواتر و تسلسل کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے فضائل و مناقب، ان کے مزایا و خصوصیات اور ان کے اندرونی اوصاف و کمالات کو بیان فرمایا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے علم میں یہ بات لانا چاہتے تھے کہ انہیں عام افرادِ امت پر قیاس کرنے کی غلطی نہ کی جائے۔ ان حضرات کا تعلق چونکہ براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے ہے، اس لئے ان کی محبت عین محبتِ رسول ہے اور ان کے حق میں ادنیٰ لب کشائی ناقابلِ معافی جرم، فرمایا:۔

"اللہ اللہ فی أصحابی، اللہ اللہ فی أصحابی، لاتتخذوھم غرضًا من بعدی، فمن أحبھم فبحبی أحبھم، ومن أبغضھم فببغضی أبغضھم، ومن آذاھم فقد آذانی، ومن آذانی فقد آذی اللہ ومن آذی اللہ فیوشک أن یاخذہ"

(ترمذی)

اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو میرے صحابہ کے معاملہ میں، مکرر کہتا ہوں اللہ سے ڈرو اللہ سے ڈرو میرے صحابہ کے معاملہ میں، ان کو میرے بعد ہدفِ تنقید نہ بنانا، کیونکہ جس نے ان سے محبت کی تو میری محبت کی بنا پر اور جس نے ان سے بدظنی کی تو مجھ سے بدظنی کی بنا پر، جس نے ان کو ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی اور جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ کو ایذا دی اور جس نے اللہ کو ایذا دی تو قریب ہے کہ اللہ اسے پکڑ لے۔

امت کو اس بات سے بھی آگاہ فرمایا گیا کہ تم میں سے اعلیٰ فرد کی بڑی سے بڑی نیکی ادنیٰ صحابی کی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اس لئے ان پر زبانِ تشنیع دراز کرنے کا حق امت کے کسی فرد کو حاصل نہیں، ارشاد ہے:

"لاتسبوا أصحابی، فلو أن أحدکم أنفق مثل أحدٍ ذھبًا مابلغ مُدَّ أحدھم ولانصیفہ"

(بخاری ومسلم)

میرے صحابہ کو برا بھلا نہ کہو، کیونکہ تمہارا وزن ان کے مقابلہ میں اتنا بھی نہیں جتنا پہاڑ کے مقابلہ میں ایک تنکے کا ہو سکتا ہے چنانچہ، تم میں سے ایک شخص احد پہاڑ کے برابر سونا بھی خرچ کردے تو ان کے ایک سیر جَو کو نہیں پہنچ سکتا اور نہ اس کے عشرِ عشیر کو۔

مقامِ صحابہ کی نزاکت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ امت کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ ان کی عیب جوئی کرنے والوں کو نہ صرف ملعون و مردود سمجھیں بلکہ برملا اس کا اظہار کریں فرمایا:-

"إذا رأیتم الذین یسبون أصحابی فقولوا لعنۃ اللہ علی شرکم"

(ترمذی)

جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہ کو برا بھلا کہتے اور انہیں ہدفِ تنقید بناتے ہیں تو ان سے کہو تم میں سے (یعنی صحابہ اور ناقدینِ صحابہ میں سے)، جو برا ہے اس پر اللہ کی لعنت (ظاہر کہ صحابہ کو برا بھلا کہنے والا ہی بدتر ہوگا)،

ؔ اس اصول کے علاوہ جو مولانا محترم مدفیضہم نے اس حدیث سے مستنبط کیا ہے اس حدیث پاک کے مفہوم و منطوق

یہاں تمام احادیث کا استیعاب مقصود نہیں بلکہ کہنا یہ ہے کہ ان قرآنی و نبوی شہادتوں

بقیہ حاشیہ: ـسے کئی اور اہم مسائل بھی مستنبط ہوتے ہیں مختصراً ان کی طرف اشارہ کر دینا مفید ہوگا۔

۱۔ حدیث میں "سَبّ" سے بازاری گالیاں دینا مراد نہیں بلکہ ہر ایسا تنقیدی کلمہ مراد ہے جو ان حضرات کے استخفاف میں کہا جائے، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ پر تنقید اور نکتہ چینی جائز نہیں بلکہ وہ قائل کے ملعون و مطرود ہونے کی دلیل ہے۔

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر کو اس سے ایذا ہوتی ہے (وقد صرح بہ بقولہ فمن آذاھم فقد آذانی) اور آپ کے قلبِ اطہر کو ایذا دینے میں حبطِ اعمال کا خطرہ ہے لقولہ تعالیٰ «ان تحبط أعمالکم و أنتم لاتشعرون»

۳۔ صحابہ کرامؓ کی مدافعت کرنا اور ناقدین کو جواب دینا ملتِ اسلامیہ کا فرض ہے (فان الأمر للوجوب)۔

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ ناقدینِ صحابہؓ کو ایک ایک بات کا تفصیلی جواب دیا جائے کیونکہ اس سے جواب اور جواب الجواب کا ایک غیر مختتم سلسلہ چل نکلے گا بلکہ یہ تلقین فرمائی کہ انہیں بس اصولی اور فیصلہ کن جواب دیا جائے اور وہ ہے لعنۃ اللّٰہ علی شرکم۔

۵۔ "شرکم" اسم تفضیل کا صیغہ ہے جو مشاکلت کے طور پر استعمال ہوا ہے، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناقدینِ صحابہؓ کے لئے ایسا کنایہ استعمال فرمایا ہے کہ اگر وہ اس پر غور کریں تو ہمیشہ کے لئے تنقیدِ صحابہ کے روگ کی جڑ کٹ جاتی ہے خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اتنی بات تو بالکل کھلی ہے کہ صحابہؓ کیسے ہی ہوں مگر تم سے تو اچھے ہی ہوں گے، تم ہوا پر اڑلو، آسمان پر پہنچ جاؤ، سو بار مر کر جی لو، مگر تم سے صحابی تو نہیں بنا جا سکے گا، تم آخر وہ آنکھ کہاں سے لاؤ گے جس نے جمالِ جہاں آرائے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دیدار کیا؟ وہ کان کہاں سے لاؤ گے جو کلماتِ نبوت سے مشرف ہوئے؟ ہاں وہ دل کہاں سے لاؤ گے جو انفاسِ مسیحائی محمدی سے زندہ ہوئے؟ وہ دماغ کہاں سے لاؤ گے جو انوارِ مقدس سے منور ہوئے؟ تم وہ ہاتھ کہاں سے لاؤ گے جو ایک بار بشرہ محمدی سے مس ہوئے اور ساری عمر ان کی بوئے عنبریں نہیں گئی؟ تم وہ پاؤں کہاں سے لاؤ گے جو معیتِ محمدی میں آبلہ پا ہوئے؟ تم وہ زمان کہاں سے لاؤ گے جب آسمان زمین پر اتر آیا تھا؟ تم وہ مکان کہاں سے لاؤ گے جہاں کونین کی سیادت جلوہ آرا تھی؟ تم وہ محفل کہاں سے لاؤ گے جہاں

کے بعد بھی اگر کوئی شخص حضرات صحابہ کرامؓ میں عیب نکالنے کی کوشش کرے تو اس بات سے

بقیہ حاشیہ: سعادتِ دارین کی شرابِ طہور کے جام بھر بھر دیتے جاتے اور تشنہ کامانِ محبت "ہل من مزید" کا نعرہ مستانہ لگا رہے تھے؟ تم وہ منظر کہاں سے لاؤ گے جو کأنی أری اللہ عیاناً کا کیف پیدا کرتا تھا؟ تم وہ مجلس کہاں سے لاؤ گے جہاں کأنما علی رؤسنا الطیر کا سماں بندھ جاتا تھا؟ تم وہ صدر نشین تختِ رسالت کہاں سے لاؤ گے جس کی طرف ھذا الأبیض المتکئ سے اشارے کئے جاتے تھے؟ تم وہ شمیم عنبر کہاں سے لاؤ گے جو دیدارِ محبوب میں خوابِ نیم شبی کو حرام کر دیتی تھی؟ تم وہ ایمان کہاں سے لاؤ گے جو ساری دنیا کو تج کر حاصل کیا جاتا تھا؟ تم وہ اعمال کہاں سے لاؤ گے جو پیمانۂ نبوت سے ناپ ناپ کر ادا کئے جاتے تھے؟ تم وہ اخلاق کہاں سے لاؤ گے جو آئینۂ محمدی سامنے رکھ کر سنوارے جاتے تھے؟ تم وہ رنگ کہاں سے لاؤ گے جو "صبغۃ اللہ" کی بھٹی میں دیا جاتا تھا؟ تم وہ ادائیں کہاں سے لاؤ گے جو دیکھنے والوں کو نیم بسمل بنا دیتی تھیں؟ تم وہ نماز کہاں سے لاؤ گے جس کے امام نبیوں کے امام تھے؟ تم قدوسیوں کی وہ جماعت کیسے بن سکو گے جس کے سردار رسولوں کے سردار تھے۔

تم میرے صحابہ کو لاکھ برا کہو، مگر اپنے ضمیر کا دامن جھنجھوڑ کر بتاؤ! اگر ان تمام سعادتوں کے بعد بھی میرے صحابہؓ برے ہیں تو کیا تم ان سے بدتر نہیں ہو؟ اگر وہ تنقید و ملامت کے مستحق ہیں تو کیا تم لعنت و غضب کے مستحق نہیں ہو؟ اگر تم میرے صحابہؓ کو بدنام کرتے ہو تو کیا میرا خدا تمہیں سرِ محشر سب کے سامنے رسوا نہیں کرے گا؟ اگر تم میں انصاف و حیا کی کوئی رمق باقی ہے تو اپنے گریبان میں جھانکو اور میرے صحابہؓ کے بارے میں زبان بند کرو اور اگر تمہارا ضمیر بالکل مسخ ہو چکا ہے تو پھر دنیا یہ فیصلہ کرے گی کہ میرے صحابہؓ پر تنقید کا حق ان کپوتوں کو حاصل ہونا چاہیے؟

علامہ طیبیؒ نے اسی حدیث کی شرح میں حضرت حسانؓ کا ایک عجیب شعر نقل کیا ہے:۔

أتھجوہ ولست لہ بکفوء

فشر کما لخیر کما فداء

ترجمہ: کیا تو آپؐ کی ہجو کرتا ہے جب کہ تو آپؐ کے برابر کا نہیں ہے؟ پس تم دونوں میں بدتر تمہارے بہتر پر قربان۔

۶۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تنقیدِ صحابہ کا منشا ناقد کا نفسیاتی شر اور خبث و تکبر ہے، آپ جب کسی شخص کے طرزِ عمل پر تنقید کرتے ہیں تو اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ کسی صفت میں وہ آپ کے نزدیک خود آپ کی اپنی

قطع نظر کہ اس کا یہ طرزِ عمل قرآن کریم کی نصوصِ قطعیہ اور ارشاداتِ نبوت کے انکار کے مترادف ہے، یہ لازم آئے گا کہ حق تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو فرائض بحیثیت منصبِ نبوت کے عاید کئے تھے اور جن میں اعلیٰ ترین منصب تزکیۂ نفوس کا تھا، گویا حضرتِ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فرضِ منصبی کی بجاآوری سے قاصر رہے اور تزکیہ نہ کر سکے اور یہ قرآن کریم کی صریح

بقیہ حاشیہ:۔ ذات سے فروتر اور گھٹیا ہے اب جب کوئی شخص کسی صحابی کے بارے میں مثلاً یہ کہے گا کہ اس نے عدل و انصاف کے تقاضوں کو کماحقہٗ ادا نہیں کیا تھا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اگر اس صحابی کی جگہ یہ صاحب ہوتے تو عدل و انصاف کے تقاضوں کو زیادہ بہتر ادا کرتے گویا ان میں صحابی سے بڑھ کر صفتِ عدل موجود ہے، یہ ہے تکبر کا وہ "شر" اور نفس کا وہ خبث جو تنقیدِ صحابہ پر ابھارتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی "شر" کی اصلاح اس حدیث میں فرمانا چاہتے ہیں۔

۷۔ حدیث میں بحث و مجادلہ کا ادب بھی بتایا گیا ہے یعنی خصم کو براہِ راست خطاب کرتے ہوئے یہ نہ کہا جائے کہ تم پر لعنت! بلکہ یوں کہا جائے کہ تم دونوں میں جو برا ہو اس پر لعنت! ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی منصفانہ بات ہے جس پر سب کو متفق ہونا چاہیئے، اس میں کسی کے برہم ہونے کی گنجائش نہیں، اب رہا یہ قصہ کہ "تم دونوں میں برا" کا مصداق کون ہے؟ خود ناقد؟ یا جس پر وہ تنقید کرتا ہے؟ اس کا فیصلہ کوئی مشکل نہیں، دونوں کے مجموعی حالات سامنے رکھ کر ہر معمولی عقل کا آدمی یہ نتیجہ آسانی سے نکال سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی برا ہو سکتا ہے یا اس کا خوش فہم ناقد؟

۸۔ حدیث میں فقولوا کا خطاب امت سے ہے گویا ناقدینِ صحابہؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت نہیں سمجھتے" بلکہ انہیں امت کے مقابل فریق کی حیثیت سے کھڑا کرتے ہیں اور یہ ناقدین کے لئے شدید وعید ہے جیسا کہ بعض دوسرے معاصی پر فَلَيْسَ مِنَّا کی وعید سنائی گئی ہے۔

۹۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح ناموسِ شریعت کا اہتمام تھا اسی طرح ناموسِ صحابہ کی حفاظت کا بھی اہتمام تھا کیونکہ ان ہی پر سارے دین کا مدار ہے۔

۱۰۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ناقدینِ صحابہ کی جماعت بھی ان "مارقین" سے ہے جن سے جہاد باللسان کا حکم امت کو دیا گیا ہے، یہ مضمون کئی احادیث میں صراحۃً بھی آرہا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ مدیر

تکذیب ہے، حق تعالیٰ تو ان کے تزکیہ کی تعریف فرمائے اور ہم انہیں مجروح کرنے میں مصروف ہیں۔ — اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے تزکیہ سے قاصر رہے تو گویا حق تعالیٰ نے آپ کا انتخاب صحیح نہیں فرمایا تھا۔ انا للہ۔ بات کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتی ہے اور جب اللہ تعالیٰ کے انتخاب میں قصور نکلا تو اللہ تعالیٰ کا علم غلط ہوا۔ نعوذ باللہ من الغوایۃ والسفاھۃ۔ چنانچہ اہلِ ہوا کی بڑی جماعت کا دعویٰ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو "بدا" ہوتا ہے، یعنی اسے بہت سی چیزیں جو پہلے معلوم نہیں تھیں بعد میں معلوم ہوتی ہیں اور اس کا پہلا علم غلط ہوجاتا ہے، جن لوگوں کا اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ تصور ہو رسول اور نبی اور ان کے بعد صحابہ کرام کا ان کے نزدیک کیا درجہ رہے گا —؟

الغرض صحابہ کرامؓ پر تنقید کرنے، ان کی غلطیوں کو اچھالنے اور انہیں موردِ الزام بنانے کا قصہ صرف ان ہی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ خدا و رسول، کتاب و سنت اور پورا دین اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے اور دین کی ساری عمارت منہدم ہوجاتی ہے، بعید نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں جو اوپر نقل کیا گیا ہے، اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا ہو۔

«ومن آذاھم فقد آذانی، ومن آذانی فقد آذی اللہ، ومن آذی اللہ فیوشك أن یأخذہ»

جس نے ان کو ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی اور جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ تعالیٰ کو ایذا دی اور جس نے اللہ کو ایذا دی تو قریب ہے کہ اللہ اسے پکڑ لے؛

اور یہی وجہ ہے کہ تمام فرقِ باطلہ کے مقابلہ میں اہلِ حق کا امتیازی نشان صحابہ کرام کی عظمت و محبت رہا ہے، تمام اہلِ حق نے اپنے عقائد میں اس بات کو اجماعی طور پر شامل کیا ہے کہ:۔

و نکف عن ذکر الصحابۃ إلا بخیر

اور ہم صحابہؓ کا ذکر بھلائی کے سوا کسی اور طرح کرنے سے زبان بند رکھیں گے۔

گویا اہلِ حق اور اہلِ باطل کے درمیان امتیاز کا معیار صحابہ کرام کا "ذکر بالخیر" ہے جو شخص ان حضرات کی غلطیاں چھانٹتا ہو، ان کو موردِ الزام قرار دیتا ہو، اور ان پر سنگین اتہامات کی فردِ جرم عائد کرتا ہو وہ اہلِ حق میں شامل نہیں ہے۔

جو حضرات اپنے خیال میں بڑی نیک نیتی، اخلاص اور بقول ان کے وقت کے اہم ترین تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے قبائحِ صحابہ کو ایک مرتب فلسفہ کی شکل میں پیش کرتے ہیں اور اسے "تحقیق" کا نام دیتے ہیں، انہیں اس کا احساس ہو یا نہ ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس تسویدِ اوراق کا انجام اس کے سوا کچھ نہیں کہ جدید نسل کو دین کے نام پر دین سے بیزار کر دیا جائے — اور ہر ایرے غیرے کو صحابہ کرامؓ پر تنقید کی کھلی چھٹی دے دی جائے جنہیں نہ علم ہے نہ عقل، نہ فہم ہے نہ فراست۔

اور یہ بڑا اندیشہ ہی اندیشہ نہیں بلکہ کھلی آنکھوں اس کا مشاہدہ ہونے لگا ہے، الامان والحفیظ۔

کہا جاتا ہے کہ "ہم نے کوئی نئی بات نہیں کہی بلکہ تاریخ کی کتابوں میں یہ سارا مواد موجود تھا، ہمارا قصور صرف یہ ہے کہ ہم نے اسے جمع کر دیا ہے۔" افسوس ہے کہ یہ عذر پیش کرتے ہوئے بہت سی اصولی اور بنیادی باتوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے ورنہ بأدنیٰ تأمل واضح ہو جاتا کہ صرف اتنا عذر طعنِ صحابہ کی وعید سے بچنے کے لئے کافی نہیں، اور نہ وہ اتنی بات کہہ کر بری الذمہ ہو سکتے ہیں۔

اولاً، قرآنِ کریم کی نصوصِ قطعیہ، احادیثِ ثابتہ اور اہلِ حق کا اجماع صحابہ کی عیب جینی کی ممانعت پر متفق ہیں، ان قطعیات کے مقابلہ میں ان تاریخی قصہ کہانیوں کا سرے سے کوئی وزن ہی نہیں، تاریخ کا موضوع ہی ایسا ہے کہ اس میں تمام رطب و یابس اور صحیح و سقیم چیزیں جمع کی جاتی ہیں، صحت کا جو معیار "حدیث" میں قائم رکھا گیا ہے، تاریخ میں وہ معیار نہ قائم رہ سکتا تھا نہ اسے قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اس لئے حضراتِ محدثین نے ان کی صحت کی ذمہ داری اٹھانے سے انکار کر دیا ہے، حافظ عراقی فرماتے ہیں:-

ولیعلم الطالب أن السیرا   یجمع ما قد صح وما قد أنکرا

یعنی علم تاریخ و سیر صحیح اور منکر سب کو جمع کر لیتا ہے۔

اب جو شخص کسی خاص مدعا کو ثابت کرنے کے لئے تاریخی مواد کو کھنگال کر تاریخی روایات سے استدلال کرنا چاہتا ہے اسے عقل و شرع کے تمام تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف یہ دیکھ لینا کافی نہیں ہے کہ یہ روایت فلاں فلاں تاریخ میں لکھی ہے بلکہ جس طرح وہ یہ سوچتا ہے کہ یہ روایت اس کے مقصد و مدعا کے لئے مفید ہے یا نہیں؟ اسی طرح اسے اس پر بھی غور کر

لینا چاہیئے کہ کیا یہ روایت شریعت یا عقل سے متصادم تو نہیں ؟ اس اصول کی وضاحت کے لئے یہاں صرف ایک مثال کا پیش کرنا کافی ہوگا۔

آپ "خلیفۂ راشد" اسے کہتے ہیں جو ٹھیک منہاجِ نبوت پر قائم ہو اور اس کا کوئی عمل اور کوئی فیصلہ منہاجِ نبوت کے اعلیٰ معیار سے ہٹا ہوا نہ ہو، اب آپ ایک صحابیؓ کو خلیفۂ راشد تسلیم کرتے ہوئے اس پر یہ الزام عائد کرتے کہ انہوں نے بلا کسی استحقاق کے مالِ غنیمت کا پورا خمس (۵ لاکھ دینار) اپنے فلاں رشتہ دار کو بخش دیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ "خلافتِ راشدہ" اور منہاجِ نبوت یہی ہے جس کی تصویر اس افسانے میں دکھائی گئی ہے ؟ اور آج کے ماحول میں اس روایت کو من وعن تسلیم کرنے سے کیا یہ ذہن نہیں بنے گا کہ خلافتِ راشدہ کا معیار بھی آج کے جائر حکمرانوں سے کچھ زیادہ بلند نہیں ہوگا جو اپنے رشتہ داروں کو روٹ پرمٹ اور امپورٹ لائسنس مرحمت فرماتے ہیں ؟ اسی پر ان دوسرے الزامات کو قیاس کر لیجیے جو بڑی شانِ تحقیق سے عائد کئے گئے ہیں۔

ثانیاً :- یہ تاریخی روایات آج یکایک نہیں ابھر آئی ہیں بلکہ اکابرِ اہلِ حق کے سامنے یہ سارا کچھ موجود رہا ہے اور وہ اس کی مناسب تاویل و توجیہ کر چکے ہیں، جس سے معلوم ہوا کہ ان تاریخی واقعات کو بڑی آسانی سے کسی اچھے محمل پر محمول کیا جا سکتا ہے، اب ایک شخص اٹھتا ہے اور "بے لاگ تحقیق" کے شوق میں ان کے ایسے محمل تلاش کرتا ہے جس سے صحابۂ کرام کی صریح تنقیص اور ان کی سیرت و کردار کی گراوٹ مفہوم ہوتی ہے کیا اس کے بارے میں یہ حسنِ ظن رکھا جائے کہ صحابۂ کرام کے بارے میں وہ "حسنِ ظن" رکھتا ہے ؟

اور عجیب بات یہ کہ جب اس کے سامنے اکابرِ اہلِ حق کے طرزِ تحقیق کا حوالہ دیا جاتا ہے تو ان حضرات کو "وکیلِ صفائی" کہہ کر ان کی تحقیقات کو قابلِ التفات نہیں سمجھتا، غالباً یہ دنیا کی نرالی عدالت ہے جس میں "وکیلِ استغاثہ" کے بیان پر یک طرفہ فیصلہ دیا جائے اور "وکیلِ صفائی" کے بیانات کو اس جرم میں نظر انداز کر دیا جائے کہ وہ کسی مظلوم کی طرف سے صفائی کا وکیل بن کر کیوں کھڑا ہو گیا ہے، اوپر قرآن و سنت کی جن نصوص کا حوالہ دیا گیا اور اہلِ حق کے جس اجماعی فیصلہ کا ذکر کیا گیا ہے اس سے معلوم ہو گا کہ صرف حافظ ابن تیمیہ اور شاہ عبدالعزیز ہی نہیں، بلکہ خدا و

رسول اور پوری امت کے اہلِ حق صحابۂ کرام کے "وکیلِ صفائی" ہیں، اب یہ فیصلہ کرنا ہر شخص کی اپنی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ وکیلِ صفائی کی صف میں شامل ہونا پسند کرتا ہے یا وکیلِ استغاثہ کی صف میں۔

ثالثاً، ان تاریخی روایات کے منفرق جزئی واقعات کو چن چن کر جمع کرنا، انہیں ایک مربوط فلسفہ بنا ڈالنا، جزئیات سے کلیات اخذ کرلینا اور ان پر ایسے جلی اور چبھتے ہوئے عنوانات جمانا جنہیں آج کی چودھویں صدی کا فاسق سے فاسق بھی اپنی طرف منسوب کرنا پسند نہیں کرے گا، یہ نہ تو دین وملت کی کوئی خدمت ہے، نہ اسے اسلامی تاریخ کا صحیح مطالعہ کہا جا سکتا ہے، البتہ اسے "تاریخ سازی" کہنا بجا ہو گا۔ بقول سعدیؒ ؎ "ولیکن قلم در کفِ دشمن است"

میں پوچھتا ہوں کیا کوئی ادنیٰ مسلمان اپنے بارے میں یہ سننا پسند کرے گا کہ اس نے خدائی دستور کو بدل ڈالا؟ اس نے بیت المال کو گھر کی لونڈی بنا لیا؟ اس نے مسلمانوں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آزادی سلب کرلی؟ اس نے عدل وانصاف کی مٹی پلید کر ڈالی؟ اس نے دیدہ ودانستہ نصوصِ قطعیہ سے سرتابی کی؟ اس نے خدائی قانون کی بالادستی کا خاتمہ کر ڈالا؟ اس نے اقربا پروری وخویش نوازی کے ذریعہ لوگوں کی حق تلفی کی؟

کیا کوئی معمولی قسم کا متقی اور پرہیزگار آدمی ان جگر پاش اتہامات کو ٹھنڈے دل سے برداشت کرے گا؟ اگر نہیں ___ اور یقیناً نہیں ___ تو کیا صحابۂ کرامؓ ہم نالائقوں سے بھی گئے گذرے ہو گئے؟ کہ ایک دو نہیں، بلکہ مثالب وقبائح اور اخلاقی گراوٹ کی ایک طویل فہرست ان کے نام جڑ دی جائے، پھر بے لاگ تحقیق کے نام سے اسے اچھالا جائے اور روکنے اور ٹوکنے کے باوجود اس پر اصرار کیا جائے۔

کیا صحابۂ کرام کی عزت وحرمت یہی ہے؟ کیا اسی کا نام صحابہؓ کا "ذکر بالخیر" ہے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معزز صحابہؓ اسی احترام کے مستحق ہیں؟ کیا ایمانی غیرت کا یہی تقاضا ہے؟ کیا مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھول جانا چاہیئے:

"جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہ کو برا بھلا کہتے ہیں

تو ان کے جواب میں یہ کہو "تم میں سے (یعنی صحابۂ کرام اور ان کے ناقدین میں سے) جو برا ہو اس پر اللہ کی لعنت!" (ترمذی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ بعد کی امت کے لئے حق و باطل کا معیار ہیں انہیں معیتِ نبوی کا جو شرف حاصل ہوا، اس کے مقابلہ میں کوئی بڑی سے بڑی فضیلت ایک جو کے برابر بھی نہیں، کسی بڑے سے بڑے ولی اور قطب کو ان کی خاکِ پا بننے کا شرف حاصل ہو جائے تو اس کے لئے مایۂ صد افتخار ہے، اس لئے امت کے کسی فرد کا ــ خواہ وہ اپنی جگہ مفکرِ دوران اور علامۂ زماں ہی کہلاتا ہو ــ ان پر تنقید کرنا قلبی زیغ کی علامت ہے ــ ایاز! قدرِ خویش بشناس!!
یہ دنیا حق و باطل کی آماجگاہ ہے، یہاں باطل حق کا لبادہ اوڑھ کر آتا ہے، بسا اوقات ایک آدمی اپنے غلط نظریات کو صحیح سمجھ کر ان سے چمٹا رہتا ہے جس سے رفتہ رفتہ اس کے ذہن میں کجی آجاتی ہے اور بالآخر اس سے صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط سمجھنے کی استعداد ہی سلب ہو جاتی ہے اور یہ بڑی خطرناک بات ہے، اہلِ حق و تحقیق کی یہ شان نہیں کہ وہ ــ "میں یہ سمجھتا ہوں ــ" کی بر خود غلط فہمی میں مبتلا ہوں اور جب انہیں اخلاص و خیر خواہی سے تنبیہ کی جائے تو تاویلات کا "ضمیمہ" لگانے بیٹھ جائیں ــ اہلِ حق کی شان تو یہ ہے کہ اگر ان کے قلم و زبان سے کوئی نامناسب لفظ نکل جائے تو تنبیہ کے بعد فوراً حق کی طرف پلٹ آئیں ــ حق تعالیٰ جل ذکرہٗ ہمیں اور ہمارے تمام مسلمان بھائیوں کو ہر زیغ و ضلال سے محفوظ فرمائے، اور اتباعِ حق کی توفیق بخشے۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد إذ هديتنا وهب لنا من لدنك رحمة إنك أنت الوهاب، وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه صفوة البرية محمد وعلى آله وأصحابه وأتباعه أجمعين ــ آمين

لے مندرجہ بالا مضمون مجلس دعوت و تحقیق اسلامی کے رفیق کار جناب مولانا یوسف طلال امریکی کے قلم سے انگریزی منتقل ہو کر کتابچہ کی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ مختار

حیاتِ انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام

مسئلہ حیاتِ انبیاء اور اس کے متعلقات پر جب حضرت مولانا محمد سرفراز صاحب شیخ الحدیث نصرۃ العلوم کی تالیف "تسکین الصدور فی تحقیق أحول الموتٰی فی البرزخ والقبور" شائع ہوئی تو ذیل کا مضمون اس کی تائید وتقریظ میں لکھا گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ خصوصاً علیٰ سیدنا محمدن المصطفیٰ وآلہ وصحبہ ماکفیٰ وشفیٰ، أما بعد:

انبیاء کرام علیہم الصلوات والسلام کی حیات بعد الممات کا مسئلہ صاف اور متفقہ مسئلہ تھا، شہداء کی حیات بنصِّ قرآن ثابت تھی اور دلالۃ النص سے انبیاء کرام کی حیات قرآن سے ثابت تھی، اور احادیثِ نبویہ سے عبارۃ النص کے ذریعہ ثابت تھی لیکن بُرا ہو اختلاف اور فتنوں کا کہ ایک مسلم حقیقت زیرِ بحث آکر مشتبہ ہو گئی، کتنی ہی تاریخی بدیہیات کو کج بحثوں نے نظری بنالیا اور کتنے ہی حقائقِ شرعیہ کو کج فہمی نے مسخ کر کے رکھ دیا، یہ دنیا ہے اور دنیا کے مزاج میں داخل ہے کہ یہاں ہر دور میں کج فہم، کجرو اور کج بحث موجود ہوتے ہیں، زبان بند کرنا تو اللہ تعالےٰ ہی کی قدرت میں ہے ملاحدہ وزنادقہ کی زبان کب بند ہو سکی؟ کیا اس دور میں امام حسینؓ کی شہادت کو افسانہ نہیں بتایا گیا اور کہا گیا کہ یہ واقعہ ہے ہی نہیں؟ اور کیا امام حسینؓ کو باغی اور واجب القتل اور یزید (بن معاویہؓ) کو امیر المؤمنین اور خلیفہ برحق ثابت نہیں کیا گیا؟ کسی صحیح حدیث کو ضعیف بنانے کے لئے کسی راوی کے بارے میں کتبِ رجال میں جرح کا کوئی کلمہ دیکھ لینا بس کافی ہے کہ اس پر بنیاد قائم کی جائے؟ اگر عقلِ سلیم سے کام نہ لیا جائے اور صرف کسی کتاب میں جرح کو دیکھا تو امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ ہتمام کے تمام ائمہ مجروح ہو کر دین کا سرمایہ ختم ہی ہو جائے گا۔

الغرض حیاتِ انبیاء کرام علیہم السلام کا مسئلہ بھی تقریباً اسی قسم کی کج بحثوں میں الجھ کر اچھے

خاصا فتنہ بن گیا، عصمت تو انبیاءِ کرام کا خاصہ ہے، علماء معصوم تو ہیں نہیں لے، کچھ حضرات نے دانستہ یا نادانستہ حدیثی و کلامی بحثیں پیدا کر دیں اور سمجھا یہ گیا یا سمجھایا گیا کہ اس طرح توسل بالاموات اور استعانت بغیر اللہ وغیرہ وغیرہ بہت سی بدعات کا خاتمہ ہو جائے گا، گویا علاج یہ تجویز کیا گیا کہ حیاتِ انبیاءؑ سے انکار کرنے ہی سے یہ مفاسد ختم ہو سکتے ہیں، اس کی مثال تو ایسی ہوئی کہ بارش سے بچنے کے لئے پرنالے کے نیچے جا کر بیٹھ گئے، بہرحال ان تفصیلات میں جانے کی حاجت نہیں، خلفشار کو ختم کرنے کے لئے اربابِ فکر و خلوص نے چند حضرات کے نام تجویز کئے کہ اس اختلاف کو جس نے فتنہ کی شکل اختیار کر لی ہے ختم کرنے کی کوشش کریں، راقم الحروف کا نام بھی انہیں میں شامل تھا، تجویز یہ ہوئی کہ اس موضوع پر ایک محققانہ کتاب مؤثر انداز میں لکھی جائے اور تشکیک پیدا کرنے والے حضرات کے شبہات کا جواب بھی دیا جائے اور مسئلہ کے تمام گوشوں پر سیر حاصل تبصرہ بھی کیا جائے، باتفاقِ رائے اس کام کی انجام دہی کے لئے جناب برادر گرامی مآثر مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز صاحب منتخب ہو گئے، جن کے دماغ میں بحث و تمحیص کی صلاحیت بھی ہے اور قلم میں پختگی بھی، علومِ دینیہ اور حدیث و رجال سے اچھی اور قابلِ قدر مناسبت بلکہ عمدہ بصیرت بھی ہے، مختلف مظان سے عزرِ نقول جمع کرنے کی پوری قدرت بھی ہے اور حسنِ ترتیب کی پوری اہلیت بھی، الحمد للہ کہ برادرِ موصوف نے توقع سے زیادہ مواد جمع کر کے تمام گوشوں کو خوب واضح کر دیا اور تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے، میرے ناقص خیال میں اب یہ تالیف اس مسئلہ میں جامع ترین تصنیف ہے اور اس دور میں جتنی تصانیف اس مسئلہ پر لکھی گئی ہیں ان سب میں جامع، واضح، عالمانہ بلکہ محققانہ ہے، اللہ تعالیٰ موصوف کی اس خدمت کو قبول سے نوازے اور اس قسم کی مزید خدمات کی توفیق عطا فرمائے۔

عرصہ ہوا کہ میرے رفیقِ محترم جناب مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری، جن کو حضرت

لے یہاں یہ تنبیہ ضروری ہے کہ بدلائل شرعیہ امت من حیث المجموع خطاء سے محفوظ ہے یعنی شرعاً یہ ناممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ مرحومہ سب کی سب کسی مسئلہ میں معاذ اللہ۔ غلطی پر متفق ہو جائے ہمارے یہاں کے ملاحدہ نے "عصمت انبیاء کرام کا خاصہ ہے" کے نعرہ کو کلمۃ حق اُرید بہ الباطل کے طور پر دین کے قطعی متواتر اور اجماعی مسائل کے ابطال بلکہ پورے دین ہی کو "عجمی سازش" قرار دینے کے لئے ڈھال بنا لیا۔ مدیر

امام العصر مولانا محمد انور شاہ رحمہ اللہ سے نہ صرف شرفِ تلمذ حاصل ہے بلکہ فرزندِ نسبتی ہونے کا شرف بھی حاصل ہے جن کے قلم سے صحیح بخاری کی محققانہ اردو شرحِ انوار الباری وجود میں آ رہی ہے اور اب سے اکتیس بتیس سال قبل مصر و استنبول کے علمی سفر میں میرے رفیقِ طریق رہے ہیں، ان کے ایک خط کے جواب میں ۱۳۷۹ھ میں، میں نے اس موضوع پر قلم برداشتہ نہایت عجلت میں جو کچھ لکھا تھا نامناسب نہ ہوگا کہ یہاں اس خط کا کچھ اقتباس نقل کر دیا جائے تاکہ اس مسئلہ میں میری قدیم ذاتی رائے بھی معلوم ہو جائے، اگرچہ وہ مجمل اشارات ہیں اور مخاطب ایک عالم تھے، تفصیل کی حاجت نہیں تھی لیکن اس موضوع پر ایک جامع اور منقح فیصلہ کی حیثیت سے ایک متن ہے، تشریح جتنی چاہے کر لیجئے، واللہ المستعان۔

محولہ بالا طویل مکتوب کے چند اقتباسات

(۱) شہدائے کے لئے بنصِ قرآن "حیات" حاصل ہے اور مزید دفع تجویز کے لئے "یرزقون" کا ذکر بھی کیا گیا ہے جیسے آج کل محاورہ بھی ہے "فلان حیّ یرزق" عام اہلِ برزخ سے ان کی حیات ممتاز ہے۔

(۲) جب انبیاء کا درجہ عام شہدائے سے اعلیٰ و ارفع ہے تو بدلالۃ النص یا بالاولیٰ خود قرآنِ کریم سے ان کی حیات ثابت ہوئی علیہم الصلوات والتسلیمات اور جب مرتبہ اعلیٰ و ارفع ہے تو حیات بھی اقویٰ و اکمل ہوگی۔

(۳) اس حیات کی اکملیت کے بارے میں دو حدیثیں آئی ہیں (۱) إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَى الْأَرْضِ أَنْ تَأْكُلَ أَجْسَادَ الْأَنْبِيَاءِ» اور حدیث «الْأَنْبِيَاءُ أَحْيَاءٌ فِي قُبُورِهِمْ يُصَلُّونَ» اور اس کے علاوہ بھی روایات ہیں) اور ان احادیث کے شواہد کے طور پر دیگر احادیث صحیح موجود ہیں، مثلاً موسیٰ علیہ السلام کا تلبیۂ حج۔

(۴) روح کے تعلقات اجساد سے پانچ قسم کے ہیں۔ فی حالۃ الجنین۔ بعد الولادۃ فی الدنیا اور اس کی دو صورتیں ہیں حالتِ نوم میں اور حالتِ یقظہ میں، بعد الموت فی البرزخ، بعد البعث فی الحشر، ضعیف ترین اول و رابع ہے، قوی ترین خامس اور متوسط دنیوی

ہے کما حققہ المتکلمون و ابن القیم فی کتاب الروح والقاری فی شرح الفقہ الاکبر۔

(۵) انبیاء کرام علیہم السلام کی نوم جیسے ممتاز ہے عام نوم سے ((اِنَّ عَینَایَ تَنَامَانِ وَلَا یَنَامُ قَلبِی)) اسی طرح ان کی موت کی حالت بھی عام اموات جیسی نہیں، اَلنَّومُ اَخُ الموت اور عام موتیٰ میں تحقیق موت سے۔ انقطاع الروح عن الجسد بالکلیہ ہوتا ہے اور یہاں بالکلیہ نہیں ہوتا اور پھر علوِ مرتبہ جتنا ہوتا ہے اتنا ہی تعلق قوی ہوگا۔

(۶) مفارقۃ الروح عن الجسد سے مفارقۃ تعلق الروح عن الجسد لازم نہیں آتا۔

(۷) اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ مبارک کو تروُّح کی کیفیت حاصل ہو جیسے معراج میں جسد پر روح کی کیفیت طاری ہوئی، تجسُّد ارواح اور تروُّح اجساد دونوں کی نظریں عالمِ شہادۃ میں ہیں تو عالمِ ارواح میں کیوں استبعاد کیا جائے جبکہ اس کا تعلق عالمِ غیب سے ہے۔

(۸) دنیا میں صوفیاءِ کرام کے یہاں ابدانِ مثالیہ کا تعدد وقت واحد میں، متعدد اَمکنہ میں ظہور اور آثار کے ثبوت پر مشہور واقعات ہیں انبیاءِ کرام کی نقل وحرکت مع الاجساد المتروحہ اس کی نظیر ہوگی۔

(۹) الغرض انبیاءِ کرام کے لئے حیاۃ، بقائے اجساد، نقل وحرکت، ادراک وعلم سب چیزیں حاصل ہیں۔

(۱۰) یہ حیات، دنیوی حیات کے مماثل بلکہ اس سے اقویٰ ہے دنیا میں ہمیشہ جسد کو روح کی خاصیت حاصل نہیں ہوتی اور برزخ میں ہوتی ہے اب اگر اس کو حیاتِ دنیوی سے بعض حضرات نے تعبیر کیا ہے تو اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کیا ہے، بہر حال وہ حیاۃِ دنیوی بھی ہے اور حیاۃِ برزخی بھی، صرف حیاتِ برزخی نہیں جس میں عام شہداء یا اموات بھی شریک ہوں بلکہ اقوی واکمل ہے اس لئے حیاتِ دنیوی کے مماثل ہے بلکہ اس سے بھی اقویٰ ہے۔

اختلاف تعبیرات میں نزاعِ لفظی ہے اس دنیا سے رسمی تعلق منقطع ہونے کے بعد برزخی دور شروع ہوتا ہے اب جو چاہے اطلاق کیا جائے۔

(۱۱) اگر احادیث ونصوص میں حیات کا ثبوت ہے اور پھر عدم نکاح بالازواج المطہرات اور عدم توریث وغیرہ کی علت اصلِ حیات کو کہا جائے تو درست ہے بہر حال حکمِ شرعی کی کوئی علت ہی ہوتی ہے اور یہاں تو علت از قبیل العلل المعتبرۃ کے ہوگی نہ کہ عللِ مرسلہ کی قسم سے اور اس علت کی تنقیح، اصولی تنقیح المناط اور تحقیق المناط سے زیادہ قطعی ہوگی۔

واللہ أعلم بالصواب

شعبان المعظم ۱۳۸۸ھ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جذبۂ ایمانی

آفتابِ نبوت کے غروب ہوتے ہی ایمانی روشنی میں اضمحلال وضعف رونما ہونا شروع ہو گیا تھا، عہدِ نبوت میں ایمان ویقین کی جو تابانی وشدت تھی وہ روز بروز زوال پذیر ہوتی رہی، حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مقدسہ میں صحابہ کی جو ایمانی کیفیت تھی وصال کے بعد اس میں اضمحلال شروع ہوا بلکہ حیاتِ مقدسہ میں حضور وغیبت کا فرق تھا، صحابی رسول حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کا مشہور واقعہ "صحیح مسلم" وغیرہ میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ کہیں جا رہے تھے راستہ میں حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ ملے، پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ جواب دیا کہ: کیا پوچھتے ہو، حنظلہ تو منافق ہو گیا، صدیق اکبر فرمانے لگے سبحان اللہ! خیر تو ہے کیا کہتے ہو؟ جواب دیا کہ ہم جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ہوتے ہیں آپ جب جنت دوزخ کا تذکرہ فرماتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، لیکن گھر آکر دنیا کے دھندوں میں مشغول ہو کر اور بیوی بچوں میں مصروف ہو کر یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے، حضرت صدیق یہ سن کر فرمانے لگے کہ: اگر یہ نفاق ہے تو پھر میں بھی اس میں مبتلا ہوں دونوں بارگاہِ نبوت میں پہنچے حنظلہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں تو منافق ہو گیا، آپ نے فرمایا: کیا بات ہے حضرت حنظلہ نے صورتِ حال بیان کی سننے کے بعد آپ نے فرمایا:

«والذی نفسی بیدہ إنکم لو تدومون علی ما تکونون عندی وفی الذکر لصافحتکم الملائکۃ علی فرشکم وفی طرقکم ولکن یا حنظلۃ ساعۃٌ فساعۃٌ»

(اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تمہاری یہ حالت جو میری مجلس میں ہوتی ہے یا ذکر اللہ کی حالت میں ہوتی ہے ہر وقت باقی رہتی تو تم اتنے اونچے ہوتے کہ فرشتے تم سے تمہارے گھروں اور راستوں میں مصافحہ کرتے اور ملتے لیکن اے حنظلہ یہ کیفیت کبھی کبھی ہوتی ہے ہمیشہ باقی نہیں رہتی)

اس واقعہ سے یہ بات واضح ہے کہ آپ کی حیاتِ مبارکہ میں حاضری اور غیر حاضری کا فرق نمایاں تھا، ایمان ویقین کی کیفیات کے اندر تفاوت رہتا تھا، پھر حضرت رسالت پناہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی وفات کے بعد تو ظاہر ہے کہ یہ تفاوت بہت نمایاں ہو گیا، جامع ترمذی و سنن ابن ماجہ میں انس بن مالکؓ صحابی رسول سے مروی ہے :

((لما كان اليوم الذى قدم فيه رسول الله صلى الله عليه وسلم المدينة أضاء منها كل شئ فلما كان اليوم الذى مات فيه أظلم منها كل شئ قال: وما نفضنا عن رسول الله صلى الله عليه وسلم الأيدى حتى أنكرنا قلوبنا))	جس دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو یہاں کی ہر چیز روشن ہو گئی لیکن جس دن آپ کی وفات ہوئی تو مدینہ کی ہر چیز تاریک ہو گئی اور فرمایا : ہم نے آپ کو دفن کر کے ابھی مٹی سے ہاتھ بھی نہیں جھاڑے تھے کہ اپنے دلوں میں فرق محسوس کرنے لگے ۔

اسی قسم کا مضمون "تاریخ ابنِ کثیر" میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے "سننِ ابنِ ماجہ" میں حضرت اُبیؓ بن کعب سے ایک حدیث اور اُم المومنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے ایک اور حدیث مروی ہے جن کا حاصل یہ ہے :

عہدِ نبوت میں نماز ایسے خشوع سے ہوتی تھی کہ نمازی کی نگاہ قدموں سے آگے متجاوز نہیں ہوتی تھی ۔

عہدِ صدیقی میں اس قدر فرق ہو گیا کہ نگاہ قدموں سے آگے بڑھ کر سجدہ کی جگہ سے آگے نہیں بڑھتی تھی ۔

عہدِ فاروقی میں قبلہ کے رُخ سے نگاہ ہٹ کر دائیں بائیں نہیں جاتی تھی لیکن جب عہدِ عثمانی آیا اور فتنوں کا دور شروع ہوا تو نمازی کی نگاہ دائیں بائیں جانے لگی ۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا محاسبۂ نفس

سبحان اللہ کیا ٹھکانا! صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی ذکاوتِ حس اور اس دقیق محاسبہ کا کہ کس طرح اپنی عبادات کا جائزہ لیتے تھے اور اپنے قلوب کی کیفیات اور اعمال کا کیسا محاسبہ کرتے تھے، ٹھیک جس طرح ہم آج اپنی معمولی سی جسمانی کیفیت کے فرق کو محسوس کرتے ہیں اور اس کی تدبیر میں لگ جاتے ہیں اسی طرح حضرات صحابہ کرام روح و قلب کے تغیرات

کا جائزہ لیا کرتے تھے اور اس کی فکر کرتے تھے اور اصلاحِ حال کی تدابیر اختیار فرماتے تھے۔

"صحیح بخاری" میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک کے بعد ہر چیز میں تغیر آگیا کوئی چیز بھی اپنی حالت پر باقی نہیں رہی بجز نماز اور پھر فرمایا:

((وھذہ الصلاۃ قد ضیعت)) اور یہ نماز بھی ضائع ہوگئی

مطلب یہ کہ نماز بھی ایسی نہیں رہی، حقوق و آداب خشوع و خضوع سے جس طرح پہلے ہوتی تھی وہ بات اب نہیں رہی۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ اپنے زمانہ کے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

((واللہ لقد أدرکت سبعین بدریًا اکثر لباسھم الصوف ولو رأیتموھم قلتم مجانین، ولو رأوا اخیارکم لقالوا مالھؤلاء من خلاق، ولو رأوا اشرارکم لقالوا ما یؤمن ھؤلاء بیوم الحساب))

(حلیۃ الاولیاء ج ۲ ص ۱۳۴)

بخدا میں نے ستر بدری صحابہ کو دیکھا جن کا زیادہ تر لباس صوف ہوتا تھا اور وہ صحابہ ایسے تھے کہ تم اگر ان کو دیکھتے تو تم ان کو دیوانہ کہتے اور اگر وہ تمہارے بہترین لوگوں کو دیکھتے تو کہہ دیتے کہ ان لوگوں کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور اگر وہ تمہارے بُرے لوگوں کو دیکھتے تو فرما دیتے کہ یہ لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں۔

اس کا حاصل یہی ہے کہ صحابہ اور بالخصوص بدری صحابہ آخرت کے کاموں اور اللہ و رسول کی مرضیات میں ایسے منہمک تھے جس کی وجہ سے ان کو نہ اپنی جان کی فکر تھی، نہ اپنی اولاد کی، نہ دنیا کے عیش و آرام کا خیال بہر حال ایسے لوگوں کو دیکھ کر یہی کہا جائے گا کہ یہ تو دیوانے ہیں اور تمہارے صلحاء اور بہترین اشخاص بھی اپنی جان اپنی اولاد کی فکر کو مقصود بنائے ہوئے ہیں اس لئے ان کو دیکھ کر بھی کہا جائے گا کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے اور تمہارے شریر اور بدکار لوگوں کو دیکھ کر کہا جائے گا کہ یہ لوگ آخرت پر ایمان و یقین نہیں رکھتے۔

حسن بصری تابعی ہیں ۱۱۰ھ میں ان کی وفات ہوئی اور آج ان کی وفات کو ۱۲۷۰برس گذر گئے۔ خیر القرون کے آدمی ہیں جس کی فضیلت زبانِ نبوت سے ثابت ہے حسن بصری آج اگر زندہ ہو جائیں اور ہماری حالت دیکھیں تو سوچئے کیا فتویٰ دیں گے۔

ان حقائق سے آپ اندازہ لگائیں کہ صحابۂ کرام کے یقین و ایمان کا کیا حال تھا اگر عہدِ تابعین میں صحابہ کرام کی قوتِ ایمانی کا اندازہ لگانا مشکل تھا تو آج کیونکر ممکن ہے کہ ہم اس کا اندازہ لگا سکیں جو جنس مارکیٹ میں ہی نہ ہو اس کے حسن و خوبی کا اندازہ کیسے لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن المبارک رحمہ اللہ سے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ افضل ہیں یا عمر بن عبد العزیز؟ آپ نے فرمایا:۔

وہ جہاد جس میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ امیر معاویہ شریک تھے اس جہاد کے غبار کا وہ حصہ جو امیر معاویہ کے گھوڑے کی ناک میں گیا ہے وہ بھی ابن عبد العزیز سے بہتر ہے۔

یہ کوئی شاعری نہیں ہے، ابن المبارک اِمتِ محمدیہ کے فقیہ و محدث امام ہیں حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے کبارِ تلامذہ میں سے ہیں ابن المبارک رحمہ اللہ کے اس فتویٰ کو شیخ ابن حجر ہیتمی نے "تطہیر الجنان" میں نقل کیا ہے۔

صحابہ کرام کمالِ ایمان و کمالِ تقویٰ پر فائز تھے

صحابہ کرام کی فضیلت فوق العادہ ہے جس سے ان نفوسِ قدسیہ کی قوتِ ایمانی اور قرب عند اللہ کا اندازہ ہوتا ہے، یہ حضرات کمالِ ایمان و کمالِ تقویٰ پر فائز تھے جس کا نام قرآنِ کریم میں "ولایت" ہے، ارشاد ہے:۔

((اُلا اِن اُولیاءَ اللّٰہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون الذین آمنوا وکانوا یتقون))	سنو اللہ تعالیٰ کے اولیاء جن پر قیامت کے دن نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے وہ لوگ ہیں جو کامل طور پر ایمان لائے اور جنہوں نے کمالِ تقویٰ اختیار کیا۔

ایمان کے بعد مدارِ قرب و کرامت عند اللہ تقویٰ ہے جو حضرات سراپا تقویٰ بن جاتے ہیں ان کی صحبتیں ان کی مجلسیں ان کی ملاقات اصلاحِ حال میں عجیب تاثیر رکھتی ہے یہی ہیں وہ پاک باز

نفوس جن کی صحبت سے دل و دماغ پر ایسے نقوش مرتسم ہو جاتے ہیں جو تنہا عبادت و ریاضت سے سالہا سال میں ممکن نہیں اسی کو کہا گیا ہے :-

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء — بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

حدیثِ نبوی میں ولی اللہ کی ایک واضح علامت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ ان کے دیکھنے سے اللہ تعالیٰ یاد آجاتا ہے، فرمایا گیا :

وخیار عباد اللہ إذا رُءوا ذکر اللہ .	اللہ تعالیٰ کے بہترین بندے وہ ہیں کہ جب ان کو دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ یاد آجائے۔

تاریخ ابن کثیر میں حضرت حسن بصری کے بارے میں امام یونس بن عبید سے منقول ہے :

کان الرجل إذا نظر إلی الحسن انتفع بہ وإن لم یر عملہ ولم یسمع کلامہ	حضرت حسن بصری کو صرف دیکھنے سے نفع ہوتا تھا اگرچہ ان کا عمل دیکھا نہ جائے اور نہ ان کی گفتگو سنی جائے۔

یہی وہ جلیس صالح ہے جس کی مثال حدیث میں ((کحامل المسک)) بیان کی گئی ہے یعنی صالح ہم نشین کی صحبت سے ایسا فائدہ ہوتا ہے جیسے مُشک اٹھانے والے کو مُشک سے، صحبت کی یہی تاثیر ہے جس کی وجہ سے سلاسلِ صوفیہ میں سے سلسلۂ نقشبندیہ میں صحبتِ شیخ پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انفاسِ قدسیہ جذب کرنے کا یہ متوارث سلسلہ ہے اسی لئے شیخ سے عقیدت، ربط و محبت ضروری ہے اگر شیخ باکمال ہے اور مرید کا یہ حال ہے تو غیر شعوری طور پر خود بخود محب جاں نثار اپنے محبوب کا نمونہ ہوگا اور جتنی محبت اور صلاحیت ہو گی اس کے مطابق یہ نقشہ تیار ہو گا، بعض عشاق منازلِ عشق منٹوں میں طے کر لیتے ہیں جب کہ دوسرے سالہا سال میں اس سے محروم رہتے ہیں۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ عشق و محبت، پاکیزگی کی یہ داستانیں اب کہاں تلاش کی جائیں معرفت و قربِ الٰہی کے یہ خُم خانے کہاں سے لائے جائیں، یہ گلستان اب خزاں کی زد میں آ چکا ہے اور اس گلشن کی ویرانی آنکھوں کے سامنے ہے، مشامِ دماغ کو معطر کرنے کے لئے

معرفت کے پھولوں کی مہک کہاں سے لائی جائے۔

مادیت کے اس دور میں بے حیائی و فواحش و منکرات کے زمانے میں یہ افسانے پارینہ نہیں تو کیا ہیں، حاصلِ کلام یہ ہے کہ جس طرح مادر زاد نابینا سیاہ و سفید میں فرق نہیں کر سکتا اسی طرح مادیت کے دور میں اس کا امکان نہیں ہے کہ عہدِ نبوت و عہدِ صحابہ اور قرون مشہود لھا بالخیر کی ایمانی کیفیت کا اندازہ لگایا جائے۔

میں تو یہ کہتا ہوں کہ جن دو چار ہستیوں کو ہم نے دیکھا ہے اور پایا ہے آج ان کے ایمانی ملکات اور اپنے رب سے تعلق کی نظیر کہیں نہیں ملتی اور ان حضرات کا اپنے بزرگوں کے بارے میں یہی نظریہ تھا یہ تنزل عہدِ نبوت سے شروع ہو چکا ہے اور چودہ سو سال سے جاری ہے چونکہ اس دین کی حفاظت اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اس لئے اس تنزل کے باوجود دین سے تعلق رکھنے والے موجود ہیں اور دین کے مختلف گوشوں میں کام ہو رہا ہے بس اغنیمت ہیں وہ حضرات کہ مادیت کے اس تاریک دور میں بھی ذکر اللہ اور تعلق مع اللہ سے گلشنِ معرفت کی آبادی میں لگے ہوئے ہیں لیکن افسوس کہ یہ بقایا صالحین سرعت سے آخرت کی طرف جا رہے ہیں۔ شوال ۱۳۸۷ھ

اصحابِ صفہ

تاریخ اسلام کے سنہرے باب کے چند تعلیمی اوراق ہیں جن کا سر ورق اصحابِ صفہ سے شروع ہوتا ہے، درحقیقت یہ باب :-

«ویعلمھم الکتاب والحکمۃ» اور وہ (نبی) ان کو کتاب (قرآن) اور حکمت (سنت) کی تعلیم دیتے ہیں اور
«وإنما بعثت معلماً» اسکے سوا نہیں کہ مجھے تو بھیجا گیا ہے (دین) سکھلانے کے لئے۔

کی عملی تفسیر ہے، مدینہ طیبہ میں مسجد نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے شمالی مشرقی جانب ایک سائبان کے سایہ میں چند نفوسِ قدسیہ تعلیم و تربیت پا رہے تھے، ان نفوسِ قدسیہ نے اپنی زندگی حصولِ علم ہی کے لئے وقف کر دی تھی، ان میں چند نفوس ایسے بھی تھے کہ کبھی کبھی دن کے کسی حصہ میں جنگل سے لکڑی لاکر فروخت کرتے اور گذر بسر کیا کرتے تھے، ان کے احوال و تعداد میں قدماء محدثین نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، جن میں امام حدیث ابونعیم اصبہانی اور امام حدیث ابوعبداللہ حاکم اور ابن الاعرابی اور سلمی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، ان کی تعداد مختلف اوقات میں کل ملا کر چار سو تک پہنچتی ہے ویسے تو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی تعلیمی ہی تھی اور امتِ محمدیہ میں صحابۂ کرام ہی سب سے پہلے متعلم و شاگرد تھے لیکن اسی تحصیلِ علم کے ساتھ ساتھ اکثر و بیشتر حضرات کے تجارت و زراعت وغیرہ کے مشاغل بھی تھے، حضرت عمر فاروقؓ جیسی اہم شخصیت کا ایک دور ایسا بھی گذرا کہ مدینہ سے باہر عوالی مدینہ میں ان کا قیام تھا اور بعدِ مسافت کے علاوہ معاشی مشغولیت کی وجہ سے روزانہ بارگاہِ نبوت کی حاضری سے معذور تھے لیکن آپ نے اپنے ایک انصاری پڑوسی (غالباً ان کا نام اوس بن خولی ہے) کے ساتھ یہ انتظام کیا ہوا تھا اور باری مقرر کر رکھی تھی کہ ایک دن وہ بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوا کریں اور جو وحیِ نبوت (قرآن کریم کی آیت) جدید اتری ہو یا کوئی اہم حدیث آپ بیان فرمائیں تو وہ رات کو عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو سنا دیا کریں اور ایک دن حضرت عمرؓ یہی خدمت انجام دیا کریں جس کی تفصیل صحیح بخاری میں موجود ہے، الغرض صحابہ کرامؓ جو روزانہ حاضری نہیں دے سکتے تھے وہ بھی حصولِ علم کے لئے پورا اہتمام و انتظام فرماتے تھے۔

لیکن کچھ حضرات ایسے بھی تھے جن کی شب و روز کی زندگی، اسی حصولِ علم کے لئے وقف تھی، اہل و عیال سے آزاد نہ تجارت سے غرض نہ زراعت سے مطلب نہ اپنی معاش کی فکر نہ اہل و عیال کی، یہ وہ اصحابِ صفہ

کی نفوسِ قدسیہ ہیں جن کی تعداد ایک ایک وقت میں ستر ستر تک بھی پہنچ جاتی تھی، انہی نفوسِ قدسیہ سے ہیں ستر وہ شہداءِ بیرِ معونہ" ہیں جن کو کفار کے چند قبائل بنی لحیان ورعل وذکوان وغیرہ نے جو تعلیمِ دین اور تبلیغِ اسلام کی غرض سے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معلم ومبلغ طلب کرنے آئے تھے اور آپ نے ان قراء کو اس دینی خدمت کے لئے بھیجا تھا، ان بدظن قبائل نے ان کو لے جا کر شہید کر ڈالا تھا، جس پر آپ کو شدید صدمہ ہوا تھا اور نمازِ فجر میں آپ نے دعاءِ قنوتِ نازلہ پڑھنی شروع فرمادی تھی،

انہی نفوسِ قدسیہ میں سے اس واقعۂ شہادت کے بعد ستر ایسے صحابہ بھی تھے جن کے متعلق حضرت ابوہریرہؓ کا یہ بیان "صحیح بخاری" میں قابلِ عبرت وبصیرت ہے:۔

رأیت سبعین من أصحاب الصُفّة، مامنهم رجل علیه رداء، إما إزار وإما کساء قد ربطوا فی أعناقهم، فمنها ما یبلغ نصف الساقین ومنها ما یبلغ الکعبین فیجمعه بیده کراهیة أن تریٰ عورته.

"صحیح البخاری (باب نوم الرجال فی المسجد)

میں نے ستر ایسے اصحابِ صفہ کو دیکھا ہے جن میں سے کسی کے پاس (اوپر اوڑھنے کے لئے) چادر نہ تھی یا ان کے پاس صرف لنگی تھی یا بدن ڈھانپنے کے لئے ایک کمبلی جس کو انہوں نے گردن سے (نیچے تک) باندھا ہوا ہوتا کوئی کملی تو ٹخنوں تک پہنچ جاتی کوئی پنڈلیوں تک ہی پہنچتی، (رکوع سجدہ کے وقت) اس کو ہاتھ سے سنبھالے رہتے کہ (جسم کا) پوشیدہ حصہ نہ کھل جائے۔

انہی نفوسِ قدسیہ میں سے خود حضرت ابوہریرہ بھی تھے جن پر بعض اوقات بھوک سے غشی کے دورے پڑا کرتے اور مسجد نبوی کے اندر منبرِ نبوی اور بیت الرسول کے درمیان روضہ میں بے ہوش پڑے ہوتے اور عام حضرات کا گمان ہوتا کہ ان پر مرگی کا دورہ پڑا ہے حالانکہ صرف بھوک کی شدت اور فاقوں کی کثرت سے ان پر اس قسم کی حالت طاری ہوتی تھی خود انہی کے زبان سے صحیح بخاری میں یہ ساری تفصیل مذکور ہے، آخر اس جفاکشی اور اس اندازِ طالبِ علمی کے جو حیرت انگیز نتائج ہونے چاہئیں تھے وہ امت کے سامنے آئے خود انہی کے زبان سے "صحیح بخاری" میں مروی ہے:۔

صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاث سنین فلم أکن فی سنی أحرص

میں تین سال تک (ہمہ وقت)، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا میں نے اپنی عمر میں اپنے سے زیادہ حدیثوں کو

علی اُن اُعی الحدیث منی ۔ یاد کرنے کا حریص و سرگرم شائق، اور کسی کو نہیں دیکھا ۔

اتنے مختصر عہد میں جو روایتیں مدوّنینِ کتبِ حدیث کو ان سے پہنچی ہیں ان کی تعداد ۵۳۷۴ ہے نہ معلوم

اور کتنی روایتیں ہوں گی جو مدوّنین کتب حدیث تک ان کے معیار کے مطابق نہ پہنچ سکیں جو یقیناً

اس قدسی صحبت اور اس فنافی العلم کے جذبہ کی برکات تھیں، چنانچہ پورے آٹھ سو صحابہ و تابعین کو ان سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا اور دین کا بہت بڑا حصہ تنہا اُنہی کی روایات سے امت کو پہنچا، یہی وجہ ہے کہ یورپ کے مستشرقین اور منکرینِ حدیث مستغربین اور ان کے علاوہ اعداءِ اسلام کا سارا زور حضرت ابوہریرہ پر طعن و تشنیع اور عیب چینی پر صرف ہو رہا ہے، کہنا یہ ہے کہ آخر وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر ان اصحابِ صفہ کے فقر و افلاس کی حالت کو برداشت کیا گیا؟ اور ان کو فکرِ معاش کی طرف کیوں متوجہ نہیں کیا گیا؟ کیوں ان کو زراعت یا صنعت و حرفت کی طرف رغبت نہیں دلائی گئی اور کیوں ان کے پیٹ بھرنے یا سدِّ رمق کے لئے زکاۃ و صدقات کا انتظار کیا جاتا؟ اور جب انتہائی مجبوری کی نوبت آجاتی اور فاقوں پر فاقے پڑنے لگتے تو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر ایک صحابی کو اربابِ صفہ میں سے ایک ایک نفر کو کھانا کھلانے کے لئے اپنے گھر لے جانے کا ارشاد فرماتے اور خود بھی دس دس افراد کو اپنے ہمراہ لے جایا کرتے تھے، اس لئے کہ ازواجِ مطہرات کی تعداد ۹ تھی اور دسویں آپ تھے، اس لحاظ سے گویا طعام الواحد یکفی الاثنین کے اصول پر جو حدیثِ مرفوع میں مذکور ہے خود بیوت نبی علیہ الصلاۃ والسلام میں عمل ہوتا تھا یہ تو احادیثِ نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کے شواہد و بینات ہیں اب ذرا قرآن کریم کا ارشاد بھی سنیئے:

«الذین أُحصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضرباً فی الأرض یحسبھم الجاھل أغنیاء من التعفف تعرفھم بسیماھم لا یسألون الناس إلحافاً» (بقرہ)

وہ حاجت مند (تمہاری امداد و اعانت کے مستحق ہیں) جو اللہ کی راہ میں (کسبِ معاش سے) روک دیئے گئے ہیں وہ روزی حاصل کرنے کے لئے روئے زمین میں (کہیں) جا نہیں سکتے، ناواقف آدمی تو ان کے (سوال کرنے سے) بچنے کی وجہ سے ان کو مالدار گمان کرتے ہیں (لیکن) تم ان کے فقر و افلاس کو ان کے چہرہ بشرہ سے پہچان سکتے ہو، وہ لوگوں سے سوال ہی نہیں کرتے کہ پیچھے پڑیں اور اصرار کریں۔

مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیت کریمہ انہی نفوسِ قدسیہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن کی زندگی کا مقصدِ وحید صرف تعلیم دین اور جہاد تھا۔

ٹھنڈے دل سے غور کرنے کا مقام ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اس صورت حال کو قائم رکھا بلکہ اس کی تعریف و توصیف وحی متلو میں بھی فرمائی، کیا یہ واضح وصاف دلیل اس کی نہیں ہے کہ امت میں کچھ افراد ایسے ہونے چاہئیں جن کی حیات طیبہ کلی طور پر علم و دین کے لئے وقف ہو چکی ہو، اس مقدس مشغلہ کے علاوہ ان کا اور کوئی مشغلہ ہی نہ ہو، اب رہا یہ سوال کہ وہ کھائیں گے کہاں سے اور ضروریاتِ معاش پوری کیسے کریں گے؟ تو قرآنِ حکیم کی تعلیمات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل میں اس کا واضح جواب صرف یہی ملتا ہے کہ ان کی ضرورت کا تکفل اور خبر گیری امتِ محمدیہ کے ذمہ فرض ہے وہ اپنے صدقات وخیرات اور زکاۃ سے ان کی خدمت کرے گی، اسی لئے علم دین میں مہارت وخصوصیت فرضِ کفایہ ہے فرضِ عین نہیں کہ ہر شخص کے بس کا یہ کام نہیں، اس کے بعد قابلِ غور یہ ہے کہ علمِ دین حاصل کرنے کے دو مقصد ہیں:۔

علمِ دین حاصل کرنے کا مقصد

۱۔ خود اپنی تکمیل یعنی صاحبِ کمال بننا اپنی دینی زندگی کو صلاح وتقویٰ سے آراستہ کرنا تاکہ فلاح و سعادتِ دارین سے خود بہرہ ور ہو سکے۔

۲۔ دوسروں کی خدمت کرنا اور ان کو سعادت دارین سے ہمکنار کرنا۔

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اگر کوئی عالمِ دین اپنی اور اپنے متعلقین کی ضروریاتِ زندگی کے لئے محتاجِ کسب معاش ہے تو اسے معاش کے ذرائع اور صحیح وسائل اختیار کرنے میں کوئی عار نہیں ہونا چاہیئے، کیا اسلام کے انتہائی مجد وعروج کے دور میں کبارِ امت نے معاشی ذرائع اختیار نہیں کئے؟ تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

علماء کے مناصب اب رہا یہ کہ علماءِ دین کے وہ مناصب کیا ہیں جن کے ذریعہ وہ مسلمانوں کی دینی خدمت انجام دے سکیں؟ اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے وہ کون سے شعبے ہیں جو ان کے سپرد ہونے چاہئیں؟ اس سوال کا جواب بالکل صاف ہے کہ اسلام کے عروج کے دور میں انہی علماء میں سے حسبِ اہلیت علماء خلافت، حکومت، احتساب، قضاء، افتاء، خطابت، تبلیغِ دین، درس وتدریس، تصنیف و تالیف وغیرہ وغیرہ مناصب پر فائز تھے جبکہ علومِ اسلامیہ میں دین و دنیا کی تفریق نہ تھی اور "رجالِ دین"

"در حال دنیا" کے درمیان کچھ زیادہ وسیع خلیج حائل نہ تھی اور نہ کوئی بنیادی تفاوت موجود تھا، دنیا کے تمام کام دین کی تعلیمات کی روشنی میں انجام پاتے تھے، لیکن اس دور میں بھی اگر مسلمان اپنے دینِ اسلام سے بالکل بے نیاز اور بے تعلق نہ بنیں تو ان کے بچوں کے لئے تعلیم قرآن، ان کی مساجد کے لئے امام وخطیب و مؤذن، شب و روز کی زندگی میں پیش آنے والے معاملات میں شرعی احکام بتلانے کے لئے مفتیین اور علومِ دینیہ۔ قرآن وحدیث وفقہ۔ کی حفاظت کے لئے معاہدِ دینیہ و مدارسِ اسلامیہ میں تدریس کے مناصب تو اب بھی موجود ہیں، پھر علماء کی فکرِ معاش کا بہانہ بنا کر کیوں مدارسِ دینیہ کی مخالفت کی جاتی ہے؟ پاکستان کی دس کروڑ آبادی میں کل علماء وطلباءِ علم کی تعداد پچاس ہزار سے زیادہ نہیں اگر مدارسِ اسلامیہ کی تعداد تقریباً ۲۰۰۰ بھی ہو تو مساجد کی تعداد کم از کم ایک لاکھ ہے، اگر مسلمان اس امر کا عہد کرلیں کہ ہر مسجد کا امام وخطیب باقاعدہ مستند عالم ہوگا تو ان طلبہ وعلماء کی تعداد اس ایک ہی دینی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتی، درسِ قرآن وتعلیم اطفال وتعلیم قرآن حفظ و ناظرہ نیز تدریسِ علوم دینیہ وافتاء یعنی مدرسین ومفتیین مدارسِ اسلامیہ کی ضرورت اس کے علاوہ رہے گی، آخر اس مروجہ دنیوی تعلیم کا مقصد تو یہی ہے تاکہ پیٹ کی پرورش ہو سکے اور حکومت کا دفتری نظام چل سکے لیکن جس کثرت سے لڑکوں اور لڑکیوں کی عصری تعلیم کا ہیضہ ملک میں پھیل رہا ہے کیا اس کی نسبت سے سرکاری عہدے اور منصب اتنے ہیں کہ سب کو جگہ دی جا سکے؟ پھر اس تعلیم کی اتنی مخالفت کیوں نہیں کی جاتی جتنی علومِ دینیہ اور علماءِ دین کی کی جارہی ہے؟ درحقیقت مسئلہ صرف دینی علماء وطلبہ کی معاش کا نہیں ہے بلکہ دنیوی علوم کے فارغ التحصیل طلبہ کی معاش کا مسئلہ اس سے بدرجہا مشکل ہے۔

ایسی صورت میں بڑے افسوس کا مقام ہے کہ جو افراد اللہ اور اس کے رسول علیہ الصلاۃ والسلام کے دین کی حفاظت کر رہے ہیں اور امتِ محمدیہ کے لئے راہِ سعادت ونجات کو محفوظ کر رہے ہیں ان کو تو بیکار اور عضوِ معطل سمجھا جا رہا ہے اور جن افراد کا معاشرہ میں صرف یہی مقام ہے کہ اپنے پیٹ بھرنے کی فکر کریں اور حکومت کی مشنری کو چلائیں ان کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کی جارہی ہے!

فیا للعجب ویا للأسف۔

اصل مشکل کا حل دراصل اگر یہ علماءِ دین کی معاش کا مسئلہ کوئی مشکل ہے اور اس مشکل کو حل کرنا ضروری ہے تو اس کا حل صرف یہ ہے کہ حکومت کی وزارتِ تعلیم میٹرک تک کی تعلیم دینی اور دنیوی مشترک رکھے بلکہ

میٹرک تک کی تعلیم کی بنیاد دینی تعلیم پر ہو اور عربی زبان کی تعلیم و تدریس لازمی و ضروری ہو تاکہ ایک میٹرک پاس طالب علم بھی بقدرِ ضرورت دونوں شعبوں کی خدمات انجام دے سکے، درحقیقت یہ مشکل خود حکومت نے اور اس کے غلط نظامِ تعلیم نے بلکہ برطانوی عہد کے ملعون طریقۂ تعلیم نے پیدا کی ہے اور شومئ قسمت سے آج تک اسی قَی کو ہم چاٹ رہے ہیں، مختصر یہ کہ اس معاملہ میں اگر قصور ہے تو صرف جدید نظامِ تعلیم کا ہے، اگر ابتدائی تعلیم سے لے کر میٹرک تک کی تعلیم میں علمِ دین کا وافر حصہ شامل کر لیا جائے بلکہ زیادہ تر توجہ تعلیمِ دین پر ہی مرکوز ہو اور جدید حصہ پر توجہ ثانوی درجہ میں تو رجالِ دین اور رجالِ دنیا کی تفریق خود بخود ختم ہو جائے گی جس نے اس ملک کے معاشرے پر بہت برا اثر ڈالا ہوا ہے اور تکلیف دہ خلیج حائل ہو گئی ہے، اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون۔

ربیع الثانی ۱۳۸۶ھ اگست ۱۹۶۶ء

اہل اللہ اور کشف والہام

گذشتہ رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ کی غالباً ۱۳ یا ۱۴ تاریخ تھی، تراویح اور وتر سے فارغ ہو کر راقم الحروف بیت اللہ کے سامنے مطاف کے کنارے حطیم کی جانب رکن شامی کی محاذات میں بیٹھا تھا اتنے میں چند احباب ومخلصین بھی آگئے اور ایک بزرگ جو مدینہ کے مہاجر ہیں تیس سال سے حرمین شریفین میں قیام پذیر ہیں بڑی اونچی باطنی نسبت کے مالک، بلکہ ارباب قلوب کے حلقہ کے ایک فرد ہیں اور "قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید" والی جماعت میں شامل ہیں، وہ بھی تشریف لائے، سلسلۂ سخن شروع ہوا تو موصوف نے فرمایا:۔

"پاکستان کے چاروں طرف آگ ہی آگ ہے، یہ ملک شدید ابتلاء میں ہے، حق تعالیٰ کے غضب وانتقام کی صورت ہے[۱] تمام اربابِ کشوف ومشاہدات پریشان ہیں دعاؤں میں مشغول ہیں، لیکن نجات کی صورت نظر نہیں آتی[۲]۔ پھر فرمایا: "شاید آخر میں بچاؤ کی کوئی صورت نکل آئے"۔

---

[۱] اس کو "کشف" کہئے یا "فراست مؤمن" مگر اس میں شک نہیں کہ بعض خاصانِ خدا پیش آنے والے حالات کو اس وقت محسوس کر لیتے ہیں جبکہ ہم "اخبار بینوں" کو ان کا وہم وگمان بھی نہیں ہوتا، اس بزرگ کی مؤید ایک بات تبلیغی احباب سے سنی کہ حضرت مولانا محمد یوسف کاندلویؒ امیر تبلیغ جب آخری مرتبہ (غالباً ۱۹۶۵ء میں) مشرقی پاکستان تشریف لے گئے تو بار بار فرماتے تھے: "مجھے یہاں چاروں طرف آگ کے شعلے بھڑکتے نظر آرہے ہیں" اور فرماتے تھے: اس کا علاج صرف یہ ہے کہ امت میں نئے سرے سے "امت پنا" پیدا کیا جائے اور "امت پنا" جب پیدا ہوگا جب امت حضور صلی اللہ علیہ وسلم والے دعوت الی اللہ کے کام میں جڑے گی۔ "مدیر

[۲] وجہ اس کی یہ ہے کہ اجتماعی جرم کی اجتماعی سزا انفرادی دعاؤں اور کوششوں سے نہیں ٹلتی، حدیث میں آتا ہے کہ "ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ اللہ کا نیک اور مومن بندہ مسلمانوں کی جماعت کے لئے دعا کرے گا مگر قبول نہیں کی جائے گی، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو اپنی ذات اور اپنے (باقی صفحہ پر)

اس قسم کی طویل گفتگو فرمائی جس سے پوری مجلس پر ایک خاص رقت طاری ہوگئی اور تمام حاضرینِ مجلس نے آبدیدہ ہوکر کعبہ شریف کے سامنے والہانہ انداز میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور حق تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعائیں کی۔

شوال میں میری مراجعت ہوئی تو یہاں وہی آگ لگ رہی تھی، اور پھر تو وہ نقشہ سامنے آیا جو کبھی نہ دیکھا تھا نہ سنا تھا، مشرقی پاکستان کا سقوط ہوا، لاکھوں جانیں اس بے دردی و بے رحمی سے ضائع ہوئیں کہ عقل حیران ہے، پاکستان کی ایک لاکھ بہادر ترین فوج کو قیدی بنا لیا گیا اور لاکھوں نہیں کروڑوں مسلمان اب بھی تڑپ رہے ہیں اور انہیں تڑپایا جارہا ہے جن کی نہ کوئی آہ و بکا سنتا ہے نہ داد نہ فریاد اور اسی پر بس نہیں، وہی آگ اب مغربی پاکستان میں بھڑک رہی ہے، مسلمان، مسلمان سے وہ سلوک کررہا ہے جس کے تصور ہی سے آدمی کانپ اٹھتا ہے، نفرت و بیزاری کے شعلے انسانی اخوت اور اسلامی برادری کو خاکستر کررہے ہیں اور پورا ملک یاس و ناامیدی اور پریشانی و سراسیمگی کی تاریک وادیوں کی طرف رواں دواں ہے:۔

ع " محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی "

مسلمانوں کا عروج وزوال

ماہِ ربیع الاول ۱۳۹۲ھ کے "بصائر و عبر" میں جو کچھ عرض کیا گیا تھا وہ ہمارے نزدیک صورتِ حال کا صحیح مرقع تھا اور جو نازک دور ہم پر گذرا ہے اور ابھی گذر رہا ہے اس کا حقیقی جائزہ تھا، ہر صاحبِ بصیرت اس کو پڑھنے کے بعد دل کی گہرائیوں سے اس کی صحت و اصابت کا اعتراف کرے گا کہ جس عبرت ناک مقام پر ہم پہنچ گئے ہیں یہ سب

(بقیہ حاشیہ صفحہ) ذاتی امور کے لئے دعا کر میں قبول کرتا ہوں مگر پوری جماعت کے حق میں تیری دعا قبول نہیں کروں گا کیوں کہ انہوں نے مجھے غصہ دلایا ہے۔" (ابن مبارک، کتاب الرقائق ص ۱۵۵ و ص ۳۸۴)

اجتماعی عذاب کے ٹلنے کی صورت صرف یہ ہے کہ پوری قوم توبہ و انابت کا راستہ اختیار کرے یا کم ازکم تمام اخیارِ امت، امت کی طرف سے نمائندے بن کر معذرت کریں، جیسا کہ آگے آتا ہے۔ مدیر

کچھ ہمارے اعمالِ بد کا نتیجہ[1] ہے اور یہ تو حق تعالیٰ کی رحمت اور اس کا احسان و کرم تھا، ورنہ شاید ہم اس سے پہلے ہی تباہ و برباد ہو گئے ہوتے۔

بہر حال جو کچھ لکھا گیا تھا وہ اپنی بساط کے مطابق صورتِ حال کی ایک ناتمام تصویر تھی، اتفاق سے ایک صاحب کا مکتوب اور اس سے منسلک ایک خواب موصول ہوا، خواب میں وہی کچھ تھا جو ہم آنکھوں سے دیکھتے اور عقل سے جانتے تھے اور جس کو اربابِ بصیرت اپنی فراست سے اور اربابِ کرامت و مکاشفات دل کی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، بعض مخلصین کی رائے ہوئی کہ جو کچھ "بصائر و عبر" میں تحریر کیا گیا ہے ایک رویائے صادقہ سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے لہٰذا اس کو بھی شائع کر دیا جائے، یہ خواب میرے ذہن سے نکل کر طاقِ نسیاں کی زینت بن چکا تھا، یاد دلانے پر تلاش کیا، مل گیا اور شائع ہوا، الحمدللہ کہ پڑھنے والوں پر اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور بہت سے احباب نے خطوط میں اپنے تأثرات کا اظہار کیا۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا "بصائر و عبر" میں جو کچھ عرض کیا گیا تھا اس خواب پر نہیں تھا، یہ خواب نہ بھی ہوتا، تب بھی صورتِ حال واضح تھی اور خواب و خیال کی سطح سے بالاتر سر کی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ ہو رہا تھا اس لئے نہ صورتِ حال کی تکذیب کی گنجائش تھی نہ خواب پر سوءِ ظن کا موقعہ تھا، لیکن بعض ناظرین کو خواہ مخواہ یہ خیال آیا کہ شاید یہ خواب بھی کچھ اسی نوعیت کا ہے جس طرح کسی زمانہ میں کوئی عیسائی شیطان شیخ احمد کے نام سے جھوٹے خواب شائع کیا کرتا تھا، گویا اگر کسی نے کسی زمانے میں کوئی جھوٹا خواب شائع کیا تو اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ ہر سچا خواب بھی جھوٹا سمجھنا چاہیئے۔

---

[1] اور اب تو ہم سب دنیا بھر کے سامنے برملا اعتراف کرتے ہیں اور بار بار کرتے ہیں کہ ہم سے کچھ "سیاسی غلطیاں" ہوئی ہیں اور واقعۃً ضرور ہوئی ہیں مگر اے کاش! ہم سب کو خدا تعالیٰ کے سامنے بھی اعتراف کرنے کی توفیق ہو جاتی کہ ہم سے صرف کچھ "سیاسی غلطیاں" نہیں بلکہ خدا تعالیٰ سے بغاوت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت اور اسلام سے نفرت کا "بدترین جرم" صادر ہوا ہے نہ صرف یہ کہ ہم نے قدرت کے باوجود خدا و رسول کا ایک بھی حکم اس ملک میں نافذ نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے پاکیزہ دین کی ایک ایک بات کا مذاق اڑانے کو ترقی پسندانہ فیشن بنایا۔ مدیر

اور ایک صاحب کو دوسرے صاحب سے کچھ زیادہ حسنِ ظن نہیں اور اتفاق سے ان کا ذکر اس مجلس میں دیکھا تو فوراً فیصلہ فرما دیا کہ یہ صحیح نہیں اس لئے کہ اس خواب میں فلاں صاحب کا ذکر ہے گویا اگر کسی میں کوئی عیب ہے (اور وہ بھی ہماری نظرِ قاصر میں)، تو اس میں کسی خوبی، کسی بھلائی اور کسی کمال کا امکان ہی سرے سے مفقود ہو گیا، یعنی ایک یا چند کمزوریوں سے تمام محاسن وکمالات سلب ہو جاتے ہیں، حق تعالےٰ نے مخلوق پر بڑا ہی احسان فرمایا کہ اسے علمِ غیب سے بے خبر رکھا، ورنہ نظامِ عالم تہ و بالا ہو جاتا، انسان اتنا کمزور اور کم حوصلہ واقع ہوا ہے کہ اسے کسی کا ایک عیب نظر آجائے تو اس کی خوبی پر اس کی نظر نہیں جاتی سارے محاسن اس کی نظر سے غائب ہو جاتے ہیں حالانکہ حقیقت میں بے عیب کون ہے بجز ذاتِ حضرتِ حق تعالےٰ شانہٗ کے اور بجز ان حضرات کے جن کو حق تعالےٰ نے شرفِ عصمت سے مشرف فرمایا ہے، کمزوریاں سب میں ہیں لیکن حق تعالےٰ کی مرضی اور اس کا حکم یہ ہے کہ انسان اپنے عیب کو دیکھے اور دوسروں کے کمال پر نظر رکھے اور ان کے عیب سے چشم پوشی کرے، اس سے تواضع، فروتنی، باہمی مودت اور اسلامی اخوت پیدا ہو گی، اس کے برعکس اگر انسان اپنی خوبیاں اور دوسروں کی کمزوریاں سامنے رکھے تو اس سے کبر و نخوت اور باہمی شقاق و نفاق کی راہ کھلے گی، خالق ہی جانتا ہے کہ اس نے اپنی کس کس مخلوق میں کیا کیا خوبیاں رکھی ہیں، حق تعالےٰ مخلوق کی خوبیاں دیکھتا ہے اور مخلوق مخلوق کی برائیوں کو دیکھتی ہے، حق تعالےٰ جو سب عیبوں سے پاک ہے وہ بندوں کے عیوب سے چشم پوشی اور درگذر فرماتا ہے اور بندۂ ناتواں جو سراپا عیب ہے وہ دوسروں کی خوبیوں سے اغماض کرتا ہے، اگر ایک انسان میں متعدد برائیاں ہوں لیکن ساتھ ہی کوئی خوبی بھی ہو تو چاہیئے کہ اس خوبی کی قدر کی جائے اور برائیوں سے چشم پوشی کی جائے، قرآنِ کریم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہی ارشاد ہیں۔

بسا اوقات خواب دیکھنے والے کی شخصیت معمولی ہوتی ہے لیکن خواب اونچا دیکھ لیتا ہے، بہرحال جب حقائق واضح ہیں اور صورتِ حال کا پورا نقشہ سامنے ہے تو جس

خواب و خیال سے اس کی تصدیق ہو اس کی تکذیب کی کیا مجال ہے؟ [1]

مسلمانوں کے زوال کا سبب

بہر حال عرض یہ کرنا ہے کہ پاکستان ابھی تک شدید ابتلاء میں ہے اور جس عذاب کا نزول کچھ عرصہ پہلے مشرقی پاکستان سے شروع ہوا تھا وہ ابھی تک نہ مشرق میں تھما ہے نہ مغرب میں، اس کے ظاہری اور سطحی اسباب خواہ کتنے تلاش کر لئے جائیں مگر اس کا حقیقی اور بنیادی سبب صرف ایک ہے اور وہ ہے ہماری شامتِ اعمال اور ہماری بدعملیوں پر قہرِ خداوندی کا متوجہ ہونا، قرآنِ کریم میں ایک جگہ قہرِ الٰہی کے نازل ہونے کی تین شکلیں ذکر کی گئی ہیں (۱) آسمانی عذاب مثلاً پتھر برسنا (۲) زمینی عذاب، مثلاً زلزلے آنا اور زمین میں دھنس جانا (۳) باہمی گروہ بندی، قتل و قتال اور جنگ و جدال، چنانچہ ارشاد ہے:

«قل ھو القادر علیٰ أن یبعث علیکم عذابًا من فوقکم أو من تحت أرجلکم أو یلبسکم شیعًا ویذیق بعضکم بأس بعض انظر کیف نصرف الآیٰت لعلھم یفقھون». (الانعام: ۶۵)	آپ کہیئے اس پر وہی قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب تمہارے اوپر سے بھیج دے یا تمہارے پاؤں تلے سے یا تم کو گروہ گروہ کر کے سب کو بھڑا دے اور تمہارے ایک کو دوسرے کی لڑائی کا مزا چکھا دے، آپ دیکھئے تو سہی ہم کس طرح مختلف پہلوؤں سے دلائل بیان کرتے ہیں شاید وہ سمجھ جاویں (بیان القرآن)

احادیثِ طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امت پر پہلی دو قسم کے عام عذاب اس

---

[1] اور اگر کسی کو کسی سے سوءظن ہی رکھنا ہو تب بھی اس خواب کو جھٹلانے کی ضرورت نہیں تھی وہ یہ تاویل کر سکتا تھا کہ اس خواب میں جس مجلس کا ذکر ہے وہ تہدید و تنبیہ کی مجلس تھی اور ایسی مجالس میں جہاں مقربین و مخلصین کو طلب کیا جاتا ہے وہاں دوسری نوعیت کے افراد کو بھی حاضر کیا جا سکتا ہے (مدیر)

طرح نازل نہیں ہوں گے کہ بعض پہلی امتوں کی طرح یہ پوری امت نیست و نابود کر دی جائے، البتہ تیسری قسم کے عذاب میں یہ امت مبتلا ہوگی، چنانچہ آج یہ امت بالخصوص ہمارا ملک اس عذاب کی لپیٹ میں ہے، طبقاتی منافرت صوبائی عصبیت اور لسانی منافست کا دیو پوری قوم کو نگل رہا ہے، بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہے، افراتفری اور بے اعتمادی کی بدبودار فضا میں دم گھٹا جا رہا ہے۔

قہرِ الٰہی سے بچنے کا راستہ

ہر طرف سے أنا ولا غیری (میں میں اور تو تو) کے نعرے بلند ہو رہے ہے، اس سے بڑھ کر کسی قوم کے لئے اور کیا سزا ہو سکتی ہے؟ کوئی شک نہیں کہ اس قوم پر قہرِ الٰہی اور غضبِ خداوندی ٹوٹ پڑا ہے، یہ ہزار چیخے چلّائے، سر پیٹے، واویلا کرے، لاکھ جتن کرے مگر جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس عذاب کو اٹھا لینے کا فیصلہ نہیں ہوگا، یہ قوم کبھی گردابِ بلا سے نہیں نکل سکتی، ہم اس بھول میں ہیں کہ خدا تعالیٰ کو راضی کئے بغیر محض ہماری تقریروں سے ہمارے نعروں سے، ہمارے اخباروں سے، ہمارے رسالوں سے، ہمارے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروپیگنڈے سے، ہماری جمہوریت سے، ہماری اصلاحات سے، ہماری حکومتوں سے، ہماری قیادت سے، ہمارے عوامی شعور سے، ہمارے قومی تدبر سے فضا بدل جائے گی، ہوا کا رُخ پلٹ جائے گا، طوفان کا دھارا مڑ جائے گا، نفرت کا دھواں چھٹ جائے گا، انتشار و افتراق کا آتش فشاں سرد ہو جائے گا اور ہم صرف اپنی ناکارہ تدبیروں سے حالات پر قابو پا لینے میں کامیاب ہو جائیں گے، اگر ہماری خوش فہمیوں سے حالات بدل جاتے تو اب تک کبھی کے بدل گئے ہوتے، مگر حق تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے إن الله لایهدی القوم الفاسقین (بے شک اللہ تعالیٰ راہ نہیں سمجھاتا بدکار قوم کو) جب تک معاشرے پر فسق و بدکاری کا عفریت مسلط ہے ہمیں کبھی فلاح و بہبود کا راستہ نہیں مل سکتا بلکہ جو تدبیر ہوگی الٹی ہوگی، ہم ان صفحات میں بار بار کہہ چکے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ اس قہرِ الٰہی سے بچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے وہ یہ کہ ہم توبہ

وانابت سے اللہ تعالیٰ کو راضی کریں اور اللہ تعالیٰ سے ہم نے جو معاملہ بگاڑ لیا ہے اس کی اصلاح کریں مگر افسوس اور بے حد افسوس کا مقام ہے کہ عوام تو عوام خواص کو بھی اس صدائے جرس پر کان دھرنے کی فرصت نہیں ہوئی، نہ اس کے لئے کوئی تحریک پیدا ہوئی۔

اُمّت کی نجات اور عذاب سے چھٹکارے کی تدبیر

میرے ایک مخلص دوست اور صالح عالم ابھی چند دن ہوئے یہاں تشریف لائے تھے، موصوف نے اپنے ایک وارِدِ قلبی کا ذکر فرمایا اور نماز پڑھتے وقت کچھ معمولی غنودگی کی حالت میں ان پر جو کیفیت طاری ہوئی اتفاق سے اس کا ذکر بھی آیا، موصوف کی عادت بے حد اخفاء کی ہے مگر اتفاقیہ زبان سے کچھ بات نکل گئی اور ہمارے اصرار پر انہیں اس کی تفصیل بیان کرنا پڑی جس سے محسوس ہوا کہ وہ ایک پیغام ہے اور اس میں امت کی نجات اور اس عذاب سے رستگاری کی ایک تدبیر ہے اور اوپر عذابِ الٰہی اس کے اسباب اور اس کی تدبیر کے سلسلہ میں جو کچھ عرض کیا گیا اس کی مزید تصدیق ہوئی، ہماری فرمائش پر موصوف نے اسے قلمبند کر دیا ہے، ذیل میں ان کی تحریر پیش کرتا ہوں، وہ فرماتے ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

سقوطِ پاکستان کا صدمہ اتنا شدید تھا کہ آنسو تھمتے نہ تھے، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہو گیا، اسی غم و فکر میں قلب پر وارد ہوا کہ:

"قوم (مسلمانانِ پاکستان) من حیث القوم نقضِ عہد کی مرتکب ہوئی ہے، یہ اس کا نتیجہ ہے، ہند و پاک کے مسلمانوں نے تحریکِ پاکستان کے دوران ۱۹۴۶ء میں پاکستان کی حمایت میں اس لئے ووٹ دیا تھا کہ پاکستان ایک مثالی اسلامی مملکت ہوگی جس میں احکامِ الٰہی کا اجراء اور شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ ہوگا، اللہ تعالیٰ نے چوتھائی صدی تک مہلت دی لیکن اس مہلت سے کوئی فائدہ

نہ اٹھایا گیا بلکہ جب ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں قوم نے مشرقی پاکستان میں تقریباً سو فیصد اور مغربی پاکستان میں بھاری اکثریت کے ساتھ ان جماعتوں اور افراد کو ووٹ دے کر جو اصلاً شریعت کے نفاذ اور نظامِ اسلامی کے قیام کے داعی نہ تھے بلکہ نیشنلزم، سوشلزم اور دیگر غیر اسلامی نظاموں کے نمائندے تھے کھلا اظہار و اعلان کر دیا کہ اللہ تعالیٰ سے جس عہد پر ملک لیا گیا تھا وہ اب باقی نہیں رہا اور قوم من حیث القوم اپنے عہد سے پھر گئی ہے تو اس نقضِ عہد کی بناء پر عتاب اور تنبیہِ الٰہی کی مورد بن گئی ہے"۔

اس "وارد" کے بعد طبیعت مزید پریشان و مضمحل ہو گئی، دل بیٹھا جاتا تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب اس نقضِ عہد پر نازل شدہ عتابِ الٰہی اور تنبیہِ خداوندی کا کیا مداوا کیا جائے، اسی پریشانی میں تھا (اور یہ سقوطِ ڈھاکہ کا غالباً دوسرا دن تھا) کہ مغرب کی سنتوں میں تھا، یکایک غنودگی سی (بین النوم والیقظہ کی حالت) طاری ہو گئی اور بارگاہِ رسالت (روحی فداہ) صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوا کہ:

"سوائے توبہ و انابت کے بچنے کی کوئی دوسری راہ نہیں، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: (وتوبوا إلی اللہ جمیعًا أیھا المؤمنون)

میرے دل میں آیا کہ اُمت اور مسلمانانِ پاکستان جس غفلت میں ہیں وہ سب کے سب کیسے تائب اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

ارشاد ہوا "اس کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ دیندار طبقہ پوری امت کی طرف سے نیابۃً توبہ کرے اور ان میں سے ہر شخص اپنے دل کو اُمت کا دل سمجھ کر دل سے تائب ہو اور انابت اختیار کرے۔

پھر توبہ و استعانت کے لئے دعائے قنوت کے ابتدائی تین الفاظ پڑھے:

اللّٰھُمَّ إنا نستعینک ونستغفرك ونؤمن بك (واللہ اعلم بالصواب)

جس کا مطلب اسی حالت میں فقیر یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ سے مدد کے لئے استغفارِ

حقیقی اور تجدیدِ ایمان کی ضرورت ہے (جس میں اس عہد کی تجدید بھی آجاتی کہ ہم پاکستان میں صحیح اسلامی احکامِ شریعت کا اجراء اور دینی معاشرہ کو بپا کریں گے.

بہر حال حاصلِ کلام یہ ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کے عتاب کو اسی صورت میں روکا جا سکتا ہے کہ پوری اُمت یا کم از کم ان کی طرف سے نیابۃً دیندار طبقہ انابت و توبہ کی راہ اختیار کرے اور پھر سے عزم بالجزم کرے کہ جو مملکت اسلام کے نام پر لی گئی ہیں اسے اسلام ہی کے بے مثل و بے مثال نظام کا گہوارہ بنایا جائے گا۔ واللہ أعلم بحقیقۃ الحال، واللہ أعلم وعلمہ أتم"

توبہ واستغفار کے جو فضائل و برکات قرآن وحدیث میں آئے ہیں اس وقت ان کا ذکر مقصود نہیں اور الحمد للہ کہ اہلِ دین مسلمان ان سے کچھ ایسے بے خبر بھی نہیں، حق تعالیٰ کے غضب وعتاب سے بچنے کے لئے توبہ واستغفار کی اہمیت تو ظاہر ہے لیکن جس طرح اپنے گناہوں سے توبہ کرنا ضروری ہے ٹھیک اسی طرح حق تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے میں جو امت تقصیر کر رہی ہے اس کے لئے بھی استغفار ضروری ہے، نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ تمام امت جس غفلت اور غیر اسلامی زندگی میں مبتلا ہے ان سب سے یہ توقع رکھنا کہ سب کے سب غیر اسلامی زندگی اور بدعقیدگی و بدعملی سے تائب ہو جائیں گے صرف حق تعالیٰ کی قدرت میں تو ہے کہ ایک ہی آن میں تمام اُمت صالح بن جائے (اس کا ایک ادنیٰ سا نمونہ ۶۵ء میں اللہ تعالیٰ نے دکھلا بھی دیا اور اس کی برکات وثمرات بھی دکھلا دئے) مگر عالمِ اسباب میں مشکل ہے، البتہ جو صورت ممکن اور آسان ہے وہ یہ ہے کہ اہلِ دین اور اہلِ درد تمام امت کا درد لے کر اٹھ کھڑے ہوں اور اُمت کے فکر کو اپنا فکر بنا کر دعوت واصلاح کے کام پر اپنی توانائیاں صرف کر دیں اور رو رو کر اللہ تعالیٰ سے امت کی ہدایت وفلاح مانگ لیں تو حق تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ وہ امت کی نجات کا فیصلہ فرما دیں گے، نیز اربابِ تقویٰ وصالحین اور وہ عام مسلمان جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف موجود ہے اور جو فرائض کی ادائیگی میں تقصیر نہیں کرتے ایسے لوگ تمام امت کی طرف سے نیابۃً اور سابقی

طرف سے اصالۃً انفرادی و اجتماعی دونوں طرح استغفار کریں، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر مزدلفہ میں رات گذارنے کے بعد صبح کو حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا:-

"یا بلال اسکت أو قال أنصت الناس، ثم قال: ان اللہ تطوّل علیکم فی جمعکم ھٰذا فوھب مسیئکم لمحسنکم وأعطی محسنکم ما سأل فادفعوا باسم اللہ[1].	اے بلال! لوگوں کو خاموش کراؤ (جب لوگ متوجہ ہو گئے تو) ارشاد فرمایا: اللہ تعالےٰ نے تم پر اس مزدلفہ کی وادی میں ایک بڑا انعام واحسان فرمایا کہ تمہارے گنہگاروں کو تمہارے نیکوکاروں کی وجہ سے بخش دیا اور نیکوکاروں نے جو مانگا سوان کو دیا، بس اللہ کا نام لے کر چلو[2]

[1] ابن ماجہ (ص ۲۳۲)۔

[2] اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس سے زیادہ تفصیل ہے، وہ فرماتے ہیں کہ "عرفہ کی شام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا اس میں ارشاد فرمایا کہ" اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر تمہارے اس مقام (وقوفِ عرفات) میں بہت ہی بڑا احسان فرمایا کہ تمہارے نیکوکاروں سے (ان کی طاعات وعبادات) کو قبول فرمایا، نیکوکاروں نے جو مانگا سو ان کو دیا اور تمہارے نیکوکاروں کی بدولت تمہارے گنہ گاروں کو بخش دیا، بجز تمہارے باہمی حقوق کے (کہ اگر کسی کے مال، جان یا عزت وآبرو کی حق تلفی کسی کے ذمہ ہو گی اس کی معافی کا وعدہ نہیں بلکہ ظالم سے مظلوم کا بدلہ بہر صورت لیا جائے گا) بس اب اللہ کا نام لے کر (عرفات سے مزدلفہ) چلو"۔

اور جب مزدلفہ کی صبح ہوئی تو فرمایا: "اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے اس مقام (وقوفِ مزدلفہ) میں تم پر بہت بڑا احسان فرمایا کہ تمہارے نیکوکاروں سے (ان کی طاعت وعبادات کو) قبول فرمالیا، تمہارے نیکوکاروں کو منہ مانگا عطا کیا اور تمہارے نیکوکاروں کی بدولت تمہارے گنہ گاروں کو بھی (بغیر سزا کے یا سزا میں تخفیف کر کے) معاف (کر دینے کا وعدہ) فرمایا اور تمہاری باہمی حق تلفیوں کا معاوضہ اپنے پاس سے ادا کرنے کا وعدہ) فرمایا، بس اب اللہ کا نام لے کر (منیٰ کی طرف) چلو۔"

صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کل شام تو آپؐ ہمیں بہت ہی فکر مند اور غمگین لائے تھے اور آج مسرت وشادمانی کی حالت میں لے جارہے ہیں؟ فرمایا: "کل میں نے اپنے رب سے ایک چیز کی درخواست کی تھی مگر قبول نہیں فرمائی، میں نے درخواست کی تھی کہ (بندوں کے جو) تاوان (ایک دوسرے کے ذمہ ہیں ان) کی (بھی) معافی ہو جائے مگر انکار فرما دیا، پھر آج میں نے دوبارہ الحاح وزاری کے ساتھ درخواست کی تو جبریل (علیہ السلام) میرے پاس آئے اور کہا کہ آپؐ کا پروردگار آپؐ کو سلام کہتا ہے فرماتا ہے کہ میں تاوانوں کی ضمانت لیتا ہوں تاوان اپنے پاس سے ادا کر دوں گا۔" (زرقانی شرح مواہب ص ۱۸۵ ج ۸)۔ مدیر

اس حدیث سے توقع ہوتی ہے کہ راستہ اب بھی کھلا ہے کہ صالحین کی وجہ سے بدکرداروں کو معافی ہوجائے خصوصاً جب صالحین اپنے تقصیر کرنے والے بھائیوں کی طرف سے بارگاہِ قدس میں معذرت پیش کریں اور ان کی طرف سے معافی مانگیں، برادرِ موصوف کے مکاشفے میں جو حکم دیا گیا ہے وہ بھی اسی نوعیت کا ہے [۱]۔ اور ہمارے شیخ سعدی رحمۃ اللہ تو بہت پہلے فرما چکے ہیں: "بداں را بہ نیکاں بخشد کریم"۔

اب ضرورت اس کی ہے کہ جس شخص کو حق تعالیٰ نے شب خیزی کی دولت عطا فرما کر ((والمستغفرین بالاسحار)) (سحر کے وقت استغفار کرنے والوں) کی صف میں داخل فرمایا ہے، اس کو نہایت تضرع اور عاجزی کے ساتھ گڑگڑا کر آخر شب میں اس توبہ کو معمول بنانا چاہیئے اور جن کو حق تعالیٰ نے پنج وقتہ نماز کی توفیق نصیب فرمائی ہے وہ نمازوں کے بعد اس کو معمول بنائیں اور بہتر ہوگا کہ جمعہ کے مبارک دن نمازِ جمعہ کے بعد اجتماعی طور پر توبہ و استغفار کریں۔

اللہ کے دربار میں عجز و انکساری سے دعا کی ضرورت ہے

بلاشبہ "دعا" میں عاجزی، تضرع اور حضورِ قلب مطلوب ہے اور توبہ کے الفاظ ایسے

---

[۱] اور اس کی حقیقت شفاعت اور سفارش ہے یعنی نیکوکار حضرات گنہ گاروں کی شفاعت کے لئے ہاتھ اٹھائیں خود اپنے کو پاک نہیں بلکہ قصوروار سمجھتے ہوئے اپنے ساتھ تمام گنہ گاروں کی طرف سے معذرت کریں اور ساری گنہ گار امت کی طرف سے نمائندہ بن کر اپنی اور سب کی خطاؤں کا اس طرح اقرار و اعتراف کریں گویا وہ ساری امت کے گناہوں کی ذمہ داری اپنے سر لے کر سب کی طرف سے توبہ کرتے ہیں اور معافی کے خواستگار ہیں، آخرت میں باذنِ خداوندی انبیاء، صدیقین، صالحین اور ملائکہ کا گنہ گاروں کی شفاعت کرنا قرآن و حدیث کی نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے اور دنیا کے عذاب سے رستگاری کے لئے شفاعت کے بھی بہت سے نظائر نصوص میں موجود ہیں، چنانچہ ان ستر افراد کے لئے جو ایک بے ادبی کی پاداش میں ہلاک کردیئے گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دعا اور سفارش کرنے کا واقعہ قرآن مجید میں کئی جگہ مذکور ہے، الغرض یہ مکاشفہ نصوصِ شرعیہ کے مطابق ہے اور اس پر کوئی علمی اشکال نہیں نہ اس پر مدار ہے، واللہ اعلم۔ مدیر

ہوں جن سے دل پر رقت کی کیفیت طاری ہو، اس لئے ان پاکیزہ دعاؤں کے علاوہ، جو بارگاہِ نبوت سے ارشاد ہوئی ہیں ہر شخص اپنے ضمیر کے مطابق اپنی زبان میں توبہ و استغفار کے ایسے الفاظ بھی استعمال کرے جن سے دل متأثر ہو اور دل کا سوز و گداز آنکھوں کے آنسوؤں کی شکل میں بہہ نکلے، لیکن بسا اوقات عوام کے لئے منضبط الفاظ میں دعا کرنا خصوصًا جب اجتماعی شکل میں دعا کی جائے، زیادہ مفید ہوتا ہے، اس لئے خیر خواہی کے جذبہ کے پیشِ نظر جو کلمات خیالِ ناقص میں آئے انہیں اخبارات میں شائع کرا دیا، اور" بصائر و عبر" کے صفحات میں بھی شائع کرنا مفید معلوم ہوتا ہے، بہتر ہوگا کہ پہلے سورۂ فاتحہ پڑھی جائے، پھر درود شریف اور دعاءِ قنوت پڑھ کر بارگاہِ ارحم الراحمین میں ہاتھ پھیلا کر نہایت توجہ اور حضورِ قلب کے ساتھ حسبِ ذیل الفاظ میں دعا کی جائے:۔

" اے ارحم الراحمین ہم گنہ گار ہیں، بدکردار ہیں، خطاکار ہیں لیکن تیرے بندے ہیں اور تیرے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہیں، ہم نے تجھ سے پاکستان اس لئے مانگا تھا کہ تیرے قانونِ رحمت و عدالت کے سرچشمے اس سرزمین میں جاری ہوں اور امتِ مرحومہ اس سے سیراب و شفایاب ہو اور ہم تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے طریقوں پر عمل پیرا ہو کر اسلام کا بول بالا کریں۔

اے اللہ ہم نے نافرمانی کی، بدعہدی کی، بغاوت کی، مملکت کا ایک بڑا حصہ ہم سے لے لیا گیا، اے اللہ اس پر بھی ہماری آنکھیں نہ کھلیں، اب عالم یہ ہے کہ ہم میں نہ اسلامی اخوت ہے اور نہ ہمدردی، بھائی بھائی کے خون کا پیاسا اور جانی دشمن ہے، ہم نے وہ کام کئے ہیں، جن سے درندے اور بھیڑیئے بھی پناہ مانگیں۔

اے ارحم الراحمین تو ہی ہمارا ملجا اور تو ہی ہمارا مددگار ہے، ہم اپنی نافرمانیوں، اپنی بغاوتوں، اپنی بداعمالیوں سے اور جو کچھ ہم نے کیا ہے اس سے سچے دل سے توبہ کرتے ہیں۔

اے ارحم الراحمین اپنے حبیبِ پاک رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ ہم گنہ گاروں کو معاف فرما اور اپنی مرضیات کی توفیق ارزانی فرما، راعی و رعایا دونوں کو دینِ اسلام پر چلنے کی توفیق مرحمت فرما جو تیرا آخری پیغامِ نجات ہے۔

یاارحم الراحمین ہم سب مسلمانوں کے درمیان الفت و محبت پیدا فرمائیے اور ہمارے دشمنوں اور بدخواہوں کے شر سے ہمیں نیز ہمارے ملک کو بچائیے (بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ) (اس آیت کی تکرار کم سے کم تین بار کی جائے) اے ارحم الراحمین تیرا رحم و کرم ہمارے اعمال سے اور تیری مغفرت ہمارے گناہوں سے کہیں زیادہ ہے، تیرے کرم کے سامنے ہمارے گناہ بالکل حقیر ہیں۔

توبہ، توبہ، اے اللہ ہمیں معاف فرما ہم تیرے ہی بندے ہیں، تجھ ہی پر ایمان رکھتے ہیں اور تجھ ہی سے مغفرت چاہتے ہیں «رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا، رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ، وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِينَ»

دعا کے بعد الحمد للہ رب العالمین کہہ کر درود شریف تنجینا پڑھا جائے جو درج ذیل ہے:-

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تُنْجِينَا بِهَا مِنْ جَمِيعِ الْأَهْوَالِ وَالْآفَاتِ وَتَقْضِي لَنَا جَمِيعَ الْحَاجَاتِ وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيعِ السَّيِّئَاتِ وَتَرْفَعُنَا بِهَا عِنْدَكَ أَعْلَى الدَّرَجَاتِ وَتُبَلِّغُنَا أَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيعِ الْخَيْرَاتِ فِي الْحَيَاةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔

شعبان المعظم ۱۳۹۲ھ، اکتوبر ۱۹۷۲ء

اخلاص اور تصحیحِ نیّت

انسان اس کا مکلّف ہے کہ وہ اپنی قدرت، اپنے علم، اپنی فہم، اپنی صلاحیت اور اپنی صوابدید کے مطابق قدم اٹھائے، انسان کی مسئولیت یہی ہے، کامیابی و ناکامی اس کے اختیار سے بالاتر ہے، کہا جاتا ہے: السعی منی والاتمام من اللہ، یعنی کوشش کرنا میرا فرض ہے باقی تکمیل تک پہنچانا یہ حق تعالیٰ کا کام ہے، نتیجہ ہمیشہ حق تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں رہتا ہے، اس کی تکوینی مصلحت و حکمت کا جو تقاضا ہوگا وہی ہوگا، اختیار تمام تر اللہ تعالیٰ کا ہے، نیز انسان اس کا مکلف ہے کہ جو کام کرے وہ اخلاص سے کرے یعنی پہلے یہ سوچ لے کہ حق تعالےٰ کی مرضی کیا ہے، مقصد رضائے الٰہی ہو، نفسانی خواہش نہ ہو، یہ مرحلہ بہت باریک اور بہت مشکل ہے، پہلے تو نفسیاتی مکائد کی وجہ سے اور شیطانی دسائس اور وساوس کی وجہ سے نفسانی خواہشات کا تجزیہ کرنا ہی بہت مشکل ہے "کارے وارد"۔ کسی مقصد کا ایسا تجزیہ کرنا کہ رضائے الٰہی کتنی ہے، اور نفس کی خواہش کتنی ہے آسان نہیں، پھر نفسانی خواہش کو یک قلم چھوڑ کر حق تعالےٰ کی خوشنودی ہی منزل مقصود ہو، بڑا کٹھن مرحلہ ہے، لبسا اوقات مقصد صحیح ہوتا ہے، عمل درست ہوتا ہے لیکن نیت صحیح نہیں ہوتی، بلکہ نفس کا کھوٹ اور دنیا کا کوئی مقصد اس میں شامل ہو جاتا ہے جس سے وہ سارا عمل بیکار ہو جاتا ہے، شیطان لعین جو انسان کا عَدُوٌّ مُبِیْن ہے اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح اگر وہ نیک کام نہیں چھڑا سکتا ہے تو کم از کم اس کو دنیا کی کسی غایت و غرض سے ملوث کر دیتا ہے اور آدمی «یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا» (یعنی وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم تو اچھا کام کرتے ہیں) کا مصداق بن جاتا ہے اور اس طرح وہ صحیح مقصد اور صحیح عمل کی برکات سے محروم ہو جاتا ہے، بہرحال پہلے یہ سوچنا کہ کام صحیح بھی ہے یا نہیں، پھر اس میں صحیح قدم رکھنا، دنیا کی کسی وجاہت و عزت، حبِ جاہ یا حبِ مال کا ذریعہ تو نہیں ان مراحل سے گزرنا بے حد مشکل ہے۔

"چو گل بسیار شد پیلان بلغزند"

یہ محض توفیقِ الٰہی سے نصیب ہوتا ہے، اس کی دینی تدابیر یہ ہیں کہ انسان بارگاہِ ربوبیت میں نہایت عاجزانہ انداز سے التجا کرے اور والہانہ دعائیں کرتا رہے، اربابِ عقل و تجربہ اور صالحین سے مشورہ کرے، استخارہ کرے، غرض پھونک پھونک کر کے قدم رکھے اور پھر بھی یہ خطرہ پیشِ نظر رہے کہ ممکن ہے میری رائے یا میرا عمل صحیح نہ ہو، تب جا کر کہیں مسئولیت کا حق ادا ہوگا، بہرحال اس مرحلے پر پہنچ کر اس کا فرض ادا ہو گیا، آگے یہ ضروری نہیں کہ وہ کام تکمیل تک پہنچ بھی جائے، یہ کام حق تعالیٰ کا ہے۔

اس دنیا میں حضرات انبیاءِ کرام علیہم الصلوات والسلام تشریف لائے، ان کے تقدس و اخلاص اور ان کے فضائل و کمالات کا کیا کہنا، انسانیت کا انتہائی معراجِ کمال، خدا پرستی کا انتہائی عروج، خداترسی کی سب سے بڑی بلندی، یہ ادنیٰ سے ادنیٰ نبوت کا خاصہ ہے «ولیس منهم دنی» اس کی رہنمائی اور اس کی توفیق کا سلسلہ حق تعالیٰ سے براہِ راست بلا واسطہ قائم ہوتا ہے «وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ» کے منصب سے ان کو سرفراز کیا جاتا ہے، کوئی قدم بھی منشاءِ الٰہی کے خلاف نہیں اٹھ سکتا، جس کو ہم ظاہر میں غلط سمجھیں، وہ بھی حق تعالیٰ کے تکوینی نظام کا عین مقتضاء ہوتا ہے، اگر کوئی ظاہری عتاب بھی ہوتا ہے تو وہ بھی کسی منشاءِ الٰہی کو پورا کرتا ہے بہرحال وہ نفس کی خواہشات سے بالاتر ہو کر معصومیت کی معراج پر پہنچ چکا ہوتا ہے «بِیْ یُبْصِرُ وَبِیْ یَسْمَعُ» (وہ میرے دکھائے دیکھتا ہے اور میرے سنائے سنتا ہے) کے مقامات طے کرتا ہے۔

اُمتِ محمدیہ کے اولیاء اللہ کو یہ کمال جب حاصل ہو جاتا ہے تو حضرات انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مراتبِ کمال کا تو کیا ٹھکانا ہے، لیکن ان تمام کمالات کے باوجود دنیا میں جس مقصد کے لئے وہ مبعوث ہوتے ہیں اس میں کوئی کامیاب ہوتا ہے اور کوئی بظاہر کامیاب دکھائی نہیں دیتا، لیکن ان میں جو بظاہر ناکام نظر آتے ہیں درحقیقت وہ بھی کامیاب ہی ہیں، اس لئے کہ انہوں نے اپنی مسئولیت پوری کر دی، مقصود رضائے الٰہی تھی وہ حاصل ہو گئی۔

کسی جماعت سے اتحاد کے لئے شرائط

بہرحال اگر مقصد ہمارا صحیح ہے اور بہت غور و خوض اور دینی تدابیر کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ

اس طرح یہ کام انجام تک پہنچانا ہے اور مقصد حق تعالیٰ کی خوشنودی ہے اور ملک و ملت کی خدمت بھی حق تعالیٰ کی رضا کے لئے کرنی ہے تو جادۂ حق سے کسی وقت بھی ہمارے قدم ڈگمگانے نہیں چاہئیں، کوئی ساتھ دے یا نہ دے، محض تکثیرِ سواد کی خاطر تاکہ جماعت قوی ہو جائے، ایسے افراد یا جماعتوں سے معاہدہ کرنا جن کا ماضی داغدار ہے یا شرعی معیار پر ان میں نقائص موجود ہیں یا جن کا مقصد محض سیاسی اقتدار و زعامت ہے اور ان معاہدوں سے ان کی دینی غلطیوں پر پردہ پڑ جانے اور آئندہ نسل پر ان کا دینی مسلک مشتبہ ہو جانے کا اندیشہ ہو تو یہ کہاں تک درست ہوگا؟ کسی جماعت کے پاس تنظیم ہے، مال و دولت ہے، رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے بے شمار وسائل ہیں، ان کے ساتھ معاہدہ کرنا صرف اس لئے کہ ضرور کامیابی ہوگی، شرعاً یہ اقدام کہاں تک صحیح ہوگا؟

اس وقت علماءِ کرام کی جماعتوں میں آراء کا اختلاف بھی ہے اور طریقۂ کار کا اختلاف بھی ہے لیکن الحمد للہ کہ مقصد ایک ہے وہ باطل اور اہلِ باطل کی سرکوبی ہے اس لئے عوام کو یہ اختلاف برداشت کرنا چاہیئے لیکن جو چیز ہر وقت پیشِ نظر رہنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ ہر جماعت کو اپنی قوت حاصل کرنے کے پیشِ نظر کوئی قدم ایسا نہیں اٹھانا چاہیئے جس سے باطل کو (غیر شعوری ہی سہی) تائید حاصل ہو اور ((اثمهما اکبر من نفعهما)) (یعنی نفع سے نقصان زیادہ ہو) کا مصداق بن جائے، ہم اس کے مکلف ہی نہیں کہ دنیا کی معروف کامیابی سے سرفرازی ہو ہم اس کے مکلف ہیں کہ قدم صحیح اٹھائیں چاہے متعارف کامیابی ہو یا نہ ہو۔

یہ مقصد نہیں کہ صحیح اور جائز، معقول اور مؤثر تدابیر اختیار کرنے میں کوتاہی کی جائے، اس کے لئے جو ممکن جدوجہد ہو اس میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیئے۔

یہ مقصد بھی نہیں کہ اسلامی جماعتوں کے اتحاد کی کوشش سے گریز کیا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اختلاف اگر ختم نہ ہو سکے تو اسے کم سے کم کرنے کی کوشش کی جائے، لیکن اتحاد کے لئے سب سے اہم شرط دین اور مسلک کا اتحاد ہے، یہ معاہدات بھی ایسے ہیں جیسے شرعی معاہدہ عقدِ نکاح ہوتا ہے، حدیث میں آتا ہے کہ نکاح میں چار باتوں کا خیال عموماً کیا جاتا ہے، مال یا حسن و جمال یا دنیوی شرافت و جاہ، یا دین، حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ((تنکح المرأۃ لاربع لمالها و جمالها و لحسبها و لدینها)) پھر فرمایا ((فاظفر بذات الدین)) یعنی دین ہی کی جہت کو

اپنی ظفر و کامیابی سمجھو۔

درحقیقت نبوت کی زبان فیض ترجمان سے ایک اصولی بات معلوم ہوئی کہ تمام ظاہری محاسن حسن و جمال ثروت و مال یا وجاہت و منصب کے بالمقابل صرف دین کو ترجیح دینی چاہیئے ظاہری تدبیریں تنظیمیں، اخبارات، پریس کی قوت اور مال و دولت کی شان و شوکت کے مقابل ان جماعتوں یا افراد کو ترجیح و برتری ہوگی جن میں دین اور دینی خدوخال نمایاں ہوں، اتحاد مطلوب ہے تو ان افراد و اشخاص یا جماعتوں سے ہو جن کا مقصد دین ہو، اور وہ خود دین پر عامل ہوں، ورنہ نتیجہ سوائے خسران اور ناکامی اور کیا ہوگا!؟

نیز جس جماعت سے معاہدہ ہو تو معاہدے کے اصول سے ہو، یعنی مساوات و اعتدال کا حامل ہو نہ یہ کہ ایسی جماعت سے معاہدہ کیا جائے کہ آپ کی حیثیت صرف تابع مہمل کی ہو جائے، آج کل یہی ہو رہا ہے کہ ضعیف جماعت کا قوی جماعت سے معاہدہ ہوتا ہے یا تو یہ ضعیف اس قوی میں بالکلیہ مدغم ہو کر اپنی حیثیت و شخصیت کھو بیٹھتی ہے یا پھر محض تابع ہو کر اپنی خودداری ختم کر دیتی ہے، یہ تمام محنتیں صرف اس لئے کی جاتی ہیں اور نامعقول و ناپسندیدہ اشیاء کو برداشت کیا جاتا ہے کہ انتخابات میں کامیابی نصیب ہو اور چند سیٹیں مل جائیں، تو کیا الیکشن میں کامیاب ہونا ہی اصل مقصد اور منزلِ مقصود ہے؟ اور کیا الیکشن ہی تمام خرابیوں اور امراض کی دوا ہے؟ کیا اسمبلی کا نظام ہی نسخۂ شفا اور اکسیرِ بے نظیر ہے؟ کیا یہ مداہنت فی الدین اسی امید موہوم کے لئے برداشت کی جاتی ہے؟ کیا ہم اس کے مکلف ہیں؟ غور کرنا ہوگا کہ صرف جماعتی وقار اور معاہدہ کی خاطر تمام دین کو پائمال کیا جا سکتا ہے؟

ع "بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست"

اللہ تعالیٰ صحیح عقل و ادراک عطا فرمائے آمین، بہرحال جو کچھ خیالِ ناقص میں آیا عرض کر دیا گیا۔

حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس
در بندِ آں مباش کہ نشنید یا شنید

رجب ۱۳۹۰ھ، ستمبر ۱۹۷۰ء

قول و عمل کا تضاد اور اسلام

آسمانی وحی میں جن بڑے بڑے جرائم کو حق تعالےٰ کے شدید غضب و ناراضی کا سبب قرار دیا گیا ہے ان میں سے قول و عمل کے تضاد کو بھی ذکر فرمایا گیا ہے، قرآنِ کریم میں سورۂ صف میں ارشاد ہے:-

«یا أیہا الذین آمنوا لم تقولون ما لا تفعلون کبر مقتاً عند اللہ أن تقولوا ما لا تفعلون»۔

اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو خدا کے نزدیک یہ بہت ناراضی کی بات ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔

درحقیقت نفاق بھی یہی چیز ہے کہ زبان پر کچھ ہے اور دل میں کچھ ہے منافقوں کے لئے سزا اور وعید بھی قرآنِ کریم میں شدید آئی ہے:۔

«إن المنافقین فی الدرک الأسفل من النار»

بلاشبہ منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں جائیں گے۔

نفاق کی تین صورتیں

اسلام کی اصطلاح میں الحاد اور زندیقیت کا بھی یہی مفہوم ہے، چنانچہ فقہاءِ کرام نے زندیق اسی کو بتایا ہے جو زبان سے اسلام کا دعویٰ کرے اور دل میں کفر چھپائے، گویا قول و عمل کے تضاد کا نام نفاق ہے اور اس کی تین صورتیں ہیں، اول یہ کہ قلبی اعتقاد تو صحیح ہو، مگر عمل، دعویٰ کے خلاف ہو، یہ نفاق فی العمل ہے، دوم یہ کہ دل سے خدا اور رسول کی بات پر سرے سے اعتقاد ہی نہ ہو بلکہ صرف ظاہر داری کے لئے ایمان و اسلام کے زبانی دعوے کئے جائیں، یہ نفاق اعتقادی کہلاتا ہے جو کفرِ خالص ہے اور اس کے لئے دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ کی وعید ہے، سوم یہ کہ ایک شخص دل میں عقیدۂ کفر رکھتا ہے مگر ظاہری طور پر اسلام کا انکار نہ کرے بلکہ بظاہر اسلام کا اقرار کرے اور قرآن و حدیث کی نصوص میں تاویل و تحریف کرکے انہیں اپنے عقائدِ باطلہ پر چسپاں کرے، یہ زندقہ، اور الحاد کہلاتا ہے جو نفاق فی التعبیر سے پیدا ہو اور نفاق کا یہ درجہ سب سے اشد ہے، چنانچہ منافق کی توبہ بالاتفاق مقبول ہے، لیکن زندیق کی توبہ بعض علماء کے نزدیک لائقِ التفات نہیں، ان تین مراتبِ نفاق میں فرق یہ ہے کہ نفاقِ عملی کی صورت میں ایمان و اعتقاد باقی ہے اور عمل کے بہت شعبے بھی موجود

ہیں مگر کسی خاص شعبۂ عمل میں نفاق ہے اور نفاقِ اعتقادی میں نہ ایمان ہے نہ اسلام، نہ عقیدہ ہے نہ عمل، صرف ظاہر داری کے لئے دعویٰ ہی دعویٰ ہے، یعنی خالص کفر کے باوجود اسلام کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور تیسرا مرتبہ اس سے بھی بدتر ہے کہ اس میں نفاق اعتقادی کے ساتھ نصوص میں تحریف کا اضافہ ہوجاتا ہے، گویا خالص کفر کو تاویلات کے ذریعے اسلام ثابت کیا جاتا ہے، الغرض قول وعمل کا تضاد ہو یا نفاق ہو حق تعالیٰ کی نزدیک بدترین جرم ہے شدید غضبِ الٰہی کا سبب ہے۔

آج مسلمانوں کا بظاہر عام جرم یہی ہے کہ زبان سے اسلام کا دعویٰ ہے لیکن عمل وہ ہیں جن سے کافر بھی شرمائے اور افراد و اشخاص ہوں یا حکومتیں راعی ہوں یا رعایا سب آج اس عظیم معصیت میں مبتلا ہیں، نفاقِ عملی میں تو قریباً سبھی مبتلا ہیں کہ زبان سے دعوے کچھ کئے جاتے ہیں اور عمل کچھ اور ہوتا ہے لیکن بہت سے لوگ تو واقعۃً نفاقِ اعتقادی کے مریض ہیں، یعنی وہ مسلمان صرف اس لئے کہلاتے ہیں کہ ان کو مسلمانوں سے واسطہ ہے ورنہ ان کے دل میں اسلام نہیں، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی عظمت ہے، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کا اعتقاد ہے، اور بہت سے لوگ اسلام کی پیمائش نفس و شکم کے پیمانے سے کرتے ہیں، گویا انسان کو دینِ اسلام کی اطاعت و فرمانبرداری کے لئے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ خود اسلام کو انسانی خواہشات کے پیچھے چلنے کے لئے نازل کیا گیا ہے وہ مسلمانوں پر یہ فرض عائد نہیں کرتے کہ وہ اپنی زندگی اسلام کے ڈھانچے میں ڈھالیں بلکہ وہ اسلام پر یہ فرض عائد کرتے ہیں کہ وہ انسانی خواہشات کے سانچے میں ڈھلتا رہے یہ موجودہ دور میں زندقہ کی ترقی یافتہ شکل ہے، خلاصہ یہ ہے کہ آج عمومی طور پر مسلمان نفاقِ عملی یا اعتقادی میں مبتلا ہے، آج ہمیں جو ذلت و نکبت نصیب ہو رہی ہے درحقیقت اس منافقانہ طرزِ زندگی کی سزا ہے۔

پاکستان کیوں حاصل کیا گیا اور اب تک کیا ہوا؟

ماضی قریب میں متحدہ ہندوستان میں ہم نے یہی نعرے لگائے کہ مسلمانوں کے لئے ایک مستقل جداگانہ سرزمین کی اس لئے ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے نفاذ کے لئے اسلام کی حکومت قائم ہو اور سر سے پیر تک اسلامی معاشرہ کی تشکیل ہو، اس موقعہ پر ہم نے بڑے بلند بانگ دعوے کئے تھے کہ حق تعالیٰ کے قوانینِ عدل کا اجرا ہوگا، اسلامی شعائر کا احیاء ہوگا،

اسلامی اتحاد کا خواب پورا ہوگا، اسی مقصد کے لئے جلسے کئے، جلوس نکالے، کوششیں کیں، قراردادیں پاس کیں، جان ومال اور عزت وآبرو کی قربانیاں دیں، جو کچھ ہوا اور جو کچھ کیا اس کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ بہرحال جد وجہد ٹھکانے لگی، حق تعالیٰ نے غلامی کے طویل دور کے بعد آزادی کی نعمت نصیب فرمائی اور ایک بڑی عظیم سلطنت عطا فرمائی، ۱۲ کروڑ کی قابل قدر اطاعت شعار فرمانبردار رعیت عطا فرمائی جس نے کارخانے بنالئے۔ کاروبار کو ترقی دی۔ مملکت کو آباد کیا۔ اس کو چار چاند لگائے، باہر کی دنیا میں اس کا وقار قائم کیا، مسجدیں بنائیں، مدرسے تعمیر کرائے، اور اتنا کمایا کہ اپنے ٹیکسوں سے حکومت کے خزانوں کو معمور کیا اور قوم کی محنتوں سے ملک کہاں سے کہاں پہنچا، ماضی وحال کی تاریخ آپ کے سامنے ہے، غرض دین ودنیا کی سعادتوں سے مملکت کو ہم کنار بنایا لیکن جس بنیادی مقصد کا بار بار اعلان کیا جاتا تھا کہ اسلامی حکومت قائم ہوگی اور یوں عالم اسلام سے اتحاد ہوگا اس کے لئے حکمرانوں اور حکومتوں نے کیا کیا؟ اپنے وعدوں کو کہاں تک پورا کیا؟ یہاں کون کون سے اسلامی قوانین جاری ہوئے؟ کفر والحاد کو کہاں تک ختم کیا گیا؟ اسلامی معاشرت قائم کرنے کے لئے کیا کیا اقدام کئے گئے؟ ان تمام سوالات کا جواب حسرتناک نفی میں ملے گا، آخر امتحان کا یہ عبوری دور تھا، کون سی نعمت تھی جو حق تعالیٰ نے نہ دی ہو؟ کون سی فرصت تھی جو نہ ملی ہو؟ لیکن واحسرتاہ! کہ ربع صدی سے زیادہ عرصہ گذر گیا، مگر پاکستان کے مقصدِ وجود کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا، کون سا وعدہ پورا کیا گیا؟ کون سی اسلامی عدالت قائم ہوئی؟ زانی اور شرابی کو کون سی سزا دی گئی؟ بداخلاقی کا کیا انسداد کیا گیا؟ ظلم عدوان، رشوت ستانی، کنبہ پروری، بے حیائی وعریانی، سودخوری وبدمعاشی کو ختم کرنے کے لئے کون سا قدم اٹھایا گیا؟ بلکہ اس کے برعکس یہ ہوا کہ سودخوری، شراب نوشی، بداخلاقی، اور بے حیائی کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی گئی بلکہ سرکاری ذرائع سے اس کی نشر واشاعت میں کوئی کسر باقی نہیں اٹھا رکھی گئی، "بینات" کے صفحات میں ان دردناک داستانوں کو بار بار دہرایا گیا ہے۔

فسق وفجور اور گناہوں کے اثرات آخر اس فسق وفجور کی کثرت اور خدا فراموش زندگی کی لعنت سے دشمنانِ اسلام (ہندوستان امریکہ روس) کے گٹھ جوڑ سے ایک جھٹکا لگا،

اور اس بے نظیر مملکت کا ایک حصّہ کاٹ دیا گیا اور بقیہ حصّہ کو شر و فساد، اختلاف و انتشار، ہوشربا گرانی اور قحط میں مبتلا کر دیا گیا، امن و امان ختم ہو گیا، کسی کی نہ جان محفوظ، نہ کسی کا مال محفوظ، نہ کسی کی آبرو محفوظ، بڑی بڑی صنعتیں نیشنلائز کی گئیں مگر نتیجہ صفر، زمینداروں اور کسانوں کے درمیان باہم دست و گریباں کی فضا پیدا ہو گئی، مزدوروں اور کارخانہ داروں کے درمیان بے اعتمادی کی لہر دوڑ گئی، حکمرانوں کی عزت و احترام کا جذبہ رعایا کے دلوں سے نکل گیا، آخر یہ سب کچھ کیوں ہوا اور کس لئے ہوا؟

جواب صاف اور واضح ہے کہ ہم نے نفاق سے کام لیا، اسلام سے روگردانی کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے وفائی کی، خدا تعالیٰ کو دھوکا دیا، قول و عمل کے تضاد کو شعار بنایا اور منافقانہ زندگی کو اختیار کیا ؎

کارہا باخلق آری جملہ راست　　　با خدا تزویر و حیلہ کے رواست

آخر حق تعالیٰ کے قانونِ عدل کا ظہور شروع ہو گیا، قرآنِ کریم بار بار حق تعالےٰ کے اس قانونِ عدل کا صاف اعلان کرتا ہے کہ جب حق تعالےٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی جائے اور قانونِ خداوندی کی توہین کی جائے تو اس کا انجام یہی ہوتا ہے کہ وہ نعمتیں ان سے چھین لی جاتی ہیں اور ان کے بدلے میں عذابِ شدید اس قوم پر مسلط کر دیا جاتا ہے، ارشاد ہے:۔

«لئن شکرتم لأزیدنکم ولئن کفرتم إن عذابی لشدید»

اگر شکر کرو گے تو تمہیں زیادہ انعام دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

«فلما نسوا ما ذُکّروا به فتحنا علیهم أبواب کل شیٔ حتی إذا فرحوا بما أُوتوا أخذناهم بغتةً فإذا هم مبلسون فقطع دابر القوم الذین ظلموا والحمد لله رب العلمین»

(الانعام)

پھر جب وہ لوگ ان چیزوں کو بھول گئے جن کی ان کو نصیحت کی جاتی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے، یہاں تک کہ جب ان چیزوں پر جو ان کو ملی تھیں خواب اترا گئے تو ہم نے ان کو دفعةً پکڑ لیا، پھر وہ بالکل حیرت زدہ رہ گئے، پھر ظالم لوگوں کی جڑ کٹ گئی اور اللہ کا شکر ہے۔

نیز ارشاد ہے:۔

((وضرب اللّٰہ مثلاً قریۃً کانت آمنۃً مطمئنۃً یاتیھا رزقھا رغداً من کل مکان فکفرت بانعم اللّٰہ فاذاقھا اللّٰہ لباس الجوع والخوف بما کانوا یصنعون)) (النحل)

اور اللہ تعالیٰ ایک بستی والوں کی حالتِ عجیبہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ بڑے امن و اطمینان میں تھے، ان کے کھانے پینے کی چیزیں بڑی فراغت سے ہر چہار طرف سے ان کے پاس پہنچا کرتی تھیں سو انہوں نے خدا کی نعمتوں کی بے قدری کی اس پر اللہ تعالےٰ نے ان کو ان حرکات کے سبب ایک محیط قحط اور خوف کا مزہ چکھایا۔

کیا یہ ارشادات ہماری تنبیہ اور گوشمالی کے لئے کافی نہیں ؟ کیا دن بدن ہمارا قدم نحوست و ادبار کی طرف نہیں بڑھ رہا ؟ کیا ہم نے خدا کی متواتر نعمتوں کی ناشکری میں کوئی کسر چھوڑی ہے، کہاں گئی وہ قرار دادِ مقاصد جو شیخ الاسلام حضرت عثمانی کی کوششوں سے پاس ہوئی تھی ؟ کہاں ہے وہ تعلیماتی بورڈ جس پر لاکھوں روپیہ خرچ کیا گیا تھا ؟ کہاں ہے وہ اسلامی کونسل جس پر لاکھوں روپیہ سالانہ خرچ ہو رہا ہے ؟ کیا یہ سب کچھ نفاق نہیں ہے ؟ غضبِ الٰہی کو دعوت دینے والی کون سی برائی ہے کہ اس کو نہ اپنایا ہو اور نیکی و فلاح و بہبود کا کون سا کام ہے جسے ہم نے نہ ٹھکرایا ہو ؟ نہ معلوم کہ غفلت کے پردے کب چھٹیں گے اور بدنصیب قوم کا طالعِ سعید کب طلوع ہوگا ؟

پاکستان اور مرزائی امت

ماضی قریب میں اسلامی آئین بنایا گیا اور عالمِ اسلام میں اس کا چرچا کیا گیا لیکن خدارا بتائیں کہ کاغذی کارروائی سے کیا اب تک ایک قدم بھی آگے بڑھ سکا ؟ مرزائی امت جو اسلام کے نام سے اسلام کی بدترین دشمن ہے جو برطانیہ کا خود کاشتہ پودا ہے یہ وہ غدارِ اسلام تحریک ہے جس کے ذریعہ تمام عالمِ اسلام کی فضا کو مسموم کیا جا رہا ہے، جو تحریک صیہونیت کی ترقی یافتہ شکل ہے جس نے پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کر رکھا ہے جو "ریاست اندر ریاست" ہے جو اسلام میں نقب زنی کرتی ہے جو مسلمانوں کی دنیا و آخرت پر ڈاکہ ڈالتی ہے جو براہِ راست سید الانبیاء حضرتِ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی حریف ہے جس کی بنیاد ہی اسلام سے غداری و بے وفائی اور مسلمانوں سے عداوت و دشمنی پر رکھی گئی ہے جس کا مشن ہی اول سے آخر تک

مسلمانوں کی جاسوسی رہا ہے، اگر یہاں کے حکمرانوں کو خدا کا، رسول کا، اسلام کا اور خود اپنے بلند بانگ دعوؤں اور وعدوں کا کچھ پاس و لحاظ ہوتا تو کیا پاکستان میں - ہاں احمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر حاصل کئے گئے پاکستان میں، اس انگریزی تحریک اور اس مرزائی امت کا سکہ چل سکتا تھا؟ ہرگز نہیں لیکن حکمرانوں کے نفاق کی اندھیر نگری میں اس کفرِ خالص کا اسلام کے نام پر جعلی سکہ ربع صدی تک پھیلتا رہا، مسلمان قوم بے بسی کے عالم میں چیختی چلاتی رہی مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی، سیاست پر مرزائیوں کا تسلط رہا، اقتصادیات پر ان کا قبضہ رہا، دفاع کی پالیسی ان کے سپرد رہی، تعلقاتِ خارجہ ان کے زیر اثر اندرونی نظم و نسق پر حاوی رہے، اونچی اونچی ملازمتیں ان کے حصہ میں آئیں، قوم نے بار بار احتجاج کئے، التجائیں کیں، تحریکیں چلائیں، مطالبات کئے مگر سب کچھ صدا بصحرا ثابت ہوا، آخر لاہور کے تاریخی اجتماع میں قوم کو اعلان کرنا پڑا کہ اگر وزیرِ اعظم قادیانی مسئلہ میں عوام کی رائے کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھیں گے تو وہ پاکستان کے نہیں بلکہ ربوہ کے وزیرِ اعظم ہوں گے، خدا خدا کرکے ۷ستمبر کو پہلی بار کم از کم کاغذی سطح پر قوم کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا گیا کہ امتِ مرزائیہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے، ربوہ کو کھلا شہر قرار دیا جائے، قادیانی اوقاف حکومت کی تحویل میں لئے جائیں، کلیدی مناصب سے ان کو نکالا جائے، تمام بری، بحری، اور ہوائی فوج سے ان کو ہٹایا جائے، ان کے الگ تشخص اور امتیاز کے لئے شناختی کارڈ جلد سے جلد جاری کئے جائیں اور غیر مسلم مردم شماری میں ان کا اندراج کیا جائے، ان کی عبادت گاہوں کے نام تبدیل کرائے جائیں، مرزائیوں کی عبادت گاہوں کو مسجد نہ کہا جائے، انہیں اسلامی اصطلاحات کے غلط استعمال سے روکا جائے، نبی، نبوت، صلاۃ و سلام، وحیِ الٰہی، مسیح، مہدی، ام المومنین، خلیفہ، امیر المومنین وغیرہ وغیرہ اسلام کے مقدس الفاظ ہیں، غلام احمد اور اس کے گردوپیش کے لوگوں کے لئے ان کا استعمال ممنوع قرار دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔

ہمیں اس اعتراف میں ذرا بخل نہیں کہ حکومت نے ۷ستمبر کو مسلمانوں کے مطالبات آئینی طور پر تسلیم کر لئے اور قادیانیوں کو "غیر مسلم اقلیت" قرار دے دیا گیا، گذشتہ حکومتوں کی طرح مسلمانوں کے مطالبات ٹھکرا کر حکومت نے عاقبت نااندیشی کا ثبوت نہیں دیا مگر افسوس صد افسوس کہ آئینی

فیصلہ کے بعد حکومت یہ سوچ کر بے فکر ہو گئی کہ مسلمانوں کو مطمئن کر دیا گیا اور ان کے مطالبات تسلیم کر لئے گئے لیکن خدارا بتائیے کہ حکومت نے اس کاغذی فیصلہ کی تعمیل کے لئے کیا قدم اٹھایا، اور ان مطالبات اور وعدوں کو کس طرح پورا کیا گیا؟ گذشتہ اشاعت میں ہم عرض کر چکے ہیں کہ مرزائی آئین کے واضح فیصلہ کو صاف صاف ٹھکرا رہے ہیں مگر حکومت نے ان کے اس باغیانہ اعلان کے خلاف کیا کارروائی کی، اس سے بڑھ کر قول و عمل کے تضاد کی کیا مثال ہوگی۔

مرزائی بدستور مسلمانوں کا مضحکہ اڑا رہے ہیں، اسلام کی مقدس اصطلاحات کو ناپاک کر رہے ہیں، مسلمانوں کے نام سے حج پر جاتے ہیں، اسلامی ممالک میں ملازمتیں کر رہے ہیں، اندرونِ ملک بڑی بڑی آسامیوں پر قابض ہو کر مسلمانوں سے "مذہبی جنون" کا انتقام لے رہے ہیں، پاکستان کو زک پہنچانے کے لئے ہر ممکن تدبیر بروئے کار لا رہے ہیں، قوم کے مختلف طبقات میں طبقاتی خلفشار برپا کر رہے ہیں لیکن ان کے انسداد کے لئے ابھی تک کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھایا گیا، اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ مرزائیوں کو اور ان کے آقایانِ مغرب کو مسلمانوں کی نفسیاتی کمزوری کا احساس ہونے لگا کہ موجودہ دور کے مسلمان صرف کہنا جانتے ہیں کرنا نہیں جانتے، وہ قول کے ہیرو ہیں مگر عمل کے پھسڈی ہیں، چنانچہ اب وہ بڑی شد و مد کے ساتھ اور بڑے امن و سکون سے اپنی قوتوں کو مجتمع کرنے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے نئے تانے بانے بننے میں مصروف ہیں اور ریاستِ ربوہ کا خلیفہ چند سالوں تک مرزائیت کے غلبہ و اقتدار کی پیش خبریاں سنا رہا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون. بحمد للہ ہم باطل کے حربوں سے مرعوب نہیں، ہمیں یقین ہے کہ ملت اسلامیہ کے بدخواہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غدار جو کنواں کھودیں گے وہ سب سے پہلے خود انہی کا مدفن ثابت ہوگا لیکن ہمیں اپنے حکمرانوں سے شکایت ہے کہ وہ آئین کے واضح فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے سے کیوں ہچکچاتے ہیں؟ کیا ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں گی جب ایک نیا طوفان برپا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے، امتِ اسلامیہ کی حفاظت فرمائے اور انہیں طاغوتی طاقتوں کے شر و فساد سے محفوظ رکھے، آمین۔ وصلی اللہ علیٰ خیر خلقہ صفوۃ البریۃ محمد وآلہٖ واصحابہٖ واتباعہٖ اجمعین۔

جمادی الاولیٰ ۱۳۹۵ھ، جون ۱۹۷۵ء

اسلام میں شہادت فی سبیل اللہ کا مرتبہ اور مقام[1]

الحمدللہ رب العالمین، والعاقبۃ للمتقین، ولا عدوان الا علی الظالمین، والصلوٰۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین وخاتم النبیین محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ وتابعیھم اجمعین.

أما بعد: حضرات! اسلام میں شہادت فی سبیل اللہ کو وہ مقام حاصل ہے کہ (نبوت وصدیقیت کے بعد) کوئی بڑے سے بڑا عمل بھی اس کی گرد کو نہیں پا سکتا، اسلام کے مثالی دور میں اسلام اور مسلمانوں کو جو ترقی نصیب ہوئی وہ ان شہداء کی جان نثاری وجانبازی کا فیض تھا جنہوں نے اللہ رب العزت کی خوشنودی اور کلمۂ اسلام کی سربلندی کے لئے اپنے خون سے اسلام کے سدا بہار چمن کو سیراب کیا، شہادت سے ایک ایسی پائیدار زندگی نصیب ہوتی ہے جس کا نقشِ دوام جریدۂ عالم پر ثبت رہتا ہے جسے صدیوں کا گرد وغبار بھی نہیں دھندلا سکتا اور جس کے نتائج وثمرات انسانی معاشرے میں رہتی دنیا تک قائم ودائم رہتے ہیں۔

شہید اور شہادت کے فضائل

کتاب اللہ کی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث میں شہادت اور شہید کے اس قدر فضائل بیان ہوئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے اور شک وشبہ کی ادنیٰ گنجائش باقی نہیں رہتی۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ، — بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی،

---

[1] مجمع البحوث الاسلامیہ مصر کی چھٹی کانفرنس ۱۹۷۱ء میں حضرت مولانا نے مذکورہ بالا عنوان پر عربی میں مقالہ لکھا اور پڑھا جو بینات میں ربیع الثانی ۱۳۹۱ھ کے پرچہ میں حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب کے قلم سے اردو ترجمہ کی شکل میں شائع ہوا۔

يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ، وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ، وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ)) (التوبہ ع)

وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کئے جاتے ہیں اس پر سچا وعدہ کیا گیا ہے توریت میں اور انجیل میں اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو کون پورا کرنے والا ہے؟ تم لوگ اپنی اس بیع پر جس کا معاملہ تم نے ٹھہرایا ہے، خوشی مناؤ اور یہ ہی بڑی کامیابی ہے۔

سبحان اللہ! شہادت اور جہاد کی اس سے بہتر ترغیب ہو سکتی ہے؟ اللہ رب العزت خود بنفس نفیس بندوں کی جان و مال کا خریدار ہے جن کا وہ خود مالک و رزاق ہے اور اس کی قیمت کتنی اونچی اور کتنی گراں رکھی گئی؟ جنت! پھر فرمایا گیا کہ یہ سودا کچا نہیں کہ اس میں فسخ کا احتمال ہو بلکہ اتنا پکا اور قطعی ہے کہ توریت و انجیل اور قرآن تمام آسمانی صحیفوں اور خدائی دستاویزوں میں یہ عہد و پیمان درج ہے اور اس پر تمام انبیاء و رسل اور ان کی عظیم الشان امتوں کی گواہی ثبت ہے پھر اس مضمون کو مزید پختہ کرنے کے لئے کہ خدائی وعدوں میں وعدہ خلافی کا کوئی احتمال نہیں فرمایا گیا ہے ((ومن اوفٰی بعھدہٖ من اللہ)) یعنی اللہ تعالےٰ سے بڑھ کر اپنے وعدہ اور عہد و پیمان کی لاج رکھنے والا کون ہو سکتا ہے؟ کیا مخلوق میں کوئی ایسا ہے جو خالق کے ایفائے عہد کی ریس کر سکے؟ نہیں! ہرگز نہیں! مرتبۂ شہادت کی بلندی اور شہید کی فضیلت و منقبت کے سلسلہ میں قرآن مجید کی یہی ایک آیت کافی و دافی ہے۔ امام طبری، عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے مسجد میں "اللہ اکبر" کا نعرہ لگایا اور ایک انصاری صحابی بول اٹھے: واہ واہ! کیسی عمدہ بیع اور کیسا سود مند سودا ہے، واللہ! ہم اسے کبھی فسخ نہیں کریں گے نہ فسخ ہونے دیں گے: نیز حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

((وَمَنْ يُّطِعِ اللهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ

اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ

وَالصّدّیقینَ وَالشھداء والصّالحِین وَحسُنَ أُولٰئکَ رفیقًا» (النساء ع ۹)

تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صلحاء اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں راہِ خدا کے جانباز شہیدوں کو انبیاء و صدیقین کے بعد تیسرا مرتبہ عطا کیا گیا ہے نیز حق تعالےٰ کا ارشاد ہے ،

«ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ أموات بل أحیاء ولکن لا تشعرون»
(البقرہ ع ۱۹)

اور جو لوگ اللہ تعالےٰ کی راہ میں قتل کر دیئے ان کو مردہ مت کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم کو احساس نہیں ۔

نیز حق تعالےٰ کا ارشاد ہے ،

«ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ أمواتًا بل أحیاء عند ربھم یرزقون فرحین بما آتٰھم اللہ من فضلہ ویستبشرون بالذین لم یلحقوا بھم من خلفھم ألا خوف علیھم ولا ھم یحزنون یستبشرون بنعمة مّن اللہ وفضل وأن اللہ لا یضیع أجر المؤمنین»

(آل عمران ع ۱۷)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے گئے ان کو مردہ مت خیال کرو بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے مقرب ہیں ان کو رزق بھی ملتا ہے وہ خوش ہیں اس چیز سے جو ان کو اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی، اور جو لوگ اس کے پاس نہیں پہنچے ان سے پیچھے رہ گئے ہیں ان کی بھی اس حالت پر خوش ہوتے ہیں کہ ان پر کسی طرح کا خوف واقع ہونے والا نہیں نہ وہ مغموم ہوں گے، وہ خوش ہوتے بوجہ نعمت وفضلِ خداوندی کے اور بوجہ اس کے کہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کا اجر ضائع نہیں فرماتے۔

(ترجمہ حکیم الامۃ تھانوی)

ان دونوں آیتوں میں اعلان فرمایا گیا کہ شہداء کی موت کو عام انسانوں کی سی موت سمجھنا غلط ہے، شہید مرتے نہیں بلکہ مر کر جیتے ہیں، شہادت کے بعد انہیں ایک خاص نوعیت کی برزخی حیات سے مشرف کیا جاتا ہے ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگرست

یہ شہیدانِ راہِ خدا، بارگاہِ الٰہی میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں اور اس کے صلے میں حق جل شانہٗ کی طرف سے ان کی عزت و تکریم اور قدر و منزلت کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ ان کی روحوں کو سبز پرندوں کی شکل میں سواریاں عطا کی جاتی ہیں، عرشِ الٰہی سے متعلق قندیلیں ان کی قرارگاہ پاتی ہیں اور انہیں اذنِ عام ہوتا ہے کہ جنت میں جہاں چاہیں جائیں، جہاں چاہیں سیر و تفریح کریں اور جنت کی جس نعمت سے چاہیں لطف اندوز ہوں، شہید اور شہادت کی فضیلت میں بڑی کثرت سے احادیث وارد ہوئی ہیں اس سمندر کے چند قطرے یہاں پیشِ خدمت ہیں:۔

حدیث ۱: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لولا أن أشقّ علی أمتی ما قعدت خلف سریّة، ولوددت أنی أقتل ثم أحیی ثم أقتل ثم أحیی ثم أقتل" (اخرجہ البخاری فی عدۃ أبواب من کتاب الایمان والجہاد وغیرہا فی حدیث طویل)	اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ میری امت کو مشقت لاحق ہوگی تو میں کسی مجاہد دستے سے پیچھے نہ رہتا اور میری دلی آرزو یہ ہے کہ میں راہِ خدا میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں۔

غور فرمائیے، نبوت اور پھر ختمِ نبوت وہ بلند و بالا منصب ہے کہ عقل و فہم اور وہم و خیال کی پرواز بھی اس کی رفعت و بلندی کی حدوں کو نہیں چھو سکتی، اور یہ انسانی شرف و مجد کا وہ آخری نقطۂ عروج اور غایۃ الغایات ہے جس سے اوپر کسی مرتبہ و منزلت کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا لیکن اللہ رے مرتبۂ شہادت کی بلندی و برتری! کہ حضرت ختمی مآب صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف مرتبۂ شہادت کی تمنا رکھتے ہیں بلکہ بار بار دنیا میں تشریف لانے اور ہر بار محبوبِ حقیقی کی خاطر خاک و خون میں لوٹنے کی خواہش کرتے ہیں۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

صرف اسی ایک حدیث سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ مرتبۂ شہادت کس قدر اعلیٰ و ارفع ہے۔

حدیث ۲: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ارشاد فرمایا:۔

«ما من أحد يدخل الجنة يحب أن يرجع إلى الدنيا وله ما في الأرض من شيء إلا الشهيد يتمنى أن يرجع إلى الدنيا فيقتل عشر مرات لما يرى من الكرامة» (أخرجه البخاري في باب تمني المجاهد أن يرجع إلى الدنيا، ومسلم)

کوئی شخص جو جنت میں داخل ہو جائے، یہ نہیں چاہتا کہ وہ دنیا میں واپس جائے اور اسے زمین کی کوئی بڑی سے بڑی نعمت مل جائے، البتہ شہید یہ تمنا ضرور رکھتا ہے کہ وہ دس مرتبہ دنیا میں جائے پھر راہِ خدا میں شہید ہو جائے کیونکہ وہ شہادت پر ملنے والے انعامات اور نوازشوں کو دیکھتا ہے۔

حدیث ۳: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

(میں بعض دفعہ جہاد کے لئے اس وجہ سے نہیں جاتا کہ) بعض (نادار اور) مخلص مسلمانوں کا جی اس بات پر راضی نہیں کہ (میں تو جہاد کے لئے جاؤں اور) وہ مجھ سے پیچھے بیٹھ رہیں (مگر ان کے پاس جہاد کے لئے سواری اور سامان نہیں) اور میرے پاس (بھی) سواری نہیں کہ ان کو جہاد کے لئے تیار کرسکوں، اگر یہ عذر نہ ہوتا تو اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں کسی مجاہد دستے سے جو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے جائے پیچھے نہ رہا کروں۔

اور اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے، میری تمنا یہ ہے کہ میں راہِ خدا میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں۔ (بخاری و مسلم)

حدیث ۴: حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

«واعلموا أن الجنة تحت ظلال السيوف» بخاری

جان لو! کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔

حدیث ۵: حضرت مسروق تابعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی:۔

«ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله

اور جو لوگ راہِ خدا میں قتل کر دیئے گئے ان کو مردہ مت خیال کرو

أمواتا بل أحياء عند ربهم يرزقون)) الآية

بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے پروردگار کے مقرب ہیں ان کو رزق بھی ملتا ہے۔

تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تفسیر دریافت کی تو آپؐ نے فرمایا:

((أرواحهم في جوف طير لها قناديل معلقة بالعرش تسرح من الجنة حيث شاءت ثم تأوي إلى تلك القناديل، فاطلع إليهم ربهم اطلاعةً فقال: هل تشتهون شيئاً، قالوا: أي شيء نشتهي ونحن نسرح من الجنة حيث شئنا؟ ففعل ذلك بهم ثلاث مرات. فلما رأوا أنهم لن يتركوا من أن يسألوا قالوا: يارب! نريد أن ترد أرواحنا في أجسادنا حتى نقتل في سبيلك فلما رأى أن ليس لهم حاجة تركوا)) (رواہ مسلم)

شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کے جوف میں سواری کرتی ہیں ان کی قرارگاہ وہ قندیلیں ہیں جو عرشِ الٰہی سے آویزاں ہیں وہ جنت میں جہاں چاہیں سیر و تفریح کرتی ہیں، پھر لوٹ کر انہی قندیلوں میں قرار پکڑتی ہیں ایک بار ان کے پروردگار نے ان سے بالمشافہ خطاب کرتے ہوئے فرمایا: کیا تم کسی چیز کی خواہش رکھتے ہو؟ عرض کیا: ساری جنت ہمارے لئے مباح کر دی گئی ہے ہم جہاں چاہیں آئیں جائیں اس کے بعد اب کیا خواہش باقی رہ سکتی ہے؟ حق تعالےٰ نے تین بار اصرار فرمایا کہ اپنی کوئی چاہت تو ضرور بیان کرو، جب انہوں نے دیکھا کہ کوئی نہ کوئی خواہش عرض کرنی ہی پڑے گی تو عرض کیا: اے پروردگار! ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری روحیں ہمارے جسموں میں دوبارہ لوٹا دی جائیں تاکہ ہم تیرے راستے میں ایک بار پھر جامِ شہادت نوش کریں (اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ اب ان کی کوئی خواہش نہیں) چنانچہ جب یہ ظاہر ہوگیا تو ان کو چھوڑ دیا گیا۔

حدیث ۶: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((لا يكلم أحد في سبيل الله - والله أعلم بمن يكلم في سبيله - إلا جاء

جو شخص بھی اللہ کی راہ میں زخمی ہو۔ اور اللہ ہی جانتا ہے کہ کون اس کی راہ میں زخمی ہوتا ہے۔

يوم القيامة وجرحه يثعب دمًا اللون لون الدم والريح ريح المسك)) رواه البخاري ومسلم)

وہ قیامت کے دن اس حالت میں آئے گا کہ اس کے زخم سے خون کا فوارہ بہ رہا ہوگا، رنگ خون کا ہوگا اور خوشبو کستوری کی۔

حدیث ۷: حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((للشهيد عند الله ست خصال:

يغفر له في أول دفعة،

ويرى مقعده من الجنة،

ويجار من عذاب القبر، ويأمن من الفزع الأكبر،

ويوضع على رأسه تاج الوقار الياقوتة منها خير من الدنيا وما فيها،

ويزوّج ثنتين وسبعين زوجةً من الحور العين،

ويشفع في سبعين من أقربائه

(رواه الترمذي وابن ماجه، ومثله عند احمد والطبراني من حديث عبادة بن الصامت)

اللہ تعالیٰ کے ہاں شہید کے لئے چھ انعام ہیں:

(۱) اول وہلہ میں اس کی بخشش ہو جاتی ہے۔

(۲) (موت کے وقت) جنت میں اپنا ٹھکانا دیکھ لیتا ہے۔

(۳) عذاب قبر سے محفوظ اور قیامت کے فزعِ اکبر سے مأمون ہوتا ہے۔

(۴) اس کے سر پر "وقار کا تاج" رکھا جاتا ہے جس کا ایک نگینہ دنیا اور دنیا کی ساری چیزوں سے بہتر ہے،

(۵) جنت کی بہتّر حوروں سے اس کا بیاہ ہوتا ہے۔

(۶) اور اس کے ستّر عزیزوں کے حق میں اس کی شفاعت قبول کی جاتی ہے۔

حدیث ۸: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((الشهيد لا يجد ألم القتل إلا كما يجد أحدكم القرصة)) رواه الترمذي والنسائي والدارمي

شہید کو قتل کی اتنی تکلیف بھی نہیں ہوتی جتنی کہ تم میں سے کسی کو چیونٹی کے کاٹنے سے تکلیف ہوتی ہے۔

حدیث ۹: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((إذا وقف العباد للحساب جاء

جبکہ لوگ حساب کتاب کے لئے کھڑے ہوں گے تو کچھ

تومٍ واضعي سيوفهم على رقابهم تقطر دمًا، فازدحموا على باب الجنة فقيل: من هؤلاء؟ قيل الشهداء كانوا أحياء مرزوقين»

(رواه الطبراني)

لوگ اپنی گردن پر تلواریں رکھے ہوئے آئیں گے جن سے خون ٹپک رہا ہوگا، یہ لوگ جنت کے دروازے پر جمع ہو جائیں گے، لوگ دریافت کریں گے کہ یہ کون لوگ ہیں رجن کا حساب کتاب بھی نہیں ہوا سیدھے جنت میں آگئے) انہیں بتایا جائے گا کہ یہ شہید ہیں جو زندہ تھے جنہیں رزق ملتا تھا۔

حدیث ۱۰: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مامن نفس تموت لها عند الله خير يسرها أن ترجع إلى الدنيا إلا الشهيد، فإنه يسره أن يرجع إلى الدنيا فيقتل مرةً أخرى لما يرى من فضل الشهادة»

(رواه مسلم)

جس شخص کے لئے اللہ کے ہاں خیر ہو جب وہ مرے تو کبھی دنیا میں واپس آنا پسند نہیں کرتا البتہ شہید اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اس کی بہترین خواہش یہ ہوتی ہے کہ اسے دنیا میں واپس بھیجا جائے تاکہ وہ ایک بار پھر شہید ہو جائے اس لئے کہ وہ مرتبۂ شہادت کی فضیلت دیکھ چکا ہے۔

حدیث ۱۱: ابن منذر نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ سے روایت کیا ہے: "وہ کہتے ہیں کہ اپنے مال کی دیکھ بھال کے لئے میں غابہ گیا وہاں مجھے رات ہو گئی، میں عبد اللہ بن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ (جو شہید ہو گئے تھے) کی قبر کے پاس لیٹ گیا، میں نے قبر سے ایسی قراءت سنی کہ اس سے اچھی قراءت کبھی نہیں سنی تھی، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کا تذکرہ کیا، آپؐ نے فرمایا: یہ قاری عبد اللہ (شہید) تھے، تمہیں معلوم نہیں؟ اللہ تعالیٰ ان کی روحوں کو قبض کر کے زبرجد اور یاقوت کی قندیلوں میں رکھتے ہیں اور انہیں جنت کے درمیان (عرش پر) آویزاں کر دیتے ہیں، رات کا وقت ہوتا ہے تو ان کی روحیں ان کے اجسام میں واپس کر دی جاتی ہیں اور صبح ہوتی ہے تو پھر انہیں قندیلوں میں آجاتی ہیں"۔

یہ حدیث حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے "تفسیر مظہری" میں ذکر کی ہے، اس حدیث

سے معلوم ہوتا ہے کہ وفات کے بعد بھی شہداء کے لئے طاعات کے درجات لکھے جاتے ہیں۔

حدیث ۱۲: حضرتِ جابر رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں: جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، نے اُحد کے قریب سے نہر نکلوائی تو وہاں سے شہداءِ اُحد کو ہٹانے کی ضرورت ہوئی، ہم نے ان کو نکالا تو ان کے جسم بالکل تر و تازہ تھے، محمد بن عمرو کے اساتذہ کہتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والدِ ماجد حضرتِ عبداللہ رضی اللہ عنہ، کو (جو اُحد میں شہید ہوئے تھے) نکالا گیا تو ان کا ہاتھ زخم پر رکھا تھا وہاں سے ہٹایا گیا تو خون کا فوارہ پھوٹ نکلا، زخم پر ہاتھ دوبارہ رکھا گیا تو خون بند ہو گیا، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے اپنے والدِ ماجد کو ان کی قبر میں دیکھا تو ایسا لگتا تھا گویا سو رہے ہیں، جس چادر میں ان کو کفن دیا گیا تھا وہ جوں کی توں تھی اور پاؤں پر جو گھاس رکھی گئی تھی وہ بھی بدستور اصل حالت میں تھی، اس وقت ان کو شہید ہوئے چھیالیس سال کا عرصہ ہو چکا تھا، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں: اس واقعہ کو کھلی آنکھوں دیکھ لینے کے بعد اب کسی کو انکار کی گنجائش نہیں کہ شہداء کی قبریں جب کھودی جائیں تو جونہی تھوڑی سی مٹی گرتی اس سے کستوری کی خوشبو مہکتی تھی۔

یہ واقعہ امام بیہقی نے متعدد سندوں سے اور ابن سعد نے ذکر کیا ہے، جیسا کہ تفسیرِ مظہری میں نقل کیا ہے، مندرجہ بالا جواہرِ نبوت کا خلاصہ مندرجہ ذیل امور ہیں:۔

اول: شہادت ایسا اعلیٰ وارفع مرتبہ ہے کہ انبیاءِ کرام علیہم السلام بھی اس کی تمنا کرتے ہیں۔

دوم: مرنے والے کو اگر موت کے بعد عزت و کرامت اور راحت و سکون نصیب ہو تو دنیا میں واپس آنے کی خواہش ہرگز نہیں کرتا، البتہ شہید کے سامنے جب شہادت کے فضائل و انعامات کھُلتے ہیں تو اسے خواہش ہوتی ہے کہ بار بار دنیا میں آئے اور جامِ شہادت نوش کرے۔

سوم: حق تعالیٰ شہید کو ایک خاص نوعیت کی "برزخی حیات" عطا فرماتے ہیں، شہداء کی ارواح کو جنت میں پرواز کی قدرت ہوتی ہے اور انہیں اذنِ عام ہے کہ جہاں چاہیں آئیں جائیں، ان کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں اور صبح و شام رزق سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

چہارم: حق تعالیٰ نے جس طرح ان کو "برزخی حیات" سے ممتاز فرمایا ہے اسی طرح ان کے اجسام بھی محفوظ رہتے ہیں، گویا ان کی ارواح کو جسمانی نوعیت اور ان کے اجسام کو روح کی خاصیت

حاصل ہوتی ہے۔

پنجم: موت سے شہید کے اعمال ختم نہیں ہوتے، نہ اس کی ترقیٔ درجات میں فرق آتا ہے، بلکہ موت کے بعد قیامت تک اس کے درجات برابر بلند ہوتے رہتے ہیں۔

ششم: حق تعالیٰ ارواحِ شہداء کو خصوصی مسکن عطا کرتے ہیں جو یاقوت و زبرجد اور سونے کی قندیلوں کی شکل میں عرشِ اعظم سے آویزاں رہتے ہیں اور جنت میں چمکتے ستاروں کی طرح نظر آتے ہیں۔

بہت سے عارفین نے جن میں عارف باللہ حضرت شیخ شہید مظہر جانِ جاناںؒ بھی شامل ہیں ذکر کیا ہے کہ شہید چونکہ اپنے نفس، اپنی جان اور اپنی شخصیت کی قربانی بارگاہِ الوہیت میں پیش کرتا ہے اس لئے اس کی جزا اور صلہ میں اسے حق جل شانہ کی تجلّی ذاتی سے سرفراز کیا جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں کونین کی ہر نعمت ہیچ ہے۔

حضرات! شہادت نتیجہ ہے جہاد کا اور ہم نے کتاب اللہ کی ان آیات اور بہت سی احادیثِ نبویہ سے تعرض نہیں کیا جو جہاد کے سلسلہ میں وارد ہیں، چنانچہ "صحیح بخاری" اور "صحیح مسلم" میں متعدد صحابۂ کرام، حضرات عبداللہ بن رواحہ اور سہل بن سعد وغیرہما رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالےٰ کے راستے میں ایک صبح کو یا ایک شام کو جہاد کے لئے نکل جانا دنیا اور دنیا بھر کی ساری دولتوں سے بہتر ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "مجاہد فی سبیل اللہ کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص ساری عمر رات بھر قیام کیا کرے اور دن کو روزہ رکھا کرے، جہاد فی سبیل اللہ کے برابر کوئی نیکی نہیں"۔ ان کے علاوہ اور بہت سی احادیث ہیں۔

شہید کسے کہتے ہیں؟

حضرات! شہید کی کئی قسمیں ہیں، ان میں سب سے عالی مرتبہ وہ شہید ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اللہ کی بات کو اونچا کرنے کے لئے میدانِ جنگ میں کافروں کے ہاتھوں قتل ہو جائے، اس کے علاوہ اپنے دین کی حفاظت کرتے ہوئے جو قتل ہو جائے وہ بھی شہید ہے، جو شخص اپنی جان کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہو جائے وہ بھی شہید ہے اور جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہو جائے وہ بھی شہید ہے، جیسا کہ سعد بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت سے نسائی،

ابو داؤد اور ترمذی میں حدیث موجود ہے۔

امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا پانچ آدمی شہید ہیں جو طاعون سے مرے، جو پیٹ کی بیماری سے مرے، جو پانی میں غرق ہوجائے جو مکان گرنے سے مرجائے اور جو اللہ کی راہ میں شہید ہوجائے۔

حضرت جابر بن عتیک رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ کے راستے میں قتل ہونے کے علاوہ سات قسم کی موتیں شہادت ہیں: طاعون سے مرنے والا شہید ہے، ڈوب کر مرنے والا شہید ہے، نمونیہ کے مرض سے مرنے والا شہید ہے، پیٹ کی بیماری سے مرنے والا شہید ہے، جل کر مرنے والا شہید ہے، دیوار کے نیچے دب کر مرنے والا شہید ہے جو عورت حمل یا ولادت میں انتقال کر جائے وہ شہید ہے (یہ حدیث امام مالک، ابوداؤد اور نسائی نے روایت کی ہے)

ابوداؤد میں حضرت امّ حرام رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سمندر میں سر چکرانے کی وجہ سے جس کو قے آنے لگے اس کے لئے شہید کا ثواب ہے۔

نسائی شریف میں حضرت صفوان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نفاس میں (ولادت کے بعد) مرنے والی عورت کے لئے شہادت ہے۔

نسائی شریف میں حضرت سوید بن مقرن سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص ظلم کی مدافعت کرتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے۔

ترمذی شریف میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ شہید چار قسم کے ہیں: ایک وہ شخص جس کا ایمان نہایت عمدہ اور پختہ تھا اس کا دشمن سے مقابلہ ہوا، اس نے اللہ کے وعدوں کی تصدیق کرتے ہوئے دادِ شجاعت دی یہاں تک کہ قتل ہوگیا، یہ شخص اتنے بلند مرتبے میں ہوگا کہ قیامت کے روز لوگ اس کی طرف یوں نظر اٹھا کر دیکھیں گے یہ فرماتے ہوئے آپ نے سر اوپر اٹھایا یہاں تک کہ آپ کی ٹوپی سر سے گر گئی (راوی کہتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ اس سے حضرت عمرؓ کی ٹوپی مراد ہے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی)، فرمایا: دوسرا وہ مومن آدمی جس کا ایمان نہایت پختہ

تھا، دشمن سے اس کا مقابلہ ہوا مگر حوصلہ کم تھا، اس لئے مقابلے کے وقت اسے ایسا محسوس ہوا گویا خار دار جھاڑی کے کانٹے اس کے جسم میں چبھ گئے ہوں. (یعنی دل کانپ گیا اور رونگٹے کھڑے ہو گئے) تاہم کسی نامعلوم جانب سے تیر آکر اس کے جسم میں پیوست ہو گیا اور شہید ہو گیا، یہ دوسرے مرتبہ میں ہو گا، تیسرے وہ مومن آدمی جس نے اچھے اعمال کے ساتھ کچھ بُرے اعمال کی آمیزش بھی کر رکھی تھی، دشمن سے اس کا مقابلہ ہوا اور اس نے ایمان و یقین کے ساتھ خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا حتیٰ کہ قتل ہو گیا، یہ تیسرے درجے میں ہو گا، چوتھے وہ مومن آدمی جس نے اپنے نفس پر (گناہوں سے) زیادتی کی تھی (یعنی نیکیاں کم اور گناہ زیادہ تھے) دشمن سے اس کا مقابلہ ہوا اور اس نے خوب جم کر مقابلہ کیا یہاں تک کہ قتل ہو گیا، یہ چوتھے درجے میں ہو گا، مسند دارمی میں حضرت عتبہ بن عبد السلمی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: راہِ خدا میں قتل ہونے والے تین قسم کے لوگ ہیں: ایک وہ مومن جس نے اپنی جان و مال سے راہِ خدا میں جہاد کیا، دشمن سے مقابلہ ہوا، خوب لڑا یہاں تک کہ شہید ہو گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ وہ شہید ہے جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے چن لیا، یہ عرشِ الٰہی کے نیچے اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے خیمے میں ہو گا، نبیوں کو اس پر فضیلت صرف درجۂ نبوت کی وجہ سے ہو گی، دوسرے وہ مومن جس نے کچھ نیک عمل کئے تھے کچھ بُرے، اس نے جان و مال کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کیا اور دشمن کے مقابلے میں لڑا یہاں تک کہ قتل ہو گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں فرمایا: مٹا دینے والی (تلوار) نے اس کی غلطیوں اور گناہوں کو مٹا دیا ہے بلاشبہ تلوار گناہوں کو مٹا دیتی ہے اور اس شہید کو اجازت دی گئی کہ وہ جس دروازے سے چاہے جنت میں داخل ہو جائے. تیسرا منافق: جس نے جان و مال سے جہاد کیا، دشمن سے مقابلہ ہوا، مارا گیا یہ دوزخ میں جائے گا کیونکہ تلوار (اور گناہوں کو تو مٹا دیتی ہے مگر، نفاق (دل میں چھپے ہوئے کفر) کو نہیں مٹاتی.

حاصل یہ کہ ان تمام احادیث کو جن میں شہادت کی اموات کو متفرق بیان کیا ہے جمع کر لیا جائے تو شہداء کی فہرست کافی طویل ہو جاتی ہے اور سب جانتے ہیں کہ جو لوگ مفہومِ مخالف کے قائل ہیں ان کے نزدیک بھی عدد میں مفہومِ مخالف کا اعتبار نہیں، نہایت جلدی میں یہ چند احادیث پیش

کی گئیں۔ ورنہ اس موضوع کے استیعاب کا قصد کیا جاتا تو شہداء کی تعداد کافی زیادہ نکل آتی لے

پھر قیاس و اجتہاد کے ذریعہ ایسے شہداء کو بھی ان سے ملحق کیا جا سکتا ہے جو اگرچہ احادیث میں صراحۃً نہیں آئے مگر حدیث کے اشارات سے نکالے جا سکتے ہیں مثلاً فرمایا: جو اپنے حق کی مدافعت کرتا ہوا مارا جائے وہ شہید ہے۔" اب یہ عام ہے جو تمام حقوق کو شامل ہے لہٰذا جو شخص مادرِ وطن کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے وہ شہید ہوگا، جو ظلم و عدوان کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہوگا، الغرض جو مسلمان اپنی جان کی اپنے اہل و عیال کی، اپنی عزت کی، اپنے مال کی، اپنے وطن کی، سرزمینِ اسلام کے وقار کی اور مسلمانوں کی عزت و قوت کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے وہ حسبِ درجہ شہید کا مرتبہ پائے گا، بشرطیکہ اس کی مدافعت رضائے الٰہی کے لئے ہو محض جاہلی عصبیت خالص قومیت اور جاہلی حمیت کی بنا پر نہ ہو۔

مسلمانوں کی ذلت و رسوائی کے اسباب

کون نہیں جانتا کہ "وطن" اپنی ذات میں کوئی مقدس چیز نہیں، اس کی عزت و حرمت محض اس وجہ سے ہے کہ وہ اسلام کی شان و شوکت اور اس کی سربلندی کا ذریعہ ہے اور "قومی اسٹیٹ" میں سوائے اس کے تقدیس کا کوئی پہلو نہیں کہ وہ اسلامی قوت کا مرکز اور مسلمانوں کی عزت و شوکت کا مظہر ہے، آج جو مشرق و مغرب میں اسلام دشمن طاقتیں عرب و عجم کے مسلمانوں کے خلاف متحد ہو کر انہیں خود ان کے اپنے علاقوں میں طرح طرح سے ذلیل و خوار اور پریشان کر رہی ہیں اس کا واحد سبب یہ ہے کہ ہم نے فریضہ جہاد سے غفلت برتی اور مرتبۂ شہادت حاصل کرنے کا ولولہ جاتا رہا، جہاد سے غفلت کی وجہ یہ نہیں کہ ہمارے پاس مال و دولت اور مادی وسائل کا فقدان ہے یا یہ کہ مسلمانوں کی مردم شماری کم ہے، اللہ رب العزت نے اسلامی عربی ممالک کو ثروت اور مال کی فراوانی کے وہ اسباب عنایت فرمائے ہیں جو کبھی تصور میں بھی نہیں آ سکتے تھے، صرف

لے مظاہر حق شرح مشکوۃ میں مرقاۃ اور "طوالع الانوار حاشیہ درِ مختار" کے حوالے سے نیز شامیؒ نے ردالمحتار میں شہداء کی فہرست شمار کی ہے جو کم و بیش ساٹھ ہیں۔ مترجم

یہی نہیں بلکہ ان وسائل میں یہ اسلام دشمن طاقتیں بھی عالمِ اسلام اور ممالکِ عربیہ کی دستِ نگر اور محتاج ہیں، الغرض آج مسلمانوں کی ذلت کا سبب وسائل کی کمی نہیں بلکہ اس کا اصل باعث ہمارا باہمی شقاق ونفاق ہے، ہم نے اجتماعی ضروریات پر شخصی اغراض کو مقدم رکھا، انفرادی مصالح کو قومی مصالح پر ترجیح دی، راحت وآسائش کے عادی ہو گئے، روحِ جہاد کو کچل ڈالا اور آخرت اور جنت کے عوض جان ومال کی قربانی کا جذبہ سرد پڑ گیا، یہ ہیں وہ اسباب جن کی بدولت مسلمان قوم اوجِ ثریا سے ذلت وحقارت کی عمیق وادیوں میں جاگری۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث جس کو امام ابوداؤد وغیرہ نے روایت کیا، اہلِ علم کے حلقہ میں معروف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ زمانہ قریب ہے جبکہ تمام اسلام دشمن قومیں تمہارے مقابلے میں ایک دوسرے کو دعوتِ ضیافت دیں گی، ایک صاحب نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا اس وجہ سے کہ اس دن ہماری تعداد کم ہوگی؟ فرمایا: نہیں! بلکہ تم بڑی کثرت میں ہوگے، لیکن تم سیلاب کے جھاگ کی مانند ہوگے، اللہ تعالیٰ دشمنوں کے دل سے تمہارا رعب نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں کمزوری اور دوں ہمتی ڈال دے گا، ایک صاحب نے عرض کیا: یا رسول اللہ دوں ہمتی سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: دنیا کی چاہت اور موت سے گھبرانا۔

بہر حال جب ہم مسلمانوں کی موجودہ ناگفتہ بہ زبوں حالی کے اسباب کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمارے سامنے چند چیزیں ابھر کر آتی ہیں جن کی طرف ذیل میں نہایت اختصار سے اشارہ کیا جاتا ہے:۔

اوّل: اعداءِ اسلام پر وثوق واعتماد اور بھروسہ کرنا (خواہ روس ہو یا امریکہ ومغربی اقوام) ظاہر ہے کہ کفر اپنے اختلافات کے باوجود ایک ہی ملت ہے اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد وتوکل اور مسلمانوں پر بھروسہ نہ کرنا جب کہ تمام مسلمانوں کو حکم ہے کہ:

((وعلى الله فليتوكل المؤمنون)) صرف اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیئے مسلمانوں کو

اس آیت میں نہایت حصر وتاکید کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو اللہ رب العزت کے سوا کسی شخصیت پر اعتماد اور بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے (حیث قدم قولہ: وعلی اللہ)

دوم: مسلمانوں کا باہمی اختلاف وانتشار اور خانہ جنگی جس کا یہ عالم ہے کہ اگر وہ آپس میں کہیں مل بیٹھ کر صلح صفائی کی بات کرتے ہیں تب بھی ان کی حالت یہ ہوتی ہے۔

((تحسبهم جمیعًا وقلوبهم شتّٰی)) بظاہر تم ان کو مجتمع دیکھتے ہو مگر ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔

سوم: توکل علی اللہ سے زیادہ مادی اور عادی اسباب پر اعتماد، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان تمام اسباب و وسائل کی فراہمی کا حکم دیا ہے جو ہمارے بس میں ہوں اور جن سے دشمن کو مرعوب کیا جاسکے لیکن افسوس ہے کہ ایک طرف سے تو ہم مادی اسباب کی فراہمی میں کوتاہ کار ہیں اور دوسری طرف فتح و نصرت کا جو اصل سرچشمہ ہے اس سے غافل ہیں، ارشادِ خداوندی ہے:۔

((وما النصر إلا من عند الله العزیز الحکیم)) نصرت و فتح تو صرف اللہ عزیز و حکیم کے پاس ہے اور اسی کی جانب سے ملتی ہے۔

تاریخ کے بیسیوں نہیں سینکڑوں واقعات شاہد ہیں کہ کافروں کے مقابلہ میں بے سروسامانی اور قلتِ تعداد کے باوجود فتح و نصرت نے مسلمانوں کے قدم چومے۔

چہارم: دنیا سے بے پناہ محبت، عیش پرستی اور راحت پسندی، آخرت کے مقابلے میں دنیا کو اختیار کرنا قومی اور ملی تقاضوں پر اپنے ذاتی تقاضوں کو ترجیح دینا اور روحِ جہاد کا نکل جانا، اس کی تفصیل طویل ہے، قرآنِ کریم کی سورۂ آلِ عمران اور سورۂ توبہ میں نہایت عالی مرتبہ عبرتیں موجود ہیں، امت کا فرض ہے کہ اس روشن مینار کو ہمیشہ پیش نظر رکھے۔

بہرحال، اللہ کے راستے میں کلمۂ اسلام کی سربلندی کے لئے دشمنوں سے معرکہ آرائی، راہِ خدا میں جہاد کرنا اور اسلام کی خاطر اپنی جان قربان کر دینا نہایت بیش قیمت جوہر ہے، قرآنِ کریم اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے دنیوی فوائد اور اخروی درجات کو ہر پہلو سے روشن کر دیا ہے اور اس کی وجہ سے امتِ محمدیہ پر جو عنایاتِ الٰہیہ نازل ہوتی ہیں ان کے اسرار کو نہایت فصاحت و بلاغت سے واضح کر دیا ہے۔

حضرات! یہ ایک مختصر سا مقالہ ہے جو نہایت مصروفیت اور کم وقت میں لکھا گیا اس لئے بحث کے بہت سے گوشے تشنہ رہ گئے ہیں جس پر مسامحت کی درخواست کروں گا، آخر میں ہم حق تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہماری غلطیوں کی اصلاح فرمائے، ہمارے درمیان قلبی اتحاد پیدا فرمائے، کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد اور نصرت فرمائے اور ہمیں صبر، عزیمت، مسلسل محنت کی لگن اور تقویٰ کی صفات سے سرفراز فرماکر کامیاب فرمائے۔ آمین

ربیع الثانی ۱۳۹۱ھ

علم کی اقسام اور ان کے حصول کا راستہ

علم دنیا میں دو راستوں سے آیا ہے ایک علمِ الٰہی ہے جو بذریعہ وحی انبیاءِ کرام علیہم السلام کے توسط سے دنیا والوں کو پہنچا ہے، اس علم کی معلّم اوّل خود حضرت حق سبحانہٗ وتعالیٰ شانہٗ کی ذاتِ گرامی صفات ہے اور اس کے اوّلین شاگرد حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام ہیں، اس مقدس سلسلۂ تلامذہ میں پہلے شاگرد اور متعلم ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام ہیں جن کے علم وفضل کا لوہا ملائکہ مقربین تک نے مانا ہے اور اس لحاظ سے حضرتِ آدم علیہ السلام کے ذریعہ ہی اس علمِ الٰہی کا پہلا درس حظیرۂ قدس کی درس گاہ میں ملأ اعلیٰ کے فرشتوں کو ہی دیا گیا ہے یہ علمِ الٰہی وہ علم ہے جس کے ادراک ومعرفت سے عقلِ انسانی قاصر وعاجز ہے، اس لئے کہ یہ حقائقِ الٰہیہ اور علومِ غیبیہ عقلِ انسانی کی دسترس سے بالاتر اور وراء الوراء (دور سے دور تر) ہیں، ارشاد ہے:۔

«ولا یحیطون بشیٔ من علمہ إلا بما شاء» اور وہ (انسان) نہیں احاطہ کرسکتے اس کے علم کے کسی حصّہ پر بھی بجز اس کے جو وہ خود (عطا فرمانا) چاہے۔

اور اس بما شاء کے استثناء کے تحت ان علوم کا جو حصّہ انسانوں کو دیا گیا ہے وہ علم الاُولین والآخرین (اگلوں اور پچھلوں سب کا علم) ہونے کے باوجود بھی "قدرِ قلیل" گویا بحرِ ذخّار کے ایک قطرہ کا مصداق ہے، ارشاد ہے:۔

«وما أُوتیتم من العلم إلا قلیلا» اور جو علم تم کو دیا گیا ہے وہ تو بہت ہی تھوڑا علم ہے۔

دوسرا وہ علم ہے جس کا ذریعہ عقل وادراک کا وہ جوہرِ لطیف ہے جو خالقِ کائنات نے ہر انسان کی فطرت میں علیٰ فرقِ المراتب (درجہ بدرجہ) ودیعت فرمایا ہے جس کا ظہور ہر بچہ میں ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی شروع ہوجاتا ہے اور سن وسال نیز محسوسات ومشاہدات اور تجربات کے اضافہ کے ساتھ ساتھ بڑھتا اور ترقی کرتا رہتا ہے۔

بحیثیت مجموعی ہر دور میں عقل انسانی میں جتنی پختگی پیدا ہوتی گئی "فکری و نظری علم" بڑھتا اور ترقی و تنوع اختیار کرتا رہا اور جوں جوں نسلِ انسانی کو نت نئی حاجات و ضروریات پیش آتی رہیں ان کو پورا کرنے کی تگ و دو میں اس علم کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا۔

لیکن اس علمِ انسانی کے مبادی، محسوسات و مشاہدات و تجربات سے انتفاع میں بھی عقلِ انسانی کی ابتدائی رہنمائی وحی والہامِ الٰہی کے ذریعہ ہی ہوئی ہے اور تمامتر صنعتوں اور حرفوں کے اصول و مبادی کے معلمِ اوّل بھی انبیاءِ کرام علیہم السلام ہی ہوئے ہیں۔

چنانچہ تمام مفسرین اس پر متفق ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی وہ تمامتر آسمانی تعلیمات جن کی تبلیغ و تعلیم کے لئے انھیں مبعوث کیا گیا تھا معبودِ حقیقی کی ابتدائی معرفت اور اس روئے زمین پر انسانی زندگی کے ابتدائی لوازمات، غذا، لباس اور مسکن کے مہیا کرنے کے طریقوں کی تعلیم پر مشتمل تھیں، حضرت ادریس علیہ السلام خیاطت (کپڑے سینے) کے معلم اول تھے، حضرت نوح علیہ السلام کشتی سازی اور جہاز سازی کے معلم اوّل ہوئے ہیں، حضرت داؤد علیہ السلام آلاتِ حرب میں سے زرہ سازی کے معلم اوّل اور حضرت سلیمان علیہ السلام فنونِ لطیفہ میں سے عمارت سازی اور ظروف سازی کے معلم اوّل ہوئے ہیں، معدنیات میں سے خام لوہے سے فولاد تیار کرنے اور تانبہ کو سیال کرنے کی صنعت کے معلمِ اوّل بھی حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام ہی ہوئے ہیں قرآنِ کریم کی نصوص اور صریح آیات اس پر شاہد ہیں۔

لیکن یہ تمام علوم جو انسانی عقل اور قوت اختراع کے ذریعہ پروان چڑھے اور دنیا میں پھیلے درحقیقت علوم نہیں بلکہ فنونِ صنعت و حرفت ہیں جنہیں انسانی عقل، موجوداتِ عالم خصوصًا زمین اور اس کی اندرونی و بیرونی پیداوار یعنی معدنیات و نباتات و حیوانات، پہاڑوں اور جنگلات کی طبعی پیداوار کے افعال و خواص اور منفعتوں مضرتوں کے مسلسل مطالعہ اور ان کی تحلیل و ترکیب سے انسانی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے والی نو بنو ایجادات و اختراعات کو سالہا سال تک بروئے کار لاتی رہی ہے اور یہ نو بنو مصنوعات وجود میں آتی رہی ہیں۔

بہر حال قرآنِ کریم کی روشنی میں یہ تو مسلم ہے کہ حیاتِ انسانی کے ابتدائی مراحل میں عقلِ انسانی کی رہنمائی بھی وحیِ الٰہی کے ذریعہ ہوئی ہے بلکہ مستدرکِ حاکم کی ایک روایت سے

تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی ذریت میں نسلاً بعد نسل جو صنعتیں اور حرفتیں قیامت تک وجود میں آنے والی تھیں جن کی تعداد اس روایت کے بموجب ایک ہزار ہے وہ سب اللہ جل شانہٗ نے حضرت آدم کو سکھائی ہیں آیتِ کریمہ وعلم آدم الاسماء کلھا سے اس روایت کی تائید ہوتی ہے فلسفہ توالد وتناسل کی رو سے بھی آدم یعنی ابو البشر کی خلقت اور فطرت میں ان تمام کمالات و فنون کے اجمالی نقوش موجود ہونے ضروری ہیں جو ان کی ذریت میں بطور توارث نسل انسانی کے مختلف ادوار میں وجود میں آنے والے ہیں۔

انسانی عقل و قوت اختراع اور دُنیا

اس جہانِ حدوث و فنا یعنی دنیا کے بقاء و ارتقاء کے لئے یہ علومِ عقلیہ صناعیہ اور ضروریاتِ زندگی کی کفیل صنعتیں بے حد ضروری ہیں اور ہر دور میں حق تعالیٰ شانہٗ عقل و ادراکِ انسانی کی تحقیقات و تجربات کے ذریعے اپنی گوناگوں عنصری، معدنی، نباتاتی اور حیوانی مخلوق میں چھپی ہوئی بے شمار صلاحیتیں، منفعتیں اور مضرتیں ظاہر کرتے اور منظرِ عام پر لاتے رہے ہیں اس لئے کہ خالقِ کائنات نے حضرت انسان کو ہی ان پر متصرف بنایا ہے اور انہی ارضی و سماوی کائنات و مخلوقات سے اس کی زندگی وابستہ ہے ارشاد ہے:۔

«وسخر لکم ما فی السمٰوات والأرض وخلق لکم ما فی الارض جمیعًا»

وہ جو آسمانوں اور زمینوں میں ہے سب تمہارے تصرف میں دے دیا ہے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لئے ہی پیدا کیا ہے۔

چنانچہ انسانی عقل اور قوت اختراع کے ذریعہ خلق لکم اور سخر لکم کی عملی تفسیر ہمیشہ سامنے آتی رہی ہے اور رہتی دنیا تک آتی رہے گی، نئی نئی "دریافتیں" ہوتی رہیں گی اور نو بنو ایجادات و مصنوعات منظرِ عام پر آتی رہیں گی، نہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کے ودیعت فرمودہ افعال و خواص اور منفعتوں اور مضرتوں کی کوئی حد و انتہا ہے اور نہ ہی انسانی ایجاد و اختراع کی کوئی حد و نہایت ہے، درحقیقت خالقِ کائنات کی ان نو بنو شئونِ الٰہیہ کے تحت جن کے متعلق ارشاد ہے «کل یوم ھو فی شأن» ہر روز اس کی نئی شان اور نرالی

شان ہے، ہر نیا دن اپنے ساتھ نئی نئی دریافتیں اور نو بنو ایجادات واختراعات لاتا ہے۔

اس طرح ایک طرف اس کارخانۂ قدرت کی لامحدود وسعت ہمہ گیری اور احاطہ کا اور دوسری طرف روز افزوں دولت وثروت اور نو بنو لوازمِ معیشت کا ظہور ہوتا ہے اور حق جل وعلیٰ کے کمالِ علم وقدرت اور محیر العقول کائناتی نظام کی حکمتیں اور اسرار ظاہر ہوتے رہتے ہیں تاکہ یہ حضرتِ انسان ان آیاتِ بینات۔ روشن دلائل کو دیکھ کر زبانِ حال اور زبانِ قال دونوں طریق پر اعتراف کرتے رہیں :۔

«ربنا ما خلقت هذا باطلا» اے پروردگار بے شک تو نے اس (کارخانہ قدرت) کو دیونہی) بیکار وبے فائدہ نہیں پیدا کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ دنیا کی یہ گوناگوں ارضی وسماوی موجودات اور ان کے حقائق وعجائبات اور اسرار وحکم کے دریافت واکتشافات کا کفیل عقل وادراکِ انسانی ہی کو بنایا گیا ہے اسی میں وہ شب وروز مصروف ومنہمک ہے اور قیامت تک رہے گی اسی لئے کسی رند مشرب کا مقولہ ہے کہ "خدا اور انسان اپنی تخلیق باہم سے زندہ ہیں" بات ایک حد تک صحیح ہے لیکن اندازِ بیان عظمت وجلال خداوندی کے منافی اور تعبیر گستاخانہ ہے۔

انبیاء علیہم السّلام کا فرضِ منصبی

ان صناعی علوم کا انبیاء علیہم السلام کے فرضِ منصبی سے کوئی تعلق نہیں، نبوت کا فرض منصبی تو یہ ہے کہ ان حقائقِ الٰہیہ اور مرضیاتِ خداوندی کو وہ بیان کریں جن کی معرفت سے عقل انسانی قاصر ہے اسی لئے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا ہے :۔

«أنتم أعلم بأمور دنياكم» دنیاوی دھندوں کو تم خود ہی خوب جانتے ہو۔

انبیاء علیہم السلام کا اصلی کام حق تعالیٰ کی ذات وصفات وکمالات کی معرفت، عبادت وطاعتِ الٰہی کے طریقوں اور ما فی السمٰوات والارض سے انتفاع واستعمال کے سلسلہ میں مرضیاتِ الٰہیہ اور منشا خداوندی سے آگاہ کرنا، مبدأ ومعاد کے احوال، مرنے کے بعد کی زندگی کے کوائف حساب وکتاب اعمال کی تفصیلات اور جزا وسزا، جنت ودوزخ وغیرہ

حقائقِ دینیہ کا بیان کرنا ہے، یہ وہ علم ہے جس کا عقلِ انسانی قطعی ادراک نہیں کر سکتی۔

قانونِ الٰہی اور مذہبِ سماوی کی ضرورت؟

اگر اس نظام کا بقاء وارتقاء ان دنیوی علوم وفنون اور وسائل وضروریات کی تکمیل پر موقوف ہے تو دنیا کا معنوی بقاء روحانی ارتقاء انسان کی درندگی اور بہیمیت سے محفوظ "انسانیت" کی تعلیم وتربیت پر موقوف ہے اگر نفوس کی تعلیم وتربیت، قلوب کی اصلاح و تزکیہ اور اس خلق لکم ما فی الارض جمیعاً (جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے فائدہ کے لئے پیدا کیا ہے) سے انتفاع میں عقلِ انسانی کی صحیح رہنمائی "علومِ وحی" یعنی مذہب اور دینِ الٰہی کے ذریعہ نہ کی جائے اور عقلِ انسانی کو آزاد اور شترِ بے مہار کی طرح بے لگام چھوڑ دیا جائے تو یہ پورا کارخانہ قدرت اور سارا عالم خود اسی انسان کے ہاتھوں جس کی فلاح و بہبود کے لئے یہ پیدا کیا گیا ہے یکسر تباہ و برباد ہو جائے اور روئے زمین فساد و بربریت قتل وغارت اور درندگی کی آماجگاہ بن کر رہ جائے جس کی نشاندہی آیتِ کریمہ ذیل میں کی گئی ہے:۔

«ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت أیدی النّاس»	بحر و بر میں لوگوں کی کرتوتوں کی وجہ سے ایک فساد برپا ہے۔

اس لئے قانونِ قدرت کا تقاضا اور بقاء اصلح کے اصول کا فیصلہ یہی ہے کہ ہر دور میں اس سرزمین پر انسانی دسترس سے بالاتر قانونِ الٰہی اور مذہبِ سماوی کا وجود ضروری ہے تاکہ انسان انسان رہیں حیوان اور درندے نہ بن جائیں۔

موجوداتِ عالم سے انتفاع اور ان کے استعمال پر مذہب یعنی احکامِ الٰہیہ کی یہ پابندی اس لئے بھی ضروری اور ناگزیر ہے کہ خالقِ کائنات نے جس طرح انسان کی "عبدیت" یا کہیئے عقل وخرد کی آزمائش اور اس کے اشرف المخلوقات ہونے کی اہلیت کو ظاہر کرنے کی غرض سے خود انسان کی خلقت میں نیکوکاری و پرہیزگاری اور فسق وفجور و بدکاری دونوں کے رجحانات فطری طور پر رکھ دیئے ارشاد ہے:۔

«فالھمھا فجورھا وتقواھا» — پس دل میں ڈال دیا اس کے اس کی بدکاری کو اور پرہیزگاری کو۔

اور متنبہ فرما دیا:۔

«قد افلح من زکّٰھا وقد خاب من دسّٰھا» — بے شک جس نے اس نفس کو پاک وصاف کر لیا اس نے فلاح پائی اور جس نے اس کو زندہ درگور کر دیا وہ خسارہ میں رہا۔

اسی طرح انسان کے تصرف اور استعمال میں دی جانے والی تمام موجوداتِ عالم میں منفعت اور مضرت دونوں قسم کے خواص واثرات بھی رکھ دیئے دنیا کی کوئی بھی چیز نہ اس طرح منفعت رساں ہے کہ اس میں مضرت کا شائبہ بالکل نہ ہو اور نہ ایسی مضرت رساں کہ اس میں منفعت کا کوئی شائبہ نہ ہو حتیٰ کہ سمیات میں بھی عظیم منافع موجود ہیں پھر صرف اتنا ہی نہیں کہ منفعت ومضرت کا کوئی یکساں اور مطرّد ضابطہ نہیں بلکہ ایک ہی چیز ایک وقت اور ایک حالت میں نافع مفید اور حیات آفرین ہے اور وہی چیز دوسرے وقت اور دوسرے حالات میں سخت مضر اور ہلاکت خیز ہوتی ہے، طبائع اور امزجہ میں بھی اسی طرح کا فرق اور تفاوت رکھا کہ ایک ہی چیز ایک شخص کے لئے مضر اور مہلک ہے اور وہی چیز دوسرے شخص کے لئے مفید اور صحت بخش ہے اور اس متنوع اور متضاد انفعال وخواص کی حامل موجودات پر متصرف بنا دیا، اس نکوکاری اور بدکاری دونوں قسم کے متضاد رجحانات کی مالک مخلوق انسان کو پھر اچھی بُری، مفید ومضر اشیاء کے انتخاب کا اختیار صرف عقل وخرد کے ہاتھ میں نہیں دیا بلکہ نفسانی اغراض وخواہشات کو اس انتخاب میں دراندازی کرنے کی پوری قدرت دی نتیجہ یہ ہے کہ ہر وقت اور ہر قدم پر عقل وخرد اور نفسانی اغراض وخواہشات میں زبردست کشمکش اور کھینچ تان برپا ہے اور یہ ظلوم وجہول مخلوق یعنی حضرت انسان سر پکڑے حیران کھڑا ہے۔

اسی ہوا وہوس اور عقل وخرد کی کش مکش کے مواقع کے لئے اللہ رب العالمین اپنی اس "حامل امانت مخلوق" حضرتِ انسان کی رہنمائی فرماتے ہیں :۔

«عسیٰ أن تحبوا شیئاً وھو شر لکم وعسیٰ أن تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم واللہ یعلم وأنتم لا تعلمون»	بہت ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لئے بُری اور مضر ہو اور ایسے ہی بہت ممکن ہے کہ تم کو ایک چیز پسند نہ ہو اور وہی چیز تمہارے لئے بہتر ہو اللہ ہی (حقیقت حال) جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

یعنی زمامِ اختیار ہوا و ہوس کے ہاتھ میں ہرگز مت دینا اور ہمیشہ حکمِ خداوندی کے مطابق اچھے بُرے اور پسند و ناپسند کا فیصلہ کرنا ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔

اس لئے بھی موجوداتِ عالم اور انسانی اختراع کردہ مصنوعات سے انتفاع اور ان کے استعمال کے بارے میں انسان کی رہنمائی اور دستگیری کی شدید ضرورت ہے اور یہ کام مذہب یعنی انسانی دسترس سے بالاتر آسمانی تعلیمات اور احکامِ الٰہیہ ہی انجام دے سکتے ہیں اور اس نظامِ عالم کے بقا و تحفظ کے لئے علوم دینیہ کا موجود و محفوظ رہنا ازبس ضروری اور ناگزیر ہے۔

مذہب اور جدید تعلیم

الغرض مذہب کی تعلیمات انسان پر روز افزوں دنیاوی ترقی کے دروازے ہرگز بند نہیں کرتیں، اس کو جاری رکھنے اور اس کے لوازمات مہیا کرنے پر قدغن ہرگز نہیں لگاتیں، مذہب کے متعلق اس قسم کی بہتان تراشی اور اس بنیاد پر خدا کی مخلوق کے دلوں میں مذہب سے نفرت اور بیزاری کے جذبات پیدا کرنا درحقیقت خدا دشمن شیطانوں کا شیوہ ہے اور لادینی کی طرف دعوت دینے والے ملحدوں کا رسوا کن پروپیگنڈہ ہے۔

ذرا سوچئے مذہب اگر انسان پر روز افزوں مادی ترقی کے دروازے بند کرے تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ لامحدود قدرتِ خداوندی کے نو بنو کرشموں اور عجائباتِ اسرارِ الٰہی کے اس "مظہر" یعنی کارخانہ قدرت کی تخلیق عبث ہے اور یہ گردش لیل و نہار اور وقت کی رفتار بے معنی اور انسانی فطرت میں ایجاد و اختراع کا جوہر ودیعت فرمانا عبث ہے حالانکہ خالقِ کائنات کا ازلی ابدی کلام، قرآن عظیم، اسی آسمان و زمین کی متنوع اور گوناگوں

مخلوق اور اسی روز و شب کی گردش یعنی وقت کی رفتار کو اربابِ بصیرت کے لئے خالق کائنات کی آیات (عجائبات اور کرشموں) کا مظہر قرار دے رہا ہے۔ ارشاد ہے:۔

«اِن فی خلق السمٰوات والأرض واختلاف الیل والنہار لآیات لأولی الألباب»

بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات دن کی گردش میں اربابِ عقل و خرد کے لئے بے شمار (قدرت کی) نشانیاں (رکھی ہوئی) ہیں۔

اور انہی آیات کو دیکھ کر تو وہ بے ساختہ کہتے ہیں:۔

«ربنا ما خلقت ھٰذا باطلا سبحانک فقنا عذاب النار»

اے ہمارے رب! بے شک اس (آسمان و زمین) کو تُو نے بیکار اور بے مقصد نہیں پیدا کیا تو تو (بیکار و عبث کام کرنے سے) پاک و مبرا ہے پس تو ہم کو جہنم کے عذاب سے بچا (اور اس جہل و کج فہمی اور جحود و عناد سے محفوظ رکھ)

اس لئے مذہب اور دینی تعلیمات پر اس سے بڑھ کر کوئی بہتان نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ روز افزوں ترقیات کے دروازے اپنے ماننے والوں پر بند کرتا ہے یا علومِ دینیہ کی اشاعت دنیوی ترقیات کے منافی ہے اور ان علوم کی درس گاہوں کا وجود ملکی ترقی و استحکام کی راہ میں حائل ہے۔

بلکہ مذہب تو ان تمام انسانی ایجادات و اختراعات اور مصنوعات پر جو اب تک ہوئی ہیں یا آئندہ ہوتی رہیں گی کنٹرول کرتا ہے جس کی بقا و ارتقا اور استحکام کے لئے شدید ضرورت ہے کہ ان کا استعمال صحیح اور برمحل ہو خالقِ کائنات کی منشاء اور مرضی کے خلاف اور منافی نہ ہو، انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کیا جائے انسانیت کو ظلم و عدوان کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کے لئے ان سے کام ہرگز نہ لیا جائے، روئے زمین پر امن و سلام قائم کرنے اور معاشی، اقتصادی اور سیاسی فتنہ و فساد استعماری لوٹ کھسوٹ کو مٹانے کے لئے ان سے کام لیا جائے، کمزور قوموں کو مغلوب و مقہور کر کے ان کے ملکوں کے ذخائرِ ثروت و رفاہیت پر ڈاکہ ڈالنے اور استحصال بالجبر کرنے کی غرض سے ہرگز ہرگز ان سے کام نہ لیا جائے۔

علومِ دنیا اور علومِ آخرت میں کوئی نزاع و تصادم نہیں

اسلام تلوار بنانے پر کوئی پابندی نہیں لگاتا ہاں اس کے استعمال پر ضرور پابندی عائد کرتا ہے کہ صحیح طریق پر اس کو استعمال کیا جائے کیوں؟ صرف اس لئے کہ تلوار ایک ظالم و بے رحم قاتل سے قصاص لینے کے لئے ہی استعمال کی جاسکتی ہے اور ایک بے قصور اور بے گناہ انسان کو اپنی شیطانی اغراض و خواہشات کی راہ سے ہٹانے کے لئے بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔

اسی طرح اسلام عہدِ حاضر کے حربی اسلحہ ٹینک، طیارہ شکن توپیں، بمبار طیارے، میزائل، راڈار اور طرح طرح کے ہلاکت خیز بم بنانے سے منع نہیں کرتا ہاں ان کے استعمال پر پابندی ضرور لگاتا ہے کہ یہ تمام سامانِ حرب اور آلاتِ جنگ صرف ملک و ملت کے دفاع اور اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کے ظلم و عدوان کا مقابلہ کرنے اور دنیا میں امن و امان قائم کرنے کے لئے استعمال کئے جائیں، استعماری اغراض، کمزور قوموں اور ترقی پذیر ملکوں کو اس حربی طاقت کے دباؤ اور زور سے مغلوب و مرعوب کر کے ان ملکوں کی پیداوار دولت و ثروت پر ڈاکے ڈالنے کے لئے ہرگز استعمال نہ کیا جائے کہ یہ عمرانی عدل و انصاف اور مساوات کے منافی اور روئے زمین پر عالمگیر فتنہ و فساد برپا کرنے کا موجب ہے جیساکہ مذکورہ سابق آیتِ کریمہ میں اس پر تنبیہ کی گئی ہے۔

غرض اسلام مقصد کی تعیین، نیت کی تصحیح، نفوس کے تزکیہ کی اہم ترین ضرورت کو پورا کرتا اور مقدس ترین فرض کو انجام دیتا ہے تاکہ عمل خود بخود صحیح ہو جائے، حاصل یہ ہے کہ نظامِ عالم کو برقرار رکھنے کے لئے دونوں قسم کے علوم، عقلی اور نظری علوم، دینی اور آسمانی علوم کا بقا اور تحفظ ضروری اور ناگزیر ہے، عقلی اور صناعی علوم و فنون کے بقاء، تحفظ اور ارتقاء کی کفیل انسان کی نو بنو حوائج و ضروریات ہیں اور وہ خود انسان کو معاشی، اقتصادی سیاسی اور حربی امور میں وقت اور زمانہ کے تقاضوں کے تحت نو بنو فنون و صنائع، ایجادات و اختراعات اور مصنوعات کو عدم سے وجود میں لانے پر مجبور کرتی رہیں گی، علوم دینیہ الٰہیہ کو دنیا میں لانے اور محفوظ رکھنے والے انبیاء علیہم السلام ہیں اور ان کے بعد ان انبیاء

کے ورثا یعنی حاملین علوم انبیاء علماء حق ہیں اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام دینار و درہم، مال ومتاع، جائداد وجاگیر ترکہ میں نہیں چھوڑتے بلکہ علوم نبوت کی وراثت چھوڑتے ہیں جو ان کے نقش قدم پر چلنے والے حاملین علوم نبوت یعنی "علماء دین" کے طبقہ میں قرناً بعد قرنٍ منتقل ہوتی چلی آتی ہے اور نظام عالم کے توازن کو برقرار رکھتی ہے خاص کر خاتم النبیین سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے علماء اور حاملین علوم کتاب وسنت کہ ان کے متعلق تو سرکار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: العلماء ورثۃ الانبیاء اس حدیث کے پیش نظر علماء امت کا کام وہی ہے جو انبیاء کا کام ہے۔

اس بحث وتنقیح سے یہ بات تو بالکل ہی صاف اور واضح ہو جاتی ہے کہ علوم دنیا اور علوم آخرت میں کوئی نزاع یا تصادم قطعاً نہیں ہے ہاں دونوں کے مقاصد اور دائرہ کار جدا جدا ہیں اسی لئے یہ بالکل حقیقت ہے کہ اگر ان انسانی علوم وصنائع کو خالق کائنات کی مرضی اور منشأ کی روشنی میں انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کر دیا جائے تو یہ دنیا ساری دین بن جائے اور پھر دین اور دنیا کی تفریق جو محض ایک شیطانی مفروضہ اور منصوبہ ہے بالکل ہی مٹ جائے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ اگر انہی علوم انبیاء کو حصول دنیا اور جلب خواہشات واغراض نفسانی کا وسیلہ بنا لیا جائے تو نہ صرف یہ کہ پورا دین، دنیا بن جاتا ہے بلکہ خالق کائنات کی امانت میں خیانت اور بہت بڑا جرم ہو جاتا ہے اس لئے کہ اگر دنیا کا حصول دنیا کے وسائل کے ذریعہ ہو تو عین مصلحت اور عقل کا تقاضہ ہے اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن اگر دین کو صرف حصول دنیا کا وسیلہ بنا لیا جائے تو یہ وضع الشئ فی غیر محلہ چیز کا بے محل استعمال ہے اور بہت بڑا ظلم اور انتہائی قبیح جرم ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ علوم نبوت کا اصلی مقصد آخرت کے ثمرات وبرکات تو ہیں ہی لیکن آخرت سے پہلے اسی دنیاوی زندگی میں انفرادی اور اجتماعی حیات طیبہ اور پاکیزہ ماحول کی تشکیل اور صالح وخدا شناس وخدا پرست معاشرے کی تخلیق بھی علوم انبیاء کا اہم فریضہ ہے جس کے بارے میں وہ دنیا وآخرت دونوں میں مسئول ہیں، خدا شناسی، خدا پرستی، خدمت خلق، امن وامان کی ضمانت، انسانیت کی فلاح وبہبود وغیرہ

انسانی کمالات و فضائل اور وسائلِ سعادت، ایک قابلِ رشک معاشرے کے وہ خدوخال ہیں جو انسان کو صحیح معنی میں مسجودِ ملائک اور اشرف المخلوقات بنا دیتے ہیں اور علومِ آخرت کے وہ ثمر بیش رس ہیں جو اس دنیا کو بھی جنت بنا دیتے ہیں۔

سائنسی اور فنی علوم اور ان کے برکات و ثمرات

یہ تو علومِ الٰہیہ دینیہ کے برکات ہیں اس کے برعکس نرے عقلی اور فنی علوم و فنون کی ہلاکت آفرینی اور ایک ایسے لادینی معاشرے کا جہنمی چہرہ اور انسانیت کے لئے نہ صرف باعثِ ننگ و عار بلکہ انتہائی بھیانک خدوخال بھی دیکھئے جو علومِ الٰہیہ دینیہ سے باغی اور خدا ورسول کی تعلیمات سے نہ صرف محروم بلکہ ان کی بیخکنی کے درپے ہے اور صرف نفسانی اغراض وخواہشات کے ہاتھوں میں اس کی باگ ڈور ہے حالانکہ فنی (سائنسی) علوم و فنون اور اختراعات وایجادات کے اس معراجِ کمال پر پہنچا ہوا ہے کہ کائناتِ ارضی کو بزعمِ خود مسخر کر لینے کے بعد کائناتِ سماوی کی تسخیر کی تگ ودو میں مصروف ومنہمک ہے ان فنی اور سائنسی علوم وفنون کی پیداوار کیا ہے؟ اور ایسے لادینی معاشرہ کے خدوخال کیا ہیں؟ فرعونیت اور قہاریت ہے بے پناہ ظلم وعدوان ہے عالمگیر اقتدار وتسلّط کا بھوت ہے۔ درندے بھی جس سے شرمائیں وہ بے رحمی اور قساوت ہے جانور بھی جس سے کترائیں وہ خود غرضی اور نفس پرستی ہے، کمزور کشی اور استحصال بالجبر ہے، بے دریغ خونریزی اور جہاں سوزی ہے، عریاں درندگی اور بہیمیت ہے یہ وہ انسانیت سوز نحوستیں اور لعنتیں ہیں جنہوں نے قیامت سے پہلے ہی اس روئے زمین کو جہنم بنا رکھا ہے، ان فراعنۂ وقت امریکہ، روس اور برطانیہ وغیرہ طاغوتی طاقتوں کے سیاہ کارنامے، ننگِ انسانیت عزائم اور مادی طاقت کے مظاہرے آپ روزانہ اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں۔ دیکھا آپ نے ان نرے مادی علوم و فنون کے ارتقاء اور سائنسی اکتشافات وایجادات کی فراوانی نے اس وقت دنیا کو کس خطرناک دور اہے بلکہ جہنم کے کنارے لاکھڑا کر دیا ہے آپ کو معلوم ہے کہ روس میں امریکہ کو تباہ کرنے اور جہنم بنا دینے کے لئے غیر معمولی پاور کے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم اور میزائل راکٹوں کے اندر فٹ جہاں سوزی کے لئے

کے ورثا یعنی حاملین علوم انبیاء علماءِ حق ہیں اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام دینار ودرہم، مال ومتاع، جائداد وجاگیر ترکہ میں نہیں چھوڑتے بلکہ علوم نبوت کی وراثت چھوڑتے ہیں جو ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے حاملین علومِ نبوت یعنی "علماءِ دین" کے طبقہ میں قرناً بعد قرنٍ منتقل ہوتی چلی آتی ہے اور نظامِ عالم کے توازن کو برقرار رکھتی ہے خاص کر خاتم النبیین سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے علماء اور حاملینِ علومِ کتاب وسنت کہ ان کے متعلق تو سرکارِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: العلماء ورثة الانبیاء اس حدیث کے پیش نظر علماءِ امت کا کام وہی ہے جو انبیاء کا کام ہے۔

اس بحث وتنقیح سے یہ بات تو بالکل ہی صاف اور واضح ہو جاتی ہے کہ علومِ دنیا اور علومِ آخرت میں کوئی نزاع یا تصادم قطعاً نہیں ہے ہاں دونوں کے مقاصد اور دائرہ کار جدا جدا ہیں اسی لئے یہ بالکل حقیقت ہے کہ اگر ان انسانی علوم وصنائع کو خالقِ کائنات کی مرضی اور منشاء کی روشنی میں انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کر دیا جائے تو یہ دنیا ساری دین بن جائے اور پھر دین اور دنیا کی تفریق جو محض ایک شیطانی مفروضہ اور منصوبہ ہے بالکل ہی مٹ جائے، بالکل اسی طرح جیسا کہ اگر انہی علومِ انبیاء کو حصولِ دنیا اور جلبِ خواہشات واغراضِ نفسانی کا وسیلہ بنا لیا جائے تو نہ صرف یہ کہ پورا دین، دنیا بن جاتا ہے بلکہ خالقِ کائنات کی امانت میں خیانت اور بہت بڑا جرم ہو جاتا ہے اس لئے کہ اگر دنیا کا حصول دنیا کے وسائل کے ذریعہ ہو تو عین مصلحت اور عقل کا تقاضہ ہے اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن اگر دین کو صرف حصولِ دنیا کا وسیلہ بنا لیا جائے تو یہ وضع الشئ فی غیر محلہ چیز کا بے محل استعمال ہے اور بہت بڑا ظلم اور انتہائی قبیح جرم ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ علومِ نبوت کا اصلی مقصد آخرت کے ثمرات وبرکات تو ہیں ہی لیکن آخرت سے پہلے اسی دنیاوی زندگی میں انفرادی اور اجتماعی حیاتِ طیبہ اور پاکیزہ ماحول کی تشکیل اور صالح وخدا شناس وخدا پرست معاشرے کی تخلیق بھی علومِ انبیاء کا اہم فریضہ ہے جس کے بارے میں وہ دنیا وآخرت دونوں میں مسئول ہیں، خدا شناسی، خدا پرستی، خدمتِ خلق، امن وامان کی ضمانت، انسانیت کی فلاح وبہبود وغیرہ

انسانی کمالات وفضائل اور وسائلِ سعادت، ایک قابلِ رشک معاشرے کے وہ خد وخال ہیں جو انسان کو صحیح معنی میں مسجودِ ملائک اور اشرف المخلوقات بنا دیتے ہیں اور علوم آخرت کے وہ ثمر بیش رس ہیں جو اس دنیا کو بھی جنت بنا دیتے ہیں۔

سائنسی اور فنی علوم اور ان کے برکات وثمرات

یہ تو علومِ الٰہیہ دینیہ کے برکات ہیں اس کے برعکس نرے عقلی اور فنی علوم وفنون کی ہلاکت آفرینی اور ایک ایسے لادینی معاشرے کا جہنمی چہرہ اور انسانیت کے لئے نہ صرف باعثِ ننگ وعار بلکہ انتہائی بھیانک خدوخال بھی دیکھئے جو علومِ الٰہیہ دینیہ سے باغی اور خدا ورسول کی تعلیمات سے نہ صرف محروم بلکہ ان کی بیخکنی کے درپے ہے اور صرف نفسانی اغراض وخواہشات کے ہاتھوں میں اس کی باگ ڈور ہے حالانکہ فنی (سائنسی) علوم وفنون اور اختراعات وایجادات کے اس معراجِ کمال پر پہنچا ہوا ہے کہ کائناتِ ارضی کو بزعم خود مسخر کر لینے کے بعد کائناتِ سماوی کی تسخیر کی تگ ودو میں مصروف ومنہمک ہے ان فنی اور سائنسی علوم وفنون کی پیداوار کیا ہے؟ اور ایسے لادینی معاشرہ کے خدوخال کیا ہیں؟ فرعونیت اور قہاریت ہے بے پناہ ظلم وعدوان ہے عالمگیر اقتدار وتسلّط کا بھوت ہے، درندے بھی جس سے شرمائیں وہ بے رحمی اور قساوت ہے، جانور بھی جس سے کترائیں وہ خود غرضی اور نفس پرستی ہے، کمزور کشی اور استحصال بالجبر ہے، بے دریغ خونریزی اور جہاں سوزی ہے، عریاں درندگی اور بہیمیت ہے یہ وہ انسانیت سوز نحوستیں اور لعنتیں ہیں جنہوں نے قیامت سے پہلے ہی اس روئے زمین کو جہنم بنا رکھا ہے، ان فراعنۂ موقت امریکہ، روس اور برطانیہ وغیرہ طاغوتی طاقتوں کے سیاہ کارنامے، ننگِ انسانیت عزائم اور مادی طاقت کے مظاہرے آپ روزانہ اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں، دیکھا آپ نے ان نرے مادی علوم وفنون کے ارتقاء اور سائنسی اکتشافات وایجادات کی فراوانی نے اس وقت دنیا کو کس خطرناک دوراہے بلکہ جہنم کے کنارے لا کر کھڑا کر دیا ہے آپ کو معلوم ہے کہ روس میں امریکہ کو تباہ کرنے اور جہنم بنا دینے کے لئے غیر معمولی پاور کے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم اور میزائل راکٹوں کے اندر فٹ جہاں سوزی کے لئے

تیار رکھے ہوئے ہیں اور امریکہ میں روس کو جہنم بنا دینے کے لئے ناقابلِ قیاس پاور والے آتش بار بم تیار رکھے ہوئے ہیں صرف بٹن دبانے کی دیر ہے، آن کی آن میں امریکہ روس کو ہیروشیما اور روس امریکہ کو ہیروشما بنا سکتا ہے اور ان دونوں برِ اعظموں میں برسنے والے بموں کے ذرات اور تابکاری کے اثرات یورپ اور ایشیا کو پھونک ڈالنے کے لئے کافی ہیں، یہ ہے علومِ آخرت کی گرفت سے آزاد محض عقلی اور سائنسی علوم و فنون اور سائنسی ارتقار کا کارنامہ۔

ہاں اگر علومِ آخرت کے کنٹرول میں رہ کر اور ان کی سرپرستی و نگرانی میں یہ فنی اور سائنسی علوم و فنون اور ایجادات و اختراعات پروان چڑھیں اور ترقی کریں تو یقیناً یہ سائنسی علوم و فنون فلاحِ انسانیت اور خدمتِ خالق و مخلوق کے بہترین وسائل بن سکتے ہیں اس لئے بھی علوم دینیہ کی درس گاہوں اور حاملینِ علومِ نبوت یعنی علماءِ دین کا بابرکت وجود اس روئے زمین خصوصاً مملکتِ پاکستان کے لئے ازبس ضروری اور ناگزیر ہے۔

دین اور علماءِ دین کے خلاف پروپیگنڈہ

یہ حقائق اظہر من الشمس، آفتابِ نیمروز سے زیادہ روشن ہیں یہ واقعات و مشاہدات ناقابلِ تردید ہیں اس کے باوجود سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں اور کس کے اشاروں پر خاص کر ان آخری ایام میں یہ شور و غوغا برپا اور شرمناک پروپیگنڈہ جاری ہے، مہینوں سے سرکاری اور نیم سرکاری رسالوں اور میگزینوں میں ادارتی نوٹ لکھے جارہے ہیں، صدرِ مملکت کے نام مکاتیب بھجوائے جارہے ہیں کہ مذہب اور دینی علوم جدید ترقیات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں، علماءِ دین ملک کی ترقی اور استحکام و سالمیت کے سب سے بڑے دشمن ہیں، مدارسِ عربیہ اور مکاتبِ دینیہ عصری تقاضوں کے خلاف فتنہ و فساد برپا کرنے کی تعلیم کے مراکز ہیں حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان تمام دینی مدارس و مکاتب اور درس گاہوں اور بڑی بڑی مساجد کو اپنے کنٹرول میں لے کر ان علومِ دینیہ اور حاملینِ علومِ نبوت کی بیخ کنی کرے نہ یہ حکومت کی مالی امداد سے آزاد عربی مدارس اور دینی درس گاہیں ہوں گی نہ یہ علماءِ دین پیدا ہوں گے نہ ملکی ترقی اور عصری تقاضوں کے خلاف کوئی آواز بلند کرنے والا ہوگا۔"

ہمیں اچھی طرح یقین ہے کہ حکومت اتنی بے خبر اور ناسمجھ نہیں ہے کہ وہ ان بازیگروں سے بے خبر ہو جن کے اشاروں پر یہ کٹھ پتلیاں ناچ رہی ہیں، بقول شاعر "کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری ہیں۔" اور مشرقِ وسطیٰ کے المیہ کے بعد تو یہ راز بالکل ہی طشت ازبام ہو چکا ہے کہ اسلامی ملکوں اور مسلمان قوموں میں سامراجی منصوبوں کو خاک میں ملانے والی ناقابلِ تسخیر طاقت صرف اسلام اور دین و ایمان کی قوت ہے اس لئے تمام استعماری حکومتیں اور سامراج پرست قومیں ہیں یاد رکھئے اشتراکی ممالک اور اقوام درحقیقت سب سے بڑی استعمار پرست قومیں ہیں جس طرح بھی بن پڑے زور سے زر سے دھمکیوں سے لالچوں سے اسلامی ممالک اور مسلمان قوموں سے اسلام اور دین و ایمان کو مٹانے کے درپے ہیں کوئی دوست بن کر کوئی دشمن بن کر، اس وقت دنیا میں جنگ دراصل دین اور لادینیت کی جنگ ہے۔

علومِ دینیہ اور علماء کے خلاف پروپیگنڈہ کرنیوالوں سے چند سوالات

تاہم ان لادینی اقوام کے بامعاوضہ یا بے معاوضہ ایجنٹوں سے علومِ دینیہ اور علماءِ دین کے خلاف پروپیگنڈے کی پول کھولنے کی غرض سے ہم دریافت کرتے ہیں کہ :-

(۱) کس عالمِ دین نے کب اور کہاں یہ کہا ہے کہ ملکی دفاع کو مستحکم کرنے کی غرض سے جدید آلات و اسلحہ سے مسلح اور جدید فنون سے واقف اور آزمودہ کار فضائی اور بحری بیڑہ تیار کرنا اور اس کے لئے ٹینک سازی، طیارہ سازی اور اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کرنا ایٹمی انرجی کے ادارے قائم کرنا اور ان کو فروغ دینا حرام اور شرعاً ممنوع ہے اور ایٹم یا ہائیڈروجن بم بنانا گناہ ہے؟

(۲) کس عربی مدرسہ میں یہ درس دیا جاتا ہے کہ ملک کو غذا کے مسئلہ میں خود کفیل بنانے کی غرض سے ملکی غذائی پیداوار میں اضافہ کرنے کی مہم چلانا اس کے لئے محکمے قائم کرنا منصوبے بنانا مصنوعی کھاد ٹریکٹر اور ترقی یافتہ جدید آلاتِ زراعت کے کارخانے قائم کرنا جراثیم کش ادویہ ہوائی جہازوں کے ذریعہ کھیتوں میں چھڑکنا، قابلِ کاشت زمین کو سیم اور تھور کے گھن سے پاک کرنے کی غرض سے ترقی یافتہ ملکوں میں آزمودہ تدابیر و وسائل پاکستان میں اختیار

کرنا، ناقابلِ کاشت زمینوں کو قابلِ کاشت بنانا اور اس مقصد کے لئے قوم کا روپیہ خرچ کرنا حرام ہے خدا کی ناراضگی اور آخرت کے عذاب کا موجب ہے؟

(۳) کس مفتیِ دینِ متین نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ غیر ملکی مصنوعات سے بے نیاز ہونے اور ملکی مصنوعات کو فروغ دینے کی غرض سے پاکستانی انڈسٹری کو جدید ترقی یافتہ معیار پر لانا اور اس کے لئے دوسرے ملکوں سے جدید سے جدید مشینری برآمد کرنا بڑے بڑے جدید طرز کے صنعتی کارخانے قائم کرنا اور ملک کو صنعت کے اعتبار سے اس قابل بنانا کہ ملکی ضروریات سے فاضل مصنوعات کو عالمی منڈیوں میں برآمد کرسکے معصیت ہے اور حرام یا مکروہ تحریمی ہے؟

(۴) کس عربی مدرسہ کی درسی کتاب میں لکھا ہے کہ ملک کی تجارت، درآمد و برآمد اور اقتصادیات کی سطح کو بلند کرنے کے لئے درآمد و برآمد کے جدید نظام کو اختیار کرنا ضرورت کے تحت بیرونی تجارتی اداروں کو ملک میں جائز اور ملکی مفاد کے مناسب شرائط کے تحت کاروبار کرنے کی اجازت دینا یا ملکی مفاد کے خلاف کاروبار کرنے والے اداروں کو معاوضہ دے کر قومی ملکیت میں لے لینا گناہ اور ناجائز ہے؟

(۵) کس جامع مسجد کے خطیب عالمِ دین نے برسرِ منبر یہ خطبہ دیا ہے کہ ملک میں تباہ کن حد تک پہنچی ہوئی اسمگلنگ (غیر قانونی تجارت) وہ بھی دشمن ملک کے ساتھ چور بازاری اور رشوت ستانی کو ختم کرنے کے لئے اعلیٰ سطح پر مؤثر تدابیر اختیار کرنا، محکمے قائم کرنا ملک میں خطرناک حد تک بڑھتے ہوئے جرائم کے انسداد کے لئے پولیس فورس کو بڑھانا اور مؤثر اقدام کرنا اور معاشرہ کو تباہ کرنے والے جرائم پیشہ لوگوں کو عبرت ناک شرعی سزائیں دینا۔ جو موجودہ قانونی سزاؤں سے بدرجہا زیادہ عبرت ناک ہیں ظلم ہے گناہ ہے اور ناجائز ہے؟ یعنی عدل و مساوات کے ساتھ ساتھ ہر شعبۂ زندگی میں ملک کی ترقی اور فروغ کے وسائل اور اقدامات کو اختیار کرنے سے علومِ آخرت کے حاملین ہرگز منع نہیں کرتے اور دینی درسگاہوں اور علماءِ دین کی مساعی کو ملکی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کہنا سفید جھوٹ اور شیطانی پروپیگنڈہ ہے۔

علماءِ دین کا پیغام اور دعوتِ دین

ہاں وہ یہ ضرور کہتے رہے، کہتے ہیں اور کہتے رہیں گے، مدرسوں کی درس گاہوں میں مسندِ درس پر بیٹھ کر بھی اور مسجدوں کے منبر اور مجمعِ عام کے اسٹیج پر کھڑے ہو کر بھی، بلکہ تختہ دار کے اوپر بھی اور جیل خانوں کی کال کوٹھڑیوں کے اندر بھی، ظالم و جابر حکمرانوں کے رُو در رُو بھی اور پسِ پشت بھی اور اسلام کا حقیقی محافظ خدا ان کے کلمۂ حق کو قوم کے کانوں تک ضرور پہنچائے گا تجربہ اس کا شاہد ہے کہ :-

(۱) اسلامی ملک میں صرف خدا کا نازل کردہ اور رسول کا لایا ہوا اسلامی قانون ہی بغیر کسی ترمیم و تصرف اور کتر بیونت کے نافذ کیا جاسکتا ہے اس کے منافی یا اس کے علاوہ کسی بھی قانون کو نافذ کرنا حرام ہے اور اس کی مخالفت فرض ہے۔

(۲) ہنگامی حالات کو وقت کے تقاضوں کو اور ملکی ترقیاتی منصوبوں کو اسلامی قانون کے سانچے میں ڈھالنا ماہرینِ قانونِ اسلامی کا فرض ہے اسلامی قانون کو ان حالات، تقاضوں اور ترقیاتی منصوبوں کے سانچے میں ڈھالنا اور اس غرض سے اس کی خود ساختہ تعبیرات اور من مانی تشریحات کرنا قطعاً حرام اور گناہِ کبیرہ بلکہ کفر و ارتداد کے مرادف ہے۔

(۳) اسلامی معاشرہ میں :-

(الف) زنا قطعاً حرام ہے اور شرعی ثبوت کے بعد اس پر حد جاری کرنا فرضِ عین ہے چاہے وہ چکلوں میں ہو چاہے کلبوں میں، چاہے گھروں کی چار دیواریوں کے اندر ہو چاہے سرِ راہ اور چاہے باہمی رضامندی سے ہو چاہے بالجبر ہو بہر صورت زنا قابلِ دست اندازئ پولیس جرم ہے زنا کے کیس میں کوئی بھی عدالت باہمی مصالحت (راضی نامہ) قبول کرنے کی مجاز نہیں۔

(ب) شراب۔ ام الخبائث جس کی جنم دی ہوئی خباثتوں سے مغربی ممالک بھی لرزہ براندام ہیں۔ قطعاً حرام ہے خواہ ایک گھونٹ ہو خواہ ایک بوتل، کسی بھی قسم کی ہو، کسی بھی نام کی اسلامی ملک میں اسلامی حکومت کے لئے اس کی کشید یا درآمد و برآمد اور خرید و فروخت

کے لائسنس جاری کرنا بھی حرام ہے اور اس کے ٹیکس سے جو حکومت کو آمدنی ہوتی ہے وہ بھی قطعاً حرام ہے۔

(ج) سُود ۔ ملک کی دولت و ثروت، خیر و برکت کو چاٹ جانے والی "دیمک" دولت کو پوری قوم کے ہاتھوں سے چھین کر چند سود خوار ہاتھوں میں جمع کر دینے والا "شعبدہ" لینا بھی اور دینا بھی قطعاً حرام ہے اسی طرح ہر سودی کاروبار بڑا ہو یا چھوٹا، سودی نظامِ مالیات، بینکاری سسٹم پوری قوم کو بھوکا ننگا بنا دینے والا سسٹم، قطعاً حرام ہے اس کے بجائے اسلامی نظامِ مالیات و اقتصادیات ملک میں جاری کرنا اور سود کی لعنت سے ملک کو پاک کرنا ہر مسلمان حکومت کا فرضِ اوّلین ہے دنیا کی فلاح کے اعتبار سے بھی اور آخرت کی نجات کے اعتبار سے بھی۔

(د) قمار جُوا۔ خواہ مہذب ہو خواہ غیر مہذب، کلبوں میں ہو خواہ ریس کورس میں کسی بھی شکل و صورت میں ہو قطعاً حرام ہے اس سے جو آمدنی ہو وہ بھی قطعاً حرام ہے اسلامی حکومت کے لئے کسی بھی صورت میں جوئے کے لائسنس دینا اور اس کی آمدنی سے ٹیکس وصول کرنا بھی قطعاً حرام ہے۔

(ھ) اسلامی معاشرہ کے تحفظ کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک محکمہ "احتساب" قائم کرنا جو محرمات و منکراتِ شرعیہ کا ارتکاب کرنے والوں کو شرعی سزائیں دینے کا مجاز ہو اسلامی حکومت کا فرض ہے تاکہ خود غرض اور ہوس پرست اسلامی معاشرہ کے خد و خال کو مسخ کرنے کی جرأت نہ کر سکیں۔

یاد رہے: کسی خطۂ زمین اور ملک و ملت میں علومِ آخرت کے مذکورۂ سابق ثمراتِ بیش بہا اور خیرات و برکات کے وجود، نشو و نما اور بقا و تحفظ کے لئے اس ملک میں انسانی دسترس سے محفوظ قانونِ الٰہی اور احکامِ شرعیہ کا نفاذ اور امر بالمعروف، نہی عن المنکر کے لئے محکمہ احتساب ازبس ضروری ہے اور یہ فرض اسی طبقہ کے ہاتھوں انجام پا سکتا ہے جو نسلاً بعد نسل اپنی عمریں علومِ قرآن اور علومِ سنت کی تحصیل، غور و فکر اور پھر ان پر عمل کرنے کرانے میں صرف کرتے ہیں یعنی حاملینِ علومِ کتاب و سنت علماء اور ایسے علماء کو پیدا کرنے اور

پروان چڑھانے والے ادارے یہی آزاد معاہد ومدارسِ علومِ عربیہ ہیں جو ملک ان آزاد عربی مدارس اور دینی مکاتب سے محروم ہو جائے گا وہ لازمی طور پر حاملینِ علومِ الٰہیہ سے بھی محروم ہو جائے گا اور پھر اس ملک اور اس کے معاشرے کی فنی اور سائنسی علوم و فنون کی ترقی کے باوجود وہی بھیانک شکل اور جہنمی صورت بن جائے گی جس کا نمونہ ہم اس سے پہلے پیش کر چکے ہیں۔

دینی مدارس اور ان کا فائدہ

یہ علومِ آخرت کی درس گاہیں اور ان سے پیدا ہونے والے حاملینِ علومِ انبیاء علمائے حق، حکومت کے عدمِ تعاون یا عوام کی سرد مہری کی وجہ سے مذکورہ بالا قابلِ رشک اسلامی معاشرہ کی تشکیل میں اگر کامیاب نہ بھی ہوں تب بھی ان کے دم قدم کا اتنا فائدہ ضرور ہو گا کہ معاشرہ کے فسق و فجور میں گرفتار افراد قانونِ الٰہی اور احکامِ شرعیہ کی خلاف ورزی، سود خوری شراب نوشی حتیٰ کہ زنا کاری اور فحاشی کے باوجود خود کو گنہگار عند اللہ مجرم ضرور سمجھتے رہیں گے اور کسی نہ کسی وقت خدا کے سامنے گناہوں کی مغفرت کے لئے ان کے ہاتھ ضرور اٹھتے رہیں گے، بالکل ہی خدا ناشناس درندے اور جانور نہ بنیں گے اور اس خدا شناسی اور اعترافِ گناہ کی بدولت۔ اگرچہ صرف دل ہی سے ہو۔ عام عذاب الٰہی، خدائی قہر اور الٰہی انتقام کا نشانہ نہ بنیں گے ارشاد ہے:۔

((وما كان الله ليعذبهم وهم يستغفرون)) اللہ سے یہ بعید ہے کہ وہ تو اللہ سے مغفرت کی دعائیں کر رہے ہوں اور اللہ ان کو عذاب (آسمانی) میں گرفتار کر دے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمانی قوت اور اسلامی روح اگرچہ فسق و فجور کی وجہ سے کتنی ہی مضمحل اور کمزور ہو جائے باقی ضرور رہتی ہے اور آڑے وقت ضرور کام آتی ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ ان علماءِ دین اور حاملین علومِ آخرت کی عمر کا وہ حصہ جو فطری طور پر دنیوی علوم، صنعت و حرفت اور ان کے علاوہ دنیوی وسائلِ معاش کے سیکھنے اور حاصل کرنے کا ہوتا ہے انہی علومِ دینیہ کی

درس گاہوں اور علومِ دینیہ کے حاصل کرنے میں گذر جاتا ہے اس کے بعد وہ دنیوی اعتبار سے کسی مصرف کے نہیں رہتے اس لئے قدرتی طور پر ان کی معاشی زندگی دین اور دینی خدمات سے وابستہ ہو جاتی ہے خواہ درس و تدریسِ علومِ دینیہ کی صورت میں ہو خواہ وعظ و تبلیغ کی صورت میں خواہ مؤذنی امامت و خطابت کی شکل میں ہو یا مکاتبِ قرآنِ کریم میں حفظ یا ناظرہ قرآنِ کریم کی تعلیم کی شکل میں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم اور اس کے معاشرہ میں ان لوگوں کی بدولت کم از کم دین کا شعور اور خدا پرستی کا احساس ضرور بیدار اور باقی رہتا ہے بلکہ قوم کی اکثریت انفرادی طور پر ضرور دیندار اور احکامِ شرعیہ کی بڑی حد تک پابند رہتی ہے حرام و حلال، طاعت و معصیت عذاب و ثواب کی تمیز اور کسی نہ کسی درجہ میں خوفِ خدا اور خوفِ آخرت ضرور باقی رہتا ہے اور اس کے نمایاں اثرات محفوظ رہتے ہیں اور کسی نہ کسی وقت اس کے برکات ضرور ظاہر ہوتے ہیں، اس کے برعکس جن اسلامی ملکوں میں ان آزاد عربی مدارس و مکاتب کا وجود حکومت کے زور سے بالکل ختم کر دیا گیا ہے اور ملک کے تمام مدارس و مکاتب کو دنیوی تعلیم کی درس گاہوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے امامت و خطابت، وعظ و تبلیغ اور درس و تدریس کو حکومت کے کنٹرول میں لے لیا گیا ہے، ان ملکوں میں علومِ قرآن و حدیث و فقہ و اصولِ فقہ کے سوتے بالکل خشک ہو چکے ہیں اور اس کے نتیجہ میں نری عیش پرستی کے تسلط کی وجہ سے ایمانی قوت اور دینی روح اور خدا پرستی کا احساس اور چرچا بالکل ہی ختم ہو چکا ہے یا ختم ہوتا جا رہا ہے اسلام کی جگہ قومیت نے لے لی ہے، خدا کی جگہ مادی ترقیات پر قابض طاغوتی طاقتوں نے لے لی ہے قانونِ الٰہی کی جگہ انسانی ساختہ پرداختہ استعماری یا اشتراکی قوانین نے اور امر بالمعروف، نہی عن المنکر کی جگہ مغربی تہذیب اور اس کے لوازمات موسیقی رقص و سرود، غنا، عریانی، فحاشی اور جنسی جذبات کو برانگیختہ اور مشتعل کرنے والی فلموں، ڈراموں اور نام نہاد ثقافتی پروگراموں نے لے لی ہے اور عام طور پر پوری قومیں خصوصاً نوجوان نسلیں شب و روز ریڈیو پر موسیقی کے نغمے اور دھنیں سننے اور ٹیلیویژنوں پر عریاں مناظر دیکھنے اور پھر اپنی نجی صحبتوں، مجلسوں یا خلوتوں میں قدِ آدم آئینوں کے

سامنے اس فحاشی اور جنسی آورگی کی ریہرسل (مشق) اور عملی تجربے کرنے میں مصروف ہے۔ العیاذ باللہ۔

پاکستان کے عذابِ الٰہی سے محفوظ رہنے کی وجہ

واضح رہے کہ پاکستان کی اس پاک سرزمین پر بطور استہزاء اللہ کے پسندیدہ "دینِ اسلام" کو "ملازم" اور اس کے حاملین علماءِ حق کو "ملا" کہہ کر مذاق اڑاتے اور توہین کرنے والوں پر قہرِ خداوندی کی بجلی نہ گرنے اور عذابِ الٰہی سے محفوظ رہنے کا سبب آیت کریمہ ((وما کان اللہ لیعذبھم وھم یستغفرون)) کی روشنی میں صرف یہ ہے کہ پاکستان کے عوام کے دلوں میں قوتِ ایمان زندہ اور روحِ اسلام بیدار ہے اور اونچے طبقہ کو چھوڑ کر متوسط اور ادنیٰ طبقہ کی اکثریت کسی نہ کسی حد تک، کم از کم انفرادی زندگی میں، احکامِ شرعیہ کی پابند ہے، چپہ چپہ پر مسجدیں آباد ہیں پنجوقتہ اذان کی آوازیں گونج رہی ہیں، عربی مدارس میں قال اللہ قال الرسول کی آسمان سے رحمتِ الٰہی کو لانے والی آوازیں بلند ہو رہی ہیں، تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ کی کتابیں ادنیٰ سے اعلیٰ تک باقاعدہ پڑھائی جا رہی ہیں اور قانونِ الٰہی کو زندہ اور محفوظ رکھنے کے لئے حاملینِ علومِ انبیاء تیار کئے جا رہے ہیں مکاتبِ قرآن جگہ جگہ بے شمار کھلے ہوئے ہیں اور چھوٹے چھوٹے بچے حفظ اور ناظرہ با تجوید اور بے تجوید قرآن پڑھنے میں مصروف ہیں، وعظ و تذکیر کے خوفِ خدا اور خوفِ آخرت کو زندہ اور بیدار رکھنے والے ہفتہ وار حلقے (اجتماعات) جمعہ کے جمعہ نماز جمعہ کے بعد قائم ہیں تبلیغی جماعتوں کے پیار محبت سے کلمہ طیبہ اور نماز پڑھوانے وغیرہ کی غرض سے تبلیغی دورے جاری ہیں، احکامِ شرعیہ اور مسائلِ دینیہ بتلانے کے لئے جگہ جگہ دارالافتاء کھلے ہوئے ہیں صرف ان دارالافتاؤں سے زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق مختلف اور متنوع احکامِ شرعیہ کے استفتاء (سوالات) اور ان کے جوابوں کی ہزاروں لاکھوں تک پہنچنے والی تعداد ہی اس امر کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے کہ اس ملک کا عام مزاج دینی ہے اور غالب اکثریت کے دلوں میں ہر شعبۂ زندگی کے اندر احکامِ شرعیہ معلوم کرنے کی تڑپ ضرور موجود ہے اور جہاں تک

ملکی حالات مساعدت کرتے ہیں ان پر عمل بھی کرتی ہے استفتاء (سوال کرنا) اس کی دلیل ہے۔

اور یہ بتلانے کی تو ضرورت نہیں ہر ذی ہوش سمجھتا اور مانتا ہے کہ یہ تمامتر صورتحال صرف الٰہی حکومت کے کنٹرول سے آزاد عربی مدارس، دینی مکاتب کے برکات اور دولت و رفاہیت پر فقر و افلاس کو ترجیح دینے والے اور اس فقر کو خدا کی رحمت باور کرنے والے حاملینِ علومِ دینیہ علماءِ حق کی دیرینہ اور مسلسل جدوجہد اور ان کی مساعئ مشکورہ (عند اللہ و عند الناس) کا نتیجہ اور خالقِ کائنات جلّ و عُلا کی توفیقِ خدمتِ دین عطا فرمانے کا ثمرہ ہیں۔

اس لئے بھی خاص طور پر ان گستاخ اور دریدہ دہن مُلحدوں، بے دینوں اور علوم دینیہ اور علماءِ دین کو گالیاں دینے والوں اور ان کے ہمنواؤں کو ان حکومت کے کنٹرول سے آزاد علومِ دینیہ کی درسگاہوں اور ان سے نکلنے والے علماء و خدامِ دین کے پاکستان میں وجود کو مغتنم اور قہرِ خداوندی سے بچانے والی پناہ گاہیں اور پناہ دہندہ سمجھنا چاہیے ورنہ اگر خدا ناکردہ اس مسلمان ملک کے عوام و خواص پر بھی وہی عام بے دینی، خدا فراموشی اغراض و خواہشات پرستی اور روحانیت کش مادہ پرستی مسلط ہو جاتی جو دوسرے اشتراکیت نواز مسلم ممالک پر مسلط ہے تو یہ ملک بھی آج دوسرے مسلمان اشتراکیت پسند ملکوں کی طرح کسی نہ کسی صورت میں قہرِ خداوندی اور انتقامِ الٰہی کا نشانہ بنا ہوتا، ارشاد ہے:۔

((نسوا اللہ فانساھم أنفسھم))	انھوں نے اللہ کو فراموش کر دیا تو اللہ نے ان سے خود اپنے نفسوں کو فراموش کرا دیا۔

یعنی خالقِ کائنات، خدا فراموش لوگوں کو اس "خدا فراموشی" کے جرم کی سزا دنیا میں یہ دیتا ہے کہ انھیں خود فراموش بنا دیتا ہے تو وہ اپنے بقا و تحفظ کی تدبیریں سوچنے اور اسباب اختیار کرنے کے بجائے خود اپنی ہلاکت و بربادی کی راہ پر چل پڑتے ہیں اور صفحہ ہستی سے مٹ جاتے ہیں، اقوامِ عالم کے عروج و زوال کی تاریخ اس کی شاہد ہے، یہ انتہائی تباہ کن انتقام خداوندی ہے، أرحم الراحمین اپنے لطف و کرم سے اس نوزائیدہ اسلامی مملکت کو اس خدا فراموشی کے جرم کے ارتکاب سے اور اس کی پاداش میں اس انتقامِ الٰہی سے محفوظ رکھے

اور ہماری بداعمالیوں کو معاف فرمائے اللھم إنا نعوذ برضاك من سخطك وبمعافاتك من عقوبتك ونعوذبك منك إلخ۔

دین کے محافظ علمائے حق ہیں

بہرحال سُن لیجئے!! اسلام خالقِ کائنات کا پسندیدہ اور کامل ترین دین ہے وہی اس کا شارع اور قانون ساز ہے اسی نے نوعِ انسانی کی آخری ہدایت کے طور پر نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے اس کو اتارا ہے اور اس کا حامل اور محافظ امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کے "علماءِ حق" کو بنایا ہے ارشاد ہے :۔

«ولتكن منكم أمة يدعون إلى الخير ويأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر»

چاہیے کہ تم میں سے ایک جماعت رہتی ایسی ہو وہ خیر (دین) کی طرف (لوگوں کو) دعوت دیں، بھلے کاموں کا حکم دیں برُے کاموں سے منع کریں۔

نیز ارشاد ہے :۔

«فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم إذا رجعوا إليهم»

کیوں نہ نکلا ان میں سے ہر فرقہ کا ایک گروہ تاکہ وہ دین میں سمجھ (علومِ دینیہ) حاصل کرتا اور جب وہ لوٹ کر جاتا تو اپنی قوم کو باخبر کرتا۔

چنانچہ علماءِ امت نے اللہ جل شانہٗ کی توفیق واعانت سے ہر زمانہ اور ہر دور میں اس کو حاصل کیا ہے اس کے حصول کو جاری وساری رکھنے اور اس کی حفاظت کے لئے معاون علوم کی تدوین کی ہے تصانیف لکھی ہیں علومِ دینیہ کی درسگاہیں قائم کی ہیں اور قرآن وحدیث اور ان کے معاون علومِ دینیہ کی درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا ہے یہ سلسلہ محض اللہ کی توفیق واعانت سے۔ حکومتوں کی امداد واعانت اور کنٹرول کے بغیر۔ صدیوں سے جاری ہے اور ایسے ہی قیامت تک جاری رہے گا، مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے :۔

يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله إلخ.

جو کوئی فرد یا قوم یا حکومت اس کو مٹانے اور نوعِ انسانی کے اس آخری "منارۂ نور"

کو گل کرنے کا قصد کرے گی اس کی زندگی کا چراغ خود گل کر دیا جائے گا اور صفحۂ ہستی سے اس کا نام و نشان مٹا دیا جائے گا اور یہ منارۂ روشنی جب تک اللہ چاہے گا رُشد و ہدایت کی روشنی بہم پہنچاتا رہے گا، ارشاد ہے:۔

«یریدون لیطفئوا نور اللہ بأفواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون» وہ (دشمن) چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو بجھا دیں اور اللہ اپنے نور (دین) کو پورا کر کے رہے گا اگرچہ منکروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

اور اس سلسلہ کا حقیقی محافظ خالقِ کائنات حق جل وعلا ہے ارشاد ہے:۔

«إنا نحن نزلنا الذکر وإنا لہٗ لحافظون» بے شک ہم ہی نے اس ذکر (دین) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

اب اگر کوئی فرد یا جماعت، حکومت یا قوم اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودنا اور ہلاکو خاں چنگیز خاں، اکبر اور اس کے ہر دو شیطانوں ابوالفضل اور فیضی، کمال اتاترک اور آخر میں مسلم اشتراکیت نواز ممالک کے زعماء اور برسرِ اقتدار پارٹیوں کے نقشِ قدم پر چل کر خودکشی کرنا چاہتی ہے شوق سے کرے، علمائے دین اور حاملینِ شرعِ متین بھی سر بکف، برہنہ جسم پر تازیانے کھانے، دار و رسن پر چڑھنے اور دمِ واپسین تک کلمۂ حق کہتے رہنے کے لئے تیار ہیں، علماء کے لئے بھی یہ کھیل کوئی نیا کھیل نہ ہو گا بلکہ یہ مقاومت اور مقابلہ اور آزمائش تو ان کے اسلاف و اکابر کی "سنت" ہے اس کے باوجود ارحم الراحمین سے دعا ہے کہ وہ پاکستان کے علماءِ حق کو اس ابتلاء سے محفوظ رکھے اور اپنی پناہ میں لے کر اس دینی خدمت کے سلسلہ کو جاری و ساری اور قائم و دائم رکھے آمین۔

دورِ حاضر میں علماء و طلباء کے خلاف خطرناک سازش

(نوٹ) یہ زمانہ ڈپلومیسی اور چالبازی کا ہے جس مخالف اور بزعمِ خود دشمن طبقہ اور اس کے مراکز کے خلاف جنگ کرنی ہوتی ہے میدانِ حرب و ضرب اور جبر و استبداد میں "گرم جنگ" لڑنے سے برسوں پہلے میدانِ صحافت میں "سرد جنگ" لڑی جاتی ہے یعنی پہلے اس

کے خلاف اخبارات و رسائل میں مضامین و مقالات شائع ہوتے ہیں تاکہ زمین یعنی "رائے عامہ" کو اس کے خلاف ہموار کر لیا جائے اس کے بعد حکومت کی "کنٹرولنگ مشینری" حرکت میں آتی ہے اور ابتداءً صرف حکومت سے رگنیشن یعنی الحاق کی دعوت دی جاتی ہے ساتھ ساتھ "ایڈ" (مالی امداد) کا لقمۂ چرب و شیریں ارباب مراکز و مدارس کے منتظمین کے سامنے ڈالا جاتا ہے اگر یہ حربہ کامیاب نہیں ہوتا تو پھر قانون کے ذریعہ رگنیشن (الحاق) پر مجبور کیا جاتا ہے اس کے بعد نصاب اور درسی کتابوں میں کتر بیونت کی جاتی ہے قدیم علوم کی ٹھوس قابلیت پیدا کرنے والی کتابیں نکال کر ان کی جگہ عصری علوم و فنون کی کتابیں لائی جاتی ہیں اس طرح دینی علوم کی جان تو نکال ہی لی جاتی ہے اسی کے ساتھ ان ملحقہ مدارس کی سندوں کو وزارتِ تعلیمات سے منظور کرا دیا جاتا ہے اور سرکاری، نیم سرکاری تعلیمی اور غیر تعلیمی اداروں میں ملازمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں یہ طلبہ کے لئے لقمۂ چرب و شیریں ڈالا جاتا ہے اور پورے ملک سے ماہرینِ علوم دینیہ کو کھینچ لینے اور آزاد عربی مدارس کو ویران کر دینے کی غرض سے ان نیم سرکاری یا سرکاری درس گاہوں میں کام کرنے والے ماہرین و محققین علومِ دینیہ کے لئے گرانقدر مشاہروں و الاؤنسز کے اعلان کئے جاتے ہیں ان کی سالانہ ترقی اور آخری تنخواہ کے "منہ میں پانی بھر لانے والے" گریڈ مقرر کئے جاتے ہیں یہ آزمودہ کار علماء و محققین کے زبان و قلم کو حکومت کے خلاف بولنے اور لکھنے سے باز رکھنے کے لئے "طلائی زنجیریں" تیار کی جاتی ہیں، ان تدبیروں کے بعد بھی جو دین کو دنیا پر ترجیح دینے پر ایمان رکھنے والے علماءِ حق اور آزاد مدارسِ دینیہ عربیہ کے اساتذہ اور مبلغین و واعظین و خطباء اس "دام ہمرنگ زمین" میں گرفتار ہو کر اپنی کلمۂ حق کہنے کی آزادی قربان کرنا نہیں چاہتے، ان کے خلاف حکومت کا قانون حرکت میں آتا ہے، اوّل ان کی قدرِ کفاف روزی پر حملہ کیا جاتا ہے اور ڈپٹی کمشنر کی منظوری کے بغیر پبلک سے چندہ وصول کرنا قانوناً ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے، پھر ان کے گوشۂ عافیت پر یورش ہوتی ہے اور محکمۂ اوقاف کے ذریعہ یادگار "صفۂ مسجد نبویؐ علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام یعنی مدارسِ عربیہ اور مکاتب دینیہ کی عمارتوں پر قبضہ کر کے انھیں خانماں برباد کر دیا جاتا ہے، خدا کے گھروں یعنی مسجدوں

پر قبضہ کیا جاتا ہے اور محکمۂ اوقاف کے ذریعہ غیر سند یافتہ مؤذنین، ائمہ اور خطباء کے لئے مسجدوں کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، اوقاف کی قائم کردہ منتظمہ کمیٹی کے سیکریٹری سے اعلان کرا دیا جاتا ہے کہ سیکریٹری کی اجازت کے بغیر کوئی بھی عالمِ دین مسجد میں وعظ نہیں کہہ سکتا، پبلک جلسوں میں علماء کو کلمۂ حق کہنے سے روکنے کے لئے دفعہ ۱۴۴ لگادی جاتی ہے ان علماء و مبلغین و واعظین کو جن سے حکومت کے خلاف بولنے کا خطرہ ہوتا ہے کسی خاص علاقہ میں "ان کی بستی میں" یا "گھروں میں" "قانون تحفظِ امنِ عامہ کے تحت نظر بند کر دیا جاتا ہے یا زبان بندی کر دی جاتی ہے اور جن علماءِ حق کے ملک میں موجود ہونے کو ہی حکومت اپنے مفاد کے لئے مضر سمجھتی ہے ان کو جلا وطن کر دیا جاتا ہے تا آنکہ علماءِ حق کے لئے قانون شکنی کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا اور وہ قانون شکنی پر آمادہ ہو جاتے ہیں، تب گرم جنگ شروع ہوتی ہے اور جیلوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اگر جیلوں کی وحشیانہ اور ننگِ انسانیت ایذا رسانیاں بھی ان کو حق بات کہنے سے نہیں روک سکتیں تو حکومتیں ان کو سولی پر چڑھا دینے میں بھی دریغ نہیں کرتیں اور علماءِ حق امام مالک امام ابو حنیفہ اور امام احمد کی سنت کو بیدریغ زندہ کرتے ہیں اور قید و بند کی تمام تر سختیوں بلکہ موت فی سبیل اللہ کو بھی لبیک کہتے ہیں۔

یہ ہوتے ہیں علماءِ حق پیدا کرنے والی علومِ دینیہ کی درسگاہوں اور علماءِ حق کے بابرکت وجود کو کسی روئے زمین سے مٹانے کے دہ سالہ اور پنجسالہ منصوبے اور ان کے مختلف مرحلے سادہ لوح عوام ان سے قطعاً ناواقف ہیں مگر علماءِ حق ان سے خوب اچھی طرح واقف ہیں اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی راہ میں ہر مزاحمت کا مقابلہ کرنے اور ہر ظلم وجور کو سہنے اور ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہیں مگر کسی مرحلہ پر بھی علومِ دینیہ کی حفاظت کا فرض انجام دینے اور حکومت کے اثر سے آزاد دینی خدمت انجام دینے کی سعادت سے کسی قیمت پر بھی دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں، وماتوفیقنا إلا بالله هو مولانا نعم المولىٰ ونعم النصير۔

یہی وہ ہتھکنڈے ہیں جس کے ذریعہ موجودہ عہد میں تمام اسلامی ملکوں کی حکومتوں نے آزاد علومِ عربیہ دینیہ کی درسگاہوں اور مکتبوں کو علومِ آخرت اور علومِ انبیاء سے یکسر خالی کیا ہے۔ انہی اسلامی ملکوں کا نام مدارسِ عربیہ کے خلاف حالیہ سرد جنگ میں بار بار لیا جارہا

ہے۔ آج یہ تمام اسلامی ممالک علومِ کتاب و سنت یعنی علمِ تفسیر و اصُول تفسیر علمِ حدیث و اصولِ حدیث، علمِ فقہ و اصول فقہ اور ان کے معاون علوم کی ٹھوس اور باضابطہ تعلیم اور درس و تدریس سے یکسر محروم اور خالی ہو چکے ہیں، اس وقت برصغیر پاکستان و ہندوستان کے سوا اور کسی ملک میں حکومتوں کے اثر سے آزاد علومِ دینیہ کی درس گاہوں اور دینی مکتبوں کا وجود باقی نہیں رہا ہے اور صرف انہی دونوں ملکوں میں مذکورہ بالا علومِ کتاب و سنت کی باضابطہ درس و تدریس اور تحفیظ و تجویدِ کلام اللہ کے سلسلے جاری ہیں اور اس آخیر زمانہ کے حسبِ حال علماء حفاظ و مجودینِ قرآن، واعظین و مبلغین انہی دو ملکوں میں ان درسگاہوں سے فارغ ہو کر نکل رہے ہیں اور مختلف دینی خدمات انجام دے رہے ہیں اور ان کی مساعی کی بدولت دینی روح جس درجہ میں بھی ہے زندہ ہے اور ان دونوں ملکوں کے مسلمانوں کا مزاج بہرحال دینی ہے جو لوگ عہدِ حاضر کے ممالکِ اسلامیہ کی درسگاہوں کو قریب سے دیکھ چکے ہیں یا ان کی اصلیت سے باخبر ہیں وہ ہمارے اس بیان کی تصدیق و تائید کریں گے نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ علومِ شرعیہ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں شیخ التفسیر، شیخ الحدیث اور شیخ الفقہ جیسے خالص دینی منصبوں پر تقرر کی پہلی اور لازمی شرط یہ ہے کہ امیدوار عالمِ دین حقیقی معنی میں ہو یا نہ ہو مگر امریکن یا یورپین ممالک کی کسی یونیورسٹی سے اس نے پی ایچ ڈی ضرور کیا ہو یعنی "یورپ ریٹرن" اور مغرب زدہ ضرور ہو یہودیوں اور نصرانیوں کا تریاق نما زہر جو اسلامی روح کے لئے سمِ قاتل ہے اس نے چار سال تک ضرور پیا ہو۔

اس لئے اب علومِ دینیہ عربیہ اور علماءِ دین پیدا کرنے والی عربی درس گاہوں کی حفاظت ان ملکوں کے علماءِ حق پر فرض کفایہ نہیں رہی بلکہ فرض عین ہو گئی ہے۔

اگر فی الحقیقت حکومت کی نیت نیک ہے اور وہ واقعی ان مدارسِ عربیہ کے فارغ التحصیل طلبہ کو عصری علوم، عالمی حالاتِ حاضرہ اور انگریزی زبان سے واقف بنا کر ان کو دینی خدمات انجام دینے کے لئے زیادہ کارآمد اور ان کی اسلامی دینی خدمات کو زیادہ مؤثر اور دور رس بنانا چاہتی ہے تو جیسا کہ اس کو اب سے تین سال پہلے وفاقِ مدارسِ عربیہ

کی جانب سے مشورہ دیا جا چکا ہے۔ ان مدارس عربیہ اور مکاتبِ دینیہ کو اور ان کے درسی نصابوں کو علی حالہ قائم رہنے دے اور کام کرنے دے۔ ہاں ان کے فارغ التحصیل طلبہ کے لئے علماءِ حق کے مشورہ سے صرف علومِ عصریہ اور انگریزی زبان کا ایک چہار سالہ نصاب الگ تجویز کرے اور اس کے لئے دو تین مستقل درس گاہیں مرکزی شہروں مثلاً کراچی، لاہور راولپنڈی یا پشاور میں قائم کرے یا موجودہ بڑے بڑے مدرسوں میں ہی یہ "چہار سالہ نصاب" اپنے خرچ پر یا اگر ان مدارس کے فنڈ میں گنجائش ہو تو انہی کے خرچ پر قائم کرے اور صرف دینی خدمات کے مناصب کے لئے اس کی سند کو تسلیم کرے۔ دفتری ملازمتوں کے لئے نہیں۔ تو ان علماء کی دینی خدمات زیادہ مؤثر اور دور رس ہو سکیں گی اور قدیم علومِ دینیہ کی باضابطہ اور ٹھوس تعلیم اور دینی تربیت کو نقصان پہنچائے بغیر یہ طلبہ عصری علوم، حالاتِ حاضرہ اور انگریزی زبان سے ناواقفیت کے نقص کو دور کر سکیں گے اور حقیقی معنی میں "علومِ عصریہ" سے واقف علماءِ دین بن سکیں گے اور اندرونِ ملک و بیرونِ ملک دینی خدمات انجام دے سکیں گے۔

محکمۂ اوقاف کا ترتیب کردہ قدیم علومِ دینیہ اور جدید علومِ عصریہ کا "مخلوط" نصاب۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر، جو اس وقت محکمۂ اوقاف کی درس گاہ جامعۂ اسلامیہ بہاول پور میں رائج ہے۔ علومِ دینیہ عربیہ کے لئے تو تباہ کن ہے ہی علومِ عصریہ اور حالاتِ حاضرہ کی کماحقہ واقفیت اور انگریزی زبان کی قابلیت پیدا کرنے میں بھی ناکام ہے جن ناظرفدار لوگوں نے جامعہ اسلامیہ بہاول پور کے نصاب اور اس کی تعلیم و تدریس کی تفصیلات کہ بخاری سال میں کتنی ہوتی ہے اور ہدایہ کتنا ہوتا ہے اور جلالین کتنی ہوتی ہے کو قریب سے دیکھا ہے وہ اس کے شاہد ہیں، وما علینا إلا البلاغ۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وآله وصحبه أجمعين۔

جمادی الأخری ۱۳۸۷ھ

علم اس کی اقسام اور اس کے فوائد

علم، دین کا ہو یا دنیا کے کسی شعبے کا، وہ بہرحال انسانیت کے لئے تمغۂ فضیلت اور طرۂ امتیاز ہے اور تعلیم کا مقصد فضل و کمال سے آراستہ ہونا اور میراثِ انسانیت کا حاصل کرنا ہے، موضوع کے لحاظ سے علم کی دو قسمیں قرار پاتی ہیں (۱) دینی علوم اور (۲) دنیاوی علوم۔ دینی علوم کے اصل ثمرات و برکات تو آخرت ہی میں ظاہر ہوں گے۔ تاہم جب تک دنیا میں اسلام کی عزت و رفعت کا دور دورہ رہا دنیا میں بھی اس کی منفعتیں ظاہر ہوتی تھیں، علمائے دین، قاضی، قاضی القضاۃ، مفتی اور شیخ الاسلام کی حیثیت سے محاکمِ عدلیہ اور محاکمِ احتساب کے مناصب پر فائز ہوتے تھے، ملک و ملت کے لئے ان کا وجود سایۂ رحمت سے کم نہیں تھا، ان کی خدا ترسی، حق پسندی اور عدل پروری کی بدولت معاشرہ میں امن و عافیت کی فضا قائم تھی اور اسلام کے عادلانہ احکام کا نفاذ بہت سے معاشرتی امراض سے حفاظت کا ضامن تھا۔

الغرض دینی مناصب کے لئے علمائے دین ہی کا انتخاب و تقرر ہوتا تھا اور آج بھی جن ممالک میں اسلامی نظام کسی حد تک رائج ہے اس کے کچھ نمونے موجود ہیں اور دنیوی علوم جن کا تعلق براہِ راست دنیا کے نظام سے تھا، مثلاً فلسفہ، منطق، تاریخ، جغرافیہ ریاضی، ہیئت، حساب، طب و جراحت وغیرہ ان کے لئے تو حکومتی مناصب بیشمار تھے۔

اور علوم کی یہ تقسیم کہ کچھ علوم دینی ہیں اور کچھ دنیاوی، محض موضوع کے لحاظ سے ہے مگر اس کے معنی دین و دنیا کی تفریق کے ہرگز نہیں۔ چنانچہ دنیوی علوم اگر بے ہودہ اور لایعنی نہ ہوں اور انھیں خدمتِ خلق، اصلاحِ معاش اور تدبیرِ سلطنت کی نیت سے حاصل کیا جائے تو وہ بھی بالواسطہ رضائے الٰہی کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور دین و دنیا کی تفریق ختم ہو جاتی ہے اور اس کے برعکس جب دینی علوم کی تحصیل کا مقصد محض دنیا کمانا ہو تو یہ علوم بھی بالواسطہ دنیا کے علوم کی صف میں آجاتے ہیں اور اس کے لئے احادیثِ نبویہ میں سخت سے سخت وعیدیں بھی آئی ہیں، مثلاً ایک حدیث میں ہے:-

«مَن تَعَلَّمَ عِلماً مِمّا يُبتغى بِهٖ وجهُ اللهِ لا يَتَعَلَّمُهٗ اِلّا لِيُصيبَ بِهٖ عَرَضاً مِنَ الدُّنيا لَم يَجِد عَرفَ الجَنَّةِ يَومَ القِيامَةِ، يعني ريحَهَا» (مشکاۃ شریف)

جس شخص نے وہ علم سیکھا جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل ہو سکتی ہے اور پھر اس کو متاعِ دنیا کا ذریعہ بنایا تو ایسا شخص قیامت کے دن جنت کی خوشبو سے بھی محروم رہے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے:۔

«مَن طَلَبَ العِلمَ لِيُجارِيَ بِهٖ العُلَماءَ اَو لِيُمارِيَ بِهِ السُّفَهاءَ اَو يَصرِفَ وُجُوهَ النّاسِ اِلَيهِ اَدخَلَهُ اللهُ النّارَ» (مشکاۃ شریف)

جس شخص نے اس غرض سے علم حاصل کیا کہ اس کے ذریعہ علماء سے مقابلہ کرے یا کم عقلوں سے بحث کرے یا لوگوں کی توجہ اپنی طرف مائل کرے، اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو آگ میں ڈالیں گے۔

بہرحال ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ دینی علوم بھی دنیا کے علوم بن جاتے ہیں اور دنیوی علوم بھی رضائے الٰہی اور طلبِ آخرت کا ذریعہ بن سکتے ہیں اور دین و دنیا کی تفریق ختم ہو جاتی ہے، گویا اصل مدار مقاصد و نیات پر ہے کہ اگر مقصد رضائے الٰہی ہے تو دنیوی علم بھی دین کے معاون و مددگار، اور صنعت و حرفت کے تمام شعبے اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کے وسائل بن جاتے ہیں۔

علوم خواہ قدیم ہوں یا جدید اور دینی ہوں یا دنیوی ان سب سے مقصد رضائے الٰہی کے مطابق ایک صالح معاشرہ کا قیام ہونا چاہیئے اور یہ مقصد اسی صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے کہ جو شخص جس شعبۂ زندگی سے منسلک ہو وہ اس شعبہ سے متعلق بقدرِ ضرورت دینی مسائل سے بھی واقف ہو، مسلمان تاجر ہو تو تجارت سے متعلقہ دینی مسائل کا عالم ہو، انجینئر ہو تو عالم ہو، طبیب اور ڈاکٹر ہو تو عالم ہو، حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد میں جو خلافتِ راشدہ کا تابناک دور ہے، ایک قانون یہ تھا:۔

لا يَبِعْ فى سُوقِنا هٰذا مَن لَم يَتَفَقَّهْ فى الدِّين

جو شخص فقیہ (دینی مسائل کا ماہر) نہ ہو اس کو ہمارے بازار میں خرید و فروخت کی اجازت نہیں۔

گویا دنیا کمانے کے لئے بھی علمِ دین کی ضرورت ہے تاکہ حلال وحرام اور جائز وناجائز کی تمیز ہو سکے اور خالص سُود، سودی کاروبار اور غیر شرعی معاملات میں مبتلا نہ ہو۔

الغرض ایک دور ایسا تھا کہ ہر ہنر وکمال کا مقصد آخرت اور رضائے الٰہی تھا اور اب ایک دور ایسا آگیا ہے کہ ہر چیز کا مقصد دنیا ہی دنیا بن کر رہ گیا بلکہ اب تو اس میں بھی اس قدر تنزل رونما ہوا ہے کہ دنیا کی بھی تمام حیثیتیں ختم ہو کر رہ گئیں۔ اب تو واحد مقصد صرف "پیٹ" رہ گیا ہے، دنیا کے ہر علم وہنر اور فضل وکمال کا منتہائے مقصود بس یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ جہنم بھر جائے۔

جدید تعلیم اور اس کا مقصد

قدیم اصطلاح میں تو دینی علم ہی علم کہلانے کا مستحق تھا، دنیاوی علوم کو فنون یا ہنر سے تعبیر کیا جاتا تھا، مگر آج کی اصطلاح یہ ہو گئی ہے کہ قدیم علوم کے ماہر کو عالِم کہا جاتا ہے اور جدید علوم کے ماہرین کو "تعلیم یافتہ" کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ امریکہ اور یورپ وغیرہ کے جو ممالک جدید علوم کے امام ہیں وہاں آج بھی کسی "تعلیم یافتہ" کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کسی اسکول میں ٹیچر، کسی کالج میں پروفیسر یا سرکاری دفتر میں ملازم ہو بلکہ وہاں تعلیم کا مقصد ہنر وکمال کی تحصیل سمجھا جاتا ہے تاکہ ہر شعبۂ حیات میں ہنر وکمال کے مالک افراد موجود ہوں، ان ممالک میں ٹیکسی ڈرائیور اور بسوں کے کنڈیکٹر بھی گریجویٹ ہوتے ہیں، یہ کہیں بھی نہیں سمجھا جاتا کہ بی اے یا ایم اے ہونے کے بعد دکان پر بیٹھنا یا کارخانے میں جانا یا ڈرائیور بننا باعثِ توہین ہے، پھر نہ معلوم ہمارے ملک میں یہ کیوں ضروری سمجھ لیا گیا ہے کہ جو شخص تعلیم یافتہ یا گریجویٹ ہو اس کے لئے سرکاری ملازمت لازم ہے ورنہ اس کی حق تلفی اور اس کی ڈگری کی توہین متصوّر ہو گی۔

برطانوی دور میں اس جدید تعلیم کا مقصد بلاشبہ یہی سمجھا گیا تھا کہ اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں سے تیار ہونے والے افراد سرکاری مشینری کے کل پرزے بنیں گے کیونکہ اس اجنبی ملک میں حکومت کی انتظامی ضرورت پوری کرنے کے لئے ان کو ایک ایسی نسل کی ضرورت تھی جس سے ان کی حکومت کا کاروبار چل سکے۔ وہ انگلستان سے

اتنے انگریز یہاں نہیں لاسکتے تھے کہ اتنے بڑے برِ کوچک کا تمام کام سنبھال سکیں، انہیں دنیا کے دوسرے ممالک پر بھی حکمرانی کرنی تھی، کلیدی مناصب تو ضرور وہ اپنوں ہی کو دیا کرتے تھے یا پھر ان کو جو سو فیصد ان کے حاشیہ بردار بن جائیں، مگر نیچے درجہ کے لئے انہیں یہیں سے آدمی مہیا کرنے تھے۔ علاوہ ازیں اس جدید تعلیم سے انگریز کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی لوگ انگریزی تہذیب و تمدن کے اتنے دلدادہ ہو جائیں کہ ظاہر و باطن میں انگریز ہی انگریز نظر آئیں اور لارڈ میکالے کی پیش گوئی پوری ہو جائے الغرض یہ ذہنیت انگریزی دور کی پیداوار ہے کہ تعلیم حاصل کرنا صرف ملازمت کے لئے ہے۔ ظاہر ہے کہ تعلیم کی رفتار میں ہر سال تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور سرکاری مناصب اور ملازمتیں محدود ہیں، تعلیمی تناسب سے ان میں اضافے کا امکان نہیں، نہ یہ ممکن ہے کہ تمام تعلیم یافتہ افراد کو سرکاری ملازمتوں میں کھپایا جا سکے اور یہ تو طلبہ کا مسئلہ تھا، اس پر مستزاد یہ کہ طالبات بھی اب تعلیم کے میدان میں اسی تیز رفتاری سے ترقی کر رہی ہیں اور وہ بھی ملازمت کی خواہاں ہیں، جب نئی نسل کو مستقبل تاریک نظر آتا ہے تو ان میں بے چینی پھیلتی ہے اور اس کا نتیجہ اس عبرت ناک منظر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو گذشتہ دنوں کراچی یونیورسٹی میں تقسیم اسناد کے موقعہ پر دیکھنے میں آیا کہ گورنر تک کے لئے آبرو بچانا مشکل ہو گیا، یہ ہیں جدید تعلیم کی برکات! اور یہ ہیں جدید تعلیم یافتہ حضرات «اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ» یہ صورت حال تمام اہل دانش اور اربابِ اقتدار کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ اگر جدید نسل کے اس ذہنی کرب کا صحیح حل تلاش نہ کیا گیا تو اس کے نتائج اس سے زیادہ ہولناک ہوں گے۔

جدید نسل کی بے چینی اور ذہنی کرب کے اسباب

ہمارے نزدیک کرب و بے چینی کے متعدد اسباب ہیں۔ سب سے اہم تو یہ ہے کہ جدید تعلیمی اداروں میں دینی ماحول، دینی تربیت اور دینی ذہن و فکر کی ضرورت کو کبھی محسوس نہیں کیا گیا بلکہ اس کے برعکس نئی نسل کو دین سے بیزار کرنے کے تمام اسباب و

وسائل مہیا کئے گئے، دین کو "ملائیت" کا نام دے کر نوخیز ذہنوں کو اس سے نفرت دلائی گئی، علمائے دین کے لئے طرح طرح کے القاب تجویز کر کے انہیں "تعلیم یافتہ" طبقہ کی نظر میں گرانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی، ذرائع نشر و اشاعت کو تمام حدود و قیود سے آزاد کر کے انہیں بد دینی کا مبلغ بنا دیا گیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ لادینی نظریات کا پرچار کرنے کے لئے مستقل ادارے قائم ہوئے اور سرکاری طور پر ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کی گئی۔ اب خود سوچئے کہ جس نوخیز نسل کے سامنے گھر کا پورا ماحول بے دین ہو، تعلیم گاہوں میں دینی ماحول کا فقدان ہو، گلی کوچوں سڑکوں اور بازاروں سے بے دینی کا غلیظ اور مسموم دھواں اٹھ رہا ہو، زندگی کے ایک ایک شعبہ سے دین کو کھرچ کھرچ کر صاف کر دیا گیا ہو، والدین سے اساتذہ تک اور صدر سے چپراسی تک نئی نسل کے سامنے دینداری، خدا ترسی اور خوف آخرت کا کوئی نمونہ سرے سے موجود نہ ہو اور جس ملک میں قدم قدم پر فواحش و منکرات، بے حیائی و بد اخلاقی اور درندگی و شیطنت کا سامان موجود ہو کیا آپ وہاں کی نئی نسل سے دینداری شرافت اور انسانی قدروں کے احترام کی توقع کر سکتے ہیں؟ جس نسل کا خمیر تخریب سے اٹھایا گیا ہو کیا وہ کوئی تعمیری کارنامہ انجام دے سکتی ہے؟ جو خود معاشرہ کے عمومی بگاڑ کی پیداوار ہو کیا وہ کسی درجہ میں بھی معاشرہ کی اصلاح کے لئے مفید اور کار آمد ہو سکتا ہے؟

تم لاکھ تعلیمی ترقی اور اعلیٰ تہذیب کے ڈھنڈورے پیٹو لیکن خوب یاد رکھو تعلیم کا ماحول جب تک دینی نہیں ہوگا، نئی نسل کے سامنے والدین، اساتذہ اور اہم شخصیتوں کی شکل میں اخلاق و انسانیت اور دینداری و خدا خوفی کے اعلیٰ نمونے جب تک موجود نہیں ہوں گے، تعلیم میں جب تک دینی تربیت مطمح نظر نہیں ہوگی اور جب تک اخلاق و اعمال، جذبات و عواطف اور رجحانات و میلانات کی اصلاح نہیں ہوگی تب تک یہ مصیبت روز افزوں ہوتی جائے گی۔ تعلیم سے جب اسلامی روح نکل جائے، اخلاق تباہ ہو جائیں، انسانی قدریں پامال ہو جائیں اور مقصد زندگی صرف حیوانیت اور شکم پروری رہ جائے تو اس تعلیم کے یہ دردناک نتائج ظاہر نہیں ہوں گے تو اور کیا ہوگا؟

صد حیف! کہ آج انسانیت کی پوری مشین "پیٹ" کے گرد گھومنے لگی ہے۔ آج کی تمام تعلیم، تمام تربیت اور تمام تہذیب کا خلاصہ یہ ہے کہ حیوانی زندگی کے تقاضے کیسے پورے کئے جائیں، دین جاتا ہے تو جائے، اخلاق مٹتے ہیں تو مٹیں، انسانیت پامال ہوتی ہے تو ہو مگر ہمارے حیوانی تقاضے اور نفسانی خواہشات بہرحال پوری ہونی چاہئیں۔ نہ دین سے تعلق، نہ اخلاق سے واسطہ، نہ انسانیت کا شعور، نہ افکار صحیح، نہ خیالات درست، نہ خدا کا خوف، نہ آخرت کی فکر، نہ مخلوق سے حیا۔ إنّا للہِ وَإنّا إلیہِ راجعون۔

جدید تعلیم اور اس کے چند مہلک ثمرات

اسی جدید تعلیم اور اس کے لادینی نظام نے لسانی عصبیت اور صوبہ پرستی کی لعنت کو جنم دیا جس کی وجہ سے مشرقی بازو کٹ گیا اور اب کراچی اور سندھ میں بھی شب و روز اس کے دردناک مناظر دیکھنے میں آرہے ہیں، نہ معلوم اس بدنصیب قوم کا انجام کیا ہو گا۔ انسانی اقدار اور احترام انسانیت کا شعور پیدا کرنے کے لئے دین و مذہب کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہم بارہا ان صفحات میں صاف صاف کہہ چکے ہیں کہ آخرت کی نجات اور دنیا کی سعادت صرف اسلامی تعلیمات اور اسلامی ہدایات و احکامات میں مضمر ہے اس کے سوا خسارہ ہی خسارہ ہے۔ تعلیم کا مقصد روح کی بالیدگی، نفس کی پاکیزگی، سیرت و کردار کی بلندی اور ظاہر و باطن کی طہارت و نظافت ہونا چاہیئے اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ اس تعلیمی قالب میں دینی روح بطورِ مقصد جلوہ گر ہو اور جب تم اپنے وسائل کی پوری قوت سے دین کو ختم کر رہے ہو اور دین کا مضحکہ اڑا کر اسے رسوا کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہو تو اس کے بدترین نتائج کے لئے بھی تیار رہو۔ ع "خرما نتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم"

نئی نسل کے اضطراب کا بڑا اور اہم سبب

نئی نسل کے کرب و اضطراب کا ایک بڑا سبب صنفِ نازک کے بارے میں غلط روی پر مسلسل اصرار ہے، اسلام نے عورت کو عزت و احترام کا جو مقام بخشا ہے وہ نہ

کسی قدیم تہذیب میں اسے حاصل ہوا تھا، نہ جدید ترقی یافتہ تہذیب کو اس کی ہوا لگی ہے اسلام نے اس کے تمام حقوق دلوائے، اسے ماں، بہن اور بیٹی کے نہایت قابلِ احترام القاب سے سرفراز کیا، مرد وعورت کے درمیان نہایت مقدس ازدواجی رشتہ قائم کر کے دونوں کی زندگی کو سراپا امن وسکون بنانے کی ضمانت دی، عورت کے تمام حقوق و نفقات کا بوجھ مرد کے ذمہ ڈالا، اس کو گھر کی ملکہ بنا کر گھر کا سارا نظم ونسق اس کے سپرد کیا، اولاد کے بہترین اتالیق کی حیثیت سے اسے پیش کیا، مرد وزن کے الگ الگ دائرہ کار کی حد بندی کی، دونوں کے لئے ایسے عادلانہ احکام وضع فرمائے کہ یہ رشتہ نفسیاتی طور پر محبت وخلوص کا مجسمہ بن جائے، گھر کے انتظامی معاملات عورت کے سپرد کر کے مرد کو گھر کی فکر سے یکسو کر دیا اور باہر کی تمام ضروریات کا بار مرد پر ڈال کر عورت کو فکرِ معاش سے آزاد کر دیا تاکہ دونوں جانب سے احسان مندی اور قدرشناسی کے جذبات پروان چڑھیں۔

ایک پُرفریب نعرہ "آزادئ نسواں"

مگر جدید تہذیب نے ان تمام مصالح واسرار کو غارت کر کے "آزادئ نسواں" کا ایک پُرفریب نعرہ ایجاد کیا اور صنفِ نازک کو گھر کی سلطنت سے باہر نکال کر گلی کوچوں میں رُسوا کیا اور زندگی کی پرخار وادیوں میں اسے مردوں کے دوش بدوش چلنے پر مجبور کیا جو فرائض مردوں کے ذمہ تھے ان کا بوجھ بھی عورتوں پر ڈالا، اس کے بعد "تعلیمِ نسواں" کے فسونِ ساحری نے عورت کو جدید تعلیم اور جدید تہذیب کے قالب میں ڈھالا اور اب عورتوں کے لئے اعلیٰ تعلیم ایک فیشن بن گیا، ڈگری حاصل کرنے کے بعد اب ضرورت ہے کہ ملازمتوں میں انہیں بھی برابر کا حصہ دیا جائے پہلے مردوں کے لئے ملازمت کی جگہ کا سوال تھا، اب عورتوں کے لئے ملازمت کا اس پر مزید اضافہ ہو گیا۔

ہمیں خوب معلوم ہے کہ جدید طبقہ کس ذہن سے سوچنے کا عادی ہو چکا ہے، اس لئے ہمیں توقع نہیں کہ اس گردابِ بلا میں پھنس جانے کے باوجود وہ کسی ناصحِ مشفق کی بات

سنناگوارا کرے گا تاہم ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ جدید تہذیب نے عورت سے بد ترین مذاق کر کے شرفِ النسائیت کو بٹہ لگا دیا ہے۔

پردہ عورت کا فطری حق ہے

پردہ عورت کا فطری حق ہے، عورت گھر میں ہو یا بازار میں، کالج میں ہو یا یونیورسٹی میں یا دفتر اور عدالت میں ہو وہ اپنی فطرت کو تبدیل کرنے سے قاصر ہے وہ جہاں ہو گی اس کے ضمیر کی خلش اور فطرت کی آواز اُسے پردہ کرنے پر مجبور کرے گی، وہ بے دین قومیں جو عورت کی فطرت سے اندھی اور خالقِ فطرت کے احکام سے ناآشنا ہیں وہ اگر عورت کی پردہ دری کے جرم کا ارتکاب کریں تو جائے تعجب نہیں مگر ایک مسلمان جس کے سامنے خدا اور رسول کے احکام اور اس کے اکابر کا شاندار ماضی موجود ہو، اس کا اپنی بہو و بیٹیوں کو پردے سے باہر لے آنا مُردہ ضمیری کا قبیح ترین مظاہرہ ہے، عورت کی ساخت و پرداخت اس کی عادات و اطوار اور اس کی گفتار و رفتار پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ وہ عورت (مستور) ہے اسے ستر (پردہ) سے باہر لانا اس پر بد ترین ظلم ہے۔

ستم ظریفی کی حد ہے کہ وہ عورت جو عصمت و تقدس کا نشان تھی اور جس کی عفت و نزاہت سے چاند شرماتا تھا اسے پردہ سے باہر لا کر اس سے ناپاک نظروں کی تسکین اور نجس قلوب کی تفریح کا کام لیا گیا جدید تہذیب میں عورت زینتِ خانہ نہیں، شمعِ محفل ہے اس کی محبت و خلوص کی ہر ادا اپنے شوہر اور بال بچوں کے لئے وقف نہیں بلکہ اس کی رعنائی و زیبائی وقف تماشائے عالم ہے، وہ تقدس کا نشان نہیں کہ اس کے احترام میں غیر محرم نظریں فوراً نیچے جھک جائیں، بلکہ وہ بازاروں کی رونق ہے، آج دو پیسے کی چیز بھی عورت کی تصویر کے بغیر فروخت نہیں ہوتی، اس سے زیادہ نسوانیت کی ہتک اور کیا ہو سکتی ہے، کیا اسلام نے عورت کو یہی مقام بخشا تھا؟ کیا جدید تہذیب نے عورت پر یہی احسان کیا؟ کیا یہی آزادیٔ نسواں ہے جس کے لئے گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگائے جاتے تھے؟ اسلام کی نظر میں عورت ایک ایسا پھول ہے جو غیر محرم

نظر کی گرم ہوا سے فوراً مرجھا جاتا ہے اسے پردہ سے باہر لانا اس کی فطرت کی توہین ہے۔

ادھر عورتیں پردے سے باہر آئیں ادھر انہیں زندگی کی گاڑی میں جوت دیا گیا، تجارت کریں تو عورتیں، وکالت کریں تو عورتیں، صحافت کے شعبہ میں جائیں تو عورتیں، عدالت کی کرسی پر متمکن ہوں تو عورتیں، اسمبلی میں جائیں تو عورتیں، الغرض کاروباری زندگی کا وہ کون سا بوجھ تھا جو مظلوم عورت کے نازک کاندھوں پر نہیں ڈال دیا گیا، سوال یہ ہے کہ جب یہ تمام فرائض عورتوں کے ذمہ آئے تو مرد کس مرض کی دوا ہیں؟ اسلام نے نان ونفقہ کی تمام ذمہ داری مرد پر ڈالی تھی لیکن بزدل مغرب نے "مردوں کے دوش بدوش چلنے کا جھانسہ دے کر یہ سارا بوجھ اٹھا کر عورت کے سر پر رکھ دیا، جدید تہذیب کے نقیبوں سے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ یہ عورت پر احسان ہوا یا بدترین ظلم؟ عورت گھر کے فرائض بھی انجام دے، بال بچوں کی پرورش کا ذمہ بھی لے، مرد کی خدمت بھی بجا لائے اور اسی کے ساتھ کسبِ معاش کی چکی میں بھی پسا کرے؟ ظاہر ہے کہ عورت کے فطری قویٰ اتنے بوجھ کے متحمل نہیں ہوسکتے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھر کا کاروبار نوکروں کے سپرد کرنا پڑا، بچوں کی تربیت وپرداخت ماماؤں کے حوالے کی گئی، روٹی ہوٹل سے منگوائی گئی، گھر کا سارا نظام تو ابتر ہوا ہی باہر کے فرائض پھر بھی عورت یکسوئی سے ادا نہ کر پائی نہ وہ کرسکتی ہے۔

پھر مرد وزن کے اختلاط اور آلودہ نظروں کی آوارگی نے معاشرہ میں جو طوفان برپا کیا اس کے بیان سے زبانِ قلم کو حیا آتی ہے، یہ ہے آزادیٔ نسواں اور تعلیمِ نسواں کا پُرفریب افسوں جس نے انسانیت کو تہ وبالا اور معاشرے کو کرب واضطراب میں مبتلا کردیا۔

اسلام کی نظر میں جائز پیشے ذلّت کے موجب نہیں

اس کرب وہیجان کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ عام طور سے صنعت وحرفت اور دستکاری سے عار نوجوانوں کے مزاج میں داخل ہوگیا گویا جب تک کوئی اچھی ملازمت

یا کوئی بڑے پیمانے کا کاروبار نہ میسر ہو اس وقت تک کسی کام کا شروع کرنا بالبوانہ شان کے خلاف سمجھا گیا اور یہ بے جا تکبر بیروزگاری زبوں حالی اور ذہنی انتشار پر منتج ہوا، کسی ادنیٰ سے ادنیٰ حلال پیشے کو حقیر سمجھنا نہایت پست ذہنی کی علامت ہے، اسلامی نقطہ نظر سے کوئی جائز اور حلال پیشہ تحقیر و تذلیل کا مستحق نہیں، حدیث میں ہے:۔

((مَا اَكَلَ اَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ، وَاِنَّ نَبِيَّ اللهِ دَاؤُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَاْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ)) (بخاری)	کسی شخص نے کبھی کوئی کھانا نہیں کھایا جو اس کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے بہتر ہو اور اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام (باوجود عظیم سلطنت کے) اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نجار (بڑھئی) تھے، الغرض ایک طرف تو حرفت و دستکاری کو حقیر جانا گیا اور دوسری طرف کسی صحیح منصوبہ بندی کے ذریعہ نوجوانوں کے لئے روزگار مہیا کرنے کی نئی نئی صورتوں پر توجہ نہیں دی گئی، نتیجۃً بیکاری و بیروزگاری کا سیلاب اُمڈ آیا اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کا مسئلہ پورے معاشرے کے لئے وبال بن گیا۔

تعلیم یافتہ بیروزگار نوجوانوں کے مسائل کا حل

اگر ہم اس مکروہ اور تکلیف دہ صورتِ حال سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے:۔

اولاً:۔ اوپر سے نیچے تک پورے معاشرے کی اور بالخصوص نئی نسل کی دینی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا ہوگا، اس کے لئے ضروری ہے کہ تمام تعلیمی اداروں میں خالص دینی ماحول بنایا جائے، امتِ مسلمہ کا رشتہ مسجد سے قائم کیا جائے اور انہیں تبلیغی مراکز میں جوڑا جائے۔

ثانیاً:۔ غیر اسلامی نظریات کی تلقین و تبلیغ کا سلسلہ یک لخت بند کرنا ہوگا جس قوم کے پاس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا پیغامِ حیات موجود ہو اور وہ اس

کے مسائل کو حل نہ کر سکے تو خدا اس قوم کے کسی مسئلہ کو کبھی حل نہ کرے، ہمارے ارباب اقتدار و اختیار کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن کو چھوڑ کر لینن و ماؤ سے راہنمائی حاصل کرنے کا نتیجہ ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔

((ضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ وباء و ابغضب مّنَ اللہ))

ثالثاً: خواتین کی بے پردگی، عریانی اور سرِ بازار رسوائی کا انسداد کرنا ہو گا، عورتوں کی بقدرِ ضرورت تعلیم پردہ میں ہو اور باہر کی تمام ذمہ داریوں سے انہیں سبکدوش کیا جائے اور اگر کوئی ایسی صورت ہو کہ کسی خاتون کا کوئی معاشی کفیل نہیں تو اول تو قوم اور قومی خزانہ کا فرض ہے کہ ان کی معاشی کفالت اپنے ذمہ لے اور اگر قوم کی بے حسی اور حکام کی غفلت اس سے مانع ہو تو ان کے لئے باپردہ گھریلو صنعتوں کا انتظام کیا جائے جس سے وہ اپنی معاش حاصل کر سکیں۔

الغرض معاشی بوجھ صرف مردوں کو اٹھانا چاہیئے اور اگر شاذونادر یہ ذمہ داری عورتوں پر آئے تو ان کے لئے باپردہ انتظام کیا جائے، ہم سمجھتے ہیں کہ اگر صرف عورتوں کا مسئلہ حل ہو جائے تو آدھا انتشار اسی وقت ختم ہو جائے گا۔

رابعاً: اس ذہنیت کو ترک کرنا ہو گا کہ تعلیم صرف ملازمت کے لئے ہے اور یہ کہ فلاں پیشہ حقیر ہے بلکہ صحیح منصوبہ بندی کے ذریعہ نئی نسل کی افرادی قوت کو مفید کاموں میں لگانا ہو گا اللہ تعالیٰ صحیح فہم نصیب فرمائے۔

جمادی الثانیہ ۱۳۹۲ھ، اگست ۱۹۷۲ء

سائنسی علوم اور تعلیم و تربیت

آج کل سائنس کا بہت شور برپا ہے، ہر طرف سے سائنس اور علومِ طبیعیہ کی صدائیں گونج رہی ہیں اور خیالِ راسخ ہوتا ہے کہ سائنس علوم، تعلیم و تربیت کا ایک اہم جزء ہیں اس کے بغیر ہر قسم کی تعلیم بے معنیٰ ہے اور یہی باور کیا جارہا ہے کہ تعلیمی نظام میں علمی سائنس اور عملی سائنس دونوں کی شدید ضرورت ہے اور جس طرح سابق اسلامی ادوار میں ریاضی اور ہیئت و فلکیات کے بڑے بڑے ماہر ہوئے ہیں اور طرح طرح کی فنی رصد گاہیں مسلمانوں نے بنائی ہیں آج کیوں مسلمانوں کا دامن ان کمالات سے خالی ہو۔

اس طرح کے افکار و نظریات آج کل عام جرائد و مجلات کے صفحات کی زینت بنے ہوئے ہیں، لیکن جہاں تک علمی و عملی سائنس کی اہمیت کا تعلق ہے اس سے انکار کرنا حماقت و جہالت ہے مگر اسی کے ساتھ سائنسی علوم کو ہر قسم کی تعلیم و تربیت کے لئے لازمی جزء سمجھنا شاید اس کا بھی حماقت و جہالت سے کم درجہ نہ ہوگا۔

علوم کی قسمیں اور ان کا حکم

پہلی بات تو یہ ہے کہ علوم دو قسم کے ہیں ایک وہ علوم جن کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرضِ عین ہے یہ وہ علوم ہیں جن کے ذریعہ بندے کا تعلق اپنے معبودِ حق تعالےٰ شانہٗ سے قائم ہو اور حق تعالےٰ کے حکم کے مطابق بندہ اس کی بندگی کر سکے، خیر و شر، حلال و حرام کی تمیز ممکن ہو، غرض عقیدہ صحیح ہوجائے اور عمل درست، عبادات و طاعات اور فرائض و واجبات سے ضروری واقفیت میسر آجائے، یہ علم چاہے زبانی تعلیم سے حاصل ہو یا والدین کی صحیح تربیت سے یا مکتب میں استاد کے ذریعے سے ہو یا پھر چاہے مادری زبان میں ہو یا کسی اجنبی زبان میں ہو اسی کو حدیث میں "طلب العلم فریضة علیٰ کل مسلم" فرمایا گیا ہے۔ دوسرے علوم وہ ہیں جن کو فقہی زبان میں "فرضِ کفایہ" کہتے ہیں یعنی اگر امت کے چند اشخاص بھی ان کو حاصل کرلیں تو بقیہ افراد کے ذمے سے یہ فرض ساقط ہوجاتا ہے جیسے نمازِ جنازہ میں چند افراد کے نماز پڑھ لینے سے تمام مسلمانوں کے ذمہ سے فرض ادا ہوجاتا ہے، اسلامی علوم میں تفسیر قرآنِ کریم اور احادیثِ نبی کریم فقہ، اصولِ فقہ، علمِ توحید و کلام وغیرہ کی تعلیم اور ان میں مہارت و بصیرت حاصل کرنا یہ فرضِ کفایہ

ہے بلاشبہ یہ فرضِ کفایہ بھی دینِ اسلام کا اہم شعبہ ہے اور امتِ اسلامیہ میں اس کا باقی رکھنا فرض ہے قرآنِ کریم کی آیتِ کریمۂ ذیل میں انہی علوم کے متعلق ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

((فلولا نفر من کل فرقة منهم	کہ ہر قوم کے چند افراد کے ذمہ ضروری ہے کہ وہ
طائفة لیتفقهوا فی الدین	علم دین سیکھیں اور اپنی بقیہ تمام قوم کو دین سے
ولینذروا قومهم إذا رجعوا	واقف کرائیں (آیت کریمہ کے کما حقہ، تفسیری حقائق
إلیهم لعلهم یحذرون)) توبہ ۲۲ ۔	ولطائف بیان کرنے کا یہ موقع نہیں)

پھر ان علوم میں بھی بعض علم ایسے ہیں کہ وہ خود مقصود نہیں ہیں بلکہ مقصود کے حصول کے لئے وسیلہ اور ذریعہ ہیں جیسے صرف نحو، معانی، بیان وغیرہ کہ ان علوم کے بغیر تفسیر، حدیث، فقہ اصولِ فقہ وغیرہ کو حاصل ہی نہیں کیا جا سکتا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے یہ علومِ عربیت مادری زبان کی حیثیت سے خود بخود حاصل تھے اس لئے ان کو ان علوم کے سیکھنے کی ضرورت نہ تھی روئے زمین کے عجمی (غیر عربی) مسلمانوں اور بعد کی نسلوں کو یہ بات میسر نہ تھی اس لئے ان کو ان علوم کا حاصل کرنا بھی ضروری ہوا۔

اب رہے وہ علومِ طبیعیہ جن کو آج کل سائنس کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، اگرچہ ان دونوں کے مفہوم میں کچھ فرق ہے، بہر حال یہ وہ علوم ہیں جو عقل وادراک اور فنی تجربات کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں عقل انسانی، نسلِ انسانی کے لئے اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم عطیہ ہے، اسی عقل کے ذریعہ حق تعالیٰ کے علم اور قدرت کے راز ہائے سربستہ، اس کائنات اور کارخانۂ قدرت میں ہر دور اور ہر زمانے میں جیسے جیسے وقت کے تقاضے ہوتے ہیں ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور پھر انہی فکری اور نظری علوم کے ذریعہ ان کے اچھے برُے اثرات و نتائج ظہور میں آتے رہتے ہیں، انہی علوم کا ثمرہ وہ تمام صنعتیں اور ایجادات ہیں جو نسلِ آدم کے کام آتی رہتی ہیں اسی کا نام عملی سائنس ہے۔

اصلی علم کیا ہے؟

اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو بآسانی واضح ہوگا کہ اصلی علوم وہی ہیں جو صرف وحیِ الٰہی کے ذریعہ اور انبیاءِ کرام کی تعلیمات کے واسطہ سے ظہور میں آتے ہیں، یہ وہ علوم ہیں جن کے ادراک سے عقلِ انسانی نہ صرف قاصر ہے بلکہ عقلِ انسانی کے دائرے سے ہی یہ علوم خارج ہیں، علوم و فنون

کی اصطلاح میں ان کو ماوراء الادراک اور ماوراء العقل کہا جاتا ہے۔

اس لئے انبیاءِ کرام علیہم الصلاۃ والسلام کا دائرۂ تعلیم و تربیت الٰہی علومِ الٰہیہ میں منحصر ہونا چاہیئے جو عقلِ انسانی کی رسائی سے بالاتر ہیں، قرآنِ کریم اور تعلیماتِ نبویہ میں ان علومِ طبعیہ وعقلیہ اور ان کے ذریعہ وجود میں آنے والی ایجادات واختراعات کی نہ تو تعلیم دی گئی ہے اور نہ ہی ان کی طرف توجہ کی گئی ہے نہ ہی اس کی ضرورت تھی۔

ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عقل وادراک جیسی خود کفیل نعمت اور قوتِ اختراع جیسی خودکار طاقت انسان کو عطا فرمادی جو ان تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کافی ووافی ہے تو پھر کسی مزید تفصیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی، چنانچہ اسلامی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ ہر دور میں عقلِ انسانی یہ خدمت انجام دیتی رہی ہے اور آج اس دورِ ترقی میں بھی جو کچھ نتائج سامنے آ رہے ہیں اور آئندہ آتے رہیں گے وہ سب اسی کے کرشمے ہیں۔

اگر ہم ان گذشتہ اشارات اور گذارشات کا خلاصہ بیان کرنا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی دو قسم کی ضرورتیں تھیں: ایک دنیا کی اور ایک آخرت کی، یا یوں کہئے ایک روح کی اور ایک جسد کی، علومِ الٰہیہ ربانیہ کے وہ سرچشمے جن کا تعلق وحیِ آسمانی سے ہے ان کا تعلق آخرت اور اصلاحِ روح سے ہے اور نفس کا تزکیہ وتہذیب ہی ان سے مقصود ہے مگر ان علوم کے حقیقی ثمرات ونتائجِ آخرت کی زندگی میں کما حقہ ظاہر ہوں گے اگرچہ ان کے برکات کا قدرے ظہور اس دنیا میں بھی ہو اور علومِ عقلیہ انسانیہ کا تعلق جسم وجسمانیات اور دنیا کی زندگی سے ہے ان کے منافع کا تعلق بھی دنیوی زندگی اور عالمِ جسمانی سے وابستہ ہے۔

سائنسی علوم کا ظاہری فائدہ

البتہ ان علومِ طبیعیہ سائنسی علوم وفنون کا اس زندگی میں ایک عظیم الشان فائدہ یہ ہے کہ یہ علوم اور ان کے ذریعہ حاصل ہونے والے نو بنو اکتشافات حق تعالیٰ کے کمالِ قدرت، کمالِ علم اور حقائقِ الٰہیہ کی معرفت کا ذریعہ بنتے ہیں اس کارخانۂ قدرت اور محیر العقول نظامِ کائنات میں حق تعالیٰ کی قدرت کے وہ راز ہائے سربستہ ان کے ذریعہ منکشف ہوتے ہیں جو معجزات کا کام دیتے ہیں اور ایمانِ کامل، یقینِ محکم، طمانیتِ دل ودماغ اور رسوخِ ایمانی جیسے

عظیم اور حیرت انگیز ثمرات کی بدولت میسر آتے ہیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی حجت منکرین وکافرین پر پوری ہو جاتی ہے لیکن تجربہ اس کا شاہد ہے کہ جو حضرات پہلے سے مشرف بایمان ہیں ان کے لئے تو یہ رسوخ ایمانی کا ذریعہ بنتے ہیں لیکن جو لوگ سعادتِ ایمان سے محروم ہوتے ہیں ان کے لئے نفسِ ایمان کا ذریعہ بھی نہیں بنتے، یہی وجہ ہے کہ یہ سائنسدان حق تعالیٰ کے اس کارخانۂ ملکوت میں اس حیرت انگیز نظام کے اسرار وغوامض پر مطلع ہونے کے بعد بھی ان میں سے کسی ایک کو بھی ایمان کی توفیق نصیب نہیں ہوتی ایمان تو کیا حقیقی معنی میں وہ انسان بننا بھی نصیب نہیں ہوتا جس کے پہلو میں دل اور دل میں رحم وعاطفۂ انسانیت ہو، یہی وجہ ہے کہ عہدِ حاضر کے تمامتر سائنس دانوں کی یہ گوناگوں ایجادات آج نسلِ انسانی کو تباہ وبرباد کرنے پر تلی ہوئی ہیں تمام دنیا کو تباہی کے کنارے لاکر کھڑا کر دیا ہے، اس تفصیل سے یہ بات بھی خیال میں آگئی ہوگی کہ سب سے زیادہ مقدم روح کی اصلاح و تربیت ہے اس کے بعد ہی یہ جدید علومِ عصریہ مفید ہو سکتے ہیں۔

علومِ الٰہیہ اور قدیم وجدید علوم کی ترویج کس کا فرض ہے؟

اب اس پر غور فرمائیں کہ تمام قدیم وجدید علوم کی تعلیم وتربیت اور ان علومِ الٰہیہ کی ترویج واشاعت نیز علومِ انسانی کی توسیع وہمت افزائی یہ کس کے ذمہ ہے؟ یہ ذمہ داری تمامتر اسلامی حکومتوں اور اسلامی حکمرانوں کی ہے، سوءِ اتفاق سے اس وقت مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک تمام حکومتیں اور حکمران درجہ بدرجہ اس ذمہ داری کے معاملہ میں مقصر نہیں بلکہ مجرم ہیں ظاہر ہے کہ اس تمام تعلیمی اور تجرباتی نظام سے تمام امت کو مستفید بنانے کے لئے حکومت کی سطح پر ہی کام ہو سکتا ہے اسی وجہ سے یہ مسلم ہے کہ تعلیمی میزانیہ فوجی میزانیہ سے زیادہ ہونا چاہئے لیکن جب حکومتیں اس طرح کی مجرمانہ غفلت برت رہی ہیں تو علومِ الٰہیہ کی جو فرضِ عین ہیں یا فرضِ کفایہ، حفاظت، امت کے ذمہ ہی عائد ہوتی ہے، متحدہ ہندوستان میں جب مسلمان اسلامی حکومتوں کے سایہ سے محروم ہوگئے تو علماءِ دین اور عام مسلمانوں نے اس ذمہ داری سے سبکدوشی کو اپنا فرض سمجھ کر اس کی کماحقہ تدبیریں کیں، دیندار اربابِ اموال سے مالی اعانتیں حاصل کرکے ان کی حفاظت کی اور آج تک الحمد للہ یہ سلسلہ ہند وپاکستان دونوں ملکوں میں قائم

ہے اور آج ہزاروں مدارسِ دینیہ باوجود گوناگوں نقائص اور کمزوریوں کے کسی نہ کسی درجہ میں یہ فرض انجام دے رہے ہیں۔

عربی زبان اور اسلام

اسلام اور عربی زبان کا جو باہمی محکم رشتہ ہے وہ محتاج بیان نہیں اسلام کا قانون عربی زبان میں ہے، اسلام کا آسمانی صحیفہ قرآنِ حکیم عربی زبان میں ہے، اسلام کے پیغمبر خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مادری زبان عربی ہے، حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تر تعلیمات ہدایات اور ارشادات کا پورا ذخیرہ عربی زبان میں ہے، اسلام کی اہم ترین عبادت صلوٰۃ (نماز) جس کو روئے زمین کے تمام مسلمان اپنے اپنے ملکوں میں روزانہ پانچ وقت پڑھتے ہیں وہ عربی زبان میں ہے، یہ نماز ہی توحیدِ اسلام کا اعلیٰ ترین مظہر اور دینِ اسلام کی بنیادی عبادت ہے، پھر ہفتہ واری اسلام کا پیغام۔ جمعہ کا خطبہ۔ عربی زبان میں ہے، سال میں دو مرتبہ عمومی و اجتماعی پیغام۔ عید الفطر اور عید اضحیٰ کا خطبہ۔ تمام دنیا میں عربی میں پڑھایا جاتا ہے، حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی رہنمائی کے لئے جو عجیب و غریب اذکار اور دعائیں۔ صبح سے شام تک ہر محل و ہر موقع اور ہر کام کے لئے تلقین فرمائی۔ عبد و معبود کے درمیان تعلق و رابطہ پیدا کرنے یا اس رشتہ کو مضبوط کرنے کے لئے جن سے زیادہ مؤثر اور کوئی تدبیر نہیں۔ وہ سب عربی میں ہیں، اسلام کا حسی مرکز۔ بارگاہِ قدس رب العالمین اور تجلیاتِ الٰہیہ کا سرچشمہ۔ جس سرزمین میں واقع ہے۔ مکہ مکرمہ زادھا اللہ شرفاً و تعظیماً و تکریماً و مھابۃً۔ وہ عرب ہے اور وہاں کے باشندوں کی زبان عربی ہے، سید الکونین رسول الثقلین حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آرام گاہ اور دار الھجرۃ جس سرزمین مقدس میں واقع ہے۔ مدینہ منورہ زادھا اللہ نوراً و طیباً۔ وہ عرب میں ہے اور اس کے بسنے والوں کی زبان بھی عربی ہے، مکہ معظمہ جس طرح عدنانی عرب کا مرکز تھا، اسی طرح ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ قحطانی عرب کا مرکز بن گیا، ان دونوں مرکزوں کی زبان اور تہذیب عہدِ قدیم سے آج تک عربی ہے، دونوں قوموں۔ عدنانی و قحطانی عربوں۔ کا سرمایۂ تاریخ و ادب عربی زبان میں ہے، قرآنِ کریم اور اسلام کے پہلے مخاطب۔ جزیرۃ العرب میں بسنے

والی پوری آبادی۔ عرب ہے، جزیرۃ العرب سے باہر اسلام کے دو اہم ترین مرکز عراق و شام ہیں، دونوں ملک عربی زبان و تہذیب کا گہوارہ تھے اور ہیں، مصر، لیبیا، سوڈان، مغربی افریقہ، الجزائر، تونس اور مراکش وغیرہ سب عربی بولنے والوں کے مرکزی مقامات ہیں، شمالی افریقہ کی اکثریت کی زبان بھی عربی یا بگڑی ہوئی عربی ہے۔

صحابۂ کرام اور تابعینِ عظام کے زمرہ میں شامل عرب فاتحین جو اسلامی فتوحات کے سلسلہ میں سندھ و ہند، افغانستان اور بخارا سے لے کر اسپین تک نہ صرف پھیل گئے بلکہ ان ملکوں میں بس بھی گئے تھے، ان کے ذریعہ ان ملکوں میں بھی عربی زبان پہنچ گئی اور چونکہ ان ملکوں کی تمام مسلمان قوموں کا "دینی سرمایہ" عربی زبان میں تھا اس لئے ان ملکوں کی بھی دینی اور مذہبی زبان عربی بن گئی، چنانچہ نہ صرف یہ کہ ان ممالک اسلامیہ میں لائقِ فخر عربی دان پیدا ہوئے بلکہ عجمی ممالک کے ان مراکز سے عربی کے وہ مایہ ناز ماہرین و موجدینِ علوم و فنون پیدا ہوئے جن کی نظیر کا دنیا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ انہی عجمی علماء کی بدولت عربی علوم میں صرف، نحو، معانی، بیان، بدیع، لغت، عربی رسم الخط، علم الاشتقاق، عروض و قافیہ اور شعر و ادب اور اسلامی علوم میں تفسیر و اصول تفسیر، حدیث و اصولِ حدیث، فقہ و اصولِ فقہ، عقائد و توحید و کلام، اور آلی علوم میں منطق، فلسفہ، ہیئت، ریاضی وغیرہ علوم کا سارا ذخیرہ عربی زبان میں ڈھل گیا اور نہ صرف یہ بلکہ عربی زبان کے حقائق فقہ اللغۃ کی باریکیاں اور حیرت انگیز لسانی خصوصیت عربی تلفظ کی صحت و سہولت کے قواعد و ضوابط اور لسانی حسن و جمال کی نیرنگیاں وغیرہ وہ علمی سرمائے ہیں کہ عربی کے علاوہ دنیا کی اور دوسری زبانوں میں ان کا پتہ تک نہیں ہے۔

الغرض دینی علوم ہوں یا اسلامی تاریخ، وحیِ الٰہی کا منبع ہو یا تعلیم و تربیتِ نبوی کا سرچشمہ، اتحادِ اسلامی کا عظیم مقصد ہو یا بین المملکتی سیاسی مفاد و مصالح، ہر لحاظ اور ہر حیثیت سے عربی زبان کی اہمیت سے انکار جنون کے مرادف ہے۔

عصرِ حاضر میں بھی صحرائے عرب میں۔ جزیرۃ العرب کے اندر اور جزیرۃ العرب کے باہر۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت سے جو "زرِ سیال۔ ہرڈل اور دوسرے معادن۔ کے ابلتے ہوئے چشمے نمودار ہو گئے ہیں انہوں نے ان بادیہ نشینوں اور خانہ بدوشوں۔ عرب اقوام۔ کو عزت و مجد اور عظمت و ثروت کے اس اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا ہے کہ آج روس و امریکہ، فرانس و برطانیہ جیسے اعداءِ اسلام

بھی اپنے اقتصادی وسیاسی مفاد ومصالح کی خاطر ان بدویوں کی خوشامد پر اور اس کے لئے عربی زبان سیکھنے اور بولنے پر مجبور ہو گئے ہیں اسی لئے تمام یوربین ممالک کے لئے عربی زبان وادب کی درسگاہیں کھولنا اور ان کو فروغ دینا ناگزیر ہو گیا ہے، کویت کا صحرا آج وہ دولت وثروت اگل رہا ہے، جس کی بدولت انگلستان کی باغ وبہار قائم ہے، اگر آج کویت کی دولت انگلستان کے بینکوں سے نکال لی جائے تو برطانیہ کا دیوالیہ نکل جائے گا۔

غرض جس طرح عہد ماضی میں روحانی ہدایت کے سرچشمے صحراء عرب سے پھوٹے آج بالکل اسی طرح مادی دولت وثروت کے سرچشمے بھی اسی سرزمین سے اُبل رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ دین ہو یا دنیا، روحانیت ہو یا مادیت ہر جہت اور ہر حیثیت سے عربی زبان دنیا کی تمام قوموں کے لئے اپنی غیر معمولی اہمیت کی بنا پر قابل توجہ بنی ہوئی ہے۔

آج ان ممالک کو عربی داں ٹیچروں کی ضرورت ہے، جدید علوم وفنون کے عربی داں ماہرین کی احتیاج ہے، عربی داں ڈاکٹروں طبیبوں، انجینئروں اور مہندسوں کی ضرورت ہے، اقتصادیات وتجارت کے ماہرین کی حاجت ہے، زراعت وصنعت میں رہنمائی کی ضرورت ہے۔

اگر ہماری عظیم ترین اسلامی مملکت پاکستان اس حقیقت اور صورتحال پر ذرا بھی غور کرتی اور ان بین الملکتی مصالح کے پیش نظر عربی زبان کی اس غیر معمولی اہمیت کو محسوس کرتی اور نہ صرف اپنے تعلیمی اداروں، یونیورسٹیوں، کالجوں اور سکولوں میں عربی زبان وادب کو فروغ دیتی اور ابتدا سے لے کر انتہا تک عربی زبان وادب کو بحیثیت زبان کے لازمی مضمون قرار دیتی بلکہ ہر طبقہ اور شعبہ کے ماہرین کے لئے مستقل عربی زبان وادب کی تعلیم کے مراکز کھول دیتی تو آج صورتِ حال بالکل بدلی ہوئی ہوتی اور تمام ممالکِ اسلامیہ عربیہ کی تعلیمی اقتصادی، تجارتی، صنعتی اور زراعتی ضرورتیں پاکستان پوری کرتا اور اس وسیلہ سے ان ممالک کی قیادت بھی پاکستان ہی کے ہاتھ میں ہوتی۔

صرف سعودی مملکت کے ہسپتالوں میں اس وقت ۵۰ فیصد ڈاکٹر پاکستانی ہیں، طائف جیسی چھوٹی سی جگہ میں پندرہ پاکستانی ڈاکٹر کام کر رہے ہیں، اگر آج ہمارے گریجویٹ عربی زبان وادب کے ماہر نہ بھی صرف واقف ہی ہوتے تو ان ممالک میں سو فیصد ڈاکٹر، انجینئر، ٹیچر اور ماہرینِ علوم وفنون پاکستانی ہی ہوتے اس لئے کہ مملکتِ سعودیہ عربیہ کے ہمسایہ ممالک شام ولبنان واردن میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ

سعودی مملکت کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں، جمہوریہ عربیہ متحدہ مصر سے ان کے تعلقات شگفتہ نہیں ہیں اس لئے بمجبوری اور بادل ناخواستہ یورپ وامریکہ جیسے ازلی دشمنِ اسلام ممالک سے یہ ضرورتیں پوری کی جا رہی ہیں، اس کے عواقب ونتائج کیا ہوں گے؟ یہ بالکل ظاہر ہے، عرب ممالک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے اور مختلف بلاکوں میں تقسیم کر دینے کے سلسلہ میں ان کی ریشہ دوانیاں بے نقاب ہو چکی ہیں، یہ معلوم کرکے انتہائی صدمہ ہوا کہ حکومتِ سعودیہ عربیہ نے ایک سو ماہرینِ تعلیم امریکہ سے بلائے ہیں اور یہ بھی سنا ہے کہ ان ماہرینِ تعلیم نے آتے ہی عربی ادب اور قرآنِ کریم کو مملکتِ سعودیہ عربیہ کے نصابِ تعلیم سے نکال دیا ہے اگر یہ صحیح ہے تو:-

ع چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما؟

کاش پاکستان کے اربابِ حل وعقد میں ذرا سی بھی اسلامی غیرت وحمیت موجود ہو اور وہ ان حقائق پر ذرا سا بھی غور وفکر کریں اور فی الفور عربی زبان وادب کی تعلیم اور ترویج وتوسیع کی کوشش شروع کر دیں اور عربی زبان جاننے والے جدید علوم وفنون کے ماہرین پیدا کرنے لگیں تو اس شرمناک اور غیرت سوز صورتِ حال کا تدارک بآسانی ہو سکتا ہے۔

جس طرح آج پاکستانی ڈاکٹر سرزمینِ مقدس حجاز میں پہنچے ہوئے ہیں اگر ہمارے تمام تعلیم یافتہ (گریجویٹ) نوجوان بھی عربی زبان وادب سے واقف ہوتے تو مملکتِ سعودیہ عربیہ کے تمام سرکاری محکمے اور تعلیمی ادارے بھی پاکستانی ماہرین سے معمور ہوتے اور اس تعلیمی اور تربیتی رشتہ اور رابطہ کے بعد دونوں اسلامی ملکوں کے تعلقات کی کیا نوعیت ہوتی؟ اس کا اندازہ آپ خود لگائیے، علاوہ ازیں ممالکِ عربیہ اسلامیہ کی یہ صحیح خدمت انجام دینے کے بعد اغیار کی خفیہ ریشہ دوانیوں سے بھی۔ جن کا راز اب طشت ازبام ہو چکا ہے۔ مملکتِ سعودیہ اور دوسرے عربی ممالک کو نجات مل جاتی، دین ودنیا دونوں کی وہ حیرت انگیز کامیابی نصیب ہوتی جس کا تصور کرنا بھی آج مشکل ہے۔

تعلیم جیسی بنیادی واساسی خدمت کی زمام ہاتھ میں آجانے کے بعد عرب ممالک کا نوجوان طبقہ جس کے ہاتھ میں کل حکومتوں کے کلیدی عہدے ہوں گے: یورپین ممالک کے بجائے پاکستان ہی کا رہینِ منت اور اسلامی تہذیب وتمدن سے متأثر ہوتا۔

افسوس کہ ہمارے حکمرانوں کو ملک و ملت کے ان اہم ترین مفادات کو سوچنے سمجھنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا، نہیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ حضرات اپنی اغراض[۲] و خواہشات کی بنا پر پاکستان میں عربی زبان و ادب اور دینی تعلیم کو کسی بھی قیمت پر برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں فیا غربۃ الاسلام۔

عربی زبان سیکھنے کے لئے۔ جہاں تک معمولی نوشت و خواند کا تعلق ہے۔ صرف تین چار ماہ کا عرصہ کافی ہے ہاں عربی زبان و ادب کی مہارت اور لسانی علوم و فنون: صرف و نحو، معانی و بیان و بدیع لغت و اشتقاق و محاضرات۔ قرآنی اعجاز[۱] کے حقائق تک پہنچنا، اس کے لئے تو بے شک عمریں درکار ہیں اور یہ مرحلہ اتنا مشکل ہے کہ امت محمدیہ کے مخصوص افراد کے حصہ میں بھی بمشکل ہی آتا ہے، مشہور ہے کہ قرآنی اعجاز کی نقاب کشائی امت میں صرف شیخ عبدالقاہر جرجانی اور علامہ زمخشری ہی کر سکے ہیں

چنانچہ مشہور مقولہ ہے کہ:۔

لم یدر اعجاز القرآن	قرآنی اعجاز کی دقیق معرفت تک دو ہی ہستیاں پہنچیں اور
إلا الأعرجان ۔	اتفاق دیکھئے کہ وہ دونوں اعرج (لنگڑے) تھے

ہمارے شیخ امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ قدس اللہ سرہ اس پر ذیل کا جملہ اضافہ فرماتے ہیں:۔

أحدهما من زمخشر والآخر من جرجان	ایک زمخشر کا رہنے والا ہے اور دوسرا جرجان کا۔

بہرحال اگر اب بھی حکومت کے تعلیمی ادارے اور محکمے بی۔اے یا ایم اے پاس طلبہ کو صرف عربی زبان سکھانے کے لئے ایک عربی زبان کی کلاس تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں میں کھول دیں اور اس کی تعلیم کے لئے

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے مقالہ عربی سے معری اسلامیات از ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب سربراہ شعبہ عربی کراچی یونیورسٹی ماہنامہ بینات بابت ماہ ذی الحجہ ۸۵ھ شمارہ ۶ ج ۱۔

[۲] بدقسمتی سے ملک کا ایک مخصوص طبقہ جو اسلام کی تعمیرِ نو کے نام سے "اسلام کا جدید ایڈیشن" تیار کرنے پر تلا ہوا ہے یا اس کام پر مامور ہے عربی زبان و ادب اور قرآنی اعجاز پر عمریں یا چند سال یا چند ماہ یا چند ہفتے صرف کرنے تو کجا عرب کی الف۔ ب (ابجد) سے بھی واقف نہیں ہے اور وہ قرآن کے منصوص احکام کی تہ میں چھپی ہوئی "علل و غایات" تراش کر قرآنی احکام میں قطع و برید کر رہا ہے ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ان متجددین "یا کیسے مجتہدین" کی پول کھولنے کی غرض سے مستشرقین کی ان کتابوں اور حوالوں کی نشاندہی کر دیں

جو ان کی "علمی تحقیق" کا مأخذ ہیں، وباللہ التوفیق۔

عرب ممالک شام و عراق و اردن و مصر وغیرہ کے ایسے اساتذہ بلائیں جو اردو انگریزی بالکل نہ جانتے ہوں تو ہمارا تجربہ ہے کہ طلبہ چند ہفتوں میں ہی عربی سمجھنے بولنے پر قادر ہو جاتے ہیں۔

اور فصیح عربی زبان کے مقابلہ پر عوامی بول چال کی عربی تو اور بھی آسان ہے اس میں صرف ونحو کے قواعد کی پابندی نہیں کرنی پڑتی۔ اگر عربی کو عربی میں پڑھایا جائے اور ذراسی لکھنے کی مشق کرائی جائے تو چند ہفتوں میں اچھی خاصی عربی بول چال اور نوشت وخواند کی مہارت پیدا ہو جاتی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی میں یہ صلاحیت واہلیت موجود ہے کہ وہ اپنے اہتمام وانتظام کے تحت ہر دو قسم کی عربی تعلیم کی خدمت انجام دے سکے اور عربی کو عربی میں پڑھانے والے عرب اساتذہ بھی میسر ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ اگر دین کی ضرورت پیش نظر ہو تب بھی عربی علوم سے استغنا ممکن نہیں اور اگر دنیا کے مصالح۔ خصوصاً اقتصادی وسیاسی مفادات۔ پیش نظر ہوں تب بھی عربی زبان وادب سے استغنا صحیح اور معقول نہیں۔

عصری تعلیم کا منتہائے نظر پیٹ کی پرورش ہے اور گرانقدر تنخواہیں اور عہدے جدید تعلیم یافتہ حضرات کا معراج کمال ہیں، اس سلسلہ میں بھی آج کل ممالکِ عربیہ اسلامیہ میں ہر قسم کے تعلیمی وتربیتی عہدے اور منصب بآسانی مل سکتے ہیں اور ان ممالک میں تنخواہوں کا معیار بھی کثرتِ زر کی بنا پر پاکستان سے کہیں اونچا ہے صرف عربی زبان سے واقفیت کی کسر ہے۔ أليس منكم رجل رشيد، (کیا ہے کوئی ہوشمند درست کار مرد)۔

محرم ۱۳۸۶ھ

عربی زبان اور اس کی اہمیت

عربی زبان کی دینی اہمیت تو ظاہر ہے کہ اسلام کا بنیادی پیغام "قرآنِ حکیم" تمام عالم کے لئے حق تعالیٰ کا آخری پیغام ہے وہ عربی زبان میں ہے۔ دینِ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں توحید و نبوت کے بعد نماز "جو عمادِ دین ہے اس کے تمام ارکان قرأتِ قرآن اذکار و ادعیہ یعنی پوری نماز اول سے آخر تک عربی میں ہے۔ عیدین و جمعہ کے خطبے عربی زبان میں ہیں، حضرت رسالت پناہ فداہ ابی و امی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیمات و ارشادات کا عظیم الشان ذخیرہ یعنی احادیث عربی میں ہے، حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی نسبتاً عربی قریشی ہاشمی ہے، بعض روایات میں عربی زبان سے محبت کرنے کے لئے یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ "میں بھی عربی اللسان ہوں قرآن بھی عربی میں ہے اور اہل جنت کی زبان بھی عربی ہے"۔ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو جو افکار اور دعائیں تلقین فرمائی ہیں جو بجائے خود عجیب و غریب دعائیں ہیں جن میں دین و دنیا کی کوئی ضرورت ایسی نہیں ہے جس کے متعلق دعا ارشاد نہ فرمائی گئی ہو بلکہ دعاؤں کی جامعیت دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے، کوئی بڑے سے بڑا عاقل انسان بھی اس جامعیت کا تصور تک نہیں کر سکتا جس سے ان کا الہامی ہونا ظاہر ہے اور نبوت کے اعجاز کی مستقل دلیل ہے یہ سب کچھ عربی زبان میں ہے، بزرگانِ دین صحابہ کرام و تابعینِ عظام سے لے کر جنید و شبلی تک پھر شیخ عبدالقادر جیلانی اور صاحبِ حزب البحر و صاحبِ دلائل الخیرات وغیرہ بقیہ بزرگانِ دین کی دعائیں اذکار اور درود شریف سب عربی زبان ہی میں ہیں اللہ تعالیٰ کے پیارے ننانوے مبارک نام بھی عربی میں ہیں، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک نام بھی عربی میں ہیں، غرض کیا کیا چیزیں گنوائی جائیں، خلاصہ یہ کہ پورا دین اور دین کے ہر ایک جز کا عربی زبان سے تعلق ہے اس لحاظ سے ایک مسلمان کا بحیثیتِ دین جتنا تعلق بھی عربی زبان سے ہو بجا ہے۔ دنیاوی اور سیاسی حیثیت سے بھی اس کی اہمیت بالکل واضح ہے تمام عرب ممالک حجازِ مقدس، مکہ، مدینہ لبنان، شام، مصر، طرابلس، الجزائر، تیونس، مراکش، بحرین، کویت وغیرہ وغیرہ چھوٹی بڑی بیسیوں ریاستیں عربی قوموں کی ہیں، عربی ممالک ہیں ان سے تعلقات قائم رکھنے کے لئے اور ان میں اسلامی نفوذ پیدا کرنے کے لئے عربی زبان کی کتنی شدید ضرورت ہے، ان ممالک میں جو

عربی لٹریچر دینی اور سیاسی کتابیں ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو رہی ہیں رسائل و اخبارات کا تو ٹھکانہ ہی نہیں، ان ممالک کو معلموں کی ضرورت ہے انجینئروں کی حاجت ہے، ڈاکٹروں کی ضرورت ہے، ان ممالک میں تجارت کے ذرائع پیدا کرنا کارخانے قائم کرنا ان ممالک میں عربی زبان میں اپنے سیاسی مقاصد و مفادات کی اشاعت کرنا انتہائی اہم وقتی تقاضے ہیں، ان سب کے لئے عربی زبان کی کتنی شدید ضرورت ہے، علاوہ ازیں ان ممالکِ عربیہ میں دنیا کی ثروت و دولت کا جو سیلاب آیا ہے اس سے بقیہ غیر عربی ممالکِ اسلامیہ کو مستفید ہونے کے لئے بھی عربی زبان کی کتنی اہمیت ہے مشرقی دنیا میں انڈونیشیا جو مسلمانوں کی بڑی حکومت ہے وہاں عربی کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے اسی لئے امام شافعی کے مذہب میں تو کچھ نہ کچھ عربی سیکھنا فرضِ عین کا درجہ رکھتا ہے، بقیہ اماموں مالک و ابوحنیفہ و احمد بن حنبل کی نزدیک بھی عربی سیکھنا فرضِ کفایہ ہے، ادبی حیثیت سے بھی عربی کی خصوصیات بے حد لطیف مگر تفصیل طلب ہیں، کاش ہمارے ملک میں ہماری یونیورسٹیوں، کالجوں اسکولوں اور ان کے اربابِ اقتدار کہ اس طرف توجہ ہو جائے اور اس کی اہمیت محسوس کرنے لگیں۔

ہمارے اسلافِ کرام کے علمی و فنی ذخائر علوم و معارف کی حیرت انگیز ذخیرے تمام کے تمام عربی زبان میں ہیں عالمِ اسلام اور عالمِ عرب کے اتحاد کے لئے عربی زبان ایک قوی رابطہ ثابت ہو سکتی ہے ہمارے حکمران دین کے لئے نہیں اپنی سیاسی و دنیوی اغراض کے لئے ہی عربی زبان پر توجہ دیتے تو آج پاکستان اور عالمِ اسلام کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ عربی زبان کی عظمت و اہمیت دینی سیاسی ادبی ہر جہت سے مسلم ہے، ہم سے تقاضا ہو رہا ہے کہ مدرسہ عربیہ اسلامیہ کی طرف سے کوئی عربی پرچہ بھی جاری کیا جائے، بہت کچھ سوچا لیکن ہماری دینی درسگاہوں کی کم ذوقی و غفلت، ہمارے طلبہ و علماء کی بے حسی اور عربی زبان سے بے رغبتی یا عدمِ مہارت اس کی اجازت نہیں دیتی تاہم فی الوقت یہ ارادہ کر لیا ہے کہ "بینات" میں چار پانچ صفحے عربی مضامین کے لئے مخصوص کئے جائیں لیکن ساتھ ساتھ اس کا اردو ترجمہ بھی ہو تاکہ عربی اور ادبی ذوق کے مالک حضرات عربی سے لطف اندوز ہوں اور عام قارئین کرام اس کے ترجمہ سے محظوظ ہوں، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ

علماء کی صحبت کے بغیر علم آزمائش و ابتلاء ہے

دنیا میں ہر کمال کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ صاحبِ کمال کی خدمت میں رہ کر وہ کمال حاصل کر لیا جائے، معمولی سے معمولی صنائع اور عام سے عام پیشوں کے لئے بھی کسی استاذ و رہنما کی ضرورت مسلم، بغیر استاد کے نری عقل و ذہانت اور طباعی سے کوئی کمال صحیح طور پر حاصل نہیں ہو سکتا، انجینیری ہو یا ڈاکٹری اور طبابت ہو، ہر صنعت و حرفت کے لئے ابتداءً عقل کی رہنمائی کے لئے کسی استاذ کی حاجت یقینی ہے، جب انسانی عقل کے پیدا کردہ فنون و علوم کے حاصل کرنے کے لئے ایک کامل کی صحبت ضروری ہے تو علومِ نبوت اور معارفِ انبیاء اور حقائقِ شریعت کے لئے استاذ و رہنما سے کیسے استغناء ہو سکتا ہے؟ کیونکہ یہ علوم و معارف تو عقل و ادراک کے دائرے سے بالاتر ہیں اور وحیِ ربانی کے ذریعہ سے امت کو پہنچے ہیں، آسمانی تربیت اور ربانی ہدایت و ارشاد کے ذریعہ سے اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے، پھر ان ربانی علوم میں الفاظ سے زیادہ مربی کی توجہات اور اس کی عملی صحبت کو دخل ہوتا ہے اور تعلیم سے زیادہ ذہنی و فکری اور عملی تربیت ضروری ہے، اس لئے جتنی طویل صحبت ہوگی زیادہ کمال نصیب ہوگا اور مربی و رہنما جتنا باکمال ہوگا اتنا زیادہ فائدہ اور کمال حاصل ہوگا، پھر ان علومِ نبوت کی غرض و غایت چونکہ ہدایت و ارشاد اور مخلوقِ خدا کی رہنمائی ہے اس لئے ان کے سمجھنے میں شیطانِ لعین کی عداوت و اضلال اور گمراہی کا شدید اندیشہ ہوتا ہے جو کمال کہ دنیوی مفاد کے لئے حاصل کرنا ہوتا ہے اس میں شیطان آرام سے بیٹھا رہتا، اس کو دخل کی حاجت ہی نہیں، نہ عداوت ظاہر کرنے کی ضرورت ہے، لیکن جہاں آخرت و عقبیٰ اور دین کی بات ہوتی ہے تو شیطان اپنی شرارت کے لئے بے تاب ہوتا ہے، مختلف وسائل سے اپنی پوری طاقت صرف کرتا ہے کہ کسی طرح سے یہ رشد و ہدایت ضلالت میں تبدیل ہو جائے اور چونکہ ابلیس لعین کا سب سے بڑا کارنامہ تلبیس ہے یعنی حق و باطل میں ایسا التباس ہو جائے کہ جو چیز ظاہری صورت کے لحاظ سے خیر ہے حقیقت کے اعتبار سے شر بن جائے پھر نفسِ انسانی کی کارستانیاں اس پر مستزاد ہیں، انسانی فطرت میں کبر و عجب ہے، ریاکاری و حُبِّ شہرت ہے، حُبِّ جاہ کا مرض ہے اور ایسے شدید و قوی امراض ہیں کہ مدتوں کی ریاضتوں اور مجاہدوں سے ان کا ازالہ نہیں ہوتا، اس لئے نفس و شیطان کے اثرات سے بچنے کے لئے مدتوں کسی کامل کی صحبت کی ضرورت ہوتی ہے اور جب فضلِ الٰہی شاملِ حال ہو تو اصلاح ہو جاتی ہے

ورنہ انسان یونہی علم وعقل کے صحراؤں میں بھٹکتا پھرتا ہے، دنیا کی علمی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جتنے فتنے پیدا ہوئے ہیں سب اذکیاء اور طبّاع حضرات کے ذریعہ سے وجود میں آئے اور علمی دور میں اکثر فتنے علم کے راستے سے آئے ہیں بلکہ علماءِ حق میں بھی بہت سے اذکیاءِ زمانہ اپنی شدتِ ذکاوت کی وجہ سے جمہورِ امت سے شذوذ اختیار کر کے غلط افکار ونظریات کا شکار ہو گئے اور وہاں زیادہ تر یہی حقیقت کارفرما رہی کہ اپنے تبحر وذکاوت پر اعتماد کر کے علمی کبر اور عجاب بالرائی کے مرض میں مبتلا ہوئے، زیادہ صحبت نہیں ملی اور کہاں سے کہاں نکل گئے، ہمارے اس دور میں بھی اس کے بہت سے نظائر موجود ہیں اور چونکہ علمی ذہانت تو ہوتی ہی ہے اور بسا اوقات بہت عمدہ بات بھی کہہ جاتے اور لکھ جاتے ہیں، اس لئے ان کی وہ عمدہ باتیں مزید فتنہ کا باعث بن جاتی ہیں اور جن حضرات کو زیادہ صحبت اور علمی گہرائیاں نصیب نہیں ہیں وہ بہت جلد ان کے معتقد ہو جاتے ہیں اور ان کے امت سے مختلف شواذ اور جدید افکار ونظریات کے بھی حامی ہو جاتے ہیں اور شیطان تو اپنے کام میں لگا ہوا ہے جو شخصیت امت کی ہدایت وارشاد کے کام آسکتی تھی وہ امت میں زیغ و ضلال کا ذریعہ بن جاتی ہے ہر دور میں اس کی مثالیں موجود ہیں، امام غزالیؒ نے "مقاصد الفلاسفہ" میں لکھا ہے کہ یونانیوں کے علوم حساب ہندسہ عنصریات وغیرہ صحیح علوم کو دیکھ کر لوگ ان کے تمام علوم کے معتقد ہو گئے، طبعیات والٰہیات میں ان کی تحقیقات کے قائل ہو کر گمراہ ہو گئے امام غزالیؒ کی یہ بات بہت عجیب ہے اور بالکل صحیح ہے شیطان کو اس قسم کے مواقع میں اضلال کا بہت اچھا موقع مل جاتا ہے، بہرحال جب انتہائی علمی قابلیت والے انتہائی ذکاوت والے فتنوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں تو ایسے حضرات کہ جن میں علمی قابلیت بہت کم، لیکن قلمی قابلیت بہت زیادہ ہو، صحبتِ اربابِ کمال سے یکسر محروم ہوں طبّاع وذہین ہوں وہ تو بہت جلد اعجاب بالرای کی خطرناک بلا میں مبتلا ہو کر تمام امت کی تحقیر اور تمام تحقیقاتِ امت کا استخفاف اور تمام سلفِ صالحین کے کارناموں کی تضحیک اور اوّل سے لے کر آخر تک تمام پر تنقید کر کے خطرناک گہرے گڑھے میں گر کر تمام نسل کے لئے گمراہی کا باعث بن جاتے ہیں، اس قسم کے لوگوں میں سے آج کل کی ایک مشہور شخصیت جناب ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی ہے جو بچپن ہی سے طبّاع وذہین مگر معاشی پریشانی میں مبتلا تھے، ابتدا میں اخبارِ مدینہ بجنور میں ملازم ہوئے اور پھر دہلی میں جمعیت علماءِ ہند کے اخبار "مسلم" سے وابستہ رہے، پھر چند سالوں کے بعد اخبار

"الجمیعۃ" دہلی میں ملازم ہوئے جو جمیعت علماءِ ہند کا ترجمان تھا، دہلی سے نکلتا تھا غالباً سہ روزہ تھا، تاریخ کے جواہر پاروں کے عنوان سے ان کے مضامین بہت آب وتاب سے نکلتے تھے، اس طرح مودودی صاحب کی قلمی تربیت مولانا احمد سعید صاحب کے ذریعہ ہوتی گئی، والدِ مرحوم کی وفات کی وجہ سے اپنی تعلیم نہ صرف یہ کہ مکمل نہ کر سکے بلکہ بالکل ابتدائی عربی تعلیم کی کتابوں میں رہ گئے، نہ جدید تعلیم سے بہرہ ور ہو سکے، پرائیویٹ انگریزی تعلیم حاصل کی اور انگریزی سے کچھ مناسبت ہوگئی، اس دور کے اچھے لکھنے والوں کی کتابوں اور تحریرات اور مجلات وجرائد سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا، اور قلمی قابلیت روز افزوں ہوتی گئی، بدقسمتی سے نہ کسی دینی درسگاہ سے فیض حاصل کر سکے، نہ جدید علوم کے گریجویٹ بن سکے، نہ کسی پختہ کار عالمِ دین کی صحبت نصیب ہو سکی اور ایک مضمون میں خود اس کا اعتراف کیا ہے جو عرصہ ہوا کہ ہندوستانِ متحدہ میں مولانا عبدالحق مدنی مرادآبادی کے جواب میں شائع ہوا تھا بلکہ بدنصیبی سے نیاز فتح پوری جیسے ملحد وزندیق کی صحبت نصیب ہوئی، ان سے دوستی رہی ان کی صحبت ورفاقت سے بہت کچھ غلط رجحانات ومیلانات پیدا ہوگئے، حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۳ء میں ماہنامہ "ترجمان القرآن" جاری کیا، آب وتاب سے مضامین لکھے بہتر سے بہتر پیرائے میں کچھ علمی وقلمی چیزیں ابھرنے لگیں، ان دنوں ملک کی سیاسی فضا مرتعش تھی، تحریک آزادئ ہند فیصلہ کن مراحل میں تھی، ہندوستان کے بہترین دماغ اسی کی طرف متوجہ تھے، مودودی صاحب نے سب سے ہٹ کر اقامتِ دین اور حکومتِ الٰہیہ کا نعرہ لگایا اور تحریکِ آزادی کی تمام قوتوں پر بھرپور تنقید کی، ان کے بھولے بھالے مداح یہ سمجھے کہ شاید دینِ قیم کا آخری سہارا بس مودودی صاحب کی ذات رہ گئی ہے چنانچہ بہت جلد مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور عبدالماجد دریابادی کے قلم سے خراجِ تحسین وصول ہونے لگا، ظاہر ہے کہ اس وقت مودودی صرف ایک شخص کا نام تھا نہ اس وقت اس کی دعوت تھی، نہ جماعت تھی نہ تحریک تھی، ان کی تحریرات اور زوردار بیانات سے بعض اہلِ حق کو ان سے توقعات وابستہ ہوئیں، ان کی آمادگی اور چوہدری محمد نیاز کی حوصلہ افزائی سے پٹھانکوٹ میں "دارالاسلام" کی بنیاد ڈالی گئی لیگ وکانگریس کی رسہ کشی شروع ہوگئی تھی، ان کے قلم سے ایسے مضامین نکلے اور سیاسی کشمکش کے نام سے ایسی کتاب وجود میں آگئی کہ ہم نوا حضرات سے اس کو خراجِ تحسین حاصل ہوا اور سیاسی مصالح نے اس کو پروان چڑھایا، لاہور میں اجتماع ہوا، اور باقاعدہ امارت کی بنیاد ڈالی گئی اور ان کی ایک لکھی تقریر پڑھی گئی جس میں بتایا گیا کہ امیرِ وقت کے لئے کیا کیا امور ضروری ہیں،

ارباب اجتماع میں مشہور شخصیتیں جناب مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا ابو الحسن علی ندوی، مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا مسعود عالم ندوی بھی تھے، بڑے امیر منتخب ہوگئے اور چار امراء یہ حضرات امیر ماتحت منتخب ہوگئے، جماعت اسلامی باقاعدہ وجود میں آگئی، اس کا دستور آیا، اس کا منشور آیا، لوگوں کی نگاہیں اٹھیں، ہر طرف سے امیدیں وابستہ ہوگئیں لیکن ۶ ماہ کا عرصہ نہیں گذرا ہوگا کہ مولانا نعمانی، مولانا علی میاں مستعفی ہو گئے اور ان کو ان کی علمی کمزوریاں اور اخلاص کا فقدان نظر آیا، ساتھ نہیں دے سکے لیکن ان حضرات نے پھر بھی پردہ پوشی کی اور امت کے سامنے صاف وصریح وجہ علیحدگی ظاہر نہیں فرمائی، میں اس وقت جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تدریسی خدمات انجام دیتا تھا، میں نے ان دو بزرگوں سے جدائی کے وجوہ دریافت کئے، بہت کچھ کہا لیکن کوئی صاف بات نہیں بتلائی لیکن میں سمجھ گیا، مولانا مسعود عالم مرحوم اور مولانا امین احسن اصلاحی کو بہت کچھ معتقدات وطریقہ کار میں موافقت تھی اور یہ دونوں بزرگ عرصہ تک مودودی صاحب کے دست وبازو بنے رہے مولانا مسعود عالم مرحوم نے عربی ادب کے ذریعہ خدمات انجام دیں اور مودودی صاحب کی تحریرات اور کتابوں کے آب وتاب سے عربی ترجمے کئے اور ادبی تربیت کرکے چند شاگردوں کو بھی تیار کردیا، مولانا اصلاحی نے اپنے خاص علمی ذوق وانداز سے مودودی صاحب کی تحریک کو پروان چڑھایا اچھے اچھے رفقاء کار، ارباب قلم اور ارباب فن شامل ہوگئے، کیمونزم کے خلاف اور بعض دینی مسائل پر عمدہ عمدہ کتابیں لکھی گئیں، سود خوری، شراب نوشی، پردہ وغیرہ پر اچھی کتابیں آ گئیں تفہیمات وتنقیحات میں بعض اچھے اچھے مضامین آئے جدید نسل کی اصلاح کے لئے کتابیں تالیف کی گئیں، عرب ممالک میں خصوصاً سعودی عرب کو متاثر کرنے کے لئے اور وہاں کے شیوخ کو ہم نوا بنانے کے لئے مختلف انداز سے کام کیا اور کامیاب تدبیریں اختیار کیں اور جو رفقاء کار کے قلم سے معرض اشاعت میں آیا اسے اس انداز سے پیش کیا جاتا رہا کہ یہ سب کچھ مودودی کی توجہات کا رہین منت ہیں، اس سے ان کی شخصیت بننی شروع ہوگئی اور تمام جماعت کے افراد کی تالیفات سے خود وجاہت کا فائدہ اٹھایا خود عربی لکھنے سے معذور، انگریزی لکھنے سے معذور ہے نہ عربی لکھ سکتا ہے نہ بول سکتا ہے یہی انگریزی کا حال بھی ہے لیکن جو کتابیں ترجمہ کی گئیں ان کے سرورق پر بھی لکھا گیا "تالیفات المودودی" کہیں یہ نہیں لکھا کہ یہ ترجمہ مسعود عالم کا ہے یا عاصم حداد کا ہے، لوگ یہ سمجھے کہ اردو کا یہ ادیب کیا ٹھکانا عربی ادب کا بھی امام ہے، لیکن چند دن گذرے تھے کہ مولانا گیلانی مرحوم اور حضرت سید سلیمان مرحوم متنبہ ہوگئے کہ یہ

تحریراتِ جدید فتنہ انگیزی کا سامان مہیا کر رہی ہیں، جو کچھ خطابات تھے اور متکلمِ اسلام وغیرہ القاب تھے، اس کو روک دیا اور مولانا گیلانی نے "صدقِ جدید" میں "خارجیتِ جدیدہ" کے عنوان سے تنقیدی مضمون لکھا، علمائے کرام کے زمرے میں شاید حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے اپنے مکاتیب میں اس فتنے کی نشاندہی فرمائی، رفتہ رفتہ علماءِ امت کچھ نہ کچھ لکھتے رہے، حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد زکریا صاحب نے اس وقت جو مطبوعہ ذخیرہ تھا سب کو مطالعہ فرما کر ایک مبسوط رسالہ مرتب فرمایا، لیکن افسوس کہ طبع نہ ہو سکا اور اس سلسلہ میں ایک مدرس مظاہر العلوم مولانا محمد زکریا قدوسی صاحب مودودی صاحب کی طرف مائل ہو گئے تھے، ان کی اصلاح کے پیشِ نظر ایک مکتوب لکھا جو "فتنۂ مودودیت" کے نام سے ایک رسالہ کی شکل میں شائع ہو گیا ہے۔

مودودی صاحب کی بہت سی چیزیں پسند بھی آئیں اور بہت سی ناپسند بھی، لیکن عرصہ دراز تک جی نہ چاہا کہ ان کو مجروح کیا جائے اور ان کے جدید اندازِ بیان سے جی چاہتا تھا کہ جدید نسل فائدہ اٹھائے، اگرچہ بعض اوقات ان کی تحریرات میں ناقابلِ برداشت باتیں بھی آئیں لیکن دینی مصلحت کے پیشِ نظر برداشت کرتا رہا اور خاموش رہا لیکن اتنا اندازہ نہ تھا کہ یہ فتنہ عالم گیر صورت اختیار کرے گا اور اکثر عرب ممالک میں یہ فتنہ بُری صورت اختیار کرے گا اور دن بدن ان کے شاہکار قلم سے نئے نئے شگوفے پھوٹتے رہیں گے، صحابہ کرامؓ اور انبیاءِ کرام علیہم السلام کے حق میں ناشائستہ الفاظ استعمال ہوں گے، آخر "تفہیم القرآن" اور "خلافت و ملوکیت" اور "ترجمان القرآن" میں روز بروز ایسی چیزیں نظر آئیں کہ اب معلوم ہوا کہ بلاشبہ ان کی تحریرات و تالیفات عہدِ حاضر کا سب سے بڑا فتنہ ہے اگرچہ چند مفید ابحاث بھی آگئیں ہیں ((وإثمهما أكبر من نفعهما)) والی بات ہے اب حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ سکوت جرمِ عظیم معلوم ہوتا ہے اور چالیس سال جو مجرمانہ سکوت کیا اس پر بھی افسوس ہوا اور اب وقت آگیا ہے کہ بلاخوف لومۃ لائم الف سے یاء تک ان کی تالیفات و تحریرات کو مطالعہ کر کے جو حق و انصاف و دین کی حفاظت کا تقاضا ہو وہ پورا کیا جائے۔ واللہ سبحانہ ولی التوفیق

رجب المرجب ۱۳۹۶ھ، اگست ۱۹۷۶ء

منصبِ افتاء اور اس کا تقاضہ

افتاء کا منصب بہت رفیع ہے اور جتنا رفیع ہے اتنا ہی دقیق و مشکل بھی ہے اس دقیق و رفیع منصب کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ مفتی جو کچھ لکھے آخرت کی مسئولیت کے پیش نظر لکھے، خارجی تأثرات، ماحول کے محرکات یا ذاتی رجحانات و میلانات سے پاک وصاف ہو کر لکھے، صرف حق تعالیٰ کی مرضی مطلوب ہو اور ہر تحریر میں رضاءِ الٰہی پیشِ نظر ہو اس کے بعد تلاشِ حق کی سعی و کوشش کرے اور وصول الی الحق میں مطلق تقصیر نہ کرے، عباراتِ فقہاء اور ائمہ کے اقوال میں انتہائی غور و خوض کے بعد اس عزم و ارادہ کے ساتھ لکھے کہ اگر غلطی یا خطا ہو گئی تو فوراً رجوع الی الصواب کر کے حق گوئی کا فرض ادا کرے گا اپنی بات کی پچ اور اپنی غلطی پر اصرار نہ کرے گا، الغرض انتہائی بے نفسی، اخلاص اور للہیت کے ساتھ قلم اٹھائے، نہ اپنی رائے پر اصرار کرے اور نہ اس کو قولِ فیصل سمجھے، خصوصاً ان حوادث و مسائل میں جو عہدِ ائمہ میں پیش نہیں آئے یا ائمہ کرام کے صریح اقوال موجود نہ ہوں ان میں تو انتہائی کوشش ہونی چاہیئے کہ فتویٰ اصولِ دین اور نصوصِ شرعیہ سے متصادم نہ ہو، اسی طرح غیظ و غضب کی یا کسی خاص تأثر کی حالت میں فتویٰ ہرگز نہ لکھے خصوصاً جس صورت میں اختلافِ آراء و افکار موجود ہو اور مسئلہ زیرِ بحث میں تجاذبِ جہات یا تعارضِ ادلہ کارفرما ہو تو انتہائی احتیاط اور غور و فکر کی ضرورت ہوگی۔

منصبِ افتاء کا اساسی اصول

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی حدیث جو بخاری اور مسلم کی متفق علیہ حدیث ہے اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسائلِ غیرِ منصوصہ کے بارے میں مذکورہ بالا امور کی طرف کافی اشارات موجود ہیں اور آخر میں ((ألا إن فی الجسد مُضغَةً إذا اصلحت صلح الجسد کلہ وإذا افسدت فسد الجسد کلہ ألا وھی القلب)) نے تو اس حقیقت کو بالکل ہی واضح کر دیا ہے کہ اس احتیاط و تورع کا مدار اصلاحِ قلب پر ہے جب تک قلب کی اصلاح نہ ہو ورع و تقویٰ اور اجتناب عن الشبہات کا امکان نہیں اور درحقیقت منصبِ افتاء کا اساسی اصول یہی ہے کہ قلب تقی و نقی ہو اور علم کامل اور صحیح ہو تو ان دونوں شرطوں کے متحقق ہونے کی صورت میں غلطی

بھی معاف ہے اور اجر کی امید بھی ہو سکتی ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ کی غیر شرعی تدفین

آج کل حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائپوری قدس سرہ کی تدفین کا مسئلہ حضرات مفتیین کے زیر بحث ہے کہ یہ تدفین شرعی ہوئی یا نہیں ہوئی؟ اور اگر نہیں ہوئی تو اس کا تدارک کیا جائے یا نہیں؟ اکثر فتاویٰ اور کیفیتِ تدفین و حقیقتِ قبر پر غور کرنے کے بعد یہی واضح ہوتا ہے کہ غیر شرعی تدفین کو شرعی تدفین اور مواراۃ اور صورتِ قبر بنا کر اس کو شرعی قبر ثابت کرنے کے لئے تمام کوششیں ہو رہی ہیں اور کتبِ فقہ کی ان عبارتوں سے استدلال کیا جا رہا ہے جن سے فتویٰ دینے والوں کے علی الرغم نقیضِ دعویٰ کا ثبوت ہو رہا ہے۔

ابتداء میں ہم نے بھی صورتِ مسئولہ کا جو صاف اور سادہ تھی جواب دے دیا اصلی صورتحال پر کچھ زیادہ غور نہیں کیا نہ ہی حقیقتِ حال معلوم کرنے کے وسائل میسر تھے اور استفتاء کے ضمن میں جو روح کار فرما ہے حضرات مفتیین کی عظمت کی بنا پر اس کی طرف خیال بھی نہیں گیا اور دوسرے استفتاء پر بھی حضرات مفتیین کی شخصیتوں کو دیکھ کر تصدیق کر دی لیکن مقتدر علماء کی مطبوعہ تحریروں سے صورتِ حال معلوم ہونے کے بعد ہمیں غلطی کا احساس ہوا اس لئے بلا تامل رجوع کر لیا گیا لیکن یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ کراچی، لاہور، ڈھڈیاں، لائل پور سے لے کر سہارن پور، لکھنؤ، بجنور مئو، شاہجہانپور تک جو فتاویٰ کا اور فتویٰ نویسی بلکہ فتویٰ سازی کا جو جال بچھایا گیا سب کو غور سے دیکھا، اقلام سے قلوب تک اور افکار سے اغراض تک جو حقائق ہیں وہ سامنے آئے، بجز حیرت و افسوس کیا کیا جا سکتا ہے ؎

"بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است"

جی نہیں چاہتا تھا کہ "بینات" کے صفحات پر یہ دل خراش موضوع زیر بحث آئے، خصوصاً "بصائر و عبر" کی سرزمین میں اس کی تخم ریزی ہو لیکن صورتِ حال نے مجبور کیا کہ اس فتویٰ نویسی کی وجہ سے جو فضا پیدا ہو گئی ہے اس کا کچھ تدارک کیا جائے اور حضراتِ مفتیین کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلایا جائے، کون نہیں جانتا کہ "قبر" کے معنی یہی ہیں کہ زمین کھود کر اس میں لحد یا شق بنائی جائے، کون نہیں جانتا کہ جہاں تک دفن شرعی اور مسنون طریقے سے ممکن ہو اس کو اختیار کیا جائے

جو روزمرہ امتِ محمدیہ کا تعامل ہے کہ قبر کھود کر مٹی نکالی جاتی ہے اور میت کو دفنانے کے بعد وہی مٹی اوپر ڈالی جاتی ہے کون نہیں جانتا کہ زمین کھود کر دفن کرنا فرض ہے بقیہ تفصیلات و کیفیات کچھ واجب کچھ سنّت کچھ مستحب ہیں، امتِ اسلامیہ کے علماء نہیں جاہلوں کو بھی یہ علم حاصل ہے اور تمام امت کا اس پر عمل ہے ان حقائق کے لئے کسی فقیہِ امت کی ضرورت نہیں بلکہ تمام صالحینِ امّت اور عوام امتِ اسلامیہ کا روزمرہ کا یہ معمول ہے، کون نہیں جانتا کہ بلا شدید ضرورت اور مخصوص حالات کے تابوت میں میت کو رکھ کر دفنانا خلافِ سنت ہے، سطح زمین پختہ یا خام پر میت کے تابوت کو رکھ کر اور چار دیواری بنا کر باہر سے مٹی لا کر بھرائی کے بعد قبر کی صورت بنا کر کوئی بھی اس کو شرعی تدفین نہیں کہتا، حضرت قطب الارشاد عارف باللہ مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری کی تدفین کی جو صورت اختیار کی گئی ہے کچھ اسی طرح کی ہے، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہٗ فرماتے ہیں:۔

جہاں تک معلوم ہوا زمین کے اوپر اینٹوں کا فرش کر کے اس پر تابوت رکھ کر چاروں طرف دیوار بنا کر اس پر ڈاٹ لگادی گئی اس کے بعد چاروں طرف دور تک مٹی ڈال کر اور اس سطح کو مسجد کے برابر جو بہت اونچی ہے کر دیا گیا اور اس پر کچی قبر کا نشان بنا دیا الخ جنابِ محترم حضرت مولانا منظور احمد صاحب نعمانی مدیر الفرقان رقمطراز ہیں:۔

تابوت لحد یا شق کی شکل میں زیرِ زمین دفن نہیں کیا گیا بلکہ زمین کے اوپر کے حصہ میں اینٹوں کے فرش پر دیواروں کے درمیان رکھا گیا اور دیواروں کے اوپر اینٹوں ہی کی ڈاٹ لگادی گئی اور پھر ہر طرف سے مٹی ڈال دی گئی الخ پھر تحریر فرماتے ہیں "کہ حضرتِ اقدس کی تدفین جس طرح ہوئی کاش اس طرح نہ ہوتی اور زیرِ زمین ہی شق کی شکل بنا کر دفن کیا جاتا، ظاہر ہے کہ غلطی نادانستہ ہی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی غلطیاں اور کوتاہی معاف فرمائیں اور اتباعِ سنت و شریعت کی توفیق دے ان دو مستند تحریروں کا مدار بھی جناب مولانا عبدالجلیل صاحب کی تحریر ہی پر ہے اس سے بڑھ کر صورتِ حال کی وضاحت کیا ہو سکتی، فقہاءِ امت اور مذاہبِ اربعہ کی معتمد علیہ کتب کا جو حاصل ہے وہ یہی ہے:۔

(الف) زمین کھود کر قبر بنانا فرض ہے اور قبور کی یہی سنتِ متوارثہ ہے۔

(ب) کھودنے کے بعد لحد یا شق کی صورت ہونا چاہیئے۔

(ج) وضع علی الارض زمین پر رکھ کر قبر کی تعمیری صورت شرعاً امر منکر اور بدعت ہے۔

(د) زمین کھودنے سے جو مٹی نکالی گئی وہی ڈالی جائے اور اس میں باہر کی مٹی ملا لینا بھی خلافِ سنّت ہے لیکن یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ بعض حضرات نے موجودہ صورت کو شرعی ثابت کرنے کے لئے جو کچھ تحریر فرمایا ہے ان کی شان، ان کے علم، ان کے فہم سے بہت بعید ہے۔ فقہاء کی تعبیر سنۃ الحفر سے حفر کا مسنون ہونا ہونا مراد لینا اور "القبر مقر المیت" سے جہاں میت رکھ دی جائے وہ قبر ہے مراد لینا اسی طرح یہ دعویٰ کرنا کہ مقصود سترِ میت ہے جس طرح حاصل ہو جائے اور کیف یواری سوءۃ أخیہ سے استدلال کرنا اور نص یبحث فی الارض سے اعراض یا اغماض کرنا یوں کہیئے کہ حکمت کو مدارِ حکم بنانا اور علت سے تغافل کرنا یا حکمت و علت میں تمیز نہ کر سکنا یا نہ کرنا یا صریح نصوصِ فقہا کو نظر انداز کرنا اور کسی مفتی کے قول کو بلا سند پیش کرنا یہ کہاں کا انصاف ہے؟ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حق تعالیٰ سب کو صحیح فہم اور صحیح علم اور بے لوث حق گوئی کی توفیق عطا فرمائے، چونکہ اس وقت تک ایک طرف کے فتاویٰ سے تصویر کا ایک ہی رُخ سامنے آیا ہے اور عوام کے دلوں میں مختلف شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی امت کے سامنے آئے لہٰذا جو فتاویٰ مدرسہ عربیہ اسلامیہ سے اس سلسلہ میں لکھے گئے ہیں اس کا شائع کرنا بھی ضروری ہوا اسی شمارے کے ضمیمہ میں ملاحظہ فرمائے جائیں۔

جدید فقہی مسائل اور چند رہنما اصول

"بینات" کے گذشتہ شمارے میں حضرات علماء کرام کی خدمت میں جو گذارش کی گئی تھی، اس کے پیش نظر بطور رہنما اصول کے مزید گذارش یہ ہے کہ:

۱۔ یہ تو ظاہر ہے کہ "اسلام" وہ آخری پیغامِ حیات و پیغامِ نجات ہے جو قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے قانونِ ہدایت ہے اور ہر دور، ہر ملک، ہر قوم کے لئے اس میں ہدایت کے سرچشمے موجود ہیں۔ مادی و روحانی، شخصی و اجتماعی، اقتصادی و معاشی، ملکی و سیاسی، غرض ہر ضرورت کی حاجت روائی کا سامان اس میں موجود ہے اور اس کا دامن ایسے بیش قیمت جواہرات سے پُر ہے کہ سارے عالم کے افلاس کا علاج اس کے خزانۂ عامرہ سے ہو سکتا ہے۔ یہی ایک ایسا صالح ترین و اعلیٰ ترین نظام ہے جو نسلِ آدم میں عدل و انصاف ہر مشکل کو آسان کر سکتا ہے۔

۲۔ "قرآن و حدیث" یا "کتاب و سنت" اس کا بنیادی سرمایہ ہیں۔ خلافتِ راشدہ بالخصوص عہد صدیقی و عہد فاروقی اور اس کے بعد عہد اموی اور عہد عباسی میں صحابہ و تابعین اور پھر ائمہ اجتہاد ائمہ اربعہ ابو حنیفہ، مالک، شافعی، احمد رضی اللہ عنہم اور ان کے اقران میں سفیان ثوری، اوزاعی وغیرہ مجتہدین امت و فقہاء اسلام کی مساعی جمیلہ و مبارکہ سے دین اسلام کی تعمیر و تعبیر کا عجیب و غریب نقشہ کامل ترین خوشنما صورت میں محفوظ ہو گیا۔ ان اکابرِ امت اور فقہاء ملت میں اللہ تعالیٰ نے عظیم ترین اخلاص، اعلیٰ درجہ کا تقویٰ و خشیتِ الٰہی، علوم دینیہ میں تبحر، دقتِ نظر، توقد و ذکاء کے جو کمالات جمع کئے تھے اس وقت کی نسل اس کا ادراک بھی نہیں کر سکتی، قرآن و حدیث کا علم صحیح اور دین اسلام کی مزاج شناسی کا ذوق جو ان کو نصیب تھا آج اس کا احساس بھی مشکل ہے اور انہی کمالات کا نتیجہ ہے کہ ایک ہزار برس سے زیادہ عرصہ گذرا لیکن ان کا فیض برابر جاری ہے۔ اور قلوب میں ان کی عظمت اور قدر و قیمت ہنوز موجود ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ قیامت تک آنے والے ان کی منت پذیری سے بے نیاز نہیں ہو سکتے اور نہ اس عظیم سرمایہ سے امت کسی وقت مستغنی ہو سکتی ہے۔

۳۔ فقہ اسلامی کا یہ ذخیرہ ہمارا بڑا قیمتی سرمایہ ہے اور جہاں اس کی حفاظت کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس پر عمل کرنا اور اس سے منتفع ہونا بھی ہمارا فرض ہے۔ منتفع ہونے سے میرا مقصد

یہ ہے کہ جدید تمدن نے جو بہت سے جدید مسائل پیدا کر دیئے ہیں اب اسی فقہ اسلامی کی روشنی میں اس کا حل تلاش کرنا چاہیئے۔ اس سرمایہ کے ہوتے امت کو نہ جدید مستقل اجتہاد کی ضرورت ہے اور نہ اس کا امکان۔ اس عظیم الشان ذخیرہ میں بحث و تلاش اور غور و خوض کے بعد جدید مسائل کے حل کرنے کا بہت سامان مل جائے گا۔ ورنہ زیادہ سے زیادہ بعض جزوی مسائل میں علماء امت کو ان ہی کے بتلائے ہوئے اصولوں پر جدید اجتہاد کی ضرورت ہوگی۔

۴۔ گذشتہ شمارے میں جو معجم طبرانی کی حدیث پیش کی تھی اس سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

الف۔ جدید مسائل ایسے ضرور پیدا ہوں گے جن میں قرآن و حدیث کا صاف و صریح فیصلہ نہ ہوگا۔

ب۔ علماء امت کے ذمہ یہ فرض عائد ہے کہ اس کا حل پیش کریں۔

ج۔ علماء انفرادی رائے اور شخصی رائے سے اجتناب کریں اور باہمی مشورہ سے اس کا فیصلہ کریں۔

د۔ ان علماء میں دو شرطیں ضروری ہیں۔ ان کے دلوں میں خوف خدا ہو۔ اور تفقہ فی الدین ان کو حاصل ہو۔ اس حدیث نبوی نے ان علماء امت کو جدید مسائل کے فیصلہ کرنے کا مکلف بنایا ہے جن میں اخلاص و تقویٰ اور عبادت گذاری کی روح موجود ہو اور غور و خوض و باہمی مشورہ کرنے کی اہلیت ہو۔

۵۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ جو بقول امام شمس الدین ذہبی "فقیہ ملت" ہیں اور بقول صفی الدین خزرجی "فقیہ امت" ہیں[1]۔ ان کی فقہ جامع ترین فقہ بلکہ فقہ اسلامی کی روح ہے کہ جس کی روشنی میں بقیہ ائمہ نے اپنی اپنی فقہ کی ترتیب و تدوین کی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے جو مسائل اپنے اصحاب و تلامذہ کو املا کروائے ہیں ان کی تعداد صاحب عنایہ شارح ہدایہ نے چوتھی صدی کے ایک محقق کے قول کے مطابق بارہ لاکھ ستر ہزار سے زائد بتلائی ہے۔ اگر امت کو یہ سارے مسائل پہنچ جاتے تو شاید بہت سے جدید مسائل حل ہو جاتے۔ فقہ حنفی کی اسی ہمہ گیری کو دیکھ کر مشہور محقق مؤرخ ابن خلدون باوجود مالکی المذہب ہونے کے اس کا اعتراف کرتا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی فقہ کی سرزمین اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھی، اس لئے جو پختگی حنفی فقہ کو نصیب ہوئی وہ فقہ مالکی کو

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب العبر للذہبی والخلاصۃ للخزرجی

نصیب نہ ہو سکی اور شاید یہی وجہ ہے کہ امام شعرانی شافعی اپنی کتاب "المیزان" میں اپنے اس کشف کا ذکر کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کا مذہب سب مذاہب سے آخر تک رہے گا جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس مذہب میں اس کی زیادہ اہلیت ہے کہ جدید نظام کے مسائل پوری طرح حل کر سکے۔ تاہم بہت سے مسائل ایسے ملیں گے اور ہیں جن کا ذکر موجودہ فقہ حنفی کے اس عظیم الشان ذخیرہ میں نہیں ملتا اور فقہ شافعی اور فقہ حنبلی میں مل جاتا ہے اس لئے اس سلسلہ میں جو بات فکر ناقص میں آئی ہے وہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں اور علماء امت کی خدمت میں درخواست کروں گا کہ اگر وہ صحیح نہ ہو تو ضرور اپنی مخلصانہ تنقید سے سرفراز فرمائیں۔ وَاللّٰہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

۶۔ مبسوط، بدائع، قاضی خاں سے لے کر طحطاوی، ردالمحتار اور التحریر المختار تک کتب فقہ حنفی کی ورق گردانی کرنے کے بعد بھی اگر مسئلہ ہاتھ نہ آئے تو امہات کتب مذاہب ثلاثہ کی ورق گردانی کرنی ہوگی۔ فقہ مالکی میں مدونہ کبریٰ سے لے کر حطاب تک
اور فقہ شافعی میں کتاب الأم سے لے کر تحفۃ المحتاج تک کی مراجعت کرنی ہوگی۔ حکومت سعودی کی عنایت و توجہ سے فقہ حنبلی کا عظیم الشان ذخیرہ طبع ہو کر امت کے سامنے گیا ہے اس کے لئے مغنی ابن قدامہ، المحرر اور الانصاف کی ورق گردانی کافی ہوگی۔ الغرض اگر مسئولہ و مطلوبہ مسئلہ ان کتب میں مل جائے تو اس پر فتویٰ دے دیا جائے۔ جدید اجتہاد کی ہرگز ضرورت نہیں اور اگر مسئلہ صراحۃً نہ ملے تو ان مسائلِ مصرحہ پر قیاس کرتے ہیں مضائقہ نہ ہوگا۔ بشرطیکہ قیاس مع الفارق نہ ہو جس کا فیصلہ خود علماء کرام فرمالیں گے کہ یہ قیاس کس درجہ میں ہے۔

۷۔ اگر مسئلہ مطلوبہ سب فقہاء کے ہاں ملتا ہے لیکن حنفی مذہب میں دشواری ہے اور بقیہ مذاہب میں نسبتاً سہولت ہے اور عوام کا عام ابتلاء ہے تو اخلاص کے ساتھ جماعت اہل علم غور کرے اگر ان کو یقین ہو جائے کہ عموم بلوی کے پیش نظر عصرِ حاضر میں دینی تقاضا سہولت و آسانی کا مقتضی ہے تو پھر مذہب مالک مذہب شافعی، مذہب احمد بن حنبل کو علی الترتیب اختیار کر کے اور اس پر فتویٰ دے کر فیصلہ کیا جائے۔
ہمارے عصر حاضر کے اکابر نے فسخ نکاح کی مشکلات کو اسی طرح حل کیا ہے اور متاخرین حنفیہ نے مسئلہ مفقود الخبر میں بھی ایسا ہی کیا ہے البتہ تلفیق سے احتراز کرنا ضروری ہوگا اور تتبع رخص کو مقصد نہ

بنایا جائے گا. مثلاً مسائل معاملات میں بیع قبل القبض ہے کہ آج کل تمام تاجر طبقہ اس میں مبتلا ہے۔ اب اس کی صورت حال پر غور کر کے پوری طرح جائزہ لیا جائے کہ اگر یہ ابتلاء واقعی ہے اور موجودہ معاشرہ مضطر ہے اور بغیر اس کے چارہ کار نہیں تو مذہب مالکی پر فتویٰ دے دیا جائے کہ عدم جواز بیع قبل القبض مطعومات کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس مسئلہ میں مذہب حنبلی بھی مذہب مالکی جیسا ہے اور حدیث میں صراحۃً طعام ہی کا ذکر ہے. نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع الطعام قبل أن یستوفیہ (سنن) امام ابو حنیفہ و امام شافعیؒ نے طعام پر بقیہ چیزوں کو قیاس کر کے منع کر دیا ہے۔

۸۔ خلافیاتِ ائمہ میں اس پر غور کرنا ہو گا کہ اختلاف کا منشا نصوص کا تعارض ہے یا قواعد فقہیہ کا اختلاف یا یہ محض اجتہادی وجوہ کی وجہ سے ہے. اس سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ کی جو الہامی رائے فیوض الحرمین میں منقول ہے کہ ائمہ احناف کے اختلافات میں ترجیح کا معیار کیسے قائم کیا جائے. اس کو پیش نظر رکھنے سے موجودہ خلافیات میں رہنمائی مل سکے گی. نیز اختیاراتِ علماء کا سلسلہ جو مختلف ادوار میں جاری رہا اس کو نظیر بنایا جا سکے گا. عُرف و حالات کے اختلافات سے جو اثرات ہوں گے ان کو بھی ضرور پیش نظر رکھنا ہو گا. مثلاً تعلیم القرآن، پھر اذان و امامت، پھر تدریس حدیث و علوم دینیہ پر معاوضہ یا مشاہرہ لینے میں قدماء و متاخرین کے زمانوں کے اختلاف کی وجہ سے جو اختلاف رہا یہ سب باتیں پیش نظر رکھنی ہوں گی۔

۹۔ جن مطلوبہ احکام کا فیصلہ کرنا ہو گا ان میں طبقات و مراتب قائم کرنے ہوں گے اور یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ مسائل موجودہ معاشرے کے لئے کس درجہ میں مطلوب ہیں کیا ان کے بغیر نظام نہیں چل سکتا؟ یا چل تو سکتا ہے لیکن کسی قدر دقت پیدا ہو گی، پھر اس دقت پر غور کرنا ہو گا کہ وہ دقت کس درجہ کی ہے؟

۱۰۔ معاملات میں فیصلہ کرنے کے لئے سب سے پہلے موجودہ ملک کے بارے میں فیصلہ کرنا ہو گا کہ فقہی اصطلاح کے اعتبار سے یہ ملک دار الاسلام ہے یا دار الامان، یا دار الحرب ہے. دار الاسلام کا اصلی مدار "فصل خصومات" پر ہے کہ پورا قانونِ تعزیرات و حدود، محاکم شرعیہ عدلیہ قائم ہوں اور معاملات و عقوبات کا قانون مکمل اسلامی ہو، تعزیرات و حدود قانونِ اسلامی کے مطابق جاری

ہوں۔ اسی طرح موجودہ نظام حکومت کا جائزہ لینا اور اس پر غور کرنا ہوگا کہ یہ کس قسم کی حکومت ہے۔ اسلامی قانون کے نفاذ پر صرف قدرت ہی کافی ہے، یا عملی طور پر اس کی تنفیذ بھی ضروری ہے۔ عرصہ دراز تک باوجود قدرت قانونِ اسلام جاری نہیں کیا گیا تو اس کے عوامل و اسباب کیا ہیں؟ اور سابقہ دارالحرب یعنی عہد برطانوی کا دارالحرب تقسیم ہوکر دو حصے بنے۔ ایک حصہ یقیناً اب بھی دارالحرب ہے۔ دوسرا حصہ صرف حکمرانوں کی تبدیلی سے کیا دارالاسلام بن جائے گا۔ یعنی قانون تو نہیں بدلا مگر قانون کے چلانے والے بدل گئے تو کیا اس لئے حکم بدل جائے گا۔ پھر جبکہ عہد حاضر میں "عائلی قانون" کے نام سے صراحۃً کتاب وسنت کے خلاف قانون بنایا گیا تو کیا صریح خلاف قرآن قانون بننے کے بعد بھی فقہاء اسلام کے مسائل کے مطابق یہ دارالاسلام ہی رہے گا؟ الغرض اس امر کے فیصلہ کرنے کے بعد معاملات کا شرعی فیصلہ ممکن ہوسکے گا۔ عقود فاسدہ، ربا، بیمہ ان سب مسائل کے صحیح حل کرنے کے لئے اس ملک وحکومت کے متعلق شرعی وفقہی فیصلہ کرنا ہوگا اور یہ غور کرنا ہوگا کہ موجودہ حزب اقتدار آخر اسلامی قانون کے نافذ کرنے سے گریز کیوں کرتا ہے؟ کیا صرف اس لئے کہ ان کی نفسیاتی خواہشات کی تکمیل میں یہ قانون حائل ہے؟ یا وہ عقیدۃً اسلامی قانون کو موجودہ زمانے کے لئے غیر صالح اور ناکافی سمجھتا ہے۔ ان سب گوشوں پر غور کرنا اور ان سب حالات کا جائزہ لینا ہوگا جب جاکر صحیح فیصلہ ہوسکے گا اور جب اس حکومت یا اس ملک کی فقہی وشرعی حیثیت متعین ہو جائے گی تو پھر ان معاملات کے احکام کا صحیح فتویٰ دیا جاسکے گا جن کا حکم اختلافِ دار سے مختلف ہوسکتا ہے۔

یہ چند مختصر اشارے ہیں جن کی حیثیت ایک مختصر "متن" کی ہے اور اس کی تشریح ایک مفصل مضمون کی محتاج ہے لیکن چونکہ اصلی مخاطب علماء کرام ہیں ان کی خدمت میں یہ اشارات بھی کافی ہوں گے۔

میری خواہش ہے کہ علماء کی خدمت میں ان موضوعات کو بھی آئندہ پیش کیا جائے جن پر ان کو غور کرنا ہوگا اور جب تک اجتماعی فیصلہ کا موقع نہ آئے۔ اس سے پہلے انفرادی طور پر ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش انہی اصول کے پیش نظر کریں۔ مقصود تین باتیں ہیں:

الف۔ اللہ کا یہ دین کامل اور ہر معاشرے کے لئے صالح و موزوں ہے۔

ب۔ اسلام کو مشکل سمجھ کر اور ناممکن العمل خیال کر کے اسلام کو ختم کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

ج۔ جو فریضہ علماء امت کے ذمہ ایسے حالات میں عائد ہوتا ہے ان سے سبکدوش ہو جائیں نہ جدید اجتہاد کا دروازہ کھولنا ہے نہ تتبع رُخَص پر قوم کو آمادہ کرنا ہے نہ ترک تقلید کی بنیاد رکھنا ہے بلکہ یہ سمجھنا ہے کہ قرآن و سنت اور اس کے بعد فقہ اسلامی اور تفقہ فی الدین کے ذریعہ سارے مشکلات حل ہو سکتے ہیں اور فقہاء اسلام اور فقہ اسلامی سے بے نیاز ہو کر دین اسلام کی حفاظت کی تدبیر طفلانہ خیال ہے، فقہاء کرام نے دین کی بڑی خدمت کی ہے۔ ایک ہزار برس کے بعد بھی دنیا ان کی جلیل القدر حیرت انگیز خدمات سے مستغنی نہیں ہو سکتی بلکہ قیامت تک ان کی منت پذیر رہے گی۔ الدین النصیحۃ للہ و لکتابہ و لرسولہ و لائمۃ المسلمین و عامتھم (مسلم عن تمیم الداری)

ربیع الثانی ۱۳۸۳ھ، ستمبر ۱۹۶۳ء

عُلماءِ اُمّت کیلئے لمحۂ فکریہ ــــــ عصرِ حاضر کا اہم تقاضا

قدیم فقہِ اسلامی کی روشنی میں جدید مسائل کا حل

یوں تو آئے دن اتنے علمی و عملی فتنے ظاہر ہو رہے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس کس کا جواب دیا جائے اور کس کس کی طرف توجہ کی جائے.

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

فتنوں کا ایک سیلاب ہے کہ امنڈا چلا آ رہا ہے. کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں جاکر رکے گا. رسائل ہیں، اخبارات ہیں، ریسرچ کے انسٹی ٹیوٹ ہیں، ثقافت کے ادارے ہیں، کہیں تعمیرِ نو کے نام پر تخریبِ دین ہے، کہیں عقائدِ اسلامیہ پر حملے ہیں، کہیں احکامِ شرعیہ سے انکار ہے، کہیں انکارِ سنت پر زور ہے، کہیں تحریفِ قرآن کا فتنہ ہے، کہیں جوازِ سود و تحلیلِ خمر کے فتوے ہیں، کہیں رقص و سرود کو جائز کرنے کے لئے تحقیقات ہو رہی ہے کہیں تعزیرات و حدود پر ہاتھ صاف کیا جا رہا ہے. کہیں سلفِ صالحین سے بدظن کرانے کی مذموم کوشش ہو رہی ہے کہیں اسلامی نظام کی ناکامی کے دلائل پیش کئے جا رہے ہیں. الغرض کہیں مستشرقین مصروفِ عمل ہیں تو کہیں ملاحدہ و زنادقہ اسلام سے برسرِ پیکار ہیں. اندر، باہر، عوام و خواص، راعی و رعیت سب ہی کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی اس آخری نعمت کو تباہ کرنے کی پوری کوشش جاری ہے. مقصدِ حیات صرف مادی آسائش ہے. نہ آخرت کا تصور، نہ حساب و کتاب کی فکر، سارے نظام کا محور صرف پیٹ ہے اور بس. اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ جن حضرات میں ان فتنوں کے دفاع کی صلاحیت و اہلیت ہے وہ یا تو بالکل غافل و خاموش ہیں یا ان کے وسائل اتنے محدود ہیں کہ اگر کچھ کرنا چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے. فإنا للہ وإنا إلیہ راجعون.

مصائبُ شتّی جمعت فی مصیبۃ	ولم یکفہا حتّی قفتہا مصائبُ
(کتنے ہی منتشر مصائب ایک مصیبت میں آکر جمع ہو گئے.	اور اس پر بھی بس نہیں بلکہ روز نئی نئی مصیبتیں آ رہی ہیں)

علماء امت کے ذمہ جہاں اور فرائض عائد ہوتے ہیں وہاں عصر حاضر کے اس اہم فریضہ کی ادائیگی بھی ان ہی کے ذمہ ہے کہ موجودہ دور کے تمدن و تہذیب نے جو نت نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان پر غور کر کے ان کا حل تلاش کیا جائے۔ آج کل کا نیا طبقہ اپنی ناواقفیت کی بنا پر اس خیال خام میں مبتلا ہو گیا ہے کہ اسلام کا قدیم نظام یا قدیم اسلامی فقہ موجودہ معاشرے کی مشکلات کے حل کے لئے کافی نہیں لیکن اگر ذرا غور کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہمارے نظام کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ وہ ہے جو قرآن و سنت کی صریح نصوص سے ثابت ہے۔ یہ تمام تر اس علیم و قدیر اور حکیم و خبیر رب العالمین کا ابدی اور دائمی قانون ہے جس کا علم بھی ہر شے کو محیط ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ قیامت تک جتنے آنے والی نسلیں ہیں ان میں کیا کیا خرابیاں پیدا ہوں گی۔ اور اس کی قدرت بھی کامل ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے علم محیط اور قدرت کاملہ سے قیامت تک پیدا ہونے والے تمام امراضِ روحانی کے لئے ایسا نسخہ شفاء اتارا ہے کہ جس میں نہ کسی ترمیم و صلاح کی گنجائش ہے۔ نہ کسی ادنیٰ سی تبدیلی کی۔ دوسرا حصہ وہ ہے جو علماء امت اور مجتہدینِ عظام نے قرآن کریم و سنتِ نبویہ سے استخراج و استنباط کر کے مرتب فرمایا ہے اس کے مختلف مراتب اور مختلف ادوار ہیں، معاملات اور معاشرت میں بہت سے احکام ایسے بھی ہیں کہ جن کا تعلق اس عہد سے تھا۔ مجتہدینِ امت کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ پہلے ہی ایسے اصول و قواعد مرتب فرما گئے کہ قیامت تک آنے والے اہلِ علم کو ان سے مستفید ہونے کا موقع ملتا رہے گا اور انہی اصول و قواعد کی روشنی میں آئندہ ہر قسم کی مشکلات حل ہو سکیں گی۔ ظاہر ہے کہ جتنا تمدن ترقی کرے گا اتنے ہی جدید مسائل پیدا ہوں گے۔ اور غیر اسلامی ملکوں سے تعلقات و روابط جتنے زیادہ پیدا ہوں گے نئے نئے مسائل سے واسطہ پڑتا رہے گا۔ مسلمانوں میں اب بھی ایک بہت بڑا طبقہ ایسا موجود ہے کہ اگر تجارت و معاملات میں اسلامی اصول کی روشنی میں ان کے مشکلات کو حل کر دیا جائے اور فقہی قوانین سے ان کو ایسی تدابیر بتلا دی جائیں کہ جن کی بنا پر وہ شرعی حدود کے دائرہ سے باہر قدم نہ نکال سکیں تو نہایت خوشی سے اس پر لبیک کہیں گے اور بدل و جان ان تدابیر پر عمل کریں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت علماءِ امت کے ذمہ یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ جس طرح ہمارے

اسلاف نے اپنے اپنے زمانے میں "اجناس" "واقعات" اور "نوازل" کے عنوان سے روزمرہ کے نت نئے پیش آنے والے مسائل کو یکجا کیا اور پھر قدیم فقہ اسلامی کی روشنی میں ان کو حل کیا۔ ٹھیک اسی طرح موجودہ فقہاء بھی جدید نوازل و واقعات کا حل قدیم فقہِ اسلامی کی روشنی میں تلاش کریں۔ جدید تمدن سے بھی فقہ کے ہر باب میں نماز روزہ سے لے کر معاملات و معاشرت تک جدید سوالات پیدا ہو گئے ہیں۔ اس لئے علماء امت کے ذمہ اب یہ فرض ہے کہ جلد سے جلد ان نئے پیدا ہونے والے مسائل کے مفصل جوابات امت کے سامنے پیش کر کے مسلمانوں کے دیندار طبقہ کو مطمئن فرمائیں، اور جدید نسل کو باور کرائیں کہ دین اسلام میں ہر وقت کے صحیح تقاضے کو پورا کرنے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے اور ہماری شریعت زمان و مکان کے قیود سے بالاتر ہے۔ "بینات" کے آئندہ شمارے میں انشاء اللہ ایک اجمالی فہرست ان مسائل کی پیش کر کے اس سلسلہ میں اہلِ علم کی خدمت میں چند رہنما اصول بھی پیش کروں گا تاکہ ان کی روشنی میں غور و خوض کر سکیں۔ بلاشبہ یہ فرض ایک اسلامی حکومت کا تھا کہ وہ وقت کے جامع ترین علماء اور قرآن و حدیث اور فقہِ اسلامی کے ایسے ماہرین کو جن کا تقوی و اخلاص مسلم ہو، جن کے تدین پر امت کو اعتماد ہو، جن کی زندگیاں قال اللہ و قال الرسول میں گذری ہوں جن کے ذہنوں میں توقد و ذکا ہو جن کی طبیعتوں میں استقامت و استقلال ہو، جو خواہشات و تاثرات سے بالاتر ہوں جن کے دلوں میں مخلوقِ خدا کا درد ہو، جو دنیا کی مشکلات سمجھنے کا سلیقہ رکھتے ہوں اور جن میں مؤثر تعبیرات اور عام فہم تحریر کا ملکہ ہو، ان کو کسی ایک مرکز میں جمع کرتی اور ان کی رفاقت میں عصرِ حاضر کے دیندار قانون دان طبقہ کو شامل کرتی اور فقہ اسلامی کے شعبہ میں تمام ممالک اسلامیہ میں اب تک جتنا کام ہوا ہے وہ سب ان کے پیشِ نظر ہوتا خواہ وہ مصر و شام میں ہوا ہو یا مغرب اقصیٰ کے ممالک میں، اور پھر اس طرح قدیم و جدید سے فقہِ اسلامی کی مہارت و معلومات رکھنے والے حضرات اس کام کو اپنے ہاتھوں انجام دیتے لیکن۔ ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

افسوس کہ حکومت پاکستان ادارۂ اسلامیات کراچی وغیرہ پر سالانہ لاکھوں روپیہ خرچ کر رہی ہے مگر اس امر پر اس کی توجہ نہیں۔ ان اداروں میں ایک بھی نہ متدین عالم ہے نہ اسلامی علوم کا ماہر

خصوصی، بجائے اس کے کہ وہ کچھ کام کرتے ان کا وجود ان کی کوششیں خود دینِ اسلام کے لئے عظیم الشان فتنے کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ فیا غربۃ الاسلام و یا خیبۃ المسلمین !!

موجودہ صورتِ حال میں جب حکومت اس طرف متوجہ نہیں تو پھر دیندار مال دار طبقہ کو چاہیے تھا کہ اس خدمت کو بجالانے کے لئے کوئی اقدام کرتا اور علماء کے مشورہ سے اس مقصد کے پیشِ نظر اہل افراد کا انتخاب کر کے فکرِ معاش سے ان کو ہر طرح مطمئن کرا کر اسی کام کے لئے فارغ کرتا، اور اس طرح ایک "مجلس الفقہاء والعلماء" کی تشکیل ہوتی کہ جس میں محققین اہل علم باہمی مشاورت اور بحث و تمحیص سے ان مسائل کو حل کرتے، شخصی رائے کتنے ہی غور و خوض کے بعد قائم ہو پھر بھی وہ شخصی رائے ہی رہے گی۔ ان مشکلات کے حل کے لئے اجتماعی جد و جہد کی ضرورت ہے۔ اکابر صحابہؓ کے بعد حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی پہلی شخصیت ہے جس نے اجتہادی مشکلات کے حل کرنے کے لئے اپنے وقت کے ممتاز ترین چالیس افراد پر مشتمل ایک جماعت کی تشکیل کی اور ایک طویل مدت تک فقہی مسائل کے استنباط اور اجتہادی احکام کی تدوین کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اسی لئے جو پختگی اور قبول عام اس مذہب کو ہوا اور کسی مذہب کو نصیب نہیں ہوا۔ چنانچہ خلافتِ عباسیہ سے لے کر خلافتِ عثمانیہ کے اختتام تک جو بارہ سو برس کا طویل زمانہ گذرا ہے اس میں یہی مذہب حنفی تھا جس کی روشنی میں خدا کی مخلوق کے مشکلات حل ہوتے رہے اور ان خلافتوں میں بھی فقہ حنفی ملک کا قانون بنا رہا۔

لیکن جب کہ ہماری حکومت اور ہمارے ملک کے مسلمانوں کا مالدار طبقہ بھی اس فرض سے غافل ہے تو اب خالصتاً یہ فریضہ علماء امت کے ذمہ آجاتا ہے۔ خصوصاً ان مدارس کے اربابِ اہتمام کے ذمے کہ جو اپنے مدرسوں میں ہزارہا روپے سالانہ خرچ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور مناسب مشاہرات پر اچھے اچھے فضلاء کو رکھ سکتے ہیں۔ اگر ان عربی مدارس میں سے ہر مدرسہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ایک جماعت کی تشکیل کرے اور پھر اپنا ایک نمائندہ منتخب کرے تو کیا اچھا ہو جو کام اربابِ حکومت لاکھوں روپے کے صرف سے بھی انجام نہیں دے رہی۔ وہ علماء کا یہ غریب و مفلس اور نادار طبقہ تھوڑے سے خرچ پر بآسانی کر سکتا ہے۔ جامعہ علوم اسلامیہ کراچی، دارالعلوم کراچی، دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈو اللہ یار، خیر المدارس ملتان، جامعہ اشرفیہ لاہور، جامعہ مدنیہ لاہور، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ، جامعہ امدادیہ کشور گنج ڈھاکہ،

مدرسہ معین الاسلام ہاٹ ہزاری چاٹگام، مدرسہ اسلامیہ جیری چاٹگام، جامعہ اسلامیہ قرآنیہ لال باغ ڈھاکہ وغیرہ وغیرہ، اگر یہ مدارس اس مقصد پر متفق ہو جائیں تو یہ عظیم الشان کام انشاء اللہ بہت جلد انجام پذیر ہو سکے گا اور بآسانی یہ مشکل حل ہو جائے گی۔

آخر میں اپنی یہ مختصر گذارش حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث پر ختم کرتا ہوں جس سے ان مشکلات کے حل کرنے میں پوری رہنمائی ملتی ہے۔

عن علیؓ قال: قلت یا رسول اللہ إن نزل بنا أمر لیس فیه بیان، أمر ولا نهي فما تأمرني قال ((شاوروا فیه الفقهاء والعابدین ولا تمضوا فیه رأی خاصة)) رواه الطبرانی فی "الأوسط" ورجاله موثقون من أهل الصحیح۔

(مجمع الزوائد ص۱۷۸ ج ۱)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش آئے جس میں آپ کا کوئی بیان کرنے یا نہ کرنے کا نہ ملتا ہو تو آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ کیا کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فقہاء و عابدین سے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کریں شخصی رائے کو دخل نہ دیں۔

اس حدیث کریم سے جہاں اجتماعی شورائی فیصلوں کی نہ صرف اہمیت بلکہ فرضیت ثابت ہوئی ساتھ ساتھ اس جماعت کی اہلیت کے شرائط بھی معلوم ہو گئے (۱) ایسے اہل علم ہوں کہ تفقہ فی الدین ان کو حاصل ہو۔ (۲) صالح و متقی اور عبادت گذار ہوں۔

واللہ سبحانہ هو الموفق۔

ربیع الاول ۱۳۸۳ھ اگست ۱۹۶۳ء

اہلِ علم و اہلِ قلم حضرات کا فریضہ

افسوس کہ ہم ایک ایسے دور سے گذر رہے ہیں جس میں اربابِ علم اپنے علمی تقاضوں کو نہیں پورا کر رہے ہیں اور اربابِ جہل علمی مسائل میں دخل دے رہے ہیں، ہر صاحبِ قلم صاحبِ علم بننے کا مدعی ہے، کتابوں کے اردو تراجم نے اس فتنے کو اور وسعت دی ہے اردو تراجم جہاں ایک اصلاحی مفید خدمت انجام دے سکتے تھے۔ افسوس کہ عصرِ حاضر میں "وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا" کا مصداق بنتے جا رہے ہیں جن کا ضرر و نقصان فائدہ و نفع سے کہیں بڑھ گیا ہے۔

دورِ حاضر جہاں مختلف فتنوں کی آماجگاہ ہے، وہاں قلم کا فتنہ شاید سب سے گوئے سبقت لے جا رہا ہے[1] علمی میدان ان حضرات کا نہ صرف بہت محدود و تنگ ہے بلکہ ہے ہی نہیں، اردو کے تراجم سے کچھ سطحی معلومات حاصل کرکے ہر شخص دورِ حاضر کا مجتہد بنتا جا رہا ہے اور "اعجابِ کل ذی رأی برأیه" (ہر شخص اپنی رائے کو پسند کرتا ہے) اس فتنے نے مزید "کریلا اور پھر نیم چڑھا" والی مثل صادق کر دی ہے اور ناشرین نے محض تجارتی مصالح کے خیال سے سستے داموں عالم نما جاہلوں سے تراجم کرا کر فتنہ کو اور بڑھا دیا ہے غرض کہ فتنوں کا دور ہے ہر طرح کے فتنے اور ہر طرف سے فتنے ہی فتنے نظر آتے ہیں، ان فتنوں کے سدباب کے لئے مستقل اداروں کی ضرورت ہے جن کا اساسی مقصد صرف یہی ہو کہ ان تراجم کا جائزہ لیا جائے اور اخبارات میں شائع ہونے والے مقالات کی نگرانی ہو، اربابِ جرائد و مجلات کا مقصد محض تجارت ہے، اور اربابِ قلم کا مقصد محض شہرت ہے یا پھر کچھ مادی منفعت بھی پیشِ نظر ہے، انہی قلمی و اخباری فتنوں میں سے ایک زرعی اصلاحات کے عنوان سے زرعی مشکلات کو حل کرنے کے سلسلہ کے مضامین ہیں جو آئے دن اخبارات میں نکلتے رہتے ہیں۔

بلاشبہ علمی و دینی نقطہ نظر سے یہ وقت کا اہم ترین مسئلہ ہے اور اسلامی احکام کی

---

[1] ایک حدیث میں جسے "درمنثور" (ص ۵۵ ج ۶) میں بحوالہ مسند احمد الادب المفرد للبخاری اور

روشنی میں اگر صحیح متفقہ حل پیش کیا جائے تو کمیونزم کا سدِ باب ہو سکتا ہے، دنیا کی مادی بنیادیں دو ہیں جن پر معاش و معیشت کا دار و مدار ہے، ایک زراعت اور ایک صنعت و تجارت دونوں چیزیں حیاتِ انسانی کے لئے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہیں۔ اس لئے دینِ اسلام نے ان کے احکام پورے طور پر بیان کر دیئے، قرآن و حدیث و فقہِ اسلامی میں ان کی تفصیلات موجود ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ مفکرین اربابِ دین و اربابِ علم جن کی علمی زندگیاں انہی بادیہ پیمائیوں میں گذری ہیں اور جن کی بے لوث زندگیاں اخلاص و تقویٰ سے معمور ہیں اور جن کی فکری و اجتہادی صلاحیتیں مسلم ہیں جلد سے جلد کسی مرکز میں بیٹھ کر وفاقی اجماعی حل پیش کریں، شخصی طور پر اس پچاس سال میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ چند ماہ پہلے مدرسہ عربیہ اسلامیہ نے چند ممتاز افراد کو جمع بھی کیا تھا لیکن تکمیل سے پہلے حضرات منتشر ہو گئے، کام ادھورا رہ گیا، حق تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں کہ جلد سے جلد یہ کام انجام پذیر ہو اور نہایت خوش اسلوبی سے منصۂ شہود پر امت کے سامنے آجائے، اگرچہ اربابِ اقتدار آج کل اتنے جری ہو گئے کہ فوجی طاقت کے بل بوتے پر ہر حکم نافذ کرتے ہیں اور اسلام کے ادعا کے باوجود ہر قید و بند سے آزاد ہو کر احکامات صادر فرماتے رہتے ہیں، ان حالات میں بے چارے اہلِ علم یا اربابِ دین کی باتوں کو وہ کہاں درخورِ اعتناء سمجھتے ہیں لیکن بارگاہِ ربوبیت میں اپنی مسؤلیت پوری کرنے کے لئے ہر وقت اس کی ضرورت ہے۔

ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ، جون ۱۹۷۲ء

(بقیہ حاشیہ صـ سے آگے) مستدرک حاکم بروایت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، ذکر کیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت سے پہلے کے چھ فتنوں کا ذکر فرمایا ہے جن میں سے ایک "فشو القلم" یعنی "قلم کا طوفان" ہے، اس حدیث کی روشنی میں آج طوفانِ قلم کی فتنہ سامانی کا اندازہ ہر عاقل کر سکتا ہے۔ مدیر

تصویر سازی اور اسلام

اسلام دینِ قیّم ہے اس نے کفر و شرک، بدعت و ضلالت اور کجراہی و گمراہی کا ایک ایک کانٹا چن چن کر صاف کر دیا، تمام اولادِ آدم کو ایک صاف، سیدھا اور نکھرا ہوا "صراطِ مستقیم" عطا کیا جس پر چل کر وہ امن و امان اور راحت و عافیت کی زندگی بسر کر سکے اور مرنے کے بعد قرب و رضا اور جنت و نعیم کی وارث بنے:۔

((تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ[۱]))	یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لئے مخصوص کرتے ہیں جو نہ تو زمین میں سرکشی چاہتے ہیں اور نہ فساد، اور اچھا انجام پرہیز گاروں ہی کے لئے ہے۔

اسلام نے انسانیت کے اعمال و اخلاق کے تزکیہ کے لئے شر و فساد کے تمام راستوں کو مسدود کر دیا، شرک جو اسلام کی نظر میں سب سے بڑا ظلم ہے تاریخ شاہد ہے کہ وہ دنیا میں مجسموں مورتیوں اور تصویروں اور فوٹوؤں کے راستہ سے آیا تھا اس لئے اسلام نے اس منبعِ کفر و شرک کو حرام اور تصویر سازوں کو ملعون اور بدترینِ خلق قرار دے کر اس راستہ کو بند کیا، صحیحین میں اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے یہ حدیث موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرضِ وصال میں ایک دفعہ ازواجِ مطہرات آپ کے پاس جمع تھیں، کسی تقریب سے "ماریہ" نامی کنیسہ (گرجا) کا ذکر چھڑا، حضرت اُم سلمہؓ اور حضرت ام حبیبہؓ کو چونکہ ہجرتِ حبشہ کے دوران اس کے حالات معلوم کرنے کا موقعہ ملا تھا اس لئے ان دونوں حضرات نے اس کے حسنِ تعمیر اور وہاں کی آراستہ تصویروں کا تذکرہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ گفتگو سن رہے تھے بسترِ علالت سے سر اٹھایا اور فرمایا:۔

((أُولٰئِكَ إِذَا مَاتَ فِيْهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهِ مَسْجِدًا ثُمَّ صَوَّرُوْا بِهِ تِلْكَ الصُّوَرَ أُولٰئِكَ شِرَارُ خَلْقِ اللّٰهِ))	ان لوگوں میں جب کسی نیک آدمی کا انتقال ہو جاتا یہ اس کی قبر پر عبادت گاہ بنا لیتے، پھر ان تصویروں سے اسے آراستہ کر لیتے تھے یہ لوگ اللہ کی مخلوق میں بدترین قسم کے لوگ ہیں۔

[۱] القصص - ۸۳

ایک حدیث میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر پر تھے، آپؐ کی تشریف آوری سے پہلے میں نے گھر میں ایک طاقچہ پر کپڑے کا پردہ لٹکا دیا جس میں تصویریں بنی تھیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا تو چہرۂ انور پر غضب کے آثار نمودار ہوئے اور نہایت نفرت کے لہجہ میں فرمایا:۔

«یَا عَائِشَۃُ اِنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَذَابًا عِنْدَ اللّٰہِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ الَّذِیْنَ یُضَاھُوْنَ بِخَلْقِ اللّٰہِ» (بخاری ومسلم)

عائشہ! قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ سخت عذاب کے مستحق یہ لوگ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی صفتِ خلق میں ریس کرتے ہیں۔

صحیح مسلم اور مسندِ احمد کی حدیث میں ہے:۔

«اِنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَذَابًا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ الْمُصَوِّرُوْنَ»

یقیناً سب سے زیادہ سخت عذاب کے مستحق قیامت کے دن تصویر ساز ہوں گے۔

اور صحیحین اور دوسری کتبِ حدیث میں بہت سی احادیثِ صحیحہ مبارکہ موجود ہیں جو جاندار چیزوں کی تصویر سازی کی حرمت اور ملعونیت کو بیان کرتی ہیں اور تمام فقہائے امت نے متفقہ طور پر جاندار چیزوں کی تصاویر کو حرام قرار دیا ہے۔

تصویر اور فوٹو ایک وبائی فتنہ

بدقسمتی سے عالم کی زمامِ قیادت کافی عرصہ سے ناخدا شناس تہذیبوں اور بددین قوموں کے ہاتھ میں ہے جن کے یہاں (الا ماشاء اللہ) دین و دیانت نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں اور شرم وحیا، عفت وعصمت، غیرت وحمیت کا لفظ ان کی لغت سے خارج ہے، ان کے نزدیک مکر وفن اور دغا وفریب کا نام "سیاست" ہے، انسانیت کشی کے اسباب و وسائل کا نام "ترقی" ہے، فواحش ومنکرات کا نام "آرٹ" ہے، مرد وزن کے غیر فطری اختلاط کا نام "روشن خیالی" اور "خوش اخلاقی" ہے، پردہ دری اور عریانی کا نام "ثقافت" ہے اور پس ماندہ ممالک ان کی تقلید۔ اندھی تقلید اور نقالی کو فخر سمجھتے ہیں، اس لئے آج سارے عالم میں فتنوں کا دور دورہ ہے، اور شاید یہ دجالِ اکبر کے دجالی فتنہ کی تیاری ہو رہی ہو، خصوصاً عالمِ اسلام ہر معصیت ہر

فتنہ اور ہر برائی کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، آئے دن کے ان ہزاروں فتنوں میں ایک "فوٹو" کا فتنہ ہے جہاں دیکھیں فوٹو گرافر موجود ہیں دعوت وضیافت ہو یا مجلس نکاح، اجلاس عام ہو یا پرائیویٹ اجتماع ہر جگہ فوٹو گرافر موجود ہوگا اور کیمرہ سامنے، اس معصیت نے وبائی فتنہ کی شکل اختیار کر لی ہے جس سے بچنا دشوار ہو گیا ہے، کوئی بالارادہ بچنا بھی چاہے تب بھی اسے معاف نہیں کیا جاتا بے خبری میں اس کا فوٹو بھی لے لیا جاتا ہے اور دوسرے دن اخبارات کے صفحات پر دنیا کے سامنے پیش بھی کر دیا جاتا ہے آج ان فوٹو گرافروں، کیمرہ بازوں اور اخبار نویسوں کے طفیل عریاں غلاظت کے انبار ہمارے گھروں میں داخل ہو رہے ہیں اور اس سے پورا معاشرہ متأثر بلکہ متعفن ہو رہا ہے مگر حیف ہے کہ اس پر کوئی گرفت کرنے والا نہیں، ستم یہ کہ اس عمومی اور عالم گیر صورت نے عام طبقہ کے ذہن سے یہ خیال ہی ختم کر دیا ہے کہ یہ بھی کوئی ناجائز کام یا معصیت اور گناہ ہے کیونکہ برائی کا یہ خاصہ ہے کہ جب وہ عام ہو جاتی ہے اور اس پر گرفت کا بندھن ڈھیلا ہو جاتا ہے تو رفتہ رفتہ اس کی نفرت وحقارت دلوں سے نکلتی جاتی ہے اور قلوب مسخ ہوتے چلے جاتے ہیں اور نوبت یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ وہ معیارِ شرافت بن جاتی ہے۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا مزاج

اور اسی کو کج نظر اور غلط پندار لوگ "انسانی قدروں کی تبدیلی" سے تعبیر کرنے لگتے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ جب تک انسان انسان ہے اور اس کی انسانیت باقی ہے تب تک کسی "انسانی قدر" کے بدل جانے کا تصور ہی غلط ہے ہاں انسان نما جانور، انسان ہی نہ رہیں کسی اور نوع میں تبدیل ہو جائیں تو دوسری بات ہے۔

چند دن ہوئے ایک "عالم" کے یہاں خصوصی دعوت تھی، وہاں دو ایک مشہور شخصیتیں بھی مدعو تھیں اور خصوصی مہمان بھی تشریف فرما تھے، راقم الحروف کو بھی شرکت کی نوبت آئی اور سوءِ اتفاق سے مجھے ان ہی کے ساتھ بٹھا دیا گیا، یہ تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک عالم کے مکان پر خصوصی دعوت میں فوٹو گرافر کیمرہ لے کر آموجود ہوگا، جب فوٹو گرافر سامنے آیا تو راقم الحروف نے سختی سے روکا اور ایک دوسرے عالم نے بھی شدید نکیر فرمائی، اطمینان ہوا کہ فتنہ ٹل گیا، لیکن کچھ

وقفے کے بعد دوبارہ کسی قدر فاصلہ پر دروازہ پر کھڑا دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس نے ہماری بے خبری اور غفلت سے فائدہ اٹھا کر اپنا ارادہ پورا کر لیا، اگلے دن "جنگ" کے صفحات پر تین اشخاص کا جن میں ایک راقم الحروف تھا، فوٹو آگیا اور ستم ظریفی یہ کہ نیچے یہ عبارت لکھ دی "گروپ فوٹو"۔ إنا للہ۔

تصویر سازی کی حرمت پر امت کا اتفاق ہے

حدیثِ نبوی میں تصویر سازی پر جو وعیدِ شدید آئی ہے وہ ہر جاندار کی تصویر میں جاری ہے اور تمام امت جاندار اشیاء کی تصاویر کی حرمت پر متفق ہے لیکن خدا غارت کرے اس مغربی تجدد کو کہ اس نے ایک متفقہ حرام کو حلال ثابت کرنا شروع کر دیا اس فتنۂ اباحیّت کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا مرکز مصر اور قاہرہ تھا، چنانچہ آج سے نصف صدی پہلے قاہرہ کے مشہور شیخ محمد بخیت مطیعی نے جو شیخ الازہر بھی تھے إباحة الصور الفوتوغرافية کے نام سے ایک رسالہ تالیف کیا تھا جس میں انہوں نے کیمرے کے فوٹو کے جواز کا فتویٰ دیا تھا، اس وقت عام علماءِ مصر نے ان کے فتویٰ کی مخالفت کی حتیٰ کہ ان کے ایک شاگرد رشید علامہ شیخ مصطفیٰ حمامی نے اپنی کتاب النهضة الإصلاحية للأسرة الإسلامية میں اس پر شدید تنقید کی اور اس کتاب میں صفحہ ۲۶۰ سے صفحہ ۲۶۴ پر اور صفحہ ۳۰۱ سے صفحہ ۳۲۶ تک اس پر بڑا بلیغ رد لکھا، ایک جگہ وہ لکھتے ہیں :- "تمام امت کے گناہوں کا بار شیخ کی گردن پر ہوگا کہ انہوں نے تمام امت کے لئے شر اور گناہ کا دروازہ کھول دیا"۔

اسی زمانہ میں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے قلم سے ماہنامہ "معارف" میں ایک طویل مقالہ شیخ مطیعی کے رسالہ کی روشنی میں نکلا، اس وقت حضرت امام العصر مولانا انور شاہ رحمہ اللہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی اور اس مضمون سے واقف ہوئے تو آپ کی تحریک پر آپ کے تلامذہ میں سے حضرت مولانا محمد شفیع صاحب نے ماہنامہ "القاسم" میں (جو دارالعلوم دیوبند کا ماہنامہ تھا) اس پر تردیدی مقالہ شائع فرمایا۔ وہ مقالہ حضرت شیخ کی راہنمائی میں مرتب ہوا جسے بعد میں التصوير لأحكام التصاوير کے نام سے حضرت مفتی صاحب نے شائع فرمایا۔

یہ واضح رہے کہ حضرت سید صاحب موصوف مرحوم نے اپنی حیاتِ طیبہ کے آخری سالوں میں جبکہ آپ کی عمرِ مبارک ساٹھ تک پہنچ چکی تھی جن چند مسائل سے رجوع فرما لیا تھا ان میں فوٹو کے

جواز کے مسئلہ سے بھی رجوع فرمایا تھا، مولانا ابوالکلام آزاد جیسے آزاد صاحبِ قلم نے اگرچہ ذوالقرنین کو سائرس بنا کر اس کے مجسمہ کا فوٹو ترجمان القرآن میں شائع کیا تھا لیکن بعد میں اسے ترجمان القرآن کے تمام نسخوں سے نکال کر تصویر کے حرام ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔

الغرض نہ صرف ہمارے اکابر بلکہ تمام فقہاءِ امت کا اس پر اتفاق ہے کہ فوٹو حرام ہے، البتہ پاسپورٹ وغیرہ ضروریات کے لئے نصف چھوٹے فوٹو کو اس سے مستثنیٰ کرنا ہوگا، اس کا گناہ ان لوگوں کے ذمہ ہے جن کی طرف سے یہ مجبوریاں عائد کی گئی ہیں، اس لئے یہ واضح رہے کہ میرا مسلک یہی ہے کہ فوٹو بلا ان خاص ضرورتوں کے ناجائز اور حرام ہے اگر میری بے خبری میں چالاکی سے کسی نے فوٹو لے لیا تو اس کا گناہ اس کی گردن پر ہے اگرچہ اس ملعون فن سے اسلامی معاشرہ میں نفرت عام نہیں رہی، ناواقف عوام اسے معمولی اور ہلکی چیز سمجھنے لگے ہیں اور کچھ لوگ تو اس کے جواز کے لئے بھی حیلے بہانے تراشنے لگے ہیں لیکن کون نہیں جانتا کہ کسی معصیت کے عام ہونے یا عوام میں رائج ہونے سے وہ معصیت ختم نہیں ہو جاتی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کو جب حرام قرار دے دیا تو اس کے بعد خواہ سو بہانے کئے جائیں مگر اس کے جواز کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، آج کل سود، بیمہ اور اسی قسم کی بہت سی چیزیں جنہیں مغربی تہذیب و تمدن کی بد دینی نے جنم دیا ہے ہمارے جدید تمدن میں گھس آئی ہیں اور اب پوری طرح ان کا رواج ہے لیکن کون مسلمان ہوگا جو یہ کہنے کی جرأت کرے کہ یہ سب جائز ہیں؟ ہاں یہ ممکن ہے کہ گناہ میں عموم بلویٰ کی وجہ سے آخرت کی سزا میں کچھ تھوڑی بہت تخفیف ہو جائے اس کا علم حق تعالیٰ ہی کو ہے۔

اسلامی سلطنت کو کیا کرنا چاہیئے؟

افسوس ہے کہ ہمارے یہاں ہر چیز پر پابندی ہے لیکن اگر آزادی ہے اور پوری آزادی ہے تو اہل الحاد کے لئے آزادی ہے کہ وہ جو چاہیں لکھیں اور جو چاہیں کہیں کوئی روکنے والا نہیں، اس سے بڑھ کر صدمے کی بات یہ ہے کہ اسلامی حکومت جس سے بجا طور پر مسلمانوں کو

یہ توقع تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی سچی خادم ہوگی اور اسلامی حصار میں شگاف ڈالنے والے قزاقوں کو سرزنش کرے گی اور انہیں قرآن وسنت اور مسلمانوں کے دین سے کھیلنے کا موقعہ نہیں دے گی مگر ہماری شامتِ اعمال ہے کہ ہماری خوش فہمی کے خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوئے، ڈاکٹر فضل الرحمٰن جن کے بارے میں ہم چھ سال سے چیخ رہے تھے مگر ہماری سنی ان سنی ایک کردی گئی تھی، عوامی مطالبہ کے پیشِ نظر گذشتہ دنوں ان کا استعفاد تو منظور کرلیا گیا، مگر حکومت کی طرف سے ان کی لغویات کی مذمت میں ایک حرف نہیں کہا گیا بلکہ اس کی طرف سے صفائی ہی کی کوشش کی گئی اور اب وہ آزادانہ طور پر اپنے نظریات کی نشرواشاعت کریں گے۔

بعض ذرائع سے ہمیں یہ افسوسناک اطلاع ملی ہے کہ حکومت کی طرف سے فوجوں کے افسروں کو متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ اسلام کا مطالعہ مسٹر پرویز کی کتابوں کی روشنی میں کریں انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اگر اس خبر میں ذرا بھی صداقت ہے تو یہ نہایت ہی افسوسناک اور روح فرسا خبر ہے، مسٹر پرویز کے نظریات ہر عام وخاص کو معلوم ہیں وہ اسلام کو "عجمی سازش" کہتے ہیں اور پوری امت کو گمراہ، ان کے نزدیک خدا اور رسول "مرکزِ ملّت" کا نام ہے وغیرہ وغیرہ، ایسے زندیق کی کتابوں کے مطالعہ کی تحریک؟

ع بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

ہم اربابِ اقتدار سے خدا اور رسول کا واسطہ دے کر (جن کے نام پر ہمیں یہ ملک اور حکومت ملی) گذارش کرتے ہیں کہ وہ اخلاص اور سچائی سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل دین اور سچے اسلام کی حفاظت کریں اور اگر وہ ایسا نہیں کرسکتے تو کم ازکم ملحدین کی حوصلہ افزائی نہ کریں، خدانخواستہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم والے اسلام کو یہاں ختم کردیا گیا تو پاکستان کو نہ مسٹر پرویز کا "طلوعِ اسلام" بچا سکتا ہے نہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا "اسلام" اور نہ کوئی ظلی بروزی نبوت، واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل، حق تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے اور ہماری لغزشوں سے درگذر فرمائے۔

شعبان ۱۳۸۸ھ

تصویر اور اسلام

اللہ تعالےٰ رحم فرمائے قربِ قیامت کی وجہ سے اس تیزی سے فتنوں پر فتنے اٹھ رہے ہیں کہ ایمان کی سلامتی مشکل ہو رہی ہے اور اعمالِ صالحہ کی توفیق سلب ہوتی جا رہی ہے، ایک فتنہ تنہا بذاتِ خود فتنہ ہوتا ہے اور ایک فتنہ مختلف فتنوں کو جنم دیتا ہے مثلاً فوٹوگرافی کا فتنہ شروع ہوا، یہی کیا کم گناہ تھا کہ اس سے سینکڑوں فتنے پیدا ہوئے، حضرت حق جل شانہ' کا علم ہر شئی کو محیط ہے، اس کے علم میں ہے کہ فلاں فتنہ فلاں فلاں اسباب و ذرائع سے ابھرے گا، اس بنا پر شریعتِ الٰہیہ کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ جو چیز کسی درجہ میں بھی معاصی اور گناہوں کا سبب بن سکتی ہو اس کو منع فرمائے، انسانی عقل بسا اوقات اپنے قصورِ علم اور کم فہمی کی وجہ سے اس کی علت و حکمت کو محسوس نہیں کر سکتی، انسان بسا اوقات تعجب کرتا ہے کہ بظاہر اس معمولی بات کو اتنی سختی سے کیوں روکا گیا، لیکن بعد میں واقعات و شواہد سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ شریعتِ الٰہیہ نے جو فیصلہ کیا تھا عین حکمت تھا، ایک مصوری کے پیٹ سے کیسے کیسے فتنے پیدا ہوں گے شریعتِ محمدی نے ابتدا ہی سے فرما دیا تھا:-

((أشد الناس عذاباً یوم القیامة المصورون))	یعنی سخت ترین عذاب قیامت کے دن صورت بنانے والوں کو ہوگا۔

اور کبھی یہ فرمایا کہ ان سے کہا جائے گا کہ جو تم نے بنایا ہے اس میں روح پھونکو اور کبھی یہ ارشاد فرمایا کہ جس گھر میں کتا یا تصویر ہو اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے اور کہیں یہ فرمایا کہ صورت سازی حق تعالیٰ کی خالقیت کی نقل کرنی ہے وغیرہ وغیرہ۔

تصویر کے معاملہ میں شریعتِ محمدیہ کی سختی کی وجہ

تصویر کے معاملہ میں اس شدت کی بنیاد درحقیقت یہ ہے کہ دینِ اسلام کا بنیادی عقیدہ توحید ہے یعنی حق تعالیٰ کی وحدانیت کا بدل وجان اقرار کرنا خواہ توحید ذاتِ الٰہی کی ہو یا توحید صفاتِ الٰہی کی ہو یا توحید افعالِ الٰہی کی ہو اسلام میں کسی قسم کا شرک قابلِ برداشت نہیں، اس لئے ابتدا ہی سے شریعت نے تمام اسبابِ شرک پر جن میں تصویر بھی شامل ہے شدید پابندی لگا دی، اسی لئے میں نے کہا کہ یہ کوئی معمولی گناہ نہ تھا لیکن اس وقت جب کہ حق تعالےٰ نے

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کے ذریعہ یہ اعلان کرایا تھا اور یہ احکام نازل فرمائے تھے خیال بھی نہیں گذر سکتا تھا کہ آئندہ چل کر یہ فتنہ کتنے عظیم الشان فتنوں کا ذریعہ بنے گا۔

تصویر اور اس کے گندے اور فتنہ انگیز نتائج

آج اسی مصوری کی وجہ سے حسن وجمال کی نمائش ہوتی ہے اور اسی تصویر سازی کی وجہ سے بے حیا قوموں کی عورتوں کے عریاں فوٹو، بداخلاقی، بد اطواری اور خدا فراموش زندگی کا ذریعہ بن چکے ہیں، یہی لعنت شہوانی وحیوانی جذبات بھڑکانے کا سبب ہے، اسی لعنت کی وجہ سے کتنے معصوموں کا خون بہہ رہا ہے اور کتنی جانیں تلف ہو رہی ہیں اور خودکشی کی کتنی وارداتیں ہو رہی ہیں، تھیٹر اور سینما کے پردوں پر اسی مصوری کی وجہ سے بے حیائی کے مظاہر اور روح فرسا مناظر سامنے آرہے ہیں اسی فتنہ کی وجہ سے نہ کسی کی آبرو محفوظ ہے نہ تہمت تراشی سے کوئی بچ سکتا ہے کسی کا سر اور کسی کا دھڑ لے کر جو چاہے کرشمہ سازی دکھلائیے، کسی کو بدنام کرنا ہو اس کے بالائی بدن کی صورت لے کر کسی طوائف کے عریاں فوٹو میں پیوند لگا کر جو چاہے کر لیجئے، آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ایک بڑی قوی اسلامی مملکت کی تباہی وبربادی اور اس کے حکمراں کی جلاوطنی میں یہی فتنہ ایک مؤثر عامل ثابت ہوا ہے، اس قسم کی عریاں تصویروں کے ذریعہ ملک میں ان کی بداخلاقی و بے حیائی و بے دینی کا پروپیگنڈہ کیا گیا اور بدنامی کی انتہا کر دی گئی اور آخر تخت وتاج سے محرومی کا باعث بنا، افسوس کہ واقعہ کی پوری تفصیل سے معذور ہوں، الغرض اس فتنے کے کرشموں سے نہ دین محفوظ ہے نہ اخلاق، نہ کسی کی جان محفوظ ہے نہ کسی کا ایمان، نہ آبرو محفوظ ہے نہ کسی کی عصمت، فواحش ومنکرات کی اشاعت میں مصوّری کا اتنا بڑا دخل ہے کہ اسی کی وجہ سے تقویٰ وطہارت و پاکیزگی زندگی کی بنیادیں ہل گئیں، لیکن آج کل کی اصطلاح میں یہ ثقافت اور آرٹ ہے اور غضب یہ کہ اس کو "اسلامی آرٹ" کا نام دیا جاتا ہے ؎ بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست۔

کسی معاشرہ میں بے حیائی کا سر اٹھانا اس کے دلوں سے اسلامی روح نکلنے کی علامت ہے تھیٹر و سینما اور یہ فلمیں جن سے آج معاشرہ ہلاکت کے کنارے پہنچ گیا ہے یہ تمام اسی مصوّری

کی بدولت ہے اور یہ فتنہ اتنا عام ہو گیا ہے کہ مسجدیں جو خالص عبادت گاہیں ہیں وہ بھی اس سے محفوظ نہیں نکاح کی محفلوں سے مقاماتِ مقدسہ تک ہر جگہ یہ فتنہ پہنچ گیا ہے بعض وہ حکومتیں جو اسلامی قانون جاری کرنے کی مدعی ہیں اور وہ جن کا دعویٰ اتباعِ سنت ہے ان کے ہاں یہ فتنہ اس قدر شباب پر ہے اور آب و تاب سے ہے کہ الامان والحفیظ، بہرحال یہ فتنہ اتنا عالمگیر ہو گیا ہے کہ نہ مسجد بچی نہ مدرسہ، نہ اسلامی ملک بچا نہ صالح مسلمان بچے اور آج اس لعنت کی وجہ سے ایک فلم تیار کی جارہی ہے، روزنامہ "جنگ" کراچی (مورخہ ۱۰ جنوری ۷۰ء صفحہ ۱۵) میں اس کا مندرجہ ذیل اشتہار شائع ہوا ہے:-

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تاریخِ اسلام پر تیار کی ہوئی دنیا کی سب سے پہلی رنگین فلم جسے حکومت سعودی عرب کے تعاون سے سرزمینِ حجاز میں فلمایا گیا۔

اَللّٰہُ اَکۡبَرُ

مکہ معظمہ کے وہ تمام تاریخی مقامات جن سے تاریخِ محمدی کا آغاز ہوتا ہے، حجرِ اسود، خانۂ کعبہ، مقامِ ابراہیم، زم زم، صفا اور مروہ، منحرِ ابراہیم، مولدِ نبیؐ، دولت کدہ حضرت خدیجہؓ، مولدِ علیؓ، مولدِ فاطمۃ الزہراؓ، غارِ حراء، دارِ ارقمؓ، غارِ مرسلات، غارِ ثور، جبل الرحمۃ کے علاوہ مسجد الرائیہ، مسجد الجن، مسجد الشجرۃ، مسجد الغنم، مسجد بوقبیس، مسجدِ طویٰ، مسجدِ عائشہؓ، مسجد العقبہ مسجد الجعرانہ، مسجد الخیف، مسجد البیعۃ، جنت المعلیٰ وغیرہ وغیرہ، مدینۂ منورہ کے وہ مقدس مقامات جہاں اسلام پروان چڑھا، مسجد نبویؐ، روضۂ مبارک سرورِ کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم، منبر ومحراب، اسطوانۂ حنانہ، اسطوانۂ جبرئیل، اسطوانۂ عائشہؓ، اسطوانۂ علیؓ، حجرۂ مبارک حضرت فاطمہؓ، مسجدِ قبا، مسجدِ قبلتین، مسجدِ حضرت ابوبکرؓ، مسجدِ حضرت علیؓ، مسجدِ فاطمہؓ، جنت البقیع وغیرہ کے علاوہ وہ تمام میدانِ جنگ جہاں جنگِ احد، جنگِ بدر جنگِ خندق، جنگِ خیبر جیسے مشہور غزوات ہوئے ہیں، اس رنگین فلم میں فتحِ مکہ کے علاوہ طائف کا وہ مقام بھی دیکھیں گے جہاں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا اور دشمنانِ اسلام کے پتھراؤ سے بے ہوش ہو گئے تھے، اس کے ساتھ ساتھ حج کے تمام مناسک

تفصیل اور تسلسل کے ساتھ دکھائے گئے ہیں۔

اسلام نے غیرت وحیاء عصمت وپاک دامنی اور پردہ پر جتنا زور دیا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، حیاء کو ایمان کا اہم شعبہ قرار دیا، بے غیرت اور دیوث افراد کو ملعون کہا گیا، حیاء باختہ لوگوں کو اسلامی معاشرہ سے خارج کیا گیا، صنفِ نازک کی بڑی خوبی اس کی طہارت ونزاہت پاکدامنی وپردہ داری بتائی گئی ہے۔

((فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللهُ)) پھر جو عورتیں نیک ہیں سو تابعدار ہیں نگہبانی کرتی ہیں پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت سے۔

بہت سی آیات واحادیث میں مستورات کے لئے پردہ وغیرہ کے خصوصی احکام صادر کئے گئے اور ان تمام راستوں کو بند کر دیا گیا جن سے بے حیائی کو در آنے کا موقع ملتا ہے۔

((وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ)) اور قرار پکڑو اپنے گھروں میں اور دکھلاتی نہ پھرو جیساکہ دکھلانا دستور تھا پہلے جہالت کے وقت میں

ان ساری تعلیمات کے باوجود کسی مسلم معاشرہ میں بے حیائی کے اسباب ومحرکات کا سر اٹھانا اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ دلوں سے اسلامی روح نکل چکی ہے اور ان مسلمانوں کے بے جان لاشے پڑے ہیں جن پر خدا فراموش تہذیبوں کے کرگس منڈلا رہے ہیں۔

بے حد افسوس کی بات ہے کہ یہ مملکتِ خداداد پاکستان جو آج تک تمام عالمِ اسلام میں کم از کم انفرادی طور پر دینی فضا اور دینی کردار کے لحاظ سے ممتاز تھا، دینی درسگاہیں اعلیٰ سے اعلیٰ یہاں موجود ہیں، خانقاہیں بہتر سے بہتر یہاں موجود رہیں، محقق علماء اور صالح عوام کی کثرت سے ایک بڑی خصوصیّت کا حامل رہا۔ اب بڑی سرعت سے خدا فراموش قوموں کی نقالی کر رہا ہے اور خرد باختہ تمدن کی تقلید۔ اندھی تقلید۔ میں لعنت وغضب کے راستوں پر رواں دواں ہے، معلوم ہوا ہے کہ لاہور میں مقابلۂ حسن ہونے والا ہے، اگر یہ خبر صحیح ہے اور ہمیں واقع کی رپورٹ غلط نہیں پہنچی ہے تو پاکستان کے مسلمانوں کے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے یہ لیڈر جو آج کل ہر جگہ ہر تقریر میں اسلام اور کتاب وسنّت کا نام لینا ضروری سمجھتے ہیں کیوں خاموش ہیں؟ اور یہ حکومت جو اسلام کے تحفظ کا دعویٰ بار بار

کرتی ہے اسے کیونکر برداشت کر رہی ہے؟ اگر یہ ملک بھی یورپ و امریکہ کے نقش قدم پر چلنے لگا تو یہاں کسی خیر کی کیا توقع ہو سکتی ہے کیا پاکستان اس لئے بنایا تھا کہ یہاں بے حیائی کو فروغ دیا جائے گا؟ یہاں نمائشِ حسن کے میلے ہوں گے؟ یہاں سینما و تھیٹر اور ریڈیو اور ٹیلیویژن کے ذریعے قوم کو ناچ گانے کی مشق کرائی جائے گی؟ اور شرمناک مناظر سے ہوس پرستی کی تسکین ہوگی؟ قحبہ خانوں، شراب خانوں اور کلبوں کے ذریعہ یہاں کی فضا کو گندہ اور نظر و قلب کو زہر آلود کیا جائے گا؟ ہم حکومت سے گذارش کریں گے کہ اس قسم کے فواحش کو بند کیا جائے ورنہ خطرہ ہے کہ اس عذابِ الٰہی سے بٹی ہوئی قوم پر مزید عذاب اور غضب نازل نہ ہو جائے۔

یکم جنوری سے سیاسی آزادی بحال ہوتے ہی مختلف تنظیمیں اور جماعتیں میدان کارزار میں اتری آئی ہیں، بیان بازی، دھینگا مشتی، مکروہ پروپیگنڈا اور تہمت طرازی کے اسلحہ سے لیس ہو کر ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہیں، لطف یہ کہ ہر جماعت اور جماعت کا لیڈر عوام کی فلاح و بہبود کے ساتھ ساتھ اسلام اسلام پکارتا اور کتاب و سنت کا نام لیتا ہے۔ (حالانکہ ان میں سے بعض حضرات کتاب و سنت کو سمجھنا تو درکنار نماز پڑھنا بھی نہیں جانتے ہوں گے نہ انہیں ایسا اتفاق کبھی پیش آیا ہوگا)

سوال یہ ہے کہ ہر جماعت کا جب یہی دعویٰ ہے کہ ہم یہاں اسلام لائیں گے اور کتاب و سنت کا آئین بنائیں گے تو پھر یہ سارے متحد کیوں نہیں ہوتے؟ آخر اتحاد سے کس نے روکا ہے؟ اگر اس پر اتفاق ہے کہ سوشلزم، کمیونزم اور سرمایہ داری ایک لعنت ہے، اگر اس پر سب متفق ہیں کہ یہاں کتاب و سنت کے مطابق اسلامی قانون نافذ ہونا چاہیئے، اگر یہ عقیدہ ہے کہ دینِ اسلام ہمارے تمام امراض کے لئے نسخۂ شفا ہے، اگر یہ تسلیم ہے کہ اسلام صرف عبادات کا نام نہیں بلکہ وہ پوری زندگی اور زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی اور معاشرے کے ایک ایک فرد کی ضروریات کا کفیل ہے، اگر یہ ایمان ہے کہ اسلامی قانون اور شرعی احکام تمام عالم کے قوانین سے اعلیٰ و ارفع ہیں، تو یہ تمام جماعتیں ان روح فرسا اختلافات کو ختم کیوں نہیں کرتیں اور بے چارے عوام پر رحم کرتے ہوئے انہیں اس حیرت انگیز انتشار سے کیوں نہیں بچایا جاتا، اگر پیشِ نظر صرف اپنی جماعت کا وقار و اقتدار نہیں تو پھر ایک دوسرے پر کیچڑ

اچھالنے۔ فضول نعروں اور دوروں سے قوم کو پریشان کرنے اور نئے نئے جرائد و اخبارات پر لاکھوں روپیہ ضائع کرنے کے کیا معنی ہوئے؟ اگر اخلاص ہے نیت صحیح ہے، مقصد متحد ہے تو یہ اختلاف کیوں؟ یہ تھوتھکار کیسی؟ یہ شور و غوغا کیونکر؟ ہماری دعا ہے کہ حق تعالیٰ تمام جماعتوں کو اخلاص و عمل اور اتفاق و اتحاد کی توفیق نصیب فرمائے۔

دراصل آج کی سیاست کے لئے یہ ضروری سمجھ لیا گیا ہے کہ عوام سے لمبے چوڑے وعدے کئے جائیں، عوامی فلاح و بہبود کے نعرے لگائے جائیں، خصوصیت سے وقت کے کسی اہم مسئلہ کو انتخابی اہمیت دی جائے، قرآن و سنت و خدا و رسول اور دین اسلام کے نام پر لوگوں سے اپیل کی جائے (خواہ داعی صاحب کی زندگی اس سے بعد المشرقین رکھتی ہو) اپنے مخالف کو نیچا دکھانے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا جائے، اس کی معمولی لغزش کو مبالغہ آمیزی سے دہرایا جایا جہاں تک بس چلے اسے ذلیل کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رہے، ہنگامے کئے جائیں، فساد اور اودھم مچایا جائے، انتخابات کے موقع پر ہمیشہ یہی ہوتا آیا، بدقسمتی سے اب پھر یہی مناظر سامنے آنے لگے ہیں، بڑے دکھ کی بات یہ ہے کہ ہمارے سیاست دانوں نے سیاست کے تالاب کو اتنا گندہ کر دیا ہے کہ اس کا تعفن پوری قومی زندگی میں رچ بس گیا ہے، بہرحال اس اختلاف و انتشار کے نتائج کیا مرتب ہوں گے ہم تمام مسلمانوں سے کہیں گے کہ اگر ہمیں اب بھی صالح و فاسق اور نیک و بد کے درمیان تمیز نہ ہوئی، کھوکھلے نعروں پر اعتماد کر لیا، صحیح افراد کو منتخب نہیں کیا تو آئندہ یہ ملک بدترین حالات سے دوچار ہوگا اور پھر کوئی توقع اس بات کی نہیں ہوگی کہ یہاں اسلامی قانون نافذ ہو سکے، اللہ تعالیٰ صحیح عقل و بصیرت نصیب فرمائے۔

اسلامی قانون کو نافذ کرنے میں ان حضرات کو دو دقتیں پیش آ رہی ہیں، اوّل یہ کہ ہمارے یہاں کا ایک مخصوص طبقہ اپنی تعلیم و تربیت کی بنا پر مغرب سے بے حد مرعوب اور احساسِ کمتری کا شکار ہے، اس غلط فہمی اور مرعوبیت کا اثر ہے کہ اسلامی حدود و تعزیرات کے بارے میں سمجھا جا رہا ہے کہ یہ عصرِ حاضر کے خلاف ہے اور دورِ حاضر کی مغربی تہذیب انہیں برداشت نہیں کر سکتی۔ اب اگر ہم اسلامی تعزیرات کو نافذ کر دیتے ہیں تو "مہذب دنیا" ہمیں رجعت پسندی اور قدامت پرستی کا طعنہ دے گی اور "غیر مہذب وحشی" کے خطاب سے نوازے گی لیکن اگر اللہ عقل دے

ذرا غور کرنے کی توفیق نصیب فرمائے تو یہ وہم دور کیا جا سکتا ہے۔

اگر یورپ و امریکہ کی عصرِ حاضر کی تاریخ کا سرسری مطالعہ کیا جائے اور تہذیب کے مدعی قوموں کے اعمال کا جائزہ لیا جائے تو ہر انصاف پسند یہ فیصلہ آسانی سے کر سکتا ہے کہ اسلامی تعزیرات کو وحشیانہ قرار دینے والی "مہذب قوموں" کے دامن پارسائی پر وحشت و بربریت اور بہیمیت اور درندگی کے کتنے دھبے ہیں؟ روس نے بخارا اور سمرقند میں مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا؟ فرانس نے الجزائر میں کیا کیا؟ امریکہ نے دوسری جنگِ عظیم میں آتشیں بمباری سے خدا تعالیٰ کی بے گناہ مخلوق کے ساتھ کیا کیا اور اب ویت نام میں کیا کر رہا ہے؟ برطانیہ نے اپنی پوری تاریخ میں ضعیف و ناتوان مخلوق کو کس بے دردی و سنگدلی سے تباہ و برباد کیا؟ کیا "مہذب قوموں" کو اور ان کی ترقی یافتہ تہذیبوں" کو شرم نہیں آتی کہ اسلام ایک مجرم کو اس کے گھناؤنے جرم کے بدلے میں معقول سزا دیتا ہے تاکہ معاشرہ اس قسم کے جرائم سے پاک ہو جائے اور خدا تعالیٰ کی مخلوق آرام و راحت کی نیند سوئے وہ تو وحشیانہ سزا ٹھہرے اور ان کے سیاہ کارنامے اور وحشت و بربریت سے لبریز عملنامے عین تہذیب اور سراپا رحم دلی قرار پائیں، کیا تعزیرات و حدود کے سلسلے میں اسلامی سزاؤں کے بدنام کرنے میں ذرا بھی معقولیت ہے؟ اگر انصاف ہو بصیرت ہو تو یہ جو کچھ کیا جا رہا ہے اس سے بڑھ کر خیرہ چشمی اور بے حیائی کیا ہو سکتی ہے، پاکستان میں بالخصوص جو روح فرسا حالت بے اطمینانی و بد امنی کی پیدا ہو چکی ہے صحیح اسلامی سزاؤں کے بغیر اصلاح کا کوئی امکان نہیں۔

(۲) ہمارے ان حضرات کا دوسرا بہانہ یہ ہے کہ اسلامی قانون بنا بنایا موجود نہیں، مرتب کرنے میں ایک بڑا عرصہ چاہیئے لیکن غور کرنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہ محض دلفریب دھوکا ہے۔

اولاً۔ اسلامی قانون "فقہِ اسلامی" کی صورت میں مدون موجود ہے جو شخص عربی میں مہارت اور قانون سے مناسبت رکھتا ہو وہ آسانی سے ہر حادثہ کا شرعی حکم معلوم کر سکتا ہے اور اسے واقعات پر تطبیق دے سکتا ہے اور اگر ہمارے قانون دانوں کی عربی سے ناواقفیت کو عذر قرار دیا جائے تو یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ جہاں آپ ایل، ایل، بی کی شرط عائد کرتے ہیں وہاں عربی فقہ میں مہارت کو کیوں شرط قرار نہیں دیتے؟ علاوہ ازیں فقہِ اسلامی کی تمام اہم کتابوں کے تراجم اردو میں موجود ہیں، کنز الدقائق ہدایہ، شرح وقایہ، عالمگیری وغیرہ وغیرہ تمام کتابیں اردو میں منتقل

ہو گئی ہیں اور بعض اہم کتابوں کے انگریزی تراجم بھی دستیاب ہیں۔ ثانیاً۔ اگر مقصد یہ ہے کہ اسلامی دفعات پر مرتب شدہ موجودہ قوانین کے مرکز پر ہونا چاہیئے تو اس پر بھی کسی قدر کام ہو چکا ہے۔ ترکی میں سلطان عبدالحمید خان کے دور میں "المجلة العدلية" کے نام سے دفعات پر ترتیب شدہ مواد موجود ہے افغانستان میں "تمسك القضاة الامانيه" اور "تشکیلات جزا عمومی افغانستان" کے نام سے مجموعے موجود ہیں، ان کتابوں کو اردو یا انگریزی میں منتقل کرنے پر کتنا عرصہ لگے گا مختصر عرصہ میں یہ سب کام ہو سکتا ہے۔

ثالثاً۔ اگر اسلامی فقہ کسی طرح بھی ہمارے قانون دانوں کے بس کا روگ نہیں تو کم از کم اتنا ہی کر لیا جائے کہ ہر محکمہ میں ایک مستند عالمِ دین کا تقرر ہو اور اس کی رائے و اعانت سے شرعی حکم معلوم کر کے نافذ کیا جائے، بہرحال اگر خدا کا خوف ہو اور آخرت کا محاسبہ پیشِ نظر ہو اور اس ملک کو صحیح اسلامی مملکت بنانا مقصود ہو تو پھر نہ اسلامی قانون نافذ کرنا مشکل ہے نہ مرتب قانون کو اردو میں منتقل کرنا دشوار، نیت درست ہو تو سب آسان۔

ذی الحجہ ۱۳۸۹ھ، فروری ۱۹۷۰ء

فوٹو اور تصویر کی حرمت

غالباً مارچ ۱۹۷۰ء میں راقم الحروف پاکستانی مندوب کی حیثیت سے "مجمع البحوث الاسلامیہ" کی پانچویں کانفرنس میں شرکت کے لئے قاہرہ گیا تھا، کانفرنس کے اختتام پر سابق صدر جمال عبدالناصر مرحوم نے گورنمنٹ ہاؤس میں مندوبین کو ملاقات کی دعوت دی جس شاہانہ کروفر کا مظاہرہ ہوا اور جو بظاہر مصری حکومت کا خصوصی امتیاز ہے۔ یہاں اس کا ذکر مقصود نہیں، ترتیب کے مطابق ہر شخص ملاقات کے لئے جاتا، مصافحہ کرتا اور اسے کچھ کہنے کی خواہش ہوتی تو دو چار باتیں بھی کر لیتا، ملاقات اور مصافحہ کے بعد صدر مرحوم نے مندوبین کے اعزاز کے لئے فوٹو گرافروں کو حکم دیا کہ ہر مندوب کا ان کے ساتھ الگ الگ فوٹو لیا جائے۔

آج کل جلسوں، کانفرنسوں اور عام اجتماعات میں فوٹو اتارنے کا مرض وبا کی شکل اختیار کر چکا ہے، یہ فتنہ اتنا عام ہو گیا کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بچنا چاہے نہیں بچ سکتا، پھر یہ معصیت اتنی پھیل گئی ہے کہ لوگ اسے گناہ ہی نہیں سمجھتے، دورِ فتنہ نے معروف کو منکر اور منکر کو معروف بنا ڈالا، گناہوں کی گندگی سے قلب و ذہن مسخ ہو گئے اور کتنے ہی گناہ معاشرے میں ایسے رچ بس گئے کہ لوگوں کے دلوں سے گناہ کا تصور و ادراک ہی ختم ہو گیا، مصر تو فوٹو کی وبا میں ہم سے بھی چار قدم آگے ہے، مدت ہوئی وہاں کے ایک عالم شیخ محمد بخیت نے جو شیخ الازہر تھے، اس کے جواز میں رسالہ لکھ کر اس معصیت کو اور بھی عام کر دیا، اسی رسالہ سے متاثر ہو کر حضرت مولانا سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے بھی معارف میں اس کے جواز پر ایک مضمون لکھا تھا، حضرت مولانا انور شاہ رحمہ اللہ کے حکم سے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اس پر ایک تردیدی مضمون لکھا جو "القاسم" میں شائع ہوا اور بعد میں "التصویر لأحکام التصاویر" کے نام سے مستقل رسالے کی صورت میں چھپ چکا ہے، الحمد للہ حضرت سید صاحب مرحوم نے اپنے مضمون سے اور فوٹو کے جواز سے رجوع فرما لیا تھا اور صاف اعلان کر دیا تھا کہ اب میں اسے حرام سمجھتا ہوں۔

خیر عرض یہ کرنا ہے کہ صدر مرحوم کی طرف سے جب اس خواہش کی تکمیل کا اظہار ہوا تو اس عزت افزائی پر عام مندوبین خصوصاً عرب مندوبین کو بڑی خوشی ہوئی کہ جمال عبدالناصر کے ساتھ ہمارا یادگار فوٹو لیا جائے گا، ہر ایک نے باری باری صدر کی بائیں جانب کھڑے

ہو کر فوٹو کھنچوائے۔ میں کوئی اتنا صالح و متقی اور پارسا نہیں ہوں کہ ایسے مواقع میں بھی ان معصیتوں سے بچ سکوں، چنانچہ عام مجموں میں بہرحال فوٹوگرافر فوٹو لیتے رہے تھے۔ لیکن صدر کے ساتھ خصوصی فوٹو اتروانے کے لئے میری باری آنے لگی تو صف سے نکل کر اندر جا کر کرسی پر بیٹھ گیا، اتفاق سے صدر میرے سامنے تھے اور مجھے خوب دیکھ رہے تھے، جب میری باری آئی تو صدر نے دو از ہری علماء سے جو اس وقت ان کے سامنے تھے، کہا کہ جاؤ اور پاکستانی شیخ (عالم) کو بلاؤ کہ وہ آکر فوٹو کھنچوائے، الحمدللہ اس وقت میری دینی غیرت جوش میں آئی، دل نے کہا آج اپنے اکابر کے مسلک پر جمے رہو اور اس اعزاز کو ٹھکرا دو۔ آج اس حدیثِ نبوی پر عمل کرنا ضروری ہے:

‹‹ لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق	یعنی معصیت میں کسی امیر کی اطاعت جائز نہیں
إنما الطاعة فی معروف (بخاری)	امیر کی اطاعت بس جائز امور میں ہے۔

جب ان دونوں حضرات نے مجھ سے کہا:-

سیادة الرئیس یدعوك	جنابِ صدر آپ کو اپنے ساتھ فوٹو بنوانے
لأخذ الصورة معه۔	کے لئے بلاتے ہیں۔

میں نے عرض کیا:-

لا أحب ذلك ولیست للصورة	میں اسے درست نہیں سمجھتا، نہ میرے نزدیک
عندی قیمة دینیة" فلا أحبها۔	اس کی کوئی دینی قدر و قیمت ہے۔

وہ دونوں گئے اور صدر سے میرا عذر بیان کر دیا، ان کے الفاظ میں نہیں سن سکا کہ میری ترجمانی انہوں نے کس انداز میں کی، رخصت ہوتے ہوئے دوبارہ مصافحہ کا دستور نہیں تھا لیکن میں عملی معذرت کے بجائے رخصت ہونے کے لئے دوبارہ صدر کے پاس گیا اور جی میں آئی کہ آج موقع ملا ہے، پھر خدا جانے موقع ملے گا یا نہیں، اس لئے آج ان سے کلمۂ خیر کہہ دینا چاہیئے، چنانچہ میں نے مصافحہ کرتے ہوئے صدر سے کہا: "جناب صدر! اللہ تعالےٰ نے آپ کے سینے میں بڑا قوی دل رکھا ہے اور یہ ایک بڑی نعمت ہے جو آپ کو عنایت ہوئی، میری آرزو اور خواہش یہ ہے کہ اس قوی دل کا قوی تعلق اس قوی ذات سے ہونا چاہیئے جو تمام طاقتوں کا سرچشمہ ہے اور تمام قوتیں جس کے قبضۂ قدرت میں ہیں،" میرے عربی الفاظ یہ تھے:-

"سیادۃ الرئیس! إن اللہ سبحانہ وتعالٰی قد منحك قلباً قویاً بین حنایا ضلوعك فأرجو أن یکون لھذا القلب القوی رابطۃٌ قویۃٌ مع الخالق القوی الذی بیدہ ملکوت کل شیءٍ۔"

صدر نے مسکراتے ہوئے میرا جملہ غور سے سنا اور قدرے زور سے مصافحہ کرتے ہوئے ہاتھ کو ذرا جھٹکا دیا جیسا کہ خوشی کے موقعہ پر ایسا کیا جاتا ہے، یہ صدرِ مرحوم سے میری آخری ملاقات تھی جو اس نصیحت پر ختم ہوئی۔

عجیب اتفاق ہے کہ اس سے ایک سال قبل میں نے خواب دیکھا تھا، خواب طویل تھا، اس میں میں جمال عبدالناصر سے کہہ رہا تھا کہ اگر آپ نے ایسا کیا اور ایسا کیا تکون أجمل الناس و أکمل الناس تو آپ سب لوگوں سے خوب تر اور کامل تر ہو جائیں گے، بظاہر اس خواب کی تعبیر پوری ہو گئی۔

مسلمانوں اور عالمِ اسلام کی غلامانہ ذہنیت

بحمد اللہ ہمیں نہ امراء و وزراء سے ملاقات کا شوق، نہ یہ داستان لذیذ و مرغوب، در اصل اس وقت میرے بصائر و عبر کا موضوع مندرجہ بالا فقرہ ہے اس سے قبل جو کچھ لکھا گیا وہ اس کی تمہید تھی، جی چاہا کہ یہ نصیحت جو ایک خاص موقعہ پر ایک خاص شخص کو کی گئی تھی پیغامِ عام کی شکل میں ہر عام و خاص کے گوش گذار کر دی جائے۔

عالمِ اسلام اور اسلامی ممالک ایک عرصہ سے زبوں حالی و پسماندگی اور زوال و اضمحلال کا شکار ہیں، مسائل پر مسائل پیدا ہوتے چلے آتے ہیں اور ہمارے اربابِ اقتدار اور سربراہانِ مملکت ہر نئے مسئلہ پر دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے سامنے کشکولِ گدائی لے کر حاضر ہو جاتے ہیں ان کی ظاہری شان و شوکت، ان کے سرمایۂ و دولت، ان کی فوجی و عسکری طاقت، ان کی مادی و سائنسی برتری، ان کی سیاسی قیادت اور حربی سیادت سے عالم اسلام اتنا مرعوب ہے جس کی حد نہیں، ہمارے حکمرانوں میں مرعوبیت اور احساسِ کہتری کا عارضہ وبائی صورت اختیار کر چکا ہے کہنا چاہیے کہ جو جتنے بڑے عہدے اور منصب پر فائز ہے اور جس کی جتنی ذمہ داریاں زیادہ ہیں وہ اتنا ہی احساسِ مرعوبیت کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے، آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ہم ترقی یافتہ

قوموں کے بغیر بھی حکومت کر سکتے ہیں اور یہ سوچا تک نہیں جا سکتا کہ ان کی دوستی کے بغیر بھی ہمارا نظامِ حکومت چل سکتا ہے، اسلامی ممالک جو پسماندہ اور ترقی پذیر ہیں، محض عالمی طاقتوں کے رحم وکرم پر جینے کے عادی ہو گئے، کروڑوں روپے کے مصارف سے اعلیٰ پیمانے پر سفارت خانوں کا تکلف کیا جاتا ہے، لاکھوں کے خرچ سے امراء و وزراء کے دورے ہوتے ہیں، وفد پر وفد بھیجے جاتے ہیں، ان طاغوتی قوتوں کے سربراہوں اور نمائندوں کو تشریف آوری کی دعوتیں دی جاتی ہیں، اس پر بڑی فراخدلی سے قومی سرمایہ صرف کیا جاتا ہے اور ان کی قدم رنجہ فرمائی کو مایۂ افتخار سمجھا جاتا ہے، یہ سارے پاپڑ اس لئے بیلے جاتے ہیں کہ یہ عالمی طاقتیں ہم سے خوش رہیں ان سے دوستانہ روابط قائم رہیں اور آڑے وقت میں ان سے مدد طلب کی جا سکے، گویا عالمِ اسلام اور اس کے سربراہوں کے نزدیک بطور اصولِ موضوعہ یہ بات طے ہو چکی ہے کہ امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس اور چین کی نظرِ عنایت جب تک ہمارے شاملِ حال نہ ہو نہ ہم عزت وآبرو سے زندہ رہ سکتے ہیں، نہ اپنے مسائل حل کر سکتے ہیں، نہ ترقی کر سکتے ہیں إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

اگر یہ دوستی برابر کی دوستی کی حد تک رہتی تو بھی ایک بات تھی، آفت تو یہ ہے کہ ہم خود اعتمادی کے وصف سے یکسر محروم ہو کر نہایت گھٹیا قسم کی مقلدانہ روش بلکہ مجھے تلخ نوائی پر معاف رکھا جائے تو عرض کروں کہ ہم غلامانہ ذہنیت میں مبتلا ہیں، گویا ہمارے پاس نظری و فکری سرمایہ کچھ نہیں، ہم بات بات میں ان کی تقلید کرتے ہیں بات بات پر ان کے حوالے دیتے ہیں اور زندگی کے ایک ایک خدوخال کو ان کے نقشوں پر ڈھالنا چاہتے ہیں، قانون ہو تو ان کا، تہذیب ہو تو ان کی، معاشرہ ہو تو ان کا سا، بول چال اور لب ولہجہ ہو تو ان جیسا، نشست وبرخاست ہو تو ان کے طرز پر، خورد ونوش ہو تو ان کے ڈھب کی، لباس کی تراش خراش ہو تو ان سے پوچھ کر، سیاست ہو تو ان سے سیکھ کر، معیشت ہو تو ان سے مانگ کر، الغرض زندگی کا وہ کون سا شعبہ ہے جس میں ہماری غلامانہ ذہنیت اور اندھی تقلید کارفرما نہیں؟

اپنے گھر میں خدا کا دیا سب کچھ ہے مگر عالمِ اسلام کی حرص وآز اور جبلتِ گداگری کا کیا کیا جائے کہ ان بددین، بے خدا اور بے تہذیب قوموں سے امداد پر امداد اور قرض پر قرض لے کر عالمِ اسلام مفلوج ہو کر رہ گیا ہے، وہ بار بار ہمیں اپنے دروازوں سے دھتکارتے ہیں اور

موقعہ بے موقعہ امداد اور قرض بند کر دینے کا اعلان کرتے ہیں لیکن ہم ہیں کہ اس کے باوجود بھی "صدائے فقیرانہ" لگانا ضروری سمجھتے ہیں اور اگر ایک دروازے سے دھکا مل جائے تو دوسرے دروازے پر حاضر ہو جاتے ہیں، کیونکہ اصول یہ طے ہو گیا ہے کہ ترقی پذیر قومیں ترقی یافتہ قوموں کی خیرات کے بغیر شاہراہِ ترقی پر گامزن نہیں ہو سکتیں، مگر یہ اصول طے کرتے وقت ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ قومیں جو آج ترقی یافتہ کہلاتی ہیں یہ کس کی خیرات پر پل کر ترقی یافتہ ہوئیں اور کس سے قرضے لے کر انہوں نے اپنے ترقیاتی منصوبے پایۂ تکمیل تک پہنچائے، نہ ہمیں یہ بات یاد رہتی ہے کہ جب ہم زندہ قوم تھے کس سے امداد لے کر ہم نے اقوامِ عالم کو فتح کیا تھا، اسی طرزِ فکر اور طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ آج پورا عالمِ اسلامی دولت کی ریل پیل کے باوجود معاشی بحران کا شکار ہے، ہمارے کارخانۂ معیشت کے بٹن پر ان طاغوتی طاقتوں کا ہاتھ ہے، وہ جب چاہتے ہیں اس بٹن کو دبا دیتے ہیں اور ہماری معیشت کا پہیہ وہیں جام ہو کر رہ جاتا ہے۔

اقوامِ متحدہ اور عالمِ اسلام

سیاسی محاذ پر بھی ہم انہی طاغوتوں کے ہاتھ کا کھلونا ہیں بات بات پر جمعیت الاقوام (اقوام متحدہ) کا دروازہ کھٹکھٹانا فرض سمجھتے ہیں، ہند و پاک کا جھگڑا ہو یا بحرین و خلیج کا، فلسطین کا مسئلہ ہو یا قبرص کا، بیت المقدس کا المیہ ہو یا نہرِ سویز کا، کشمیر کا تنازعہ ہو یا اسرائیل کا، ہر مسئلہ میں ہماری کامیاب سیاست یہ ہے کہ ہم اس کی رپٹ اقوامِ متحدہ کے تھانے میں درج کرائیں، اگر ان ترقی یافتہ قوموں میں اپنے مفادات سے ہٹ کر خالص انسانی بنیادوں پر عالمی مسائل حل کرنے کا جذبہ ہوتا تب بھی ہمارے اس "سیاسی کارنامہ" کے لئے کوئی وجہ جواز ہوتی مگر بار بار کے تجربوں نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ منافق جن کو مادی ترقی نے اقوامِ عالم کا چودھری بنا دیا ہے اور یہ کفن چور جنہوں نے مظلوم اور پسماندہ قوموں کے کفن چھین چھین کر اپنی معیشت کا جامہ تیار کیا ہے انہوں نے اپنے مفاد سے ہٹ کر کسی مظلوم کی آہ و بکا اور کسی ناتوان نیم بسمل کی سسکیوں پر کبھی کان نہیں دھرا بلکہ کمزور مظلوم کے مقابلہ میں انہوں نے ہمیشہ طاقت ور ظالم کو تھپکی دی ہے مسلمانوں کو آپس میں لڑانا اور عالمِ اسلام میں نفرت و بیزاری کے کانٹے بونا ان شیاطین کا

مستقل وطیرہ ہے، اقوامِ متحدہ کا ادارہ جب سے وجود میں آیا ہے اس نے عالمِ اسلام کے ایک بھی مسئلہ کو حل نہیں کیا بلکہ اس میں نئی گرہوں کا اضافہ کیا ہے اقوامِ متحدہ میں جو مسئلہ گیا وہ ہمیشہ کے لئے ایسا الجھا کہ ناخنِ تدبیر اسے سلجھانے سے ہمیشہ کے لئے قاصر رہے۔

ان تمام حقائق و تجربات کے بعد بھی ہم سیٹو، سنٹو، دولتِ مشترکہ اور اقوامِ متحدہ سے چمٹے رہنے کو ضروری سمجھتے ہیں، خدا معلوم وہ کون سا سحرِ سامری ہے جس سے دیکھنے سننے اور سوچنے کی صلاحیتیں جاتی رہیں، گویا عقلیں مسخ ہیں اور آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہیں، حدیث میں تو آتا ہے کہ:

«لا یُلدغ المؤمن من جحر واحد مرتین» (متفق علیہ)	مومن ایک ہی سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔

لیکن آج ہم دعوئ ایمان کے باوجود اس سوراخ سے بار بار ڈسے جانے کی مشق کر رہے ہیں، قرآنِ کریم کی یہ آیات گویا آج کی صورتِ حال کے بارے میں نازل ہوئی ہیں:

«یا أیها الذین آمنوا لا تتخذوا بطانة من دونکم لا یألونکم خبالاً، ودوا ما عنتم، قد بدت البغضاء من أفواههم وما تخفی صدورهم أکبر، قد بینا لکم الآیات إن کنتم تعقلون» (آل عمران: آیت ۱۱۸)	اے ایمان والو! اپنے سوا کسی کو صاحبِ خصوصیت مت بناؤ، وہ لوگ تمہارے ساتھ فساد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے، تمہاری مضرت کی تمنا رکھتے ہیں، واقعی بغض ان کے منہ سے ظاہر ہو پڑتا ہے اور جس قدر ان کے دلوں میں ہے وہ تو بہت کچھ ہے ہم علامات تمہارے سامنے ظاہر کر چکے اگر تم عقل رکھتے ہو (ترجمہ حضرت تھانویؒ)
«کیف وإن یظهروا علیکم لا یرقبوا فیکم إلاً ولا ذمة یرضونکم بأفواههم وتأبی قلوبهم وأکثرهم فاسقون» (التوبہ: آیت ۸)	کیسے؟ حالانکہ ان کی یہ حالت ہے کہ اگر وہ کہیں تم پر غلبہ پا ئیں تو تمہارے بارے میں نہ قرابت کا پاس کریں اور نہ قول و قرار کا، یہ لوگ تم کو اپنی زبانی باتوں سے راضی کر رہے ہیں اور ان کے دل نہیں مانتے اور ان میں زیادہ آدمی شریر ہیں (ترجمہ حکیم الامت تھانویؒ)

اس قسم کی بیسیوں آیات ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا کسی کافر پر اعتماد کرنا ان کی پہلی غلطی ہے۔

موقعہ بے موقعہ امداد اور قرض بند کر دینے کا اعلان کرتے ہیں لیکن ہم ہیں کہ اس کے باوجود بھی "صدائے فقیرانہ" لگانا ضروری سمجھتے ہیں اور اگر ایک دروازے سے دھکا مل جائے تو دوسرے دروازے پر حاضر ہو جاتے ہیں، کیونکہ اصول یہ طے ہو گیا ہے کہ ترقی پذیر قومیں ترقی یافتہ قوموں کی خیرات کے بغیر شاہراہِ ترقی پر گامزن نہیں ہو سکتیں، مگر یہ اصول طے کرتے وقت ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ قومیں جو آج ترقی یافتہ کہلاتی ہیں یہ کس کی خیرات پر پل کر ترقی یافتہ ہوئیں اور کس سے قرضے لے کر انہوں نے اپنے ترقیاتی منصوبے پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ نہ ہمیں یہ بات یاد رہتی ہے کہ جب ہم زندہ قوم تھے کس سے امداد لے کر ہم نے اقوامِ عالم کو فتح کیا تھا، اسی طرزِ فکر اور طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ آج پورا عالمِ اسلامی دولت کی ریل پیل کے باوجود معاشی بحران کا شکار ہے، ہمارے کارخانۂ معیشت کے بٹن پر ان طاغوتی طاقتوں کا ہاتھ ہے، وہ جب چاہتے ہیں اس بٹن کو دبا دیتے ہیں اور ہماری معیشت کا پہیہ وہیں جام ہو کر رہ جاتا ہے۔

اقوامِ متحدہ اور عالمِ اسلام

سیاسی محاذ پر بھی ہم انہی طاغوتوں کے ہاتھ کا کھلونا ہیں بات بات پر جمعیت الاقوام (اقوامِ متحدہ) کا دروازہ کھٹکھٹانا فرض سمجھتے ہیں، ہند و پاک کا جھگڑا ہو یا بحرین و خلیج کا، فلسطین کا مسئلہ ہو یا قبرص کا، بیت المقدس کا المیہ ہو یا نہرِ سویز کا، کشمیر کا تنازعہ ہو یا اسرائیل کا ہر مسئلہ میں ہماری کامیاب سیاست یہ ہے کہ ہم اس کی رپٹ اقوامِ متحدہ کے تھانے میں درج کرائیں، اگر ان ترقی یافتہ قوموں میں اپنے مفادات سے ہٹ کر خالص انسانی بنیادوں پر عالمی مسائل حل کرنے کا جذبہ ہوتا تب بھی ہمارے اس "سیاسی کارنامہ" کے لئے کوئی وجہِ جواز ہوتی مگر بار بار کے تجربوں نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ منافق جن کو مادی ترقی نے اقوامِ عالم کا چودھری بنا دیا ہے اور یہ کفن چور جنہوں نے مظلوم اور پسماندہ قوموں کے کفن چھین چھین کر اپنی معیشت کا جامہ تیار کیا ہے انہوں نے اپنے مفاد سے ہٹ کر کسی مظلوم کی آہ و بکا اور کسی ناتوان نیم بسمل کی سسکیوں پر کبھی کان نہیں دھرا بلکہ کمزور مظلوم کے مقابلہ میں انہوں نے ہمیشہ طاقت ور ظالم کو تھپکی دی ہے مسلمانوں کو آپس میں لڑانا اور عالمِ اسلام میں نفرت و بیزاری کے کانٹے بونا ان شیاطین کا

مستقل وطیرہ ہے، اقوامِ متحدہ کا ادارہ جب سے وجود میں آیا ہے اس نے عالمِ اسلام کے ایک بھی مسئلہ کو حل نہیں کیا بلکہ اس میں نئی گرہوں کا اضافہ کیا ہے اقوامِ متحدہ میں جو مسئلہ گیا وہ ہمیشہ کے لئے ایسا الجھا کہ ناخنِ تدبیر اسے سلجھانے سے ہمیشہ کے لئے قاصر رہی ہے۔

ان تمام حقائق وتجربات کے بعد بھی ہم سیٹو، سنٹو، دولتِ مشترکہ اور اقوامِ متحدہ سے چمٹے رہنے کو ضروری سمجھتے ہیں، خدا معلوم وہ کون سا سحرِ سامری ہے جس سے دیکھنے سننے اور سوچنے کی صلاحیتیں جاتی رہیں، گویا عقلیں مسخ ہیں اور آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہیں، حدیث میں تو آتا ہے کہ:

«لا یُلدغ المؤمن من جحر واحد مرتین» (متفق علیہ)

مومن ایک ہی سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔

لیکن آج ہم دعوئ ایمان کے باوجود اس سوراخ سے بار بار ڈسے جانے کی مشق کر رہے ہیں، قرآنِ کریم کی یہ آیات گویا آج کی صورتِ حال کے بارے میں نازل ہوئی ہیں:

«یا أیھا الذین آمنوا لا تتخذوا بطانۃ من دونکم لا یألونکم خبالاً، ودوا ما عنتم، قد بدت البغضاء من أفواھھم وما تخفی صدورھم أکبر، قد بینا لکم الآیات إن کنتم تعقلون» (آل عمران: آیت ۱۱۸)

اے ایمان والو! اپنے سوا کسی کو صاحبِ خصوصیت مت بناؤ، وہ لوگ تمہارے ساتھ فساد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے، تمہاری مضرت کی تمنا رکھتے ہیں، واقعی بغض ان کے منہ سے ظاہر ہو پڑتا ہے اور جس قدر ان کے دلوں میں ہے وہ تو بہت کچھ ہے ہم علامات تمہارے سامنے ظاہر کر چکے اگر تم عقل رکھتے ہو (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

«کیف وإن یظھروا علیکم لا یرقبوا فیکم إلاً ولا ذمۃ یرضونکم بأفواھھم وتأبٰی قلوبھم وأکثرھم فاسقون» (التوبہ: آیت ۸)

کیسے؟ حالانکہ ان کی یہ حالت ہے کہ اگر وہ کہیں تم پر غلبہ پائیں تو تمہارے بارے میں نہ قرابت کا پاس کریں اور نہ قول وقرار کا، یہ لوگ تم کو اپنی زبانی باتوں سے راضی کر رہے ہیں اور ان کے دل نہیں مانتے اور ان میں زیادہ آدمی شریر ہیں (ترجمہ حکیم الامت تھانویؒ)

اس قسم کی بیسیوں آیات ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا کسی کافر پر اعتماد کرنا ان کی پہلی غلطی ہے۔

عالمِ اسلام اور مسلم سربراہوں کو کس پر اعتماد کرنا چاہیئے۔

الغرض عالمِ اسلام اور اس کے سربراہوں پر زبوں حالی، سراسیمگی اور احساس کمتری کی جو فضا مسلط ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہیں نے صدر ناصر مرحوم سے وہ جملہ کہا تھا کہ جن سہاروں کے بھروسے ہم آج تک جی رہے تھے وہ نہایت بودے، نکمے اور ناکارہ ثابت ہوئے، آج عالمِ اسلام کو خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر انگڑائی لینے کی ضرورت ہے، آج وقت کی پکار عالمِ اسلام سے ایک انقلاب کا مطالبہ کر رہی ہے، یقین و ایمان کا انقلاب! تعلق مع اللہ کا انقلاب! ترقی یافتہ طاغوتوں کے لات و منات کو توڑ پھینکنے کا انقلاب! آج ضرورت ہے کہ عالمِ اسلام کے سربراہ اپنے قلب و ذہن، سیرت و کردار، اخلاق و اعمال، فکر و نظر، جذبات و احساسات اور تدبیر و سیاست کا رُخِ قبلہ مغرب سے بدل کر پیغامِ نبوت کی طرف پھیریں، طاغوتی قوتوں سے کٹ کر ایک اللہ تعالیٰ کی ذات سے دلوں کا تعلق پیدا کریں، کعبۂ دل سے تین سو ساٹھ بتوں کو ہٹا کر توحید کے انوار و تجلیات سے منور کریں، یورپ کی تقلیدی سیاست چھوڑ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفائے راشدینؓ سے سیاست و حکمرانی کا سبق سیکھیں۔

اصلی و حقیقی ایمان و یقین

کاش ہمیں کلمۂ اسلام لا اِلٰہَ الا اللہ محمد رسول اللہ کا صحیح یقین نصیب ہو جائے یعنی پوری کی پوری کائنات کا معبود اور خالق و مالک صرف ایک اللہ ہے، ہر چیز میں صرف اسی کی مشیت کارفرما ہے، آسمان و زمین کی ایک ایک چیز اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے، کائنات کا ذرہ ذرہ اسی کا تابعِ فرمان ہے، اسی کے چاہنے سے سب کچھ ہوتا ہے وہ نہ چاہے تو کچھ نہیں ہوتا، عزت و ذلت، فتح و شکست، صحت و رزق اور قوت و ناتوانائی اسی کے قبضے میں ہے۔

اور یہ کرامتِ مسلمہ کی نجات صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ہے، آپؐ ہی کا یقین، آپؐ ہی کا عزم، آپؐ ہی کا عمل، آپ ہی کی سیرت اور آپ ہی کا پیغام ہمارے لئے فلاح و کامرانی کا ذریعہ ہے، فماذا بعد الحق إلا الضلال؟ کائنات کی ساری طاقتیں ہمارے ساتھ ہوں مگر خدا ہمارے ساتھ نہ ہو تو ہم ذلیل ہو کر رہیں گے اور کائنات کی ہر طاقت ہمارے خلاف ہو مگر خدا سے ہمارا تعلق صحیح ہو تو بھری دنیا ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، ہم رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے نقش قدم پر ہوں تو دریا ہمیں راستہ دے سکتے ہیں، جنگل کے شیر ہماری راہنمائی کر سکتے ہیں، ہوا کی لہریں ہماری آواز ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچا سکتی ہیں۔ ہماری تاریخ میں اس کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔

عالم اسلام کی کمزوری کا سبب

یہ طاغوتی طاقتیں جو آج ہم پر مسلط ہیں اور عالم اسلام کی نکیل جدھر چاہتی ہیں موڑ دیتی ہیں یہ صرف اس لئے طاقت ور ہیں کہ ہم کمزور ہیں اور ہم اس لئے کمزور ہیں کہ ہمارا اعتماد خالقِ کائنات کو چھوڑ کر ناکارہ اور کمزور مخلوق پر رہ گیا ہے، بخدا! اگر اس قوی ذات سے ہمارا تعلق قوی ہو تو ہم آج بھی امریکہ و روس کا غرور قیصر و کسریٰ کی طرح خاک میں ملا سکتے ہیں۔ ان کے ایٹم، ان کی سائنسی ترقی اور ان کے تمدّنی کرّ و فر کی ساری عمارت آج بھی پیوندِ زمین ہو سکتی ہے، مگر اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم خدا تعالےٰ کی خاطر اپنی خواہشات ترک کر دیں، اس کے احکام پر اخلاص کے ساتھ عمل کرنے کا عہد و پیمان کریں اور اس کی رضا کے مقابلہ میں کسی کی رضامندی و ناراضگی کی پروا نہ کریں۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہٗ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں خط لکھا کہ مجھے کوئی وصیت لکھ بھیجئے مگر زیادہ طویل نہ ہو، جواب میں حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے لکھا:۔

سلام علیك! أما بعد: فإنی سمعت رسول الله صلى الله علیه وسلم یقول: «من التمس رضى الله بسخط الناس کفاه الله مؤنة الناس ومن التمس رضى الناس بسخط الله وکله الله إلى الناس» والسلام (ترمذی)

(السلام علیکم! اما بعد: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، فرماتے تھے کہ جو شخص لوگوں کو ناراض کر کے اللہ کی رضامندی ڈھونڈتا ہے اللہ تعالےٰ لوگوں کے شر سے اس کی خود کفایت فرماتے ہیں اور جو شخص اللہ تعالےٰ کو ناراض کر کے انسانوں کی رضامندی چاہتا ہے اللہ تعالےٰ اسے انسانوں کے سپرد کر دیتے ہیں (اور ان ہی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں)

الغرض اگر مسلمانوں کا ایمان پختہ اور مضبوط ہو، حق تعالےٰ سے ان کا تعلق صحیح ہو، اس کی

ذات پر کامل بھروسہ اور یقین ہو، طاغوتی طاقتوں سے بیزار ہو کر وہ اپنے وسائل پر انحصار کریں اور کلمۂ اسلام کی سربلندی کے لئے ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہو جائیں تو حق تعالےٰ کا وعدہ یقیناً پورا ہوگا، ارشاد ہے :۔

((وکان حقاً علینا نصر المؤمنین)) "اور ہمارے ذمہ ہے مومنوں کی مدد کرنا"

((وأنتم الأعلون إن کنتم مؤمنین)) "اور تم ہی اونچے رہو گے بشرطیکہ تم مومن ہو"

((وما النصر إلا من عند الله العزیز الحکیم)) "اور مدد تو صرف اللہ عزیز و حکیم کے پاس سے ملتی ہے"

اگر مسلمان ان ارشاداتِ ربانی کو سینے سے لگائیں، فسق و فجور کی متعفن زندگی چھوڑ کر توبہ و انابت کا راستہ اختیار کریں تو حق تعالےٰ کی رحمتیں نازل ہوں گی اور راحت و سکون اور عزت و سربلندی کی بھی نعمتیں نصیب ہوں گی جن کا ظہور قرونِ اولیٰ میں ہو چکا ہے، حق سبحانہ و تعالےٰ ہمارے قلوب کی اصلاح فرمائیں، عالمِ اسلام کی حفاظت فرمائیں اور اسلام کے تمام بدخواہوں کو ذلیل و خوار کریں۔

وصلی الله تعالےٰ علیٰ صفوة البریة محمد وآله وصحبه وأتباعهم أجمعین - آمین

ربیع الثانی ۱۳۹۱ھ

محبتِ رسولؐ کا تقاضہ

بد قسمتی سے ہم ایک ایسے دور سے گذر رہے ہیں کہ ہر نیا آفتاب ایک نئی آفت لے کر طلوع ہوتا ہے اور ہر رات فتنہ، و فساد اور ظلم و عدوان کی نئی تاریکی چھوڑ کر جاتی ہے، دن بدن انسانی قدریں پامال ہو رہی ہیں، دینی شعائر مٹ رہے ہیں، دل و دماغ مسخ ہو رہے ہیں، جہل و عناد کی اس تاریک فضا میں دینی حقائق کو اجاگر کرنا اور دین کی بالکل واضح، بدیہی اور موٹی موٹی باتوں کا سمجھنا بھی بے حد مشکل ہو چکا ہے، جب بدی نیکی کا روپ دھار لے، جب صریح منکر کو "معروف" کا نام دیا جائے؛ جب سراپا جہل کو علم سمجھا جانے لگے اور جب بے حیائی اور بے حمیتی کو شرافت و اخلاق کی سند مل جائے تو کون سمجھا سکتا ہے کہ یہ بات جسے تم دین سمجھ رہے ہو بے دینی ہے اور جسے تم شرف و وقار سمجھتے ہو وہ ننگِ انسانیت ہے یوں تو دنیا میں حق و باطل کو گڈمڈ کرنے کی رسم بہت قدیم زمانے سے چلی آتی ہے اور حقائق اکثر ملتبس رہتے ہیں لیکن اب تو عقلوں پر ایسا پردہ پڑا ہے کہ کسی صحیح بات کا انکشاف ہی نہیں ہوتا بلکہ باطلِ محض کو حق کے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے، شعائرِ کفر کو اسلامی شان و شوکت کا ذریعہ بتایا جاتا ہے، فسق و فواحش کو تقویٰ خیال کیا جاتا ہے، آج کتنی چیزیں ایسی ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین اور دینِ اسلام کی تذلیل ہوتی ہے مگر بد فہمی کا یہ عالم ہے کہ انہی کو دینِ اسلام کے احترام کا ذریعہ بتایا جاتا ہے، جن چیزوں کو کل تک اعدائے اسلام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض و نفرت کے اظہار کے لئے استعمال کرتے تھے، آج انہی چیزوں کو اسلام کے نادان دوست اسلام سے عقیدت کا مظاہرہ کرنے کے لئے اپناتے ہیں، ذہن و قلب کے مسخ ہو جانے کا قبیح منظر اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے؟

در اصل جب کسی قوم کے اندر سے دین کی حقیقی روح نکل جاتی ہے اور صرف نمائشی ڈراموں پر اس کا مدار رہ جاتا ہے تو گھٹیا قسم کے پست اور سطحی مظاہر اس کے فکر و عمل کا محور بن جاتے ہیں لایعنی حرکات کو حقیقی دین سمجھا جاتا ہے، فواحش و منکرات کو دینی قدروں کا نام دیا جاتا ہے، سنت کی جگہ من گھڑت بدعات سے تسکین حاصل کی جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت کا تقاضا تو یہ تھا کہ مسلمانوں کا ظاہر و باطن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت سے سرشار ہوتا، قدم قدم پر آپؐ کی پیروی ہوتی، آپؐ کے ایک ایک طریقے کو اپنانے کا ولولہ ہوتا، صورت و سیرت اور ظاہر و باطن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی جھلک نظر آتی، آپ کی ایک ایک سنت کو زندہ کرنے اور ایک ایک حکم کو ہر شعبۂ زندگی میں نافذ کرنے کی تڑپ ہوتی لیکن جب قلوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت سے خالی ہوگئے، ایمان و یقین کے چراغ دلوں سے گل ہوگئے، آپؐ کے اخلاق و اعمال کی پیروی کا جذبہ یکسر ختم ہو کر رہ گیا تو محبتِ رسولؐ کے صحیح تقاضوں کی جگہ سطحی مظاہر کو عینِ دین و ایمان سمجھ لیا گیا، توہین و تذلیل کو اکرام و احترام اور دشمنی اور عداوت کو اظہارِ محبت تصور کر لیا گیا، واحسرتاہ

غیر مسلموں کی نقالی اور مسلمان

کسی قوم کی دینی حس کے ماؤف ہو جانے کا جو نقشہ اوپر پیش کیا گیا اس کا سب سے پہلا مظاہرہ عیسائیوں اور یہودیوں کے یہاں ہمیں ملتا ہے، جب وہ اپنی بدبختی سے اپنے نبی کی تعلیمات کو یکسر فراموش کر بیٹھے تو انہیں دین کے مردہ ڈھانچے کو محفوظ رکھنے کے لئے نمائشی تصویروں کا سہارا لینا پڑا، چنانچہ عیسائیوں میں حضرت عیسٰی، حضرت مریم اور دیگر اکابر کی فرضی تصویریں بنائی گئیں اور ان کی پرستش کو جزوِ دین و ایمان بنا لیا گیا، بعد ازاں اس محرف مسیحیت کی ترویج و اشاعت کے لئے مصنوعی ڈرامے تیار کئے گئے اور ان کی فلموں کی نمائش کی گئی، مصر کے چند اشخاص نے سوچا کہ ہم عیسائیوں کی نقالی میں کیوں پیچھے رہیں انہوں نے اس کے مقابلہ میں جامع ازہر کی مجلسِ اعلیٰ کے بعض ارکان کی سرپرستی میں "فجرِ اسلام" کے نام سے ایک فلم تیار کی اور عرب اسلامی ممالک میں اس کا خوب چرچا ہوا، بیس، بائیس ممالک میں اس کی نمائش ہو چکی ہے اور اب وہ سرزمینِ پاک کو ناپاک کرنے کے لئے کراچی پہنچ گئی ہے، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعہ اس کی ایسی تشہیر کی گئی گویا مسلمانوں کو تجدیدِ ایمان کے اہم ذریعہ کا انکشاف ہوا ہے، اخبارات کے مطابق یہاں کے بعض نام نہاد علمائے دین

نے بھی اس کی شرعی منظوری دے دی ہے اور اب فرزندانِ اسلام اسکرین کے پردے پر "اسلام کا تماشہ" دیکھنے کے لئے جوق در جوق تشریف لارہے ہیں، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

بسے نادیدنی را دیدہ ام من

مرا اے کاشکے مادر نزادے

تصویر سازی اور اسلام

کون نہیں جانتا کہ اسلام کی نظر میں تصویر سازی نہ صرف قبیح اور حرام ہے بلکہ لعنت اور غضبِ خداوندی کی مستوجب ہے، تصویر بنانے والے کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ((المصورون أشد الناس عذاباً یوم القیامۃ)) یعنی وہ قیامت کے دن سب سے سخت تر اور بد ترین عذاب میں مبتلا ہوں گے جس مکان میں تصویریں ہوں، اس پر خدا کی لعنت آئی ہے، فرشتوں کو تصویروں سے بھی اسی طرح نفرت آئی ہے جس طرح کتے سے نفرت ہے، کیا ان وعیدوں کے ہوتے ہوئے کسی فلم کو جائز کہا جاسکتا ہے؟ کیا فلموں کی ترویج وتشہیر پوری قوم پر خدا کے غضب ولعنت کو دعوت دینے کے مترادف نہیں؟

پھر اس سے بڑھ کر جسارت کیا ہوسکتی ہے کہ عہدِ نبوت اور عہدِ اسلام کی پاک اور روحانی زندگیوں کو تصویروں کے ذریعہ فلمایا جائے؟ کتنا بڑا ظلم ہے کہ جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت قرار دیا ہو آپؐ کے پاکیزہ دور کو اس لعنت میں ملوث کیا جائے؟ کیا اللہ ورسولؐ کے نزدیک یہ ناپاک جسارت قابلِ برداشت ہوسکتی ہے؟ کیا مسلمانوں میں اتنی ایمانی حس بھی باقی نہیں رہی کہ وہ کم از کم نبوت کے پاکیزہ دور کو اس نجاست سے محفوظ رکھتے؟۔

مزید برآں یہ کہ یہاں صورت یہ نہیں کہ جو واقعات پیش آئے ہو بہو انہی کا عکس لے لیا گیا ہو بلکہ یہاں جو صحیح صورتِ حال ہے وہ یہ ہے کہ دورِ نبوت کے واقعات کا مصنوعی سوانگ بنایا گیا ہے۔ کچھ بہروپیوں نے خاکم بدہن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پارٹ ادا کیا، کسی نے صحابہ وصحابیات کے مقدس اشخاص کا، کسی نے ابوجہل وابولہب وغیرہ کافروں کا۔ پھر ان مصنوعی ڈراموں کی عکس بندی کرکے فلم تیار کی گئی اور اسے پردۂ اسکرین پر لایا گیا، اب اگر

کسی مسلمان میں ایمان کی کوئی رمق اور غیرت کی ادنیٰ حس موجود ہو گیا وہ ایک لمحہ کے لئے برداشت کرے گا کہ وہ لوگ جن کا وجود ہی گندگی اور بے حیائی کا نشان ہے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپؐ کے مقدس صحابہ و صحابیات کی شبیہ بنا کر پیش کیا جائے اور ان کے ادا کردہ پارٹ کو ان مقدس ہستیوں سے منسوب کیا جائے؟ اس سے بڑھ کر ان حضرات کی تذلیل و توہین کیا ہو سکتی ہے پھر جن لوگوں نے ابوجہل و ابولہب وغیرہ کافروں کا کردار ادا کرتے ہوئے ان کی کافرانہ حرکات کی نقل کی ہو گی اور صحابہ و صحابیات کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا ہو گا کیا وہ مسلمان بھی رہیں گے؟ اور ان کے وہ تماشائی جو اس تماشۂ کفر کو تفریحِ طبع کا سامان کرتے ہیں ان کا اسلام محفوظ رہ جائے گا؟ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان ڈراموں میں بہت سی حرکات و سکنات اور بہت سے الفاظ و کلمات ایسے آئیں گے جن کو حقیقت کے ساتھ دور کا واسطہ بھی نہیں ہو گا، اس صورت میں ان مصنوعی واقعات کو حقیقی قرار دینا بدترین قسم کا جھوٹ اور افتراء ہو گا، جس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ((من کذب علیَّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار)) کہ جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانا دوزخ بنالے۔

امریکی اور مغربی اخبارات و رسائل میں جب کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فرضی تصاویر شائع ہوتی ہیں آئے دن ہمارے اخبارات میں ان پر احتجاج ہوتا رہتا ہے اور مسلمانوں میں ایک کہرام مچ جاتا ہے کیا اس قسم کی فلموں کے بعد مسلمانوں میں یہ حمیت باقی رہے گی کہ وہ اعدائے اسلام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں؟ جب مسلمان خود دورِ نبوت کی فلمیں بنانے سے نہیں شرماتے تو وہ کس منہ سے غیروں کو روکنے کی جرأت کریں گے؟ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ کچھ عرصہ بعد اعدائے اسلام نہ صرف ان مقدس ہستیوں کی فرضی تصویریں کھلے بندوں شائع کرنے لگیں گے بلکہ آپؐ کی حیاتِ طیبہ پر محض فرضی فلمیں وجود میں آنا شروع ہوں گی اور جس طرح اب تک مستشرقین آپؐ کی سیرتِ طیبہ کو غلط رنگ میں پیش کرنے کی جسارت کرتے رہے ہیں آئندہ نہایت گھناؤنے انداز میں آپؐ کو پردۂ فلم پر دکھایا جائے گا اور یہ نام نہاد مسلمان جنہوں نے خود اس بدعت کو جنم دیا، ان کفار کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے، اب تک کافر تو میں صرف

مسلمانوں کے احترام میں اس سے ہچکچاتی رہی ہیں، مسلمانوں کو شرم آنی چاہیئے کہ جو کام کافر قومیں سرانجام نہیں دے سکیں اس مکروہ اور گندے کام کا آغاز خود ان کے ہاتھوں ہو رہا ہے، اور سب سے آخری بات یہ ہے کہ کیا لہو و لعب اور تفریح و تماشے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے مقدس صحابہ کی ذات گرامی ہی رہ گئی تھی؟ کیا کوئی دیوث اور بے غیرت شخص بھی یہ گوارا کر سکتا ہے کہ اس کے ماں باپ اور بہو بیٹیوں کا سوانگ بھرا جائے اور لوگ اس کا تماشہ دیکھیں؟ پھر آخر اس مشقِ ستم کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و صحابیات کی ذواتِ قدسیہ ہی کو کیوں منتخب کیا گیا ہے؟ کیا ان کا احترام ہماری ماؤں اور بہنوں سے بھی کم ہے؟ منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نقلیں اتار کر ہنسی مذاق کیا کرتے تھے اور ان سے جب احتجاج کیا جاتا تو جواب دیتے کہ ہم تو یوں ہی دل لگی اور تفریح کر رہے تھے، قرآنِ کریم نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا ہے:۔

«لاتعتذروا قد کفرتم بعد إیمانکم»	بہانے نہ بناؤ، تم نے دعویٔ ایمان کے بعد کفر کا ارتکاب کیا ہے!۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی یا اسلام کی کسی بات کو ہنسی دل لگی اور تفریحِ طبع کا موضوع بنانا کیسا ہے؟ اس کو وہی شخص اختیار کر سکتا ہے جس کا دل دین و ایمان سے خالی ہو چکا ہو، ان گذارشات کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

اول:۔ اسلام میں تصویر سازی حرام اور موجبِ لعنت ہے۔

دوم:۔ اس حرام اور ملعون چیز سے دورِ نبوت کو ملوث کرنا نہایت ناپاک جسارت اور ان بزرگوں کی توہین ہے۔

سوم:۔ واقعات کے بہت سے اجزاء و مکالمات فرضی ہوں گے جو کذب و افتراء علی الرسول ہے۔

چہارم:۔ ایکٹروں اور ایکٹرسوں کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا پارٹ ادا کرنا شرمناک بات ہے۔

پنجم:۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی مقدس زندگی کو لہو لعب اور تفریح کا موضوع بنانا شعبۂ کفر ہے۔

ششم :۔ ایسی فلموں سے غیر مسلموں کے لئے فرضی تصاویر اور من گھڑت واقعات پر مبنی فلمیں بنا کر دورِ نبوت کی جانب منسوب کرنے کا دروازہ کھل جائے گا جس کے نتائج تباہ کن ہوں گے، اس لیئے ہم اربابِ اقتدار کی خدمت میں عرض کریں گے کہ اس قوم پر رحم فرمائیں اور اس فلم "فجرِ اسلام" کی نمائش پر پابندی عائد کریں اور تمام مسلمانوں سے اپیل کریں گے کہ وہ نہ صرف اس فلم کا بائیکاٹ کریں بلکہ ہر ممکن طریقہ سے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں، خصوصاً تمام علمائے کرام، ائمہ، خطباء اور دیگر راہنماؤں کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے، ایک حرام چیز کو اگر سارا جہان بھی حلال کہہ دے اور اس کے جائز ہونے کے چاروں طرف سے فتوے صادر ہونے لگیں تب بھی وہ چیز حلال اور جائز نہیں ہو جاتی، اس قسم کی صریح حرام چیزوں کو جائز کرنے کا انجام بد کچھ تو مسلمانوں کے سامنے آچکا ہے اور کچھ کسر باقی ہے وہ آئندہ پوری ہو جائے گی، ولا فعل اللہ ذلک۔

لیجئے ابھی تک "فجرِ اسلام" ہی کا ماتم تھا، لیکن ابلیسِ لعین نے اس سے آگے بڑھ کر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کی فلم بھی تیار کرا دی، کراچی کے بعض اخبارات کی یہ خبر پڑھیئے:۔

بارہ اسلامی ممالک میں حضورِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ پر فلم کی نمائش کی جائے گی۔

جامعہ ازہر اور شیعہ کونسل نے مناظر کی نمائش کی منظوری دے دی۔

تہران ۲۰ جولائی (یو پی پی)، پیغمبرِ اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر ایک فلم تیار کرنے کے معاہدہ پر اس ہفتہ کے دوران دستخط کر دیئے گئے، اس معاہدے کی رو سے یہ فلم فارسی سمیت کئی زبانوں میں بارہ اسلامی ممالک میں نمائش کے لئے تقسیم کی جائے گی، یہ فلم لبنان، کویت، بحرین اور مراکش کی ٹیموں کی جانب سے مشترکہ طور پر پیش کی جا رہی ہے، اس کے ڈائریکٹر مصطفےٰ عقاد ہیں اور اس نمائش کے مناظر کی منظوری لبنان کی اعلیٰ شیعہ کونسل اور قاہرہ کی جامع ازہر نے دے دی۔

(روزنامہ آغاز، ۲۱ جولائی ۱۹۷۳ء)

اگر یہود و نصاریٰ اور منافقینِ اسلام کی ان مکروہ سازشوں سے اب بھی مسلمانوں کی آنکھیں نہیں کھلیں تو اس کے سوا کیا کہا جائے کہ قلوب مسخ ہو چکے ہیں اور عنقریب اللہ تعالےٰ

کی جانب سے رُسوا کن عذاب در عذاب میں یہ قوم مبتلا ہونے والی ہے انا للہ و انا الیہ راجعون۔

وزارتِ اسلامی امور پاکستان اورِ علماء

کراچی کے ایک انگریزی اخبار ڈیلی نیوز میں یہ خبر شائع ہوئی ہے:۔

"۱۵ دسمبر ۷۳ء۔ خوشی کی بات ہے کہ مرکزی کابینہ میں عنقریب دینِ اسلام کی حفاظت واشاعت کے لئے ایک اسلامی امور کی پوری وزارت قائم کی جائے گی، عرصہ دراز سے ایسی وزارت کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی، گذشتہ دنوں مرکزی اسمبلی میں اس کے متعلق مولانا کوثر نیازی کا اعلان بڑی حد تک پاکستانی عوام کی اکثریت کو مطمئن کرے گا جو کہ مُلّاؤں کے کردار اور دینی امور پر ان کے تسلط سے مایوس ہو چکے تھے، ہمیں یقین ہے کہ اسلامی امور کی وزارت مولانا کوثر نیازی کی سرکردگی میں قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو فروغ دے گی اور اسلام کو ان ملاؤں کے پنجوں سے چھڑائے گی جو کھلم کھلا اسے اپنے سیاسی اور معاشی اغراض کے لئے استعمال کرتے ہیں، یہ وزارت جو مجموعی طور پر دینی امور کی نگران ہوگی یقیناً پرانی مساجد کی دیکھ بھال، نئی مساجد کی تعمیر (جہاں مساجد نہ ہوں) اور مساجد میں روشن خیال جدید تعلیم یافتہ اور ترقی پسند اشخاص جن کو اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا پورا علم ہو کے تقرر کا کام انجام دے گی"

جہاں تک وزارتِ امورِ شرعیہ کے قیام کا تعلق ہے یہ بہت ہی مبارک اقدام ہے، جو بہت پہلے ہونا چاہیئے تھا، ایک اسلامی حکومت کا سب سے اہم فریضہ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اسلام اور شریعتِ اسلامیہ کی پاسبان ہو اور اسلامی اقدار کے فروغ و ترویج میں کوشاں ہو، لیکن یہ خبر جس لب ولہجہ میں شائع ہوئی ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ شاید اصل مقصد اسلام کی پاسبانی سے زیادہ "ملاؤں" سے گلو خلاصی ہے ان "ملاؤں" کا سب سے بڑا اور ناقابلِ معافی جرم بس یہ ہے کہ انہوں نے اس ملک میں اسلام کو زندہ رکھنے کے لئے ہر قسم کی قربانی دی ہے انہی بوریہ نشینوں کا طفیل ہے کہ یہاں اسلام کے کچھ بچے کھچے آثار نظر آرہے ہیں، ہمارے ترقی

پسند ملحدین کی نظر میں "غریب ملّا" اس وجہ سے خار ہے کہ وہ جس افراتفری، جس سرپھٹول اور جن لادینی خطوط پر معاشرہ کو ڈالنا چاہتے ہیں ملّا اس کے لئے "سدِّ راہ" ہے، بہرحال کسی پر احسان جتانا مقصود نہیں بلکہ صرف عرض کرنا ہے کہ اگر اس ملک میں اسلام کو باقی رہنا ہے تو انشاء اللہ اسلام کے یہ پاسبان جنہیں آپ بلند نظری کی بنا پر لفظ "ملّا" سے تعبیر کرتے ہیں وہ ہی رہیں گے، سکندر مرزا اور ایوب حکومت پر بھی یہ سودا سوار ہوا تھا مگر ان کا جو انجام ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔

جہاں تک سیاسی اور معاشی اغراض کے لئے اسلام کو استعمال کرنے کا سوال ہے ہمیں معلوم نہیں کہ اس ملک میں وہ کون بڑا یا چھوٹا ہے جو اسلام کے طفیل اپنی روٹیاں سیدھی نہیں کر رہا، خود اس ملک کا قیام، اس کا وجود، یہاں کی صدارتیں، امارتیں، وزارتیں سب اسلام ہی کے نام سے وابستہ ہیں۔

اسلام کسی گروہ یا کسی طبقہ کی اجارہ داری نہیں، نہ "ملّا" کسی خاص مخلوق کا نام ہے، بادشاہ کا لڑکا ہو یا کسی فقیر کا، تاجر کا بیٹا ہو یا مزدور کا جو چاہے علمِ دین حاصل کر کے اسلام کی خدمت میں حصہ لے سکتا ہے، علمِ دین کی تحصیل کے دروازے کسی مسلمان پر بند نہیں لیکن اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ علمِ دین سے جاہل رہ کر بھی اسے دین کے معاملہ میں دخل در معقولات کا حق حاصل ہے اور اسلام کو "ملّاؤں" کے چنگل سے آزاد کرنے کا یہی مطلب ہے کہ ہر شخص کو "لاوارث اسلام" کے پوسٹ مارٹم کا حق ہے تو انشاء اللہ قیامت تک یہ تمنا بر نہ آئے گی۔

((یریدون لیطفؤا نور اللّٰہ بأفواھھم واللّٰہ متم نورہٖ ولو کرہ الکافرون))

ذوالحجہ ۱۳۹۳ھ، جنوری ۱۹۷۴ء

حج بیت اللہ

اللہ تعالیٰ شانہ نے یوں تو ہر عبادت کے لئے قدم قدم پر رحمت و عنایت اور اجر و ثواب کے وعدے فرمائے ہیں، نماز و زکاۃ اور روزہ و اعتکاف وغیرہ سب پر جنت اور جنت کی بیش بہا نعمتوں کے وعدے ہیں لیکن تمام عبادات میں "حجِ بیت اللہ" کی شان سب سے نرالی ہے حج گویا دبستانِ عبدیت کا آخری نصاب ہے جس کی تکمیل پر بارگاہِ عالی سے رضا و خوشنودی کی آخری سند عطا کی جاتی ہے کتنے عجیب انداز سے فرمایا گیا ہے :۔

((والحج المبرور لیس له جزاء إلا الجنة)) اور "حجِ مبرور" کا بدلہ تو بس جنت ہی ہے۔

گویا "حجِ مبرور" ایک ایسی عالی شان عبادت ہے کہ بجز جنت کے اس کا اور کیا بدلہ ہو سکتا ہے حجِ مبرور جس کا بدلہ صرف جنت ہی ہو سکتی ہے، اس کی تشریح یہ ہے کہ اس میں گناہ کی آلودگی اور ریا کاری کا شائبہ نہ ہو یعنی تمام سفرِ حج میں اللہ تعالےٰ کی نافرمانی سے آدمی بچے اور محض اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر حج کیا جائے، بلاشبہ اس شرط کا نبھانا بھی بہت مشکل ہے اور صرف اللہ تعالےٰ کی توفیق اور اس کے فضل ہی سے یہ مشکل مرحلہ طے ہو سکتا ہے۔

عشق و محبّت کا سفر حج کی ظاہری صورت بھی عجیب و غریب ہے اور اس میں غضب کی جاذبیت ہے، قدم قدم پر عشق و محبت کی پُر بہار منزلیں طے ہوتی ہیں، سب سے بڑے دربار کی حاضری کا قصد ہے، دل میں دیارِ محبوب کی آرزوئیں مچلتی ہیں، سفر طویل ہے، حلال و طیب توشۂ سفر کا اہتمام کیا جا رہا ہے نیک اور صالح رفیق کی تلاش ہو رہی ہے چشم پُرنم کے ساتھ عزیز و اقارب سے رخصت ہو رہے ہے، لین دین کا حساب بے باق کیا جا رہا ہے، حق حقوق کی معافی طلب کی جا رہی ہے کوشش یہ ہے کہ اس دربار میں حاضر ہوں تو کسی کا معمولی حق بھی گردن پر نہ ہو، لیجئے روانگی کا وقت آیا، غسل کر لیجئے اور دو سفید نئی چادریں پہن لیجئے گویا انسان خود اپنے ارادہ و اختیار سے سفرِ آخرت پر روانہ ہو رہا ہے، پہلے غسل سے بدن کے ظاہری میل کچیل کو صاف کرتا ہے اور پھر کفن کی چادریں اوڑھ کر دوگانۂ احرام ادا کرتا ہے اس طرح گویا توبہ و انابت سے دل کے میل کچیل سے اپنے

باطن کو پاک صاف کرتا ہے اور ظاہری و باطنی نظافت کے ساتھ شاہی دربار میں نذرانۂ عشق و محبت پیش کرنے کا عہد کر لیتا ہے، ارحم الراحمین نے دعوت دے کر بلایا ہے اور شاہی دربار سے بلاوا آیا ہے، یہ فوراً "بیت اللہ الحرام" کے شوقِ دیدار میں اس دعوت پر لبیک اللّٰھم لبیک (میں حاضر ہوں، اے میرے اللہ! میں حاضر ہوں) کا نعرہ بلند کرتے ہوئے مستانہ وار سوئے منزل رَوانہ ہو جاتا ہے۔

یہ اس والہانہ و عاشقانہ عبادت کی ابتدا ہے، زیب و زینت کے تمام مظاہر ختم، راحت و آسائش کے تمام تقاضے فراموش، نہ سر پر ٹوپی، نہ پاؤں میں ڈھب کا جوتا، نہ بدن پر ڈھنگ کا کپڑا، دیوانہ وار رواں دواں منازلِ عشق طے کرتا ہوا جا رہا ہے، دیارِ محبوب کی دھن میں بادہ پیمائی ہو رہی ہے

در بیاباں ہا ز شوقِ کعبہ خواہی زد قدم
سرزنشہا گر کند خارِ مغیلاں غم مخور

پہنچتے ہی مرکزِ تجلیات (کعبہ) پر نظر پڑی تو بے ساختہ دارِ محبوب کا طواف کرتا ہے، بار بار چکر لگاتا ہے، حجرِ اسود جو "یمین اللہ فی الأرض" کی حیثیت رکھتا ہے اس کو چومتا ہے آنکھوں سے لگاتا ہے ملتزم سے چمٹتا ہے، زار و قطار روتا ہے گویا زبانِ حال سے کہتا ہے:-

نازم بچشمِ خود کہ روئے تو دیدہ است
افتم بپائے خویش کہ بکوئیت رسیدہ است
ہزار بار بوسہ زنم من دستِ خویش را
کہ بدامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

اس بے خود عاشقِ زار کو جو قلبِ تپاں اور جگرِ سوزاں لے کر آیا تھا پہلی مہمانی کے طور پر آبِ زمزم، کا تحفہ شیریں پیش کیا جاتا ہے جس سے تسکینِ قلب بھی ہو گی اور جگر کی پیاس بھی بجھے گی اور حکم ہوتا ہے کہ جتنا پانی پیا جا سکے پی لے، خوب دل ٹھنڈا کر لے، کوئی کسر نہ چھوڑ، یہاں سے فارغ ہو کر صفا و مروہ کے درمیان چکر لگاتا ہے، پھر منیٰ پہنچتا ہے پھر اس کے آگے عرفات کا رُخ کرتا ہے، آج وادئ عرفات پسج مچ ہنگامۂ محشر کا منظر پیش کر رہی ہے، حیرت انگیز اجتماع ہے، رنگا رنگ مختلف شکلیں مختلف زبانیں، بوقلموں مناظر، یہ سب رب العالمین کے دربارِ قدس

کے مہمان ہیں، یہ شاہی دربار میں عبدیت و بندگی، ضعف و بے کسی، عجز و درماندگی اور ذلت و مسکنت کا نذرانہ پیش کریں گے اور رضا و مغفرت، فضل و احسان اور انعام و اکرام کے گوہر مقصود سے جھولیاں بھر کر لے جائیں گے، اپنے لئے اپنے اعزہ و اقارب اور دوست احباب کے لئے آج جو کچھ مانگیں گے نقد ملے گا، زوال ہوا تو ہر چہار طرف سے آہ و بکا کا شور برپا ہوا، اس کی آواز بھی اس حیرت انگیز طوفانِ گریہ وزاری میں ڈوب گئی، شام تک کا سارا وقت اسی عالم تحیر میں گذارتا ہے کبھی خوب رو رو کر مانگتا ہے کبھی لبیك اللّٰھم لبیك کا نعرہ لگاتا ہے کبھی تکبیر کی گونج سے زمزمہ آراء ہوتا، کبھی تہلیل سے نغمہ سرا ہوتا ہے کبھی لا إلٰہ إلا اللہ وحدہٗ لاشریك لہٗ سے وحدانیت و ربوبیت کی صدائیں بلند کرتا ہے، عابد و معبود کا یہ تعلق کتنا دلربا ہے؟ اور بندگی و سرافگندگی کا یہ منظر کس قدر حیرت افزا ہے؟

آفتاب غروب ہوا اور اس دشت پیمانے بوریا بستر باندھ مزدلفہ کا رُخ کیا، شب بیداری وہاں ہوگی، مغرب و عشا کی نماز وہاں پڑھی جائے گی، اظہارِ آدابِ بندگی میں کچھ کسر باقی رہ گئی ہے تو وہاں نکالی جائے گی، کبھی رکوع و سجود ہے، کبھی وقوف و قیام ہے، کبھی تہلیل و تکبیر ہے، کبھی تسبیح و تلبیہ ہے، گریہ وزاری، دعا و مناجات اور تضرع و ابتہال کا نصاب پورا ہوا تو کامیابی و کامرانی کی نعمت سے سرشار ہو کر وہاں سے منیٰ کو چلا، دشمنِ انسانیت، عدوِ مبین، راندۂ بارگاہ، ابلیسِ لعین کی سرکوبی کے لئے جمرہ کی رمی کی، خلیل و ذبیح (علیٰ نبینا وعلیہما الصلاۃ والسلام) کی سنت قربانی کی یاد تازہ کرنے کے لئے اللہ تعالٰی کے نام پر قربانی دی اور رضائے محبوب کے لئے جان و مال کے ایثار و قربانی کا عہد تازہ کرلیا، وہاں سے بارگاہِ قدس کے مرکزِ انوار کی زیارت کو چلا اور طوافِ کعبہ کے انوار و برکات سے دیدۂ و دل کی تسکین کا سامان کیا۔

الغرض اس عاشقانہ و والہانہ عبادت میں دیوانہ وار ایثار قربانی اور عبدیت و فنائیت کا ریکارڈ قائم کرلیتا ہے اور تجلیات ربانی کے انوار و برکات سے سراپا نور بن جاتا ہے اور رحمت و رضوان کے تحفوں سے مالامال ہو کر اور استحقاقِ جنت کی آخری سند لے کر اپنے وطن کو واپس لوٹتا ہے اس طرح بندہ بندگی کا ثبوت دے کر جنت و رضوانِ الٰہی کی نعمتوں سے سرفرازی کے تمغے وصول کرلیتا ہے ((والحج المبرور لیس لہ جزاء إلا الجنۃ)) کے آخری انعام سے مطمئن

ہو جاتا ہے، دیکھئے کس انداز سے عشق و محبت کی منزلیں طے کی گئیں اور کس کس طرح شاباشوں سے نوازا گیا، یہ اس عاشقانہ و عارفانہ عبادت کا بہت ہی مختصر سا نقشہ ہے۔

سفرِ عشق میں امتحان ظاہر ہے کہ مقصد بہت ہی اعلیٰ ہے اس لئے کبھی کبھی اس مقصد کے حصول کے لئے امتحان بھی ناگزیر ہوتا ہے، مدتوں کے جمے ہوئے تہ بر تہ زنگ و غبار کو دُور کرنے کے لئے شدید تنقیہ کی ضرورت پڑتی ہے، کبھی جان پر امتحان آتا ہے کبھی مال پر، کبھی رفقاء سے تنہا کرا کر تڑپایا جاتا ہے، کبھی بٹوا کر رُلایا جاتا ہے، کبھی ہر آسائش و راحت چھین کر آخرت کی آسائش و راحت کی نعمت سے نوازا جاتا ہے، بہرحال یہ راز سربستہ کسی کے بس کی بات نہیں، شانِ ربوبیت کے کریمانہ کرشمے ہیں، شانِ صمدیت کا ظہور ہے اور ارحم الراحمین کی رحمتِ خفیہ کے شیون ہیں، رحمتِ الٰہی کا ظہور کبھی بصورتِ رحمت ہوتا ہے کبھی بشکلِ زحمت، کسی کو چون و چرا کی گنجائش نہیں یہ وہ مقام ہے کہ عارفین جو دریائے معرفت کے غوطہ زن ہیں وہ بھی سرِ حیرت جھکا کر خاموش ہیں، صبر آزما امتحان لیا جاتا ہے کبھی جوع و خوف سے کبھی انفس و اموال زیرِ امتحان ہوتے ہیں، رضا بالقضاء کے لئے مجاہدہ کرایا جاتا ہے اور مہربانی اور شاباش کی بارش ہوتی اور آخر میں جنت کی سند مل جاتی ہے اور ((والحج المبرور لیس له جزاء إلا الجنة)) کا تحفہ عطا کیا جاتا ہے بلاشبہ عبدیت کا ظہور اور شانِ عشق و محبت کا مظاہرہ جس طرح حج بیت اللہ الحرام میں ہوتا ہے کسی اور عبادت میں نہیں ہوتا۔

امسال سالِ گذشتہ یا گذشتہ سالوں کی بہ نسبت بے حد ہجوم تھا اور تقریباً نصف ملین (۵۰۰۰۰۰) خدا کی مخلوق زیادہ پہنچ گئی تھی، محدود مقامات اور محدود انتظامات میں غیر محدود مخلوق کا انتظام درہم برہم ہو گیا تھا، قیام و طعام کی دشواریاں تھیں، ٹریفک اور مواصلات کا نظام تقریباً بس سے باہر تھا، ایک ترکی قوم کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی جن کی دیو ہیکل بسوں نے تمام حجاجِ کرام کو بے بس بنا دیا تھا، سڑکیں بند، راستے مشغول، شاہ فیصل کے عہدِ مبارک کے شاہانہ انتظامات نے بھی عجز و تقصیر کا اعتراف کیا۔ اگرچہ قدم قدم پر حق تعالیٰ کی شانِ ربوبیت کرم فرما تھی اور شاہ فیصل کے عہد کے برکات بالکل ظاہر و باہر تھے لیکن پھر بھی حکومتوں کا حج پر کنٹرول کر کے حجاج کے کوٹے مقرر کر کے تحدید کرنے کی مصلحتیں و حکمتیں تکوینی طرز پر واضح ہو گئیں، اس سلسلہ میں

چند باتیں اور گذارشات ضروری خیال کرتا ہوں۔

حجاج کے لئے چند ضروری ہدایات

۱۔ عورتوں اور مردوں کا ناگفتہ بہ اختلاط طوافوں میں، نمازوں میں اور سلام کی حاضری میں غیر شرعی ہے اس لئے ضروری ہے کہ عورتوں کے طواف کے لئے رات یا دن میں کوئی وقت مخصوص کر لیا جائے اور اس طرح سلام کی حاضری کے لئے بھی وقت مخصوص ہو ان اوقات میں مردوں کو طواف یا حاضری سے روکا جائے۔

۲۔ نہ تو عورتوں پر جماعت کی پابندی ہے نہ مسجد کی حاضری کی فضیلت ہے، نہ نمازِ جمعہ ان پر فرض ہے اس لئے عورتیں گھر میں نماز پڑھا کریں اور اسی طرح جمعہ میں عورتوں کی حاضری روکی جائے، موجودہ صورتِ حال نہ شرعاً درست ہے نہ عقلاً قابل برداشت ہے۔

۳۔ رمی جمرات کے لئے عورتیں رات کو جایا کریں جس طرح بوڑھوں اور مریضوں کے لئے بھی یہی وقت مناسب ہے بلاشبہ بغیر عذر کے یہ خلافِ سنت ہے لیکن موجودہ صورتِ حال میں انشاءاللہ کراہت بھی ختم ہو جائے گی۔

۴۔ تمام حضرات جو حجِ بیت اللہ الحرام کا ارادہ کریں تمام ضروری مسائل یاد کرکے آئیں، فرائض و واجبات کا اہتمام بہت ضروری ہے بسا اوقات یہ دیکھا گیا کہ لوگ فرائض و واجبات میں تقصیر کرتے ہیں اور فضائل و مستحبات کا اہتمام ہوتا ہے۔

اس وقت جو صورتِ حال ہے قانونی و فقہی احکام کے پیشِ نظر تو یہ امید رکھنا بہت مشکل ہے کہ یہ عبادت صحیح ادا ہوئی یا یہ حجِ مبرور ہوگا، صحیح طواف کیسے ہو؟ اور اس میں کیا کیا باریکیاں ہیں؟ اگر ایک قدم طواف کا ایسا ادا ہو کہ بیت اللہ کی طرف سینہ ہو جائے تو سارا طواف بیکار ہو گیا، اگر شروع کرنے میں حجرِ اسود سے تقدم ہو گیا تو طواف میں نقصان آجاتا ہے، اگر ایک اینچ ہٹ کر طواف شروع کیا تو سرے سے طواف ہوا ہی نہیں، خاص کر ازدحام و ہجوم میں صحیح طواف کرنا بے حد دشوار مرحلہ ہے عورتیں مردوں کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہیں، ایک عورت اگر صف میں مردوں کے درمیان کھڑی ہو گئی تو تین مردوں کی نماز غارت ہو گئی ، جو شخص داہیں ہو جو بائیں ہو،

جو اس کی سیدھ میں پیچھے ہو، اگر ایک ہزار عورتیں اس طرح صفوں کے درمیان ہیں تو تین ہزار مردوں کی نماز فاسد ہوگئی، دوران سفر بہت سی نمازیں قضاء ہو جاتی ہیں اگر فرض نماز قضا ہوگئی تو حجِ مبرور کی توقع رکھنا مشکل ہے، الغرض اس طرح دسیوں مسائل ہیں کہ جن سے عوام تو کیا علماء بھی غافل ہیں، "رمیِ جمرات" میں معمولی عذر پر دوسروں کو وکیل بنایا جاتا ہے اس طرح وہ توکیل صحیح نہیں ہوتی، دم لازم آ جاتا ہے غور کرنے سے محسوس ہوا کہ جہاں تک مسائل و احکام کا تعلق ہے مشکل سے یہ کہا جائے گا کہ یہ حج صحیح ادا ہو گیا لیکن حق تعالیٰ شانہٗ کی رحمتِ کاملہ کے پیشِ نظر کوئی بعید نہیں کہ اگر نیت صحیح ہو اور جذبہ سچا ہو تو تمام کوتاہیاں اور قانونی فروگذاشتیں سب معاف ہوں اور ارحم الراحمین کی رحمتِ عامہ سے یہی امید ہے کہ اپنے گنہگار بندوں کی کوتاہیوں سے درگذر فرما کر اپنی رحمت و نعمت سے نوازے اور نہ معلوم کس کی کون سی ادا قبول ہو جائے اور کیا کچھ خزانۂ رحمت سے ملے اور بلاشبہ حق تعالیٰ شانہٗ کی رحمتِ کاملہ کی موسلادھار بارش میں کوئی بدنصیب ہی محروم رہے گا ہو سکتا ہے کہ چند مقبولینِ بارگاہ کے طفیل سب کا حج قبول ہو، اس کی شانِ کریمی کے سامنے سب کچھ آسان ہے، کاش اگر حق تعالیٰ کی اتنی مخلوق قانون کے مطابق جذباتِ صادقہ سے والہانہ انداز سے یہ فریضہ ادا کرتی تو امت کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اور تمام عالم میں ان نمائندگانِ بارگاہِ قدس کا فیض جاری ہوتا جس حریمِ قدس کو ان شاندار کلمات سے وحیِ ربانی میں یاد کیا ہو:۔

((إن أول بيت وضع للناس للذي ببكة مباركاً وهدى للعالمين

فيه آيات بينات مقام إبراهيم ومن دخله كان آمنا))

ان آیاتِ بینات اور ان برکات و تجلیات کا کیا ٹھکانا؟ بہر حال کہنا یہ ہے کہ کوشش کی جائے کہ قانون کی رُو سے بھی صحیح حج ہو اور نیت و جذبہ بھی سچا ہو اور قدم قدم پر تقصیر کا احساس ہو اور یہ تصور مستمر قائم ہو کہ اس حریمِ قدس میں حاضری کے آداب کی اہلیت کہاں؟ ہم جیسے ناپاکوں کو اس سرزمین میں حاضری کی دعوت دی گئی اور پہنچ گئے، یہ محض حق تعالیٰ شانہٗ کا عظیم احسان ہے کہ اس مقدس زمین اور بقعۂ نور میں سراپا ظلمات والے کو جگہ عطا فرما دی، توقع ہے کہ اس احساس سے بارگاہِ قدس میں شرفِ قبولیت نصیب ہو یہ جو کچھ بیت اللہ کی عظمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ بہت سطحی حقائق کے درجہ میں بات عرض کی گئی ورنہ جو حقائق و اسرار عارفین و کبارِ صوفیاءِ کرام،

شیخ اکبر، امامِ ربانی شیخ احمد سرہندی، حضرت شیخ سید آدم بنوری، شاہ عبدالعزیز اور حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہم اللہ جمیعًا نے بیان فرمائے ہیں، وہ بینات کے دائرۂ بیان سے بالاتر ہیں، راقم الحروف نے اپنے رسالہ "بغیۃ الاریب فی مسائل القبلۃ والمحاریب" کے آخر میں کچھ تھوڑا سا حصہ بیان کیا ہے، بہرحال کعبۃ اللہ اس مادی کائنات میں "شعائر اللہ" میں داخل ہے، نماز میں اگر حق تعالیٰ شانہٗ سے مناجات و ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے توحج میں حق تعالیٰ کے گھر میں مہمانی کا شرف و مجد حاصل ہے جب ہم کلامی کی عظمت بیت الحرام میں نصیب ہو اور دونوں عظمتیں جمع ہو جائیں تو جو کچھ بھی اس کا درجہ ہوگا تصور و خیال سے بالاتر ہے ؎

"نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز"

یہ وہ مقام ہے کہ انتہائی تعظیم و ادب کی ضرورت ہے لیکن آج کل ہماری غفلت و جہالت سے جو صورت حال ہے وہ ظاہر ہے افسوس یہ کہ ہماری تمام عبادات کی صرف صورت رہ گئی، روح نکل گئی ہے تمام عبادات بے جان لاشے ہیں اگر ان میں جان ہوتی تو آج امت محمدیہ کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا، حق تعالیٰ کی رحمت ہے اور اسلام کا حکیمانہ نظام ہے کہ مساجد بھی بیوت اللہ ہیں (وان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احدا) مساجد صرف اللہ تعالیٰ کی ہیں ان میں صرف اللہ ہی کی عبادت ہونی چاہیئے، آخری سب سے بڑا مرکزی گھر وہ مسجدِ حرام وہ بیت الحرام ہے جس سے عالم میں بجز اس مقام کے جہاں حضرت سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما رہے ہیں کوئی مقدس قطعہ نہیں جہاں پر حق تعالیٰ کی طرف سے انوار کی موسلا دھار بارش برستی ہے فرشتے طواف کے لئے آسمانوں سے اترتے ہیں حق تعالیٰ مسلمانوں اور حجاجِ کرام کو توفیق نصیب فرمائے کہ اس مقام کی صحیح معرفت نصیب ہو، بقدرِ طاقت بشری حق ادا کر سکیں۔ محرم الحرام ۱۳۹۵ھ، فروری ۱۹۷۵ء

اعضائے انسانی کی تبدیلی

آئے دن اسلامی ممالک میں علمی محفلیں سجائی جاتی ہیں اور سیمینار، کلوکیم اور مجلسِ مذاکرات و مباحثات منعقد کی جاتی ہیں اور بین الاقوامی سطح پر مندوبین کو بلایا جاتا ہے، پر تکلف انتظامات کئے جاتے ہیں لاکھوں روپے خرچ کئے جاتے ہیں مگر ان کی تہ میں دیکھئے تو اکثر و بیشتر سیاسی مصالح چھپی ہوتی ہیں کم از کم کسی مملکت کی سستی شہرت کے لئے تو کامیاب نسخہ ہے ہی، علمی مسائل اور دینی مشکلات کو سیاسی سطح پر لاکر حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ووٹوں کی کثرت و قلت اور اٹھے ہوئے ہاتھوں سے فیصلے کئے جاتے ہیں، حکیمِ مشرق نے سچ کہا ہے ؎

گریز از طرزِ جمہوری غلام پختہ کارے شو   کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

ظاہر ہے کہ علمی مشکلات حل کرنے کے لئے پر سکون علمی ماحول کی اور علمی دماغوں کو جمع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے پارلیمانی مجلسی ہنگامہ آرائیوں سے اور سیاسی مصالح کی آمیزش سے کیا یہ مسائل طے ہو سکتے ہیں ؟ پھر اکثر و بیشتر ارکان غیر علمی ہوتے ہیں ان کی نامزدگی حکومت کے رحم و کرم پر موقوف ہوتی ہے کس کو نمائندہ بنائے اور بھیجے، بھلا غیر علمی اشخاص علمی مسائل میں کیا رائے دے سکتے ہیں اور ان کی رائے کی کیا وقعت ہو سکتی ہے ؟

اسی سلسلہ کی کڑی یہ ہے کہ اپریل ۶۹ء کے آخری ہفتہ میں کوالالمپور، ملائشیا کے دار الخلافہ میں ایک سیمینار منعقد ہوا ہے۔ ۱۸؍ اسلامی ملکوں سے نمائندے پہنچے ہیں ہماری مملکت کی جانب سے بھی آٹھ ارکان کا ایک وفد گیا ہے جس میں ہمارے ملک کے ایک مایہ ناز اور ممتاز عالم مولانا شمس الحق صاحب افغانی بھی تھے مگر اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑے، فقہی مسائل میں جو مسئلہ طے ہوا ہے وہ اعضاءِ انسانی کی تبدیلی کا مسئلہ ہے مثلاً ایک آدمی کی آنکھ دوسرے آدمی کے لگائی جا سکتی ہے یا نہیں اسی طرح دوسرے اعضاء، بلاشبہ یہ مسئلہ انتہائی توجہ اور تحقیق کا محتاج ہے، مصر کے بعض علماء نے تو عرصہ ہوا جواز کا فتویٰ دے دیا تھا، سید رشید رضا وغیرہ نے بھی جواز کا فتویٰ دیا ہے لیکن یہ مسئلہ اتنا سطحی نہیں ہے، کراچی میں "مجلسِ تحقیقاتِ مسائلِ حاضرہ" نے مختلف اور متعدد مجالس میں اس پر غور کیا ہے اور مذاہبِ اربعہ کی تمام کتابیں چھان ڈالی ہیں اور علماءِ ہند و پاک سے استفتاء بھی کیا ہے آخر میں جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ عدمِ جواز

ہے البتہ خون مریض کو دینے کا جواز تو ہے لیکن ایک انسان کے اعضاء دوسرے انسان کو منتقل کرنے کی گنجائش نہیں، نہ معلوم کہ ان حضرات نے کن فقہی دلائل کی بنیاد پر یہ اتفاق رائے کیا ہے، انشاء اللہ عنقریب "مجلس تحقیقِ مسائل حاضرہ" کے یہ طے شدہ مسائل شائع کیے جائیں گے، فقہی مسائل بے حد بحث و تحقیق کے محتاج ہیں۔

کہنا یہ تھا کہ اس قسم کے علمی مسائل کے لئے فقہی ذوق کے علاوہ کتبِ مذاہب کے وسیع مطالعہ کی شدید ضرورت ہے اور ادلہ پر ہر پہلو سے غور کرنے کی حاجت ہے، ظاہر ہے کہ ایک مجلس میں یہ مسائل کیسے طے ہو سکتے ہیں اور کیا اگر کوالالمپور میں چند حضرات نے فیصلہ کر لیا تو کیا ان کا فیصلہ تمام دنیا کے لئے حجت ہو سکتا ہے جبکہ یہ بھی یقینی معلوم نہیں کہ طے کرنے والے کون یگانۂ روزگار فقہاء ہیں؟ دراصل لادینی قوموں میں یا امریکہ و یورپ میں ایک چیز کا تعامل شروع ہو جاتا ہے مذہب سے ناآشنا حکمراں چاہتے ہیں کہ ان کی تقلید کے لئے کوئی دلیل مل جائے اور ہم بھی پیچھے نہ رہیں، یہ شرمناک قسم کا احساس کمتری اور بے حمیتی ہے أعاذنا الله منه۔

ربیع الاول ۱۳۸۹ھ

حضرت مولانا بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور جمعیۃ علماءِ اسلام

محرم ۸۹ھ کے بصائر میں حضرت بنوری مدظلہ کی شائع شدہ تقریر سے متعلق مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل نے ایک مکتوب روانہ کیا حضرت مولانا نے اس کے اور ان کے ایک سابقہ مکتوب کے پیشِ نظر یہ جواب لکھا ہے:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادرِ محترم زادکم اللہ مجداً، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

نامۂ کرم نے نوازا، وقت کے موجودہ فتن سے متعلق "بینات" کے تازہ شمارہ میں "بصائر و عبر" کے عنوان کے تحت میری شائع شدہ تقریر کے بارے میں آپ نے جن نیک جذبات کا اظہار اور اس پر جو میری حوصلہ افزائی فرمائی ہے اس کا میں تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

کچھ عرصہ قبل آپ کا ایک اور طویل مکتوب بھی وصول ہوا تھا جس میں آپ نے جمعیت علمائے اسلام کے طرزِ عمل اور وقت کی بعض تحریکوں سے متعلق ان کے مؤقف اور پھر اس بارے میں

میری خاموشی پر سخت تنقید کی تھی اس خط کا جو جواب میں نے فوری طور پر پیش کیا تھا اس میں میں نے اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ جمعیت علماءِ اسلام کے ساتھ میرا کوئی رسمی تعلق نہیں ہے البتہ میری ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں اور میں ان کو ان کے مؤقف اور عمل میں مخلص ضرور سمجھتا ہوں۔

آپ کا یہ خط دراصل میرے محترم دوست مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی کے اس بیان سے متعلق تھا جو انہوں نے ایک پریس کانفرنس میں دیا تھا اور اخبارات کے غلط تصرف کی وجہ سے اس کا مفہوم بظاہر وہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا جو کہ اس بیان سے مولانا موصوف کی مراد ہو سکتا تھا جس وقت میں آپ کے اس خط کا جواب دے رہا تھا مولانا موصوف کا تردیدی بیان ابھی اخبارات میں شائع نہیں ہوا تھا تاہم مولانا کے تقویٰ، تدین، خلوص اور مجاہدانہ زندگی کے پیشِ نظر جس کا ہمیں ذاتی طور پر اچھی طرح علم ہے میں نے از خود مولانا کی طرف سے دفاع اور ان کے قول کو اچھے محمل پر حمل کرنا اپنا فریضہ سمجھا اور غالباً اس خط میں آپ کے اس رویہ پر ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا کہ آپ ایک شخص کے ساتھ مخالفت ہونے کی وجہ سے اس کی پوری زندگی اور اعمال کو نظر انداز کر کے اس کے متعلق اس قسم کی بے باکانہ رائے قائم کر دیتے ہیں اور جن کے ساتھ آپ کا قلبی تعلق اور محبت ہے ان کے وہ مساوی بھی محاسن نظر آتے ہیں جن کے خلاف ملک بھر کے علماء کا اجماع ہو چکا ہے۔

بہر حال آپ کے گذشتہ عتاب اور موجودہ حوصلہ افزائی کے پیشِ نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ کسی شخص یا جماعت یا کسی نظریہ کی تائید یا تردید میں جو کچھ میرے قلم یا زبان سے نکلتا ہے وہ محض مذہبی نقطہ نگاہ سے ہوتا ہے سیاسیات سے میرا کوئی تعلق یا لگاؤ نہیں اور اس لئے میرے جملہ بیانات ہر قسم کی سیاسی مصالح سے ہمیشہ بالاتر ہوتے ہیں۔

مجھے متعدد بار مصر اور بعض دوسرے عرب ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا، میں نے اپنے علم و فراست کے مطابق وہاں کے حالات کا جو جائزہ لیا وہ بالکل آزادانہ طور پر سپردِ قلم کیا میں نے جیسا کہ ناصر کی اشتراکیت نوازی اور عرب قومیت کی علمبرداری پر تنقید کی ایسے ہی اس کی سامراج دشمنی اور اس کے غیور و شجاع اور کیرکٹر کے مضبوط ہونے پر اس کی تعریف کی اور اس کی بعض

اسلامی خدمات کو سراہا بھی، کوئی سیاست مجھے اس غلط بیانی پر آمادہ نہ کر سکی کہ میں اس کو خواہ مخواہ یہودیوں کے ایجنٹ اور اسلام کے بدترین دشمن کی شکل میں ظاہر کروں، ایسے ہی حال ہی میں جب ملک میں سوشلزم اور کمیونزم زندہ باد کے نعرے بلند ہونے لگے جو کہ دراصل اس ملعون سرمایہ دارانہ نظام کا ردعمل تھا جو کہ مغربی سامراج نے زمانہ دراز سے ان بلاد پر مسلط کر رکھا ہے اور اس بات کا خطرہ محسوس ہونے لگا کہ ملک کے عوام جو کہ اس سامراجی نظام کی پیدا کردہ معاشی مشکلات سے بُری طرح دوچار ہیں کہیں اپنی مشکلات کے حل کے طور پر اس قسم کی لادینی تحریکوں اور محض مادی بنیادوں پر استوار نظامِ حیات کو قبول کرنا شروع نہ کر دیں تو میں نے ان فتن سے عوام کو آگاہ کرنا اور یہ بتلانا اپنا فریضہ سمجھا کہ ان کی مشکلات کا حل اسلام میں جو ہر اعتبار سے جامع ترین دین ہے، بطریقِ احسن موجود ہے یہاں بھی میری یہ تنقید خالص دینی جذبہ کے تحت تھی، یمین و یسار کی کش مکش میں کسی ایک طرف جھکاؤ کبھی میری طبیعت کا تقاضا نہیں رہا، مغربی سامراج نے جو نقصان اسلام اور مسلمانوں کو پہنچایا ہے وہ میرے نزدیک اس نقصان سے کسی درجہ میں بھی کم نہیں جو روس اور چین کے ہاتھوں مسلمانوں کو پہنچا ہے۔

الغرض امریکہ اور چین کی اس موجودہ جنگ میں ملک کی سیاسی جماعتوں کا مؤقف مختلف ہے بعض مذہبی سیاسی جماعتیں کمیونزم اور سوشلزم کو شکست دینے کے لئے امریکی اور برطانوی سامراج کو تقویت دینے اور ان کا آلہ کار بننے سے دریغ نہیں کرتی ہیں جبکہ بعض دوسری جماعتیں مغربی سامراج کی بیخ کنی کے لئے اس کے ساتھ برسرِ پیکار تمام طاقتوں کے حق میں قدرے نرمی برتنے کو مصلحت کا تقاضا سمجھتی ہیں اور میں چونکہ کسی بھی سیاسی مکتبِ فکر سے وابستہ نہیں اس لئے تمام باطل قوتوں پر بے لاگ اور آزادانہ نکیر کرنے میں مجھے کوئی جھجک اور تردد نہیں ہو سکتا لیکن اپنے اس آزادانہ مؤقف کے باوجود میں یہ گوارا نہیں کروں گا کہ میرے اس قسم کے بیانات کو آپ یا آپ کی جماعت اپنی بعض حریف جماعتوں کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیں[1]

---

[1] یعنی اس بیان کو "جمیعت العلماءِ اسلام" کے اس مؤقف کے خلاف بطور حجت پیش کرنا کہ "روس اور چین کے متوقع خطرات کے سدباب کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی پہلے امریکہ اور برطانیہ کی بالفعل مسلط کردہ لعنتوں کا خاتمہ ازحد ضروری ہے۔"

میں اگرچہ جمعیت علماءِ اسلام کے ساتھ رسمی طور پر وابستہ نہیں ہوں اور نہ ہی اپنے مشاغل کی بنا پر ان سے کوئی خاطر خواہ تعاون کر سکا ہوں لیکن باوجود اس کے میری ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں اور میرے نزدیک یہ جماعت ہی وہ صحیح المسلک مذہبی سیاسی جماعت ہے جس سے مسلمانوں کو خیر کی توقعات وابستہ کر کے اس کو تقویت پہنچانا چاہیئے، جمعیت کے زعماء کو میں قریب سے جانتا ہوں ان کا سیاسی مؤقف کچھ بھی ہی، لیکن ان کے متعلق اس بات کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ وہ اسلام کے مقابلہ میں سوشلزم یا کسی اور باطل نظام کو ایک لمحہ کے لئے قبول کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں، ان کا ماضی اس پر شاہد ہے کہ انہوں نے ہمیشہ سلفِ صالح اور اہلِ سنت والجماعت کے مسلک سے دفاع کیا ہے اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی خاطر کسی قسم کی قربانی اور جہاد سے کبھی دریغ نہیں کیا چنانچہ اس وقت بھی اسلامی تعلیمات کے تحت ملک کے معاشی مسائل کا حل تلاش کرنے میں جمعیت مصروف ہے۔

اخیر میں ایک بار پھر آپ کے نیک جذبات پر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، آپ کے مفید مشوروں پر عمل کی کوشش کی جائے گی، اللہ ہم سب کو صراط مستقیم کی ہدایت فرمائے۔

ربیع الاول ۱۳۸۹ھ

استخارہ اور اس کا مسنون طریقہ

جن مخلصین و احباب کے خطوط آرہے ہیں ان سب کے لئے یہ لائحہ عمل پیش کیا جارہا ہے کہ مسنون استخارہ پر عمل کریں، نامناسب نہ ہوگا کہ یہاں استخارۂ مسنونہ کی ترکیب بھی لکھ دی جائے اور دعا بھی لکھ دی جائے، درحقیقت استخارہ مشکاۃِ نبوت کی ایک روشنی ہے جو امت کو دکھلائی گئی ہے اور اُمت کے ہر پریشان حال انسان کی قیامت تک کے لئے رہنمائی فرمائی گئی ہے، یہ پیغمبرانہ تربیت ہے جس کی برکات قیامت تک جاری رہیں گی، حدیث میں آتا ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو اس طرح استخارہ کی تعلیم دیتے تھے جس طرح قرآنِ کریم کی سورتیں بچوں کو یاد کرائی جاتی ہیں اور تعلیم دی جاتی ہیں۔ بزرگانِ دین کے تجربوں میں بہت سی صورتیں استخارہ کی آئی ہیں اور ان کے ذریعے انسان کی رہنمائی بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن ہادیٔ اُمت خاتم النبیین رحمۃ للعالمین اعلم الاولین و الآخرین کے سینہ نبوت سے جو چیز نکلی ہو، اس کی خیر و برکت کا کیا کہنا۔

واضح ہو کہ استخارۂ مسنونہ کا مقصد یہ ہے کہ بندے کے ذمے جو کام تھا وہ اس نے کر لیا اور اپنے آپ کو حق تعالیٰ کے علمِ محیط اور قدرتِ کاملہ کے حوالہ کر دیا۔ گویا استخارہ کرنے سے بندہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی انسان کسی تجربہ کار، عاقل اور شریف شخص سے مشورہ کرنے جاتا ہے تو وہ شخص صحیح مشورہ ہی دیتا ہے اور اپنی مقدور کے مطابق اس کی اعانت بھی کرتا ہے۔ گویا استخارہ کیا ہے حق تعالیٰ سے مشورہ لینا ہے۔ اپنی درخواست استخارہ کی شکل میں پیش کر دی، حق تعالیٰ سے بڑھ کر کون رحیم کریم ہے؟ اس کا کرم بے نظیر ہے، علم کامل ہے اور قدرت بے عدیل ہے، اب جو صورت انسان کے حق میں مفید ہوگی حق تعالیٰ اس کی توفیق دے گا۔ اس کی رہنمائی فرمائے گا، پھر نہ سوچنے کی ضرورت، نہ خواب میں نظر آنے کی حاجت۔ جو اس کے حق میں خیر ہوگا وہی ہوگا، چاہے اس کے علم میں اس کی بھلائی آئے یا نہ آئے، اطمینان و سکون فی الحال حاصل ہو یا نہ ہو، ہوگا وہی جو خیر ہوگا، یہ ہے استخارہ مسنونہ کا مطلوب اسی لئے تمام اُمت کیلئے تاقیامت یہ دستور العمل چھوڑا گیا ہے اور اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ:

"من سعادة ابن ادم استخارته من الله ومن شقاوته ترك الاستخارة" — انسان کی سعادت و نیک بختی یہ ہے کہ اپنے کاموں میں استخارہ کرے اور بدنصیبی یہ ہے کہ استخارہ کو چھوڑ بیٹھے۔

اب استخارہ کی دعا ناظرین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے :-

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْتَخِيرُكَ بِعِلْمِكَ وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيمِ فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا أَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا أَعْلَمُ وَأَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ. اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذَا الْأَمْرَ خَيْرٌ لِّي فِي دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي فَاقْدِرْهُ لِي وَيَسِّرْهُ لِي ثُمَّ بَارِكْ لِي فِيهِ وَإِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذَا الْأَمْرَ شَرٌّ لِّي فِي دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي فَاصْرِفْهُ عَنِّي وَاصْرِفْنِي عَنْهُ وَاقْدِرْ لِيَ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ ثُمَّ أَرْضِنِي بِهِ.

یا اللہ میں آپ سے خیر چاہتا ہوں بوجہ آپ کے علم کے اور قدرت طلب کرتا ہوں آپ سے بوجہ آپ کی قدرت کے اور مانگتا ہوں میں آپ سے آپ کے بڑے فضل میں سے کیونکہ آپ قادر ہیں اور میں قادر نہیں اور آپ عالم ہیں اور میں عالم نہیں اور آپ علام الغیوب ہیں یا اللہ اگر ہو علم میں آپ کے کہ یہ کام بہتر ہے، میرے لئے میرے دین میں اور میری معاش میں اور میرے انجامِ کار میں تو تجویز کر دیجئے

اور آسان کر دیجئے اس کو میرے لئے پھر برکت دیجئے میرے لئے اس میں اور اگر ہو علم میں آپ کے کہ یہ کام بُرا ہے میرے لئے میرے دین میں اور میری معاش میں اور میرے انجام کار میں تو ہٹا دیجئے اس کو مجھ سے اور ہٹا دیجئے مجھ کو اس سے اور نصیب کر دیجئے مجھے بھلائی جہاں کہیں بھی ہو پھر راضی رکھئے مجھ کو اس پر۔

جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ / جولائی ۱۹۷۰ء

جدّہ سے احرام باندھنے کا حکم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ؛

رسالہ "الیواقیت فی احکام المواقیت" مصنفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم وزیدت حسناتہم کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا اور کچھ حصہ حضرت مصنف سے زبانی بھی سنا اور بحری حجاج مسافروں کے لئے جدہ سے جوازِ احرام کا مسئلہ ہماری "فقہی مجلس" کی متعدد مجالس میں زیرِ بحث آیا اور کافی غور وخوض ہوا اور "تحفۃ المحتاج شرح المنہاج" کی عبارت اور مخدوم ہاشم سندھی وغیرہ کی عبارات و آراء پر بھی غور ہوا اور بہت عرصہ پہلے انفرادی طور پر بھی بارہا غور کیا، کبھی انشراح صدر نہیں ہوا کہ جدہ سے احرام کے جواز کی صورت درست ہوسکتی ہے جو کچھ فہم قاصر میں آیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے :-

سرزمینِ حرم یا مکہ معظمہ میں آنے کے لئے دنیا کے کسی گوشہ سے آئیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدود مقرر فرمادی ہیں، بلا احرام ان سے تجاوز کرنا جائز نہیں، بیت الحرام کے شمال سے آنے والوں کے لئے "ذوالحلیفہ" ہے، مغرب سے آنے والوں کے لئے "جحفہ" ہے (جس کا جدید نام "رابغ" ہے) جنوب سے آنے والوں کے لئے "جبل یلملم" ہے (جس کا جدید نام "جبال سعدیہ" ہے)، مشرق سے آنے والوں کے لئے "قرن المنازل" ہے اور شمال مشرق سے آنے والوں کے لئے "ذات العرق" ہے (جس کا جدید نام عقیق ہے) اب یا تو انہیں مقامات پر گذر ہوگا تب تو انہیں مقامات سے احرام باندھنا ہوگا، یا ان سے فاصلے سے گزرنا ہوگا تو دائیں یا بائیں یہ مقامات واقع ہوں گے، ان کی محاذات اور مسامتت سے احرام باندھنا ہوگا اگر محاذات کی جگہ متعین نہ ہو سکے اور علم یا ظنِ غالب سے تعیین ممکن نہ ہو تو اس وقت کسی ایسے مقام سے احرام باندھنا ہوگا جس کا فاصلہ کم از کم دو مرحلہ عرفیہ یا تین مراحل شرعیہ ہوں کیونکہ قریب ترین مواقیت کا فاصلہ اتنا ہی ہے ظاہر ہے کہ میقات یا محاذاتِ میقات سے تجاوز کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ محاذاتِ میقات مجہول ہو، نیز جدّہ تمام فقہاءِ حنفیہ کی تصریحات کے مطابق

داخلِ میقات ہے، اب جو شخص بحر میں سفر کر رہا ہو، محاذاتِ میقات سے بلا احرام گذرے گا اور داخلِ میقات کے مقام پر پہنچے گا، اس پر تجاوز عن المیقات بلا احرام کا حکم لگ گیا،

رہا یہ کہ محاذات کا علم صحیح طریقہ سے ممکن نہیں ہے؟ تو یہ بات صحیح نہیں ہے، آج کل کے آلات و نقشہ جات اور جہاز رانوں کی معلومات کے پیش نظر یہ محض خیالِ خام ہے، نیز آج کل پاکستان سے جو جہاز جاتے ہیں جہاز راں تمام مسلمان ہوتے ہیں، اطلاع دینے والے کافر کا سوال بھی ختم ہو جاتا ہے، شیخ ابن حجر ہیتمی مکی کا یہ فرمانا کہ جب "تجاوز یمنةً ویسرةً یعنی دائیں بائیں ایسے حال میں کہ مسافر کا رخ مکہ کی سمت میں نہ ہو تو تاخیرِ احرام جائز ہے اور جب رُخ مکہ کی طرف ہو تو اس وقت محاذاتِ میقات سے احرام باندھنا ہوگا" قابلِ اطمینان نہیں ہے جب مسافروں کا قصد مکہ ہی ہے اور آگے چل کر صحیح تعیینِ محاذات کی مشکل ہو تو اس متعین محاذات کو چھوڑنا غیر معقول ہے جبکہ میقات اور محاذات میقات سے پہلے احرام باندھنا زیادہ بہتر ہے اور اسی وجہ سے ابن حجر کے چند شارحین نے ان کی رائے کی مخالفت کی ہے، اگرچہ مدارِ خلاف کچھ اور ہے صرف اتنی بات تجاوز عن المیقات کے لئے کہ مسافتِ جدّہ اور یلملم برابر ہے جدّہ سے احرام باندھنے کے لئے کافی نہیں، یہ تو صرف اس وقت حکم ہے کہ محاذاتِ میقات کا تعیین نہ ہو سکے، بہر حال جو کچھ ابن حجر ہیتمی نے فرمایا ہے وہ میری سمجھ سے بالاتر ہے اور تعجب ہے کہ موصوف نے اپنے دعویٰ کی تائید اور تدلیل میں کوئی فقہی یا حدیثی دلیل پیش نہیں فرمائی، اس لئے موصوف کے دعویٰ بلا دلیل پر اتنی بڑی بنیاد قائم کرنا صحیح نہیں اور میرے نزدیک فقہی مسئلہ یہی ہے کہ بحری مسافر کو یلملم کی محاذات سے احرام باندھنا ضروری ہے ورنہ دم لازم آئے گا اور توبہ بھی لازم ہوگی۔

شعبان ۱۳۸۸ھ

عائلی قوانین

عائلی قوانین جو سابق حکومت نے بزورِ اقتدار نافذ کئے تھے، قرآن و حدیث اور اسلامی مسلّمات کے خلاف ہیں، ملک بھر میں ان پر تنقیدیں کی گئیں، تمام دانشور حلقوں کی جانب سے ان پر احتجاج اور ان کی ترمیم و تنسیخ کا مطالبہ کیا گیا، سابق حکومت نے خود منسوخ ہونا گوارا کیا، مگر افسوس کہ ان غلط قوانین کی صلاح کے لئے آمادہ نہ ہو سکی، مقامِ مسرت ہے کہ موجودہ حکومت نے ان قوانین کو اسلامی شریعت کے مطابق بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے (روزنامہ جنگ، ۲ فروری ۱۹۷۰ء)

اگر یہ کارِ خیر موجودہ حکومت کے ہاتھوں انجام پائے تو مسلمانوں پر بڑا احسان ہوگا اور یہ کارنامہ موجودہ حکومت کے حسنات میں شمار ہوگا البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے لئے موزوں افراد کو منتخب کیا جائے جو اس کی صحیح اہلیت رکھتے ہوں، اسلامی شریعت کو ٹھیک سمجھتے ہوں، انہیں خدا کے سامنے جوابدہی کا احساس ہو اور عام مسلمانوں کو ان کے علم و دیانت پر اعتماد ہو، ورنہ ساری محنت بے کار جائے گی۔ (واللہ الموفق)

محرم الحرام ۱۳۹۰ھ

نزولِ مسیح علیہ السلام کا عقیدہ[1]

اسلامی اصول کی روشنی میں

حامداً و مصلیاً۔ امام حجۃ الاسلام غزالی "مقاصد الفلاسفہ" وغیرہ میں فرماتے ہیں :-

"یونانیوں کے علوم میں حساب، ہندسہ اور اقلیدس، یقینی علوم تھے ان کو یقینی اور صحیح پاکر ان کے بقیہ علوم الٰہیات، طبعیات، نجوم وغیرہ کو بھی بعض لوگ ان کی تقلید میں صحیح خیال کرنے لگے"۔

حقیقت میں یہ ایک عام چیز ہے نہ اس عہد کی تخصیص ہے نہ یونانیوں کے علوم کی خصوصیت اکثر جب لوگ کسی کی شخصیت سے مرعوب ہو جاتے ہیں ان کے بعض خود ساختہ غلط نظریات و افکار کو بھی یا تو صحیح مان لیتے ہیں یا اس میں تاویل کے درپے ہو جاتے ہیں تو اور ان کی شخصیت کو بچاتے رہتے ہیں، آج کل یہی وبا پھیل رہی ہے بعض مشاہیر جن کے بعض کمالات و خصائص عوام میں مسلم ہو گئے ہیں اکثر لوگ ان کی شخصیت اور بعض خصوصیات سے مرعوب ہو کر ان کے بقیہ خیالات و افکار کو بھی صحیح تصور کرنے لگتے ہیں اور بسا اوقات اس میں غلو کرکے ان ہی تحقیقات کو صحیح نظریات سمجھنے لگتے ہیں۔ اس عقلی ترقی کے دور میں یہ چیز خود دنیا کے دوسرے عجائبات کی طرح حیرت انگیز ہے۔ ایک طرف کبارِ امت اور اساطین اسلام عمائدین اشعری، ماتریدی یا ملا علی غزالی، رازی، آمدی وغیرہ جیسے محققینِ اسلام کی تحقیر کی جاتی ہے، کبار فقہاءِ امت اور اکابر محدثین کے فیصلوں کو بنظر اشتباہ دیکھا جاتا ہے اور دوسری طرف قرنِ حاضر کے بعض اربابِ قلم کی قلمی جولانیوں سے متاثر یا ان کی شخصیت سے مرعوب ہو کر ان کے ہر فکر اور ہر خیال کو قطعی خیال کرنے لگتے ہیں۔ کچھ دنوں سے ہندوستان کے مؤقر جریدہ "صدق" میں نزول مسیح علیہ السلام کا عقیدہ زیر بحث ہے جو مدتوں پہلے سے فیصلہ شدہ اور جو "فتنہ قادیانیت" کی وجہ سے پھر تقریباً چالیس سال زیر بحث رہا اور جس پر متعدد کتابیں تصنیف ہوئیں۔ مولوی ابو الکلام صاحب، مولوی جار اللہ صاحب مولانا عبید اللہ صاحب سندھی وغیرہ کی تحریرات میں یہ چیز آئی اور مولانا آزاد نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ اگر یہ عقیدہ نجات کے لئے ضروری ہوتا تو قرآن میں کم سے کم ((واقیموا الصلوٰۃ)) جیسی تصریح

---

[1] یہ مقالہ سہ روزہ "صدق" لکھنؤ کی چھ اشاعتوں (۲۸ شعبان لغایۃ ۱۲ رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ) میں شائع ہوا تھا۔

ضروری تھی اور ہمارا اعتقاد ہے کہ کوئی مسیح اب آنے والا نہیں الخ، اس وقت بھی میں نے اس خیال کی تردید میں ایک مفصل مضمون لکھا تھا جو بعض اربابِ جرائد کی مداہنت سے شائع نہ ہو سکا اور نہ اس کا مسودہ میرے پاس ہے، غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کو اصل داعیہ اس قسم کے خیالات میں عقلی استبداد ہے اور بدقسمتی سے اپنے عقلی معیار کو ان حضرات نے اتنا بلند سمجھا ہے کہ نبوت کا منصب گویا ان عقولِ قاصرہ کو دے دیا گیا، ہو سکتا ہے کہ ہمارے بعض نیک دل اربابِ قلم ان ہی حضرات کی شخصیتوں سے مرعوب ہو کر غیر شعوری تقلید میں کچھ درمیانی صورت اختیار کرنے لگے ہوں۔

اہلِ حق کے مسلک کی تائید میں جنابِ محترم مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے ایک مقالہ "صدق" میں شائع فرمایا، اس کے جواب میں جے پور کے ایک محترم نے بہت طویل مقالہ "صدق" میں شائع فرمایا جس کی تنقیح حسب ذیل امور میں ہو سکتی ہے :۔

(۱) نزولِ مسیح کا عقیدہ صحیح ہے لیکن ظنی ہے یقینی نہیں۔

(۲) نزولِ مسیح کے بارے میں احادیث اصطلاحی تواتر کو نہیں پہنچیں۔

(۳) نزولِ مسیح کے بارے میں اجماع کا نقل مشتبہ ہے، غیب کے آئندہ امور میں اجماع محلِ نظر ہے ممکن ہے کچھ اور اجزاء بھی تنقیح طلب ہوں، لیکن اصلی مدار ان تین چیزوں پر ہے اور یہی زیادہ اہم بھی ہیں، اس وقت اس مختصر فرصت میں اس مسئلہ کی نوعیت میں بعض خطرناک اصولی غلطیاں جو پیش آ رہی ہیں ان کا تصفیہ مقصود ہے، جے پوری صاحب نہ تو میرے مخاطبِ خاص ہیں نہ ان کے مضمون کی سطر سطر کی تردید یا گرفت منظور ہے نہ طالبعلمانہ بحثوں میں الجھنا مقصود ہے نہ ان کی نیت پر حملہ ہے صرف طالبِ حق کے لئے چند اصولی اساسی امور بیان کرنے ہیں، باقی جحود و عناد کا تو کوئی علاج نہیں، والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔

(۱) دینِ اسلام کے مہمات عقائد و اعمال یا اصول و فروع کا ایک ذخیرہ جیسے قرآن کریم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے ہم تک پہنچا ہے، اسی طرح اعتقادی و عملی ضروریاتِ دین ہم تک بذریعہ توارث یا تعامل طبقہ بہ طبقہ بھی پہنچتے رہے ہیں بلکہ اگر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ دینِ اسلام اور اس کی کل ضروریات ہم کو اسی توارث کے ذریعہ پہنچی ہیں، لاکھوں کروڑوں

مسلمان جن کو نہ تو قرآنی تعلیمات کی پوری خبر ہے نہ احادیثِ نبویہ کا علم ہے لیکن باوجود اس کے وہ دین کی مہمات وضروریات سے واقف رہتے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ عوام کا ایمان اجمالی ہوتا ہے تفصیلات کے وہ اس وقت مکلف ہوتے ہیں جب ان کے آجائے یہ حق تعالیٰ کا ایک مستقل احسان ہے کہ باوجود اس دینی توارث کے قرآنِ کریم وحدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں ایک ایسا دستور اساسی بھی دے دیا کہ اگر کسی وقت مدتوں کے بعد اس دینی عملی توارث میں فتور یا قصور آجائے یا لوگ منحرف ہو جائیں تو تجدید واحیاء کے لئے ایک مکمل "اساسی قانون" اور علمی ذخیرہ بھی محفوظ رہے تاکہ امم سابقہ کی طرح ضلالت کی نوبت نہ آئے اور حق تعالیٰ کی حجت پوری ہو جائے اور ظاہر ہے جب کتابِ الٰہی "خاتم الکتب الالٰہیہ" ہو اور نبی کریم خاتم الانبیاءؑ ہوں اور دین خاتم الادیان اور امت خیر الامم ہو تو اس کے لئے یہ تحفظات ضروری تھے اور اسی لئے اس علمی قانون پر عمل کرنے کے لئے "عملی نمونوں کی ایک جماعت بھی ہمیشہ موجود رہے گی تاکہ علمی وعملی دونوں طرح حق وباطل کا امتیاز قائم رہ سکے اور پوری طرح تحفظ کیا جائے اور مزید اطمینان یا اتمامِ حجت کے لئے دونوں باتوں کا صاف صاف نہایت مؤکد طریقہ پر اعلان بھی کر دیا، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :۔

(۱) «إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون» حجر آیۃ نمبر ۹	ہم ہی نے قرآن کو اتارا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

(۲) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

«لا تزال طائفة من أمتي قائمين على الحق لا يضرهم من خالفهم ولا من خذلهم حتى يأتي أمر الله وهم على ذلك» (بخاری)	یعنی ایک گروہ قیامت تک ہمیشہ کے لئے دینِ حق پر قائم رہے گا کسی کے امداد نہ کرنے سے یا مخالفت کرنے سے ان کا کچھ نہ بگڑے گا۔

اور میرے خیال ناقص میں تو «فاسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون» (اگر تم نہیں جانتے ہو تو اہل علم سے پوچھتے رہو) میں بھی ایک لطیف اشارہ ہے کہ ہر دور میں کچھ اہلِ حق ضرور ہوں گے۔

بہرحال اتنی بات واضح ہوئی کہ "محافظینِ حق" اور "قائمین علی الحق" کا ایک گروہ قیامت تک ہوگا جس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ مہماتِ دین کے لئے صرف علمی اور ذہنی دستورِ اساسی ہی نہیں بلکہ ایک "عملی نمونہ" بھی موجود رہے گا اور اسی طرح توارث اور تعامل کا سلسلہ بدستور جاری رہے گا اگر بالفرض وہ علمی و دفتری قانون دنیا سے مفقود بھی ہو جائے تو حصولِ مقصود کے لئے اس گروہ کا وجود بھی کافی ہوگا۔

دین اسلام کی بہت سی ضروریات اور قطعیات مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، نکاح، طلاق خرید و فروخت کی اجازت، شراب خوری، زنا کاری، قتل و قتال کی حرمت وغیرہ وغیرہ بیسیوں باتیں اسی توارث کے ذریعہ سے ہم تک پہنچتی رہی ہیں بلکہ نماز کی بعض کیفیات اور زکوٰۃ کی بعض تفصیلات نہ تو صریح قرآن سے ثابت ہیں نہ اس بارے میں احادیث "اصطلاحی متواتر" ہیں لیکن باوجود اس کے دنیا جانتی ہے کہ وہ سب چیزیں ضروری اور قطعی ہیں اور اس میں کوئی شبہ بھی نہیں۔

(۲) "ادلہ سمعیہ" یعنی عقائد و احکام کے ثبوت کے لئے قرآن و حدیث کی نصوص چار قسم کی ہوتی ہیں:-

الف:- ثبوت و دلالت دونوں قطعی ہوں۔

ب:- ثبوت قطعی ہو دلالت ظنی ہو۔

ج:- دلالت قطعی ہو ثبوت ظنی ہو۔

د:- ثبوت و دلالت دونوں ظنی ہوں۔

ثبوت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ و رسول کا کلام ہے، دلالت کے معنی یہ کہ اس کے کلام کی مراد یہ ہے۔

قرآن و احادیثِ متواترہ ثبوت کے اعتبار سے دونوں قطعی ہیں البتہ دلالت کے اعتبار سے کبھی قطعیت ہوگی کبھی ظنیت۔

اخبارِ آحاد میں تیسری چوتھی قسم پائی جاتی ہے، مزید تفصیل کے لئے عبدالعزیز بخاری کی کتاب کشف الاسرار شرح اصولِ فخر الاسلام اور شرحِ تحریر الاصول ابن امیر حاج وغیرہ

ملاحظہ ہوں پہلی قسم سے انکار کفر ہے، دوسری تیسری قسم کے انکار سے کفر تک نوبت نہیں پہنچتی۔

(۳) تصدیق رسالت جو بنیادی عقیدہ ہے اس میں تصدیق کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات کو دل قبول کرے اور تسلیم کرے، قرآن میں ((و صدق به)) اور ((ویسلموا تسلیماً)) سے یہی مراد ہے صرف، کسی شے کا علم میں آجانا جو منطقی و معقول تصدیق ہے قطعاً کافی نہیں ہے ورنہ صرف معرفت تو بہت سے یہودیوں کو اور ہرقل کو بھی حاصل تھی لیکن مسلمان ہونے کے لئے اور نجات کے لئے اتنی بات کافی نہ ہوئی۔

(۴) احادیثِ متواترہ کا افادۂ قطعیت اہلِ حق بلکہ امت کا اجماعی مسئلہ ہے۔

(۵) اصطلاحی تواتر میں ایک شرط یہ ہے کہ ہر دور میں نقل کرنے والے اتنے ہوں کہ غلطی اور شبہ کی گنجائش نہ رہے، نقل کرنے والوں کی کوئی خاص تعداد مقرر نہیں، بسا اوقات کسی خاص موقع پر پانچ خاص آدمیوں کی روایت سے یقین حاصل ہوتا ہے جو پچاس دوسروں سے کسی دوسرے موقع پر حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لئے علماءِ اصول نے تصریح کردی ہے کہ بیان کرنے والوں یا سننے والوں کے مرتبہ سے فرق پڑ جاتا ہے اور کبھی مضمون اور بات کی نوعیت سے بھی تفاوت ہو سکتا ہے۔ دیکھئے فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت (۲-۱۱۰) مطبوعہ مصر۔

(۶) بعض اصولیین کے نزدیک تواترِ حدیث کا مدار راویوں کی کثرت اور طرق و مخارج کی تعداد پر نہیں بلکہ دارومدار "تلقی بالقبول" پر ہے جن احادیث کو قرن اول یعنی صحابہؓ کے عہد ہی میں امت نے قبول کر لیا ہے وہی متواتر ہیں۔ اس تعریف کے پیشِ نظر متواتر احادیث کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے، بعض محققین نے اسی تعریف کو زیادہ پسند کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عملی اعتبار سے قبولیت عامہ نفسِ کثرتِ رواۃ سے کہیں زیادہ مؤثر اور قوی ہے اسی کو ہم نے توارث و تعامل سے تعبیر کیا ہے۔ عنقریب اس بات کی تائید دوسری طرح سے بھی ہو جائے گی۔

(۷) قرن اول میں ناقلین شرطِ تواتر پر ہوں اور قرنِ ثانی و ثالث میں کمی آجائے یہ محض عقلی احتمال ہے۔ ذخیرہ حدیث میں اس کی مثال نہیں ملتی بلکہ احادیث کی روایت میں واقعہ یہ ہے کہ یہ راوی بڑھتے گئے اور قرن ثانی و ثالث میں "اخبارِ آحاد" کے راوی بھی اس کثرت کو پہنچ گئے ہیں جو قرنِ اول میں احادیثِ متواترہ کے بھی نہیں تھے۔

جے پوری صاحب کو یہاں بھی بظاہر اشتباہ ہے اگرچہ آخری جزو کو خود بھی ایک مقام پر تسلیم کر گئے ہیں۔

(۸) احادیثِ متواترہ کا ذخیرۂ حدیث میں نہ ہونا یا نہایت کم ہونا دونوں دعوے تحقیق اور واقعیت کے خلاف ہیں، حافظ ابن حجر وغیرہ محققین اس خیال کی تردید کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس قسم کے خیالات کا منشاء احوالِ رواۃ وکثرتِ طرق پر قلتِ اطلاع کے سوا اور کچھ نہیں بلکہ فرماتے ہیں کہ صحاحِ ستہ میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ حافظ جلال الدین سیوطی نے تو دو مستقل رسالے تصنیف کئے ہیں جن میں احادیثِ متواترہ کو جمع کیا ہے (۱) "الازہار المتناثرۃ فی الاخبار المتواترۃ" یہ رسالہ چھپ چکا ہے (۲) تدریب الراوی (ص ۱۹۱) فتح المغیث للعراقی (۲۷-۱) فتح المغیث للسخاوی (ص ۹۵)

(۹) محدثین میں کبارِ محدثین کی رائے یہ ہے کہ صحیح بخاری وصحیح مسلم کی وہ احادیث صحیحہ جو درجۂ تواتر کو نہیں بھی پہنچیں وہ بھی قطعی ہیں اور ان سے علمِ یقینی حاصل ہوتا ہے۔ استاذ ابومنصور بغدادی، امام ابواسحٰق اسفرائنی، امام الحرمین، امام ابوحامد اسفرائینی، قاضی ابوطیب طبری، امام ابواسحٰق شیرازی، شمس الائمہ سرخسی حنفی، قاضی عبدالوہاب مالکی، ابویعلیٰ حنبلی، ابوخطاب حنبلی، ابن فورک، ابن طاہر مقدسی، ابونصر عبدالرحیم شافعی ابن صلاح وغیرہ محققین مذاہب اربعہ کا یہی مذہب ہے بلکہ اکثر اشاعرہ اور عام محدثین کا بھی یہی مسلک ہے اور یہی رائے ہے متاخرین میں سے ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن حجر کی، سیوطی کا یہی دعویٰ ہے۔ نووی وغیرہ نے جو خلاف کیا ہے حافظ ابن حجر نے اس کو بھی نزاعِ لفظی بتایا ہے "الانصاح فی المحاکمۃ بین النووی وابن الصلاح" ابوعلی غسانی کی جو اس موضوع پر مستقل کتاب ہے وہ بھی نزاعِ لفظی ٹھہراتے ہیں فرماتے ہیں کہ: "علم قطعی نظری" کا افادہ سب کے یہاں مسلم ہے۔ امام ابن طاہر مقدسی تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ جو صحیحین کی روایتیں نہیں ہیں لیکن صحیحین کی شرط پر ہوں وہ بھی مفیدِ قطع ہیں، بلکہ کبار تابعین میں سے عطاء بن ابی رباح فرماتے ہیں:-

إن ما اجمعت علیہ الامۃ	جس حدیث پر امت کا اتفاق ہو کہ یہ صحیح ہے
اقوی من الاسناد۔	نفسِ اسناد کے تواتر سے یہ زیادہ قوی چیز ہے۔

امام ابو اسحٰق اسفرائینی فرماتے ہیں :۔

أهل الصنعة مجمعون على أن الأخبار التي اشتمل عليها الصحيحان مقطوع بصحة أصولها ومتونها فمن خالف حكمه خبر أمنها وليس له تأويل سائغ للخبر نقضنا حكمه لأن هذه الأخبار تلقتها الأمة بالقبول اھ ۔ (فتح المغیث للسخاوی)

محدثین سب اس پر متفق ہیں کہ بخاری و مسلم کی احادیث سب قطعی ہیں، اگر بغیر صحیح تاویل کوئی ایک حدیث کی بھی مخالفت کرے گا تو اس کے حکم کو ہم توڑیں گے، کیونکہ امتِ محمدیہ نے ان احادیث کو قبول کر لیا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں :۔

الإجماع على القول بصحة الخبر أقوى في إفادة العلم من مجرد كثرة الطرق .

کسی حدیث کی صحت پر علماء کا متفق ہونا افادۂ علم (قطعیت) میں کثرتِ طرق سے زیادہ قوی ہے۔

(۱۰) متواتر لفظی کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ بعینہٖ ایک ہی لفظ سے وہ احادیث مروی ہوں، بلکہ جس لفظ سے بھی ہوں مضمون ایک ہونا چاہیئے اور ایک یا دو محدثین نے جو نفیِ تواترِ حدیث کا دعویٰ کیا تھا یا صرف ایک ہی مثال بتلائی تھی بعض محققین کے نزدیک ان کی مراد بھی یہی ہے کہ ایک لفظ سے متواتر کی مثال نہیں ملتی ۔ عزیز الوجود ہے گویا ان کے نزدیک بھی احادیث متواترہ بہت ہیں لیکن ایک لفظ سے نہیں ہیں، صرف حدیث ((من كذب علي متعمداً فليتبوأ مقعده من النار)) کو ایسا بتلایا گیا ہے اس بنا پر نزاع بھی لفظی ہو جاتا ہے، متواترِ معنوی کے یہ معنی نہیں کہ لفظ مختلف ہوں اور مضمون سب میں ایک ہو بلکہ یہ معنی ہیں کہ ہر ایک حدیث میں مضمون الگ الگ ہو اور ایک بات قدرِ مشترک نکل آئے جیسے احادیثِ معجزات کہ ہر ایک اگرچہ اخبارِ آحاد میں سے ہے لیکن نفس ثبوتِ معجزہ سب میں قدرِ مشترک ہے، اسی کو اصطلاح میں تواترِ معنوی یا تواترِ قدرِ مشترک کہتے ہیں، ملاحظہ ہو "مسلم الثبوت" اور اس کی شرح "فواتح الرحموت"۔

(۱۱) ادلۂ شرعیہ میں ایک دلیل "اجماعِ امت" ہے، اگر اس اجماع کا ثبوت قطعی ہو تو اجماع

قطعی ہوگا اور اس کا منکر بھی کافر ہوگا جیسے دوسری قطعیاتِ شرعیہ کا منکر، بعض عقائد اگرچہ اخبارِ آحاد سے ثابت ہوں لیکن ان پر امت کا اجماع ہو جائے وہ بھی قطعی ہو جاتے ہیں، کما فی التلویح وشرح التحریر (۳-۱۱۶) آئندہ "غیبی امور" کے متعلق "علاماتِ قیامت" کے بارے میں اگر اجماع ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس بارے میں مخبرِ صادق سے جو نقل ہے وہ صحیح ہے، ملاحظہ ہو تفصیل کے لئے فواتح الرحموت شرح مسلم (۲-۲۹۶)، شرح تحریر الاصول لابن امیر الحاج (۳-۱۱۶) "حدوثِ عالم" پر اجماع کے معنی بھی یہی ہیں جیسے فتح الباری (۱۲-۱۷۷) میں تقی الدین ابن دقیق العید سے منقول ہے، بے پوری صاحب نے اس بارے میں کسی قدر تلبیس سے کام لیا ہے، فلیتنبہ۔

(۱۲) جو چیز قرآنِ کریم یا احادیثِ متواترہ سے ثابت ہو یا اجماعِ امت سے اور دلالت بھی قطعی ہو تو وہ سب ضروریاتِ دین میں داخل ہیں "ضروریاتِ دین" کے معنی یہ ہیں کہ ان کا دینِ اسلام سے ہونا بالکل بدیہی ہو خواص سے گذر کر عوام تک اس کا علم پہنچ گیا ہو، یہ نہیں کہ ہر عامی کو اس کا علم ہو، کیونکہ بسا اوقات تعلیمِ دین نہ ہونے سے بعض "ضروریاتِ دین" کا علم عوام کو نہیں ہوتا لیکن تعلیم کے بعد اور جان لینے کے بعد اس پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے، علماء نے تصریح فرما دی ہے کہ "بعض متواتراتِ شرعیہ کے جہل سے تو کفر نہیں لازم آتا، لیکن معلوم ہونے کے بعد جحود و انکار سے آدمی کافر ہو جاتا ہے ملاحظہ ہو "جواہر التوحید" کی شرح (ص۱۵۱) و حاشیہ "الموافقات" للشاطبی (۳-۱۵۶) و اکفار الملحدین (ص۲)۔

(۱۳) "ضروریاتِ دین" کا انکار کرنا یا اس میں خلافِ مقصود تاویل کرنا دونوں کو علماءِ کرام نے موجبِ کفر بتلایا ہے، حجۃ الاسلام غزالی نے اس موضوع میں "التفرقۃ بین الاسلام والزندقہ" مستقل کتاب لکھی ہے اور فیصلہ کن بحث فرمائی ہے، مدت ہوئی مصر سے چھپ کر آگئی ہے اور غالباً ہندوستان میں بھی طبع ہوئی ہے اور امام العصر محدثِ وقت حضرت استاذ مولانا محمد انور شاہؒ کی کتاب "اکفار الملحدین فی ضروریات الدین" اس موضوع پر نہایت ہی جامع اور بے مثل کتاب ہے۔

(۱۴) جو چیز متواتر ہو جائے وہ دین میں "ضروری" ہو جاتی ہے کیونکہ متواتر کا افادہ علم ضروری

قطعی مسلمات سے ہے پس اگر کسی کو اس کا علم ہو جائے کہ یہ حدیث احادیثِ متواترہ میں سے ہے یا یہ بات حدیثِ متواتر سے ثابت ہے تو اس پر ایمان لانا ضروری ہو جاتا ہے خواہ اس کا تعلق کائناتِ ماضیہ سے ہو یا مغیباتِ مستقبلہ سے ہو یا مغیباتِ مستقبلہ سے، خواہ عقائد کے متعلق ہو خواہ احکام کے بارے میں ہو، تصدیقِ رسالت کے لئے اس سے چارہ نہیں ورنہ تکذیبِ رسول کا کفر ہونا کسی دلیل کا محتاج نہیں، بہر حال تصدیقِ رسول کا ایمان کے لئے ضروری ہونا اور تکذیب سے کفر کا لازم آنا یہ خود دین کی ضروریات میں داخل ہے کتبِ کلامیہ اور کتبِ اصولِ فقہ میں یہ قواعدِ کلیہ "مفصل مل جاتے ہیں، بطورِ نمونہ ہم اس سمندر سے چند قطرے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں:۔

(۱) ومن اعترف بكون شيء من الشرع ثم جحده كان منكراً للشرع وإنكار جزء من الشرع كإنكار كله (شرح التحریر ۳-۱۲۳)

جو شخص یہ مانے کہ یہ چیز شریعت میں ہے باوجود اس کے اس کا انکار کرے تو یہ کل شریعت کا انکار ہے۔

(۲) وصح الإجماع على أن كل من جحد شيئاً صح عندنا بالإجماع أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أتى به فقد كفر أو جحد شيئاً صح عنده بأن النبي صلى الله عليه وسلم قاله فهو كافر۔

(الملل لابن حزم ۱-۲۵ و ۲۵۶)

اس پر اجماع ہے کہ جس چیز کے متعلق یہ اتفاق ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں اس کا انکار کفر ہے یا یہ مانتا ہو کہ آپ فرما چکے ہیں، باوجود اس کے نہ ماننے یہ کفر ہے۔

(۳) من أنكر الأخبار المتواترة في الشريعة مثل حرمة لبس الحرير على الرجال كفر (شرح فقہ اکبر نقلاً عن المحیط)

کسی شرعی حکم کی حدیثِ متواتر ہو اور اس سے انکار کیا جاوے تو کافر ہو گا جیسے ریشمی لباس مردوں کے لئے۔

(۴) فصار منكر المتواتر ومخالفه كافراً

(اصول فخر الاسلام بحث السنہ)

متواتر کا انکار یا مخالفت دونوں کفر ہیں۔

(۵) والصحيح أن كل قطعي من الشرع

دین میں جو چیز قطعیات کو پہنچ چکی ہو وہ

فهو ضروري .

ضروریاتِ دین میں داخل ہے ۔

(المحصول للرازی بحوالہ اکفار الملحدین صہ ۶۷)

(۶) شروط القطع في النقليات التواتر الضروري في النقل والتجلي الضروري في المعنى (ایضاً صہ ۶۹)

شرعی امور جب تواتر سے ثابت ہوں اور معنی بھی واضح ہوں یہی قطعیت ہے ۔

(۷) كل ما لم يحتمل التأويل في نفسه وتواتر نقله ولم يتصور أن يقوم بُرهان على خلافه فمخالفته تكذيب محض (التفرقۃ للغزالی صہ ۱۴)

جس چیز کی نقل متواتر ہو اور تاویل کی گنجائش نہ ہو اور کوئی دلیل خلاف پر قائم نہ ہو تو ایسی چیز کی مخالفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ہے ۔

(۸) بل إنكار المتواتر عدم قبول إطاعة الشارع. .. ورد على الشريعة وإن لم يكذب وهو كفر بواح نفسه .

بلکہ حقیقت میں تو متواتر کا انکار شارع علیہ الصلاۃ والسلام کی عدمِ اطاعت ہے اور شریعتِ اسلام کا رد ہے جو خود کھلا ہوا کفر ہے اگرچہ تکذیب نہ کرے ۔

(شرح الاشباہ للحموی رد المختار، طحطاوی بحوالہ اکفار الملحدین)

(۹) ومن أنكر شيئاً من شرائع الإسلام فقد أبطل قول لا إله إلا الله .

شریعتِ اسلامیہ کی کسی چیز سے انکار کرنا کلمۂ اسلام سے انکار کرنا ہے ۔

(السیر الکبیر للامام محمد بحوالہ اکفار الملحدین)

(۱۰) فلا خلاف بين المسلمين أن الرجل لو أظهر إنكار الواجبات الظاهرة المتواترة ونحو ذلك فإنه يستتاب فإن تاب وإلا قتل كافراً مرتداً اھ .

امتِ مسلمہ میں کوئی خلاف اس بارے میں نہیں کہ جو کوئی متواترات سے انکار کرے چاہے اس کا کرنا فرض ہو یا ترکِ حرام ہو اس سے توبہ نہ کرے تو کافر ہے اور واجب القتل ہے ۔

(شرحِ عقیدۂ طحاویہ مطبوعہ حجاز صہ ۲۴۶)

(۱۱) لا یکفر أهل القبلة إلا فیما فیه إنکار ما علم مجیئه بالضرورة أو أجمع علیه کاستحلال المحرمات (المواقف)، ومثله فی العضدیه۔

اہلِ قبلہ کی اس وقت تک تکفیر نہیں کی جاتی جب تک ضروریاتِ دین کا یا کسی ایسی چیز کا جس پر اجماع منعقد ہو، انکار نہ کرے مثلاً حرام کو حلال سمجھنا۔

(۱۲) وکذلک یقطع بتکفیر من کذب أو أنکر قاعدة من قواعد الشریعة وما عرف یقیناً بالنقل المتواتر من فعل رسول صلی اللہ علیه وسلم۔

جو شخص تکذیب کرے یا کلیاتِ شریعت میں سے کسی قاعدہ سے انکار کرے یا جو چیز نبی کریم سے متواتر ثابت ہے اس سے انکار کرے اس کی تکفیر قطعی و یقینی ہے۔

(۱۳) وخرق الإجماع القطعی الذی صار من ضروریات الدین کفر۔

قطعی اجماع جو ضروریاتِ دین میں داخل ہے اس کا خلاف کرنا کفر ہے۔

(کلیات أبی البقاء بحوالہ اکفار الملحدین)

(۴) ضروریاتِ دین کی مثال میں علماءِ امت اپنی اپنی کتابوں میں دو چار مثالیں ذکر کر دیتے ہیں، ناظرین کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ ضروریاتِ دین بس یہی ہیں آگے سلسلہ ختم ہو گیا، یہ چیز جے پوری صاحب کو بھی پیش آرہی ہے، حالانکہ ان اکابر کا مقصود محض مثال پیش کرنا ہے، نہ استقصاء، نہ حصر، نہ تخصیص، اس غلط فہمی کے ازالہ کے لئے ذیل میں ہم ان مثالوں کو ایک جگہ جمع کر دیتے ہیں جو سرسری محنت سے مل سکیں تاکہ اس مختصر فہرست سے خود بخود یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ مقصود تمثیل تھی، نہ پوری فہرست، کتبِ فقہ، اصولِ فقہ، کتبِ کلام اصولِ حدیث میں ذیل کی مثالیں ملتی ہیں۔

اثباتِ علمِ الٰہی، قدرتِ محیط، ارادۂ کاملہ، صفتِ کلام، قرآن کریم، قِدَمِ قرآن، قِدَمِ صفاتِ باری، حدوثِ عالم، حشرِ اجساد، عذابِ قبر، جزاء و سزا، رؤیتِ باری قیامت میں، شفاعتِ کبریٰ، حوضِ کوثر، وجودِ ملائکہ، وجودِ کراماً کاتبین، ختمِ نبوت، نبوت کا وہبی ہونا، مہاجرین و انصار کی اہانت کا عدمِ جواز، اہلِ بیت کی محبت، خلافتِ شیخین، پانچ نمازیں، فرض رکعات کی تعداد، تعدادِ سجدات، رمضان کے روزے، زکاۃ، مقادیرِ زکاۃ، حج، وقوفِ عرفات،

تعدادِ طواف، جہاد، نماز میں استقبالِ کعبہ، جمعہ، جماعت، اذان، عیدین، جوازِ مسح خفین، عدم جواز سبّ رسول، عدم جوازِ سبِّ شیخین، انکارِ جسم، انکارِ حلول اللہ، عدمِ استحلالِ محرمات، رجمِ زانی محصن حرمتِ لُبسِ حریر (ریشم پہننا) جوازِ بیع، غسلِ جنابت، تحریمِ نکاحِ امہات، تحریم نکاحِ بنات، تحریمِ نکاحِ ذوی المحارم، حرمتِ خمر، حرمتِ قمار، اس وقت یہ اکیاون مثالیں پیش کی گئی ہیں، اب تو خیالِ مبارک میں آ گیا ہوگا کہ بعض وہ امور جن کی طرف التفات بھی نہ ہوگا وہ بھی ضروریاتِ دین میں داخل ہیں، اب ہم اس بحث کے آخر میں محققِ ہند حضرت عبد العزیزؒ صاحب کی عبارت کا اقتباس پیش کرتے ہیں پوری عبارت اکفار الملحدین میں منقول ہے اس سے انشاء اللہ یہ بات بالکل بدیہی ہو جائے گی کہ ضروریاتِ دین کے لئے ضابطہ کلیہ کیا ہے اور جو چیزیں بطور تمثیل پیش کی جاتی ہیں ان کا دائرہ صرف تمثیل ہی کی حد تک محدود ہے فرماتے ہیں:

ضروریات الدین منحصرة عندهم في ثلاثة بمدلول الكتاب بشرط أن يكون نصًا صريحًا لا يمكن تأويله كتحريم البنات والأمهات، وبمدلول السنة المتواترة لفظًا أو معنًى، سواء كان من الاعتقاديات أو من العمليات وسواء كان فرضًا أو نفلًا . . . . والمجمع عليه إجماعًا قطعيًا كخلافة الصديق والفاروق ونحو ذلك ولا شبهة أن من أنكر أمثال هذه الأمور لم يصح إيمانه بالكتاب والنبيين۔	ضروریاتِ دین تین قسم کے ہیں پہلی قسم یہ کہ تصریح نصِ قرآنی سے ثابت ہوں جیسے ماں بیٹی سے نکاح کا حرام ہونا۔ دوسری قسم یہ کہ سنتِ متواترہ سے ثابت ہوں، تواتر خواہ لفظی ہو خواہ معنوی، عقائد میں ہو یا اعمال میں ہو فرض ہو یا نفل ہو۔ تیسری قسم یہ ہے کہ اجماعِ قطعی سے ثابت ہوں جیسے صدیقِ اکبر و فاروقِ اعظم کی خلافت وغیرہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس قسم کے امور سے اگر انکار کیا جائے تو اس شخص کا ایمان قرآن اور انبیاء پر صحیح نہیں ہے۔

امام العصر محدث حضرت استاذ مولانا محمد انور شاہ مزید توضیح کے ساتھ فرماتے ہیں کہ

"ضروری کے معنی یہ ہیں کہ حضرت رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت ضروری ہو، دین سے ہونا یقینی ہو اور جو بھی اس کا شرعی مرتبہ ہو اسی درجہ کا عقیدہ اس کا ضروری ہوگا، مثلاً نماز فرض ہے اور فرضیت کا عقیدہ بھی فرض ہے اور اس کا سیکھنا بھی فرض ہے اور انکار کفر ہے، اسی طرح مسواک کرنا سنت ہے اور سنت ہونے کا عقیدہ فرض ہے اور سیکھنا سنت اور انکار کرنا کفر ہے اور عملاً ترک کر دینا باعثِ عتاب یا عقاب ہے" اب امید ہے کہ اس تشریح سے ضروریاتِ دین کی حقیقت واضح ہو گئی ہوگی۔ بات تو بہت لمبی ہو گئی لیکن توقع ہے کہ طالبِ حق کے لئے نہایت کارآمد ثابت ہوگی اور آج کل جو عام طور سے ایمان و کفر کے قواعد یا مسائل میں عوام کو یا عالم نما جاہلوں کو شبہات و شکوک یا وساوس پیش آ رہے ہیں ان کا بھی اس سے تصفیہ ہو جائے گا اس طولانی تمہید کے بعد ان ہی اصولِ مذکورہ کی روشنی میں ہم نزولِ مسیح علیہ السلام کے عقیدہ کو پرکھتے ہیں، اگرچہ ہمارا اصلی مقصد تو پورا ہو گیا، اب طالبِ حق خود ہی ان اصولِ اسلامیہ اور قواعدِ مسلمہ کی روشنی میں تفتیش کر کے مزید ضروریاتِ دین کا سراغ بھی لگا سکے گا لیکن تبرعاً چند مختصر گذارشات بھی ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:"نزول مسیح علیہ السلام کے تین پہلو ہیں، قرآنی حیثیت اس کی کیا ہے؟ حدیثی مرتبہ کیا ہے؟ اور اجماعِ امت کا فیصلہ اس بارے میں کیا ہے؟ تینوں امور واضح ہونے کے بعد خود بخود یہ چیز اظہر من الشمس ہو جائے گی کہ عقیدۂ نزول ضروریاتِ دین میں سے ہے یا نہیں۔

نزولِ مسیح اور قرآنِ کریم

(۱) ((وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا)) زخرف - ۶۱ — اور بے شک وہ نشانی ہے قیامت کی پس نہ شک کرو اس میں۔

ترجمان القرآن حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ صحابہ میں سے، تابعین میں سے ابو العالیہ، ابو مالک، عکرمہ، حسن، قتادہ، ضحاک، مجاہد وغیرہ سے آیتِ کریمہ کی صحیح تفسیر یہ منقول ہے کہ: "اِنَّہٗ" کی ضمیر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے، قرآنی سیاق کا تقاضا بھی یہی ہے اور "عِلْم" کے معنی نشانی کے ہیں۔ تفسیر ابن جریر، تفسیر ابن کثیر، تفسیر درِ منثور میں مجاہد سے مروی ہے،

قال آیۃ للساعۃ خروج عیسی ابن مریم قبل یوم القیامۃ.	فرمایا: قیامت کی نشانی ہے حضرت عیسیٰ بن مریم کا قیامت سے پہلے تشریف لانا۔

حافظ ابنِ کثیر دعویٰ کرتے ہیں کہ یہی تفسیر صحیح ہے، ظاہر ہے کہ کسی صحابی سے اس کے خلاف تفسیر جب منقول نہیں تو ایسی صورت میں حبرِ اُمت اور بحرِ اُمت ترجمان القرآن ابن عباس کی تفسیر سے زیادہ راجح کون سی تفسیر ہو سکتی ہے، اب ترجمہ آیتِ کریمہ کا یہ ہوا کہ "یقینی یہ ہے کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی نشانی ہے پس اس میں شک نہ کرو"۔ تفصیل کے لئے تفسیر ابن جریر (۲۵-۵۴) مطبوعہ میریہ، تفسیر ابن کثیر (۹-۱۴۶) مطبوعہ میریہ، الدر المنثور (۶-۲۰) طبع مصر، عقیدۃ الاسلام فی حیات عیسیٰ علیہ السلام (ص۳) ملاحظہ ہو، اس لئے عقیدۃ الاسلام (ص ۵) میں حضرت امام العصرؒ فرماتے ہیں:۔

اذا تواترت الاحادیث بنزولہ وتواترت الآثار وھو المتبادر من نظم الآیۃ فلا یجوز تفسیر بغیرہ الخ.	جب عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی احادیث و آثار متواتر ہیں، اور قرآن کریم کی آیت کا واضح مفہوم بھی یہی ہے تو اس کے علاوہ کوئی اور تفسیر صحیح نہ ہوگی۔
(۳) «وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا» (النساء ۱۵۹)	کوئی شخص بھی اہلِ کتاب میں سے نہ رہے گا مگر وہ عیسیٰ علیہ السلام پر ان کی موت سے قبل ایمان لائے گا۔

"موتہ" کی ضمیر میں نزاع ہے، ابن جریر نے ابن عباس مجاہد، عکرمہ، ابن سیرین، ضحاک وغیرہ کی تفسیر کے مطابق اس کی تصحیح و ترجیح فرمائی ہے کہ "موتہ" کی ضمیر راجع ہے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اور مقصود یہ ہے کہ نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے وقت جتنے اہلِ کتاب ہوں گے عیسیٰ علیہ السلام کی وفات سے پہلے سب ایمان لے آئیں گے اور اسی قول کو ابن جریر اپنی تفسیر میں "اُولیٰ ھذہ الاقوال بالصحۃ" قرار دیتے ہیں، ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:۔

وھذا القول ھو الحق کما سنبینہ بالدلیل القاطع إن شاء اللہ۔۔	یہی قول حق ہے جیسا کہ آگے دلیلِ قطعی کے ساتھ اس کو بیان کریں گے، ان شاء اللہ!

ولاشك أن هذا الذى قاله ابن جرير هو الصحيح لأنه المقصود من سياق الآية ۔

لاریب کہ یہ جو کچھ ابن جریرؒ نے فرمایا ہے یہی صحیح ہے کیونکہ سیاقِ آیت سے یہی مقصود ہے ۔

عمدۃ القاری (۷ ـ ۲۵۲) میں اس تفسیر کو اہل العلم کی تفسیر بتلایا ہے ۔

بہر حال قرآنِ کریم کی راجح تفسیر کی بنا پر ان دو آیتوں میں نزولِ مسیح علیہ السلام کا ذکر ہے ہاں یہ دو آیتیں اس مقصود میں ظاہر الدلالۃ ہیں قطعی الدلالۃ نہیں لیکن چونکہ احادیثِ صحیحہ نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تواتر کو پہنچ گئی ہیں اور تواتر مفیدِ قطعیت ہے اس حیثیت سے یہ آیتیں مفیدِ قطعیت ہوں گی اگرچہ مقطوع لغیرہ ہوں ۔

بہر حال یہ تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے اس موضوع کی تفصیل وتحقیق نکات ولطائف کو دیکھنے کا اگر شوق ہو تو "عقیدۃ الاسلام" اور "تحیۃ الاسلام" کی مراجعت کی جائے جو امام العصر مولانا انور شاہ قدس سرہٗ کی اس موضوع پر بے نظیر کتابیں ہیں ۔

نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تواترِ حدیث

اب رہا دوسرا پہلو : حدیثی اعتبار سے تو یہ پہلے ذہن نشین ہونا چاہیئے کہ تواترِ حدیث یا تواترِ احادیث دونوں ایک ہی حقیقت کے دو عنوان ہیں ، محدثین کی اصطلاح میں اگر ایک "متن" مثلاً دس صحابہ سے مروی ہو تو یہ دس حدیثیں کہلائیں گی اگر عددِ صحابہ درجۂ تواتر کو پہنچ گیا تو یہی حدیث متن کے اعتبار سے حدیثِ متواتر ہوگی ، رواۃ اور کثرتِ طرق کے اعتبار سے احادیثِ متواترہ کی تعبیر زیادہ انسب ہوگی بظاہر چ پوری صاحب اس سے بھی غافل ہیں ، اب سُنیئے ! اگر کسی حدیث کے رواۃ اور طُرق بحث وتفتیش کے بعد درجۂ تواتر کو پہنچ گئے ہیں تو ہر محدث کو اس حدیث کے متواتر کہنے کا حق حاصل ہوگا اگرچہ امت میں سے کسی نے تصریح نہ کی ہو بلکہ ہو سکتا ہے کہ محدث نے بغیر بحث وتحقیق کے کسی حدیث کے متعلق فرما دیا ہو کہ یہ خبرِ واحد ہے ، بعد میں تتبُّعِ طرق اور کثرۃِ رواۃ سے کسی کو معلوم ہو کہ متواتر ہے تو وہ متواتر اور مفید للعلم القطعی ہوگی ، نیز یہ معلوم رہے کہ ہر فن کا مسئلہ اس فن والوں سے لیا جاتا ہے کسی حدیث کی تصحیح یا تحسین یا تضعیف یا خبرِ واحد یا مشہور و متواتر

ہونے کے لئے محدث کی شہادت پیش کی جائے گی صرف فقیہ کا یہ منصب نہیں اور نہ صرف متکلم یا معقولی کا یہ وظیفہ ہے، ایک موقع پر جے پوری صاحب نے "نزولِ مسیح" کی احادیث کو "اخبارِ آحاد" کہنے کے لئے تفتازانی کی عبارت پیش فرمائی ہے، یہ فن تفتازانی کا نہیں، وہ معانی و بیان یا منطق و کلام میں ہزار درجہ محقق ہوں تو ہوں۔ حدیث ان کا فن نہیں ہے یہاں تو غزالی امام الحرمین رازی آمدی جیسے اکابر کے اقوال بھی قابلِ اعتبار نہیں چہ جائیکہ تفتازانی؟ ایسے موقع پر تو مغلطائی، ماردینی، مزّی، ذہبی، عراقی، ابن حجر، عینی، ابن تیمیہ، ابن قیم ابن کثیر وغیرہ وغیرہ محدثینِ امت اور حفاظِ حدیث کی شہادت مقبول ہو سکتی ہے۔

سید جرجانی اور تفتازانی کی احادیث دانی جاننے کے لئے یہ واقعہ کافی ہے کہ چھ ماہ تک "حُبُّ الھرۃ من الایمان" میں مناظرہ کرتے رہے کہ یہ حدیث ہے اور "من" ابتدائیہ ہے یا تبعیضہ؟ بے چاروں کو اتنی بھی خبر نہیں ہوئی کہ حدیث "موضوع" ہے، خیر اس بحث کو رہنے دیجئے احادیثِ "نزولِ مسیح" صحاح کی حدیثیں ہیں اور صحاح ہی میں عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عمرؓ، حذیفہؓ، ابن اُسید، ابوامامہ باہلی، جابر بن عبداللہ، نواس بن سمعان سے مروی ہیں ان میں سے ابوہریرہ جابر، حذیفہ، ابن عمر رضی اللہ عنہم کی حدیثیں تو صحیحین کی ہیں، اگر اس باب میں صرف شیخین ہی کی حدیثیں ہوتیں تو نمبر (۹) کے مطابق محققین اہلِ حدیث و کبارِ محدثین کے نزدیک ان کے افادۂ یقین میں ذرا بھی شبہ نہیں اور صحیحِ ابن خزیمہ، صحیحِ ابن حبان، مسندِ احمد، سننِ اربعہ وغیرہ کی حدیثیں ملا کر مرفوعات کی تعداد سترؔ تک پہنچ جاتی ہے، کیا سترؔ کبارِ صحابہ جن کی فضیلت میں وحیِ متلو نازل ہوئی اور روئے زمین پر انبیاء علیہم السلام کے بعد صدق شعار قوم ان سے زیادہ نہیں گذری، اگر لسانِ نبوت سے ان کی حکایت مفید للعلم نہیں ہوگی تو کس قوم کی ہوگی؟ اگر ہمیں کسی کے صلاح و تقوے اور صداقت کا یقین ہو اور بیس بائیس ایسے آدمی آکر ہم سے کوئی بات بیان کریں تو انصاف سے بتایا جائے کہ ہمارے لئے مفید للعلم الیقینی ہوگی یا نہیں؟ حالانکہ ایک صحابی ایک ہزار راویوں پر بھاری ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ساری امت پر بھاری ہے تو شاید مستبعد نہ ہوگا، پھر ان سترؔ صحابہ کی مرفوع احادیث کے علاوہ تقریباً تیسؔ صحابہ و تابعین سے آثارِ موقوفہ بھی مروی ہیں اور محدثین کا یہ فیصلہ ہے کہ غیر قیاسی وغیر عقلی امور میں موقوف روایت بھی مرفوع کے حکم میں ہے، گویا

سوم فوع روایتیں باسانید صحیحہ وحسنہ جمع ہو گئی ہیں کیا کوئی بتلا سکتا ہے کہ جن محدثین نے جن احادیث کے متعلق تواترِ اصطلاحی کا دعویٰ کیا ہے وہ کثرتِ رواۃ و کثرتِ طُرق اور کثرت مخارج میں اس کا مقابلہ کر سکتی ہیں؟ حدیث "من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار" جو سب سے اعلیٰ ترین متواتر حدیث کی نظیر پیش کی گئی ہے اس کے رواۃ بھی تقریباً سو ہی تک پہنچتے ہیں، حالانکہ مشکل ہے کہ سو کی سو روایتوں کے تمام رجال صحیح یا حسن تک پہنچیں، حدیث "مسح خفین" باتفاقِ محدثین حدیث متواتر ہے کتب اصول فقہ و کتبِ فقہ و شروحِ حدیث میں متعدد مواضع میں امام ابو حنیفہ کا یہ مشہور قول نقل چلا آتا ہے:۔

ماقلت بالمسح علی الخفین إلا إذا جاءنی مثل ضوء النهار وإنی أخاف الکفر علیٰ من لم یر المسح علی الخفین ۔	میں مسح خفین کا اس وقت قائل ہوا جب کہ دن کی روشنی کی طرح یہ مسئلہ میرے سامنے واضح ہو گیا اور جو شخص مسح خفین کا قائل نہیں مجھے اس کے حق میں کفر کا اندیشہ ہے۔

تو "مسحِ خفین" کے انکار سے کفر کا اندیشہ ہے اور تاریخ خطیب بغدادی میں ہے کہ امام ابو حنیفہ رح سے کسی نے ان کا مسلک پوچھا تو انہوں نے فرمایا:۔

أُفضِّلُ الشیخین وأُحبُّ الختنینِ وأری المسح علی الخفین ۔	میں حضرت ابو بکر و عمر کو سب (صحابہ) سے افضل سمجھتا ہوں عثمان و علی سے محبت رکھتا ہوں مسح خفین کا قائل ہوں ۔

گویا "سُنّی" ہونے کے لئے مسحِ خفین کے ماننے کو ضروری معیار قرار دیا ہے، بالفاظِ دیگر جواب کا خلاصہ یہ نکلا کہ میں نہ شیعی ہوں نہ خارجی ہوں بلکہ سُنّی ہوں تو اس لئے کہ امام رح کے نزدیک مسح علی الخفین کی احادیث متواتر ہیں اور مفید للعلم القطعی ہیں حالانکہ غسلِ رجلین قرآن کریم کا قطعی حکم ہے اور احادیثِ غسلِ رجلین بھی متواترہ ہیں، دو قطعی دلیلوں سے فرضیت غسل رجلین ثابت ہو چکی تھی، پھر بھی جمہورِ امت کے نزدیک مسح علی الخفین کا جواز یقینی ہے اور اس قطعی دلیل سے کتاب اللہ اور احادیثِ متواترہ غسل پر زیادتی صحیح ہو گئی۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ احادیث مسح علی الخفین بتصریح امام احمد بن حنبلؒ مرفوع حدیثیں کل چالیس ہیں حالانکہ صحابہ میں سے بعض اکابر کا خلاف بھی منقول ہے پھر یہ بھی مشکل ہے کہ یہ چالیس حدیثیں سب کی سب صحیح یا حسن ہوں اس کے باوجود اتنی مقدار تواترِ قطعی کے لئے کافی ہو گئی۔

احادیث غسلِ رجلین کو متواتر اصطلاحی کہا گیا ہے حالانکہ بمشکل اکتیس حدیثیں منقول ہیں، احادیث معراجِ جسمانی کو متواترِ اصطلاحی کہا گیا ہے حالانکہ کل رواۃ بتیس تک پہنچتے ہیں احادیثِ حوضِ کوثر کو متواترِ اصطلاحی کہا گیا ہے۔ حالانکہ کل احادیث پچاس تک پہنچتی ہیں، احادیث "رفع یدین عند التحریمہ" کو متواتر اصطلاحی کہا گیا ہے حالانکہ کل حدیثیں بمشکل پچاس تک پہنچیں گی۔

حدیث "من بنیٰ مسجد اللّٰہ" الخ متواتر ہے باوجودیکہ صحابہ روایت کرنے والے بیس سے متجاوز نہیں، ایسے ہی حدیث شفاعت، حدیث عذاب قبر، حدیث سوال منکر نکیر، حدیث "المرء مع من احب" حدیث "کلٌّ میسر لما خلق لہٗ" حدیث "بدأ الاسلام غریبًا" الخ وغیرہ وغیرہ ان سب حدیثوں کو اصطلاحی تواتر کے اعتبار سے متواتر کہا گیا ہے۔

حافظ ابن تیمیہ نے تو کئی رسائل میں احادیثِ شفاعت، حوضِ کوثر، عذاب قبر کو سنتِ متواترہ سے تعبیر کیا ہے باوجودیکہ ان کے رواۃ وطرق احادیثِ نزولِ مسیح کو نہیں پہنچتے۔

اب نہیں معلوم جے پوری صاحب کے یہاں وہ کون سی شرط ہے جو حدیثِ متواتر اصطلاحی کے لئے موجود ہونی چاہیے، محدثین نے جن متواتر حدیثوں کو جمع کیا ہے وہ سب اصطلاحی متواترات ہیں نہ کہ لغوی، نہ معلوم جے پوری صاحب کو تواتر کے لفظ سے کیوں چڑ ہے کہ جہاں "تواترت الاخبار" کا لفظ دیکھ لیا، فرمانے لگے: "یہ تواتر لغوی ہے مراد کثرت ہے" نہ معلوم یہ "حجی" کا منصب آپ کو کس نے دیا ہے، ہاں یہ صحیح ہے کہ بعض مواقع پر لغوی تواتر مراد ہوتا ہے لیکن خارجی قرائن اور بحث وتحقیق سے یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ یہ تواتر اصطلاحی ہے یا لغوی، جن کا یہ فن ہے اور شب وروز اس کی مزاولت کرتے رہیں اور حدیث ان کی صفتِ نفس بن گئی ہے وہ ہی اپنی بصیرت سے اس کا فیصلہ کرتے ہیں، ہر عمر و وزید کا یہ منصب نہیں، اب سوچئے کہ صحابہ میں سے احادیثِ نزول کو اتنے روایت کرنے والے اور صحابہ سے نقل کرنے والے یقیناً اس سے کہیں زائد ہیں اور کم سے کم اتنے تو ضرور ہیں اور باتفاق امت رواۃ بڑھتے ہی گئے کم نہیں ہوئے، اسی وجہ سے متواترات کی مشہور احادیث کی تعداد بھی بڑھ گئی کہ قرنِ ثانی میں نقل کرنے والے بڑھ جاتے ہیں اور قرنِ ثالث میں تو اخبارِ آحاد بھی مشہور ومتواتر کی کثرتِ طرق اور کثرتِ رواۃ کو پہنچ جاتی ہیں جو جے پوری صاحب کو خود بھی تسلیم ہے اب ایسی صورت میں اگر کوئی محدث بھی تصریح نہ کرتا کہ یہ حدیث متواتر ہے جب

بھی کوئی مضائقہ نہ تھا۔

لیکن باوجود اس کے جب حافظ ابن کثیر ان کو "اخبارِ متواترہ" سے تعبیر کرتے ہیں، حافظ جلال الدین سیوطی ان کو "متواتر" کہتے ہیں، قدماء محدثین میں سے "ابوالحسن السجزی الآبری" اس کو متواتر مانتے ہیں اور خارجی بحث و تحقیق سے بھی یہ بات ثبوت کو پہنچ چکی تو خدارا انصاف کیجئے کہ ایسی صورت میں کیا کسی کو یہ حق حاصل ہے کہ بے دلیل محض اپنی خواہش پوری کرنے کے لئے یہ کہے کہ تواتر سے لغوی تواتر مراد ہے۔

ابوالحسن آبری قدماء محدثین میں سے ہیں۔ ابن خزیمہ صاحب الصحیح سے روایت کرتے ہیں ۳۶۳ھ میں وفات پا چکے ہیں ان کا قول حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری (۶-۳۵۸) مطبوعہ میریہ میں یوں نقل کیا ہے: وقال ابوالحسن الخسعی الآبدی۔

یہ ناسخین کی تصحیف ہے صحیح السجزی الآبری ہے سجستانی کی نسبت غیر قیاسی سجزی آیا کرتی ہے کما فی القاموس السجستی نہیں آتی جیسا جے پوری صاحب فرماتے ہیں)

فی مناقب الشافعیؒ وتواترا الأخبار	مناقب شافعیؒ میں ہے کہ اس مضمون کی احادیث متواتر
بأن المهدی من هذه الأمة،	ہیں کہ مہدی اس امت سے ہوں گے اور عیسیٰ علیہ السلام
وأن عیسیٰ یصلی خلفه إلخ۔	ان کی اقتداء میں نماز پڑھیں گے۔

اصل غرض اس عبارت سے چاہے ابن ماجہ والی حدیث کا رد ہی ہو جس میں "لا مهدی إلا عیسیٰ" آیا ہے لیکن اس سے تین باتیں نکل آئیں۔

الف: احادیثِ مہدی متواتر ہیں۔

ب: احادیثِ نزولِ مسیح متواتر ہیں۔

ج: مہدی کا عیسیٰ علیہ السلام کے لئے امام ہونا متواتر ہے۔

لیجئے بجائے ایک دعویٰ کے اب تین دعوے ہو گئے، جے پوری صاحب کا یہ فرمانا کہ لازم آتا ہے غرض یہ تو نہ تھی۔ بالکل بے معنی بات ہے کیونکہ لازم بین ہے لزوم صریح ہے اور قائل کا غیر مراد نہیں بلکہ یہ مراد بالاولیٰ ہے اور اس کا التزام ہے تو کیا یہ لازم ہونا ان کے خلافِ مقصود ہے، کیا "دلالة النص" اور "دلالة بالاولیٰ" یا "ظاہر النص" کی بحث اصولِ فقہ میں محض بیکار ہے حقیقت

میں خروجِ مہدی، نزولِ مسیح، خروجِ دجال تینوں تشاکل و متقارب امور ہیں اور شرعی حیثیت میں تقریباً ان تینوں میں تلازم ہے، اس لئے اکثر احادیث میں تینوں کا ذکر ساتھ ساتھ آتا ہے، فرحم اللہ من أنصف، اب صرف ایک دو محدثوں کا ضعیف قول کہ متواتر عزیز الوجود کیسے قابلِ وثوق ہو سکتا ہے کیا مثبت کا قول راجح ہے یا نافی کا؟ اکثریت کس طرف اور اقلیت کس طرف ہے؟ خارجی ثبوت کس کی شہادت دیتا ہے، اثباتِ متواترات کی یا نفی کی؟ اور کثرت کی یا قلت کی؟ کیا کسی نے ان کے قول کو قبول بھی کیا۔

احادیث کا ذخیرہ متواترات سے بھرا پڑا ہے اگر کسی کو نظر نہ آئے تو اس کا کیا علاج؟

بہرحال حدیثی ابحاث میں محض اٹکل سے یا محض عقلی احتمالات سے کام نہیں چلتا نہ اس قسم کے وساوس سے خدا کے ہاں نجات ہو سکتی ہے محدثین میں سے جن محدثین نے یہ فرمایا تھا کہ متواتر حدیث قلیل الوجود ہیں، وہ یہ بھی تو فرماتے ہیں کہ بخاری و مسلم کی اخبارِ آحاد بھی مفید للعلم الیقینی ہیں تو ان کے یہاں تو "ضرورتِ دین" کے لئے صحیحین کی اخبارِ آحاد بھی کافی ہیں، آپ بتلائیے کہ آپ کے نزدیک قرآنِ کریم کے سوا "ضروریاتِ دین" کے لئے کیا ثبوت رہ جاتا ہے؟ کیا اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کے بغیر کوئی بھی عقیدہ ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ قطعیت کے لئے سوا قرآن کے متواتر حدیث ہونی چاہیئے اور وہ ہے نہیں؟ اللہ اللہ کیسے کام ہلکا ہو گیا یہی تو فرقہ اہلِ قرآن والے کہتے چلے آئے ہیں اور تقریباً کل منکرینِ حدیث کا منشا بھی یہی نکلتا ہے، بہرحال بقیہ ضروریاتِ دین کے لئے یا تو صحیحین کی اخبارِ آحاد کو مفید للعلم مان کر ان کو قطعی ماننا ہوگا یا احادیثِ متواترہ کو تسلیم کر کے ان "ضروریاتِ دین" پر ایمان لانا ہوگا، تیسرا قول کہ نہ تو احادیثِ صحیحین مفیدِ قطعیت ہیں اور نہ کوئی حدیث متواتر موجود ہے جو مفیدِ قطعیت ہو، مرکب باطل ہے" اللہ تعالےٰ فہم و انصاف عطا فرمائے۔ یہی تو وہ پرانا فتنہ ہے جو جہمیہ کی میراث رہ گئی ہے گویا آج کل اس فتنہ کی تجدید ہو رہی ہے کیونکہ "عقائدِ قطعیہ" کے لئے ان دلائل کی ضرورت ہوگی جن کا مفیدِ علم ہونا قطعی طور پر مسلم ہو اور وہ صرف قرآنِ کریم کی وہ نصوص ہوں گی جو قطعی الدلالۃ ہوں یا حدیثِ متواتر قطعی الدلالۃ ہو اور وہ ہے نہیں، یہی تو حمدان قرمطی اور ان کے اتباع "قرامطہ" کا مسلک ہے، اب بتلائیے کہ بات کہاں سے کہاں تک پہنچ جائے گی؟

پس خلاصہ یہ ہوا کہ احادیثِ نزولِ مسیح صحیحین کی حدیثیں ہیں، محققین محدثین اور اکثر اشاعرہ کے مذہب کے موافق تو افادۂ علم و یقین کے لئے یہ بھی کافی ہے اور اگر مدار تواتر پر بھی ہو تو قرنِ اول میں ان احادیث کی تلقی بالقبول ہو چکی ہے تو یہ چیز بھی ان احادیث میں موجود ہے، اگر خواہ مخواہ اسی کی ضد ہے کہ تواتر اصطلاحی کی مشہور تعریف کی بنا پر متواتر احادیث چاہئیں تو لیجئے گذشتہ تحقیق و تفصیل سے یہ بات بھی بحمد اللہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ احادیثِ نزولِ مسیح اصطلاحی تواتر سے متواتر ہیں اور متواتر بھی قطعی الدلالۃ ہیں، احادیثِ متواترہ قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ ہونے کے بعد عقیدۂ نزولِ مسیح کی فرضیت و قطعیت میں کیا شبہ رہ جاتا ہے اور جحود و انکار کا جو نتیجہ ہے وہ بھی ظاہر ہے، یقین و اذعان کی ان مختلف جہات اور حیثیات کے بعد بھی اس کے ضروریاتِ دین ہونے میں کوئی شبہ باقی رہتا ہے؟ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

نزولِ مسیح علیہ السلام اور اجماعِ اُمت

نمبر (۱۳) میں یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ مستقبل میں جن امور کے متعلق امت کا اجماع ہوتا ہے اس کی حیثیت کیا ہے؟ کیونکہ امت کو تو غیب کا علم نہیں، وہ تو علّام الغیوب ہی کا خاصہ ہے، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ مخبرِ صادق سے جو کچھ منقول ہے اس پر امت کا اتفاق ہے اگر وہ نقل بذریعہ آحاد ہو، جب بھی اجماع کے بعد قطعی و یقینی ہو جاتی ہے اب غور کیجئے کہ کتب حدیث میں جو امہات و اصول ہیں مثلاً بخاری، مسلم، سننِ نسائی، سننِ ابی داؤد، ترمذی، ابن ماجہ سے لے کر مستدرکِ حاکم و سننِ کبریٰ بیہقی تک بیسیوں کتابوں میں نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے مستقل ابواب موجود ہیں، سب ہی نزول کی احادیث روایت کرتے ہیں اور نفسِ نزول میں اسنادی اعتبار سے کوئی علتِ قادحہ نہیں بیان کرتے۔

پھر ان ہی کتبِ حدیث و کتبِ تفسیر میں صحابہ رضی اللہ تعالےٰ عنہم سے پھر تابعین سے اور تابعین بھی مختلف بلاد کے مدینہ، مکہ، بصرہ، کوفہ، شام وغیرہ کے سب سے نزولِ مسیح کے بارے میں نقول موجود ہیں، پھر کسی صحابی کسی تابعی سے نہیں بلکہ کسی امامِ دین، کسی محدث، کسی مصنف سے بھی اس کا خلاف کسی کتاب میں کسی دور میں، کہیں بھی کوئی حرف نقل نہیں ہوا، کیا یہ اس کی دلیل

نہیں کہ یہ بات اور یہ عقیدہ بالکل اجماعی و اتفاقی ہے، پھر کتبِ عقائد میں جو مستند ترین اور اعلیٰ ترین کتبِ عقیدہ ہیں ان سب میں اس کا ذکر عقیدہ کی صورت میں موجود ہے اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہوگی؟۔

اس وقت ہم ذیل میں دو اہم ترین مأخذ پیش کرتے ہیں:۔

(۱) **عقیدۂ طحاویہ**:۔ جو امام ابوحنیفہؒ، ابو یوسفؒ، محمدؒ وغیرہ ائمہ حنفیہ کے عقائد میں موثوق ترین چیز ہے، اس کی عبارت ملاحظہ ہو:۔

ونؤمن بأشراط الساعة من خروج الدجال ونزول عيسىٰ ابن مريم عليه السلام من السماء۔	خروجِ دجال اور آسمان سے نزولِ عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ علاماتِ قیامت پر ہمارا ایمان ہے۔

(۲) **فقہِ اکبر**:۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مشہور ترین متداول کتاب ہے، ابومطیع بلخی کی روایت سے منقول ہے امام ابومنصور ماتریدی جو ماتریدیہ کے امام الطائفہ ہیں وہ اس کتاب کے پہلے شارح ہیں اس فقہِ اکبر کی عبارت یہ ہے:۔

ونزول عيسىٰ عليه السلام من السماء وسائر علامات القيامة على ما وردت به الأحاديث الصحيحة حق كائن۔ اھ	آسمان سے عیسیٰ علیہ السلام کا نازل ہونا اور اس کے علاوہ علاماتِ قیامت جو صحیح احادیث میں مذکور ہیں بالکل حق ہیں۔

ان عبارتوں میں جس طرح تصریح کی گئی ہے اس سے بڑھ کر عقیدہ ہونے کی کیا تصریح ہو گی! کیا اس قسم کی تصریحات کے بعد کسی منصف کے لئے کوئی شبہ باقی رہتا ہے؟ کیا اس عقیدہ کے اتفاقی ہونے کے لئے مزید کسی دلیل کی ضرورت باقی رہتی ہے؟ یہ عقائد تو وہ ہیں جو بذریعہ توارث امتِ محمدیہ میں پہنچ چکے ہیں اب اجماع کی بھی دو تصریحی شہادتیں پیش کی جاتی ہیں تاکہ بیانِ سابق کی تصدیق و تائید میں کسی طالبِ حق کے لئے کوئی خلجان باقی نہ رہے۔

امام ابو اسحاق کلاآبادی بخاری جو قرنِ رابع کے اکابر حفاظِ محدثین سے ہیں اور اپنی اسناد سے روایت حدیث کرتے ہیں، اپنی کتاب "معانی الأخبار" میں فرماتے ہیں۔

قد أجمع اهل الأثر وکثیر من أهل النظر علیٰ أن عیسیٰ علیه السلام ینزل من السماء فیقتل الدجّال ویکسر الصلیب اھ۔

تحیة الإسلام ص۱۳۵۔

کل محدثین اور بہت سے متکلمین کا اس پر اجماع ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے، دجال کو قتل کریں گے اور صلیب کو توڑیں گے۔

یہ خیال رہے کہ محدثین کا دور متکلمین سے پہلے شروع ہوتا ہے اور اس مسئلہ پر محدثین کا اجماع منعقد ہو چکا ہے بعد میں اگر متکلمین کے عہد میں خلاف بھی ہو گیا ہو تو اجماعِ سابق کو مضر نہیں، نہ یہ خلاف اتفاق ہونے کے بعد قابلِ اعتبار ہے جس کی تحقیق کتبِ اصولِ فقہ میں موجود ہے، نیز بظاہر یہ خلاف جو بعض متکلمین کی طرف منسوب ہے، صحیح نہیں جیسا کہ آئندہ سفارینی کی عبارت سے واضح ہے۔

بہر حال یہ تو ہوئی نقل "اجماع" کے بارے میں قدماءِ محدثین کی تصریح اب متأخرین اہلحدیث میں سے امام شمس الدین محمد بن احمد حنبلی سفارینی نابلسی کی عبارت ملاحظہ ہو:۔

وأما الإجماع فقد اجتمعت الأمة علی نزوله ولم یخالف فیه أحد من أهل الشریعة وإنما أنکر ذلك الفلاسفة والملاحدة مما لا یعتد بخلافه وقد انعقد إجماع الأمة علی أنه ینزل ویحکم بهذه الشریعة المحمدیة اھ۔

(شرح عقیدہ سفارینی ص۹۰ ج۲)

رہا نزول عیسیٰ علیہ السلام میں اجماع، تو امتِ محمدیہ کے کل اہل شرع کا ان کے نزول پر اجماع ہے کہ وہ نازل ہوں گے اور شرعِ محمدی پر عمل کریں گے، بجز فلاسفہ اور ملاحدہ کے کسی نے خلاف نہیں کیا اور ان کا خلاف قابلِ اعتبار نہیں۔

سفارینی مذکور بارہویں صدی کے اکابرِ محدثین میں ہیں حنبلی المذہب ہیں نابلس کے ایک گاؤں سفارین کے باشندے ہیں، نام محمد بن احمد، شمس الدین لقب ابو العون کنیت ہے بیسیوں کتابوں کے مصنف ہیں۔

"سلک الدرر فی أعیان القرن الثانی عشر" "السحب الوابلة علی ضرائح الحنابلة" وغیرہ میں ان کا مفصل ترجمہ اور حالات مذکور ہیں، سلک الدرر میں ان کو الشیخ الامام العلام الحبر البحر النحریر وغیرہ جلیل القدر القاب سے ذکر کیا ہے اور بہت سے مفاخر و مآثر لکھنے کے بعد فرماتے ہیں :۔

وبالجملہ فقد کان غرۃ عصرہ وشامۃ مصرہ لم یظہر فی بلدہ بعد مثلہ الخ۔

صاحب الضرائح لکھتے ہیں: شمس الدین العلامۃ المسند الحافظ المتقن۔ وبالجملہ فتألیفہ نافعۃ مفیدۃ مقبولۃ سارت بہ الرکبان وانتشرت فی البلدان کان إماماً متقناً جلیل القدر زینۃ أہل عصرہ ونقادۃ أہل مصرہ الخ۔ سید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی صاحب "تاج العروس شرح القاموس" اور صاحب "إتحاف السادۃ المتقین بشرح إحیاء علوم الدین" حدیث میں ان کے تلمیذ ہیں۔ اب تو جے پوری صاحب نے سفارینی کو پہچان لیا ہوگا کہ وہ کون ہیں اور کس پایہ کے ہیں، سفارینی کی عبارت سے معلوم ہوا کہ کل محدثین اور سب متکلمین ماتریدیہ، اشاعرہ معتزلہ سب کے سب کا نزولِ مسیح علیہ السلام پر اجماع ہے، صرف ملحدین و فلاسفہ اس کے منکر ہیں۔ اس قسم کے مواضع میں جب اجماع کا اس طرح ذکر کیا جاتا ہے اس سے اجماعِ ناطق ہی مراد ہوتا ہے، اجماع سکوتی کو کبھی بھی اس طرح تعبیر نہیں کرتے، جے پوری صاحب کو جیسے تواتر کے لفظ سے چڑ ہے ایسے ہی اجماع کے لفظ سے بھی ضد ہے جہاں اجماع کا لفظ دیکھا جھٹ فرمائیں گے کہ یہ کوئی سکوتی اجماع ہوگا، محض اپنی ضد کو پورا کرنے کے لئے بے انصافی کرکے بے دلیل ایسی بات کہنا کسی عالم کا شعار نہیں جب تک کوئی صریح دلیل اس کے خلاف قائم نہ ہو، اجماع سے یہی اجماعِ صریح اجماعِ ناطق مراد ہوگا اگر ان کو اس پر اصرار ہے کہ یہ اجماعِ سکوتی ہے تو لائیں کوئی دلیل پیش کریں، ہاتوا برہانکم إن کنتم صادقین۔

نیز واضح رہے کہ تألیفی دور کے بعد اجماع کا نقل انہی تألیفات کے ذریعہ سے ہوتا ہے، جتنے مسائل اصول کے ہوں یا فروع کے جن میں اجماع نقل کیا جاتا ہے اسی پر اعتماد کیا جاتا ہے، آج تک تألیفی دور میں کل اربابِ تالیف کا سلف میں بھی اور خلف میں بھی یہی معمول چلا آرہا ہے یہ کبھی نہ ہوا اور نہ ہوسکتا ہے کہ چودھویں صدی میں کسی زید و عمرو کو اسنادی اجماع بہ پہنچ

گیا ہو، اس قسم کے خیالات محض طفلانہ ہیں اگر بات لمبی نہ ہوتی تو ہم یہاں پر اس کے نظائر پیش کرتے کہ جن امور میں اجماع نقل ہوا ہے اور امت کے نزدیک اجماع سے وہ درجۂ قطعیت کو پہنچ گئے ہیں ان میں بھی اس سے زیادہ اجماع کا ثبوت نہیں کہ فلاں کتاب میں فلاں شخص نے اس پر اجماع نقل کیا ہے اور ناقل ثقہ ہے۔ اب تک امتِ محمدیہ نے اپنی تالیفات میں اس علمی امانت کو اچھے طریقہ سے ادا کر دیا ہے اب آگے اللہ تعالےٰ رحم فرمائیں۔

خلاصہ بحث:۔ اس طویل بحث کا خلاصہ حسب ذیل امور میں پیش کیا جاتا ہے:۔

(۱) نزولِ مسیح علیہ السلام کا عقیدہ اُمتِ محمدیہ میں قرن بہ قرن طبقہ بہ طبقہ متوارث چلا آرہا ہے اور اس کو تواترِ طبقی حاصل ہے، قطعیت کے لئے یہ توارث خود بخود مستقل دلیل ہے جس کی تفصیل نمبر (۱) میں گذر چکی ہے۔

(۲) باوجود اس توارث کے قرآنِ مجید میں بھی اس کا ذکر موجود ہے اکثر اہلِ علم اور صحابہ وتابعین کی تفسیر کی بناء پر نزولِ مسیح علیہ السلام کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے۔

(۳) نزولِ مسیح کی احادیث باتفاق امت صحیح ہیں اور باتفاق امت ان کی تلقی بالقبول ہو چکی ہے اور بہ تصریح حفاظِ حدیث وہ اصطلاحی متواتر ہیں اور خارجی بحث وتحقیق سے بھی ان تینوں باتوں کی قطعیت میں کوئی شبہ نہیں۔

(۴) نزولِ مسیح کے بارے میں امتِ محمدیہ کا اجماع بھی منعقد ہو چکا ہے، قدماءِ محدثین اور متاخرین اس اجماع کو نقل کرتے ہیں اور آج تک کسی کتاب میں کسی کا اہلِ حق میں سے انکار یا خلاف منقول نہیں۔

(۵) غرض یہ کہ عقیدہ نزولِ مسیح مختلف جہات مختلف اعتبارات سے قطعی ہے اور ضروریاتِ دین میں داخل ہے اور معلوم ہونے کے بعد صرف باطنی زیغ یا قلبی وساوس یا عقلی استبعاد کی بنا پر انکار کرنا اور انکار کے لئے حیلے تلاش کرنا اور چارہ جوئی کرنا مومن قانت کا شیوہ نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ضروریاتِ دین کا اہم ترین جز ہے، حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بات فرما چکے ہوں اور قطعی ذرائع سے ہم تک پہنچ جائے پھر اس کا ضروریاتِ دین میں داخل نہ ہونا ایمان کا جز نہ بننا بالکل غلط ومتناقض دعویٰ ہے اور پیغمبرِ اسلام کی تکذیب

ہے، اگر تصدیقِ رسول ضروریاتِ دین میں داخل ہے تو کوئی راستہ ماننے کے سوا نہیں، اس کی کیفیت سمجھ میں آئے یا نہ آئے اگر فرشتہ آسمان سے اتر سکتا ہے اور بصورت دحیہ کلبیؓ متمثل ہو سکتا ہے تو ایک نبی کا آسمان پر چلا جانا اس میں کون سا عقلی استبعاد ہے «فتمثل لها بشرا سویاً» «لقد جاءت رسلنا ابراهيم بالبشرى» وغیرہ آیاتِ قرآنیہ میں بشکلِ انسانی فرشتہ کا متمثل ہونا بالکل منصوص ہے انبیاء علیہم السلام کی روحانیت ان کی قوتِ قدسیہ کی وجہ سے بھی غالب ہوتی ہے اس لئے ان کے اجسادِ مبارکہ پر روحانی کیفیات بآسانی طاری ہو سکتی ہیں کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معراجِ جسمانی اور جسدِ عنصری کا عروج بنص قرآن مکہ سے بیت المقدس تک ثابت نہیں؟ اور آگے آسمانوں پر صعود و عروج احادیث متواترہ سے ثابت نہیں؟ کیا اس پر یقین اہلِ حق کا عقیدہ نہیں؟ تو جیسے یہاں صعود و نزول آنا فانا قابلِ انکار نہیں اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کا رفعِ جسمانی پھر حق تعالیٰ جل شانہٗ کے ارادہ کی مقناطیسی جذب نے ان کو آسمان پر اٹھا لیا ہو تو اس میں کون سی حیرت کی بات ہے۔ آج کل مسمریزم اور اسپریچویلزم کے عجائبات کا اگر کسی کو ذرہ بھر بھی علم ہو تو ان خوارقِ الٰہیہ میں ذرا بھی شبہ نہیں کر سکتا۔ خیر! یہ چیز تو ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے، کہنا صرف اتنا ہے کہ جب اللہ و رسول کوئی بات ارشاد فرمائیں ہمیں بجز تسلیم کے کوئی مخلص نہیں، قولہ تعالیٰ «ما كان لمؤمن ولا مؤمنة إذا قضى الله ورسوله أمراً أن يكون لهم الخيرة» اللہ و رسول کے فیصلہ کے بعد کسی مرد مومن یا عورت مومنہ کو ماننے نہ ماننے کا اختیار باقی نہیں رہتا، عقیدہ کی تنقیح کے دو جزء ہیں: عیسیٰ علیہ السلام کا جسمانی رفع اور پھر قیامت کے قریب آسمان سے نزول، یہی دو چیزیں ضروریاتِ دین میں داخل ہیں، جب نزول مانا جائے گا تو رفعِ جسمانی خود بخود ماننا پڑے گا، اس لئے اس مضمون میں اس جزء کو نہیں لیا گیا باقی یہ تفصیلات کہ رفع سے پہلے موت طاری ہوئی تھی یا نہیں، تھوڑی دیر کے لئے یا زیادہ دیر کے لئے، رفع بحالتِ حیات ہوا؟ وغیرہ وغیرہ ان جزوی تفصیلات میں کچھ کچھ سلف سے خلاف منقول ہے لیکن اہلِ حق اور جمہور اہلِ سنت کا اس میں منقح فیصلہ یہی ہے کہ جسدِ عنصری کے ساتھ بحالت حیات رفع آسمانی واقع ہوا۔ اس وقت صرف مسئلہ نزول کو اصولی حیثیت سے واضح کرنا تھا، اتنا

عرض کر دیا گیا، اسی پر کفایت کی جاتی ہے توقع ہے کہ طالبِ حق کے لئے اتنا لکھنا کافی ہوگا،

إن أُريد إلا الإصلاح ما استطعت وما توفيقي إلا بالله عليه توكلت وإليه أنيب ۔

شعبان المعظم ۱۳۹۱ھ

عقیدۂ ختم نبوت

الحمد لله رب العالمين، والصلوٰة والسلام على سيدنا محمد خاتم النبيين، وعلى آله الطاهرين وصحبه اجمعين۔

امابعد، دین اسلام کی اساسی خشت ختم نبوت کا عقیدہ ہے، حق تعالیٰ شانہ نے اس کائنات کی ہدایت کے لئے رشد وہدایت کا جو سلسلہ جاری فرمایا وہ نبوّت ورسالت کا سلسلہ ہے اس کی ابتدا حضرت آدم (علیہ صلوات اللہ وسلامہٗ) سے ہوتی ہے اور اس عمارت کی تکمیل کی آخری خشت حضرت سید العالمین خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا وجود باجود اور ظہور پرُنور ہے۔

اللهم صل عليه صلاةً تكرم بها مثواه وتشرف بها عقباه وتبلغ بها يوم القيامة مُناه ورضاه، وبارك وسلم۔

ختم نبوت کے اس عقیدہ پر خدا تعالیٰ کی سب سے آخری آسمانی کتاب قرآنِ کریم کی بے شمار تصریحات موجود ہیں اور جس طرح یہ ثبوت کے اعتبار سے قطعی ہے اسی طرح دلالت کے لحاظ سے بھی قطعی اور ہر شک وشبہ سے پاک ہے، ظاہر ہے کہ کسی مسئلہ میں قرآن کریم کی ایک آیت کریمہ بھی اگر قطعی الدلالۃ ہو تو مضمون کی قطعیت کے لئے کافی ہے، چہ جائیکہ قرآن کریم کی ایک سو سے زائد آیات ختمِ نبوت پر دلالت کرتی ہیں اس قطعیت کی نظیر قرآن کریم میں بھی کم ملے گی۔ اسی طرح عقیدۂ ختم نبوت پر احادیثِ نبویہ بھی تواتر کو پہنچ گئی ہیں اور تواتر بھی ایسا ہے کہ جس کی نظیر احادیث متواترہ کے ذخیرہ میں نہیں، دو صد احادیث سے یہ عقیدہ ثابت ہوا ہے گویا قرآن و احادیث میں اس قطعیت کی نظیر کسی اور مسئلہ میں نہیں ملے گی۔ پھر امتِ محمدیہ کا اس پر اجماع بھی ہے اور نہ صرف امتِ محمدیہ کا اجماع! بلکہ تمام کتبِ سماویہ کا اس پر اجماع ہے اور تمام انبیاء کرام

کا اس پر اجماع ہے۔ عالم ارواح میں تمام انبیاء کرام علیہم صلوات اللہ وسلامہٗ کا یہ عہد و پیمان ہے۔

پس جس طرح توحیدِ الٰہی تمام ادیان کا اجماعی عقیدہ ہے۔ اسی طرح ختم نبوت کا عقیدہ بھی تمام کتبِ الٰہیہ، تمام انبیاء کرام اور تمام ادیانِ سماویہ کا متفق علیہ اور اجماعی عقیدہ ہے۔ آغازِ انسانیت سے لے کر آج تک اس پر ہمیشہ اتفاق رہا ہے کہ خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں گے اور سلسلۂ نبوت و رسالت آپؐ کی ذات گرامی پر ختم ہو جائے گا۔ اصولی و اعتقادی مسائل میں انبیاء کرام کے درمیان کبھی اختلاف نہیں ہوا بلکہ وہ ہر دور میں متفق علیہ رہے ہیں۔ پس جس طرح دیگر عقائد دینیہ تمام نبوتوں میں مشترک ہیں ٹھیک اسی طرح حضرت محمد مصطفےٰ احمدِ مجتبیٰ علیہ صلوات اللہ و سلامہٗ کا آخری نبی ہونا اور آپؐ ہی کی نبوّت پر دنیا کا خاتمہ ہونا تمام انبیاء کرام کی شریعتوں اور آسمانی کتابوں کے مسلّمات میں سے رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ کتبِ سماویہ میں اس کی ان گنت پیش گوئیاں کی گئیں۔ آپؐ کا نام، آپؐ کے القاب، آپؐ کا خاندان، آپؐ کا ملک، آپؐ کی جائے ولادت، آپؐ کے دارِ ہجرت وغیرہ کی خبریں دی گئیں، غرض اللہ تعالےٰ نے تمام مخلوقات پر اور تمام اقوام عالم پر اپنی حجت پوری کر دی۔

اور اسلام کی پوری تاریخ میں اس اجماعی عقیدے کا ظہور اس طرح ہوتا رہا کہ جب کبھی کوئی مدعی نبوّت کھڑا ہوا اس کا سر قلم کر دیا گیا، یہ اس عقیدے کا عملی ثبوت تھا جو اسلام کے ہر دور میں ہوتا رہا اور جس پر امّت کا تعامل مسلسل جاری رہا، حضرت صدیقِ اکبرؓ کے دور میں اسلامی جہاد کا آغاز ہی مسیلمۂ کذاب کے مقابلہ میں جنگِ یمامہ سے ہوا جس میں سات سو صرف حفاظِ قرآن شہید ہوئے۔ جو صحابہ کرامؓ میں "اہل القرآنؓ" کے لقب سے مشہور تھے، گویا اسی عقیدے کی حفاظت کے لئے سب سے زیادہ صحابہ شہید ہوئے اور اسی بنیاد کو مضبوط کرنے کے لئے اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خون کی قربانیاں پیش کیں، معرکۂ حق و باطل سب سے پہلے اسی عقیدہ کی خاطر برپا ہوا اور اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس خون سے اس باغیچہ کو سیراب کیا گیا، یہ حق تعالےٰ کی حکمت بالغہ تھی کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے دور میں اسود عنسی اور مسیلمۂ کذاب کے فتنہ کی سرکوبی کر کے قیامت تک آنے والی اُمّت کو دو ٹوک اور غیر مبہم انداز میں بتا دیا گیا کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو لوگ دعوائے نبوت کے ساتھ اٹھیں امّت کو ان سے کیا سلوک

کرنا ہوگا۔

قادیانیت انگریز کا خود کاشتہ پودا

الغرض یہ عقیدہ اتنا بنیادی اور اتنا اہم ہے کہ اسے عالم ارواح سے لے کر آج تک ہر آسمانی دین میں مسلسل دہرایا جاتا رہا اور قولاً، عملاً، اعتقاداً اس کی مسلسل تاکید و تلقین کی جاتی رہی۔ بدقسمتی سے برطانوی اقتدار میں جھوٹی نبوّت کا فتنہ کھڑا کیا گیا اور یہ سمجھ کر کہ ختم نبوّت اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے، اس کے متزلزل ہو جانے سے اسلام کی عمارت منہدم ہو جائے گی۔ اس پر کاری ضرب لگانے کی کوشش کی گئی، اس کے لئے مدعیٔ نبوت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ ما علیہ کا انتخاب کیا گیا، متحدہ ہندوستان اسلامی حکومت کے سائے سے محروم تھا ورنہ مرزا کا حشر بھی اسودِ عنسی اور مسیلمۂ کذّاب وغیرہ سے مختلف نہ ہوتا، اس لئے مسلمان سوائے دینی بحثوں اور مناظروں کے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ برطانوی حکومت اپنے تمام لامحدود وسائل سے اس فتنہ کی پرورش اور اپنے خود کاشتہ پودا مرزا غلام احمد قادیانی کی حفاظت کرتی رہی۔

قادیانیت کے خلاف علامہ کشمیری کا جہاد

اُمت کے جن اکابر نے اس فتنہ کے استیصال کے لئے محنتیں کی ہیں ان میں سب سے زیادہ امتیازی شان حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری دیوبندی رحمہ اللہ کو حاصل تھی اور دارالعلوم دیوبند کا پورا اسلامی اور دینی مرکز انہی کے انفاسِ مبارکہ سے اس شجرہ خبیثہ کی جڑوں کو کاٹنے میں مصروف رہا، قادیانیوں کے شیطانی وساوس اور زندیقانہ دسائس کا جس طرح حضرت امام العصر نے تجزیہ کر کے ان پر تنقید کی اس کی نظیر تمام عالمِ اسلام میں نہیں ملتی، حضرتِ مرحوم نے خود بھی گراں قدر علوم و حقائق سے لبریز تصانیف رقم فرمائیں اور اپنے تلامذہ مدرسینِ دیوبند سے بھی کتابیں لکھوائیں اور ان کی پوری نگرانی واعانت فرماتے رہے، میں نے خود حضرت رحمہ اللہ سے سنا کہ "جب یہ فتنہ کھڑا ہوا تو چھ ماہ تک مجھے نیند نہیں آئی اور یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ کہیں دینِ محمدی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کے زوال کا باعث یہ فتنہ نہ بن جائے، فرمایا: چھ ماہ کے بعد دل مطمئن ہو گیا کہ انشاء اللہ دین باقی رہے گا اور یہ فتنہ مضمحل ہو جائے گا۔" میں نے اپنی زندگی میں کسی بزرگ اور عالم کو اس فتنے پر اتنا دردمند نہیں دیکھا جتنا کہ حضرت امام العصرؒ کو، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دل میں ایک زخم ہو گیا ہے،

جس سے ہر وقت خون ٹپکتا رہتا ہے۔ جب مرزا کا نام لیتے تو فرمایا کرتے تھے: "لعین ابن اللعین لعینِ قادیان"۔ اور آواز میں ایک عجیب درد کی کیفیت محسوس ہوتی۔ فرماتے تھے کہ" لوگ کہیں گے کہ یہ گالیاں دیتا ہے فرمایا کہ ہم اپنی نسل کے سامنے اپنے اندرونی دردِ دل کا اظہار کیسے کریں؟ ہم اس طرح قلبی نفرت اور غیظ و غضب کے اظہار کرنے پر مجبور ہیں۔ ورنہ محض تردید و تنقید سے لوگ یہ سمجھیں گے کہ یہ تو علمی اختلافات ہیں جو پہلے سے چلے آتے ہیں۔ مرضِ موت میں جب تمام قوتیں جواب دے چکی تھیں اور چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھے ایک دن (یہ جمعہ کا دن تھا) جامع مسجد میں ڈولی میں لائے گئے اور اپنے شاگردوں اور علماء اور اہلِ دیوبند کو آخری وصیت فرمائی کہ دینِ اسلام کی حفاظت کی خاطر اس فتنہ قادیانیت کی سرکوبی کے لئے پوری کوشش کریں اور فرمایا "میرے تلامذہ کی تعداد جنہوں نے مجھ سے حدیث پڑھی ہے دو ہزار ہوگی، ان سب کو میں وصیت کرتا ہوں کہ اس فتنہ کے خلاف پوری جدوجہد کریں۔" حضرت رحمہ اللہ کی یہ وصیّت" دعوتِ حفظِ ایمان "کے نام سے ایک پمفلٹ کی شکل میں شائع ہوگئی تھی۔

حضرت رحمہ اللہ نے اپنی آخری زندگی میں مسلمانانِ کشمیر کو اس فتنے سے بچانے کے لئے آخری تصنیف فارسی زبان میں تالیف فرمائی، کشمیر میں فارسی زبان عام تھی اور وہاں کی علمی زبان فارسی ہی تھی اس لئے آیت خاتم النبیین کی شرح فرمائی، حضرت مرحوم کا دل و دماغ جس طرح علوم و معارف سے بھرا ہوا تھا، ظاہر ہے کہ قلم سے اسی انداز کے علوم و حقائق نکلیں گے۔ زبان فارسی ہو یا اردو علومِ انوری کے جواہرات اپنی پوری تابانی کے ساتھ ظاہر ہوں گے۔ ہر شخص نہ اس کی تہوں تک پہنچ سکتا تھا، اور نہ یہ علوم اس کے قبضہ میں آسکتے تھے، اس کے لئے حسب ذیل امور کی ضرورت تھی:۔

۱۔ عام فہم شستہ اردو زبان میں ترجمہ کیا جائے۔

۲۔ مترجم ذکی و محقق عالم ہو کہ علمی اشارات و لطائف کو بخوبی سمجھتا ہو۔

۳۔ حضرت امام العصر رحمہ اللہ کے طرزِ تحریر سے مناسبت رکھتا ہو اور اس کے سمجھنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہو۔

۴۔ قادیانیت کے موضوع سے دلچسپی رکھتا ہو اور قادیانی مذہب کے لٹریچر سے پوری طرح باخبر ہو۔

۵۔ علمی دقائق کی تشریح پر اردو میں قادر ہو اور قلمی افادات سے عوام کو مستفید بنانے کی قابلیت رکھتا ہو۔

۶۔ تالیفی ذوق رکھتا ہو، تصنیفی ملکہ حاصل ہو تاکہ مناسب عنوانات سے مضمون کو آسان کر سکے۔

۷۔ حضرت امام العصر رحمہ اللہ سے انتہائی عقیدت و محبت ہو کہ مشکلات حل کرنے میں گھبرا نہ جائے اور غور و خوض سے اکتا نہ جائے۔

۸۔ محنت و عرق ریزی کا عادی ہو، دل کا درد رکھتا ہو، قادیانیت سے بغض ہو۔

۹۔ اپنے علمی کاموں میں محض رضاءِ حق کا طالب ہو، حُبِّ جاہ و ثناء سے بالاتر ہو۔

۱۰۔ عام علمی مہارت اور دینی ذوق کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ عربیت و بلاغت کے سمجھنے کی قابلیت رکھتا ہو اور معانی و بلاغت کی نکتہ سنجیوں سے واقف ہو۔

یہ دس امور تھے جو ارتجالاً زبانِ قلم پر آگئے "عشرہ کاملہ" کے بعد اب مترجم صحیح ترجمہ پر قدرت پا سکتا ہے مجھے کسی سے توقع نہ تھی کہ یہ خدمت صحیح طور پر انجام دے سکے گا۔ میری خود بھی ہمت نہ تھی کہ اس لق و دق صحرا میں قدم رکھوں، اگرچہ عرصہ دراز سے احساس تھا کہ اس کے ترجمہ و تشریح کی ضرورت ہے جس وقت شباب تھا اور فرصت بھی تھی دماغ میں تازگی تھی اور عہدِ انوری کی صحبتوں کی یاد تازہ تھی اس وقت توجہ نہ کر سکا اور اس سعادت سے محروم رہا، حالانکہ "نفحۃ العنبر" میں ۵۴ برس پہلے لکھ چکا تھا کہ خدا کی قسم! انوری علوم کے باغ و بہار اور وہبی علوم کا نمونہ اگر دیکھنا ہو تو رسالہ "خاتم النبیین" ملاحظہ کیا جائے [1]۔

---

[1] نفحۃ العنبر کا متعلقہ اقتباس حسب ذیل ہے۔

أودع الشيخ فيها نكات وأسرار أوهبية ما يرهف الألباب والبصائر ويروح القلوب والخواطر، احتوت على حقائق سامية ربانية وبدائع حكم إلهية يبهت لها الخيال وتحار له العقول، ستحس أوان مطالعتها أن المنة

"حضرت شیخ نے اس میں وہ وہبی اسرار و نکات درج کئے ہیں جن سے فہم بصیرت کو جلا ملتی ہے اور روح و قلب کو وجد آجاتا ہے۔ یہ رسالہ ان بلند پایہ حقائقِ ربانیہ اور حکمتِ الٰہیہ کے نوادر پر مشتمل ہے جن سے خیال مبہوت اور عقل ششدر رہ جاتی ہے اس کے مطالعہ کے وقت

الحمدللہ کہ یہ سعادت میرے ہم نام اور میرے ہم کام میرے مخلص رفیقِ کار مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی کے حصہ میں آئی جو اس "عشرہ کاملہ" سے متصف تھے باکمال تھے اور اللہ تعالےٰ کا شکر کہ وہ اس کے ترجمہ وتشریح کے فرض سے نہایت کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے اور اس علمی ودینی خدمت کا حق ادا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ بارگاہ قدس میں قبول فرمائے اور مترجم کے لئے سعادت دارین کا وسیلہ بنائے اور حضرت مولانا انور شاہ رحمہ اللہ کی شفاعتِ مقبولہ کا ذریعہ بنائے۔ آمین

ہدیۃ المہدیین فی آیۃ خاتم النبیین :-

حال ہی میں مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان کی طرف سے حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ ربانی دارالعلوم کراچی) کا عربی رسالہ "ھدیۃ المھدیین فی آیۃ خاتم النبیین شائع کیا گیا جو موصوف نے حضرت الاستاذ امام العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے حکم سے اور انہی کی نگرانی میں مرتب فرمایا تھا۔ اس میں مسئلہ ختم نبوت پر ۲۳ آیات، ۱۰۵ احادیث، صحابہ تابعین کے آثار، علمائے امت کے ارشادات اور کتب سابقہ کی شہادتوں کا بے نظیر ذخیرہ جمع کیا گیا ہے یہ رسالہ عربی میں اپنے موضوع پر جامع ترین کتاب ہے جس پر حضرت امام العصرؒ نے حضرت مؤلف کو بہت داد دی تھی۔

"مجلس تحفظ ختم نبوت" کی جانب سے اس کی اشاعت اس مقصد کے پیش نظر کی گئی ہے کہ نہ صرف

بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ :

السحاب یھطل بدیمھا، أو أنّ البحر الذاخر یسیح بعبہ، وایم اللہ إنّ محاسنھا الجلیۃ تأخذ بالقلوب لاأدری بأیّ وصفٍ أصفھا، درر فاق بھاؤھا، وغرر شاع ضوءھا وسناؤھا وزھر فاح أریجھا ودراق زھاؤ ھا، للہ من حکم یمانیۃ سمح بھا صدرہ وللہ من معارف عالیۃ نثرت من سنی قلمہ۔

ایسا محسوس ہوگا گویا ابر باراں موسلا دھار برس رہا ہے یا بحر محیط ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ خدا کی قسم اس کے محاسن دلوں کو پکڑ لیتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ کن الفاظ سے اس کی تعریف وتوصیف کروں۔ یہ وہ موتی ہیں جن کی رونق سب پر فائق ہے یہ وہ گوہر ہیں جن کی تابانی ودرخشانی شہرۂ آفاق ہے یہ وہ کلیاں ہیں جن کی خوشبو مہک رہی ہے سبحان اللہ! کیا یمانی حکمتیں ہیں جو سینۂ انور سے نکلیں اور ماشاء اللہ کیا ہی اعلیٰ معارف ہیں جو آپ کی نوک قلم سے بکھرے۔

اندرون ملک ہر عالم اور عربی داں اس سے مستفید ہو بلکہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ان تمام ممالک کے اہل علم تک یہ کتاب پہنچائی جائے جہاں قادیانی فتنہ ارتداد کے اثرات ہیں اور جہاں عالمی زبانوں میں مستند اور ٹھوس لٹریچر کا تقاضا شدت سے ہو رہا ہے ارادہ ہے کہ سردست اس کتاب کا ایک لاکھ نسخہ بھجوانے کا بندوبست کیا جائے اور اس کی شکل یہ تجویز کی گئی ہے کہ وہ تمام اہلِ خیر جنہیں دین اور اس کے عالمی تقاضوں کا احساس ہے انہیں اس صدقہ جاریہ کی طرف توجہ دلائی جائے کہ وہ حسب استطاعت اس کے سو سو، ہزار ہزار نسخے خرید کر خود بھجوائیں یا یہ کام "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے سپرد کر دیں جو حضرات اس صدقہ جاریہ کی تحریک میں حصّہ لیں گے انہیں کتاب اصل لاگت پر مہیا کی جا رہی ہے۔ یعنی فی سینکڑہ ۳۰۰/۰۰ تین صد روپے اور فی ہزار ۲۴۰۰/۰۰ چوبیس سو روپے۔ اس چھوٹی سی کتاب کے ایک لاکھ نسخے بھجوا دینا قومی سطح پر معمولی بات بات ہے مگر اس کے اثرات انشاء اللہ دنیا و آخرت میں خیر و برکات کا موجب ہوں گے۔ میں تمام احباب و مخلصین سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ قومی و ملّی فریضہ کی طرف متوجہ ہوں اور اس تحریک میں بیش از بیش حصہ لیں۔

واللہ الموفق لکل خیر و سعادۃ۔ جمادی الثانیہ ۱۳۹۷ھ، جون ۱۹۷۷ء

دینِ اسلام کا سب سے بڑا شعار عقیدہ ختم نبوت

"ختمِ نبوت" کا عقیدہ دین اسلام کا وہ بنیادی عقیدہ ہے کہ تمام عمارت اسی عقیدہ پر قائم ہے یعنی یہ کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی و رسول ہیں اور سلسلۂ نبوت جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا تھا آپ پر ختم ہوا ہے اولِ انبیاء حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اب کوئی نبی یا رسول آنے والا نہیں، یہ قطعی اعلان آسمانی وحی نے قرآنِ کریم میں "سورۂ احزاب" میں کیا ہے اور واضح رہے کہ وحیِ آسمانی کا یہ اعلان ۵ھ ہجری میں حضرت ام المومنین زینب بنت جحش کے آسمانی نکاح کے موقع پر ہوا ہے لیکن اس آیتِ کریمہ کے نزول سے قبل بھی یہ عقیدہ اٹھارہ سال پہلے اسلام کا اساسی عقیدہ تھا، اسی طرح تمام اسلامی عقائد کو قرآنِ کریم کے نزول سے پہلے ہی حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر امت نے تسلیم کیا ہے اور ان پر ایمان لائی ہے بعد میں قرآنِ کریم میں موقع بہ موقع ان کا ذکر و اعلان ہوتا رہا تاکہ اسلامی دستور و اسلامی آئین دینِ اسلام کے مہمات سے خالی نہ ہو، نماز، روزہ، زکاۃ، حج، وضو، غسل وغیرہ وغیرہ تمام اسلامی فرائض کو امت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر تسلیم کیا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم امت کے لئے واجب الاطاعت اور واجب الایمان ہے قرآنِ کریم میں اس کا ذکر ہو یا نہ ہو اور یہ عقائد اور یہ شریعت اور اس کے تمام بنیادی احکام امتِ محمدیہ کو تعامل و توارث و تواتر کے ذریعہ پہنچے ہیں، بہرحال کہنا یہ ہے کہ "ختمِ نبوت" کا عقیدہ اساسی ہے اور قطعی ہے اور ہر دور میں امتِ محمدیہ کا اس پر اجماع رہا ہے جس طرح یہ عقیدہ بنیادی اور اہم ترین عقیدہ ہے اسی طرح اس عقیدے کے مخالف عقیدہ امت میں سب سے بڑا فتنہ ہوگا اور سب سے بڑا کفر ہوگا، چنانچہ شیطان نے سب سے پہلے حملہ اسی عقیدہ پر کیا ہے تاکہ اسلامی بنیاد متزلزل ہو سکے، یمامہ کا "مسیلمہ کذاب" یمن کا "اسودِ عنسی" یمامہ کی "سجاح" یہ کذابین و دجالین کے سرِفہرست ہیں اور اسی لئے جھوٹی نبوت کے مدعی کو ہر دور میں کافر سمجھا گیا اور اس دعوے کو دینِ محمدی کے خلاف بغاوت کے مترادف سمجھا گیا اور اسی اہمیت کے پیشِ نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف اعلان فرمایا کہ :۔

"میری اس امت میں تیس دجال و کذاب پیدا ہوں گے جن میں سے ہر ایک نبوت کا دعویٰ کرے گا اور یہ سب جھوٹے ہیں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا اور میں آخری

نبی ہوں۔"

جیساکہ صحیح بخاری کی روایت میں تصریح کی گئی ہے، بہرحال عقیدۂ ختمِ نبوت دینِ اسلامی کا قطعی عقیدہ ہے قرآنِ کریم اس پر ناطق ہے احادیثِ نبویہ کا اس پر تواتر ہے اور امتِ محمدیہ کا اس پر اجماع ہے اگر غور کیا جائے تو واضح ہوگا کہ امتِ محمدیہ کی تمام کوششیں اور علماءِ اسلام کی تمام محنتیں اور یہ تمام اسلامی ادارے، دینی درس گاہیں اور اسلامی انجمنیں اور احادیثِ نبویہ کی تدریس اور کتبِ حدیث کی تالیف و تصنیف و اشاعت یہ سب کچھ اسی عقیدے کی حفاظت وصیانت کی مختلف صورتیں ہیں اور متعدد مظاہر ہیں اگر یہ عقیدہ درمیان سے ختم ہو جائے تو یہ تمام دینی جدوجہد بالکل لایعنی ہے نہ قرآنِ کریم کی عظمت واہمیت باقی رہتی ہے نہ صحیح بخاری و صحیح مسلم وغیرہ احادیثِ نبویہ کی حاجت باقی رہتی ہے جب دوسرا نبی ورسول آسکتا ہے اور وحیِ الٰہی کا سلسلہ جاری ہے نئی شریعت بھی آسکتی ہے، جدید احکام بھی نازل ہوسکتے ہیں جہادِ اسلامی بھی منسوخ ہوسکتا ہے حج وزکوٰۃ اور تمام عبادات میں جو ترمیم چاہیں ہوسکتی ہے تو قرآن وحدیث کی وقعت واہمیت کیا باقی رہ جاتی ہے، گویا حفاظتِ اسلام کا قوی ترین ومستحکم قلعہ یہی ختمِ نبوت ہے اس لئے شیاطین الانس وشیاطین الجن کا سب سے پہلا حملہ اس قلعہ پر ہوا اس لئے کہ اس مورچہ کو ختم کرکے تمام معاملات حسبِ خواہش طے ہوسکتے ہیں لہٰذا کسی بھی اسلامی حکومت کا سب سے پہلا فریضہ یہ ہے کہ اس قلعہ کی حفاظت کرے، اسلامی دستور، اسلامی آئین کی بنیاد بھی یہی عقیدہ ہے۔

اسلام کے خلاف برطانوی سازش

الغرض دینِ اسلام کا سب سے بڑا شعار "عقیدۂ ختمِ نبوت" ہے بدقسمتی سے متحدہ ہندوستان پر جب فرنگی استعمار کا پنجہ مضبوط ہوگیا اور ۱۸۵۷ء میں روح فرسا مظالم کرکے لاکھوں مسلمانوں کو تہِ تیغ کردیا گیا لیکن اس کے باوجود انگریز اسلام کو ختم نہ کرسکا، تب اسلام کے خلاف جن مؤثر تدابیر کو انگریز نے اختیار کیا ان میں سب سے مؤثر نسخہ یہی ہاتھ آیا کہ اسلام کے اس عقیدہ پر کاری ضرب لگائے انگریزی نفسیات کے بارے میں مسولینی کا مقولہ مشہور ہے کہ ؛ یہ قوم صدیوں پہلے انجام کار کا اندازہ لگالیتی ہے بلاشبہ شیطنت وتلبیس میں یہ قوم اعداءِ اسلام میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے، ہمارے شیخ المشائخ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی فرمایا کرتے تھے کہ ؛ جہاں کہیں اسلام کے خلاف سازش نظر آئے اگر کھوج

لگاؤ گے تو معلوم ہو گا کہ اس کا سر چشمہ انگریز ہے۔ اس لئے انگریزی حکمراں کی نگاہ نے ایک صوبے پنجاب کے ضلع گورداسپور کے گاؤں قادیان میں ایک وکیل مرزا غلام احمد کا انتخاب کر لیا، مسلمانوں میں "مہدیت" کے دعوے دار بہت سے مختلف ادوار میں پیدا ہو چکے تھے لہٰذا یہ دعویٰ زیادہ انوکھا نہ تھا، اس لئے اول مرزا غلام احمد نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تاکہ آسانی سے ہضم ہو سکے، رفتہ رفتہ "مثیلِ مسیح موعود" کا دعویٰ کیا اس کو بھی چند لوگوں نے قبول کر لیا، پھر "مسیحِ موعود" ہونے کا دعویٰ کیا پھر "نبی غیر تشریعی" (یعنی بلا شریعت پیغمبر) ہونے کا مدعی ہوا آخر صراحۃً نبوت کا دعویٰ کر ڈالا اور یہ بھی ساتھ دعویٰ کیا کہ ان کی شریعت میں امر و نہی بھی ہے جدید احکام بھی ہیں اور بالآخر جہاد کے منسوخ ہونے کا اعلان کر دیا، الغرض ترتیب و تدریج کے ساتھ جو پہلے مرحلہ پر سوچ چکا تھا اسی مرحلے پر آخر کار پہنچ گیا تمام اطرافِ ہند میں شور و غوغا ہوا اور تکفیر پر مضامین آئے کتابیں لکھی گئیں لیکن برطانیہ نے بہت ہوشیاری اور تدبر کے ساتھ اس کی ترویج و تقویت اور پشت پناہی میں پورا زور صرف کر دیا اور آج اسی کے نتیجہ میں دنیا کا کوئی گوشہ باقی نہیں رہا کہ انگریز کے اس خود کاشتہ پودے کے ثمرات وہاں نہ پہنچے ہوں، لندن میں تو اس کا مرکز ہی ہے امریکہ کینیڈا سے لے کر فلسطین تک بلکہ اسرائیل کی نام نہاد حکومت میں بھی اس کا مرکز ہے اگر پاکستان کی موجودہ حکومت کا دعویٰ ہے کہ وہ اسلامی حکومت ہے اور دستور کے اندر بھی یہ دفعہ آگئی ہے کہ مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کا عقیدہ رکھے تو اس کو فوراً قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دینا چاہیئے کہ یہ ایک اسلامی حکومت کا ادنیٰ ترین فرض ہے، مقامِ مسرت ہے کہ مکہ مکرمہ میں "رابطۂ عالم اسلامی" کی دعوت پر تمام اسلامی ممالک کی اسلامی جماعتوں کا اجتماع ہوا اور بالاتفاق یہ قرارداد پاس ہوئی کہ "مرزائی قادیانی جہاں بھی ہوں غیر مسلم اقلیت ہیں" صرف پاکستان کے ایک نمائندے نے اتفاق نہیں کیا۔ انا للہ۔

جس حکومت کے نمائندہ کو سب سے پہلے سبقت لے جانی چاہئے تھی وہی مخالف رہا، کہنا یہ ہے کہ حکومتِ پاکستان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اس عقیدہ کی حفاظت کرے اور ملک کے جو باشندے اس عقیدہ کے خلاف ہیں ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر ان کے ساتھ بقیہ غیر مسلم اقلیتوں کا معاملہ کرے، حق تعالیٰ ہمارے حکمرانوں کو دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائیں اور اس پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائیں تاکہ قیامت کے روز سرخ روئی نصیب ہو اور دنیا میں بھی ہم مسلمانوں اور مسلمان حکومتوں کے سامنے رسوا نہ ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس کی حفاظت کر کے آپ کی شفاعتِ کبریٰ کے مستحق ہوں۔

تخلیقِ کائنات کا مقصد

قرآن مجید میں بہت سی جگہ عقیدۂ آخرت کے اثبات کے لئے یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ اگر اس کائنات کی تخلیق کا منشا صرف یہی ہوتا کہ اس دنیا کا نقشہ وجود میں آجائے اور اس کا کوئی نتیجہ نہ ہو تو یہ محض ایک فعلِ عبث اور کھیل تماشا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ قدسی صفات کھیل تماشے سے بلند و بالا اور عبث ولایعنی سے پاک اور منزّہ ہے :-

اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰکُمۡ عَبَثًا	پس کیا تمہارا خیال ہے کہ ہم نے تمہیں عبث پیدا کیا
وَّ اَنَّکُمۡ اِلَیۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ[1]	ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے۔

یہ کارخانۂ عالم بے نتیجہ و بے مقصد نہیں بلکہ ذریعہ و وسیلہ ہے ایک بڑے مقصد کا، یہ عبوری و عارضی اور امتحانی و ابتلائی زندگی خود مقصد نہیں بلکہ یہ تمہید ہے آخرت کی، جہاں کی زندگی ابدالآباد کی زندگی ہوگی، سورۂ فاتحہ سے سورۃ الناس تک بے شمار مقامات پر محیر العقول معجزانہ اسلوب اور عجیب مؤثر انداز میں یہ حقیقت بار بار ذہن نشین کرائی گئی ہے، سُورۂ فاتحہ میں جسے ایک مسلمان کم ازکم ۳۲ مرتبہ روزانہ پڑھتا یا سنتا ہے، حق تعالیٰ کی ربوبیت اور رحمتِ عامہ کے فوراً بعد یوم الدین کی مالکیت اور بادشاہی کا اعلان کیا گیا ہے تاکہ ہر لحظہ یہ عقیدہ پیشِ نظر رہے کہ دنیا خود مقصد نہیں اصل منزلِ مقصود آخرت اور صرف آخرت ہے۔

پاکستان کا مقصد

ٹھیک اسی طرح یہ سمجھنا چاہیئے کہ مملکتِ خداداد پاکستان جسے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کی طویل اور صبر آزما جنگِ آزادی کے بعد حاصل کیا گیا جس کے لئے جان و مال اور عزت و آبرو کی بے مثال قربانیاں دی گئیں جس کی خاطر لاکھوں خاندانوں کو ترکِ وطن کی وہ صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں جن کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ شرمندہ ہے اور جس کو خدا اور رسول کے مقدس نام پر اور

---

[1] سورۃ المومنون ع ۶

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کا واسطہ دے کر حاصل کیا گیا، اگر اس کا مقصد صرف اتنا ہی تھا کہ آزادی مل جائے، کافروں کی جگہ بڑے بڑے مسلمان سرمایہ دار وجود میں آجائیں، بڑے بڑے کارخانے ہوں، فلک بوس عمارتیں اور خوشنما بلڈنگیں ہوں، فراخ سڑکیں اور عمدہ کاریں ہوں، سینما اور تھیٹر ہوں، ریڈیو اور ٹیلیویژن ہوں، شاندار ہوٹل اور کلب گھر ہوں، رقص وسرور کی محفلیں، مخلوط دعوتیں اور حیا سوز مناظر ہوں، سود اور رشوت کا بازار گرم ہو، ظلم و ناانصافی کا دور دورہ ہو، لاقانونیت کی فضا ہو، نہ خدا کا خوف ہو نہ قانون کا ڈر، نہ حاکم کو احساسِ فرض ہو نہ محکوم کو، نہ کسی کی جان محفوظ ہو نہ مال، نہ پولیس اپنے منصب کی پروا کرے نہ عدالت سے دادخواہی غریب آدمی کے لئے ممکن ہو، ایک طرف کارخانوں پر کارخانے کھلتے جائیں اور دوسری طرف ملک کا نادار طبقہ نانِ جویں کا محتاج ہو، الحاد و دہریت کی کھلی چھٹی ہو، کوئی کسی کے ایمان پر ڈاکہ ڈالے، ایمانی عقائد پر حملہ کرے، اخلاق کو تباہ کرے، معاشرہ کو متعفّن کرے مگر قانون اسے روکنے میں کامیاب نہ ہو، الغرض یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اگر یہ ملک اسی کے لئے بنا تھا، آزادی اسی کے لئے حاصل کی گئی تھی، خدا اور رسول کے مقدس نام کا استعمال انہی "مقاصد" کے لئے ہوا تھا، پاکستان کی تفسیر کلمہ طیبہ[1] سے اسی کے لئے کی گئی تھی تو ہم نے خود اپنے اوپر کتنا بڑا ظلم کیا اور بھری دنیا کو کتنا بڑا دھوکا دیا؟ یہ سارے کام تو امریکہ و یورپ اور بے دین ممالک میں بھی بڑے وسیع پیمانے پر انجام دیئے جا رہے تھے۔

الغرض حق تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق اگر تخلیقِ دنیا کا منشاء آخرت نہ ہو، روزِ جزا میں میزانِ عدل قائم نہ ہو، جزا و سزا کا دفتر نہ کھلے، مجرمین کو سزا اور صالحین کو جنت نہ ملے تو عالم کا تمام نقشہ بے کار ہے، محض کھیل اور تماشا ہے، اسی طرح اگر پاکستان کا مقصد اسلامی حکومت، اسلامی دستور اور اسلامی قانون نہ ہو تو یہ تمام نقشہ بے کار ہے اور کھیل تماشے سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

---

[1] "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا إله إلا الله!" تحریکِ پاکستان کے دوران بچے بچے کی زبان پر تھا، ان بچوں کو جواب پیرانہ سالی میں قدم رکھ رہے ہیں یہ نعرہ اب بھی یاد ہوگا۔

تاسیسِ پاکستان کا اصل مقصد

پاکستان کی تاسیس کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس ملک میں اسلام کا قانون رائج ہو، ایک صالح معاشرے کی تشکیل ہو، فواحش و منکرات کا قلع قمع کیا جائے، بے حیائی و عریانی کا جو سیلاب خدا فراموش ملکوں سے آرہا ہے اس سے محفوظ رہا جائے، ظلم و عدوان کو مٹایا جائے۔ اسلام کے عدل و انصاف کے سائے میں ہر شخص اطمینان و سکون کی زندگی بسر کرسکے۔ قوم کے نادار افراد کی دستگیری کی جائے، کس قدر حیرت و افسوس کا مقام ہے کہ تئیس سال کے طویل عرصہ کے بعد بھی ہم اسلامی قانون کے سایۂ رحمت سے محروم ہیں، ملک اسلام اور مسلمانوں کا ہے: حکومت مسلمانوں ہی کی ہے، حکومت کا سرکاری مذہب اسلام ہے، مگر نہ اسلامی دستور ہے نہ اسلامی قانون، قوم بار بار مارشل لاء کے سائے میں زندگی گذارنے پر مجبور ہے، اس سے بڑھ کر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس اسلامی ملک میں کوئی "اسلامی حکومت" آج تک مسلم اور غیر مسلم کے درمیان سرکاری طور پر کوئی حدِ فاصل قائم نہیں کرسکی، گذشتہ دورِ حکومت میں یہ سستا اصول بنا لیا گیا تھا کہ جو شخص بھی اسلام کا ادعا کرے وہ مسلمان ہے، ایک شخص حکومت کے سرکاری مذہب سے بغاوت کرکے حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کا انکار کرے، ارشاداتِ نبوت کو جھٹلائے، الحاد و تحریف کے ذریعہ دین کی ساری جڑوں کو کھوکھلا کردے، مرزائی بنے، پرویزی بنے، ملحد بنے، نماز روزہ کا مذاق اڑائے، انبیاءِ کرام کی توہین کرے، مگر یہاں اس کے "اسلام" پر کوئی آنچ نہیں آتی اور وہ جوں کا توں مسلمان رہتا ہے، اس سے بڑھ کر ستم ظریفی اور کیا ہوسکتی ہے کہ ایک مسلمان ملک میں اسلام کے حقوق محفوظ نہ ہوں۔

قادیانیوں کے بارے میں عدالت کے فیصلے

تاہم اس پُر آشوب اور تاریک فضا میں بھی روشنی کی کرن کبھی کبھار پھوٹ نکلتی ہے، مرزائی اُمت کی شرعی اور قانونی حیثیت کیا ہے؟ اس نکتہ پر سابق ریاستِ بہاولپور کے جج جناب

محمد اکبر صاحب کا تاریخی فیصلہ[1] ایک مسلمان جج کے ایمان کا شاہکار تھا، قیامِ پاکستان کے بعد جناب شیخ محمد اکبر ڈسٹرکٹ جج راولپنڈی نے ان کے کفر کا فیصلہ دیا[2] اور اب یہ تیسرا فیصلہ ہے جو جیمس آباد کے سول جج جناب محمد رفیق گوریجہ پی، سی، ایس نے جنہیں فیملی کورٹ جج کے اختیارات بھی حاصل ہیں، ایک احمدی مرد کے ساتھ مسلمان لڑکی کے نکاح کو ناجائز قرار دیتے ہوئے صادر فرمایا ہے[3]۔

یہ فیصلہ بے حد لائق تحسین اور قابلِ مبارک باد ہے جہاں ہم محترم جج کو مبارک باد پیش کرتے ہیں وہاں موجودہ مارشل لاء حکومت کے دور میں عدلیہ کی آزادی بھی قابلِ صد تبریک ہے جس کی وجہ سے ایک سول جج اس جرأتِ ایمانی کا مظاہرہ کر سکتا ہے کہ وہ شرعی اور اسلامی قانون کے مطابق مُدلّل اور مفصل فیصلہ کر سکے کہ چونکہ قادیانی مسلمان نہیں اس لئے کسی مسلمان عورت اور قادیانی مرد کے درمیان عقدِ نکاح منعقد نہیں ہوتا۔

فیصلے کا پورا متن ملک کے بہت سے اخبارات و جرائد میں شائع ہو چکا ہے۔ یہاں ہم اس فیصلے کے چند اہم نکات کا مطالعہ کرانا چاہتے ہیں۔

فیصلہ جیمس آباد کے اہم نکات

نکتہ اول: مسلمان کسے کہتے ہیں۔

سب سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ اسلام کی تعریف کیا ہے؟ اسلام اور کفر کے درمیان حدِ فاصل کیا ہے؟ اور وہ کون سی چیز ہے جو ایک مسلمان کو غیر مسلم سے مُمیّز کرتی ہے؟ اس نکتہ پر بحث کرتے ہوئے فاضل جج امیر علی کی کتاب "محمڈن لا" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> کوئی شخص جو اسلام لانے کا اعلان کرتا یا دوسرے لفظوں میں خدا کی وحدانیت اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیغمبر ہونے کا اقرار کرتا ہے وہ مسلمان اور مسلم لاء کے تابع ہے۔"

---

[1] بمقدمہ مسماۃ غلام عائشہ بنت مولوی الٰہی بخش۔ بنام عبدالرزاق ولد مولوی جان محمد، یہ مقدمہ دو سال تک زیرِ سماعت رہا اور فاضل جج نے ۷ فروری ۱۹۳۵ء مطابق ۳ ذیقعدہ ۱۳۵۳ کو فیصلہ سنایا۔ "فیصلہ مقدمہ بہاولپور" کے نام سے طبع ہو چکا ہے اور نہایت قیمتی دستاویز ہے۔

[2] بمقدمہ امۃ الکریم بنت کرم الٰہی۔ بنام لیفٹیننٹ نذیر الدین پسر ماسٹر محمد دین، یہ فیصلہ ۳ جون ۱۹۵۵ء میں ہوا، مجلس تحفظ ختم نبوت تغلق روڈ ملتان سے شائع ہو چکا ہے۔

[3] بمقدمہ امۃ الہادی بنت سردار خاں بنام حکیم نذیر احمد برق قادیانی یہ فیصلہ ۱۳ جولائی ۱۹۸۰ء کو پڑھ کر سنایا گیا۔

ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں: "ہر وہ شخص جو خدا کی وحدانیت اور رسولِ عربی کی پیغمبری پر ایمان رکھتا ہے، دائرۂ اسلام میں آجاتا ہے۔"

نیز سر عبدالرحیم کی کتاب "محمڈن جورسپروڈنس" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:۔

"اسلامی عقیدہ خدائے واحد کی حاکمیت اور محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی کی حیثیت سے مشن کی صداقت پر مشتمل ہے۔"

یہ دونوں تعریفیں جو اپنے مفہوم میں متحد ہیں، اپنی جگہ صحیح اور درست ہیں مگر تشریح طلب ہیں اسلام دراصل انسان کے اس عہد کا نام ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے اس پورے دین کو جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بھیجا گیا، دل وجان سے تسلیم کرتا ہے، اس عہد میں چند اصولی چیزیں آپ سے آپ آجاتی ہیں۔

اوّل:۔ اس عہد کی رُو سے لازم ہوگا کہ دین کے تمام اجزاء کو ایک ایک کرکے تسلیم کیا جائے اگر کوئی شخص دین کی کسی ایسی بات کو جس کا ثبوت قطعی ہے[1] نہیں مانتا تو چاہے باقی سارے دین کو مانتا ہو تب بھی وہ مسلمان نہیں کہلائے گا کیونکہ معاہدہ کی ایک شق سے انحراف معاہدہ کی پوری دستاویز سے انحراف سمجھا جاتا ہے، قرآن کریم میں ارشاد ہے:۔

---

[1] دین کی ایسی باتیں جن کا ثبوت قطعی ہے اور جن کا دینِ محمدی میں داخل ہونا ہر عام وخاص کو معلوم ہے، "ضروریاتِ دین" کہلاتی ہیں: ضروریات "ضروری" کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: بدیہی، واضح، بالکل ظاہر۔ "ضروریاتِ دین" کے معنی ہوئے: وہ امور جن کا جزوِ دین ہونا بالکل ظاہر، واضح اور قطعی ہو، ان کے ثبوت میں کوئی خفا نہیں، نہ شک وشبہ کی گنجائش ہے۔

"ضروریاتِ دین" کے ذیل میں وہ ساری چیزیں آجاتی ہیں جن کا ثبوت قرآنِ مجید، حدیثِ متواتر اور اجماعِ امت سے ہو، ان تمام امور کا ماننا ایمان کہلاتا ہے اور ان میں سے کسی ایک کا انکار کر دینا بھی صریح کفر ہے اور ان کو توڑ مروڑ کر غلط معنی پر محمول کرنا الحاد اور زندقہ کہلاتا ہے جو کفر کی بدترین صورت ہے، اس موضوع پر جامع ترین تحقیقی کتاب امام العصر مولانا محمد انور شاہ رحمہ اللہ کی تصنیف اکفار الملحدین ہے جس کا اردو ترجمہ بھی مجلس علمی کراچی نے شائع کر دیا ہے، قابلِ دید ہے خصوصاً علماء ومحققین کے استفادہ کے لائق ہے۔

((اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتَابِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ج وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ ط وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ))

(البقرہ ع ۱۰)

پھر کیا ایسا نہیں کہ تم کتاب کے ایک حصے پر تو ایمان لاتے ہو، اور اس کے ایک حصے سے مُکر جاتے ہو؟ تم میں سے جو شخص بھی ایسا کرے گا اس کا بدلہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسے دنیا میں رسوائی نصیب ہو اور قیامت کے دن انہیں سخت ترین عذاب کے حوالے کیا جائے گا، اور اللہ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو۔

دوم:۔ اس عہد کا دوسرا تقاضا ہے کہ تمام دینی حقائق کو منُ وعَن تسلیم کیا جائے اور ان کے معنیٰ ومفہوم وہی لئے جائیں جو خدا اور رسول کی مراد ہیں اور جو صحابہؓ کے دور سے آج تک اپنے صحیح تسلسل کے ساتھ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے ہوئے ہم تک پہنچے ہیں، اگر ایک شخص الفاظ کی حد تک تو دین کو ماننے کا دعوی کرتا ہے لیکن وہ دین کے بنیادی حقائق کی من مانی تاویل کر کے ان کی اصل روح کو کچل دیتا ہے اور انہیں ایسے من گھڑت اور عجیب وغریب معنیٰ پہناتا ہے جو نہ خدا اور رسول کی مراد ہیں، نہ صحابہؓ وتابعین کے زمانہ میں ان کا کبھی تصور کیا گیا، نہ اسلام کی بعد کی صدیوں کے علماء ان سے آشنا ہوئے تو یہ شریعت کی اصطلاح میں تحریف، الحاد اور زندقہ ہوگا اور یہ کفر کی خبیث ترین قسم ہے، یہ شخص دین کو مانتا نہیں بلکہ دین سے کھیلتا ہے، اسی قماش کے لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے:۔

((اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا ط اَفَمَنْ یُّلْقٰی فِی النَّارِ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ یَّاْتِیْٓ اٰمِنًا یَّوْمَ الْقِیٰمَۃِ ط اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ لا اِنَّہٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ)) (حم السجدہ ع ۵)

یقیناً جو لوگ ہمارے احکام میں کجروی اختیار کرتے ہیں وہ ہم سے چھپے نہیں رہ سکتے، پس کیا وہ شخص جسے دوزخ میں ڈالا جائے گا، بہتر ہے یا وہ شخص جو قیامت کے دن امن کی حالت میں آئے گا؟ تم جو چاہو کرلو، وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) تمہارے کرتوتوں کو یقیناً دیکھ رہا ہے۔

سوم :۔ اس عہد کا تیسرا مقتضیٰ یہ ہے کہ اس عہد و پیمان کے بعد اس سے کوئی ایسا قول و فعل سرزد نہ ہو جو اس عہد کی نفی کرتا ہو۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اسلام کا عہد باندھ لینے کے بعد دوسرے تمام مذاہب و ملل کے عقائد و افکار اور نظریۂ حیات سے کنارہ کشی کرے، اگر ایک شخص اسلام کا دعویٰ کرتا ہے مگر عملاً بُت کو سجدہ کرتا ہے، ہندوؤں کے مذہبی مراسم بجالاتا ہے، عیسائیوں کی صلیب لٹکاتا ہے یا معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں گستاخی کرتا ہے، کسی نبی کی تنقیص کرتا ہے، قرآن مجید سے ہتک آمیز سلوک کرتا ہے، شعائرِ دین کی بے ادبی کرتا ہے، کسی حکم شرعی کا مذاق اڑاتا ہے، ایسا شخص اپنے دعوائے ایمان میں مخلص نہیں بلکہ منافق ہے اور محض اسلام اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے اسلام کا ادعا کرتا ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

((وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ، يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا)) (البقرۃ ع ۲)	اور بعض لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر، حالانکہ وہ قطعاً مومن نہیں، وہ اللہ کو اور مسلمانوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔

الغرض اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ : (۱) دین کے وہ تمام حقائق جن کا علم ہمیں یقینی ذرائع سے پہنچا ہے، ان سب کو تسلیم کرے (۲) ان کو بغیر کسی تاویل و تحریف کے مِن وعَن قبول کرے (۳) اور اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس سے اس کے دعوائے ایمان کی نفی ہوتی ہو، کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اس معاہدۂ ایمان کا مختصر متن ہے، جو دین کی تمام تفصیلات کو شامل ہے، یہ ہے اسلام کی میزانِ عدل! جس سے کسی کے اسلام اور کفر کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

نکتہ دوم : مسلمان اور غیر مسلم کے الگ الگ دائرہ عمل :۔

فاضل جج نے اس نکتہ پر بھی بحث کی ہے کہ آیا عدالت یہ تعین کر سکتی ہے کہ احمدی (مرزائی) مسلمان ہیں یا نہیں؟ انہوں نے عدالتِ عالیہ کے فاضل ججوں کے مشاہدات کا حوالہ دیتے ہوئے یہ قرار دیا ہے کہ بعض صورتوں میں عدالت کے لئے یہ تصفیہ ناگزیر ہے مثلاً وراثت، جائداد

منصب، کسی خانقاہ کی سجادہ نشینی، کسی مذہبی ادارے کی سربراہی یا پاکستان کے صدارتی انتخاب کی امیدواری کا سوال ہو وغیرہ، تو عدالت کو یہ تعین کرنا ہوگا کہ احمدی (مرزائی) مسلمان ہیں یا نہیں۔"

جہاں تک ہماری عدالتوں کے دائرۂ اختیار کا تعلق ہے اس کی تشریح تو عدالتِ عالیہ ہی بہتر کر سکتی ہے لیکن جہاں تک شریعتِ اسلامیہ کے فیصلے کا سوال ہے اس کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام اور کفر کی لائنیں اپنے نقطۂ آغاز ہی سے جُدا ہو جاتی ہیں ہماری شریعت میں ایک لمحہ کے لئے نہ کسی مسلمان سے غیر مسلم کا سا سلوک کیا جا سکتا ہے، نہ کسی غیر مسلم کو مسلمان کے حقوق دیئے جا سکتے ہیں۔

کوئی غیر مسلم[1]، سلام و دعا اور مسلمانوں کی دوستی اور موالات کا مستحق نہیں، وہ مر جائے تو اسلامی طریقہ کے مطابق اس کا کفن دفن اور جنازہ جائز نہیں، وہ کسی عزت و تکریم کا مستحق نہیں، وہ کسی مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا، نہ مسلمان اس کا وارث ہو سکتا ہے، وہ اسلامی عدالت کا جج نہیں بن سکتا، نہ اسلامی آئین کی تدوین میں اسے شریک کیا جا سکتا ہے، نہ اسے کسی کلیدی آسامی پر مسلط کیا جا سکتا ہے، نہ وہ مسلمانوں کے کسی مذہبی ادارے کے لئے موزوں ہے نہ کسی مسلمان عورت سے نکاح کر سکتا ہے، نہ کسی مسلمان لڑکی کا ولی بن کر اس کا نکاح کرا سکتا ہے، نہ کسی مسلمان یتیم بچے کا متولی ہو سکتا ہے۔ وغیر ذالک

ظاہر ہے کہ یہ وہ احکام ہیں جن کی قدم قدم پر ضرورت واقع ہوگی اور ایک مسلمان کو خدا و رسول کے حکم کے مطابق ان احکام کا ہر لمحہ خیال رکھنا ہوگا، اس لئے ایک مسلمان کے لئے یہ تعین ہر وقت ضروری ہے کہ فلاں شخص اپنے نظریات و عقائد کے ساتھ مسلمان ہے یا نہیں؟

اور یہ تو خیر عام غیر مسلموں کا حکم ہے، مُرتد کی نوعیت اس سے زیادہ سنگین ہے، اسلام لانے کے بعد اس سے پھر جانا یا اسلام کے کسی قطعی حکم کا انکار کر دینا، یا ضروریاتِ دین کو توڑ

---

[1] غیر مسلم سے مراد یہاں وہ تمام لوگ ہیں جنہوں نے نکتۂ اولیٰ کی تشریح کے مطابق اسلام قبول نہیں کیا، ایسے لوگ خواہ اپنے آپ کو ہزار بار مسلمان کہیں لیکن جب تک وہ اپنے غلط نظریات سے توبہ کرکے سیدھے طریقے سے اسلام کو قبول نہیں کرتے شریعت کی نظر میں وہ مسلمان نہیں، نہ ان سے مسلمانوں کا سا برتاؤ جائز ہے۔

موڑ کر ان کو من گھڑت معنیٰ پہنانا شروع کر دینا، یا شریعت کے کسی حکم کو طنز و تعریض کا نشانہ بنانا "ارتداد" کہلاتا ہے، ارتداد، اسلام کی نظر میں کفر اور شرک سے کہیں بڑھ کر انتہائی درجے کا سنگین جرم ہے، اسلام نے جرائم کی جو فہرست مرتب کی ہے ان میں صرف تین جرائم ایسے ہیں جن کے لئے سزائے موت تجویز کی ہے۔

معاشرتی جرائم میں قتلِ عمد سب سے بدتر جرم ہے اور سزائے موت کا موجب، اخلاقی جرائم میں زنا سب سے گھناؤنی چیز ہے اور اس کے لئے رجم (سنگساری) کی سزا ہے اور نظریاتی جرائم میں ارتداد، کفر و طغیان کی آخری حد ہے اور اس کے لئے سزائے موت کا حکم ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

"من بدّل دینہ فاقتلوہ" (صحیح بخاری) جو شخص بھی اپنے دین کو بدل کر مرتد ہو جائے اسے قتل کر دو۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام صُلح و جزیہ کے شرائط پر کفر و شرک سے تو مصالحت کر سکتا ہے لیکن ارتداد سے مصالحت کرنے کے لئے کسی قیمت پر آمادہ نہیں، مُرتد کے بارے میں اس کا فیصلہ یہ ہے کہ اسے تین دن کی مہلت دی جائے، اس کے شبہات کے ازالہ کی کوشش کی جائے اگر وہ اسلام کی طرف پلٹ آئے تو اس کی جان بخشی کی جائے گی، ورنہ اس پر سزائے موت جاری کر دی جائے گی [۱] مُرتد کو مہلت کے ان تین دنوں میں بھی آزاد نہیں چھوڑ دیا جائے گا بلکہ نظربند رکھا جائے گا اور اس سے مکمل معاشرتی مقاطعہ (بائیکاٹ) ضروری ہو گا اور اسے آزادانہ تصرفات کی اجازت نہیں ہو گی۔

خلاصہ یہ کہ جس شخص کا کفر یا ارتداد معروف ہو شریعتِ اسلام کے مطابق اس کے ساتھ ایک لمحہ کے لئے بھی مسلمانوں کا سا برتاؤ نہیں کیا جا سکتا، اسے مسلمانوں کی جماعت میں گھسنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی ہے، نہ اسے اسلامی برادری کے حقوق سے نفع اندوزی کا موقع دیا جا سکتا ہے۔

---

[۱] امام شافعیؒ اور دوسرے ائمہ کے نزدیک مُرتد مرد یا عورت دونوں کا ایک ہی حکم ہے مگر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ صرف مرد کا حکم ہے، عورت کے لئے حبسِ دوام کا حکم ہے جب تک کہ وہ توبہ نہ کرلے۔

نکتہ سوم: قادیانی کافر و مرتد ہیں، اس کے وجوہ و اسباب

فاضل جج نے قرآن مجید، احادیثِ نبویہ اور اجماعِ اُمت سے یہ ثابت کرنے کے بعد کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں، مرزا غلام احمد اور ان کے پیروؤں کے جو عقائد و نظریات ان ہی کے لٹریچر سے پیش کئے ہیں اور جن کو سامنے رکھ کر فاضل جج نے مرزائیوں کے کفر و ارتداد کا فیصلہ کیا ہے، ان کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:۔

(۱) مرزا غلام احمد نے ختمِ نبوت کے اسلامی عقیدہ سے انحراف کیا ہے۔

(۲) انہوں نے بہت سے مقامات پر خود نبی و رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

(۳) انہوں نے بہت سی ان آیات کو جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے خود اپنی ذات پر چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۴) انہوں نے مسیحِ موعود ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

(۵) انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے نسب پر طعن کیا ہے اور ان کی دادیوں اور نانیوں کے خلاف غیر شائستہ زبان استعمال کی ہے۔

(۶) انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کے بارے میں توہین آمیز کلمات کہے ہیں۔

(۷) انہوں نے اپنے لئے نزولِ وحی کا دعویٰ کیا ہے۔

(۸) انہوں نے قرآن مجید کی آیات کو دیدہ و دانستہ مسخ کیا ہے۔

(۹) انہوں نے نزولِ عیسیٰ کے اسلامی عقیدہ کا انکار کیا ہے اور اس کی من مانی تاویلیں کی ہیں۔

(۱۰) انہوں نے ان تمام مسلمانوں کو جو ان پر ایمان نہیں لائے، کافر قرار دیا ہے۔

(۱۱) انہوں نے اپنے پیروؤں کو مسلمانوں کے پیچھے نماز پڑھنے سے روکا ہے۔

(۱۲) انہوں نے مرزائیوں کو مسلمانوں کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے منع کیا ہے۔

(۱۳) انہوں نے مرزائیوں کو حکم دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے نکاح میں اپنی بیٹیاں نہ دیں، کیونکہ وہ کافر ہیں۔

(۱۴) انہوں نے اپنے ایک خواب کے حوالے سے خدائی کا دعویٰ کیا ہے اور آسمانوں کی تخلیق کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

(۱۵) مرزائیوں نے "الفضل" (۱۷ جولائی ۱۹۲۲ء) میں دعویٰ کیا ہے کہ ہر شخص بڑے سے بڑا مرتبہ پا سکتا ہے، حتیٰ کہ (نعوذ باللہ) محمد رسول اللہ سے بھی بڑھ سکتا ہے۔

(۱۶) مرزائیوں کا دعویٰ ہے کہ مرزا غلام احمد کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں کا وہی مرتبہ ہے جو صحابۂ رسولؐ کا تھا۔

(۱۷) مرزا غلام احمد نے اپنی نبوت پر ظل و بروز کا پردہ ڈالا ہے اور یہ بقول علامہ اقبال مجوسیوں کا عقیدہ ہے۔

(۱۸) انہوں نے تنسیخِ جہاد کا دعویٰ کیا ہے۔

فاضل جج نے مرزائی لٹریچر کے ان اقتباسات سے جو "مشتے نمونہ از خروارے" کا مصداق ہیں، یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مرزا غلام احمد اور ان کے پیروؤں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں، فاضل جج نے اس سلسلے میں جو ریمارکس دیئے ہیں، ان کے چند اقتباس ملاحظہ ہوں، موصوف لکھتے ہیں:-

"قرآنِ پاک اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ بالا ارشادات کے بعد یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ مدعا علیہ (مرزائی) نے خود کو نعوذ باللہ پیغمبروں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے اور اس کے ممدوح مرزا غلام احمد نے بھی اپنے پیغمبر اور نبی اور رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:-

"مدعا علیہ اور مرزا غلام احمد دونوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ایک بالکل مختلف تصور پیش کیا ہے جو مسلمانوں کے مسلمہ عقائد کے یکسر منافی ہے اور قرآنِ پاک کی تعلیمات سے متصادم ہے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:-

لیگل اتھارٹی کے پورے احترام کے ساتھ میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ احمدیوں

اور غیر احمدیوں میں نہ صرف یہ کہ بنیادی اور نظریاتی اختلاف موجود ہے بلکہ ان میں عقیدے اور اعلانِ نبوت کے بارے میں بھی اختلافات موجود ہیں، نیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کا نزول، قرآنِ پاک کی آیات کو مسخ کرنا میری رائے میں کسی شخص کو بھی مُرتد قرار دینے کے لئے کافی ہیں۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

"رسولِ پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس سے زیادہ اور کوئی توہین نہیں ہو سکتی کہ مرزا غلام احمد جیسا شخص یا مدعا علیہ یا کوئی اور خود کو پیغمبرانِ کرام (علیہم السلام) کی صف میں کھڑا کرنے کی جسارت کرے کوئی مسلمان کسی شخص کی طرف سے ایسا دعویٰ برداشت نہیں کر سکتا اور نہ قرآن و حدیث سے اس طرح کے دعوے کی تائید لائی جا سکتی ہے۔"

"مرزا غلام احمد نے دانستہ طور پر قرآنِ پاک کی آیات خود سے منسوب کی ہیں اور انہیں خود ساختہ معنیٰ پہنائے ہیں تاکہ وہ دوسروں کو گمراہ کر سکیں، اور یہ بے خبر اور جاہل لوگوں کو گمراہ کرنے کی ایسی سنگین غلط بیانی ہے جو جان بوجھ کر روا رکھی گئی ہے اور جو اسلام کی نظر میں گناہِ کبیرہ ہے۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

"پیغمبرانِ کرام کے بارے میں غیر شائستہ زبان کا استعمال ہی کسی کے ارتداد کے رجحان کی غمازی کرنے کے لئے کافی ہے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

"مرزا غلام احمد یا مدعا علیہ کی نام نہاد نبوت پر ایمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی کھلی تنقیص ہے، جس کی وضاحت خداوند تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں اور رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں کر دی ہے، مدعا علیہ اور مرزا غلام احمد نے امتی نبی یا رسول، یا ظلی اور بروزی نبی کا جو تصور پیش کیا ہے وہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کے سراسر منافی ہے، اس کی کوئی سند قرآن اور

حدیث سے نہیں ملتی اور نہ مدعا علیہ اور مرزا غلام احمد کے تصور کی تائید کسی اور ذریعہ سے ہوتی ہے، امتی نبی کا تصور انتہائی غیر اسلامی ہے اور یہ مرزا غلام احمد اور مدعا علیہ کی من گھڑت تصنیف ہے۔"

فاضل جج آگے چل کر اپنے فیصلے میں مزید لکھتے ہیں:۔

مندرجہ بالا امور کے پیشِ نظر میں یہ قرار دینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ مدعا علیہ اور ان کے ممدوح مرزا غلام احمد نبوت کے جھوٹے مدعی ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہامات وصول کرنے کے متعلق بھی ان کے دعوے باطل اور مسلمانوں کے اس متفقہ عقیدے کے منافی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزولِ وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔"

" مسلمانوں میں اس بارے میں اجماع ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں اور ان کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا، اور اگر کوئی اس کے برعکس یقین رکھتا ہے تو وہ صریحاً کافر اور مرتد ہے۔"

" مرزا غلام احمد نے قرآنِ پاک کی آیاتِ مقدسہ کو توڑ مروڑ کر اور غلط رنگ میں پیش کیا ہے اور اس طرح انہوں نے ناواقف اور جاہل لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے، انہوں نے جہاد کو منسوخ قرار دیا ہے اور شریعتِ محمدی میں تحریف کی ہے اس لئے مدعا علیہ کو جس نے خود اپنی نبوت کا اعلان کیا ہے، نیز مرزا غلام احمد اور ان کی نبوت پر اپنے ایمان کا اعلان کیا ہے، بلا کسی تردد کے کافر اور مُرتد قرار دیا جا سکتا ہے۔"

قادیانی مسئلہ میں فاضل عدالت کا فیصلہ اتنا واضح ہے کہ اس پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، یہ فیصلہ جو قرآن مجید، احادیثِ نبویہ اور اجماعِ امت کی روشنی میں کیا گیا ہے، پوری ملتِ اسلامیہ کے احساسات و عقائد کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی ہے، اس فیصلے کا اطلاق جس طرح قادیانی مرزائیوں پر ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح لاہوری مرزائیوں کے مؤقف کو بھی واضح کر دیتا ہے۔

بعض ناواقف اور جاہل یہ سمجھتے ہیں کہ مرزائیوں کی قادیانی پارٹی تو بلاشبہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے کیونکہ وہ مرزا غلام احمد کو نبی مانتی ہے، لیکن لاہوری پارٹی مرزا صاحب کو نبی نہیں مانتی اس لئے انہیں دائرۂ اسلام سے خارج قرار دینا مشکل ہے، یہ مُوقف شریعتِ اسلام اور لاہوری پارٹی دونوں کی حقیقت سے بیک وقت جہالت اور ناواقفی کی دلیل ہے۔

اولاً:۔ لاہوری پارٹی جس کی قیادت مسٹر محمد علی (مرید مرزا غلام احمد قادیانی) کے ہاتھ میں تھی مرزا غلام احمد اور ان کے خلیفۂ اول حکیم نور الدین کے زمانہ تک ٹھیک ان ہی عقائد و نظریات کی حامل تھی جو دوسرے قادیانیوں کے ہیں، مسٹر محمد علی اور ان کے ہمنواؤں کی اس وقت کی تحریریں شاہد ہیں کہ وہ مرزا غلام احمد کو نبی مانتے تھے اور اس کا برملا اعلان کرتے تھے، مرزا صاحب کے خلیفۂ دوم مرزا بشیر الدین سے ذاتی اور سیاسی اختلافات کی بنا پر انہوں نے اپنی الگ پارٹی بنالی اور یہ مُوقف اختیار کیا کہ مرزا غلام احمد نبی نہیں تھے بلکہ مجددِ اعظم تھے، پھر مجدد مان کر تمام انبیاءِ کرام سے ان کو افضل مانتے ہیں، اب جب تک یہ پارٹی اپنے سابق مُوقف سے برائت کا اظہار کرتے ہوئے تجدیدِ اسلام کا اعلان نہیں کرتی، اسے مسلمان تصور نہیں کیا جا سکتا، فقہائے امت کی تصریح کے مطابق کسی مُرتد کا اسلام اسی وقت معتبر ہوگا جب کہ وہ اپنے سابق نظریات سے مکمل برائت کا اعلان کرے۔

ثانیاً:۔ لاہوری پارٹی اگرچہ مرزا غلام احمد کو بظاہر نبی نہیں مانتی لیکن انہیں مسیحِ موعود اور مہدی موعود کے خطاب سے مشرف کرتی ہے، مسیحِ موعود کا خطاب نبوت ہی کی ایک تعبیر ہے، اس لئے مرزا غلام احمد جیسے لوگوں کو مسیحِ موعود کہنا یقیناً کفر ہے۔

ثالثاً:۔ جیسا کہ فاضل عدالت نے لکھا ہے، مرزا غلام احمد کا جھوٹا دعوائے نبوت کرنا خود کو انبیاءِ کرام کی صف میں لا کھڑا کرنا، قرآنی آیات کو مسخ کرنا، انبیاءِ کرام کی توہین کرنا عیسیٰ علیہ السلام کی دادیوں اور نانیوں کے بارے میں ناشائستہ الفاظ استعمال کرنا، اظہر من الشمس ہے اور کسی تاویل کا متحمل نہیں، لاہوری پارٹی ان دعاوی باطلہ کے باوجود مرزا صاحب کو نہ صرف یہ کہ کافر و مرتد نہیں سمجھتی بلکہ مہدی اور مجدد تسلیم کرتی ہے اور یہ خود کفر ہے، اگر اسلام میں ایسے مہدی اور مجددوں کا وجود تسلیم کر لیا جائے تو یہ دین ایک کھلونا بن کر رہ جاتا ہے، اسی بنا پر ہمارے شیخ

امام العصر حضرت العلامہ مولانا محمد انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں:۔

وَمَنْ ذَبَّ عَنْهُ اَوْ تَأَوَّلَ قَوْلَهُ
يُكَفَّرُ قَطْعًا لَيْسَ فِيْهِ تَوَانٍ

(ترجمہ) اور جو شخص (کھلے کفر کے باوجود) مرزا صاحب کی جانب سے مدافعت کرے گا یا اس کے اقوال کی تاویل کرے گا بغیر کسی جھجک کے اسے بھی قطعی کافر قرار دیا جائے گا۔

فَشَانِئُ شَانِ الْاَنْبِيَاءِ مُكَفَّرٌ
وَمَنْ شَكَّ قُلْ هٰذَا الْاَوَّلِ ثَانٍ

(ترجمہ) انبیاء علیہم السلام کی شان میں تنقیص کرنے والے کی تکفیر کی جائے گی اور جو اس میں شک کرے وہ بھی اسی کے پیچھے ہے (اور کافر و مرتد ہے)

رابعاً:۔ ان تمام امور سے قطع نظر لاہوری پارٹی کے سربراہ مسٹر محمد علی ایم اے نے اپنی تصانیف میں جن نظریات کا اظہار کیا ہے اور قرآنِ کریم کی آیات کی جس انداز سے کھلی تحریف کی ہے اور نصوصِ شرعیہ کو جس طرح مسخ کیا ہے وہ ان کے الحاد و زندقہ کی کافی دلیل ہے، لاہوری پارٹی اپنے سربراہ کے نظریات سے متفق ہے، اس لئے بھی اس کا حکم مسلمانوں کا نہیں ہو سکتا۔

نکتہ چہارم: قادیانیوں کو ایک علیحدہ اُمّت قرار دینے کا مطالبہ

فاضل جج مرزا غلام احمد کی ان تصریحات کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"اس سے ظاہر ہے کہ احمدی (مرزائی) مسلمانوں سے ایک الگ مذہب کے پیرو ہیں اور علامہ اقبال نے اس وقت کی حکومتِ ہند کو بالکل درست مشورہ دیا تھا کہ اس طبقے (احمدیوں)، کو مسلمانوں سے یکسر مختلف تصور کیا جائے اور اگر انہیں علیحدہ حیثیت دے دی گئی تو مسلمان ان کے ساتھ اسی رواداری سے پیش آئیں گے جس کا مظاہرہ وہ دوسرے مذاہب کے پیرؤوں سے کرتے ہیں، لیکن ایک الگ طبقے کی حیثیت سے زندگی گذارنے کا حق احمدیوں کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ مسلمانوں کے پرسنل لاء میں مداخلت کریں اور انہیں مجبور کریں کہ وہ احمدیوں کو بھی صرف اس لئے اسلام کا ایک

فرقہ تسلیم کرلیں کہ انہوں نے اپنے اوپر" احمدی مسلم" کا لیبل لگا رکھا ہے۔"

فاضل جج کا یہ ریمارک اور علامہ اقبال کا اس وقت کی انگلش گورنمنٹ کو مشورہ دینا کہ وہ مرزائی امت کو مسلمانوں سے ایک الگ اور جداگانہ اقلیت قرار دے دراصل ان عقائد و نظریات اور طرز عمل کا فطری اور منطقی نتیجہ ہے جو مرزا غلام احمد اور ان کی امت نے اختیار کیا، جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے انہوں نے اسلام کے قطعی اور مسلّمہ عقیدہ ختمِ نبوت پر تاویل و تحریف کی ضرب لگا کر اپنے دعوائے نبوت کے لئے راستہ پیدا کیا، پھر قرآن مجید کی بے شمار آیات کی تحریف کر کے منصبِ نبوت پر سرفراز ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس نئی نبوت کے نتیجہ میں ان تمام مسلمانوں کو جو اس نئی نبوت پر ایمان نہیں لائے، کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا اور ان سے تمام مذہبی و معاشرتی تعلقات منقطع کرنے کا اعلان کیا اور پھر یہ خالی دھمکی ہی نہیں بلکہ اس وقت سے آج تک مرزائی امت عملی طور پر بھی مذہب و معاشرت میں مسلمانوں سے کٹی ہوئی ہے۔

اب جبکہ مرزائی امت کے بقول:۔

"ان کا (یعنی مسلمانوں کا) اسلام اور ہے اور ہمارا اور، ان کا خدا اور ہے اور ہمارا اور، ہمارا حج اور ہے اور ان کا حج اور، اسی طرح ان سے ہر بات میں اختلاف ہے۔"

(الفضل ۲۱ اگست ۱۹۱۷ء تقریر میاں محمود)

"یہ غلط ہے کہ دوسرے لوگوں سے ہمارا اختلاف صرف وفاتِ مسیح یا اور چند مسائل میں ہے، آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی ذات، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن، نماز، روزہ حج، زکوٰۃ، غرض آپ نے تفصیل سے بتایا ایک ایک چیز میں ان سے ہمیں اختلاف ہے۔" (الفضل ۳۰ جولائی ۱۹۳۱ء، تقریر میرزا محمود)

ان کا اور مسلمانوں کا جب ہر چیز میں اختلاف ہے، مذہب ان کا الگ، نبی ان کا الگ، نماز روزہ ان کا الگ، عقائد ان کے الگ، معاشرت ان کی الگ، تو آخر کیا وجہ ہے کہ سیاسی طور پر ان کی مردم شماری مسلمانوں سے الگ نہ کی جائے اور ان کو مسلمانوں سے ایک الگ اقلیت قرار نہ دیا جائے۔

علامہ اقبال نے برٹش گورنمنٹ کو یہ حقیقت پسندانہ مشورہ دیا تھا کہ وہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے ایک الگ اقلیت قرار دے مگر برٹش گورنمنٹ کا مفاد اسی میں تھا کہ قادیانیوں کو مسلمانوں میں گھل مل

کر انہیں دسیسہ کاریوں کا موقعہ دیا جائے کیونکہ بقول فاضل جج :۔

"مرزا غلام احمد نے محض اپنے آقاؤں کی خوشنودی کے لئے مسلمانوں میں انتشار وافتراق پھیلانے کا کھلا لائسنس حاصل کر لیا تھا۔"

اس لئے انگریز کسی قیمت پر بھی اپنے اس بنے بنائے کھیل کو بگاڑنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا تھا، مگر سوال یہ ہے کہ اب جب کہ انگریز کو رخصت ہوئے، ربع صدی کا عرصہ گذر چکا ہے، پاکستان کی مسلمان حکومت سے کیوں توقع نہ رکھی جائے کہ وہ مرزائی امت کو مسلمانوں سے ایک الگ ملت قرار دے، ہماری مسلمان حکومت کو مسلمانوں اور مرزائیوں میں کون سی چیز قدرِ مشترک نظر آتی ہے؟ اور ملک وملت کی وہ کون سی مصلحت ہے جس کی بنا پر مرزائیوں کے مسلمان ہونے پر اصرار کیا جائے؟ اور ملتِ اسلامیہ کا یہ معقول مطالبہ تسلیم نہ کیا جائے؟ خدا اور رسول کا وہ کون سا حکم ہے جو ہمیں مجبور کر رہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کے باغیوں کو ہم اپنی سر آنکھوں پر جگہ دیں؟ حقائق مفروضات کے تابع نہیں ہوتے، کوئی مانے نہ مانے مگر وہ اپنا وجود منوا کر چھوڑتے ہیں، مرزائی، مسلمانوں سے ایک الگ امت ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ آفتاب نصف النہار کا انکار کیا جا سکتا ہے مگر اس کا انکار ممکن نہیں۔ ملتِ اسلامیہ کے لئے یہ بات ناقابل برداشت ہے کہ حضرت ختمی مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل ایک اور نبی لا کر کھڑا کیا جائے اور پھر اس پر اصرار کیا جائے کہ ہم انہیں مسلمان بھی کہیں۔

نکتہ پنجم :۔ قادیانیوں کے غیر مسلم قرار پانے کے نتائج :۔

فاضل عدالت نے قادیانی مدعا علیہ کو غیر مسلم قرار دیتے ہوئے جو آخری نتیجہ قلمبند کیا ہے وہ یہ ہے :۔

"اندریں حالات میں قرار دیتا ہوں کہ اس مقدمے کے فریقین کے درمیان شادی اسلامی شادی نہیں، بلکہ یہ سترہ سال کی ایک مسلمان لڑکی کی ساٹھ سال کے ایک غیر مسلم کے ساتھ شادی ہے لہٰذا یہ شادی غیر قانونی اور غیر مؤثر ہے۔"

"مندرجہ بالا بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدعیہ جو ایک مسلمان عورت ہے کی شادی مدعا علیہ کے ساتھ جس نے شادی کے وقت خود اپنا قادیانی ہونا تسلیم کیا ہے اور

اس طرح جو غیر مسلم قرار پاتا ہے، غیر مؤثر ہے اور اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں "۔

عدالت کے زیرِ غور چونکہ صرف ایک شادی کا مقدمہ تھا اس لئے فاضل عدالت نے ایک قادیانی کو غیر مسلم (مُرتد) قرار دیتے ہوئے اس کے ساتھ مسلمان لڑکی کے نکاح کو غیر منعقد قرار دیا مگر اسی فیصلہ کی روشنی میں مسلمان یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ :۔

الف ؛ قادیانی چونکہ غیر مسلم (مُرتد) ہیں اس لئے انہیں ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

ب ؛ انہیں کلیدی آسامیوں پر فائز کر کے مسلمانوں کے سر پر مسلط نہ کیا جائے۔

ج ؛ انہیں ایک مسلمان کی حیثیت سے سیاسی حقوق سے متمتع ہونے کا موقعہ نہ دیا جائے۔

د ؛ انہیں تبلیغِ اسلام کے ڈھونگ سے غیر ممالک میں مرزائیت پھیلانے کے لئے زرِ مبادلہ نہ دیا جائے۔

ہ ؛ انہیں آئندہ مسلمانوں کو گمراہ اور مُرتد کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔

و ؛ انہیں اس بات کی اجازت نہ دی جائے کہ وہ مسلمانوں کے بھیس میں حج کو جائیں اور مکہ، مدینہ اور مقاماتِ مقدسہ کو اپنے قدموں سے ملوث کریں۔

آخر میں ایک بات ہم مسلمانوں سے بھی کہنا چاہتے ہیں، وہ یہ کہ مرزا غلام احمد اور ان کے متبعین کے عقائد و نظریات سے تمام مسلمان باخبر ہیں، ہمارے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ پنجاب کے بعض وکیل اور سیاست دان مرزائیوں کی پیروی اور حمایت کر رہے ہیں، تمام مسلمانوں کی دینی غیرت کا تقاضا ہے کہ وہ کسی ایسے سیاسی لیڈر اور بیرسٹر کو منہ نہ لگائیں جو مرزائیوں کی حمایت کے لئے کھڑا ہو اور نہ اس قسم کے شقی کو ووٹ دیں، رضا بالکفر کفر ہے جو دل سے اس کفر کی تائید کرے اور دنیوی منافع کے لئے اس کو مسلمان ثابت کرے، ایسا شخص خود اسلام کی نعمت سے محروم ہو جاتا ہے، ایسے حالات میں مسلمان حق بجانب ہوں گے کہ یہ اعلان کریں کہ اس قسم کے وکلاء کا مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين، وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه صفوة البرية سيدنا محمد وآله وأصحابه وأتباعه أجمعين۔

شعبان ۱۳۹۰ھ، اکتوبر ۱۹۷۰ء

تسخیر کائنات اور اسلام[1]

دینِ اسلام اور دینِ اسلام کی آسمانی کتاب قرآنِ کریم کا بنیادی مقصد انسانیت کی تکمیل ہے یعنی انسان کو درندوں اور حیوانات کی صف سے نکالا جائے اور اس کی ایسی تربیت کی جائے اور ایسے اعلیٰ مکارم اخلاق سے آراستہ کیا جائے کہ دنیا میں وہ باعزت اور پُرسکون زندگی سے سرفراز ہو سکے اور عظیم الشان محیر العقول کارخانۂ قدرت کے خالق و مالک کی خوشنودی حاصل کر سکے۔

وحیِ آسمانی اور تعلیماتِ نبویؐ کا مرکزی نقطہ

وحیِ آسمانی اور ہدایات و تعلیماتِ نبوی کا مرکزی نقطہ یہ ہوتا ہے کہ انسان حق تعالےٰ کی (جو اس کائنات کا خالق و مالک ہے) معرفت تک رسائی حاصل کر سکے اور اس تخلیقی نظام کے نتائج پر غور کرے اور اس کے فوائد و منافع اور آثار و ثمرات کو سمجھے اور ان سے فائدہ اٹھا کر شکر بجالائے اور آفاقی و انفسی آیاتِ بینات میں غور و خوض کر کے خالق و مالک کی عظمت و جلال کا گرویدہ ہو جائے اور انسان اپنی قیمت بھی سمجھ لے کہ اس کائناتی نظام کا مقصد انسان کی تکمیلِ حیات اور خدمت ہے اور اس منعمِ حقیقی کی ان حیرت انگیز نعمتوں کا بدل و جان شکر ادا کرے، نیز حقائق و معارف کی گہرائیوں تک پہنچ جائے کہ یہ تمام کارخانہ جو اس ملکوتی عجائب قدرت پر مشتمل ہے۔ "بے مقصد تخلیق" نہیں بلکہ کوئی اہم مقصد پیش نظر ہے اور ان دل کی گہرائیوں سے حقیقت کا اعتراف کرے کہ یہ جو انسان کی فانی حیات ہے اس کے لئے ربوبیت کا یہ حیرت افزا نظام وجود

---

[1] ۲۴ تا ۲۷ اگست ۶۹ء کو لاہور میں چار روزہ سیمینار محکمہ اوقاف کے زیر اہتمام ہوا مندرجہ بالا مقالہ اس میں پڑھا گیا۔

میں آیا ہے تا آنکہ وحیِ الٰہی کا وہ پیغامِ خداوندی جو حضرت ابوالبشر آدم علیہ السلام سے لے کر تمام انبیاء و رسل جس کی خبر دیتے ہیں کہ یہ دور عبوری دور ہے اور یہ حیات فانی حیات ہے اور اس کے بعد ایک جاودانی زندگی کا دور ضرور آنے والا ہے، اس پیغام کا بدل و جان اعتراف کرلے اور یہ کہ ان تمام مظاہرِ قدرت میں قدم قدم پر اس جاودانی زندگی کے روشن دلائل موجود ہیں تاکہ کسی طرح بھی عقلِ انسانی اس کا انکار نہ کرسکے اور حق تعالیٰ کی حجت پوری ہو جائے۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے انسان کو عقل و ادراک جیسی نعمت عطا فرمائی اور ملکوتی روح سے سرفراز فرمایا جس کے اسرار سربستہ کی عقدہ کشائی سے بیالوجیا (علم الحیاۃ) والے بھی حیران اور عاجز ہیں خصوصًا آج کے دور میں کہ عقل کی ایجادات و اختراعات نے کیسے کیسے حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیئے ہیں تاکہ عقلی پرواز کے ان فوق العادۃ کمالات کو دیکھ کر اس کے خالق کی عظمت کا اعتراف کیا جائے۔

بلاشبہ عقل کی جتنی پختگی ہوگی اور نسلِ انسانی اس سے فائدہ اٹھائے گی، جدید سے جدید اختراعات وجود میں آئیں گی، بجلی، ٹیلیویژن، ٹیلیفون، ریڈیو، ٹیلیگراف، لاسلکی نظام، ہوائی جہاز وغیرہ سینکڑوں عجائبات جو آج کل سامنے آرہے ہیں، تمام عقلی کمالات کے آثار و مظاہر ہیں۔

ع "ہر کہ بیشتر راہ رفت آں راہ دید"

ایک سے ایک بڑھ کر عجائبات سامنے آرہے ہیں عقلی ادراکات و ایجادات ہی نے آلاتِ تلسکوبیہ اور آلاتِ میکروسبیہ کی اختراعات کے بعد اسرار و تخلیق کے کتنے رازہائے سربستہ کی عقدہ کشائی کی ہے سبحان اللہ العظیم۔

خلاصہ یوں سمجھ لیجئے کہ حق تعالیٰ نے اس دنیا میں جہاں عقلاء و حکماء فلاسفہ و سائنسدان پیدا کئے ساتھ ہی ساتھ انبیاء و رسل کا سلسلہ بھی جاری فرمادیا تاکہ عقل کی طغیانی حد سے نہ بڑھ جائے، حضرت ادریس علیہ السلام کے عہد ہی سے حکماء و عقلا کا سلسلہ جاری ہوگیا، حضرت ادریس علیہ السلام کا عہد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی پہلے ہے اس لحاظ سے وہ تاریخی دور سے بہت پہلے کی شخصیت ہیں تو گویا حکماء کا دور بھی اسی وقت سے شروع ہے اور کچھ بعید نہیں کہ انبیاءِ کرام علیہم السلام کی رہنمائی میں ابتداءً یہ حکماء کام کرتے ہوں گے لیکن انبیاء کی رہنمائی

سے استغنا کیا ہوگا، تو ٹھوکریں کھانا شروع کی ہوں گی فیثا غورث و بطلیموس، پھر وادیٔ بابل و نینوی میں حکماء صائبین پھر ہندوستان میں ارجہد سے لے کر روما و یونان کے سقراط و بقراط، افلاطون و ارسطو، ابرخس و ارسطرا طیس وغیرہ وغیرہ سینکڑوں حکماء عالم کے گوشے گوشے میں پیدا کئے تا کہ ملکوت کے مشاہدات سے کائنات کے اسرار کا انکشاف ہوتا رہے لیکن حیات بعد الممات کے حقائق کے ادراک سے یہ حکماء و عقلاء عاجز رہے اگرچہ یونان کے حکماء نے الٰہیات کی طرف بڑی توجہ دی لیکن ظاہر ہے کہ یہ حقائق عقل کے دائرۂ ادراک و امکان سے باہر تھیں اس لئے ٹھوکریں کھائیں اور ناکام رہے۔

اس کے برعکس انبیاء علیہم السلام کا منصب ان ہی حقائق کو بیان کرنا ہوتا ہے جس کے ادراک سے حکماء و عقلاء عاجز رہے ہوں، عقل کا دائرہ تحقیقات، مشاہدات و تجربات تک محدود ہوتا ہے، حق تعالیٰ نے عقل کی تخلیق ضرور فرمائی اور اس میں یہ حیرت انگیز صلاحیت بھی رکھی کہ وہ اسرارِ عالم مادی کی عقدہ کشائی کر سکے لیکن وحیِ الٰہی کا منصب اور نبوت کا مقام یعنی الٰہیات اور ما بعد الطبیعات نیز عقل و ادراک سے بالاتر حقائقِ الٰہیہ کا دائرہ حکماء کی دسترس سے بالا تجویز فرما دیا۔

دینِ اسلام کیا ہے؟ بہرحال "دینِ اسلام" یا شریعتِ اسلامیہ نام ہے اس عالمگیر نظامِ انسانیت کا جس میں تکمیلِ انسانیت کے کسی گوشے کو نظر انداز نہیں کیا گیا، خالقِ کائنات سے رشتہ ہو یا مخلوق سے اور وہ بھی شخصی زندگی سے متعلق ہو یا اجتماعی زندگی سے، غرض عبادات ہوں یا معاملات معیشت و معاشرت ہو یا احوال و اخلاق و اعمال ان سب کے لئے ایک علمی دستور اور مقصد و نصب العین ہے دینِ اسلام کا علمی دستور قرآنِ کریم اور مقصود رضائے الٰہی ہے اور دنیا کے عبوری دور میں رضائے الٰہی اور تکمیلِ انسانیت کی جلیل القدر خدمات انجام دے کر ابدالآباد کی نعمتوں اور لازوال حیاتِ طیبہ کا مستحق ہو جائے۔

قرآن کریم کیا ہے؟ قرآنِ حکیم انسانیت کی تکمیل چاہتا ہے اور اس کے لئے اس نے اسلام کے بنیادی اصول و احکام اور اساسی اغراض و مقاصد انتہائی محیر العقول اور معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ واضح کر دیئے ہیں ان مقاصد و سلسلۂ بیان میں وہ مظاہرِ قدرت اور آثارِ قدرت

کو بھی اگر بیان کرتا ہے تو اس کا مقصود بھی یہی ہے کہ انسان کے فکری اور اعتقادی پہلوؤں کی تکمیل کی جائے، اگر وہ تاریخی حقائق بیان کرتا ہے تو اس کی غرض بھی یہی ہے کہ ان عبرت انگیز وقائعِ تکوینی اور آیاتِ الٰہیہ سے انسانی بصیرت و اعتبار کی تربیت و تکمیل کی جائے اگر احکامِ الٰہیہ کا ذکر ہوگا تو اس سے مراد بھی یہی ہوگی کہ اشرف المخلوقات بنانے کی تدبیر ہو جائے ذات و صفات کی توحید و کمال کا بیان ہو یا اصول و احکام کی تمہید و انضباط، ان سب ہی سے انسان کو انسانیت کی معراج تک پہنچا دینا مقصود ہے۔

قرآنِ کریم نہ تاریخی کتاب ہے کہ محض واقعات کی تفصیل ہی بیان کرتا رہے اور نہ ہی طبیعی نوامیس کی تفصیل و بیان پر مشتمل کتابِ طبیعات ہے کہ محض علمی اور ذہنی عیاشی کے افسانوں میں وقت ضائع کرے، وہ تاریخ کی روح پیش کرتا ہے اور طبیعات کے فکر و عمل کے نتائج بیان کرتا ہے جس سے توحیدِ الٰہی، خلق و ربوبیت کے حقائق انسان کے دل و دماغ میں پیوست ہوں اور روح کو پاکیزگی حاصل ہو تاکہ وہ نظامِ عالم میں خلیفۃ اللہ کے منصبِ اعلیٰ کے تقاضوں کو پورا کرنے کا اہل بن جائے، قرآن اگر کائنات میں غور کرنے کی دعوت دیتا ہے تو اس کی غرض و غایت یہی ہوتی ہے کہ انسانی ذہن و فکر کے سامنے اللہ تعالےٰ کی معرفت کا راستہ کھل جائے اور اس غور و فکر کے بصیرت آموز نتائج سے ایمان بالغیب کی تائید اور پرورش ہو اس لئے کہ ان حقائقِ کونیہ اور حقائقِ الٰہیہ میں غور و خوض سے ایمان قوی ہوگا، وہ ان کی طرف محض علم و فن کی حیثیت سے کبھی دعوت نہیں دیتا کہ محض فن ہی کو مقصد بنا لیا جائے یا دنیا میں محض برتری یا عالمِ انسانیت پر پنجۂ استبداد مضبوط کرے۔

قرآنِ کریم کے بعض جدید مفسرین کو اس سلسلہ میں بڑی غلط فہمی ہوئی ہے انہوں نے ان موضوعات میں محض قرآنی مباحث کی تفسیر اور ان مباحث کی غرض و غایت بیان کرنے میں بڑے غلو سے کام لیا ہے اور یہ حقیقت ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے کہ قرآن اگر طبیعات میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے تو اس کا مقصد بھی معرفتِ الٰہی تک پہنچنا ہے اور کسی جگہ ان طبیعی مسائل کو خدمتِ خلق کا ذریعہ بنایا جائے، نہ یہ کہ صرف مال و دولت اور ثروت کا ذریعہ بنایا جائے، ظاہر ہے کہ ذات و صفاتِ الٰہی کے بحرِ بیکراں میں شناوری کا صرف یہی ایک راستہ ہے کہ انسان

ان حقائق میں غور کرے تاکہ اس وادی میں ان کے فکر ونظر کی صلاحیتیں زیادہ وسیع ہوں اور ان کے سامنے معرفتِ الٰہیہ کے نئے نئے باب کھلیں اور جب اس طرح قلب وروح کی تربیت ہو جائے اور انسانیت کا صحیح شعور بیدار ہو جائے تو عملی دائرہ کا صحیح مقصد بھی خود بخود متعین ہو جاتا ہے۔

اس تمام بحث وتفصیل کا حاصل یہ ہے کہ الغرض کائنات اور کونیات حق تعالیٰ کے کمالاتِ قدرت اور صفاتِ جلال وجمال کا ایک صحیفہ ہے جس کے مطالعہ سے اور اس میں غور وفکر کرنے سے ایمان میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور اس حیثیت سے طبیعات کے جدید علوم ان اصحاب کے لئے بلاشبہ بصیرت افزاء اور بے حد بصیرت افروز ہیں جن کو وحی والہام اور مکاشفہ کی راہ سے وصول الی اللہ حاصل نہ ہو، معرفتِ الٰہیہ ان علوم پر منحصر نہیں ہے بلکہ ظاہر بین اصحاب کے لئے حصولِ معرفت کا یہی ایک راستہ باقی رہ گیا ہے۔

عملی معارف کے بعد عملی نتائج ہیں اور اس علم وعمل سے حقیقی فوائد حاصل کرنے کے لئے صحتِ مقصد اور تصحیح مقصد کی ضرورت ہے اور تصحیحِ مقصد کے لئے ایمان باللہ، ایمان بالرسل اور ایمان بالآخرت کے سوائے کوئی دوسری راہ نہیں ہے، ایمان ویقین سے محرومی اور بے مقصد علم وعمل ہی کی وجہ ہے کہ روس، امریکہ اور یورپ کی قومیں ان سائنسی ترقیات اور محیرالعقول ایجادات واختراعات کے باوجود انسانیت کی صفوں سے نکل کر پوری درندگی کی حدوں تک پہنچ چکی ہیں، نبوت ختم ہو چکی ہے، اس لئے معجزاتِ نبوت اور انبیاء کے خوارق کی جگہ اللہ تعالیٰ ان علمی راہوں سے ان پر اپنی حجت پوری کر رہا ہے اور خود ان ہی کے ایجاد کردہ علوم سے ان حقائق کو اس نے واشگاف کر دیا ہے کہ بے شعور طبیعت اور اس کے ان حیرت انگیز مظاہر اور حیرت افزا خواص ومنافع ہیں کرشمۂ الٰہیہ کے اعتراف کے سوائے اور کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔

ایک طرف سائنس کی موجودہ ترقیات اور حیرت انگیز ایجادات واختراعات کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی عقل میں کیا کیا صلاحیتیں دے رکھی ہیں اور جب ان صلاحیتوں سے کام لیا گیا ہے تو عقل نے کہاں تک رسائی حاصل کر لی ہے ان چیزوں کو دیکھ کر سائنس دانوں کے کمالات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے لیکن یہ صورت کمال کا صرف ایک ہی رُخ ہے، اس تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے کہ ان آیاتِ قدرت اور عجائباتِ خلق وتکوین کو دیکھنے کے بعد بھی وہ اب تک اللہ

تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے اور ایمان باللہ کی دولت سے محروم ہیں، تو حیرت ہوتی ہے کہ یہی عقلاء فکر و نظر کے اس رُخ پر اس قدر جاہل کیسے رہ گئے لیکن حق تعالےٰ ان کے اس کفر و انکار کی حقیقت سے بھی پردہ اٹھاتا ہے، ارشاد ہے:۔

«یعلمون ظاھراً من الحیٰوۃ الدنیا وھم عن الآخرۃ ھم غافلون»	وہ حیات دنیا کے ظاہر ہی میں سے کچھ جانتے ہیں اور یہی لوگ آخرت سے تو بالکل ہی غافل ہیں۔

دنیا کا بھی ظاہر اور وہ بھی ہم بہت محدود مقدار میں جانتے ہیں ان کا ذہن اور ان کی فکر و نظر اس طرف بالکل نہیں جاتی کہ اس حیرت انگیز کائنات اور پُراسرار حقائق مخلوقات کے خالق پر ایمان لائیں ایک طرف یہ ذہانت اور حیرت انگیز ذہانت اور دوسری طرف اس قدر غباوت اور غیر معمولی غباوت بجائے خود کس قدر عجیب اور حیرت ناک ہے اور حق تعالےٰ کے اس ارشاد کی صداقت کتنی کتنی سچی گواہی ہے:۔

«ومن لم یجعل اللہ لہ نوراً فمالہٗ من نور»	اللہ تو جس کو روشنی نہ دے تو اس کے لئے کہیں روشنی نہیں ہے۔

اس بحرِ محیط کے چند قطرے ہی مناسب ہیں، اس مختصر سی تمہید کے بعد ہم وحیِ ربانی قرآنِ کریم کی زبانی پیش کرتے ہیں، ارشاد ہے:۔

(۱) «إن فی خلق السمٰوات والأرض واختلاف اللیل والنھار لآیات لأولی الألباب ہ الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبھم ویتفکرون فی خلق السمٰوات والأرض ربنا ما خلقت ھذا باطلاً سبحانك فقنا عذاب النار» (آل عمران ۱۹۰-۱۹۱)	بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں دلائل ہیں اہلِ عقل کے لئے جن کی حالت یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالےٰ کی یاد کرتے ہیں کھڑے بھی اور بیٹھے بھی اور لیٹے بھی اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے اس کو لایعنی پیدا نہیں کیا، ہم آپکو پاک سمجھتے ہیں، سو ہم کو عذابِ دوزخ سے بچالے۔
(۲) «وآیۃ لھم اللیل نسلخ منہ النھار	اور ایک اور نشانی ان لوگوں کے لئے رات ہے کہ ہم

فإذا هُم مظلمون ہ والشمس
تجری لمستقر لها ذلك تقدیر
العزیز العلیم ، لا الشمس
ینبغی لها أن تدرك القمر
ولا اللیل سابق النهار ہ
وكل فی فلك یسبحون))
(سورۂ یٰسین ، ۳۷-۴۰)

اس پر سے دن کو اتار لیتے ہیں سو یکایک
وہ لوگ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں اور آفتاب
اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے، یہ اندازہ
باندھا ہوا ہے اس کا جو زبردست علم والا ہے
نہ آفتاب کی مجال ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور
نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے اور دونوں
ایک ایک دائرہ میں تیر رہے ہیں۔

(۳) ((اللہ الذی خلق السموات
والأرض وأنزل من السماء ماءً
فأخرج به من الثمرات رزقاً لکم
وسخر لکم الفلك لتجری فی
البحر بأمره وسخر لکم الأنهار
وسخر لکم الشمس والقمر دائبین
وسخر لکم اللیل والنهار))
(ابراہیم ۳۲-۳۳)

اللہ ایسا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا
کیا اور آسمان میں سے پانی برسایا، پھر اس پانی
سے پھلوں کی قسم سے تمہارے لئے رزق پیدا کیا اور
تمہارے نفع کے لئے کشتی کو مسخر بنایا تاکہ وہ خدا کے حکم
سے دریا میں چلے اور تمہارے نفع کے واسطے نہروں کو
مسخر بنایا اور تمہارے نفع کے واسطے چاند اور سورج
کو مسخر بنایا جو ہمیشہ چلنے ہی میں رہتے ہیں اور تمہارے
نفع کے واسطے رات اور دن کو مسخر بنایا۔

(۴) ((اللہ الذی رفع السموات بغیر عمدٍ
ترونها ثمّ استوی علی العرش
وسخر الشمس والقمر کل یجری
لأجل مسمّی یدبّر الأمر یفصّل
الأیات لعلکم بلقاء ربکم
توقنون)) (رعد)

اللہ ایسا ہے کہ اس نے آسمانوں کو بدون ستون کے
اونچا کھڑا کر دیا چنانچہ تم ان کو دیکھ رہے ہو، پھر عرش
پر قائم ہوا اور آفتاب اور مہتاب کو کام میں لگا دیا،
ہر ایک ایک وقتِ معین پر چلتا رہتا ہے وہی ہر کام
کی تدبیر کرتا ہے دلائل کو صاف صاف بیان کرتا ہے
تاکہ تم اپنے رب کے پاس جانے کا یقین کر لو۔

(۵) ((وسخر لکم اللیل والنهار والشمس والقمر
والنجوم مسخرات بأمره إنّ فی ذلك

اور اس نے تمہارے لئے رات اور دن اور
سورج اور چاند کو مسخر بنایا اور ستارے اس کے حکم سے مسخر

لآیات لقوم یعقلون (النحل ۱۲) | ہیں بیشک اس میں عقلمند لوگوں کے لئے چند دلیلیں ہیں۔

(۶) «ولئن سألتهم من خلق السموٰت والأرض وسخر الشمس والقمر ليقولن الله فأنى تؤفكون» (العنکبوت ۶۱)

اور اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور جس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے تو وہ لوگ یہی کہیں گے کہ وہ اللہ ہے پھر کدھر اُلٹے چلے جا رہے ہیں۔

(۷) «ألم تروا أن الله سخر لكم ما في السموات وما في الأرض وأسبغ عليكم نعمه ظاهرةً وباطنة» (لقمان ۲۰)

کیا تم لوگوں کو یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے اور جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں اور اس نے تم پر اپنی نعمتیں ظاہری اور باطنی پوری کر رکھی ہیں۔

(۸) «ألم تر أن الله يولج الليل في النهار ويولج النهار في الليل وسخر الشمس والقمر كلٌ يجري إلى أجل مسمًّى وأن الله بما تعملون خبيرٌ» (لقمان ۲۹)

اے مخاطب! کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کر دیتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے کہ ہر ایک وقت مقررہ تک چلتا رہے گا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب عملوں کی پوری خبر رکھتا ہے۔

(۹) «يولج الليل في النهار ويولج النهار في الليل وسخر الشمس والقمر كل يجري لأجل مسمى ذالكم الله ربكم له الملك» (فاطر ۱۳۰)

وہ رات کو دن میں داخل کر دیتا ہے اور دن کو رات میں داخل کر دیتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے ہر ایک مقررہ وقت تک چلتے رہیں گے یہی اللہ تعالیٰ تمہارا پروردگار ہے اسی کی سلطنت ہے۔

(۱۰) «إن ربكم الله الذي خلق السموات والأرض في ستة أيام ثم استوى على العرش يغشي الليل النهار يطلبه حثيثًا والشمس والقمر والنجوم مسخرات بأمره ألا له الخلق

بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا پھر عرش پر قائم ہوا، چھپا دیتا ہے شب سے دن کو ایسے طور پر کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے آلیتی ہے اور سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب اس کے حکم کے تابع

وَالأمر تبارك الله
رب العٰلمين))
(الأعراف ۵۴)

ہیں یاد رکھو! اللہ ہی کے لئے خالق ہونا اور حاکم ہونا بڑی خوبیوں کے بھرے ہوئے ہیں اللہ تعالےٰ جو تمام عالم کے لئے پروردگار ہیں۔

(۱۱) ((ومن اٰياته اليل والنهار والشمس
والقمر لا تسجدوا للشمس ولا
للقمر واسجدوا لله الذي
خلقهن إن كنتم إياه تعبدون))
(حم سجدہ - ۳۷)

اور منجملہ اس کی نشانیوں کے رات ہے اور دن ہے اور سورج ہے اور چاند ہے تم لوگ نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو کرو اور اس خدا کو سجدہ کرو جس نے ان نشانیوں کو پیدا کیا، اگر تم کو خدا کی عبادت کرنا ہے۔

(۱۲) ((سنريهم اٰياتنا في الاٰفاق
وفي أنفسهم حتى يتبين لهم
أنه الحق أولم يكف بربك أنه
على كل شئ شهيد)) (حم سجدہ - ۵۳)

ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں ان کے گرد ونواح میں بھی دکھائیں گے اور ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ وہ قرآن حق ہے کیا آپ کے رب کی یہ بات کافی نہیں کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے۔

(۱۳) ((يسئلونك عن الأهلة قل هي
مواقيت للناس والحج))
(بقرہ، ۱۸۹)

آپ سے چاندوں کی حالت کی تحقیقات کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ وہ چاند ایک آلہ شناخت اوقات ہے لوگوں کے لئے اور حج کے لئے۔

(۱۴) ((هو الذي جعل الشمس ضياءً
والقمر نوراً وقدره منازل
لتعلموا عدد السنين والحساب ما
خلق الله ذلك إلا بالحق يفصل الاٰيات
لقوم يعلمون ۞ إن في اختلاف اليل
والنهار وما خلق الله في السمٰوٰت
والأرض لاٰيات لقوم يتقون، إن الذين
لا يرجون لقاءنا ورضوا بالحيوٰة الدنيا

وہ اللہ ایسا ہے جس نے آفتاب کو چمکتا ہوا بنایا اور چاند کو نورانی بنایا، اس کے لئے منزلیں مقرر کیں تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو، اللہ تعالےٰ نے یہ چیزیں بے فائدہ پیدا نہیں کیں وہ یہ دلائل ان لوگوں کو صاف صاف بتلا رہے ہیں جو دانش رکھتے ہیں بلاشبہ رات اور دن کے لئے یکے بعد دیگرے آنے میں اور اللہ نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے ان سب میں ان لوگوں کے واسطے دلائل ہیں جو ڈر مانتے ہیں جن

واطمأنوا بها والذين هم عن اٰیاتنا غفلون۔ اُولٰئك مأوٰهم النار بما كانوا یكسبون » (یونس ۵ ۔ ۸)	لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے اور دنیوی زندگی پر راضی ہو گئے اور اس میں جی لگا بیٹھے ہیں اور جو لوگ ہماری آیتوں سے بالکل غافل ہیں ایسے لوگوں کا ٹھکانا ان کے اعمال کی وجہ سے دوزخ ہے ۔

پہلے اس سے کہ ہم لفظ کلمۂ تسخیر کے معنی بیان کریں، قرانِ کریم کی ان آیاتِ ربانی سے سرسری طور پر جن حقائق کی طرف رہنمائی ہوتی ہے ان کو اجمالاً پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں :۔

۱. یہ تمام کارخانہ قدرت جس میں آسمان زمین، چاند، سورج، سمندر اور دریاؤں کا حیرت انگیز نظام جسے نظامِ شمسی کہا جاتا ہے قائم ہے، یہ پورا نظام عالمِ انسان کی خدمت و آسائش کے لئے ہے۔

۲۔ یہ تمام عالمِ ملکوت حق تعالٰے کی تخلیق کا نتیجہ ہے، اسی کے تصرف میں ہے، اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے اور یہ سب کچھ اس کی عظمت و جلال کی نشانیاں ہیں ۔

۳. ان ملکوتی عجائبات میں غور کرنے والے یقیناً خالقِ کائنات کی عظمت کے قائل ہوں گے اور اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ کارخانہ کسی عظیم ترین مقصد کا پیش خیمہ ہے اور اس کا نتیجہ فوق العادت نکلنے والا ہے نہ از خود وجود میں آیا ہے نہ ہی بے مقصد ہے، یہ تخلیق بھی اس کی ہے اس پر اقتدارِ تصرف بھی اسی کا ہے ۔

۴. چاند، سورج اور رات دن کا یہ چکر اس دنیا کے نظام سے وابستہ ہے اور ایک وقت آئے گا کہ یہ پورا نظام ختم ہو گا جب تک وہ وقت نہیں آئے گا اسی طرح ہمیشہ ہمیشہ چلتا رہے گا۔

۵ . چاند، سورج کے جہاں اور منافع ہیں مہینوں اور برسوں کا حساب اور اوقاتِ کار کا تعلق بھی ان سے وابستہ ہے تاکہ دنیا کے کاروبار کے اوقات اور عبادات کے اوقات خصوصاً حج کا موسم معلوم ہوتا رہے۔

۶ ۔ چاند کی منزلیں مقرر کی گئی ہیں تاکہ ان سے پورے مہینہ کے دنوں کا حساب معلوم ہو سکے اور سورج سے برسوں اور موسموں کا حساب معلوم ہوتا رہے ۔

۷ ۔ ان آسمانی اور ذہنی حقائق پر غور کرو اور ان کی تحقیق کے رازوں سے زیادہ توجہ اس طرف کرو

کہ کتنے عظیم فوائد اور منافع ان سے وابستہ ہیں۔

۸۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے چاند کے گھٹنے بڑھنے کی علت اور سبب کو دریافت کیا، جواب میں سبب بتلانے کی بجائے مقصد سے آگاہ کیا گیا کہ یہی معلوم کرنا اہم اور کارآمد ہے، باقی سبب و علت یہ تو عقلی چیز ہے خود مشاہدات و تجربات سے سمجھ جائیں گے، اصلی مقصد اس نظام کے منشاءِ قدرت کو سمجھنا ہونا چاہیئے سو اس کو بتلا دیا۔

تسخیر کے معنی عربی لغات میں تسخیر کے معنی ہیں کسی چیز کو اپنے ارادہ کے تابع کر لینا یا کام میں لگا لینا اور اس طرح مجبور کرنا کہ وہ خلاف نہ کر سکے، چاند، سورج، رات دن، اور کائنات کے تمام سیاروں اور تاروں کی تسخیر کی حقیقت یہ ہے کہ ان سب کو حق تعالےٰ نے ایک ایسے نظام میں منسلک کر دیا ہے کیا مجال ہے کہ اس میں مقرر کردہ نظام سے سرِمو تجاوز کر سکیں حق تعالےٰ کے تکوینی اور تخلیقی نظام کے مطابق یہ سب اپنے اپنے مدارت پر معلق ہیں اور ایک نظام کے تحت چل رہے ہیں یعنی اپنا اپنا کام انجام دے رہے ہیں اور یہ تسخیر محض حق تعالےٰ کے ارادہ و اختیار اور تصرف و اقتدار کا کرشمہ ہے، انسانی دسترس سے بالاتر ہیں، یہ تسخیر شدہ کائناتی اشیاء کونیہ ہیں اور ان کو مسخر کرنے والی صرف حق تعالےٰ کی ذات جلَّ ذکرہ ہے اور جس کے لئے ان کو تسخیر کیا گیا وہ حضرتِ انسان ہیں۔

نظامِ کائنات میں انسان کی پرواز

ظاہر ہے کہ اس حقیقت کی رُو سے انسانی ارادہ و اختیار اور تصرف و اقتدار کو اس نظامِ کائنات میں ذرہ برابر بھی دخل نہیں نہ اس نظام کو روک سکتا ہے نہ بدل سکتا ہے، انسان کی پرواز زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اس کے فوائد منافع کا علم ہو جائے اور ان سے فائدہ اٹھائے، باقی فائدہ اٹھانے کی صلاحیت و اہلیت ہر زمانہ اور ہر دور میں عقل و فہم اور آلات و وسائل کی توانائی پر موقوف ہے، فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے، دیکھئے ایک بچہ بہت کم بوجھ اٹھا سکتا ہے، ایک نوجوان بہت زیادہ بوجھ اٹھا سکتا ہے جس طرح یہ مادی اور جسمانی کیفیت جو حالات کے اعتبار سے مختلف ہیں، ٹھیک اسی طرح عقل و ادراک کی قوتیں بھی حالات کے اعتبار سے مختلف ہیں، حق تعالےٰ کی کائنات سے سابقہ حکماء کی عقلیں محدود فائدے حاصل کرتی رہیں آج کے سائنس دانوں کی عقول

نے دقیق سائنسی آلات کے ذریعہ ایسے بے شمار فوائد و منافع حاصل کرلئے ہیں جن کا تصور بھی حکماءِ سابقین کو نہ تھا، لباس، پوشاک، زراعت، تجارت، صنعت و حرفت، نو بنو ایجادات و اختراعات وغیرہ یہ تمام اشیاء جس مرحلے پر آج پہنچ گئی ہیں، اس کے عشرِ عشیر کا ذکر بھی ماضی بعید میں تو کیا ماضی قریب میں بھی افسانے معلوم ہوتے تھے اس دریافت کا نام تسخیر رکھنا صحیح نہیں ہوسکتا، یہ تو عقلی ترقی ہے یا تمدن کی ترقیات ہیں، یہ تمام مادی اشیاء تو حق تعالےٰ نے انسان کے انتفاع کے لئے تسخیر و تخلیق فرمائی ہیں وہی ان کا خالق وہی ان کا تسخیر کنندہ ہے، رہے حضرتِ انسان تو ہر دور ہر زمانہ میں انسانی عقول اپنے اپنے محدود دائرے میں ان سے انتفاع کرتی اور فائدے اٹھاتی رہی ہیں۔

قدرتِ الٰہی اور انسانی قوت کے دائرے

انسان نے اپنی فکری اور تجرباتی کاوش سے یہ تو کرلیا کہ انسان کے جسم سے خون نکال کر اسے محفوظ کرلیا اور بوقتِ ضرورت دوسرے آدمی کے جسم میں چڑھادیا اور مان لیجئے اس کی جان بچ گئی، لیکن آج تک انسان سے یہ نہ ہوسکا اور نہ ہوسکے گا کہ کسی لیبارٹری میں پھلوں اور غذاؤں سے خون تیار کرسکیں، قدرتِ الٰہی کے کرشموں کا دائرہ اور ہے اور انسانی قدرتِ تصرفات کا دائرہ اور، یہ تو ہوا کہ انسان چاند پر پہنچ گیا اور ہوسکتا ہے کہ کل مریخ یا کسی اور کرّے کی زیارت بھی کرلے لیکن چاند سورج کے نظام سے رات اور دن کا جو نظام قائم ہے اس میں تصرّف یا کسی قدر تبدیلی کرسکے ناممکن ہے مثلاً جہاں رات ۱۲ گھنٹہ کی ہے اسے ۲۴ گھنٹہ کی کردیں اور رات کا وقت کچھ کم کردیں۔

تسخیرِ کائنات کا مطلب تسخیرِ کائنات کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے جو کائنات کا نظام مقرر فرمایا ہے اس میں انسان تصرف کرسکتا یا وہ نظام انسان کے اختیار و اقتدار میں آجائے اور حسبِ منشاء جب چاہیں چھوٹے بڑے کرسکیں، زیادہ سے زیادہ بات اتنی ہے کہ جو ماضی میں اس کائنات سے فائدہ نہ اٹھا سکے، آج عقلی ترقی کے مراحل اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ ان کے ذریعہ اتنے عظیم فوائد حاصل کئے جارہے ہیں جن کا تصوّر بھی کچھ عرصہ پہلے نہ کرسکتے تھے، ان قرآنی تعبیرات پر ذرا بھی کوئی غور کرے تو بات صاف اور واضح ہوجاتی ہے،

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ((وسخر لکم الشمس والقمر)) تمہارے لئے یا تمہارے فائدے کے لئے یا تمہارے کاموں کے لئے چاند اور سورج کی تسخیر فرمادی، یہ نہیں فرمایا "سخرتم الشمس والقمر)) کہ تم نے چاند اور سورج کو مسخر کر دیا، دراصل تسخیر کرنے والی حق تعالےٰ کی ذاتِ قدسی صفات ہے یہ موجودہ کائنات جس مقصد کے لئے تسخیر کی گئی ہے موجودہ انسانی معلومات کا قرآنی تعبیرات وکلمات کا واضح مفہوم بھی یہی ہے۔

عقلِ انسانی قدرتِ خداوندی کی حیرت انگیز تخلیق

بلاشبہ عقل کی یہ ترقی اور کائناتی فضا میں رسائی فوق العادۃ ترقی ہے کہ ایک مشینی ایجاد یعنی خلائی جہاز اور قمری گاڑی کو لاکھوں میل فضا پر پہنچا دینا اور پھر لاکھوں میل کے فاصلے سے زمین کے ساتھ اس کا ربط قائم رکھنا اور زمین پر سائنس دانوں کا اس پر کنٹرول کرنا ہر خرابی کی اصلاح کرنا اور ہر سیکنڈ پر اس کی کیفیت سے باخبر رہنا اور زمین پر اس کی مختلف کیفیات کی تصویروں کا پہنچتے رہنا وغیرہ وغیرہ، نہایت ہی حیرت افزاء انسانی ترقی ہے لیکن یہ سب کچھ کارفرمائی اس عقلِ انسانی کی ہے جو حق تعالےٰ کی مخلوق ہے اور قدرتِ الٰہی کی حیرت انگیز تخلیق ہے کہ انسانی عقل میں کتنی بڑی اور حیرت انگیز ترقی کی صلاحیت واہلیت ودیعت فرمائی ہے اسی سلسلہ میں ماہنامہ "بینات" کے ۱۹۶۵ء کے ایک شمارے میں راقم الحروف نے لکھا تھا۔

"خبر آئی ہے اور دنیا میں اس خبر کا چرچا ہے کہ روس کا راکٹ کرّہ قمر پر پہنچ گیا، ٹیلی ویژن سے تصویریں لے لی گئی ہیں اور اب یہ کوشش جاری ہے کہ آئندہ ان خودکار راکٹوں کے ذریعہ انسان کو چاند تک پہنچایا جائے، بلاشبہ یہ حیرت انگیز کارنامہ ہے اور سائنس کی قابلِ فخر ترقی ہے لیکن کرّہ ارض کے سب سے زیادہ قریب کرّہ تک جہاز بھیجنا رب العالمین کی اس حیرت افزاء اور وسعتِ کائنات کی نسبت سے کیا حیثیت رکھتا ہے؟ باقی سیّاروں کے کرّات تک انسان کب تک پہنچ جائے گا اور ان سے بھی دور ستاروں پر کب تک؟ جن کی روشنی بھی (فی سیکنڈ روشنی کی رفتار سے ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ ہے) ہزاروں سال بلکہ بعض ستاروں کی لاکھوں برس تک پہنچتی۔ سبحان اللہ العظیم۔ کیا ٹھکانا ہے!

ہیئتِ افلاک اور سیارات کے بارے میں سابقہ تحقیق

جدید طبیعات کی تحقیقات میں بطلیموس کے قدیم نظاماتِ فلکیات مشاہدہ سے غلط ثابت ہو چکے ہیں، ان نظاموں کی بنیاد اس نظریہ پر تھی کہ سبعِ سیارات سات آسمانوں میں جڑے ہوئے ہیں، اسی نظریہ پر ان کی تفصیلات مرتب کی گئی ہیں، قرآنِ کریم نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ اس عالم سے قریب تر آسمان کی زینت ان ستاروں سے کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ستارے آسمان کے نیچے ہیں، عوام یا خواص نے غلطی سے یہ سمجھ لیا تھا کہ شاید اسلام بھی وہی کچھ کہتا ہے جو ہیئتِ افلاک کے قدیم نظریات میں بیان کیا گیا ہے، جب یہ قدیم نظریات غلط ثابت ہوئے تو لوگوں کے اعتقاد ڈگمگانے لگے، جیسے طبیعات کی ان جدید تحقیقات نے اسلام کے پیش کردہ حقائق کو غلط ثابت کر دیا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان نظامات سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں تھا، الحمدللہ اسلام اپنی جگہ قائم ہے، قدیم نظریۂ ہیئت غلط ثابت ہو یا جدید، تحقیقاتِ کائنات کے متعلق اسلام نے قرآنِ حکیم میں جتنی جگہ بھی تفصیل کی ہے وہ اپنی جگہ اٹل ہے، سائنس کا یہ دعویٰ قابلِ قبول نہیں ہے کہ آسمان کا وجود نہیں ہے، اس دعویٰ پر اس کے سوائے کوئی دلیل نہیں کہ ان فلکی کرات کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان علوم کی پرواز ابھی اتنی بلند نہیں ہوئی کہ آسمانوں تک رسائی ہو جائے، ماہرینِ سائنس کی عقل و تحقیق اور ان کے علوم ابھی ان کرات ہی کے گرد گھوم رہے ہیں، ان جدید تحقیقات سے اگر کوئی حقیقت بے نقاب ہوئی ہے تو وہ صرف اس قدر کہ ہیئتِ افلاک اور سیارات کا پرانا نقشہ غلط تھا اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اس کا اسلام اور قرآنِ کریم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

قرآنِ کریم اور وحیِ الٰہی کا منصب ان حقائق کو بیان کرنا ہے جہاں عقل کی رسائی نہیں ہوتی، عقل کی سرحد جہاں ختم ہو جاتی ہے وہاں سے نبوت اور وحی کی حد شروع ہوتی ہے، قرآنِ کریم اگر ان حقائق کائنات کی طرف کبھی کبھی اشارہ کرتا ہے تو اس کا مقصد محض تذکیر و موعظت ہے یا صرف ان عقدوں کی گرہ کشائی ہے جہاں عقلِ انسانی کو ٹھوکر لگتی ہے۔

اسی لئے وہ سلسلۂ بیان میں ضرورت اور موقع کی نسبت سے ان اسرار و حقائق کے تذکرہ اور

ان کی طرف اشارہ میں بھی کسی تکوینی حقیقت کی پوری تفصیل پیش کرنے کے بجائے ان کے صرف ان ہی پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے جہاں سے تذکیر و موعظت اور انسان کی عبرت پذیری اور بصیرت اندوزی کا مقصد حاصل ہو، ذاتِ الٰہی کا عرفان اور اس کی صفات و کمال کی معرفت حاصل کرنے کے لئے عقل و فکر کی راہ ہموار ہو جائے۔

اسی لئے علمِ کائنات اور اس کے اسرار انکشافات ہی کو جو درحقیقت ایمان و معرفت کا وسیلہ ہیں حیاتِ انسانی کا مقصدِ وحید بنا لینا اور اصل مقصد کو نظر انداز کر کے وسیلہ ہی کو مقصدی حیثیت دے دینا نہ انسان کے لئے مفید ہے نہ صحت و عقل کے مطابق ہے اور نہ اسلام ہی اس کی اجازت دیتا ہے، انسان کی بقاء اور اس کی ضروریات کا نہ ان علوم و فنون پر انحصار ہے اس لئے کہ وہ ان کے بغیر بھی زندہ رہ رہا ہے اور معاشرتی آسودگی حاصل کرتا رہا ہے اور نہ قرینِ عقل و دانش ہی ہے کہ وہ اشرف و اکرم مخلوق جس کے لئے یہ کائنات مسخر کی گئی ہے جس میں قدرت کی بخشی ہوئی تسخیر و تصرفِ کائنات کی صلاحیتیں ظاہر ہو کر اس کے اشرفِ خلائق ہونے کی شہادت دیتی رہی ہیں، اپنے سے فروتر اور مسخر مخلوق کے احوال و خواص کے علم ہی کو اپنا مقصدِ زندگی بنا لے، اس لئے اسلام نے اس کو یہ نصب العین دیا ہے کہ وہ کائنات کی مخلوق کو اپنے فکر و نظر کا مرکز و محور بنانے کی بجائے خالقِ کائنات سے ربطِ قرب کو مطلوب و مقصود بنائے اور تکوینیات کے ان علوم کو بھی انسانی زندگی کے اسی اعلیٰ ترین نصب العین تک پہنچنے کا وسیلہ بنائے۔

شوال المکرم ۱۳۸۹ھ ، دسمبر ۱۹۶۹ء

انسان کا چاند پر پہنچنا

خبر آئی ہے اور دنیا میں اس خبر کا چرچا ہے کہ روس کا راکٹ کرۂ قمر پر پہنچ گیا ہے، ٹیلیویژن سے تصویریں لے لی گئی ہیں اور اب یہ کوشش جاری ہے کہ آئندہ ان خود کار راکٹوں کے ذریعہ انسان کو بھی چاند تک پہنچایا جائے، بلاشبہ یہ ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے اور سائنس کی قابلِ فخر ترقی ہے، لیکن کرۂ ارض کے سب سے زیادہ قریب کرہ تک خلائی جہاز بھیجنا رب العالمین کی اس حیرت افزاء وسعت کائنات کی نسبت سے کیا حیثیت رکھتا ہے؟ باقی سیاروں کے کرات تک انسان کب تک پہنچ پائے گا اور ان سے بھی دور ستاروں پر کب تک؟ جن کی روشنی بھی (فی سیکنڈ روشنی کی رفتار سے ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے) ہزاروں سال بلکہ بعض ستاروں کی لاکھوں برس میں پہنچتی ہے!

العظمة لله العظيم وله الكبرياء في السمٰوات والأرض ۔ عظمت خدائے عظیم ہی کے لئے ہے اور اسی کے لئے ہے ساری بڑائی آسمانوں اور زمین میں۔

جدید طبیعیات کی تحقیقات میں بطلیموس اور فیثاغورث کے قدیم نظاماتِ فلکیات مشاہدہ سے غلط ثابت ہو چکے ہیں ان نظاموں کی بنیاد اس نظریہ پر تھی کہ سبع سیارات سات آسمانوں میں جڑے ہوئے ہیں اسی نظریہ پر ان کی خاص خاص تفصیلات مرتب کی گئی تھیں، قرآنِ حکیم نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ اس عالم سے قریب تر آسمان کی زینت ان ستاروں سے کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام تارے آسمان کے نیچے ہیں، عوام یا خواص نے غلطی سے یہ سمجھ لیا تھا کہ شاید اسلام بھی وہی کچھ کہتا ہے جو ہیئتِ افلاک کے قدیم نظریات میں بیان کیا گیا ہے اور جب یہ قدیم نظریات غلط ثابت ہوئے تو لوگوں کے اعتقاد ڈگمگانے لگے جیسے طبیعیات کی ان جدید تحقیقات نے اسلام کے پیش کردہ حقائق کو غلط ثابت کر دیا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان نظامات سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

الحمدللہ! اسلام اپنی جگہ قائم ہے، قدیم نظریۂ ہیئت غلط ثابت ہو یا جدید تحقیقات، کائنات کے متعلق اسلام نے قرآنِ حکیم میں جتنی تفصیل بھی کی ہے وہ اپنی جگہ بالکل اٹل ہے، سائنس کا یہ دعویٰ قابلِ قبول نہیں کہ آسمان کا وجود نہیں ہے اس دعویٰ پر اس کے سوائے کوئی دلیل نہیں کہ ان فلکی کرات

کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہے، اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ ان علوم کی پرواز ابھی اتنی بلند نہیں ہوئی کہ آسمانوں تک رسائی ہو جائے، ماہرین سائنس کی عقل و تحقیق اور ان کے علوم ابھی ان کرات ہی کے گرد گھوم رہے ہیں۔

ان جدید تحقیقات سے اگر کوئی حقیقت بے نقاب ہوئی ہے تو وہ صرف اس قدر ہے کہ ہیئتِ افلاک اور سیارات کا پرانا نقشہ غلط تھا اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلام اور قرآن حکیم کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم اور وحیِ الٰہی کا منصب ان حقائق کو بیان کرنا ہے جہاں عقل کی رسائی نہیں ہوتی، عقل کی سرحد جہاں ختم ہو جاتی ہے وہاں سے نبوت اور وحی کی حد شروع ہوتی ہے، قرآنِ کریم اگر ان حقائقِ کائنات کی طرف کبھی کبھی اشارہ کرتا ہے تو اس کا مقصد محض تذکیر و موعظت ہے یا صرف ان عقدوں کی گرہ کشائی جہاں عقلِ انسانی کو ٹھوکر لگتی ہے اور اس کی بصیرت گرہ کھاتی ہے۔

اسی لئے وہ سلسلۂ بیان میں ضرورت اور موقع کی مناسبت سے ان اسرار و حقائق کے تذکرہ اور ان کی طرف اشارہ میں بھی کسی تکوینی حقیقت کی پوری تفصیل پیش کرنے کے بجائے اس کے صرف انہیں پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے جن سے تذکیر و موعظت اور انسان کی عبرت پذیری اور بصیرت اندوزی کا مقصد حاصل ہو، ذاتِ الٰہی کا عرفان اور اس کی صفاتِ کمال کی معرفت حاصل کرنے کے لئے عقل و فکر کی راہ ہموار ہو جائے۔

اس لئے علمِ کائنات اور اس کے اسرار کے انکشاف ہی کو۔ جو درحقیقت ایمان و معرفت کا وسیلہ ہیں۔ حیاتِ انسانی کا مقصدِ وحید بنا لینا اور اصل مقصد کو نظر انداز کر کے وسیلہ ہی کو مقصدی حیثیت دے دینا، نہ انسان کے لئے مفید ہے نہ صحتِ عقل کے مطابق ہے اور نہ اسلام ہی اس کی اجازت دیتا ہے، انسان کی بقا اور اس کی ضروریات کا نہ ان علوم و فنون پر انحصار ہے اس لئے کہ وہ ان کے بغیر بھی زندہ رہا ہے اور معاشرتی آسودگی حاصل کرتا رہا ہے اور نہ قرینِ عقل و دانش ہی ہے کہ وہ اشرف و اکرم مخلوق۔ جس کے لئے یہ کائنات مسخر کی گئی ہے جس میں قدرت کی بخشی ہوئی تسخیر و تصرف کائنات کی صلاحیتیں ظاہر ہو کر اس کے اشرفِ خلائق ہونے کی شہادت دیتی رہیں ہیں خدا اپنے سے فروتر اور مسخر مخلوق کے احوال و خواص کے علم ہی کو اپنا مقصد زندگی بنا لے اس لئے اسلام نے اس کو یہ

نصب العین دیا ہے کہ وہ کائنات مخلوق کو اپنے فکر و نظر کا مرکز و محور بنانے کے بجائے خالقِ کائنات سے ربط و قرب کو مطلوب و مقصود بنائے اور تکوینیات کے ان علوم کو بھی انسانی زندگی کے اسی اعلیٰ ترین نصب العین تک پہنچنے کا وسیلہ بنائے۔

کبھی فرصت ہوئی تو انشاء اللہ ان مجمل اشارات کی تفصیل سپردِ قلم کی جائے گی۔

وَاللہُ سُبحانَہٗ ھُوَالموفق والمعین۔

ذوالقعدہ ۱۳۸۵ھ مارچ ۱۹۶۶ء

تسخیر قمر و تسخیر کائنات

تمام عالم میں ایک شور برپا ہے کہ چاند کی تسخیر ہوگئی، تمام فضائی عالم کے لئے راستہ ہموار ہوگیا، انسان چاند پر پہنچ گیا، امریکہ نے حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا، اور کچھ سادہ لوح انسانوں کا مذہبی عقیدہ متزلزل ہونے لگا کہ یہ مخلوق آسمانوں پر کیسے پہنچ گئی، ہمیں ان حضرات کے تعجب پر تعجب اور حیرت پر حیرت ہے، اعلیٰ ترین دماغوں نے فیثاغورس اور بطلیموس، افلاطون اور ارسطو کے عہد سے ہی اللہ تعالےٰ کی اس کائنات اور فضا کے محیر العقول نظام کے حقائق و معلومات حاصل کرنے کے لئے لگاتار کوششیں کی ہیں اور موجودہ دور میں بڑی حد تک ان قدیم فلاسفہ کی خوشہ چینی کر کے ہی عملی تجارب آگے بڑھائے ہیں، اسلامی ادوار میں بھی رصد گاہیں بنیں اور بہت کچھ ان نظریات کی تحقیقات ہوئیں، غرض یہ کہ ہزاروں برس سے ان فضائی معلومات و تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا ہے۔

یہاں ہمیں سب سے پہلے تو عقل کی پرواز پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ حق تعالےٰ نے انسانی عقل و دماغ کو کتنی بڑی صلاحیت عطا فرمائی ہے کہ وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا، یہ تمام خالقِ عقل حق تعالےٰ کی عظیم قدرت کی نشانیاں ہیں، اس کے بعد کائنات کی وسعت، آسمانی کائناتی نظام کی وسعت پر غور کیا جائے، لاکھوں برس سے یہ حیرت ناک نظام جاری و ساری ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات ثناء و صفت کے لائق جس نے یہ عظیم الشان کارخانہ قائم کیا ہے، مزید غور کیجئے کہ فضاءِ فوقانی میں سینکڑوں نہیں، ہزاروں نہیں، لاکھوں نہیں، کروڑوں نہیں، اربوں کھربوں کرے ہیں جو آسمانی نظام میں معلق جگمگا رہے ہیں اور زمین والوں سے بعض اتنے دور ہیں کہ ان کی روشنی، روشنی کی رفتار سے جو فی سیکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل یا ۳۰۰ ہزار کیلو میٹر ہے، زمین پر لاکھوں نوری سالوں کے بعد پہنچتی ہے سبحان اللہ العظیم۔

پھر اس فضا کے اندر کتنے نظامِ شمسی ہیں بعض سورج تو ایسے ہیں کہ ان میں نور تو ہے لیکن بجائے حرارت کے برودت ہے اگر زمین والوں پر ان کی تاثیر پہنچ جائے تو تمام مخلوق جو کرۂ ارض پر آباد ہے منجمد ہو جائے اور اس کرۂ ارض کا نظامِ شمسی جس میں روشنی اور حرارت دونوں ہیں اگر ہواؤں اور بادلوں سے ان کی حرارت کم نہ ہو تو دنیا جل کر راکھ کا ڈھیر بن

جاتی، پھر یہ اربوں کرے، جن میں چاند، سورج، زہرہ، عطارد، مریخ، مشتری، زحل اور جوزا، سرطان، اسد وغیرہ شامل ہیں، سب کے سب اس فضا میں معلق ہیں ان میں سے بعض کا حجم زمین سے لاکھوں گنا بڑا ہے۔ ایک جوزا کا حجم ہی سورج سے لاکھوں گنا بڑا کہا جاتا ہے۔ یہ سب ان گنت کرّے پہلے آسمان کے نیچے نیچے فضا میں موجود ہیں، اس خدائے قادر لایزال عزیز و علیم کا یہ حیرت انگیز نظام ہے جس کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ابھی نسلِ انسانی کو کروڑوں سال کا عرصہ چاہیئے جس کا سائنسدان بھی اعتراف کرتے ہیں۔

چاند سورج اور آسمان قرآن و حدیث نے کہیں بھی یہ تصریح نہیں کی کہ یہ چاند سورج افلاک میں جڑے ہوئے ہیں یہ تو صرف بطلیموسی ہیئت کی پیداوار ہے کہ سبعِ سیارات آسمانوں میں ہیں لیکن جدید ہیئات نے اس بطلیموسی نظام کی غلط بینی ثابت کر دی ہے کہ یہ فضا میں معلق ہیں، فیثاغورس کا نظریہ بطلیموس کے خلاف تھا وہ ان سب کو فضا میں مانتے تھے اور یہ بھی کہیں نظر سے گذرا ہے کہ فیثاغورس زمین کی حرکت کے بھی قائل تھے اور یہ کچھ بعید بھی نہیں اس لئے کہ کہتے ہیں فیثاغورس حضرت ادریس علیہ السلام کے شاگرد تھے اور ان سے ہی مستفید تھے ہو سکتا ہے کہ وحیِ آسمانی کی برکت سے ان کا نظریہ صحیح ہو گیا ہو، علماءِ اسلام میں سے شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ زمین کی حرکت کے قائل تھے، قرآنِ حکیم کی تعبیر «ولقد زیّنا السماء الدنیا بمصابیح» کا صاف مطلب یہی ہے کہ یہ تمام نجوم اور سیارے چاند و سورج آسمانِ دنیا کے نیچے ہیں اور اس نیلگوں آسمان کے لئے آرائش و زینت کا کام کرتے ہیں۔

آسمان اور افلاک میں فرق یہاں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ آسمان اور ہیں اور افلاک اور شئی ہیں نیز یہ کہ آسمان کا اطلاق ہر فوقانی چیز پر کیا جاتا ہے، جدید سائنس میں آسمانوں کی نفی کی کوئی دلیل نہیں صرف اتنا ثابت ہے کہ یہ کرّے آسمان میں جڑے ہوئے نہیں ہیں، بہرحال ان مختصر اشاروں سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ اللہ تعالےٰ کی کائنات کی وسعت کس قدر حیرت انگیز ہے اور آسمانوں تک تو ابھی ان کی عقل و مشاہدہ اور رصد گاہوں کی پرواز پہنچی ہی نہیں۔ پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ اربوں کھربوں تاروں میں زمین سے قریب تر

چاند تھا جس کی دوری دو لاکھ اڑتیس ہزار میل بتائی جاتی ہے اس تک پہنچنے کے لئے ڈرتے ڈرتے کھربوں روپیہ خرچ کیا سالہا سال تک اعلیٰ ترین دماغوں نے عرق ریزی کی تب کہیں جاکر انسان چاند پر پہنچ کر کچھ ریت اور پتھر لے آیا، اگر یہ رقم تمام عالم کے محتاجوں میں تقسیم کی جاتی تو شاید دنیا میں کوئی فقیر نہ رہتا، شاید اللہ تعالیٰ کی تکوینی مصلحت اس میں یہ ہو کہ ان کی دولت اور ان کی دماغی توانائی ان عبث و بیکار باتوں میں صرف کر دی جائے اور دنیا کو ان کے ظلم و عدوان سے بچایا جائے، اگر یہ پوری دولت اور طاقت صرف دنیا اور زمینی مخلوق کی طرف متوجہ ہوتی تو نہ معلوم یہ کیا کیا ستم ڈھاتے، علاوہ ازیں کہ اللہ تعالیٰ کی حجت ان کفار پر پوری ہو رہی ہے کہ اب بھی حق تعالیٰ کی عظمت کمالِ قدرت، کمالِ جبروت، خلاقیت اور حیرت انگیز محیر العقول نظام پر ایمان لے آئیں کوئی معذرت قیامت کے دن ان کے پاس باقی نہ رہے، سَنُرِیھِمْ آیاتنا فی الآفاق و فی انفسھم حتّٰی یتبین لھم أنہ الحق أو لم یکف بربك أنہ علیٰ کل شیٔ شھید، ان آفاقی و انفسی دلائلِ قدرت اور تکوینی معجزات کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی اگر حق تعالیٰ کی وحدانیت اور قدرت پر ایمان نہ لائیں تو ان سے بڑھ کر بدنصیب قوم کون ہوگی؟ سچ فرمایا اللہ تعالیٰ نے یعلمون ظاھراً من الحیاۃ الدنیا وھم عن الآخرۃ ھم غافلون ۔

غور کرنے کی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے کرہ کا جو فضا میں معلّق ہے جس میں پہاڑ اور ریگستان اور غار ہی ہیں اور خود بالکل سیاہ ہے، سورج کے ساتھ کیسا ربط و تناسب قائم کیا ہے کہ اس کی روشنی سے تمام عالم میں قمر کی روشنی مد و جزر اور دوسرے منافع کا اور مہینوں کے حساب کا نظام قائم فرما دیا ہے اسی قمر سے سمندروں اور دریاؤں کے مد و جزر کا تعلق رات کے اندھیروں میں سمندروں کے اندر کشتی بانوں اور جہاز رانوں کو اسی سے جہات معلوم ہوتی ہیں، پھلوں اور اناج کے پکنے اور لذت میں چاند کی شعاعوں کی تاثیر ہی کار فرما ہے پھر قمری مہینہ کا پورا حساب، چاند نکلنے اور بڑھنے گھٹنے کے ساتھ اور سال کے بارہ مہینوں کا حساب اور موسموں، فصلوں کا نظام، سورج کے ساتھ کس حیرت انگیز طریق پر قائم ہے کہ جس سے ایک فلسفی، ایک دیہاتی، ایک حکیم اور ایک بدّو یکساں طور پر مستفید ہوتے

ہیں. صحابہ کرام نے حضور علیہ الصلاۃ والسلام سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ چاند کیوں بڑھتا گھٹتا ہے، آپ نے فرمایا: اس کی حکمت اور علت کو چھوڑو اس کے منافع پر غور کرو کہ اللہ تعالےٰ نے نظامِ اوقات اور حجِ بیت اللہ کے وقت معلوم کرنے کے لئے یہ سلسلہ جاری فرمایا ہے آیت کریمہ: ((یسئلونك عن الأهلة قل هي مواقيت للناس والحج)) کا مفہوم یہی ہے، صحابہ کرام کو آپ کی صحبت سے جو ایمانی قوت و بصیرت نصیب تھی، اس کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت نہ تھی کہ شمس و قمر کے فلسفیانہ اسباب و علل کو معلوم کر کے ایمان بڑھائیں اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے تخلیقی منشاء کو واضح فرمایا کہ ان کو کس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اور اسباب و اسرارِ تخلیق سے توجہ ہٹا کر مقصدِ تخلیق واضح فرمادیا تاکہ احکامِ شرعیہ کی تعمیل کریں اور حکمتوں کے درپے نہ ہوں.

سائنسی کارنامے انبیاء علیہم السلام کے معجزات سمجھنے کا ذریعہ ہیں

اسی طرح اس وقت بھی اگر کسی کو اللہ تعالےٰ نے عقلِ سلیم بخشی ہو تو اس کے لئے ان سائنسی کارناموں سے انبیاء علیہم السلام کے معجزات و کمالات سمجھنے کا راستہ کھل سکتا ہے، دنیا نے ہزاروں سال محنت کی، طرح طرح کے پاپڑ بیلے، اربوں کھربوں دولت ضائع کی، قیمتی جانوں کو خطرے میں ڈالا اور اس کے نتیجہ میں صرف قریب ترین کرّے چاند تک رسائی حاصل کی، اب حق تعالےٰ کا معاملہ اپنے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ دیکھئے اور ان کی بلندیٔ مراتب کا تصور کیجئے، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو ان اسباب و تدابیر، آلات و وسائل کے بغیر جب چاہا آسمانوں کی سیر کرادی، فضائے بسیط کا سارا فاصلہ چند لمحوں میں طے کرادیا اور آناً فاناً تمام آسمانوں سے اوپر پہنچا دیا، رفعتِ انسانی کی تمام حدیں پست رہ گئیں اور ملکوتِ الٰہیہ کے وہ عجائبات دکھلا دئے کہ نسلِ انسانی اسباب کے دائرے میں کروڑوں برس تک تحقیقات پر محنت کرے مگر ناممکن ہے کہ اس کا لاکھواں حصہ بھی حاصل کرسکے، سلیمان علیہ السلام کو یہ اعزاز بخشا گیا کہ ان کے لئے ہوا مسخّر کردی. چنانچہ ان کا "ہوائی تخت" محض ہوا کے دوش پر مہینوں کی مسافت صبح و شام کے چند لمحات میں طے کرلیتا تھا، حضرت

رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے براق کے ذریعہ برق رفتاری کا جو ریکارڈ قائم کیا گیا، کیا بجلی کی رفتار اور ایٹمی رفتار اس کی گرد کو بھی پہنچ سکتے ہیں ؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وادیٔ عرفات میں ایک لاکھ انسانوں کے جمِ غفیر سے خطاب فرما رہے ہیں، تمام سامعین تک آپ کی آواز بغیر مشین کے پہنچائی جا رہی ہے ۔ وادیٔ منیٰ میں خدا کے آخری پیغمبر کا خطبہ ہو رہا ہے تمام حجاجِ کرام جو تقریباً آٹھ مربع میل وادی میں پھیلے ہوئے اپنے اپنے خیموں میں قیام پذیر تھے، آپ کی آواز بلاکم و کاست سن رہے ہیں سنن ابی داؤد کی حدیث ہے کہ صحابہ فرماتے ہیں" ہم اتنی دور کی آواز اتنی آسانی سے سن رہے تھے کہ گویا آج ہماری قوت سماع بڑھا دی گئی ہے ۔" نہ مائیکروفون ہے نہ لاؤڈ اسپیکر، نہ ریڈیو اسٹیشن ہے نہ بجلی کے آلات، لیکن پوری وادی میں پھیلا ہوا مجمع آپ کی آوازِ مبارک کی لذت اندوزی سے سرشار ہے، آج ٹیلی ویژن کی ایجاد پر دنیا محوِ حیرت ہے اور اسے سائنسی معجزہ کہا جاتا ہے لیکن نبوت ٹیلی ویژن اور لاسلکی نظام کی رہینِ منت نہ تھی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان اسباب کے بغیر "عالمِ غیب" لا کھڑا کر دیا جاتا ہے اور مسجد نبوی کی دیوارِ قبلہ میں جنت و دوزخ کا مشاہدہ بحالت نماز کسوف کرا دیا جاتا ہے آج دنیا زمین پر بیٹھ کر دور بینوں سے چاند کی سطح کا مشاہدہ کرنے پر پھولی نہیں سماتی لیکن نبوت کی آنکھ دور بینوں کی منت کشی کے بغیر خندق کھودتے ہوئے بصرہ کے محلات کا مشاہدہ کر لیتی ہے آج آلات کے ذریعہ زمین والے چاند والوں کو ہدایت دیتے ہیں اور بڑا کرشمہ سمجھا جاتا ہے لیکن نبوت کی انگشتِ شہادت براہِ راست چاند کو ہدایات جاری کرتی ہے اور دیکھنے والے چاند کو تعمیلِ حکم کرتے ہوئے دیکھتے ہیں ۔

خیر یہ تو پیغمبرانہ معجزات ہیں، آپ کے فیضِ صحبت سے فیض یافتہ اصحابِ کرام ہی کی کرامت پر ایک نظر ڈالئے، فاروقِ اعظم مدینہ طیبہ میں جمعہ کا خطبہ دیتے ہوئے ملکِ شام میں ایک جنگ کا مشاہدہ کر رہے ہیں، فوجی قائد پیچھے پہاڑی کے حملے سے بے خوف ہے عین اسی وقت اسے ہدایت دیتے ہیں:" یا ساریۃ! الجبل الجبل" (اے ساریہؓ پہاڑ کی طرف کا خیال رکھو کہ اس طرف سے دشمن حملہ نہ کرے) حضرت ساریہؓ نہ صرف فاروق اعظم کی گونجتی ہوئی آواز کو پوری طرح سنتے ہیں بلکہ اس کے مطابق عمل کر کے میدانِ جنگ کا نقشہ پلٹ دیتے ہیں ۔ کیا ریڈیو اور ٹیلیویژن

کی اختراع اس سے زیادہ عجیب ہے ؟

ہمارے استاذِ محترم امام العصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے اپنے ایک فصیح و بلیغ قصیدہ میں اس حقیقت کا پہلی بار انکشاف فرمایا ہے کہ عالمِ اسباب میں عقلِ انسانی کی اختراعات کے ذریعہ جتنی حیرت انگیز ایجادات ہوئی ہیں اور ہوں گی ان سب کا نمونہ انبیاءِ کرام کے معجزات میں موجود ہے درحقیقت انبیاءِ کرام علیہم السلام کے معجزات پیش خیمہ ہیں۔ اس بات کا کہ آئندہ چل کر نسلِ انسانی اسباب کے ذریعہ یہاں تک ترقی کرے گی۔ فرماتے ہیں:

وقد قیل إن المعجزات تقدم

بما یرتقی فیہ الخلیفۃ فی مدی

۱۳۴۷ھ کا واقعہ ہے کہ حضرت شیخ امام العصر مولانا محمد انور شاہ رحمہ اللہ کشمیر سے واپسی پر لاہور میں آسٹریلین بلڈنگ میں بطور مہمان قیام پذیر تھے۔ میزبان نے ڈاکٹر اقبال مرحوم کو بھی دعوت دی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ حضرتؒ نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے بیان فرمانا شروع کیا، ڈاکٹر صاحب انتہائی حیرت و تعجب سے ہمہ تن گوش تھے اور خوب خوب مستفید ہو رہے تھے، مجھے ارشاد فرمایا: "ڈاکٹر صاحب کو میرے قصیدے کے وہ اشعار جو اس مضمون سے متعلق ہیں سناؤ"۔ اتفاق سے مجھے وہ تمام قصیدہ اس وقت محفوظ تھا میں نے سنانا شروع کردیا، ڈاکٹر صاحب مرحوم بہت ہی تعجب سے میری طرف دیکھنے لگے۔

اصلی تسخیرِ کائنات

خیر کہنا یہ ہے کہ ایک معمولی کرّے تک پہنچ جانا کیا اس کا نام "کائنات کی تسخیر" ہے ؟ جس کا چار دانگ عالم میں ڈنکا بجایا جا رہا ہے ع "کہ آمدی کہ بپیر شدی" اصل تسخیر تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کرّے کو تمام دنیا کے لئے پیغامِ رحمت بنایا ہے اور حیاتِ انسانی اس کی رہینِ منت ہے ان سائنسی کارناموں سے ایک مسلمان کو حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا زیادہ سے زیادہ مشاہدہ ہونا چاہیئے اور اس کا ایمان قوی تر ہونا چاہیئے کہ کس چیز سے اللہ تعالیٰ نے کیا کیا فوائد مخلوق کے لئے مقدر کئے ہیں اگر فضا میں خلائی اسٹیشن قائم ہو جائے اور نسلِ انسانی کی آبادی وہاں شروع ہو جائے تو "ربنا ما خلقت ھٰذا باطلا

سبحانک فقنا عذاب النار" کی تفسیر کے تحت آجائے گی۔

بہرحال ان سائنسی کارناموں سے کسی اسلامی عقیدہ پر زد نہیں آتی، یہ امریکہ، یہ روس اور یہ سائنسدان ان ہی "کرّوں" کی تحقیقات میں رہیں گے جو آسمان سے نیچے معلق ہیں، آسمانی دروازے ان شیاطین پر بند ہیں اللہ تعالیٰ نے انس و جن دونوں قسم کے شیاطین کو یہ قدرت نہیں دی کہ وہاں تک پرواز کر سکیں البتہ ان سائنسی کرشموں سے یہ فائدہ ہوا کہ جو چیز انبیاءِ کرام علیہم السلام کے معجزات میں کارفرما تھی اور عقلِ انسانی اپنی کوتاہ نظری کی بنا پر اس کو محال و ممتنع سمجھتی تھی اللہ تعالیٰ نے حجّت پوری کردی اور اس کا امکان ثابت ہوگیا اور ایک چھوٹے سے نمونے میں اس کا وقوع دکھلا دیا تاکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے خوارق و معجزات سے انکار نہ کرسکیں، تفصیلات تو بہت ہیں تاہم امید ہے کہ ان ہی اشارات سے بہت کچھ رہنمائی ہوجائے گی۔ مسلمانوں کے ایک صوفی شاعر حضرت فرید الدین عطارؒ نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہست عالم ذرۂ از ندر تش — باز ذرہ" عالمے از حکمتش

کارِ عالم غیرت است و حیرت است — حیرت اندر حیرت اندر حیرتست

واللہ ولی التوفیق والہدایۃ

جمادی الثانیہ ۱۳۸۹ھ، ستمبر ۱۹۶۹ء

حدیث افتراقِ اُمّت

حدیث افتراقِ اُمت مختلف الفاظ اور مختلف طرق سے چودہ صحابہ کرامؓ سے مروی ہے. محدثین کی اصطلاح کے مطابق یہ چودہ حدیثیں ہوتی ہیں. طرق اس سے زیادہ ہیں. ان صحابہ کرامؓ کی حدیثیں مندرجہ ذیل امہاتِ حدیث میں ملتی ہیں.

مسند احمد، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، صحیح ابن حبان، مستدرک حاکم، سنن کبریٰ، بیہقی، مسند بزار وغیرہ. مسند احمد کی روایت سے کم ازکم اتنا ثابت ہوا کہ حدیث بے اصل نہیں. جیسا کہ محدثین کی تصریحات اس بارے میں موجود ہیں. بلکہ بعض اسانید بالکل صحیح ہیں. سنن ابی داؤد کی روایت اور اس پر سکوت سے کم سے کم اتنا پایۂ ثبوت کو پہنچا کہ حدیث مذکور قابلِ احتجاج ہے. ترمذی، ابن حبان حاکم نے صحیح ہونے کی تصریح کی. حافظ جمال الدین زیلعی نے تخریج احادیث کشاف میں اور حافظ شمس الدین سخاوی نے کتاب الفرق میں اس حدیث کے متون اور ان کی اسانید وطرق پر سیر حاصل بحث کی ہے. افسوس کہ یہ دونوں کتابیں غیر مطبوع ہیں اور عوام ان سے مستفید نہیں ہو سکتے. ان کے اقتباسات ہمارے پیش نظر ہیں.

ان سب احادیث میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت صحیح اور بالکل صحیح ہے. محدثانہ نقطۂ نگاہ سے اس کی نفسِ صحت میں کوئی کلام نہیں. ترمذی و ابن حبان و حاکم سے لے کر زیلعی، ابن حجر، سخاوی سیوطی اور محمد بن اسمٰعیل عجلونی تک محدثین اس کی تصحیح کے قائل ہیں. ابوہریرہؓ کی اس حدیث پر اسناد کے اعتبار سے عدم صحت کا حکم ساری اُمت میں سوائے ابن حزم کے اور کسی نے نہیں لگایا. اگرچہ ابن حزم بھی نفس ثبوت سے گو باسنادِ ضعیف ہو منکر نہیں ہیں. فیروز آبادی کا قول جس پر ان کی کتاب "سفر السعادۃ" ختم ہوئی ہے یہ ہے: "وباب افتراق الامۃ الی اثنتین وسبعین فرقۃ لم یثبت فیہ شئ" لیکن اتنی بات سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ وہ بھی "موضوع" ہونے کا حکم لگاتے ہیں. آگے چل کر ہم یہ واضح کردیں گے کہ ان دونوں بزرگوں کی اس جرح کی فنی قیمت کتنی ہے اور فیروز آبادی کا رتبہ اس بارے میں کیا ہے لیکن یہاں صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ "لم یصح من جھۃ الاسناد" یا "لم یثبت" سے کسی روایت کا بالکل بے اصل یا موضوع ہونا محدثانہ اصول سے ثابت نہیں ہو

سکتا. بہر حال ہم اگر ان دونوں کی بات کو بھی حدیثی اعتبار سے وقعت دیں تو اس باب میں یہ بھی ایک قول ہوگا اور یہاں ایک تیسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ اصل حدیث بالکل صحیح ہے لیکن اس میں یہ زیادتی:

کلھا فی النار إلا واحدۃ۔ — کہ بہتر فرقوں میں سے بہتر دوزخ میں ہوں گے. صرف ایک جنت میں ہوگا.

صحیح نہیں. محدثانہ نقطۂ نگاہ سے غور کرنے پر یہ معلوم ہوگا کہ یہ قول زیادہ اقرب الی التحقیق ہے اور حسن اتفاق یہ ہے کہ امام ترمذی و حاکم وغیرہ نے جس حدیث کی تصحیح فرمائی ہے اس میں یہ زیادتی سرے سے ہے ہی نہیں. چنانچہ حدیث ابوہریرہؓ جو مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد، مستدرک حاکم اور صحیح ابن حبان میں ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: «افترقت النصاری علی إحدی أو قال اثنتین وسبعین فرقۃ وتفترق أمتی علی ثلاث وسبعین فرقۃ»

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہود اکہتر فرقوں میں اور نصاری بھی اکہتر یا بہتر فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت تہتر فرقوں میں منقسم ہوگی.

اب رہی وہ زیادتی جو ابوداؤد کی دوسری روایت میں ہے. اس کے متن میں حسب ذیل اضطراب ہے:

الف: ثنتان وسبعون فی النار وواحدۃ فی الجنۃ. یا اس کے ہم معنی لفظ.

ب: اثنتان وسبعون فی الجنۃ وواحدۃ فی النار. بعض محدثین نے اسنادی اعتبار سے اس کو زیادہ واضح کیا ہے. شمس الدین محمد بن احمد المقدسی "احسن التقاسیم" میں اسی کے قائل ہیں.

ج: بعضہ فی الجنۃ وبعضہ فی النار إلا ھذہ الأمۃ فإنھا کلھا فی الجنۃ.

د: کلھا فی الجنۃ إلا الزنادقۃ. اب ظاہر ہے کہ اس اضطراب میں اگر صحیح ترجیح کا معیار قائم ہو سکے تو ترجیح دی جائے گی ورنہ سقوط متعین ہے. اگرچہ جمہور محدثین کے نزدیک آخری تین صورتیں مرجوح اور پہلی صورت راجح ہے تاہم اس اضطراب سے اس کی وہ قوت نہیں رہی جو اصل متن کے بقیہ حصہ کی ہے.

علامہ ابن حزم اور حدیث افتراق

حدیث میں امام ابن حزم کی جلالت قدر اور تبحر و وسعت

علم سے کوئی انکار نہیں لیکن ان سارے کمالات اور خصائص کے باوجود یہ کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ان کا ہر قول صحیح ہے۔ یہ عصمت تو صرف نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے۔ ان کا قول ایک حد تک جرح و تعدیل میں مسلم ہے۔ محدثین میں مشہور ہے کہ ابن حزم کو باوجود جلیل القدر حافظ حدیث ہونے کے جامع ترمذی ان تک نہیں پہنچی بلکہ وہ اس کے مصنف امام ترمذی کے مرتبہ اور حالت سے بھی ناواقف تھے اور اسی لئے انہوں نے ابوعیسیٰ ترمذی کو مجہول کہا ہے (دیکھئے تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۸۸) اس سے اتنا تو بالکل صاف ہو گیا کہ امام ترمذی کی تصحیح اور ان کی خاص روایت کا تو ان کو علم نہیں ہوا، ورنہ شاید اتنی صفائی کے ساتھ " لایصح من جھۃ الاسناد " نہ فرماتے۔ پھر ابن حزم نے کوئی تصریح نہیں فرمائی کہ وہ کس اسناد کے پیشِ نظر یہ فرماتے ہیں اور کس راوی کی وجہ سے ایسا فرماتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس حدیث کے بعض طرق میں عبدالرحمٰن بن زیاد افریقی ہے اور بعض میں کثیر بن عبداللہ نخعی ہے اور بعض میں عباد بن یوسف یا رشدین سعد ہے۔ اور کسی میں ولید بن مسلم ہے اور ان سب میں ان کے علاوہ بھی کوئی مجہول یا مجروح ضرور ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ابن ماجہ اور بیہقی و بزار کی یہ روایتیں ان کے پیش نظر ہوں اور ان اسانید کے اعتبار سے حکم عدم صحت کا لگایا ہو۔

کچھ بھی ہو اس قسم کے مواقع پر مثبت کے قول کو ترجیح دی جائے گی نہ کہ منکر کے قول کو یا نافی کے قول کو۔ رہا یہ فرمانا کہ "جرح تعدیل پر مقدم" ہے پہلے تو یہ کہ علی الاطلاق نہیں ورنہ دنیا میں کوئی محدث کوئی حافظ حدیث اور کوئی امام ثقہ نہیں ہو سکے گا اور امام احمد، مالک، شافعی، بخاری، مسلم، داؤد ظاہری اور خود ابن حزم سب ختم ہو جائیں گے، بلکہ محدثین نے تصریح فرما دی ہے کہ جس کی شخصیت مشتبہ ہو اور اس کی قدر و منزلت مشہور نہ ہو اس وقت جرح تعدیل پر مقدم ہو گی۔ دوسرے یہ کہ یہ اصول اس وقت مسلم ہو گا کہ کسی شخص کے متعلق اس قسم کے متعارض اقوال ملیں تو یہ ہرگز مراد نہیں کہ کسی حدیث کے اسناد کو اجمالاً کسی نے مجروح کر دیا اور دوسرے نے تصحیح کی تو جرح مقدم سمجھی جائے گی۔

بہرحال ابن حزم نے "ملل و نحل" کی کتاب الایمان میں اس حدیث کی صحت سے انکار فرمایا۔

لیکن حیرت ہے کہ اپنی کتاب محلی کی پہلی جلد اور کتاب الاحکام کی آخری جلد میں عوف بن مالک کی حدیث

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

"تفترق أمتی علی بضع وسبعین فرقۃ أعظمھا فتنۃ علی أمتی قوم یقیسون الأمور برأیھم" کی روایت لاکر اس کی تصحیح کی کوشش کی ہے اور اپنے خیال میں ابطال قیاس کے لئے دلیل پیش فرمائی ہے حالانکہ ابن حزم سے پہلے اور ابن حزم کے بعد اندلس سے لے کر خراسان تک کے محدثین اس حدیث کی تضعیف میں ہم زبان ہیں۔ گویا علامہ ابن حزم احادیث افتراق امت میں ابوہریرہؓ کی صحیح حدیث کی تو تضعیف فرماتے ہیں اور عوف بن مالک کی ضعیف حدیث کی یہاں توثیق فرماتے ہیں۔ خیر یہ توثیق صحیح ہو یا غلط لیکن بہر حال ابن حزم کے قلم سے بھی حدیث افتراق امت کی توثیق کا ایک طریق ظہور میں آگیا۔ اگر ابن حزم ہی کے قول پر مدار ہے تو لیجیئے یہ بھی حاضر ہے اور سنیئے ابن حزم کی کتاب "الفصل" جس کے حوالہ سے حدیث کی تضعیف نقل ہوئی ہے وہ کتاب "الاحکام" سے پہلے کی تالیف ہے اور کتاب الاحکام اس کے بعد کی لکھی ہوئی ہے چنانچہ کتاب الاحکام کی پہلی جلد میں خود ابن حزم اس کی تصریح فرماتے ہیں۔ اب ابن حزم کے اگر دو متعارض قولوں میں کسی ایک کو ترجیح دے سکتے ہیں تو وہ ان کا آخری قول ہوگا۔ خلاصہ یہ ہوا کہ حدیث کی صحت سے انکار اب ابن حزم بھی نہیں کر سکتے۔ نہ ابن حزم کی سابق تضعیف و انکار قابل قبول ہو سکتا ہے جب کہ ان کا آخری قول خود اس کے خلاف موجود ہے۔ فرحم اللہ من أنصف و أذعن للحق۔

مجدالدین فیروز آبادی اور حدیث افتراقِ امت | اب لے دے کے صرف مجدالدین فیروز آبادی رہ جاتے ہیں، پہلے تو یہ عرض ہے کہ فیروز آبادی کا شمار نہ تو حفاظ میں ہے نہ کبار محدثین میں جرح و تعدیل اور نقد حدیث کے باب میں ان کے قول کا کیا مرتبہ ہو سکتا ہے۔ بالخصوص جبکہ جہابذہ امت کے اقوال ان کے مخالف موجود ہوں۔

"رفع یدین" کے بارے میں ان کا یہ قول "فقد صح فی ھذا الباب أربعمائۃ خبر واثر ورواہ العشرۃ المبشرۃ ولم یزل علی ھذہ الکیفیۃ حتی رحل من ھذا العالم ولم یثبت شئ غیرھا۔"

ان کی مبالغہ آمیزی اور معرفتِ حدیث میں ان کا کیا مرتبہ ہے اس کی قلعی کھول دیتا ہے اور محدثین کے نزدیک اس باب میں ہر ہر جزء وخبر غلط ہے اور تحقیق و واقعیت سے کہیں بعید ہے۔

جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ ان کی "سفر السعادۃ" میں اس قسم کے جتنے دعوے ہیں تحقیق کے بعد بہت کم صحیح ثابت ہو سکے۔ اس لئے شارحین سفر السعادۃ" وغیرہ محققین نے تصریح فرمادی ہے کہ اس قسم کے مبالغہ آمیز دعاوی تحقیق کے خلاف ہیں۔ اگر مضمون کی طوالت کا خطرہ نہ ہوتا تو یہاں اس کے چند نمونے بھی پیش کرتا۔ فیروز آبادی کی تفسیر "تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباس" ان کی حدیث دانی کی تردید کے لئے کافی ہے جس کو علماء نے "أکذب التفاسیر" کا لقب دیا ہے۔ اس لئے فیروز آبادی ایک طرف تصحیح میں انتہائی متساہل اور دوسری طرف تصعیف میں انتہائی متشدد واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے نہ ان کی تصحیح قابل اعتماد ہے نہ تضعیف قابل وثوق ہے۔ امہات حدیث ہمارے سامنے ہیں محدثین کے اقوال کا ذخیرہ سامنے موجود ہے۔ رجال و اسانید کی تحقیق کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ان حقائق ثابتہ کے سامنے فیروز آبادی کے محض ایک دعوے کی کیا وقعت رہ جاتی ہے۔

ع فی طلعۃ الشمس ما یغنیک عن زحل۔

ابن جوزی جیسے جلیل القدر محدث جنہوں نے سب سے پہلے تنقید حدیث کے لئے اصولِ درایت بھی مفصل مرتب فرمائے ہیں انہوں نے اس حدیث پر کوئی عقلی جرح نہیں فرمائی اور نہ اپنی کتاب "موضوعات" میں اسے ذکر فرمایا ہے۔ حدیث کی اسنادی صحت کے بعد اس کے مقصد کی تعیین میں گو علماء امت کا کچھ معمولی سا اختلاف ہے کہ آیا یہ عدد بہتّر و تہتّر تحدید کے لئے ہے یا محض تکثیر کے لئے اور اس اختلاف و تفرق سے مراد اصولی تفرق و اختلاف ہے یا فروعی اور امت سے مراد امت اجابت ہے یا امت دعوت وغیرہ وغیرہ۔ اگر اتنا کہہ دیا جائے کہ مراد تعداد سے محض تکثیر ہے اور جس طرح قرآن کریم میں سبعون ذراعًا اور سبعین مرۃ وغیرہ کے عدد تکثیر ہی کے لئے مستعمل ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی ہے۔ افتراق و اختلاف سے مراد عام اختلاف ہے۔ فروعی ہو یا اصولی اور مقصد اہل اھواء اور اھل بدع کا افتراق ہے۔ اہل سنت محدثین و فقہاء ظاہریہ وغیرہ سب فرقہ ناجیہ میں شمار ہیں اور حدیث کا خلاصہ صرف اتنا ہوا کہ یہود و نصاریٰ میں بہت سے فرقے پیدا ہوئے ہیں اور میری امت میں ان سے زیادہ فرقے پیدا ہوں گے۔ نجات کا انحصار صرف میری اتباع اور میرے اصحاب کے اتباع میں ہے تو بتلائیے کہ اس حدیث میں عقلی کیا اشکال

رہ جاتا ہے. کیا تاریخی شہادت اس کے اثبات میں ہے یا نفی میں. بہرحال یہ چیز تو بطور نمونہ و مثال کے عرض کر دی ہے ورنہ بہت کچھ تفصیل و تحقیق کی گنجائش ہے. معنوی حیثیت سے اس حدیث کی تحقیق و تشریح مطالب میں بہت کچھ لکھا گیا ہے. ابو اسحاق شاطبی نے کتاب الاعتصام میں کافی و شافی بحث فرمائی ہے جو ایک منصف کے لئے باعث طمانینت ہو سکتی ہے. مضمون باوجود بہت اختصار کچھ طویل سا ہو گیا لیکن توقع ہے کہ نفع سے خالی نہ ہوگا.

محرّم ۱۳۸۳ھ

حدیث اختلافِ اُمّت

حدیث «اختلاف امتی رحمۃ» کے بارے میں عرصہ سے بحث کا میدان گرم ہے کسی کو مضمون سے اختلاف ہے اور کسی کو اس کے لفظ حدیث ہونے میں اشتباہ و تردد ہے اور ایک حد تک اتنی بات تو معقول ہے کہ تشتت و افتراق کو عذاب بتلایا گیا ہے۔ اس سے نجات و پناہ مانگی گئی ہے۔ نصوصِ کتاب و سنت میں افتراق و اختلاف کی مذمت بیان ہوئی ہے۔ قرآن و حدیث کی نصوص کے پیش نظر بلا شبہ درست ہے کہ جو چیز سراسر عذاب و زحمت ہے وہ رحمت کیوں کر بنی؟ الغرض اکثر ارباب فکر و نظر کے لئے یہ موضوع مرکز توجہ بنا ہوا ہے۔ اس لئے خیال آیا کہ اس کے اسنادی پہلو کو بھی روشن کیا جائے اور اس کی معنوی حیثیت سے بھی پردہ اٹھایا جائے، اور جس طرح کہ حدیث افتراق امت پر ایک خلاصہ پیش کیا گیا ہے اور ایک طویل مضمون کا نچوڑ نکالا گیا ہے۔ اسی انداز سے اس پر بھی چند سطریں لکھ کر ناظرین بینات کی خدمت میں تحفہ پیش کیا جائے۔ نیز دور حاضر کے بعض اربابِ فکر پر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فروعی اختلاف کی بنا پر ان کی دینی منزلت و شرعی منصب مشتبہ ہو گیا ہے اور وہ ان کی حیثیت کو قابلِ تنقید سمجھ کر ایک بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ایک حد تک ان کے شبہات کا بھی ازالہ ہو جائے، گو اصل مسئلہ مستقل توجہ و بحث کا محتاج ہے اور اس کے سب پہلوؤں پر سیر حاصل بحث اور نتیجہ خیز تنقیح کی ضرورت ہے اور انشاء اللہ اس سلسلہ میں جو افراط و تفریط ہو رہی ہے اس کے سد باب کے لئے دوبارہ کچھ لکھا جائے گا لیکن اس وقت تو اس مضمون سے ضمناً موضوع کے ایک رخ سے نقاب کشائی ہو جائے گی۔ واللہ سبحانہ ہو الموفق۔

حدیثِ اختلافِ اُمّت کے رواۃ اور اس کے الفاظ

"حدیث اختلافِ امت" کا یہ مضمون مجموعی طور پر مندرجہ ذیل صحابہ رضی اللہ عنہم سے مرفوعاً و موقوفاً روایت کیا گیا ہے،

حضرت عمر[۱] فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت جابر[۲] بن عبداللہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابن[۳] عباس رضی اللہ

عنہا. نیز حسب ذیل تابعین سے بھی مروی ہے۔

(۱) قاسم بن محمد بن ابی بکرجن کا شمار مدینہ کے فقہاء سبعہ میں ہے۔

(۲) عمر بن عبدالعزیز، خلیفہ راشد۔

(۳) یحییٰ بن سعید الانصاری۔

اور مندرجہ ذیل کتب حدیث وغیرہ میں مختلف الفاظ سے مذکورۃ الصدر حدیث کسی صحابی یا تابعی سے روایت کی گئی ہے:

مسند عبد[1] بن حمید، مسند دارمی[2]، سنن ابن[3] ماجہ، الجمع بین[4] الصحاح للعبدری، مستدرک[5] حاکم، تاریخ ابن[6] عساکر، فضائل[7] الصحابہ للدارقطنی، المدخل[8] للبیہقی، طبقات[9] ابن سعد، معجم[10] طبرانی، مسند الفردوس[11] للدیلمی، کتاب[12] الحجۃ فی اثبات المحجۃ لنصر بن ابراہیم المقدسی، کتاب[13] العلم والحلم لآدم بن ابی ایاس، الرسالۃ[14] الاشعریہ للبیہقی، المختصر[15] فی اصول الفقہ لابن حاجب المالکی، غریب الحدیث[16] للامام الخطابی، مشکوٰۃ[17] المصابیح للخطیب، جمع[18] الفوائد لمحمد بن سلیمان المغربی وغیرہ[ا]۔

جن کبار محدثین اور محققین نے اپنی اپنی تصانیف میں اس کا ذکر کیا ہے ان میں سے چند کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں۔

امام خطابی[1]، ابوعبداللہ[2] الحسین بن الحسن الحلیمی الشافعی۔ قاضی حسین[3] الشافعی، امام[4] الحرمین الاسعد بن الاسعد الشافعی۔ ابوالعباس[5] القرطبی المالکی۔ حافظ حدیث برہان[6] الدین زرکشی، حافظ ولی[7] الدین العراقی بلکہ عبدالروف مناوی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مالکؒ نے اس کو صراحت کے ساتھ حدیث ہی کہا ہے (دیکھو فیض القدیر ج ا ص ۲۱)

اب نہایت اختصار کے ساتھ چند منتخب روایات پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) عن عمر بن الخطاب قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سالت ربی عن اختلاف	حضرت فاروق اعظم سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے صحابہ کے اختلافات

ا ملاحظہ ہو تفسیر مظہری ج ۲ ص ۱۱۶ مطبوعہ دہلی جید برقی پریس، المقاصد الحسنہ للسخاوی ص ۲۶ و ص ۲۷ طبع مصر، فیض القدیر للمناوی طبع مصر ج ا ص ۲۰۹ تا ۲۱۱، کتاب الموضوعات الکبیر للقاری ص ۲ مطبع محمدی لاہور طبقات ابن سعد ص ۱۸۹ ج ۵ مطبوعہ قاہرہ۔

اللہ، یا محمد إن أصحابك عندی کالنجوم لبعضها أقوی من بعض وفی روایة: «لبعضها أضوء من بعض ولکل نور فمن أخذ لبشیء مما هم علیه من اختلافهم فهو عندی علی هدی»

کے بارے میں حق تعالیٰ سے عرض کیا تو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی فرمایا کہ آپ کے صحابہ کی مثال آسمان کے تاروں جیسی ہے بعض زیادہ روشن ہیں بعض سے اور ہر ایک کے لئے نور ہے ان میں سے کسی کے قول کا بھی اتباع کیا گیا تو وہ ہدایت پر ہے۔

یہ روایت، مسند عبد بن حمید و مسند دارمی و ابن ماجہ، رزین عبدری، حاکم وغیرہ کی ہے (بحوالہ تفسیر مظہری ج ۲ ص ۱۱۶ مطبوعہ دہلی)

(۲) یہی حدیث امام حدیث دارقطنی نے اپنی کتاب "فضائل الصحابہ" میں اور حافظ ابن عبدالبر نے حضرت جابر کی روایت سے نقل کی ہے۔ (بحوالہ مذکورہ)

(۳) یہی حدیث امام بیہقی نے کتاب "المدخل" میں بروایت ابن عباس نقل کی ہے۔ (بحوالہ مذکورہ)

محدثین کی اصطلاح میں یہ تین حدیثیں ہو گئیں۔

(۴) عن ابن عباس قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مهما أوتیتم من کتاب اللہ فالعمل به ولا عذر لأحد فی ترکه فان لم یکن فی کتاب اللہ فسنة ماضیة، فإن لم یکن فی سنة نبی فما قال أصحابی إن اصحابی بمنزلة النجوم فی السماء فأیها أخذتم به اهتدیتم واختلاف أصحابی لکم رحمة۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کتاب اللہ میں ہے اس پر عمل ضروری ہے اور کسی کا بھی ترک کرنے میں عذر قبول نہیں اور کتاب اللہ میں نہیں تو پھر سنت میں ہوگا اور اگر میری سنت میں نہیں تو پھر جو میرے صحابہ کہیں اور میرے صحابہ کی مثال آسمان کے تاروں جیسی ہے کسی کے قول پر بھی عمل کروگے تو ہدایت پر چلوگے اور میرے اصحاب کا اختلاف تمہارے لئے رحمت ہے۔

یہ حدیث بیہقی نے "المدخل" میں روایت کی ہے اور طبرانی نے "معجم" میں اور دیلمی نے "مسند الفردوس" میں اور بدرالدین زرکشی نے بحوالہ "کتاب الحجۃ" للنصر المقدسی ذکر کی ہے لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔ اس کی سند میں جویبر بن معبد ضعیف ہے اور انقطاع بھی ہے لیکن واضح رہے کہ یہ ابن ماجہ کا

راوی ہے اور حماد بن زید و ابن المبارک و یزید بن ہارون جیسے اکابر محدثین نے اس سے روایت کی ہے۔ (دیکھو "میزان الاعتدال" للذہبی ج ا ص ۱۹۸) اور انقطاع امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہ کے یہاں علت قادحہ نہیں منقطع روایت ان ائمہ کے نزدیک احکام میں بھی قابل عمل ہے۔

(۵) اختلاف اُصحابی رحمۃ لاُمتی — میرے صحابہ (ساتھیوں) کا اختلاف میری امت کیلئے رحمت ہے۔

امام بیہقی نے اس کو "رسالہ اشعریہ" میں بغیر سند نقل کیا ہے۔ یہی روایت حافظ عراقی نے بحوالہ آدم بن ابی ایاس نقل کی ہے۔ سند کا ذکر نہیں کیا جس کی تفصیل حافظ سخاوی نے "المقاصد الحسنہ" میں کی ہے۔

(۶) عن القاسم بن محمد قال اختلاف اُصحاب محمد رحمۃ لعباد اللہ۔ — حضرت قاسم بن محمد فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا اختلاف اللہ کے بندوں کیلئے رحمت ہے۔

یہ روایت "تفسیر مظہری" میں بحوالہ کتاب "المدخل للبیہقی" و طبقات ابن سعد مذکور ہے "طبقات ابن سعد" (ج ۵ ص ۱۸۹ مطبوعہ قاہرہ) کے الفاظ سند کے ساتھ یہ ہیں:

اُخبرنا قبیصۃ بن عقبۃ حدثنا افلح بن حمید عن القاسم بن محمد قال کان اختلاف اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للناس۔ — قبیصہ بن عقبہ فرماتے ہیں کہ افلح بن حمید قاسم بن محمد سے روایت فرماتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا اختلاف لوگوں کے لئے باعث رحمت ہے۔

(۷) عن عمر بن عبد العزیز قال "ماسرّنی لو اُن اُصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم لم یختلفوا لاُنھم لو لم یختلفوا لم یکن رخصۃ — حضرت عمر بن عبد العزیز فرماتے ہیں مجھے اس کی خوشی نہ ہوتی اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں اختلاف نہ ہوتا اگر اختلاف نہ ہوتا تو رخصت کہاں سے نکلتی۔

یہ روایت بیہقی نے کتاب "المدخل" میں نقل کی ہے (بحوالہ سخاوی و مظہری)

الغرض ان مختلف روایات اور مختلف الفاظ اور متعدد طرق و مخارج سے قدر مشترک یہی نکلی کہ حدیث کا مضمون محدثانہ نقطۂ نگاہ سے قابل اعتبار ہے اور ایک حدیث کا صحیح ہونا، بقیہ روایات کی تصحیح کی دلیل ہے۔ نیز ان مختلف الفاظ سے مقصود بھی واضح ہو گیا کہ اصلی مقصد یہ ہے کہ اختلاف کی وجہ

سے حکم کا وزن ہلکا ہو جاتا ہے اور گنجائش نکل آتی ہے۔ چنانچہ حافظ شمس الدین سخاوی نے "المقاصد الحسنہ" میں یحییٰ بن سعید انصاری سے نقل کیا ہے: "أھل العلم أھل توسعۃ" "یعنی علماء توسع کیا کرتے ہیں۔ پھر خود سخاوی فرماتے ہیں کہ" مفتیانِ کرام میں ہمیشہ اختلاف رہا ایک جائز کہتا ہے ایک ناجائز لیکن ایک دوسرے کی عیب جوئی نہیں کرتے۔" ظاہر ہے کہ منصوص حکم کے خلاف کرنا یا قطعی حکم کی نافرمانی کرنا یا اجماعی فیصلہ کی خلاف ورزی کرنا جتنا بڑا جرم ہوگا کسی اختلافی مسئلہ کی مخالفت کرنا اتنا بڑا جرم ہرگز نہ ہوگا۔ بہرحال گذشتہ روایات و الفاظ سے جو نتائج نکلے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے صحابہ کے آئندہ اختلاف سے اندیشہ ہوا کہ غیر منصوص مسائل میں ضرور اختلاف ہوگا ایسا نہ ہو کہ یہ اختلاف قلوب میں اختلاف و تفرق و تحزب و تشیع کا ذریعہ بنے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے اطمینان دلایا کہ صحابہ حق پر ہیں ان کے مراتب علم و فقہ میں ضرور تفاوت ہوگا لیکن کوئی مضائقہ نہیں۔ ان میں ہر ایک کا اتباع رہنمائی کے لئے کافی ہوگا۔

(۳) صحابہ کی متابعت کا موقع اس وقت آئے گا جب کتاب و سنت میں صاف و صریح حکم نہ ہو تو پھر صحابہ کے اتباع میں دین ہوگا اس سے خروج دین سے خروج سمجھا جائے گا۔

(۴) جس طرح عام انسانوں کے مزاجوں میں تفاوت ہوتا ہے کوئی عزیمت کو پسند کرتا ہے۔ کوئی رخصت و آسانی کا متلاشی رہتا ہے کوئی احتیاط و ورع کے پہلو کو ترجیح دیتا ہے۔ کوئی عام نظام کے پیش نظر تیسیر و سہولت کو پسند کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح سے صحابہ کے مزاجوں میں بھی تفاوت ہوگا اور تابعین کی آئندہ نسلیں اپنے اپنے مزاج کے مطابق اپنے لئے ہیرو منتخب کرلیں گی۔

(۵) دین اسلام کے فطری نظام کا بھی فطری تقاضا تھا کہ مسائل اجتہادیہ میں اتنی لچک رہے کہ ہر شخص اپنے ماحول اور طبعی افتاد کے مطابق انتخاب کا فیصلہ کرسکے۔

(۶) قلوب میں اتنی وسعت ہونی چاہیئے کہ اجتہادی امور میں تنگ نظری و تعصب سے کام نہ لیا جائے اور اس اختلاف کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سمجھے۔ دیکھئے اس مضمون کو کتنی صراحت کے ساتھ حضرت خلیفہ راشد امیر المومنین عمرؓ ثانی نے بیان فرمایا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور مدینہ طیبہ کے فقہاءِ سبعہ میں ممتاز ترین شخص حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ نے کس صراحت کے ساتھ اس کو اللہ تعالیٰ

کی رحمت بتلایا۔ چنانچہ الشیخ عبد الرؤف المناوی نے فیض القدیر میں بڑے شرح وبسط کے ساتھ فرمایا کہ "حدیثِ مذکور کا مصداق فروعی احکامِ اجتہادیہ ہیں اور مذاہبِ امت کا فروعی اختلاف اللہ تعالےٰ کی بڑی نعمت اور بڑا فضل وکرم ہے ہاں اصول وعقائد میں اختلاف کرنا یہ گمراہی وضلالت ہے۔" حافظ ابو عمرو بن الصلاح سے بھی یہی مضمون موصوف نے نقل کیا ہے۔ اس لئے امام خطابی نے بڑے زور وشور سے فرمایا ہے کہ اس حدیث پر صرف دو شخصوں نے اعتراض کیا ہے کہ اگر اختلاف رحمت ہے تو اتفاق عذاب ہوگا۔ فرماتے ہیں کہ یہ کہنے والا ایک اسحاق موصلی ہے جو بے دین ہے اور دوسرا جاحظ ہے جو ملحد ہے۔ موصوف کے الفاظ ہیں:۔ اعترض علی هذا الحديث رجلان أحدهما ماجن والآخر ملحد، وهما اسحاق الموصلی وعمرو بن بحر الجاحظ (ملاحظہ ہو "المقاصد الحسنۃ" للسخاوی ص ۲۷)

بہر حال امام خطابی اور بہت سے محققین نے یہی سمجھا ہے کہ حدیث کا تعلق اور اس اختلاف کا محل فروعی اجتہادی مظنون مسائلِ شرعیہ ہیں۔ دینِ اسلام کے منصوص مسائل وآیاتِ بینات جو قرآن وسنت میں فیصلہ شدہ ہیں وہ نہیں ہیں اور ظاہر ہے کہ ان میں اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ ان نصوص کی دلالت اگر قطعی نہیں یا تعارض ہے اور اجماع وغیرہ اس باب میں نہ ہو تو نصوصِ شرعیہ اور احادیثِ نبویہ کے محامل ومعانی ومقاصد میں اختلاف کا درجہ یہی ہوگا۔ جو فروعی مسائلِ اجتہادیہ کا ہے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی محدث وقت اپنی بے نظیر تفسیر المظہری (ج ۲ ص ۱۱۵) میں آیۃ کریمہ ذیل کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:۔

"ولا تكونوا كالذين تفرقوا" يعني اليهود تفرقوا على ثنتين وسبعين فرقة "واختلفوا من بعد ما جاءهم البينات" الدلائل الواضحة القاطعة من الآيات المحكمة والأخبار المتواترة المحكمة من الأنبياء ونحو ذلك كاجماع هذه الأمة سواء كان ذلك الاختلاف في أصول الدين كاختلاف أهل الأهواء مع أهل السنة أو في الفروع المجمع عليها كمسألة غسل الرجلين ومسح الخفين في الوضوء، وخلافة الخلفاء الأربعة، واحترز بهذا القيد عن اختلاف بالاجتهاد

فی ماثبت بالأدلة الظنية فإن الاختلاف فيها ضروری ضرورة خطأ بعض المجتهدين ، فذلك الاختلاف بعد بذل الجهد بلا مكابرة وتعصب معفو بل هو رحمة وسعة للناس الخ.

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ یہ یہود کا کام ہے کہ بینات آنے کے بعد تفرق واختلاف کرتے ہیں، بینات سے مراد قرآن کریم کی آیات محکمہ یا احادیث متواترہ قطعیہ اور اجماع امت ہے. الغرض مضر اختلاف وہ ہے جو اصولِ دین میں ہو یا ان فروع دین میں ہو جو اجماع امت سے ثابت ہیں جیسے وضو میں پاؤں کا دھونا یا موزوں پر مسح کرنا یا خلفاء راشدین کی خلافت کا ثبوت. رہا مجتہدینِ امت کا وہ اختلاف جو سعی وکوشش کے باوجود ادلۂ ظنیہ کی وجہ سے باقی رہا تو یہ معاف ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے. پھر قاضی صاحب نے اس کی تائید میں گذشتہ روایات ذکر فرمائی ہیں. تابعین کے ان آثار سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ حدیث «اختلاف امتی رحمۃ» سے مراد یہی فروعی اختلاف ہے. دین کے مسائلِ شرعیہ میں ائمہ کا اجتہادی اختلاف ایک مسلمہ حقیقت ہے. نقل کے علاوہ عقل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور ائمہ دین کے اجتہادی دور کی پوری تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے. ان حقائق کے پیش نظر کسی کو مجالِ انکار باقی نہیں رہ سکتا اور حدیث کا مقصد بالکل واضح ہو جاتا ہے. مزید غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان روایات میں وہی حقیقت جلوہ گر ہے جو فضائلِ صحابہ اور مناقبِ امتِ محمدیہ میں آئی ہے کہ "یہ امت کبھی گمراہی پر متفق نہ ہوگی." اور حق ان کے اندر دائر سائر رہے گا اور "میں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ میری امت گمراہی پر متفق نہ ہو. اللہ تعالیٰ نے میری درخواست قبول فرمالی." وغیرہ وغیرہ. مختلف روایات جو متعدد صحابہ کرام سے کتب حدیث میں موجود ہیں.

دراصل اختلافِ امت کا سب سے پہلے ظہور عہد صحابہ میں ہوا ہے. صحابۂ کرام کے دور میں جتنا بھی مسائلِ دین اور فروعی اجتہادی احکامِ شرعیہ میں اختلاف ہوا ہے وہ سب دین کے دائرے کے اندر ہوا ہے یہ ممکن نہیں کہ صحابہ میں سنتِ نبویہ کے خلاف کوئی جدید بدعت راستہ نکالے. اگر کوئی اختلاف بھی پیش آئے گا تو غور کرنے کے بعد ہر بات کی سند، یا کسی حدیثِ قولی یا فعلی سے مل جائے گی یا قرآن کریم سے صاف وصریح استنباط ہوگا. اس کا کوئی امکان نہیں

کہ بلا سند و حجت اپنی خواہش پر کوئی بات کہے یا اس پر اصرار کرے. یہی وجہ ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کا دینی منصب بیان فرما دیا ہے. چنانچہ سب سے پہلے حضرات شیخین یعنی سیدنا ابی بکرؓ اور سیدنا عمرؓ کا دینی منصب متعین فرمایا. ارشاد ہے:

اقتدوا بالذین بعدی أبی بکر و عمر (ترمذی) — میرے بعد ابوبکر و عمر کی اقتدا کرو.

إن اللہ جعل الحق علی لسان عمر (ترمذی والوداؤد) — اللہ نے عمرؓ کی بات میں حق رکھا ہے.

پھر خلفاء راشدین کے مرتبہ کا تعین فرمایا:

علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدیین عضوا علیها بالنواجذ و إیاکم ومحدثات الأمور. — تم پر لازم ہے کہ میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت کو اختیار کرو. اس کو دانتوں سے پکڑ لو اور نئی نئی باتوں سے بچتے رہو.

(احمد والسنن من حدیث العرباض بن ساریة)

پھر عام صحابہ کے بارے میں ارشاد ہے،

وأصحابی أمنة لأمتی، فإذا ذهب أصحابی أتی أمتی ما یوعدون (مسلم) — میرے صحابہ میری امت کے امین ہیں جب میرے صحابی چلے جائیں گے تو میری امت پر پھر وہ حالات آئیں گے جن سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے.

بلکہ حدیث خیر القرون قرنی الخ میں تابعین کے دور کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے.

بہر حال اس قسم کی روایات کا ایک وسیع باب ہے جن سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ سنت نبویہ کے بعد صحابۂ کرام کا درجہ ہے، اگر سنت نبویہ میں دین کی کوئی بات نہ ملے تو تعلیم صحابہ میں تلاش کرنا چاہیئے. اگر بلا اختلاف عہد صحابہ میں کوئی بات طے ہو جاتی ہے تو پھر کسی کو اس کی مخالفت کا حق نہیں پہنچتا، اور اگر ان میں اختلاف پایا گیا تو ان کے اقوال میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا ہوگا، جدید اجتہاد کی نہ ضرورت ہے نہ اس کی اجازت، اس کا کوئی امکان نہیں کہ صحابہ بدعت یا احداث فی الدین اختیار کریں. اس لئے کہ ان کے دینی منصب کی ضمانت دی گئی ہے اور ان کی پیروی کی طرف رہنمائی کی گئی ہے. اب اگر قرآن و حدیث میں کسی امر کا کوئی فیصلہ

نہ ملے تو اسے صحابہ کے اقوال اور ان کی سنت میں تلاش کرنا چاہیئے جو شخص ان کی سنت ہوتے ہوئے جدید اجتہاد کرے گا یا اس سے انکار کرے گا وہ مبتدع ہوگا بلکہ ان احادیث کا مخالف و منکر ہو جائے گا جو آپ نے اپنے صحابہ کرامؓ کے حق میں ارشاد فرمائی ہیں۔ حضرات صحابہ سے بھی اس سلسلہ میں متعدد تصریحات ملتی ہیں۔

(۱) حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں:۔

کل عبادۃ لم یتعبد ھا أصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلا تعبدوھا وخذوا بطریق من کان قبلکم۔	یعنی جو عبادت صحابہ نے نہیں کی تو تم بھی وہ عبادت مت کرو اور سلف کا طریقہ اختیار کرو۔

(۲) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں۔

من کان منکم مستناً فلیستن بمن قد مات فإن الحی لا یؤمن علیہ الفتنۃ:۔	جو کوئی تم میں سے کسی کی اقتدا کرنی چاہے تو اس کی اقتدا کرے جس کا انتقال ہو چکا ہے کیونکہ زندہ آدمی کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔

(۳) یا فرمایا:۔

اتبعوا آثارنا ولا تبتدعوا۔	ہمارے آثار و اقوال کا اتباع کرو اپنی طرف سے نئی باتیں مت نکالو۔ وغیرہ وغیرہ۔

صحابہ و تابعین کے اتنے کثرت سے آثار و اقوال اس سلسلہ میں ملتے ہیں کہ جمع کرنے سے ایک دفتر تیار ہو جائے گا اور جب کہ قرآن کریم میں صحابہ کے فضائل و مناقب اتنی وضاحت کے ساتھ موجود ہیں تو پھر ان کے ہوتے ہوئے ان کے اس دینی منصب کو سمجھنے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ غالباً اس وقت یہ چند اشارے کافی ہوں گے۔

بہر حال حدیث افتراقِ امت "جس کے متعلق گذشتہ "بینات" کے شمارے میں تفصیل آ چکی ہے اس کا تعلق اس افتراق و شقاق سے ہے جو اصولِ دین میں ہے اور انتہائی مذموم ہے۔ نصوصِ قرآن و حدیث میں اس کی مذمت و قباحت بیان کی گئی ہے۔ امتِ اسلامیہ اور

امت اجابت میں جو فرقے اصولی پیدا ہوئے جن کو اہل ہوا اور اہل بدع کہا جاتا ہے۔ ان میں خوارج وقدریہ، رافضہ، مرجئہ، جہمیہ، کرامیہ، حشویہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب کا تعلق حدیث افتراق امت سے ہے جس کے لئے معیار اتباعِ سنت۔ ما انا علیہ و اصحابی کا جادۂ مستقیم بتلایا گیا اور جو اس معیار پر صحیح نہ اترے وہ اس دائرہ سے خارج ہوں گے اور حدیث "اختلافِ امت" کا دائرہ فروعی اجتہادی مسائل تک منحصر ہے۔ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاءِ راشدین، توقیر صحابہ، اجماع امت واجتہاد و استنباط کے اصولی طرق میں سب اہل سنت متفق ہیں، ان کے جزوی اختلافات کو قابل گرفت نہیں سمجھا گیا اور ہدایت کی گئی کہ اس قسم کے اختلافات کو افتراق کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ اس اختلاف کو تکوینی مصالح واسرار اور فطری اختلاف سمجھ کر اس کو سراسر حکمت ومصلحت سمجھا جائے۔ اس دائرے میں تحزب وتشیع کو برسرکار نہ لایا جائے اور قلوب کے نفاق وشقاق کا ذریعہ بننے نہ دیا جائے۔ دونوں حدیثوں کے مضمون جدا جدا ہیں۔ ان کو ایک ہی مصداق پر حمل کرنا یہ سراسر غلط مبحث ہے۔ اگر قرونِ متاخرہ میں چند افراد نے تصلب مذہبی میں غلو کرکے تعصب وفرقہ بندی کے ذریعہ امتِ محمدیہ میں شقاق ونفاق کا راستہ کھول دیا تو یہ اتباعِ مذاہب کی ناعاقبت اندیشی ہے۔ یہ ان کا جرم ہے کہ ایک صحیح ومفید چیز سے ناجائز و غلط فائدہ اٹھایا گیا۔ کچھ ظاہر بین اور عواقب ناشناس حضرات نے غلو کرکے اتباع کے اس غلط طریقۂ عمل سے متاثر ہو کر اصل اختلافِ فکری کو غیر اسلامی نظریہ قرار دے دیا اور حنفیہ ومالکیہ شافعیہ وحنابلہ کی گروہ بندیوں کو بیچ میں لاکر انہیں قدریہ وجہمیہ بلکہ کفار ومشرکین کی صف میں کھڑا کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حالانکہ صاف بات ہے کہ جن مسائل واحکام میں کوئی قرآنی وحدیثی فیصلہ موجود نہ ہو اور صحابہ کے دور میں ان کا فیصلہ نہ ہو سکا ہو تو چونکہ انسانی دماغ کے مراتب مختلف ہیں اور ہر دماغ کا زاویہ نگاہ فطری طور پر ضروری نہیں ہے کہ دوسرے سے متفق ہو جائے اور ہر صاحبِ فکر وصاحب اجتہاد اس کا مکلف ہے کہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے منشا کو سمجھنے کی کوشش کرے اور وحی الٰہی کے اصل سرچشمہ سے سیراب ہو، اس لئے اختلاف تو ناگزیر تھا۔ لہٰذا شریعت نے اس کے دائرے کو وسیع بنا دیا اور پابندی نہیں لگائی اور فطری ضرورتوں کی تکمیل

بس توسع سے کام لیا اور اس کو رحمت کہا۔ شرط صرف اتنی ہے کہ اصولی دائرہ سے باہر نہ جائے اور نیت بخیر ہو اور علم و تقوی و بحث و تحقیق کی اہلیت موجود ہو۔ یہ موضوع زیادہ وضاحت و تشریح کا محتاج ہے اس وقت حدیث «اختلاف أمتي رحمة» کے مضمون کو سمجھنے کے لئے اتنا کافی ہوگا، انشاء اللہ تعالیٰ حق تعالیٰ حق سمجھنے کی صحیح توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

ربیع الاول ۱۳۸۳ھ

حدیث "بدأ الاسلام غریباً" کی تشریح

بَدَأَ الاِسلامُ غَرِیباً وَسَیَعُودُ کَمَا بَدَأَ فَطُوبیٰ لِلغُرَبَاءِ (مسلم عن أبی ھریرۃ)

"صحیح مسلم شریف" کی ایک صحیح حدیث ہے کہ اسلام کا ابتدائی دور غربت کا تھا اور آخری دور بھی غربت کا ہوگا جو لوگ اسلام کی غربت کے باوجود اسلام پر قائم رہیں گے وہ خوش قسمت ہیں۔

غریب کے معنی | عربی زبان میں "غریب" کے معنی مسافر کے ہیں جس کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو، کوئی اجنبی مسافر جب کسی ملک میں جاتا ہے تو لوگ اس کو تعجب سے دیکھتے ہیں، نہ اس کا کوئی ہمدرد ہوتا ہے نہ غمگسار نہ کوئی پرسانِ حال، تاریخِ اسلام میں ابتدائی دور کے حالات و واقعات تو پڑھے ہوں گے، حضرت بلال حضرت عمّار بن یاسر حضرت سمیہ حضرت ابو فکیہہ حضرت خبّاب بن الأرت وغیرہ وغیرہ رضی اللہ عنہم کی دردناک داستانیں تو زبانِ زد خلائق ہیں آپ نے بھی سُنی یا پڑھی ہوں گی یہ ہے غریب الدیار اسلام کا دورِ غربت اگر غور فرمائیں تو زیادہ تر عقیدے کا دور تھا، تمدن و معیشت کا نہ تھا پوشاک و خوراک کا نہ تھا، رنگ و صورت کا نہ تھا، صرف ایک عقیدۂ توحید کا دور تھا اور اسی کی دعوت پر کہا جاتا تھا:۔

«أَجَعَلَ الآلِهَةَ إِلٰهاً وَاحِداً — بہت سے خداؤں کو ایک خدا بنا دیا؟ یہ تو بڑی

إِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ» — عجیب بات ہے۔

مسلمان مملکتوں میں اسلام کی غربت

حق تعالیٰ کی توحید اور ذات و صفات و کمالات میں یکتائی کا عقیدہ مسلمانوں کا خصوصی وصف تھا اسی وجہ سے "دینِ اسلام" کو ایک غریب الدیار مسافر کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے لیکن آئیے اور اسلام کی آج کی غربت پر نظر ڈالئے، اس وقت تمام تر اسلام کا مدار صرف زبان پر ہے، زبان سے بے شک اسلام اور مسلمان کا نام لیا جاتا ہے لیکن نہ عقیدہ اسلام کا نہ عمل مسلمانوں کا نہ صورت مسلمانوں کی، نہ سیرت اسلام کی، نام "اسلامی مملکت" اور "المملکۃ الاسلامیۃ" اور قانون ہے رومن لاء یا کمیونزم یا سوشلزم نام ہے اسلام کا عمل ہے نیشنلزم کا، شراب خانے آباد ہیں، جوئے اور قمار کے اڈے عروج پر ہیں، رقص و سرود کی محفلیں گرم ہیں، مرد و زن کے روح فرسا نیم عریاں مناظر قدم

قدم پر سامنے ہیں، شراب خانوں کے اشتہارات ہیں، سینما اور تھیٹروں کے اشتہارات ہیں، اخبارات، دیواریں بورڈ ان اشتہارات سے پٹے پڑے ہیں، سگریٹ یا سگار منہ میں ہے ننگا سر ہے یا سر پر ہیٹ لگا ہے گردن میں ٹائی بندھی ہے، درحقیقت عیسائیت کا امتیازی نشان اور صلیب کی علامت ہے، ہیں کون؟ مسلمان! نت نئی دعوتوں کے نام ہیں لنچ اور ڈنر ہیں کھڑے کھڑے اچھلتے کودتے کھا رہے ہیں، عجیب عجیب انداز سے بولیاں بول رہے ہیں اور قہقہے لگا رہے ہیں، سر سے پیر تک صورت سے سیرت تک صاحب بہادر بنے ہوئے ہیں غرض کیا کیا ادائیں آج کے مسلمانوں کی شمار کی جائیں۔

اور سب سے زیادہ روح فرسا طرزِ عمل یہ ہے کہ تھیٹروں کے اسٹیج پر فلموں کے دوش بدوش میلاد النبیؐ کے جلسے ہیں اور حج و زیارت کی فلمیں ہیں، غزوہ بدر کے ڈرامے ہیں تھوڑی بہت جو کسر باقی تھی وہ ٹیلیویژن نے پوری کر دی، إنا للہ وإنا الیہ راجعون۔

اسلام کے ساتھ شر انگیز اور مضحکہ خیز صورت حال

اور ان سب سے جانکاہ صورت یہ ہے کہ اسلام اور دینِ اسلام کے ساتھ یہ مضحکہ خیز اور شر انگیز حرکات عینِ اسلام اور خدمتِ اسلام ہیں، عبادت و طاعت سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس پُر فریب صورتِ حال نے اور ان شیطانی و طاغوتی کارناموں نے پردہ پوش عورتوں کو شریف زادیوں کو پابندِ شرم و حیا لڑکیوں کو بھی زاویۂ عفت و عصمت سے نکال کر فسق و فجور کے ان حیا سوز مرکزوں میں پہنچا دیا۔ فیا غربۃ الاسلام" قرآن و حدیث اور فقہِ اسلامی کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں، ہر کافرانہ عقیدے کے اظہار اور اشاعت کی آزادی ہے جو جس کو چاہے کافر بنا دے مرتد بنا دے کوئی پرسان حال نہیں محاسبہ نہیں کوئی جرم نہیں، سادہ لوح مسلمان اور عیسائی مشنریاں، بھیڑوں میں بھیڑیوں کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے کہ جو چاہے کریں نہ اسلامی حمیت ہے نہ اسلامی غیرت ہے۔

سب سے بڑی صدمے کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اسلام کے نام پر ہو رہا ہے آہ" دین اسلام " سر سے پیر تک غریب ہی غریب ہے، کسمپرسی کی حالت میں کراہ رہا ہے نہ کوئی تیمار دار ہے نہ کوئی غم خوار۔

اگر آج کوئی صحابی زندہ ہو جائے اور ہمارے اسلامی ملکوں کا یہ نقشہ دیکھے، کیا وہ باور کر سکے

گا کہ یہ اسلامی مملکت ہے اور یہ اس کے مسلمان باشندے ہیں؟ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے زمانے میں بڑی حسرت سے فرمایا کرتے تھے:

والذی لا إله إلا هو ما أذکرُ ما غبرَ	خدا کی قسم میں کیا کہوں کہ دنیا کیا رہ گئی ہے اس کی مثال
من الدُّنیا إلا کالثَّغَبِ شُرِبَ	اس حوض کی ہے جس کا نتھرا اور صاف پانی تو پی لیا گیا
صَفوُهٗ وبقی کَدَرُهٗ .	ہو اور گدلا گندا پانی باقی رہ گیا ہو۔

یہ خلافت راشدہ کا دور ہے اس زمانہ کی بات فرما رہے ہیں، حضرت ابن مسعود، حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کی شہادت سے پہلے وفات پا چکے ہیں اگر آج کے دور کو دیکھیں تو آپ ہی سوچئے کیا کہیں گے؟ حضرت ابن عمر ایک مسجد میں نماز پڑھنے کی غرض سے تشریف لے لئے اذان کے بعد مؤذن نے اتفاق سے دوبارہ نماز کا اعلان کر دیا چونکہ حدیث میں اذان کے بعد دوبارہ نماز کا اعلان ثابت نہیں، ناراض ہو کر فوراً مسجد سے نکلے اور اپنے ساتھی مجاہد سے فرمایا:

اُخرج بنا من عندِ هٰذا المبتدعِ	چلو اس بدعتی کے یہاں سے نکلو۔

آج کوئی صحابی ان ممالکِ اسلامیہ میں آنکلیں وہ اسلام کا نقشہ دیکھ کر کیا فیصلہ فرمائیں گے؟

عملی اسلام کی حفاظت کے لئے خوش نصیب افراد کا وجود

اسی سلسلہ میں حضرت امام حسن بصری کا ایک مقولہ "بینات" کے کسی شمارے میں گذر چکا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اللہ جل وعلیٰ کا آخری پیغام جس طرح قرآن وحدیث کی صورت میں محفوظ ہے اور اس کے ذریعہ اللہ جل جلالہٗ کی حجت تمام مخلوقات پر پوری ہو رہی ہے اور اسلام کی علمی سرمایہ کی حفاظت کی گئی ہے ٹھیک اسی طرح سے عملی اسلام کے خدوخال بھی آج محفوظ ہیں اور ہر دور میں حق تعالےٰ امتِ محمدیہ کی کسی ایک جماعت کو حق پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرماتا رہتا ہے تاکہ عملی نقشہ بھی سامنے رہے، چنانچہ صحیح بخاری شریف کی ایک حدیث میں بروایت حضرت امیر معاویہ صاف اعلان فرمایا گیا ہے:

ولا تزال طائفة من اُمتی ظاهرین	یعنی قیامت تک ایک جماعت ہمیشہ حق پر عمل کرنے
علی الحق لا یضرّهم من خالفهم	والی موجود رہے گی مخالفین و دشمنانِ اسلام کی تدبیروں

من خذلهم حتی یأتی أمر الله وھم   سے ان کو کوئی ضرر نہ پہنچ سکے گا۔
علیٰ ذلك أوکما قال ۔

بہرحال یہ جو کچھ بھی ہے صرف شخصی اسلامی زندگی کا نقشہ ہے افرادِ امت میں ہمیشہ ایسے ملیں گے، لیکن جہاں تک تعلق پورے معاشرے اور مسلمان حکومتوں کا ہے، افسوس کہ ان میں تمام اسلامی آثار و نشانات مٹتے جارہے ہیں مراکش و الجزائر و ٹیونس سے لے کر انڈونیشیا تک تمام ممالکِ اسلامیہ میں اسلام کی حیثیت ایک اجنبی مسافر کی ہے صحیح قانونِ اسلام ہر حکومت میں تقریباً ختم ہے دو ملک البتہ ایسے ہیں جہاں کچھ کچھ آثار باقی ہیں مملکت عربیہ سعودیہ اور مملکتِ افغانستان اور کسی قدر مملکتِ لیبیا لیکن معاشرے کا حُلیہ ان ممالک میں بھی بگڑتا جارہا ہے، اس مغربی تمدن و تہذیب کا پنجہ اتنا شدید ہے کہ کوئی مملکت بھی اس کی گرفت سے باہر نہیں۔

خیر ہمیں تو اپنے وطن اور اپنی مملکت کی فکر ہونی چاہیئے انتہائی افسوس ہے کہ جو توقعات تھیں وہ سب خاک میں مل گئیں اور دشمنانِ اسلام کی تدبیریں پورے طور پر کارگر ہوگئیں صدمہ صرف اس کا ہے کہ یہ تمام تخریب اسلام کے نام پر کی جارہی ہے۔

حکومتوں کی اصلاح کے لئے صحیح راستہ

تجربہ کے بعد یہ محسوس ہوا کہ حکومتوں کی اصلاح کے سیاسی راستے بیکار ہیں انتخابات میں حصہ، جلسے، جلوس، مظاہرے، پروپیگنڈے، اخبارات کے ذریعہ اصلاح کی توقع یہ حربے بے اثر اور بے نتیجہ ہیں ان کے اثرات اگر ہوتے بھی ہیں تو دیرپا نہیں ہوتے سطحی اور وقتی ہوتے ہیں، چند افراد اگر اسمبلی میں شدید جدوجہد کے بعد پہنچ بھی گئے تو نقارہ خانے میں طوطی کی آواز سے ان کی حیثیت زیادہ نہیں ہوتی، بارہا یہ تجربہ ہو چکا ہے ؏۔

مَن جرّب المجرّب حلّت   یعنی تجربہ کے بعد بھی عبرت حاصل نہ کرنا
به الندامة ۔   ندامت کا باعث ہے۔

اب تو تمام مرکزِ توجہ عوام کی انفرادی اصلاح ہونی چاہیئے، اس کے بعد معاشرے کی اصلاح پر توجہ دینے کی ضرورت ہے اگر عوام کی اصلاح ہو جاتی ہے تو ظاہر ہے کہ انہی میں سے اربابِ اقتدار آئیں گے انہی میں سے ارکانِ اسمبلی ہوں گے اور ظاہر ہے کہ اگر جمہورِ امت کے رجحانات صحیح

ہوں گے تو اقتدار کے خواہاں اور کرسی کے خواہش مند مجبور ہوں گے کہ وہ ایسے طریقے اور لائحہ عمل اختیار کریں جس پر عوام سے خراج تحسین مل سکے، ضرورت اس کی ہے کہ اسلام کے علمبرداروں کی پوری جدوجہد افراد اور معاشرے کی اصلاح کے رُخ پر ہونی چاہیئے، بلاشبہ راستہ طویل ہے وقت زیادہ لگے گا لیکن اگر کوئی امید اصلاح کی ہو سکتی ہے تو اسی صورت میں

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

اب ضرورت اس کی ہے کہ پُرسکون طریقے پر دعوت الی اللہ کا پیغام ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا جائے اور بازاروں، دکانوں، دفتروں سے لے کر اسکولوں، کالجوں، اور یونیورسٹیوں تک اس کے دائرے کو وسیع بنا دیا جائے، اللہ تعالےٰ توفیق عطا فرمائے۔

جمادی الاولیٰ ۱۳۸۸ھ

حدیث النکاح من سنّتی کی تحقیق

کراچی کے ایک اہلِ حدیث عالم کا جنہیں مولانا بنوری سے مخلصانہ تعلق ہے، خیال ہے کہ خطبۂ نکاح میں جو حدیث النکاح من سنتی ۔ فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ پڑھی جاتی ہے نہ یہ حدیث صحیح ہے، نہ اس کا پڑھنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، اس لئے اس کا پڑھنا بدعت ہے، ان کے استفسار پر مولانا مدظلہ نے جو تحقیق فرمائی ہے وہ اہلِ علم کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔

بخدمت گرامی حضرت مولانا ۔ ۔ ۔ ۔ صاحب، زیدت معالیہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

دو نامے مسلسل پہنچے، میں انتہائی مشغول تھا اور ہوں، اس لئے جواب میں تاخیر وتقصیر ہوئی، اس کے لئے معذرت خواہ ہوں، اب اختصار کے ساتھ جواب عرض کرتا ہوں۔

سوال :- النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی یہ حدیث باسناد صحیح کہاں مروی ہے (خلاصہ)

الجواب :- یہ ایک حدیث نہیں بلکہ دو حدیثیں ہیں : النکاح من سنتی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے سننِ ابن ماجہ میں مروی ہے[1] اس کی اسناد اگرچہ متکلم فیہ ہے مگر شواہد کثرت سے موجود ہیں[2]۔ بنابریں اگرچہ اس کی مخصوص اسناد "صحیح" نہیں ہے لیکن معنی بالکل صحیح ہیں اور شواہد صحیحہ کی بنا پر یہ حدیث بسندِ مخصوص "صحیح لغیرہ" کے حکم میں ہوگی۔

---

[1] باب ماجاء فی فضل النکاح (ص ۱۳۴)، حدثنا احمد بن الازہر، ثنا آدم، ثنا عیسی بن میمون عن القاسم عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : النکاح من سنتی فمن لم یعمل بسنتی فلیس منی ،، الحدیث۔

[2] فمنها : قولہ تعالیٰ : ولقد ارسلنا رسلاً من قبلک وجعلنا لهم ازواجاً وذریۃ (الرعد ع ۶)

ومنها : حدیث ثلاثۃ رھط جاءوا الی بیوت ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسئلون عن عبادۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلما اخبروا کانهم تقالوها (رواہ الشیخان وغیرهما من حدیث انس)

ومنها : حدیث ابی ایوب : اربع من سنن المرسلین الحیاء والتعطر والسواک والنکاح (رواہ الترمذی بقیہ صہ پر)

"فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي"۔ یہ حدیث انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے مرفوعاً صحیح بخاری شریف میں موجود ہے[1] ظاہر ہے کہ اس کی صحت میں کلام نہیں اور نہ ہو سکتا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے بھی "التلخیص الحبیر" میں اس پر تنبیہ کی ہے اور اسی طرح ذکر کیا ہے، نیز کسی حدیث کے حدیث ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ صحیح اصطلاحی ہو، حسن بھی حدیث ہے، ضعیف بھی حدیث ہے اور ہر مسئلہ میں صحیح حدیث ہوتی بھی نہیں، نہ کبھی علماء و فقہا اور محدثین نے اسے شرط قرار دیا ہے بلکہ بسا اوقات حسن وغیرہ سے بھی تمام محدثین اُمت استدلال کرتے چلے آرہے ہیں[3]۔ بہرحال جب یہ دو حدیثیں ہوئیں تو پڑھنے کا صحیح طریقہ یہ ہونا چاہیئے کہ شروع میں قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر حدیث: "النکاح من سنتی" پڑھی جائے، پھر دوبارہ وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کہہ کر دوسری حدیث "فمن رغب عن سنتی فلیس منی" کو پڑھا جائے اور میں ہمیشہ اسی طرح ہی پڑھتا ہوں، یہ سب کچھ یاد سے لکھ رہا ہوں اس لئے ابن ماجہ صحیح البخاری اور "التلخیص الحبیر" کا صفحہ نمبر نہیں لکھا، اگر ضرورت ہوئی لکھ دیا جائے گا۔

سوال:۔ اس کا ثبوت دیا جائے کہ یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس خطبہ میں پڑھی تھی؟

الجواب:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑھنا ضروری نہیں، حدیث ہونا کافی ہے، خطبۂ حاجت و خطبۂ نکاح جو ترمذی وغیرہ کی احادیث میں آیا ہے اس کا مطلب اتنا ہے کہ حمد و شہادتین سے خطبہ شروع ہونا چاہیئے، آیتِ تقویٰ والی حدیث جامع ترمذی کی اسناد محدثین کے اصول پر صحیح نہیں

بقیہ حاشیہ ص سے آگے) ومنها: حديث عبيد بن سعد يبلغ به النبي صلى الله عليه وسلم قال: من أحبَّ فطرتي فليستن بسنتي ومن سنتي النكاح. (رواه أبو يعلى ورجاله ثقات إن كان عبيد بن سعد صحابياً وإلا فهو مرسل. قاله الهيثمي ص ۲۵۲) وما إلى ذلك من الأحاديث والآثار.

[1] باب الترغیب فی النکاح (۲-۷۵۷)

[3] حدیث حسن بالاتفاق حجت ہے اس لئے حسن کو کسی بھی مسئلہ میں نہ ماننا اور ہر جگہ صحیح اصطلاحی کا مطالبہ کرنا گویا خرقِ اجماع ہے، البتہ حدیث ضعیف حلال و حرام میں حجت نہیں اور فضائل کے باب میں تسامحاً اس پر عمل جائز ہے جب کہ تین شرطیں اس میں پائی جائیں۔ (باقی ص پر)

ہے، زیادہ سے زیادہ حسن کا درجہ رکھتی ہے اس لئے کہ وہ روایت ابو عبیدہ عن عبداللہ بن مسعود کی سند سے مروی ہے اور ابو عبیدہ کا سماع عبداللہ سے ثابت نہیں، اس لئے محدثین کے نزدیک منقطع ہے اور منقطع حدیث صحیح نہیں ہوتی بلکہ ضعیف ہوتی ہے، حاکمؒ نے مستدرک میں ابن مسعود کی جو حدیث روایت کی ہے اس میں آیتِ تقویٰ کا ذکر نہیں [1] اس لئے بھی محلِ نظر ہو گیا اگر مثبت کو ترجیح دی جائے، تب بھی اتنا ثبوت تو مل گیا ہے کہ خطبۂ نکاح میں اگر یہی مضمون ضروری ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کا التزام فرماتے، حالانکہ ابو درداء کی روایت میں حمد و ثنا شہادتین کے الفاظ بھی اور ہیں، نیز حضرتِ فاطمہ اور حضرتِ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے عقدِ نکاح کا خطبہ مرفوعاً ثابت ہے وہ بالکل اور خطبہ ہے [2]، ان تمام شواہد سے معلوم ہوا کہ خطبۂ نکاح میں صرف آیات و احادیث کا ذکر ضروری یا مندوب ہے، کوئی خاص قسم کے الفاظ مطلوب نہیں اور تمام اُمت کے نزدیک حکم ہے کہ نفس خطبہ نکاح بھی مندوب اور مستحب ہے واجب نہیں ہے [3]۔ اس لئے ان ماثورہ خطبوں میں سے کوئی بھی ہو اس کا التزام مستحب تو ہے مگر واجب یا سنت مؤکدہ نہیں، پھر جب حمد و ثناء، شہادتین اور آیاتِ تقویٰ پڑھ لی گئیں تو اصلی سنت ادا ہو گئی، اس کے بعد مزید ترغیب و تذکیر کی نیت سے احادیث ماثورہ کا پڑھنا مجتہدانہ ذوق کے پیشِ نظر عین منشاءِ حدیث ہے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مختلف خطبات پڑھنا اور فرمانا اس کی دلیل ہے کہ خطبۂ نکاح میں اصل مقصود حمد و ثنا، شہادتین اور نکاح سے متعلقہ آیات و احادیث کا ذکر ہے، پھر جب اصلی سنت ادا ہو گئی اور مسنون اور مستحب درجہ پورا ہو گیا تو اس پر آیات

(بقیہ حاشیہ صفحہ سے آگے) (۱) شدید نکارت نہ رکھتی ہو بلکہ اس کا ضعف قابل تحمل ہو (۲) قواعد شرعیہ، سنت ثابتہ اور اجماعِ امت کے خلاف نہ ہو (۳) اس پر عمل کرتے ہوئے اس کی سنیت کا عقیدہ نہ رکھا جائے۔ واللہ اعلم

[1] قال الحافظ فی التلخیص الحبیر (۳-۱۵۲): وقد رواہ الحاکم من طریق آخر عن قتادۃ عن عبد ربہ عن أبی عیاض عن ابن مسعود، ولیس فیہ الآیات." وذکرہ الشوکانی فی النیل".

[2] اس خطبہ کا پورا متن علامہ قسطلانی نے "مواہبِ لدنیہ" میں نقل کیا ہے۔

[3] أخرج أبو داؤد عن رجل من بنی سلیم قال خطبت إلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أمامۃ بنت عبد المطلب فانکحنی من غیر أن تیشھد.

واحادیث تذکیر کے اضافہ کو خلافِ سنت کہنا بہت بے انصافی ہے یا سطحی قسم کا غیر مفتیانہ ذوق ہے اور اگر بالفرض خطبۂ نکاح میں الفاظ ماثورہ پر اقتصار ہی کو مستحب تسلیم کر لیا جائے تب بھی آیات واحادیثِ مناسبہ کے اضافہ کو زیادہ سے زیادہ "ترکِ مستحب" کا درجہ دیا جا سکے گا، اب اگر کوئی مستحب کو کرتا ہے، تو ترکِ مستحب پر اعتراض در کرکرنا، بالخصوص جب کہ وہ فتنہ کا باعث ہو، کیونکہ صحیح ہو سکتا ہے اور کسی مستحب کے ترک پر اعتراض کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اعتراض کنندہ اس "مستحب" کو "واجب" سمجھتا ہے اور جس مستحب کو واجب سمجھ لیا گیا خود اس کا ترک از روئے حدیث واجب ہے، اللہ تعالےٰ صحیح فہم عطا فرمائے۔

بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف خطبے قولاً و عملاً ثابت ہیں اور قدرِ مشترک حمد و ثناء و شہادتین اور متعلقاتِ نکاح کا ذکر کرنا ہے اور بس۔

جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ جولائی ۱۹۷۰ء

عدل وانصاف کی اہمیّت

صحیح بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ان سات اشخاص کا ذکر آیا ہے جو قیامت کے دن عرشِ الٰہی کے سائے میں ہوں گے، ان میں سرِفہرست "امامِ عادل" کا نام آتا ہے:۔

عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال:۔ «سبعۃٌ یظلّھم اللہ فی ظلّہٖ یوم لا ظلّ إلّا ظلّہ، إمام عادل وشاب نشأ فی عبادۃ اللہ، ورجل معلق قلبہ فی المساجد، ورجلان تحابّا فی اللہ اجتمعا علیہ وتفرقا علیہ، ورجل دعتہ امرأۃ ذات منصب وجمال فقال: إنی أخاف اللہ، ورجل تصدق بصدقۃٍ فأخفاھا حتی لا تعلم شمالہٗ ما تنفق یمینہٗ، ورجل ذکر اللہ خالیاً ففاضت عیناہ»[۱]	حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سات آدمی ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے (عرش) کے سائے میں جگہ دے گا جس دن کہ اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا[۱] عادل بادشاہ،[۲] وہ جوان جو اللہ کی عبادت میں پلا بڑھا ہو[۳] وہ آدمی جس کا دل مسجد میں لٹکا ہوا رہتا ہے[۴] ایسے دو آدمی جن کی محبت محض اللہ کی خاطر تھی، اسی کے لئے جمع ہوئے اور اسی پر جدا ہوئے[۵] وہ آدمی جس کو کسی صاحبِ حسب و جمال عورت نے دعوت دی تو اس نے کہا مجھے خدا کا خوف ہے[۶] وہ آدمی جس نے اس قدر چھپا کر صدقہ کیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہوئی اور[۷] وہ آدمی جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا تو آنکھیں ابل پڑیں۔

عدل درحقیقت اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی عظیم الشان صفت ہے، قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:۔

«شھد اللہ أنہٗ لا إلٰہ إلا ھو والملٰئکۃ وأولوا العلم قائماً بالقسط لا إلٰہ إلا ھو العزیز الحکیم»[۲]	اللہ نے گواہی دی کہ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی وہی حاکم انصاف کا ہے کسی کی بندگی نہیں سوا اس کے زبردست ہے حکمت والا۔

---

[۱] صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۹۱ [۲] آل عمران ۱۸

حق تعالیٰ شانہٗ خود عادل ہے اس کا نازل کردہ قانون (شریعتِ محمدیہ) سراپا عدل ہے اس لئے بے شمار آیتوں میں بندوں کو عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے اور اس میں ایسی باریکیوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ عقل حیران ہے۔

قرابت کے موقعہ پر بڑے سے بڑے انصاف پرور کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور وہ جنبہ داری کی خاطر عدل و انصاف کا دامن چھوڑ دیتا ہے مگر فرزندانِ اسلام سے ایسی نازک صورت حال میں بھی عدل و انصاف قائم رکھنے کا عہد لیا گیا ہے:۔

«یا أیها الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شهداء لله ولو علی أنفسکم أو الوالدین والأقربین إن یکن غنیاً أو فقیراً فالله أولی بهما، فلا تتبعوا الهوی أن تعدلوا» [1]

اے ایمان والو! قائم رہو انصاف پر، گواہی دو اللہ کی طرف کی، اگرچہ نقصان ہو تمہارا یا ماں باپ کا یا قرابت والوں کا، اگر کوئی مالدار ہے یا محتاج ہے تو اللہ ان کا خیر خواہ تم سے زیادہ ہے سو تم پیروی نہ کرو دل کی خواہش کی انصاف کرنے میں۔

اسی طرح جب کسی سے بغض و عداوت ہو تو عدل و انصاف کے تقاضے عموماً بالائے طاق رکھ دیئے جاتے ہیں اور اپنے حریف کو نیچا دکھانے کے لئے آدمی ہر جائز و ناجائز حربہ تلاش کرتا ہے لیکن احکم الحاکمین کی جانب سے مسلمانوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ ایسے موقعہ پر بھی عدل و انصاف کی ترازو ہاتھ سے نہ چھوڑیں بلکہ ہر حال میں عدل و انصاف کو قائم رکھیں:۔

«یا أیها الذین آمنوا کونوا قوامین لله شهداء بالقسط ولا یجرمنکم شنآن قوم علی أن لا تعدلوا، اعدلوا هو أقرب للتقوی واتقوا الله إن الله خبیر بما تعملون» [2]

اے ایمان والو! کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے گواہی دینے کو اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو عدل کرو، یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے اور ڈرتے رہو اللہ سے، اللہ کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو۔

نظامِ عالم اور عدل و انصاف

در اصل کائنات کا نظام ہی عدل و انصاف سے وابستہ ہے نظامِ عالم کے لئے عدل و انصاف سے بڑھ کر اور کوئی چیز ضروری نہیں بلاشبہ حاکمِ عادل کا وجود اس عالم کے لئے سایۂ رحمتِ الٰہی ہے اور کسی عدل

---

[1] النساء ۱۳۵ [2] المائدہ ۸

کش حاکم کا تسلط عذابِ الٰہی ہے جو بندوں کی نافرمانیوں کی پاداشں میں ان پر نازل کیا جاتا ہے:۔

ع "شامتِ اعمال ماصورتِ نادر گرفت"

کسی زمانے میں مطلق العنان بادشاہ کو "من لمن الملک" بجلتے تھے اور آئین وقانون ان کے اشاروں پر رقص کرتا تھا لیکن دورِ جدید نے ملوکیت کو جمہوریت میں بدل ڈالا، آئین ودستور وضع کئے گئے، بادشاہت کی جگہ کہیں صدارتی نظام رائج ہوا اور کہیں وزارتی نظام نافذ کیا گیا، گویا دورِ قدیم کے "شہنشاہ" کا منصب دورِ جدید کے صدرِ مملکت یا وزیرِ اعظم کو تفویض ہوا، فرق یہ پڑا کہ دورِ قدیم میں بادشاہ اوپر سے آتے تھے اور دورِ جدید میں نیچے سے جاتے ہیں لیکن عدل وانصاف محض ملوکیت یا آج کی جمہوریت کا نام نہیں بلکہ اس کا مدار خدا ترس اور عدل پرور اربابِ اقتدار پر ہے، حاکمِ اعلیٰ عدل وانصاف کے جوہر سے مالامال ہو تو ملوکیت بھی رحمت ہے یہ نہ ہو تو جمہوریت بھی چنگیزی کا روپ دھار لیتی ہے جس طرح مملکت کی آبادی وشادابی عدل وانصاف سے وابستہ ہے اسی طرح اشخاص کی بقا وفلاح عدل وانصاف کی رہینِ منت ہے۔

قوموں اور ملکوں کی تباہی کے اسباب

کسی مملکت کی تباہی وبربادی کے عوامل کا جائزہ لیجئے تو دو بنیادی چیزیں سامنے آئیں گی:۔ قوم[۱] کا فسق وفجور اور حکمرانوں[۲] کا ظلم وعدوان، جب کوئی قوم خدا فراموشی کی روش اختیار کرتی ہے، الٰہی قوانین سے سرکشی کرتی ہے اور فسق ومعصیت کے نشہ میں بدمست ہو کر حلال وحرام اور جائز وناجائز کے حدود علانیہ توڑنے لگتی ہے تو ان پر جفا کیش اور جابر وظالم حاکم مسلط کر دیئے جاتے ہیں، قرآنِ کریم میں کسی قوم کی تباہی وبربادی کے بارے میں ایک قانونِ عام بیان فرمایا ہے:۔

«وإذا أردنا أن نهلك قرية أمرنا مترفيها ففسقوا فيها فحق عليها القول فدمرناها تدميرا»[۱]	اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش عیش لوگوں کو حکم دیتے ہیں پھر جب وہ لوگ وہاں شرارت مچاتے ہیں تب ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے، پھر اس بستی کو تباہ اور غارت کر ڈالتے ہیں۔

---

[۱] بنی اسرائیل -۱۶

قوم کا فسق و فجور اور ملوک و سلاطین کا ظلم ہی سب سے پہلے اس عالم کی تباہی و بربادی کا ذریعہ بنتا ہے، ظلم و استبداد کی چکی میں پہلے سرکش قوم پستی ہے، بالآخر یہی چکی ظالم و جابر کو بھی پیس ڈالتی ہے، اہلِ دانش کا قول ہے کہ کفر کے ساتھ حکومت رہ سکتی ہے مگر ظلم و استبداد کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔

درحقیقت کائنات کا حقیقی تصرف و اقتدار اللہ رب العالمین اور احکم الحاکمین کے ہاتھ میں ہے، حدیث میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ ظالم کو چندے مہلت دیتا ہے لیکن جب اسے پکڑتا ہے تو پھر اسے نہیں چھوڑتا" یہی وجہ ہے کہ ظالم حکمران زیادہ دیر تک مسندِ اقتدار پر نہیں رہ سکتا بلکہ دوسروں کے لئے درسِ عبرت بن کر بہت جلد رخصت ہو جاتا ہے، تاریک دور کے فرعون و ہامان اور شداد و نمرود کو جانے دو، ماضی قریب میں اسٹالن، ہٹلر اور مسولینی وغیرہ کا عبرت ناک حشر کس نے نہیں دیکھا اور برطانیہ کا حشر بھی سب کے سامنے ہے وہ ظالم جس کی بادشاہی میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا، آج سمٹ سمٹا کر ایک چھوٹے سے جزیرے میں پناہ گزین ہے، خود ہماری مملکتِ خداداد پاکستان کی چھوٹی سی عمر میں جابر حکمرانوں کی بے بسی کے عبرتناک مظاہر سامنے آتے رہے ہیں کیا سکندر مرزا غلام محمد، ایوب خاں اور یحییٰ خاں کے قصوں کو دنیا بھول جائے گی۔

حکومت کی بقاء کے لئے عدل و انصاف ضروری ہے

بہرحال بقائے مملکت اور بقائے حکومت کے لئے بے حد ضروری ہے کہ اربابِ اقتدار عدل و انصاف کو قائم کریں اور قوم فسق و معصیت کا راستہ ترک کر کے انابت اور رجوع الی اللہ کا راستہ اختیار کرے، دنیا کی تاریخ بالعموم اور اسلامی تاریخ بالخصوص اس حقیقت پر شاہد ہے کہ مسلمان قوم کو من حیث القوم نا ؤ نوش، فسق و فجور اور فحاشی و بدکاری کبھی راس نہیں آئی اور اس کا انجام ہمیشہ ہولناک ہوا، پاکستان کی پاک سرزمین جو حق تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی اس کا تقاضا یہ تھا کہ یہاں عدل و انصاف کا دور دورہ ہوتا، پاکیزہ معاشرہ وجود میں آتا، تقویٰ و طہارت کی فضا قائم ہوتی، راعی اور رعایا اسلام کا سچا نمونہ پیش کرتے اور یہ مملکتِ خداداد دورِ جدید میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی علمبردار ہوتی لیکن افسوس صد افسوس کہ ؎ "خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم"

یہاں نہ صرف یہ کہ دورِ غلامی کے تمام آثارِ کفر کو جوں کا توں باقی رہنے دیا گیا بلکہ آزادی کے بعد یہ فرض کر لیا گیا کہ ہم خدا اور رسول سے بھی آزاد ہیں، سود قمار اور دیگر صریح محرمات کو حلال کرنے کی کوشش کی گئی، فواحش و منکرات کی ترویج کی گئی، سینما، ریڈیو، ٹیلی ویژن کو بے حیائی کا منادبنا دیا گیا، رہی سہی کسر اخبارات نے پوری کر دی، شعائرِ دین کا مذاق اڑایا گیا، اسلامی قوانین کو مسخ کیا گیا، دین کے قزاقوں کو کھل کھیلنے کا موقعہ دیا گیا، بے خدا قوموں کی تقلید میں آزادیٔ نسواں کا پرچار کیا گیا، اسلام کے مقابلہ میں نئے نئے ازموں کے نعرے لگائے گئے اور اب تو خدا فراموشی کی حالت ایسی ناگفتہ بہ صورت اختیار کر چکی کہ اس کے انجام کا تصور کر کے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہ ایک فطری اصول ہے کہ جرم انفرادی ہو تو اس کی سزا بھی افراد تک محدود رہتی ہے اور جب قوم کی قوم ہی جرم و بغاوت کا راستہ اختیار کرے تو اس کی سزا بھی عام ہوتی ہے، یہ سزا ہمیں ایک بار سقوطِ مشرق کی صورت میں مل چکی اور ابھی یہ زخم مندمل نہیں ہو پایا تھا کہ سزا کی دوسری قسط کے خطرات سر پر منڈلانے لگے۔

مسلمان قوم سے اسلام کی رُوح نکلنے کا نتیجہ

جس طرح روح نکل جانے کے بعد لاشۂ بے جان اپنے وجود کو محفوظ نہیں رکھ سکتا بلکہ اس کے اعضاء میں انحلال و انفصال کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور بالآخر سڑ گل کر منتشر ہو جاتا ہے ٹھیک اسی طرح مسلمان قوم سے اسلام کی روح نکل جائے تو نتیجہ انحلال و انتشار کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ شدید خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ جس طرح امریکہ روس اور ہندوستان کی سازش سے ہم اپنے ملک کے ایک بڑے حصہ سے محروم ہو بیٹھے ہیں اسی طرح خاکم بدہن۔ مزید تباہی و بربادی سے دوچار نہ ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ عقلوں پر کیسے پردے آجاتے ہیں اور ان حقائق سے کیوں عبرت نہیں لی جاتی، ایک طرف پورا ملک بے چینی و بے قراری کا شکار ہے بیم و یاس کی کیفیت طاری ہے، ہوشربا گرانی سے کمر ٹوٹ رہی ہے، خیر و برکت اٹھ چکی ہے یہی خطۂ زمین جو دوسرے علاقوں کو غلہ فراہم کرتا تھا خود دانے دانے کے لئے دریوزہ گر ہے ہر چیز کا قحط ہے باہمی الفت و محبت اور اتحاد و اعتماد نصیبِ دشمناں ہے۔ رشوت، لالچ، چور بازاری، سٹہ بازی جیسے امراض دق کی

طرح چمٹے ہوئے ہیں، چوری اور ڈاکے کی وارداتیں روز مرہ کا معمول بن چکی ہیں، کیا یہ سب عذاب الٰہی کی شکلیں نہیں؟ صد حیف کہ ان تنبیہات سے سبق نہیں لیا جاتا بلکہ فواحش ومنکرات میں روزافزوں اضافہ ہورہا ہے، کلبوں اور ناچ گھروں میں عریانی بے حیائی کے دردناک مظاہر ہیں، ظلم وبربریت کی آخری حدوں کو چھویا جارہا ہے، غفلت وخدافراموشی کا نشہ دن بدن تیز سے تیز تر ہوتا جارہا ہے. آخر حق تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے والی زندگی کب تک برداشت کی جائے گی؟ اور انتقام الٰہی کی بے آواز لاٹھی کب تک تھمی رہے گی؟ گذشتہ بے خدا قوموں کے بارے میں فرمایا ہے:۔

«الذین طغوا فی البلاد، فاکثروا فیہا الفساد، فصبّ علیہم ربک سوط عذاب، إن ربک لبالمرصاد»	یہ سب وہ تھے جنہوں نے زمین میں سرکشی کی، پس اس میں بہت اودھم مچایا، پھر برسایا ان پر تیرے رب نے کوڑا عذاب کا، بلاشبہ تیرا رب گھات میں ہے.

ان تمام دردناک صورتِ حال سے نجات حاصل کرنے کے لئے ازبس ضروری ہے کہ راعی اور رعایا بارگاہِ ربوبیت میں توبہ وانابت اختیار کریں، اجتماعی معاصی سے یکسر پرہیز کریں اور گذشتہ گناہوں پر بارگاہِ رحمت میں توبہ واستغفار کریں، اسلامی شعائر کو بلند کریں اور غیر اسلامی نشانات کو پامال کریں، سورۂ نوح میں اس قسم کے معاصی کی کثرت سے قحط وتنگ سالی جیسے عذاب کا نازل ہونا اور اس کا علاج توبہ واستغفار بتایا گیا ہے:۔

«فقلت استغفروا ربکم إنہٗ کان غفاراً یرسل السماء علیکم مدراراً ویمددکم بأموال وبنین ویجعل لکم جنٰتٍ ویجعل لکم أنہاراً»	(نوح علیہ السلام بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے ہیں کہ قوم سے خطاب کرتے ہوئے) میں نے کہا: گناہ بخشواؤ اپنے رب سے بے شک وہ ہے بخشنے والا، چھوڑ دے گا تم پر آسمان کی دھاریں اور بڑھا دے گا تم کو مال اور بیٹوں سے اور بنا دے گا تمہارے واسطے باغ اور بنا دے گا تمہارے لئے نہریں.

مقصد یہ کہ توبہ وانابت کی برکت سے نہ صرف آخرت کی کامیابی وکامرانی نصیب ہوگی بلکہ دنیا کے عیش وآرام کی صورتیں بھی اللہ تعالےٰ اپنے فضل واحسان سے مہیا فرمادیں گے، دلوں کو سکون واطمینان نصیب ہوگا، اموال میں خیر وبرکت ہوگی، اولاد صالح اور خدمت گار

ہو گی، آسمان سے ابر رحمت کا نزول ہو گا، پھلوں اور غلوں کی کثرت اور بہتات ہو گی، فرصت کے لمحات بہت مختصر ہیں اور فیصلے کی گھڑی سر پر آئی کھڑی ہے اس لئے ہمیں موجودہ حالات کا صحیح علاج فوراً کر لینا چاہیئے ورنہ ہماری ظاہری اور سطحی تدبیریں سب ناکام ہوں گی، اللہ تعالےٰ ہم پر رحمت فرمائے، ہماری قوم کو فسق و فجور اور حکمرانوں کو ظلم و عدوان سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے،

ربنا اغفر لنا ذنوبنا وإسرافنا في أمرنا وثبت أقدامنا وانصرنا على القوم الكافرين، ربنا ظلمنا أنفسنا وإن لم تغفر لنا وترحمنا لنكونن من الخاسرين.

وصلى الله تعالى على خير خلقه صفوة البرية سيدنا محمدٍ وعلى آله وأصحابه وأتباعه إلى يوم الدين.

ربیع الاوّل ۱۳۹۵ھ ، اپریل ۱۹۷۵ء

دُنیا و آخرت

حضرت مولانا رحمہ اللہ کی یہ تقریر اسلامیہ کالج پشاور کی جامع مسجد میں ۱۳۸۷ھ میں ہوئی تھی جسے ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ محفوظ کر لیا گیا تھا چونکہ سفرِ حج کی وجہ سے حضرت مولانا رحمہ اللہ محرم ۱۳۸۸ھ کے لئے بصائر و عبر نہیں لکھ سکے تھے لہٰذا بصائر و عبر کی جگہ تقریر کو چار اقساط میں پیش کیا گیا، ہم مولانا محمد اشرف صاحب مدظلہ (صدر شعبہ عربی اسلامیہ کالج پشاور) کے ممنون ہیں کہ یہ تقریر ان ہی کی دعوت پر ہوئی اور ان کے ہی اہتمام سے ضبط کی گئی۔

خطبۂ مسنونہ، امابعد: فأعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

"اعلموا أنما الحیاۃ الدنیا لعب ولھو وزینۃ وتفاخر بینکم وتکاثر فی الأموال والأولاد کمثل غیث أعجب الکفار نباتہ، ثم یھیج فتراہ مصفراً ثم یکون حطاماً وفی الآخرۃ عذاب شدید، ومغفرۃ من اللہ ورضوان وما الحیاۃ الدنیا إلا متاع الغرور، سابقوا إلی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضھا کعرض السماء والأرض، أعدت للمتقین"

محترم بھائیو اور عزیز طلباء! حسنِ اتفاق سے آج میرے محترم اور مخلص مولانا محمد اشرف صاحب کی دعوت پر مجھے یہاں حاضری کا موقعہ ملا، زندگی میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ اس پاکیزہ مسجد میں آپ سے تخاطب کا شرف حاصل کر رہا ہوں، میں اس سرزمین سے آوارہ وطن ہو کر یہاں سے بہت دور چلا گیا ہوں اس لئے مجھے صدمہ ہے کہ یہاں کے عزیز بھائیوں کی خدمت کا مجھے موقعہ نہیں ملتا نہ ان کے دینی عواطف بھڑکانے کا، نہ اپنے جذبات و عواطف پیش کرنے کا، نہ ان سے دردِ دل سننے کا، نہ اپنی بات سنانے کا نہ انہیں تڑپانے کا، نہ اپنی تڑپ کے اظہار کا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے اپنے وطن میں اپنے بھائیوں کے ساتھ مل بیٹھنے کے چند لمحے آج میسر آئے، اس لئے مجھے ممنون ہونا چاہیئے اپنے محترم مولانا محمد اشرف صاحب کا جنہوں نے مجھے یہ موقعہ دیا کہ میں آپ کو اپنے دردِ دل کی کہانی سناؤں اور آپ کو بھی اپنے غم میں شریک کر سکوں۔

نبی کسے کہتے ہیں

عزیز بھائیو! انسان کی زندگی ایک مقصد سے وابستہ ہے، اگر وہ مقصد پیشِ نظر رہے تو کامیابی ہی کامیابی ہے، ہم اس کے مکلف ہیں کہ ہم منزلِ مقصود کو پہچانیں اور صحیح رہنمائی میں وہاں تک پہنچنے کی امکانی کوشش کریں، پہنچنا یا نہ پہنچنا ہمارا کام نہیں بلکہ نتیجہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اگر ہم زندگی میں منزلِ مقصود تک پہنچنے میں بظاہر ناکام بھی رہے ہوں تب بھی انشاءاللہ کامیاب ہیں، دیکھئے دنیا میں تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار (یا کم وبیش) پیغمبر تشریف لائے (ہاں درمیان میں اتنا عرض کردوں کہ) جسے ہم "پیغمبر" کہتے ہیں اس کی حقیقت پہچان ہی نہیں سکتے، نہ "پیغمبر" مصلح، ریفارمر جیسے کسی لفظ سے اس حقیقت کو ادا کیا جاسکتا ہے، انبیاء کرام علیہم السلام کی بلندی اور حقیقتِ نبوت کی طرف راہنمائی سے ہمارے الفاظ قاصر اور ناتمام ہیں، ہماری کسی زبان میں خواہ انگریزی ہو یا اردو، پشتو ہو یا فارسی، کوئی لفظ نہیں اور نہ اس کی گنجائش ہے جو "نبی ورسول" اور "نبوت ورسالت" کے مفہوم کو ٹھیک ٹھیک ادا کردے۔ تفصیلات سے قطع نظر میں یہاں اس کی طرف مختصر اشارہ کرتا ہوں۔

لغتِ عرب میں "نبی" کے معنی ہیں نبأ (خبر) دینے والی شخصیت، لیکن شریعت نے جس ذات کے لئے یہ لفظ استعمال کیا ہے اس کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ رب العالمین جلّ ذکرہ نے ازل سے اس کو اپنے اور بندوں کے درمیان واسطہ بنانے کے لئے منتخب فرمایا ہو، قدرت اس کی پرورش کررہی ہو ولتصنع علی عینی، اس کو ہر طرح معصوم بنایا گیا ہو، وہ نفس وشیطان کے تمام غوائل سے محفوظ ہو، اس کا امکان نہیں کہ وہ عقل وشہوت کی خواہش میں گمراہ ہوسکے اس کا کوئی امکان نہیں کہ نفس وشیطان کے وساوس سے منزلِ مقصود اس سے محجوب ہوسکے، ایک ایسی ہستی جسے رب العالمین اپنے اور اپنی مخلوق کے درمیان واسطہ ہدایت بناتا ہے، اسے اپنا نمائندہ منتخب کرتا ہے، اسے معصوم الفطرت، معصوم العقل اور معصوم النفس پیدا کرتا ہے اس کے بعد وہ غیب کی خبر دیتا ہے، جسے وحی کہا جاتا ہے اور محققین اہلِ لغت لکھتے ہیں کہ نبأ کے معنیٰ ایسی خبر کے ہیں جو غیب سے ہو اور اس میں عظیم فائدہ ہو، اب نبی کے معنیٰ ہوئے بروہ معصوم ہستی جس کا قدرت نے ازل ہی سے انتخاب فرمایا، وہ کسب سے

نہیں بنا، تعلیم سے نہیں بنا، محنت سے نہیں بنا، جدو جہد سے نہیں بنا، بلکہ اللہ تعالےٰ کی وہبی رحمت شاملِ حال ہوئی، اسی نے اس کا انتخاب کیا، اسی کی قدرت نے اس کی تربیت فرمائی۔ اسے نفس وشیطان کے غوائل سے ہر آن محفوظ رکھا، پھر اس کے پاس ایسی غیبی خبریں (وحی) بھیجیں جن میں سننے والوں کا عظیم فائدہ ہے، اب بتلائیے کہ لفظ "نبی" کا ترجمہ ہم کس لفظ سے کر سکتے ہیں۔

یہ تو ایک ضمنی بات تھی، میں یہ عرض کر رہا تھا کہ انبیاءِ کرام جو اس قدر عظمت اور درجہ رکھتے ہیں دنیا میں تشریف لائے اور انسانیت کے سامنے ایک دعوت پیش کی، دنیا کے اعتبار سے جسے ہم کامیابی و ناکامی سمجھتے ہیں، کوئی کامیاب ہے کوئی ناکام لیکن اپنے مقصد کے اعتبار سے سبھی اعلیٰ درجے کے کامیاب ہیں ان پر آرے چلے، ان کے بدن سے لوہے کی کنگھیاں نکالی گئیں ان کو ایذائیں دی گئیں، ان کو خدا جانے کیا کچھ کہا گیا، ان میں سے بعض کے ہاتھ پر ایک بھی شخص ایمان سے مشرف نہیں ہوا، لیکن اس کے باوجود نبی نبی ہے، رسول رسول ہے ان کے کمالات میں اس سے کمی نہیں ہوئی بلکہ ہر ایک مقصدِ زندگی میں کامیاب رہا، کیونکہ کام اللہ کا ہے نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے پس جب انبیاء کرامؑ کے بارے میں ہمارا تصور یہ ہے تو ہم اپنے بارے میں اس غلط فہمی میں کیوں مبتلا ہو جائیں کہ ہمیں مقصد تک پہنچنا ہے نہیں! ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ منزلِ مقصود کو ٹھیک ٹھیک پہچانیں اور وہاں تک پہنچنے کی جدوجہد کریں، پھر خواہ سیلاب کے تھپیڑوں سے نکل کر ساحلِ مراد تک پہنچ جائیں یا درمیان ہی میں شہید ہو کر رہ جائیں، بہر صورت گوہرِ مقصود حاصل ہے یہ اللہ کا کام ہے کہ جسے چاہیں ظاہری اعتبار سے بھی کامیاب بنا دیں جسے چاہیں ناکام کر دیں، منزل کی پہچان اور اس کی تگ و دو کے بعد ہم بہر حال کامیاب ہیں، یہی ہمارا مقصد ہے۔

زمین کی حقیقت

جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اس کے ترجمہ اور مضمون کو بیان کرنے سے پہلے ایک بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اس دنیا میں ہزاروں حقائق ایسے ہیں جن کی اصل حقیقت تک ہماری رسائی نہیں جبکہ صبح و شام ہمیں ان سے واسطہ رہتا ہے دیکھئے یہ زمین جس کے بارے

میں فرمایا گیا ہے ((منها خلقناكم وفيها نعيدكم ومنها نخرجكم تارة أخرىٰ))
(اسی سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اسی میں ہم تمہیں دوبارہ لوٹا دیں گے) اس سے بڑھ کر ہمیں کس چیز سے واسطہ ہوگا؟ اسی زمین سے ہم نکلے، اسی میں ہم جائیں گے، اسی زمین کے مادہ سے غذا تیار ہوئی، پھل اور میوے پیدا ہوئے وہ انسان کے اندر بنائی ہوئی ایک خدائی مشین، معدہ میں پہنچے، ہضم و تحلیل کے بعد جگر میں خون بنا، پھر خون اپنے مدارج طے کر کے سفید مادہ کی شکل بنا، وہ ایک عجیب و غریب نظام سے ایک جگہ پہنچا اور چند دنوں میں ایک جیتا جاگتا انسان پیدا ہو گیا، فتبارك الله أحسن الخالقين۔

یہ تو ہمارا اس زمین سے تعلق ہے مگر اسی زمین کی حقیقت آج تک ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں ہزاروں برس سے دنیا اس بطلیموس عقیدے پر قائم تھی کہ زمین ساکن ہے اور سورج متحرک مگر جدید سائنس نے اس نظریہ کو غلط ثابت کر دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ زمین شرقاً و غرباً گھومتی ہے اور سورج اپنی جگہ قائم رہتا ہے[1]. تو عقلاء کے ہزاروں برس اس غلط فہمی میں مبتلا رہنے سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اتنے قریب ترین حقائق جو ہمارے پاؤں کے نیچے اور آنکھوں کے سامنے ہیں زندگی میں ہمہ وقت ان سے سابقہ رہتا ہے، ہمیں ان حقائق تک بھی پوری رسائی نہیں اور ابھی تک قطعی فیصلہ نہیں کر پائے کہ یہ زمین ساکن ہے یا متحرک، آپ کو یاد ہوگا کہ جب سائنسدانوں کی ایک جماعت ارضی تحقیقات کے لئے جمع ہوئی تھی اس وقت انہوں نے بڑی صفائی سے اقرار کیا تھا کہ زمین کے بارے میں ہماری معلومات بطلیموس کے عہد سے کچھ زیادہ نہیں تو جب انسان زمین کی حقیقت بھی معلوم نہیں کر سکے تو کیا اعتبار ہے ان کی تحقیقات کا جن کی تحقیقات پر کروڑوں نہیں بلکہ اربوں کھربوں روپے خرچ ہو رہے ہیں، ان میں ابھی تک یہ بحث چل رہی ہے کہ زمین ساکن ہے یا متحرک؟ متحرک ہے تو اس کی حرکت کیسی ہے؟ سورج میں حرکت ہے یا نہیں؟ یہ کرہ فضا میں کیسے معلق ہے؟ زمانہ دراز کے بعد انسان کو محض ظاہری اور سطحی علم حاصل ہو سکا، اللہ تعالےٰ کا یہ ارشاد کتنا عجیب و غریب اور برمحل ہے :۔

---

[1] اب سائنس کی جدید تحقیق یہ ہے کہ سورج میں ایک قسم کی حرکت نہیں بلکہ مختلف نوعیت کی حرکات ہیں۔
(محمد سراج۔ ایم سی ذراعت)

«یعلمون ظاھراً من الحیاۃ الدنیا وھم عن الآخرۃ ھم غافلون» یہ لوگ دنیوی زندگی کی بھی محض ظاہری سطح کو جانتے ہیں (حقیقت اس کی بھی معلوم نہیں) اور آخرت سے تو بالکل ہی غافل ہیں.

انسان میں ہڈیاں کتنی ہیں؟ پٹھے کتنے ہیں، ریشے کتنے ہیں، شرائین کتنی ہیں، سونا چاندی لوہا پیتل کتنا ہے، آنکھ کے پردے کتنے ہیں، دماغ کیسے بنا ہوا ہے، یہ سب کچھ جانتے ہیں، لیکن یہ کبھی نہیں سوچا کہ منی سے یہ جاندار کیسے بن گیا؟ رحم مادر میں یہ ناک نقشے کیسے تیار ہوگئے؟ ایک بالشت کے محدود رقبہ میں اربوں کھربوں انسانوں کی الگ الگ شکلیں کس نے بنا ڈالیں. آپ نے کبھی سوچا کہ ہم نے ذرا سا بیج ڈالا، اس سے اتنا بڑا عظیم الشان درخت جس کے اجزاء بھی مٹی اور پانی ہیں آخر کیسے پیدا ہوگیا، اس ننھے سے بیج سے یہ درخت کس نے نکالا جس کی جڑ، تنا، پتے، شاخیں، کونپلیں، پھل، پھول سب کی خاصیت الگ الگ، رنگ جدا جدا اور تاثیر علیحدہ علیحدہ ہے، پھر ایک ہی زمین اور مٹی سے مرچ بھی پیدا ہوتی ہے اور آم بھی کیلا بھی اور کریلا بھی، زہر بھی اور تریاق بھی، کبھی قدرت کے ان عجائبات پر غور کیا؟ کہ یہ کیسے پیدا ہوئے اور کس نے پیدا کئے، بس یہی وہ مقام ہے جہاں مادہ پرست سائنسدانوں اور علم الحیاۃ کے ماہرین کو غلطی ہوئی، ان کی عقلی پرواز وہی ہے جو قرآن نے بیان کی: یعلمون ظاھراً من الحیاۃ الدنیا وھم عن الآخرۃ ھم غافلون. وہ دنیوی زندگی کی صرف ظاہر سطح کو جانتے ہیں اور آخرت سے تو بالکل ہی غافل ہیں.

قدرتِ خداوندی کے مظاہر

پھر یہ دنیا جس کا آپ کو کچھ سطحی علم ہے بھی یہ کل کائنات کا شاید کروڑواں حصہ بھی نہیں بنتا، آج تو ان حقائق کو سائنسدان بھی ماننے پر مجبور ہیں ورنہ کسے معلوم تھا کہ ریت کے اجزاء سے نائلون کا کپڑا تیار ہوگا جو اپنی خوبصورتی، خوشنمائی، نفاست اور نرمی سے ریشم کو بھی مات کردے گا، اگر کوئی شخص ایسا دعویٰ کرتا تو یقیناً اسے احمق کہا جاتا، لیکن آج اسی زمین کے اجزاء سے اربوں گز سالانہ نائلون تیار ہوتا ہے اور اتنی وافر مقدار میں تیار ہوتا ہے کہ ایک ایک عورت سو سو جوڑے بنائے تب بھی ختم ہونے میں نہیں آتا، کیا یہ رب العالمین کی شانِ

ربوبیت نہیں ؟ کیا معلوم کہ کل ایسے کیمیائی مواد پیدا ہو جائیں جن کے ذریعہ ایک جریب زمین سے ہزار جریب کی پیداوار ہونے لگے جو لوگ آئندہ پیدا ہونے والی انسانیت سے ڈر کر نسل کُشی کے فلسفے پیش کرتے ہیں کیا ان پر "آب نا دیدہ موزہ کشیدہ" کی مثال صادق نہیں آتی ؟ خدا کی رزاقیت پر پہلے ہی سے تحدید لگا دینا کیسی عجیب بات ہے۔ یہ نقصان صرف اس لئے ہوا کہ نظریات کی بنیاد صرف عقل کو بنا لیا گیا اور عقل بے چاری اتنی محدود ہے کہ وہ صرف سامنے کی چیز کو دیکھنا جانتی ہے آگے پیچھے اوپر نیچے کچھ نہیں دیکھتی : یعلمون ظاھراً من الحیاۃ الدنیا۔

چاند اور دیگر سیارے

تو میں نے کہا کہ آسمان کو تو چھوڑو، تم زمین پر ہو اور زمین سے قریب تر کُرہ چاند ہے جو ۲۰۰۳۸ ہزار میل دور ہے جس کی روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کے حساب سے سوا سیکنڈ میں یہاں پہنچتی ہے اور سورج آٹھ کروڑ میل بتلایا جاتا ہے جس کی روشنی تقریباً آٹھ منٹ میں یہاں پہنچتی ہے پھر اس سے آگے اور کرے اس سے زیادہ دور ہیں اور آسمان ان سب سے دور ہے سائنسدانوں کی رسائی ابھی تک درمیانی کروں تک نہیں ہوئی آسمان تک کہاں پہنچتے، بس غلطی سے دعویٰ کر دیا کہ آسمان نہیں ہے اور اس پر یہ دعویٰ کر دیا گیا کہ اسلام جو آسمان کے وجود کا قائل ہے غلط ہے معاذ اللہ، حالانکہ اسلام غلط نہیں ہوا، البتہ بطلیموسی فلسفہ غلط ہوا جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ یہ سیارے آسمان میں گڑے ہوئے ہیں، اسلام نے تو یہ دعویٰ کیا تھا کہ آسمان اوپر ہے اور یہ چھوٹے بڑے سیارے سب سے نیچے کے آسمان کی زینت ہیں ((ولقد زینا السماء الدنیا بمصابیح)) تو آسمان چھت ہے اور یہ فضا میں معلق سیارے اس کے لئے زینت ہیں اس لئے اسلام اپنی جگہ قائم ہے ہاں جدید تحقیق سے بطلیموسی فلسفہ غلط ہو گیا، سچ پوچھیے تو سائنس نے ہم پر احسان کیا آج سائنس کی بدولت ہمارے لئے معجزات کی حقیقت کا سمجھنا آسان ہو گیا، اب یہ ہماری غلطی ہو گی اگر ہم سائنس سے صحیح نتائج نہیں نکال سکتے۔

بھائی ایک بات سُن لیجئے، ایک عقل کا دائرہ ہے اور ایک نبوت کا، نبوت ان چیزوں

کو بیان کرتی ہے جن کی دریافت سے عقل قاصر ہے جہاں حواس کی سرحد ختم ہوتی ہے وہاں عقل کی پرواز شروع ہو جاتی ہے اور جہاں عقل کی سرحد ختم ہوتی ہے وہاں سے نبوّت کی سرحد شروع ہوتی ہے جو چیز حواس سے آپ معلوم نہیں کر سکتے اسے عقل سے معلوم کرتے ہیں اور جو چیز عقل سے معلوم نہیں ہو سکتی اسے نبوت سے معلوم کیا جاتا ہے آپ عقل سے معلوم نہیں کر سکتے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا، زندگی ہوگی یا نہیں ہوگی، مٹی میں مل جانے کے بعد اٹھنا ہوگا یا نہیں ہوگا، اللہ تعالےٰ نے انبیاء کرام (علیہم السلام) بھیجے تاکہ وہ ان امور میں آپ کی رہنمائی کریں۔ انبیاء کرام (علیہم السلام) حساب وکتاب، سائنس اور ریاضی کی تعلیم کے لئے نہیں بھیجے جاتے اس لئے کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" جب ان چیزوں کی ضرورت ہوگی، عقلِ خداداد ان کو معلوم کرے گی، اس لئے جو چیزیں عقلی دائرے میں آسکتی تھیں ان کے لئے انبیاء کرام (علیہم السلام) کو بھیجنے کی ضرورت نہ تھی۔

"موجودہ سائنس تکوینی عجائبات پر مطلع ہونے کا ایک راستہ ہے"

الغرض سائنس سے یہ فائدہ ہوا کہ حق تعالےٰ کے حیرت ناک تکوینی عجائبات سے واقفیت ان ذرائع سے آسان ہوگئی۔ میں یہاں اس کی ایک مثال عرض کرتا ہوں، دنیا میں مشکل ترین مسئلہ یہ تھا کہ عذاب قبر کیسے ہوگا؟ کیونکہ قدیم وجدید اکثر عقلاء وجودِ روح کے قائل ہیں کہ جب انسان مرجاتا ہے تو روح بدن سے جدا ہو جاتی ہے اسی کا نام موت ہے، اب اشکال یہی ہے کہ جب موت کے بعد بدن جمادِ محض رہ گیا تو اسے عذابِ قبر کیسے ہوگا؟ لیکن سائنسی ترقی اور مسمریزم، علم التوجہ اور علم الارواح کے جدید فنون نے جن حقائق و عجائبات سے نقاب کشائی کی ہے اس سے کم از کم عذاب قبر کا مسئلہ تو ناقابلِ فہم نہیں رہا، اس سلسلہ میں فرید الوجدی نے "دائرۃ المعارف" میں مادۂ روح کے تحت یہ دلچسپ واقعہ فرانسیسی مجلّہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ "عملِ تنویم (مسمریزم) کے ایک ماہر نے ایک شخص پر عملِ تنویم شروع کیا اور اس سے بعض امور کے بارے میں سوالات کرتا رہا اس طویل اور مسلسل عمل سے اس معمول کی روح نکل گئی، جسم ٹھنڈا، حس وحرکت مفقود، اس پر موت کی کیفیت طاری ہوگئی، اور سوال وجواب کا سلسلہ منقطع ہو گیا، عامل صاحب بہت پریشان ہوگئے، جلدی سے

ایک دوسرے آدمی پر تنویمی توجہ ڈالی، اس سے پہلے معمول کے بارے میں دریافت کیا، اس نے بتلایا کہ اس کی روح نکل چکی ہے اور ذرا فاصلے پر فلاں جگہ موجود ہے، اب عامل صاحب اسے تلاش کرنے لگے، معمولِ ثانی نے بتلایا کہ اب آپ کا ہاتھ اس کی پنڈلی پر ہے، عامل نے فوراً ہوا میں نشتر چلایا اور معمولِ اوّل جو بے حس و حرکت پڑا تھا اس کی پنڈلی پر زخم ہوا جس سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا، باوجودیکہ جسم کے درمیان اور اس جگہ کے درمیان جہاں ہوا میں نشتر چلایا گیا تھا کافی فاصلہ تھا۔

اس قسم کے عجائبات کی خبریں ہمیشہ آتی رہتی ہیں تو قدرت نے بتلا دیا کہ تمہاری عقل کے دائرے کے اندر بھی ایسی چیزیں واقع ہو سکتی ہیں کہ روح کے جدا ہو جانے کے بعد بھی جسم سے اس کا اتصال موجود ہے، شریعت نے یہی کہا تھا کہ مردہ خواہ کسی جگہ ہو، خشکی میں یا تری میں سمندر کے تہ میں ہو یا مچھلی کے پیٹ میں مرجائے، گل جائے، اس کے اجزاء ہوا میں تحلیل ہو جائیں لیکن خدا کے ملک، اس کی قدرت اور اس کے علم سے باہر نہیں، روح کا ایک مخفی تعلق جسم کے ان ذرات سے باقی رہتا ہے جس کی وجہ سے جسم کو برزخی ثواب و عذاب ہوتا ہے خواہ ہمیں اس کا احساس ہو یا نہ ہو۔

دیکھئے میڈیکل سائنس کے بقول آپ کے پیٹ میں ہزاروں لاکھوں جراثیم موجود ہیں، ایک دوسرے کو مارتے ہیں، قتل کرتے ہیں اور دوائیوں سے انہیں ختم کیا جاتا ہے میدانِ کارزار گرم ہے لیکن آپ کو ان کی کوئی خبر نہیں، اس انکشاف سے پہلے کسی کو کیا خبر تھی کہ ایک قطرہ کے اندر کروڑوں اربوں جراثیم ہوں گے، اتنے باریک کہ آلات کے ذریعہ انہیں دس ہزار گنا بڑا نہ کریں تو وہ نظر نہیں آئیں گے، ان میں خورد و نوش اور توالد و تناسل کا سلسلہ بھی جاری ہے، قدرت کے یہ عجائبات جو آج آپ کے علم میں آئے ہیں کیا سو سال پہلے معلوم تھے؟ نہ معلوم آئندہ کیا کیا حقائق ظاہر ہوں گے۔

دنیا کی بے حقیقتی و بے ثباتی

میرا مقصد اس دنیا کی حقیقت سمجھانا ہے، دیکھئے! اگر آپ سے کہا جائے کہ آپ کی یہ زندگی کچھ نہیں بلکہ اس کے بعد جو زندگی آئے گی وہی اصل زندگی ہوگی تو ممکن ہے کہنے والے

کو بے وقوف کہا جائے کہ ہم تو اس زندگی میں کھاتے ہیں پیتے ہیں، شادی بیاہ کرتے ہیں اولاد پیدا کرتے ہیں جوان ہوتے ہیں، قتل و قتال اور رزم و بزم کے ہنگامے برپا کرتے ہیں، نظم مملکت چلاتے ہیں طرح طرح کے عجائب کا انکشاف کرتے ہیں اور تم کہتے ہو "یہ کچھ نہیں" میں عرض کرتا ہوں، یہ تمہاری زندگی تھیٹر اور سینما کی مثال ہے، تم سینما کے پردوں پر پاکستان، ایشیا یورپ، افریقہ، امریکہ، الغرض سارے جہاں کی چیزیں دیکھتے ہو، اس کے بنانے پر کروڑوں روپے صرف کئے جاتے ہیں، کتنے ہی لوگ اس پر روپیہ برباد کرتے ہیں، امیر و غریب شاہ و گدا اور مفکر و سائنسدان سب ہی یہ تماشا دیکھنے کے لئے جاتے ہیں تو یہ سینما کیا ہے؟ خالی پردہ ہے جس کے لئے دین بھی غارت کیا جاتا ہے اور اخلاق بھی مال بھی برباد کیا جاتا ہے اور قیمتی وقت بھی حالانکہ سب جانتے ہیں کہ اس کے مناظر، نقش و نگار اور آوازیں سب مصنوعی ہیں ان کی حقیقت کچھ نہیں، اب مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتلاتے ہیں کہ تمہاری یہ زندگی بھی خود ایک تماشا ہے اور جب مر گئے تو پتہ چلے گا کہ الناس نیام فاذا ماتوا انتبھوا (لوگ محو خواب ہیں جب مریں گے تب جاگ اٹھیں گے) قرآن مجید نے اسی حقیقت کو بیان فرمایا، چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

«اعلموا أنما الحياة الدنيا لعب ولهو وزينة وتفاخر بينكم وتكاثر في الأموال والأولاد كمثل غيث أعجب الكفار نباته ثم يهيج فتراه مصفرا ثم يكون حطاما وفي الآخرة عذاب شديد ومغفرة من الله ورضوان وما الحياة الدنيا إلا متاع الغرور»	تم خوب جان لو کہ دنیوی زندگی محض لہو و لعب (کھیل تماشا) اور زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال و اولاد میں ایک کا دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا ہے جیسے مینہ ہے کہ اس کی پیداوار کاشت کاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے، پھر وہ خشک ہو جاتی ہے سو اس کو تو زرد دیکھتا ہے پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے اور آخرت میں عذابِ شدید ہے اور خدا کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے اور دنیوی زندگی محض دھوکہ کا سامان ہے۔

قرآنِ کریم کا اعجاز اور اس کی فصاحت و بلاغت

سبحان اللہ! ایسی فصاحت، ایسی بلاغت، ایسا عجیب زورِ بیان، ایسی شیرینی، ایسا کمال لیکن افسوس کہ ع۔ زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم۔ ہمیں نہ تو قرآن کا اعجازِ حلاوت و اندازِ فصاحت معلوم نہ ترجمے میں اتنی قابلیت کہ میں اس زورِ بیان کو ادا کرسکوں اس لئے میں چند اشارات عرض کرتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں اعلموا أنما الحیاۃ الدنیا کلام کو اعلموا کے بعد إنما سے شروع فرمایا، شیخ عبدالقادر جرجانی "دلائل الاعجاز" میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ إنما سے کلام شروع کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ کلام سو فیصد حقیقت ہے جس میں کسی ادنیٰ تردد یا شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

تو إنما سے کلام شروع کرکے حق تعالیٰ شانہٗ متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ تمہاری دنیوی زندگی کا لہو و لعب اور کھیل تماشا تو ایسی بدیہی حقیقت اور کھلی بات ہے کہ اس میں کسی عاقل کو تردد ہی نہیں ہوسکتا، سبحان اللہ! یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ ایک طرف تو قرآن کے حقائق اتنے گہرے ہیں کہ بڑے بڑے عقلاء وہاں تک رسائی سے عاجز ہیں، چنانچہ ایک لمبی حدیث میں قرآن پاک کے بارے میں فرمایا:

«لا یخلق بکثرۃ الرد و لا یمل قاریہ و لا یشبع منہ العلماء و لا تنقضی عجائبہٗ»	قرآن کثرتِ تلاوت سے کہنہ نہیں ہوتا، اس کا پڑھنے والا اکتاتا نہیں اس سے علماء کو سیری نہیں ہوتی اس کے عجائبات ختم نہیں ہوتے۔

تو ایک طرف تو قرآن کریم ایسا دریائے ناپید اکنار ہے کہ اس کے حقائق و عجائبات ختم نہیں ہوتے اور دوسری طرف اس کا یہ اعجاز ہے کہ عامی سے عامی آدمی بھی اپنے ظرف کے مطابق اس کا مفہوم سمجھ جائے، چنانچہ ارشاد ہے:

«ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر»	اور یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان کردیا پس ہے کوئی سوچنے والا؟

سبحان اللہ! یہ رب العالمین ہی کے کلام کی خصوصیت ہوسکتی ہے کہ ایک طرف یہ اس قدر آسان! کہ ایک اُمّی ان پڑھ بھی اسے سمجھ جائے اور دوسری طرف ایک بڑے سے بڑا فقیہ

فلسفی، متکلم اور عاقل بھی اس کے حقائق کی گہرائی سے حیران اور ششدر رہ جائے کیونکہ وہ تو رب العالمین ہے اس کی ربوبیت عامہ کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ ہر شخص کے دماغ کو اس کی استعداد کے مطابق غذا مہیا کرتا ہے، فلسفی کو اس کے خیال کے مطابق، فقیہ کو اس کی گہرائی کے مطابق عالم کو اس کی شان کے مطابق عامی کو اس کے حال کے مناسب، قرآن کے اس خوانِ یغما اور مائدۂ عام سے سب کو فیض ملتا ہے۔

انسانی زندگی کے چار دور

بہرحال قرآن حکیم نے اپنی اعجازی شان سے ہماری دنیوی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے کہ یہ زندگی کل چار دائروں میں سمٹی ہوئی ہے لعب و لہو، زینت، تفاخر اور تکاثر۔

بچہ کی ابتدائی پرورش اور اس کے قدرتی نظام

انسان جب پیدا ہوتا ہے تو آپ جانتے ہیں کہ نہ وہ بول سکتا ہے نہ کسی چیز کو سمجھ سکتا ہے، ہاتھ، پاؤں، ناک، کان، آنکھ سب کچھ موجود ہے مگر بے بسی کا یہ عالم ہے! کہ ان سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتا، ہاں قدرتِ فیاض نے اسے دودھ چوسنے کا ڈھنگ بتلا رکھا ہے، اسی خدائی تعلیم سے وہ اپنی خوراک لیتا ہے (یہاں درمیان میں ایک اور بات عرض کرتا ہوں، بچہ کے مزاج کے مطابق حق تعالیٰ نے غذا تیار کی، وہی مادہ جو کبھی پیٹ کی نلکی کے ذریعہ شکم مادر میں اس کی غذا بنتا تھا جب پیدا ہوا تو اس کی قدرت نے دودھ کی شکل میں تبدیل فرما دیا کہ منہ پاک ہے تو اس کے لئے غذا بھی پاک ہونی چاہیئے، پھر یہ غذا بھی ایسی لطیف تجویز فرمائی کہ دنیا کی کوئی لیبارٹری (تجربہ گاہ) ایسی لطیف غذا تیار نہیں کر سکتی، اسی لئے محققین اطباء کا کہنا ہے کہ ماں کے دودھ کا بدل نہیں ہو سکتا، اس کے اس دودھ کے ذریعہ جو افعال، خواص، عادات ملکات اور مزاجی خصوصیات بچے کی طرف منتقل ہوتی ہیں انہیں رہنے دیجئے، صرف اتنی بات پر غور فرمائیے کہ یہ دودھ اگر زیادہ میٹھا ہوتا تو کیڑے پیدا کرتا، پھیکا ہوتا تو بدمزہ ہوتا، زیادہ گرم یا زیادہ سرد ہوتا تو ننھے بچے کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتا، زیادہ غلیظ ہوتا تو قراقر پیدا کرتا اور پتلا ہوتا تو غذائی ضرورت پوری نہ کرتا، اس لئے نہایت معتدل رکھا، پھر اس کے نکلنے کے لئے نہایت باریک چھلنی لگا دی تاکہ ذرا ذرا نکلے، سوراخ

بڑا ہوتا تو بچے کو گھبراہٹ ہوتی تو یہ ہے حق تعالےٰ کی شانِ ربوبیت کہ گندے مادے کو صاف ستھرے دودھ کی شکل میں تبدیل کر کے غذا بنا دیا کہ اسی سے فلسفی کی بھی پرورش ہوتی ہے اور عاقل کی بھی، نبی کی بھی اور ولی کی بھی، اسی سے اندازہ ہوگا ان لوگوں کی حماقت کا جنہوں نے رزق کو اپنے قبضے میں سمجھ کر شور کر دیا کہ بچے بند کرو، ورنہ بھوکوں مر جاؤ گے حالانکہ جو خالق و رازق بے دست و پا بچے کے لئے انتظام کرتا ہے وہ دوسرے انسانوں کے لئے بھی رزق کے نئے نئے دروازے کھول سکتا ہے دراصل عقیدہ اور یقین بگڑ گیا، خدا کی رزاقیت پر سے یقین اٹھ گیا۔

انسانی زندگی کے تدریجی مراحل

بہر حال عرض کر رہا تھا کہ بچہ جب پیدا ہوا تو کچھ نہیں جانتا، نہ عقل، نہ شعور، نہ ادراک، اب غذا ملی کچھ نرم نرم چیزیں کھانے لگا اور اعصاب میں ذرا قوت آگئی تو چلنے پھرنے لگا، تو اب صرف دو کام وہ جانتا ہے اول یہ کہ دنیا کی ہر چیز کھانے کے لیۓ ہے، گندگی ہو اس میں ہاتھ ڈالے گا، آگ ہو اس کو منہ میں لے جائے گا، کھانے کو کوئی چیز ہو اسے کھائے گا، الغرض وہ پیٹ جانتا ہے اور کچھ نہیں جانتا، یہ چونکہ غیر شعوری دور ہے اس لئے قرآن نے اس کا ذکر نہیں کیا اور جب چار پانچ سال کا ہوا تو کھیل کود کا دور شروع ہو گیا اب نہ اسے فیشن کی فکر ہے، نہ جوتے کپڑے کی، نہ ٹوپی کی نہ ٹائی کی، پہلے غیر شعوری دور میں فنا فی الاکل تھا تو اب فنا فی اللعب ہے، اس کے بعد جوانی آئی تو زینت و آرائش کا دور شروع ہوا، ڈاڑھی ایسی ہو، صابن ایسا ہو، بال ایسے ہوں، ٹوپی ایسی ہو، کپڑے ایسے ہوں، الغرض ہر وقت آرائش و زیبائش کی فکر، اسے فکر نہیں کہ باپ کہاں سے لائے گا روپیہ پیسہ کہاں سے آئے گا، ماں باپ کی گذر بسر کیسے ہوگی، یہ فنا فی الزینۃ ہے اور بناؤ سنگار میں مستغرق، اب ذرا عقل میں پختگی آئی، کچھ شدبُد ہوئی، کوئی ڈگری ملی کہیں ملازمت اور عہدہ ملا، چار پیسے جیب میں آنے لگے تو تفاخر شروع ہوا، ہم سادات ہیں، ہم قریشی ہیں، ہم پٹھان ہیں، ہم خٹک ہیں، ہم یہ ہیں ہم وہ ہیں، کہیں قومیت، کہیں پارٹی کہیں کچھ کہیں کچھ، حالانکہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد یہ ہے: اِن اکرمکم عند اللہ اتقٰکم (تم سب میں اللہ کے نزدیک مکرّم وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو) اب ذرا

اور آگے بڑھے شادی ہوگئی، اولاد ہوئی، اب مال اور اولاد میں اضافہ کی فکر ستانے لگی آج پانچ سو تنخواہ ہے فلاں ڈگری کرلیں تو تنخواہ بڑھ جائے وہ ڈگری کرلیں تو آٹھ سو ہو جائے، امریکہ جائیں تو اور زیادہ ہو جائے، لندن جائیں تو اتنی ہو جائے، یہ ہے تکاثر فی الاموال والاولاد، لاحول ولا قوۃ الا باللہ، کوئی امریکہ جاتا ہے خواہ ایمان غارت ہو جائے۔ دین برباد ہو جائے، اخلاق تباہ ہو جائے مگر ڈگری کے لئے لندن، پیرس اور امریکہ جانا ضروری ہے، خدا کے بندو! رزق محدود، زندگی محدود، ازل سے رزق ناپ تول کر مقرر کر دیا گیا، تعجب ہے کہ ڈگری کے لئے لندن اور امریکہ کی خاک چھانی جائے، دین وایمان کو خطرات میں ڈالا جائے۔

بھائی ٹھیک ہے کچھ اسباب کرو لیکن اتنی حرص بھی کیا جس کے لئے اپنے ایمان کو اتنے شدائد اور اتنے سیلابوں میں ڈالا جائے اگر تم خدا کے فضل سے بچ بھی نکلے لیکن کتنے ہیں جو بچ نکل آتے ہیں۔

"مال واولاد پر تفاخر"

بہرحال یہ ہیں انسانی زندگی کے چار دور، لہو ولعب سے ابتدا ہوئی۔ پھر زینت کا دور آیا، پھر تفاخر کا، پھر تکاثر کا، اور یہ مال واولاد پر تفاخر اور تکاثر کا مرض تو ایسا ہے کہ کمبخت مرتے دم تک چمٹا رہتا ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

«أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ» تمہیں بہتات کی حرص نے اتنا غافل کر دیا کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔

اور حدیث پاک میں آتا ہے:۔

«منهومان لا يشبعان: منهوم العلم ومنهوم المال» دو حریص ایسے ہیں جن کا پیٹ نہیں بھرتا: علم کا حریص اور مال کا حریص۔

دیکھئے! امریکہ کتنا امیر ترین ملک ہے مگر اس کا پیٹ ابھی تک نہیں بھرا، وہ بھی یہی چاہتا ہے کہ فلاں ملک ختم ہو تو میری منڈی چلے، بس وہی حالت ہے جسے حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے:۔

«لو كان لابن آدم واديان من ذهب لابتغى ثالثاً» اگر انسان کو دو وادیاں (یعنی ایک یہ دنیا اور ایک ایسی ہی دوسری دنیا) سونے سے بھری ہوئی مل جائیں تو

وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ — تیسری کو تلاش کرے گا اور کوئی چیز سوائے قبر کی
إِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوبُ اللهُ — مٹی کے انسان کا پیٹ نہیں بھرتی اور رجوع کرے
عَلَىٰ مَنْ تَابَ» — اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے جس کو توفیق اور سمجھ عطا فرمائی اور وہ قانع ہو گیا، اس کا پیٹ البتہ بھر جاتا ہے، الحمد للہ ایسے صالحین موجود ہیں۔

انسانی زندگی کی ایک مشاہد مثال

خیر اللہ پاک نے انسان کی زندگی کے یہ چار دور بیان فرمائے، لہو و لعب، زینت و تفاخر، تکاثر، ہم سمجھتے تھے کہ کھیل کود بچوں کا ہی کام ہے اب معلوم ہوا کہ اس کھلنڈرے زمانے میں صدرِ مملکت اور بادشاہ بھی کھیلتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چار دور اس لئے بیان فرمائے کہ بعض ادوار میں ان میں بعض چیزوں کا غلبہ ہوتا ہے ورنہ کھیل، زینت اور تفاخر ہر دور میں کچھ نہ کچھ پایا جاتا ہے، بہر حال یہ ہے تمہاری دنیا کا خلاصہ، اس کے بعد مثال سے اس کا نقشہ بیان فرماتے ہیں:۔

«كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ — جیسے بارش کہ کسانوں کو اس کی کھیتی پسند آتی ہے
نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ — پھر وہ خشک ہو کر زرد نظر آتی ہے یا لآخر وہ چورا
مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا» — چورا ہو جاتی ہے۔

بالکل یہی حال انسانی زندگی کا ہے، آج ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا اس سے پہلے کچھ نہیں تھا، پلا پڑھا، پھلا پھولا، جوان ہوا، یہ ہوا وہ ہوا پھر مر گیا، جنازہ پڑھا گیا دفن کر دیا گیا اور کچھ مدت بعد نام و نشان مٹ گیا، پھر انجام کیا ہو گا؟ فرماتے ہیں:۔

«وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ — اور آخرت میں سخت عذاب بھی ہے اور اللہ تعالیٰ
وَمَغْفِرَةٌ مِنَ اللهِ وَرِضْوَانٌ» — کی خاص بخشش اور رضا مندی بھی۔

یہ ہے تمہاری زندگی کا نقشہ! کتنی محدود؟ کتنی ناپائدار؟ اس پر فریفتہ ہونا، مغرور ہونا اسی کو مقصد بنا لیا، یہ تمہاری بے وقوفی ہے، کج فہمی ہے فرماتے ہیں:۔

«وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ» — اور دنیاوی زندگی تو محض دھوکے کا سودا ہے

اس کے بعد ارشاد ہے یہ سب چھوڑو، اسے وسیلہ سمجھو، گذرگاہ اور راستہ سمجھو، اسے مقصد نہ بناؤ کہ مقصد آنے والی زندگی ہے بس: سابقوا إلى مغفرة۔ لپکو! دوڑو! بخششِ خداوندی کی طرف ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ وجنة عرضها كعرض السماء والأرض اور دوڑو! جنت کی طرف کیسی جنت؟ جس کی صرف چوڑائی آسمان و زمین جتنی ہے، بھائی خدا ہی جانے، آج تو خیر زمین کی محدودیت معلوم ہو گئی ہے ورنہ اس زمانے میں تو معلوم نہ تھی اور آسمان کی وسعت کی تو آج تک بھی کسی ماہرِ فلکیات کو ہوا تک نہیں لگی، کسی کو کچھ خبر نہیں کہ خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ دنیا کتنی وسیع ہے؟ میں نے کسی کتاب میں ایک سائنسدان کا یہ جملہ پڑھا ہے کہ: یہ کیڑے مکوڑے (حشرات الارض) جو دنیا کی رذیل، ذلیل، بیکار اور گندی مخلوق شمار کی جاتی ہے انہی کی تحقیقات اتنی وسیع ہیں کہ انسان دو لاکھ سال تک بھی ان کی انتہا کو نہیں پہنچ سکتا۔

نظامِ قدرت کے سامنے انسانی عقل کی حیرانی

میں یہاں ایک لطیفہ آپ کو سناتا ہوں، بعض لوگ آج کل کہا کرتے ہیں کہ مکھی تو گندی چیز ہے، بھنبھناتی ہے، گندگی پر بیٹھتی ہے، خدا نے اس کو کیوں پیدا کر دیا، میں کہا کرتا ہوں کہ حدیث میں آتا ہے کہ: "مکھی اگر کھانے کے برتن میں گر جائے تو اسے غوطہ دے کر نکال دو، کیونکہ اس کے ایک پر میں بیماری ہے اور دوسرے میں اس کی دوا ہے۔"

بعض نادانوں نے اس حدیث کا خوب مضحکہ اڑایا ہے کہ یہ حدیث تو بالکل خلافِ عقل ہے میں کہتا ہوں کہ اگر آپ نے مکھی پر اپنی تحقیقات اتنی قطعیت کے ساتھ مکمل کر لی ہوتیں کہ ان پر نہ تو اضافہ ممکن ہوتا، نہ کسی تحقیق میں ردوبدل کی گنجائش رہتی، پھر تو آپ کو حق تھا کہ اس حدیث پر اعتراض کرتے، لیکن جب آپ کو اپنے جہل کا خود اقرار ہے، جیسا کہ سائنسدان کا مقولہ میں نے ابھی نقل کیا، تو یہ حدیث خلافِ جہل ہوئی، خلافِ عقل تو نہ ہوئی، یہ دوسری بات ہے کہ آپ نے جہل کا نام عقل رکھ لیا ہے یعنی جس چیز کی حقیقت تک آپ کی رسائی نہیں ہو سکی، آپ نے کم نظری کی بنا پر اسی کو خلافِ عقل کہنا شروع کر دیا۔

آخر یہ بات آپ کی عقل میں کیوں نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قدرتی نظام کے تحت

ایک حشرہ ایسا پیدا کیا ہے جس کا کام جاروب کشی ہے اسے اتنی تیز نظر بخشی ہے کہ تمہاری دوربینیں اس کے سامنے ہیچ ہیں اور اس کے معدے میں ایسی حرارت پیدا کی ہے جو اس کی کھائی ہوئی تمام گندگی کو جلا کر تریاق بنا دیتی ہے، دیکھئے شہد کی مکھی کس قدر زہریلی ہے لیکن وہ پھلوں کا رس چوس کر بجائے زہر کے شہد اگلتی ہے تو اس حدیث میں یہ بتلایا گیا ہے کہ مکھی کے ایک بازو میں اس کی غیر منہضم غذا کا خزانہ ہے یہ تو بیماری ہے اور دوسرے بازو میں ہضم شدہ تریاق ہے اور وہ برتن میں گرتے وقت اسی بازو کو آگے رکھتی ہے جس میں غیر منہضم غذا جمع کرتی ہے تم اسے غوطہ دے کر اس کا وہ بازو بھی ڈال دو جس میں دوا ہے تاکہ توازن قائم ہو جائے اب بتلائیے اس میں کون سی بات خلافِ عقل ہے؟ وہاں ہم ان حقائق سے جاہل تھے، وحی نے ہم کو آگاہ کر دیا۔

اس کم بینی کی بنا پر چین والوں نے تو یہاں تک مکھی مار مہم چلائی کہ چین سے مکھی کا وجود ہی یکسر ختم کر دیا، مگر سنا ہے کہ اب وہ امراض کی رفتار کو بڑھتا ہوا دیکھ کر پھر مکھی کو چین میں لا رہے ہیں تو کہاں قدرت کا نظام اور کہاں ہماری عقل! واقعی نظام قدرت کے سامنے انسانی عقل حیران اور ششدر ہے۔

دنیا پیدا کرنے کا مقصد اور آخرت کی لامحدود زندگی اور بے شمار نعمتیں

بہرحال میں عرض کر رہا تھا کہ دنیا کی بے ثباتی بیان کرتے کے بعد اللہ پاک نے دنیا کو پیدا کرنے کا مقصد ذکر فرمایا اور وہ ہے ((سابقوا إلی مغفرة من ربکم وجنة)) الخ، آپ ہی بتلائیے کہ اگر کوئی ایسا جہاں ہو جہاں کی زندگی بے نہایت ہو، ہزار برس نہیں، لاکھوں کروڑوں برس نہیں بلکہ کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی ہو! تو ایسی زندگی کے لئے تیاری کرنا بہتر ہے؟ یا اس محدود زندگی کے لئے سر کھپانا؟ ظاہر ہے کہ انسان کی حرص غیر محدود ہے تو اس کے لئے زندگی بھی غیر محدود چاہیئے، یہ غیر محدود زندگی مرنے کے بعد والی وہ ہی زندگی ہے جو انبیاء کرام علیہم السلام نے بتلائی ہے اگر اس محدود زندگی کے لئے رات دن کھپے رہتے ہو، وقت لگاتے ہو، محنتیں کرتے ہو، ڈگریاں حاصل کرتے ہو، تحقیقات کرتے ہو تجربے کرتے ہو تو اگر اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پر یقین ہے تو اس ہمیشہ رہنے

والی زندگی کے لئے بھی تو وقت دو، محنت کرو، جان کھپاؤ! جب ہم مسلمان ہیں ہمارا اس پر ایمان ہے کہ مرنے کی بعد کی زندگی کامل، لامحدود اور نہ ختم ہونے والی زندگی ہے تو کتنی عجیب بات ہے کہ اس کے لئے کوئی محنت نہ کی جائے کوئی فکر نہ کی جائے؟ پھر وہاں کی نعمتیں بھی ایسی جن کے بارے میں ارشاد ہے:۔

((ولکم فیها ما تشتهی أنفسکم ولکم فیها ما تدعون))

تم اس (جنت) میں جو چاہو گے وہ ملے گا جو مانگو گے وہ فوراً مہیا کر دیا جائے گا۔

نیز ارشاد ہے:۔

((فلا تعلم نفس ما أخفی لهم من قرة أعین))

ان جنتیوں کے لئے جو آنکھوں کی ٹھنڈک راحت و آسائش چھپا کر رکھی گئی ہے اسے تو کوئی جانتا ہی نہیں (تصور سے بالاتر ہے)

اور ایک حدیث قدسی میں یوں آتا ہے،

قال الله تعالیٰ: ((أعددت لعبادی الصالحین ما لا عین رأت، ولا أذن سمعت ولا خطر علیٰ قلب بشر))

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا، نہ کسی انسان کے دل میں ان کا خیال ہی گذرا۔

ہاں ہاں ان کو کسی بھی آنکھ نے نہیں دیکھا، خواہ وہ کینیڈی کی آنکھ ہو یا چرچل کی فرعون کی ہو یا شداد کی، اولین کی ہو یا آخرین کی، کسی بڑے سے بڑے ملک و سلطنت کے بادشاہ کی آنکھوں کو بھی انکا دیکھنا نصیب نہیں ہوا، ہم بعض چیزوں کو دیکھتے تو نہیں مگر کانوں سے سن لیتے ہیں گویا سننے کا دائرہ دیکھنے سے زیادہ وسیع ہے اس لئے فرمایا: کسی کان نے وہ نعمتیں سنی بھی نہ ہوں گی، پھر احتمال تھا کہ دنیا میں کسی نے دیکھا اور سنا تو نہ ہو لیکن شاید کسی نے اس کا تصور ہی کر لیا ہو، تصور تو ایسی چیز ہے کہ یہاں بیٹھے بیٹھے ہی دور دراز ملکوں اور وہاں کی چیزوں کا تصور کر سکتے ہیں نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی تصور کر سکتے ہیں کہ ہم بادشاہ ہو گئے یا آسمان پر چڑھ گئے، اس لئے فرماتے ہیں:۔ کہ نہیں ان نعمتوں کا تو خیال بھی کسی دل

میں نہ گذرا ہوگا۔

اور یہ سب نعمتیں غیر محدود ہوں گی (اثنائے تقریر میں بجلی بجھ گئی اس پر حضرت نے فرمایا: چلو بھئی دل کی روشنی سے کام لو) ہاں تو میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب وہ زندگی یقینی بھی ہے اور غیر محدود بھی، کامل بھی ہے اور لذیذ بھی تو بتلائیے اپنی اس محدود زندگی میں سے آپ نے اس کے لئے کتنا وقت نکالا اور کیا تیاری کی؟ (بجلی آگئی تو فرمایا الحمد للہ، اس صبر پر بھی الحمد للہ اجر ملے گا)

جنّت اور اخروی نعمتوں کا مستحق کون ہے؟

بہر حال یہ جنت اور بخشش کی دولت کس کو ملے گی؟ فرماتے ہیں:۔

﴿اُعدت للذین آمنوا باللہ ورسلہٖ﴾	تیار کی گئی ہے ان کے لئے جو یقین لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر۔

دنیا کی زندگی میں تو مومن وکافر، نیک وبد، دوست اور دشمن سبھی کو حسبِ ضرورت ومصلحت دیا جاتا ہے یہ خوانِ یغما ہے یہاں ایمان وکفر کا سوال نہیں بلکہ کافر اور فاسق کو زیادہ دیا جاتا ہے، اس کی مصلحت ہمیں معلوم کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن اس زندگی کے بعد جو امتحان ہوگا اس کے نتیجہ میں آخرت کی نعمتیں اپنی محنت میں کامیاب ہونے والوں کو ملیں گی، ہاں تو ادنیٰ جنتی کو تمہاری زمین سے دس گناہ زیادہ جنت کی زمین ملے گی۔

جنت کی وسعت وبلندی

لوگ کہتے ہیں: صاحب اتنی بڑی جنت کہاں سے آگئی؟ میں پوچھتا ہوں یہ جو سیارے فضا میں معلق ہیں کیا ان کی تعداد اور ان کی وسعت تمہیں معلوم ہے؟ صرف کہکشاں کے بارے میں تمہارے فلکیات کے ماہر کہتے ہیں کہ اس میں تین ارب ستارے ہیں تو گویا اسی فضا کو جس میں سیارے گردش کر رہے ہیں اگر انسانوں پر تقسیم کر دیا جائے اور جتنے انسان موجود ہیں ان سے کروڑوں بلکہ اربوں گنا زائد انسان ہوں تب بھی تمہاری زمین سے دس گنا کیا ہزاروں گنا زیادہ رقبہ ایک آدمی کے حصے میں آسکتا ہے اور پھر جنت تو اس فضائے بسیط سے بھی کہیں بلند وبالا اور وسیع تر ہے، بہر حال اگر آپ کو یقین ہے اس ابدی زندگی پر تو دیکھنا

یہ ہے کہ آپ اس کے لئے تیاری کیا کرتے ہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا کے منصب حاصل نہ کرو یہاں کی ترقی سے کنارہ کش ہو جاؤ، اس کے لئے محنتیں نہ کرو، نہیں جو جائز ہے سب کچھ کرو، خوب کرو، محنت سے کرو لیکن اسے وسیلہ سمجھو، مقصد نہ بناؤ، کیونکہ زندگی میں کھانا بھی ہوگا، پہننا بھی ہوگا رہنا بھی ہوگا اور جو بھی اس زندگی بسر کرنے کے لوازمات میں سب درکار ہوں گے مگر سب بقدرِ ضرورت اور وقتی، اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی پشاور سے کراچی کا سفر کرے تو دو تین دن کا سفر ہے اس کے لئے کھانے، ناشتے کا انتظام، اوڑھنے پہننے کے کپڑے، سونے کے لئے بستر، جگہ (سیٹ) وغیرہ کا انتظام اور خرچ کے لئے جیب میں کچھ پیسے سب ہی ضروری ہیں لیکن نہ یہ سفر بذاتِ خود مقصد ہے نہ اس کے لوازمات نہ کوئی درمیانی ویٹنگ روم (انتظار گاہ) آخری منزل ہے، اب اگر وہ مسافر کسی ویٹنگ روم کی سج دھج کو دیکھ کر وہیں بیٹھا مزے لیتا رہا اور گاڑی نکل جائے تو اس کو آپ احمق اور بے وقوف کہیں گے یا نہیں؟ پس اس سے بھی بڑھ کر بے وقوف وہ شخص ہوگا جو دنیا کے ویٹنگ روم کے تماشہ میں کھو کر اسی کو مقصد بنالے اور اس کی لطف اندوزیوں میں منزلِ مقصود کو بھول جائے۔

حق تعالیٰ نے آپ کو دنیاوی وسائل بھی دیئے ہیں اور عقل وشعور بھی دیا ہے اب اگر آپ آخرت کو مقصد بنالیں تو یہ دنیا اور اس کی تمام نعمتیں بھی آخرت بن جائیں گی، مثلاً جہاد کے لئے تلوار بنائی جائے تو یہ ساری محنت باعثِ اجر ہوگی اور اگر اسی تلوار کو ظلم وتعدی کے لئے بنایا جائے تو موجبِ جرم وعذاب ہوگی، تو مقصد آخرت کو بنا کر اس کی خاطر دنیا میں جو بھی صحیح اور جائز محنت کروگے وہ سب آخرت میں شمار ہوگی اور اگر دنیا ہی کو مقصد بنالیا تو آخرت کے کام بھی دنیا بن جائیں گے۔

اخروی ابدی زندگی کے حصول کا طریقہ

اب میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ آخرت کی ابدی زندگی کے لئے ہم کیا کر رہے ہیں؟ شاید آپ کہیں ابھی تو ہم طالب علم ہیں، ڈگری حاصل کرنے کے بعد منزل بھی متعین کرلیں گے، لیکن یہ دھوکا ہے، آخر آپ کے پاس کیا سند ہے کہ اتنی مدت ہم زندہ بھی رہیں گے، یہاں تو یہ ہوتا ہے کہ اسی برس کا بوڑھا رینگتا رہتا ہے اور تنومند، مضبوط نوجوان حرکتِ قلب

بند ہونے سے ختم ہو جاتا ہے اس قسم کے بیسیوں عبرت آموز واقعات آپ کے سامنے ہیں۔

دوسرا دھوکہ یہ ہے کہ ہم خیال کر لیا کرتے ہیں کہ عالم فاضل یا گریجویٹ بننے کے بعد "کام" کریں گے، آپ مسلمان ہیں آپ طالب علمی میں بھی بہت کچھ کام کر سکتے ہیں، پروفیسر ہوں وہ بھی خوب کام کر سکتے ہیں اگر ہم میں سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ دین کی طرف متوجہ ہو جائے تو دنیا میں انقلاب آجائے تو اگر آپ نے طالب علمی ہی سے آخرت کی طرف توجہ کر لی تو گویا آخرت کا سامان کر لیا اور اگر مقصد صرف ڈگری اور تنخواہ ہے تو یہ وہی کافروں کی سی حیوانی زندگی ہے جس کے بارے میں فرمایا ہے:۔

((والذین کفروا یتمتعون ویأکلون کما تأکل الانعام والنار مثوی لھم))	اور جو لوگ کافر ہیں وہ تو (دنیا میں) ایسے ہی نفع اٹھاتے اور کھاتے پیتے ہیں جیسے چوپائے اور (آخرت میں تو) ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل وشعور کی دولت دی ہے اور نبوت وبعثت کی نعمت اس کی رہنمائی کے لئے عطا فرمائی ہے کیا انسان کی قیمت یہی حیوانی زندگی ہے کہ کھائے اور نکالے، کھائے اور نکالے؟ انسان کو اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگری، بڑی سے بڑی تنخواہ میسر آجائے، اچھا فرنیچر عمدہ کار، بہترین بنگلہ اور آسائش کا ہر سامان مل جائے لیکن اگر مقصد پیٹ کو بھر لینا اور سو رہنا اور جو کھایا ہے اس کو نکال دینا ہی ہو تو انسان گویا پاخانہ بنانے کی اچھی خاصی مشین بن گیا کہ ڈالو اور نکالو، ڈالو اور نکالو، اگر یہ مقصد زندگی ہو تو ذرا سوچ لیجئے، آپ نے انسان کو کہاں پہنچایا اسی کے متعلق فرمایا ہے:۔

((اُولٰئک کالانعام بل ھم اضل))	یہ لوگ تو ڈھوروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گذرے۔

اس لئے کہ ان کے پاس تو عقل نہیں کہ وہ کچھ سوچیں وہ تو صرف اتنا شعور رکھتے ہیں کہ بھوک لگی تو چارہ کھا لیا اور پیاس لگی تو پانی پی لیا مگر یہ انسان نما جانور تو عقل کے باوجود ڈوب گئے۔

بے دینی کے سیلاب کو روکنے کے لئے سب کو مل کر کوشش کرنی چاہیئے۔

آپ طالب علمی اور جوانی میں وہ خدمت کرسکتے ہیں جو بڑھاپے میں نہیں کرسکتے، اسلام ایک دعوت اور پیغام ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے «اَلَا فَلْیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ» یعنی ہر موجود شخص دین کا پیغام غیر موجود لوگوں کو پہنچائے"۔ تو آپ کے ذمہ بھی ایک فرض عائد ہوتا ہے اسلام کو پہنچانے کا، آج اسلام کو خطرناک سیلابوں کا سامنا ہے جس کا بڑا سبب مغرب کی طاغوتی طاقتیں ہیں، دراصل اہلِ مغرب نے "صلیبی جنگوں" سے یہ اندازہ اچھی طرح کرلیا تھا کہ ہم مسلمانوں کو قوتِ شمشیر اور زورِ بازو سے شکست نہیں دے سکتے اس لئے انہوں نے اسلام کے خلاف ذہنی جنگ شروع کی تاکہ مسلمانوں کو اسلام کی نعمت سے محروم کردیا جائے ان کی یہ کوششیں جو کئی صدی پہلے شروع کی گئی تھیں آج اپنے شباب پر ہیں، آج ان کے پاس طاقت ہے وسائل ہیں، بے پناہ ذرائع ہیں آج ان کا نقشہ ٹھیک وہی ہے جو موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کا بیان فرمایا تھا:۔

«رَبَّنَا اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ»	اے پروردگار آپ نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیوی زندگی، بے حد مال و دولت اور زینت و آرائش دی ہے اے پروردگار! اس کے نتیجے میں وہ (بجائے شکر کے) تیرے بندوں کو گمراہ کر رہے ہیں اے پروردگار ان کے مالوں کو ملیامیٹ کردے۔

وہ خود یہ جانتے ہیں کہ وہ جس زندگی میں مبتلا ہیں وہ بدترین اور تباہ کن زندگی ہے، دنیا ہی میں جہنم کی زندگی میں مبتلا ہیں، مجھے کراچی کے ایک دوست نے جو انگلینڈ سے آئے تھے، بتلایا کہ وہاں ایک شخص بہت بڑا مالدار تھا اس نے اپنے والدین کو ملازم رکھ چھوڑا تھا وہ فخر سے کہا کرتا تھا کہ جب میں دوسروں کو ملازم رکھتا ہوں تو اپنے ماں باپ کو کیوں ملازم نہ رکھوں، یہ ہے نئی تہذیب و تمدن، انسانیت ختم، عاطفت ختم، جانوروں میں جو شفقت پائی جاتی ہے وہ بھی انسانوں میں مفقود ہے، وہ خود جن فواحش، منکرات اور عریانیوں میں

غرق ہیں چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو بھی غرق کر دیں، افسوس ہے کہ ہم اسی بدترین زندگی کو اپنا کر ان کے نقش قدم پر جا رہے ہیں۔

بہر حال اسلام کے دشمن رات دن اس فکر میں ہیں کہ کسی طرح اسلام کی برکات سے ہمیں محروم کر دیں تو جب تک ہمارے نوجوان، طالب علم، پروفیسر، تاجر، کسان غرضیکہ ہم سب مل کر اپنے دین کو بچانے کی فکر نہیں کریں گے اس وقت تک بے دینی کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا ممکن نہیں ہوگا اس سیلاب کو روکنا کسی مخصوص طبقے کے بس کا کام نہیں البتہ اتنا ہو جائے گا کہ یہ لوگ اپنے دین کو بچالیں، لیکن جس عالمگیر پیمانے پر بے دینی کا سیلاب آیا ہے جب تک اسی پیمانے پر اسے روکنے کے لئے محنت نہیں کی جائے گی اس وقت تک یہ نہیں رکے گا۔

ہمارا دینی فرض

میری زندگی کا موضوع مسائلِ حیات پر غور کرنا ہے، میں بہت تڑپ رہا ہوں ایک چھوٹی سی درس گاہ میرے پاس ہے دو چار سو طالب علم پاس بیٹھے رہتے ہیں لگا رہتا ہوں لیکن جب سوچتا ہوں کہ میرا کام اس سے پورا ہو گیا، تو دل جواب دیتا ہے قطعاً نہیں، میں اپنے کو دھوکا دوں گا اگر میں یہ سمجھ لوں کہ میں نے بخاری شریف کا درس دے لیا اور میرا کام پورا ہو گیا، دین کا تقاضا ہے کہ اگر آگ لگی ہو تو اسے بجھانے کے لئے مجھے جانا چاہیے، اللہ تعالیٰ شاید مجھے نہیں چھوڑیں گے کہ دنیا میں فسق و فجور کی آگ لگ رہی تھی ایک جہان اس میں جل رہا تھا اور یہ میں بخاری شریف پڑھا رہا تھا۔

میرے دوستو! میں اور آپ ایک کشتی کے مسافر ہیں، ہماری منزل آخرت ہے اگر اس کشتی میں کوئی سوراخ کر دے تو ہم سب غرق ہوں گے اس لئے اس کے ہاتھوں کو پکڑنا اور اس کی صحیح راہنمائی کرنا ہمارا سب کا فرض ہے، اس لئے میں آپ حضرات سے اس مختصر وقت میں یہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خدا کے لئے دنیا کو مقصد نہ بناؤ، اپنے منصب کو پہچانو، اپنے وقت کی قدر کرو اور حق تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کی تیاری کرو اور اسلام کا پیغام دنیا کو پہنچاؤ، اس کے لئے کسی خاص فراغت اور فرصت کی ضرورت نہیں، تم ہر جگہ رہ کر ہر حال میں اسلام کی خدمت کر سکتے ہو، اگر آپ نے ایسا کر لیا تو واللہ دنیا کی کامرانی بھی آپ کے ہاتھ ہوگی اور اگر بالفرض کامیابی

نہ بھی ہوئی تو آپ کا کام تو بہر حال پورا ہو ہی گیا۔

عالمگیر فتنوں کے مقابلہ کے لئے تبلیغی جماعت کا وجود

اب میں ایک ضروری مضمون عرض کر کے ختم کرتا ہوں، ایک دفعہ مکی مسجد (کراچی) جانا ہوا، میں کبھی کبھی وہاں چلا جاتا ہوں۔ وہاں تبلیغی حضرات نے مجھے پکڑ لیا اور کچھ بیان کرنے کی دعوت دی میں نے سوچا کیا بیان کروں، بولنا مجھے آتا نہیں، خیر میں ان حضرات کے اصرار پر بیٹھ گیا، الحمد للہ رب العلمین کی آیت پڑھی، بس پھر کیا تھا قرآن کی برکت سے سینہ کھل گیا، عجیب وغریب مضامین ذہن میں آئے، کوئی ڈیڑھ دو گھنٹہ بیان ہوا، تفصیل تو مجھے اب یاد نہیں رہی کچھ مضمون یاد ہے وہی اس موقعہ پر عرض کرنا چاہتا ہوں، میں نے کہا اللہ جل ذکرہٗ عالمین کا رب ہے اس کی ربوبیت کے کرشمے ظاہر ہیں لیکن اتنے عجیب وغریب کہ عقل حیران ہے، جسمانی ربوبیت کی تفصیل کو چھوڑتا ہوں، صرف روحانی ربوبیت کو دیکھئے کہ نبوت ختم ہو چکی ہے علماء امت کی مساعی اول تو ناکافی ہیں پھر جتنی کچھ ہیں وہ بھی کامیاب نہیں اور نئی نسل کی تباہی اور گمراہی کے لئے بیسیوں فتنے موجود ہیں، تھیٹر سینما وغیرہ وغیرہ اخلاق کی قربان گاہ تھے ہی اب تو بے دینی کے انتہائی غلبہ اور تسلط کی وجہ سے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا بھی جو حال ہے وہ آپ کو معلوم ہے، اخبارات میں روزانہ اس کی خبریں آپ پڑھتے ہیں، اس کے علاوہ وہ ممالک جو فحاشی اور بے حیائی کے مرکز ہیں امریکہ برطانیہ وغیرہ ان ممالک سے مواصلات اور رسل ورسائل کی آسانی کی وجہ سے فتنوں کا ایک تانتا بندھا ہوا ہے۔

الغرض ان حضرات کی برکت سے پوری بات ذہن میں آگئی، میں ان تبلیغی حضرات کے اخلاص کا بڑا معتقد ہوں، اب بھی بعض مخلصین کی وجہ سے بول رہا ہوں، ورنہ مجھے بیان کرنا نہیں آتا، تو دل میں یہ بات آئی کہ اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کا کرشمہ یوں ظاہر ہوا ہے کہ ان عالمگیر فتنوں کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے تبلیغی جماعت کا یہ نظام جاری فرما دیا، یہ وہ نظام ہے جو عالمگیر بننا چاہتا ہے اس میں عالم بھی کھپ جاتا ہے اور ان پڑھ بھی، امیر بھی اور غریب بھی، تاجر بھی اور صناع بھی، کالا بھی اور گورا بھی، مشرقی بھی اور مغربی بھی، اگر اس زمانے میں یہ تبلیغی نظام جاری نہ ہوتا تو گویا اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کا کمال ظاہر نہ ہوتا، ورنہ ہمارے مدارس، تعلیمی ادارے

اسکول اور کالج جتنے آدمی تیار کرتے ہیں وہ تو اس عالمگیر سیلاب کے لئے کافی نہیں تھے، یہ تبلیغ والے ایک گشت لگاتے ہیں، سیلاب کے طریقہ سے آتے ہیں اور دو چار پانچ دس آدمیوں کی ہدایت کا سامان بن جاتے ہیں، کہیں کسی کو امریکہ سے پکڑ لاتے ہیں کہیں لندن سے، مصر کے صدر ناصر نے پانچ ہزار مبلغ بھیجے اور سالانہ کروڑوں روپیہ ان پر صرف ہوتا ہے لیکن ان سے پوچھئے کہ کتنے لوگوں کو صحیح مسلمان بنایا، ادھر تبلیغی نظام کی برکات آپ کے سامنے ہیں کہ ہزاروں لاکھوں بندگانِ خدا کی ہدایت کے لئے یہی نظام ذریعہ بن گیا تو اللہ پاک نے تبلیغی جماعت کا جو نظام جاری فرمایا ہے یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی روحانی ربوبیت کا ایک کرشمہ ہے جو اللہ پاک نے اس امت کے اندر ظاہر فرمایا ہے تاکہ اللہ کی حجت پوری ہو جائے اور کسی کو یہ کہنے کا موقعہ نہ رہے کہ میرے پاس فرصت نہ تھی، اللہ نے یہ نظام ہی ایسا جاری فرمایا کہ مشغول سے مشغول آدمی بھی اس میں کھپ سکتا ہے، اس نظام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے یہ سبق دیا کہ تمہارے ذمے اس پیغام کا پہنچانا ہے، اگر کسی کو "لا إلٰهَ إلا الله محمد رسول الله" یاد ہے وہ یہی دوسرے بھائی کو سکھا دے، کسی کو سبحانك اللهم یاد ہے وہ سکھا دے کیونکہ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کو یہ بھی یاد نہیں تو اللہ رب العالمین کی ربوبیت کا جیسا مادی نظام ہے ایسا ہی تبلیغی جماعت کا وجود میرے نزدیک روح کی غذا اور آخرت کی تیاری کے لئے اللہ تعالیٰ کا روحانی نظامِ ربوبیت ہے یہ ایک "مختصر متن" ہے جس کی شرح پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں اس لئے میں آپ حضرات سے یہی عرض کروں گا کہ آپ اس جماعت سے تعلق رکھیں، خدا تعالیٰ آپ کو توفیق دے، آپ دنیا کے اندر انقلاب پیدا کر دیں گے، فرض شناسی اور دین پر چلنے کی ہمت آپ میں پیدا ہو گی اور اس کی وہ لذت، فرحت اور مسرت آپ کو حاصل ہو گی کہ ؎ لذتِ ایں بادہ بخدا نشناسی تانہ چشی

اور سچ پوچھئے تو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں وہ لذت، وہ سرور اور وہ اطمینانِ قلب رکھا ہوا ہے کہ بے چارے بادشاہوں کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی اور یہ وہ دولت ہے جو آج دنیا میں مفقود ہے، امریکہ اور برطانیہ کو خبر نہیں کہ ان بوریا نشین فقیروں کے پاس سکونِ قلب کی کتنی بڑی دولت ہے، ان کا حال تو وہی ہے جو قرآن مجید میں بیان فرمایا گیا ہے۔

((وإنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ)) اور بے شک جہنم محیط ہے کافروں کو

آخرت میں تو جہنم ان کو گھیرے ہوئے ہوگی ہی، یہ دنیا بھی ان کے لئے سراپا جہنم بن کر رہ گئی ہے تو اللہ جل ذکرہ نے تبلیغی جماعت کے ذریعہ ہدایات کا سامان پیدا کر دیا ہے اور آپ کے لئے اپنی اور اپنے بھائیوں کی اصلاح کی صورت پیدا کر دی ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائیں کہ ہم اس پر گامزن ہو جائیں تاکہ ہماری زندگی درست ہو جائے، ہماری ساری زندگی آخرت کے لئے بن جائے اور ہمیں آخرت کی جاودانی زندگی نصیب ہو جائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العلمین۔

محرم الحرام ۱۳۸۸ھ

"تبلیغِ دین و دعوت الی اللہ"

عرصہ دراز سے اُمتِ محمدیہ سے ایک اہم تقصیر ہو رہی اور خیر القرون کے بعد سے ہی اس تقصیر کی بنیاد پڑ گئی تھی یعنی "تبلیغِ دین" اور "دعوت الی اللہ" میں قابلِ حسرت کوتاہی ہو رہی ہے، دعوت وہدایت دینِ اسلام کا اساسی اصول ہے، جب دعوت ناکام ہو اور اس کی اشاعت کے راستے میں روڑے اٹکائے جائیں تو "جہاد و قتال" کی نوبت آتی ہے، قرونِ اولیٰ کے سلفِ صالحین گفتار سے زیادہ اپنے کردار سے یہ دعوت پیش کرتے رہے، قوتِ بیانی سے پہلے اخلاقی و ایمانی قوت سے دعوت دیتے رہے، ہر ایک صحابی سر سے پیر تک اسلامی اخوت، اسلامی مواسات اور اسلامی اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھا، دُنیا میں اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے دینی حسن و جمال اور حسنِ اخلاق کے کمال سے پھیلا، تلوار کے زور سے نہیں پھیلا، صاحبِ انصاف و صاحبِ عقل و بصیرت موٴرخ اس سے بے خبر نہیں، اگر مسلمان اس اہم فریضہ میں کوتاہی نہ کرتے تو شاید تمام عالم مسلمان ہوتا، تکوینی مصالح تو حق تعالےٰ ہی جانتا ہے تاہم دنیا کے مزاج میں کفر و اسلام کے امتزاج سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن جہاں تک عقل اور اسلامی اصولوں کا تقاضا ہے وہ یہی ہے جو کچھ عرض کیا جا رہا ہے، چنانچہ اپنے اثرات کے اعتبار سے دیرپا اسلام وہی رہا، جو دعوت وارشاد کے راستوں سے پھیلا ہے، اسلامی فتوحات کے ادوار میں یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ حضراتِ صحابہ کے عہدِ میمون میں جو ممالک اسلام کے زیرِ نگین آئے وہ آج تک اسلام پر قائم ہیں اور بعد میں سلاطینِ اسلام کی تلوار سے جو مسلمان ہوئے وہ یکے بعد دیگرے اسلام سے نکلتے جا رہے ہیں، نیز یہ فرق بھی واضح ہے کہ قرونِ اولیٰ کے مفتوحہ ممالک میں عقائد کی پختگی آج بھی باقی ہے، اگرچہ اعمال و اخلاق میں یورپ کی نقالی کا رنگ غالب ہے، اس کے برخلاف جو ممالک بعد میں سلاطینِ اسلام اور ملوکِ اسلام کے زورِ تلوار سے فتح ہوئے ہیں ان میں عقائد کی خامی واضح ہے اگر کہیں اعمالِ ظاہری میں بظاہر پختگی بھی نظر آئے تو کرید نے کے بعد معلوم ہو گا کہ قلبی عقیدہ اتنا کھوکھلا ہو چکا

ہے کہ ایک دھکے سے ختم ہو جاتا ہے، در اصل ابتدائی دور کی فتوحات میں اخلاص نمایاں تھا، انہوں نے اگر جہاد بھی کیا تو وہ بھی صرف اس غرض سے تھا (لتکون کلمة الله هی العلیا) (تاکہ صرف حق تعالےٰ کا دین غالب ہو) اس لئے ان فتوحات کی برکات سے مسلمانوں کے عقائد میں پختگی پائی جاتی ہے اور جو ملک بعد میں فتح ہوئے ان میں اخلاص کا وہ درجہ نہ تھا، بلکہ ملوکیت اور شان و شوکت کی آمیزش تھی اس لئے وہ دینی تصلب حاصل نہ ہو سکا، کہنا یہ تھا کہ دعوت وارشاد میں امت مقصر رہی ہے اور آج جو نقشہ اسلام اور مسلمانوں کا ہے اسی تقصیر کے نتیجے ہے۔

تبلیغی جماعت اور اس کے شاندار اثرات

حق تعالےٰ کی ہزاروں ہزار رحمتیں ہوں حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی رُوح پر جنہوں نے مسلمانوں کو بھولا سبق یاد دلایا اور اس سبق یاد دلانے میں ہی فنا ہو گئے، اگر کوئی فنا فی اللہ، فنا فی الرسول اور فنا فی الشیخ کے مظاہر کو سمجھنا چاہتا ہو تو حضرت مرحوم کو دیکھ لے کہ کس طرح "فنا فی التبلیغ" ہو گئے تھے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے بس یہی فکر ہی دامنگیر تھی، تمام زندگی اور تمام افکار و انفاس بس اسی مقصد کے لئے وقف تھے حق تعالیٰ نے ان کی جانفشانی و قربانی، ایثار و اخلاص اور جد و جہد کو قبول فرمایا اور چار دانگ عالم میں اس کے ثمرات و برکات پھیل گئے، شاید روئے زمین کا کوئی خطہ ایسا باقی نہ رہا ہو گا جہاں ان کی جماعت کے قدم نہ پہنچے ہوں، ماسکو فنلینڈ و اسپین سے لے کر چین و جاپان تک ان قافلوں کی دعوت انبیاء کرام علیہم السلام کے طریق دعوت سے بہت مشابہت رکھتی ہے، اس کا انتظار نہیں کہ لوگ خود آئیں گے اور دین سیکھیں گے بلکہ گلی کوچوں اور بازاروں میں چل پھر کر اور گھر گھر لوگوں کے پاس پہنچ کر دعوت دی جاتی ہے اور زبان سے، حسنِ اخلاق سے اور اپنے طرزِ عمل سے دعوت دی جاتی ہے، سر سے پیر تک اسلامی مجسمہ بن کر اسلام کا عملی نمونہ پیش کیا جاتا ہے اس لئے اس کا اثر یقینی ہوتا ہے۔

آج اُمت تقریر وتحریر کی محتاج نہیں، یہ بہت کچھ ہوچکا ہے، ضرورت عملی نمونہ پیش کرنے کی ہے، فصاحت وبلاغت کا دریا اُمت بہا چکی ہے لیکن آج صرف سادہ عملی دعوت کی ضرورت ہے، الحمدللہ کہ آج تبلیغی جماعت اس پر عمل پیرا ہے، بہرحال طبیب خود مریض کے پاس جاتا ہے اس کا انتظار نہیں کرتا کہ مریض طبیب کے پاس پہنچے تو علاج ہو، اگر یہ طریقہ عام ہوجائے اور امت کی اکثریت یا کم از کم بڑی کثرت اس مقصد کو شروع کردے تو توقع ہوسکتی ہے کہ امت کو نجات مل جائے اور بیڑہ پار ہوجائے، اگر امت پوری طاقت اسی طرح اصلاح ودعوت پر لگائے اور معاشرے کی اصلاح ہوجائے تو ہوسکتا ہے کہ آئندہ اقتدار بھی انہی صالح ہاتھوں میں آجائے اور پھر جو کام سالوں میں ہوتے ہیں وہ منٹوں میں ہوجایا کریں، بنیادی اصول بھی یہی ہے کہ پہلے معاشرے کی اصلاح کی جائے اگر اصلاح شدہ معاشرے کے افراد کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور ہو تو کامیابی یقینی ہے ورنہ امت کا وہی حشر ہوگا جو آج ہورہا ہے اور اکثریت کے جو نمائندے مسندِ حکومت پر براجمان ہیں ان کا "صورت ببین حالش مپرس" والا قصہ ہے، اس طرح بلاشبہ کچھ دیر تو لگے گی، لیکن قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ میں دس پندرہ سال کا عرصہ کچھ زیادہ نہیں ہوتا، آج قوم کی کشتی جس خطرناک بھنور میں پھنس گئی ہے روزانہ اخبارات کے صفحات میں اس کو دیکھئے اور پڑھئے، حیرت واضطراب کی کوئی انتہا باقی نہیں رہتی، لے دے کر ایک عالمِ دین مسندِ حکومت پر متمکن ہوا، مگر شیطانوں کے لئے اس کا وجود بھی ناقابلِ برداشت ہے، خدا جانے کتنی مشکلات ان کے لئے پیدا کی جارہی ہیں، کتنے روڑے ان کے راستے میں اٹکائے جارہے ہیں، تمام شیاطین الانس والجن مقابلے پر سینہ تان کر کھڑے ہوگئے ہیں، الغرض جب تک معاشرے کی اصلاح نہ ہوجائے نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے، اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں۔

لندن میں بین الاقوامی تبلیغی اجتماع

لندن سے برادرم محترم مولانا مفتی عبدالباقی کا ایک مکتوبِ گرامی آیا تھا جس میں بین الاقوامی

تبلیغی اجتماع (لندن)، کا ایک منظر پیش کیا گیا ہے اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اس سے اس کی تائید ہوتی ہے نامناسب نہ ہوگا اگر اس کا اقتباس پیش کروں وہ لکھتے ہیں:

(۱) بین الاقوامی تبلیغی اجتماع ختم ہو چکا، تثلیث کے اس ملک میں توحید کی آواز عجیب منظر پیش کر رہی تھی، ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا قرونِ اولیٰ کے بچے بچھلائے لوگ (جن کی زندگی میں اسلام کی جھلک نظر آرہی تھی) جمع ہوئے ہیں، ان میں لمبی لمبی ڈاڑھیوں والے، لمبے لمبے کرتوں والے، پاجاموں والے، شلواروں والے، بڑی بڑی پگڑیوں والے تھے جنہیں دیکھ کر "گورے لوگ" محوِ حیرت بھی تھے اور محوِ تماشا بھی۔

جب ہندوستان کا وفد لندن کے ہوائی اڈہ "ہیتھرو" بلڈنگ نمبر ۳ پر تشریف لایا تو قانونی کارروائی سے فراغت کے بعد سب سے پہلے امیر التبلیغ حضرت مولانا انعام الحسن صاحب باہر تشریف لائے نہ زندہ باد یا مردہ باد کے نعرے، نہ ہنگامہ نہ شور و شر کچھ بھی نہیں تھا بلکہ انتہائی وقار اور خاموشی کے ساتھ، لبوں پر تبسم، چہروں پر طلاقت، اطمینان اور سکون کی فضا میں معانقے ہوئے، مصافحے ہوئے اور پھر دعا شروع ہوئی جس میں آہیں، سسکیاں اور پھر آخر میں دھاڑیں مار کر رونے کی آوازیں بلند ہوئیں، تثلیث کے پرستار نیم عریاں لباس میں کیمرے تان کر کھڑے تماشہ کر رہے تھے اور تماشہ دکھا رہے تھے، ان کو فوٹو اتارنے سے منع کیا گیا تاہم چپکے چپکے سے وہ کیمروں کو ہلاتے رہے، سراپا حیرت کے مجسمے بنے ہوئے تھے، چونکہ لندن ایرپورٹ (ہیتھرو) پر ایک منٹ میں جہاز اترتا ہے اور قریباً دوسرے میں اڑتا ہے اس لئے مسافروں کا تانتا بندھا رہتا ہے، مسافر آتے جاتے تھوڑی دیر کے لئے ضرور رکتے اس لئے کہ منظر ہی ایسا تھا کہ ہر ایک کو دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔

(۲) یہ مجمع مرکزِ تبلیغ لندن گیا اور پھر دوسرے دن اجتماع گاہ شیفیلڈ میں پہنچا،

تین دن شیفیلڈ میں بڑی رونق رہی، خاص طور پر جب خیموں میں اور خیموں سے باہر میدان میں نمازوں کے لئے صفیں درست ہو جاتی تھیں تو اس منظر کو دیکھنے کے لئے محلِ اجتماع سے باہر فٹ پاتھوں پر انگریز مرد اور انگریز عورتیں کافی تعداد میں کھڑے ہو کر تماشہ کرنے لگتے، یہ رُوح پرور منظر ان پر بڑا اثر انداز ہو رہا تھا، اجتماع میں قریباً اٹھائیس ملکوں کے وفود شامل ہوئے جو آسٹریلیا کے علاوہ باقی چاروں براعظموں کے مختلف بولی بولنے والے، مختلف نسل و رنگ کے لوگ تھے، کینیڈا، امریکہ، افریقہ اور ایشیا اور یورپ، عرب و عجم، اسلام کے عالمگیر دین ہونے کا عملی نقشہ نظر آ رہا تھا، قریباً بارہ سو آدمیوں نے چار مہینوں، چلوں اور کم و بیش وقت لگانے، دور اور دیر کے لئے نکلنے کے لئے اپنے نام پیش کئے، بائیس جماعتیں بیرونی ممالک کے لئے تیار ہو گئیں اور بیالیس اندرونِ ملک کے لئے۔

(۳) کینیڈا اور امریکہ سے آئی ہوئی جماعتوں میں قریباً پندرہ آدمی حاجی حسین احمد جاجبھائی کی مسجد میں (جہاں میرا قیام ہے)، جہاز کی روانگی میں تاخیر ہونے کی وجہ سے بارہ دن تک ٹھیرے، رات کو عشاء کی نماز کے بعد یہ لوگ ٹرانسلیٹر (ترجمان) کے ذریعہ مجھ سے سوالات کرتے رہتے اور میں ان کو جوابات دیتا رہتا، کبھی کبھی چار چار ترجمان ہوتے تھے، یہ سلسلہ رات کے ڈیڑھ بجے اور کبھی دو دو بجے تک چلتا تھا، انہوں نے مختلف موضوعات پر سوالات کئے، علمِ رمل، علمِ جفر، علمِ نجوم، قیافہ، پامسٹری، کہانت، الہام، وحی، عذابِ قبر، برزخ، دوزخ، جنت، علاماتِ قیامت، دجال، امام مہدی علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام، یاجوج ماجوج دیدارِ الٰہی سے لے کر خوابوں کی تعبیرات تک سوالات کئے، چونکہ ان میں اکثر نو مسلم تھے اس لئے علم کے بہت پیاسے تھے آخر میں انہوں نے کہا کہ نیویارک میں ہمارے اور بہت سے بھائی ہیں، جو اپنے سوالات کے تسلی بخش جوابات چاہتے ہیں آپ ہمارے ساتھ نیویارک

اور کینیڈا چلیں، بہت عذر پیش کیا کہ مجھے انگریزی نہیں آتی وغیرہ ہاں اگر یہ میرے ترجمان میرے ساتھ جائیں تو کسی وقت آپ کے ہاں آنا ہو سکتا ہے، لیکن یہ لوگ بضد رہے، پھر یہ لوگ واپس چلے گئے، یہ اکثر کالے رنگ اور نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

(۴) ہم نے محمد علی کلے سے متعلق ان سے پوچھا تو انہوں نے محمد علی کلے کے بارے میں کسی اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا، کہنے لگے اس نے آج تک پورا کلمہ نہیں پڑھا، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پڑھتا ہے اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے محمد رسول اللہؐ آج تک نہیں پڑھا اور اس نے آج تک نماز نہیں پڑھی اور بہت مالدار ہے کبھی زکاۃ نہیں نکالی اور حج ابھی تک نہیں کیا، روزہ کا حال خدا کو معلوم ہے۔

"تبلیغِ دین اور دینی مدارس"

بہرحال میرا ناقص خیال ہے کہ جتنے عملی فتنے رونما ہو رہے ہیں ان کی اصلاح کے لئے یہ طریقہ دعوت اور اس میں شمولیت بلاشبہ مؤثر نسخہ اور علاج ہے لیکن علمی فتنوں کے لئے ٹھوس علم کی ضرورت ہے، آج کل اعدائِ اسلام مستشرقین وغیرہ اسلام کے بنیادی مسائل کو ڈائنامیٹ لگا رہے ہیں، قرآنِ کریم کے کلامِ الٰہی ہونے میں شبہات، حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں وساوس، فقہِ اسلامی پر تنقیدات واعتراضات، ان علمی فتنوں کی سرکوبی کے لئے ٹھوس علمِ دین، جدید علمِ کلام، جدید سائنس، معلوماتِ عامہ، حسنِ تحریر، شگفتہ بیانی، سنجیدہ متوازن دماغ، پیہم کوشش اور صالح و مؤثر لٹریچر کی ضرورت باقی رہے گی جو علم سے ناواقف تبلیغی حضرات یہ تصور قائم کر لیتے ہیں کہ اب نہ مدارس کی ضرورت ہے نہ خانقاہوں کی، یہ غلو ہے، جہل ہے، علمِ دین تو تمام دینی کاموں کے لئے بنیاد ہے، امت علومِ دینیہ سے کسی وقت بھی بے نیاز نہیں ہو سکتی، جب مسلمانوں میں علمی فتنوں کا دور زیادہ نہ تھا اس وقت بھی علومِ اسلامیہ میں مہارت کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا تھا، سابقہ ادوار میں اربابِ اقتدار کو علمی فتنوں کے عام کرنے کا موقع

بہت کم ملا، شخصی طور سے فتنے برپا کئے جاتے تھے صرف امام احمد بن حنبل کے دور میں مامون عباسی کو اقتدار کے ذریعہ "خلقِ قرآن" کا فتنہ مسلط کرنے کا موقع ملا اور اس کے بعد ابن معتصم لیکن آج تو برطانوی و امریکی اور روسی اقتدار کے سایہ میں فتنوں پر فتنے پرورش پا رہے ہیں اتنی بڑی بڑی طاقتور حکومتیں خود مختلف راستوں سے علمی فتنے پھیلانے میں مصروف ہیں، اگر علماءِ امت نہ ہوتے اور ان کے دانت کھٹے نہ کرتے تو آج اسلام کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اور خاکم بدہن اسلام صفحہ ہستی سے کبھی کا مٹ چکا ہوتا، یہ تو ان بوریہ نشین علماء کے کارنامے ہیں کہ آج بھی اسلام باقی ہے اور جو کچھ حصہ باقی نظر آ رہا ہے وہ سوکھی روٹی کھانے والوں کا رہین منت ہے، بہرحال عصرِ حاضر کے علمی فتنوں کے پیشِ نظر علمی خدمات اور علمی مدارس کی اہمیت پہلے سے ہزار گنا زیادہ ہے، نیز آج کے پُرآشوب دور میں جب عقیدۂ اسلامی بہت کمزور ہو گیا ہے اس کی حفاظت کے لئے علم دین کی ضرورت بہت زیادہ ہے، لینن و کارل مارکس و ماؤزے تنگ کے اقتصادی فلسفوں کے سرکوبی کے لئے حاذق علماء کی ضرورت ہے، ہاں یہ ضروری ہے کہ اربابِ علم پوری طرح جدید علمی ہتھیاروں سے مسلح ہوں تاکہ صحیح مقابلہ ہو سکے، عصری تقاضوں کے پیشِ نظر جدید علمی تربیت سے آراستہ ہونا اور جدید معلومات فراہم کرنا اور نئی دنیا سے باخبر ہونا بے حد ضروری ہے، بس شکوہ اگر ہے تو اس کا ہے کہ صحیح پختہ کار علماء کا وجود کبریتِ احمر ہے۔

بہرحال خدمتِ دین اور اسلام کو ان علمی فتنوں سے بچانے کے لئے محقق اور بابصیرت اربابِ علم کی بے انتہا ضرورت ہے اور ان علمی خدمات کو مؤثر بنانے کے لئے انتہائی اخلاص کی شدید حاجت ہے، نرے علم پر مطلوبہ ثمرات مرتب نہیں ہو سکتے جب تک علم کے ساتھ اخلاص نہ ہو؟ قبولیت عند اللہ کے لئے اخلاص کا ہونا تو بالکل واضح ہے، لیکن علمی خدمات پر صحیح اثرات مرتب ہونے کے لئے بھی اخلاص کے بغیر چارۂ کار نہیں، گویا قبول عند الناس بھی ثمرہ ہے قبول عند اللہ کا، کہنا یہ ہے کہ تبلیغی خدمات اور موجودہ طرز پر دین کا جو کام ہو رہا ہے بلاشبہ دین ہے اور اہم جزوِ دین لیکن یہ سمجھنا کہ بس یہی دین ہے اور اس کے بعد علمِ دین کی ضرورت نہیں، یہ بالکل غلط

بلکہ گمراہی ہے[1]۔ آج کل ایک سب سے بڑا فتنہ یہ ہے کہ جو اربابِ علم ہیں وہ صرف علم اور تعلیم پر قناعت کر کے بیٹھ گئے ہیں اور جو اربابِ عمل اور اربابِ دعوت ہیں وہ اپنے آپ کو علم اور علماء سے مستغنی سمجھتے ہیں، علماء کو میدانِ عمل میں آنے کی ضرورت ہے اور اربابِ عمل کو علم حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی ساتھ قدم قدم پر اخلاص کی ضرورت ہے۔

---

[1] علمائے اہلِ حق سے سوءِ ظن اور ان کی بے وقعتی بہت ہی خطرناک ہے علماءِ کرام سے استغناء گمراہی اور کجروی کا پہلا زینہ ہے، کسی کجرو جماعت یا تحریک کی پہلی علامت یہ ہے کہ وہ علماءِ حق سے بے نیاز ہو، تفصیل کے لئے حضرت شیخ الحدیث الحاج مولانا محمد زکریا کاندھلوی دامت برکاتہم کی تصنیف "الاعتدال فی مراتب الرجال" کا مطالعہ کیا جائے۔

الحمد للہ تبلیغی جماعت کے اکابر کو ہمیشہ اس کا اہتمام رہا کہ اس کام میں عوام کا علماء سے جوڑ ہو وہ ان کی قدر و قیمت کو سمجھیں اور ان سے استفادہ کریں، حضرت مولانا محمد الیاسؒ مختلف عنوانات سے بار بار اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے، ایک بار فرمایا: "ایک عامی مسلمان کی طرف سے بدگمانی بھی ہلاکت میں ڈالنے والی ہے اور علماء پر اعتراض تو بہت سخت چیز ہے۔" پھر فرمایا: "ہمارے طریقۂ تبلیغ میں عزتِ مسلم اور احترامِ علماء بنیادی چیز ہیں، ہر مسلمان کی بوجہ اسلام کے عزت کرنی چاہیئے اور علماء کا بوجہ علم کے بہت احترام کرنا چاہیئے۔" ایک موقعہ پر فرمایا: "ہمارے کارکن جہاں بھی جاویں وہاں کے حقانی علماء و صلحا کی خدمت میں حاضری کی کوشش کریں الخ۔" ایک صاحب کو تحریر فرمایا: علم کے فروغ اور ترقی کے بقدر اور علم ہی کے فروغ اور ترقی کے ماتحت دینِ پاک فروغ اور ترقی پا سکتا ہے، میری تحریک سے علم کو ذرا بھی ٹھیس پہنچے، یہ میرے لئے خسرانِ عظیم ہے، حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور حضرت مولانا محمد یوسفؒ (نور اللہ مرقدہما) کی اس قسم کی بے شمار تصریحات ہیں۔ (تفصیل کے لئے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی مدظلہٗ کی تازہ تالیف "دہلی کی تبلیغی جماعت پر عمومی اعتراضات اور ان کے مفصل جوابات" ملاحظہ فرمائیے۔

اس سے معلوم ہوا وہ تبلیغی کارکن جو علماءِ کرام کی مساعی کو (بعض اس وجہ سے کہ وہ تبلیغی کام میں لگے ہوئے نہیں) قدر و منزلت کی نظر سے نہیں دیکھتے وہ ناپختہ کاری کی وجہ سے دعوت کے مزاج سے ناآشنا ہیں یا بقول حضرت شیخ الحدیث دراصل وہ دعوت کے کام میں لگنے سے پہلے علمائے کرام سے بیزار تھے اور اس کام میں لگنے کے بعد بھی ان کی خو نہ بدلی، گویا طالبِ علم چور نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات چور طالب علمی کرنے لگتے ہیں۔" (مدیر)

جب علم وعمل واخلاص تینوں باتیں جمع ہو جائیں گی تو اس کے بہترین نتائج وبرکات ظاہر ہوں گے مزید برآں سراپا اخلاص بن کر بھی حق تعالےٰ کی توفیق وفضل کی ضرورت ہے، افسوس کہ مادیت کے اس دردناک دور میں تمام دینی اقدار ختم ہو گئے اور یہ سارے دینی کلمات صرف بے معنی الفاظ رہ گئے، مسلمانوں کے معاشرے میں اتنا شدید انقلاب آگیا کہ تمام دینی اصطلاحیں مسلمانوں کی زندگی میں بے حقیقت الفاظ رہ گئے، اگر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ اور دورِ اوّل کے مسلمان زندہ ہو کر ہمارے دورِ حاضر کے نام لیوا مسلمانوں کی زندگیاں دیکھ لیں تو کیا فرمائیں ؟ اللہ تعالےٰ اپنے فضل وکرم سے صحیح اسلام پر قائم رکھے اور صحیح مسلمانوں کے خدوخال کی حفاظت فرمائے اور تقویٰ وطہارت کی حیاتِ طیبہ نصیب فرما کر فوز وفلاح کے مدارجِ عالیہ سے نوازے آمین۔

بحرمة النبی الأمین علیه صلوات الله وسلامه إلی یوم الدین۔

شوال المکرم ۱۳۹۲ھ ، دسمبر ۱۹۷۲ء

دنیا اور اس کی بے ثباتی

غالباً ۱۹۴۸ء کی بات ہے شیخ الاسلام حضرت استاذ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کراچی عامل کالونی میں قریشی صاحب کے مکان پر قیام فرما تھے میں پشاور سے کراچی آکر جامعہ ڈابھیل ضلع سورت جا رہا تھا، حضرت استاذ مرحوم نے مجھے تنہائی میں بُلا کر دو ارشاد فرمائے (۱) حکومت پاکستان کا خیال ہے کہ علماء کا ایک خیرسگالی وفد ممالک اسلامیہ عربیہ بھیجا جائے، مولوی عبدالعلیم صاحب صدیقی بھی ان میں ہوں گے، مجھ سے اصرار ہو رہا ہے کہ میں بھی ساتھ جاؤں لیکن اختلاج قلب کے مرض کی وجہ سے ہوائی جہاز کا سفر میرے لئے مشکل ہے جی چاہتا ہے کہ آپ ضرور جائیں علماء کے وفد میں ایک جید عالم اور عربی ادیب کا ہونا ضروری ہے۔ (۲) بلادِ عربیہ کے لئے سفراء کا تقرر کیا جا رہا ہے ظاہر ہے کہ سفارت پر تو اسی شخص کا تقرر کریں گے جو انگریزی کا ماہر ہو لیکن اس کے ساتھ بحیثیت معاون عربی دان کا تقرر ضروری ہے آپ ان بلادِ عربیہ کے لئے بہت موزون ہیں اور ان ممالک میں مصر سب سے زیادہ موزون ملک ہے جس میں آپ فراغت کے ساتھ علمی مشاغل بھی جاری رکھ سکیں گے، میری خواہش ہے کہ آپ اس کے لئے آمادہ ہو جائیں، مسٹر لیاقت علی خان میری بات کو رد نہیں کرتے وہ اس کو ضرور مان لیں گے، راقم الحروف نے پہلی بات کے بارے میں عرض کیا کہ اگر آپ تشریف لے جائیں تو میری انتہائی خوش قسمتی ہوگی کہ آپ کی خدمت کا شرف حاصل کرسکوں اور اگر آپ تشریف نہ لے جائیں تو پھر میں اس وقت اس خدمت سے معذور ہوں:

دوسری بات حضرت مرحوم نے ایسی بزرگانہ شفقت اور اخلاص سے فرمائی تھی کہ میں حیران تھا کہ کیا جواب دوں؟ دل نے تو سنتے ہی انکار کر دیا تھا لیکن جس بزرگانہ مرحمت نوازی سے اظہار فرمایا تھا، صاف انکار کرنا میرے لئے خلاف ادب تھا، عرض کیا: ڈابھیل پہنچ کر استخارہ کے بعد عرض کروں ؛ ڈابھیل پہنچا، جواب جو پہلے سے دل میں تھا وہی تھا، عرض کیا کہ حضرت: جب تک مجھے اس ملک میں علمی زندگی، کفاف کے ساتھ میسر ہے میں ان "مناصب" کا تصور بھی نہیں کر سکتا، اس وقت میرا مشاہرہ ڈابھیل میں ایک سو پچاس روپے تھا۔

حضرت شیخ الاسلام رحمہ اللہ کی قدر و منزلت جو پاکستان میں تھی وہ ظاہر ہے، پاکستان کے منصۂ وجود پر آنے سے چند سال قبل بمبئی میں موصوف نے مسٹر محمد علی جناح سے ان کی کوٹھی پر مالا بار ہل میں غلام حسن، احمد پی بٹلر اندیری کی وساطت سے جو اہم ملاقات کی تھی اس کے نتیجہ میں حضرتِ مرحوم نے جو اس وقت

دارالعلوم دیوبند کے صدارت کے عہدے پر فائز ہونے کو شش فرمائی اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ اور جمعیۃ علماءِ ہند کو مسلم لیگ کے ساتھ ایک معاہدہ کے بعد مسلم لیگ کی حمایت پر آمادہ کر دیا، ان اکابرِ امت کی مساعی اور لیگ کے شانہ بشانہ خدمات انجام دینے کے بعد ہی مسلمان قوم من حیث القوم لیگ میں شامل ہوئی اور مسٹر جناح کو دہلی کے عام مشترکہ اجلاس میں اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ بلا شبہ عوام پر آج بھی علماء کا اقتدار ہے" سوءِ اتفاق یا حسن اتفاق سے کچھ عرصہ کے بعد جمعیۃ علماءِ ہند اس خیال سے کہ مسلم لیگ اپنے معاہدہ پر قائم نہیں رہی اور جن شرائط پر معاہدہ ہوا تھا ان کا ایفا نہیں کیا گیا، مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گئی اور حسب سابق کانگریس کی ہم نوائی کرتی رہی لیکن حضرت شیخ الاسلام مرحوم بدستور مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ رہے اور تشکیلِ پاکستان کے سلسلہ میں اہم ترین خدمات انجام دیں لیکن ان کے اخلاص اور عالی ہمتی نے کبھی گوارا نہیں کیا کہ پاکستان قائم ہونے کے بعد اپنی خدمات کا کوئی صلہ حاصل کریں جس وقت اگست ۱۹۴۷ء میں اسمبلی کا پہلا اجلاس کراچی میں ہوا تو حضرت مرحوم بھی بنگال کی طرف سے اسمبلی کے ممبر تھے، اجلاس کے لئے تشریف لائے تھے اور بحیثیت مہمان گلِ رعنا کوٹھی سولجر بازار میں مقیم تھے پھر جیکب لائن میں شیخ محمد حیات الیکٹرک انجینئر کی دعوت پر ان کے مکان میں منتقل ہو گئے اور نہایت تکلیف و عسرت کی زندگی بسر کرتے رہے بعد ازاں عامل کالونی میں مسٹر قریشی کے بنگلے میں اقامت پذیر رہے اس موقعہ پر دیوبند سے کراچی کے فرسٹ کلاس کے ٹکٹ اور اسمبلی کے اجلاس کے ایام کا معاوضہ کل ۸۰۰ روپے کا چیک زندگی بھر میں وصول کیا ہے اور بس، سنا تھا کہ مسٹر لیاقت علی خاں مرحوم نے حضرت مرحوم کو کسی بنگلہ کی چابیاں ارسال فرمائی تھیں کہ وہاں سکونت اختیار کر لیں لیکن حضرتِ موصوف نے انکار فرمایا اور چابیاں واپس فرما دیں، اسی زمانہ کا ایک لطیفہ بھی یاد آیا، حضرت الاستاذ مرحوم جب پہلی بار اسمبلی کے اجلاس کی شرکت کے لئے تشریف لے گئے تو عام طور پر تقریریں سب انگریزی میں ہوئیں، اس روز جب واپس تشریف لائے تو بہت افسردہ تھے فرمایا: کہ ایسی زبان میں تقریریں ہوئیں کہ ہم سمجھ نہ سکے کہ کیا کہا گیا، اردو میں ہوتیں تو ہم بھی جواب دیتے اور ان کو معلوم ہوتا کہ علماء بھی کچھ جانتے ہیں اس کے بعد یہ ایک بلیغ جملہ فرمایا: "انگریزی زبان ان کے جہل پر ایک نقاب ہے، یہ نقاب اُترے تو حقیقت کھل جائے"۔

غرض یہ ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ نہ ہمارے اکابر نے کبھی ان مناصب کا خیال کیا اور نہ ان کے کفش برداروں نے ان دنیا کے مناصب کو کوئی وقعت دی اور نہ زندگی کا نصب العین بنایا۔

الحمدللہ نہ وزیر بننے کا شوق نہ کرسیٔ صدارت کی آرزو، نہ ادارۂ تحقیقات اسلامیہ کے ڈائرکٹر بننے کی تمنا نہ مشاورتی کونسل کی رکنیت کی خواہش نہ بڑے بڑے مشاہرات کی طرف رغبت۔ ہم بوریا نشین ہیں اور بوریا نشینی پر ہی ہم فخر کرتے ہیں، یہ مناصب، یہ کرسیاں، یہ گرانقدر تنخواہیں یہ متاعِ دنیا، یہ وجاہتیں تمہیں مبارک ہوں۔ آرزو صرف یہی ہے کہ پاکستان جس مقصد کے لئے بنا ہے، خدا کرے وہ فراموش نہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمتِ گرانمایہ "دینِ اسلام" اور یہ وراثتِ محمدی علیہ الصلاۃ والسلام ضائع نہ ہو جائے، سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ان ملاحدہ و زنادقہ کو دین میں کھلی ہوئی تحریف و الحاد کا موقع کیوں دیا جا رہا ہے؟ تم میزائل بناؤ، تم راکٹ تیار کرو، تم آسمان پر جاؤ، تم کرۂ قمر پر جاؤ یا مریخ پر پہنچو، تم بڑی بڑی تنخواہیں اور الاؤنس لو اور خوب عیش و عشرت مناؤ لیکن اللہ تعالیٰ کے اس دین کو برباد مت کرو اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ اغیار کا آلۂ کار مت بنو! یہ تمہارے دوست ہرگز نہیں بن سکتے خواہ امریکہ یا روس ہو خواہ برطانیہ یا فرانس یا جرمنی، خدارا ان دشمنانِ اسلام اور دشمنانِ پاکستان کی آرزوؤں کو خاک میں ملا دو، دین پر غیرت کرو اور مسلمان قوم کی آبرو کو بچاؤ۔ "ثقافتِ اسلامی کے نام پر غیرت سوز روح فرسا ننگِ انسانیت ہوس رانیوں کو چھوڑ دو، زندہ، باوقار غیور قوم بنو، امریکہ کی امداد کو بھی اس کے منہ پر مارو اور روس کی امداد کو بھی ٹھوکر مارو، تمہارے سامنے چینی قوم کی زندہ مثال موجود ہے ان سے سبق لو، دیکھو چند سال کے عرصہ میں یہ قوم صرف اپنے دست و بازو پر بھروسہ کر کے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر ہر اعتبار سے کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور اس راز کو معلوم کرو کہ روس جیسی جبار حکومت اور امریکہ جیسی دولت مند اور طاقت ور سلطنت دونوں اس قوم سے لرزہ براندام کیوں ہیں؟

علماء اور ان کا فریضہ

غالباً چار سال کا عرصہ ہوا کہ کراچی کے ڈپٹی کمشنر جناب منیر صاحب نے کراچی کے چند منتخب خطباء اور ائمہ مساجد اور علماء کو بلایا تھا کہ صدرِ مملکت کی طرف سے چند ہدایات آئی ہیں کہ آپ کے حضرات کو پہنچا دی جائیں :-

۱۔ "فیملی لاز" "عائلی قوانین" کی مخالفت نہ کی جائے۔

۲۔ خاندانی منصوبہ بندی اگرچہ قانون تو نہیں بنا ہے لیکن حکومت کی خواہش ہے کہ وہ کامیاب

ہو، آپ اس کی بھی مخالفت نہ کریں ۔

۳ ۔ مذہبی اختلافات کی بنا پر ہرگز کسی قسم کا نزاع اور تصادم نہ ہونے دیا جائے ۔

۴ ۔ اقلیتوں کے خلاف (یعنی عیسائیوں کے خلاف) کوئی قدم نہ اٹھائیں ۔

۵ ۔ مساجد میں "صلاۃ وسلام" پر جو شدید اختلافات ہیں ان کو ختم کیا جائے ، جہاں تک یاد ہے یہ ان ہدایات کا خلاصہ ہے ۔ راقم الحروف نے انتہائی جرأت کے ساتھ عرض کیا :-

ان ہدایات کے جواب میں کچھ عرض کرنے سے پہلے اتنا بتلا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس طرح اس کرسی پر آپ کو صدرِ مملکت نے بٹھایا ہے اس لئے آپ کا فرض تھا کہ ہم لوگوں تک ان کی ہدایات پہنچا دیں اسی طرح احکم الحاکمین نے ہمیں بھی ایک مسند پر بٹھایا ہے اس لئے ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم بے خوف وخطر نہایت صفائی اور جرأت کے ساتھ اس احکم الحاکمین کا پیغام اس سلسلہ میں آپ تک اور آپ کی وساطت سے صدرِ مملکت تک پہنچا دیں ، اس تمہید کے بعد جواب سنیئے !

۱ ۔ انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ جو قانون سابق ملعون دور میں بنا تھا اور قرآن وسنت اور اسلام کے بالکل مخالف تھا ، پوری قوم نے اس کی شدید مخالفت کی تھی اور سابقہ حکومت کو مجبوراً اس کو دفن کرنا پڑا تھا آخر کون سی ایسی مصلحت ہے کہ اس متعفن (سڑی ہوئی) لاش کو قبر سے نکال کر ہمارے سروں پر مسلط کیا جا رہا ہے ، حکومتِ مسلمہ کی اطاعت ہمارا مذہبی فریضہ ہے لیکن اگر حکومت غیر اسلامی قانون بنانے لگے تو اس کی مخالفت بھی ہمارا مذہبی فریضہ ہے ، اس کی اطاعت تو کیا اس پر سکوت بھی جرم ہے ۔

۲ ۔ خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں علماءِ امت نے از روئے اسلام وعقل اور از روئے اخلاق ومعاشرت غرض ہر پہلو سے اس کے نقائص اور خطرناک نتائج واضح کر دیئے ہیں اور خاص کر اس اسلامی ملک میں جو رسوا کن نتائج نمودار ہوں گے ان کی تفصیلات ایک ایک کر کے عیاں کر دی گئی ہیں ان حالات میں ہمارا اس کی موافقت کرنا یا خاموش رہنا بے حد مشکل بلکہ بدترین خیانت ہے ، اس سلسلہ میں جو کچھ اب تک کہا گیا ہے حکومت کا فرض تھا کہ کروڑوں روپیہ اس منصوبہ پر اندھا دھند خرچ کرنے سے پہلے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرتی اور اپنے اس فیصلہ پر نظرِ ثانی کرتی ، نام تو خانہ داری یا خاندانی منصوبہ بندی ہے صاف کیوں نہیں کہتے کہ "ضبطِ تولید"

کی تدبیر ہے۔

۳۔ مذہبی اختلافات کا دائرہ صرف علمی حد تک محدود رہنا ضروری ہے، اسٹیج پر عوام کے سامنے ان مسائل کو لانا یقیناً غلط اور فساد کا موجب ہے۔ اخلاص و دین و عقل کا تقاضہ یہی ہے کہ ان اختلافات کو علمی حلقوں اور تصنیف و تالیف کے دائرہ تک محدود رکھا جائے۔

۴۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکومت ان اقلیتوں کے ساتھ جو رواداری برت رہی ہے یہ اقلیتیں اس سے غلط فائدہ اٹھا کر اپنے حدود سے تباہ کن تجاوز کر کے ملک کے مسلمانوں کو مرتد بنا رہی ہیں" رسولِ اسلام" صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر ناقابل برداشت رکیک حملے کر رہی ہیں قرآنِ کریم کو نشانہ بنا رکھا ہے، اس مارشل لا کے دور میں اور دفعہ ۱۴۴ کے زمانے میں (اس وقت دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی)، ان کو عام جلسوں کی اجازت دی جاتی ہے، مسلمانوں کے ملک میں اور اسلامی حکومت کے عہد میں اسلام کے خلاف زہر اگلا جاتا ہے اور مسلمانوں کو آہ تک کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی؛ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ابھی دو ماہ پیشتر حیدر آباد میں اسی مشنری کے فتنہ پردازی سے انتہائی شرمناک واقعہ پیش آچکا ہے تعجب ہے کہ منیار ٹی کے ساتھ اتنی رواداری اور میجارٹی کے ساتھ یہ بے رُخی اور اتنی بے انصافی یہ کیسی سیاست ہے؟!

۵۔ صلاۃ وسلام فرض نمازوں کے بعد اعلان کر کے قیام کے ساتھ اور لوگوں کو اس پر مجبور کرنا اور جو نہ کرے اس کو وھابی وغیرہ وغیرہ طعنے دینا یہ قطعاً اسلام اور اسلامی روح کے منافی ہے صلاۃ وسلام کا جو طریقہ عہدِ نبوت سے چلا آرہا ہے وہی طریقہ باقی رہنا چاہیئے، اس موقع پر مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی نے کچھ اپنے مسلک کی طرف سے صفائی پیش کی تھی جس کا معقول جواب دیا گیا تھا۔

غرض یہ ہے کہ ہماری خواہش اور کوشش رہی ہے کہ حکومتِ وقت حالات کا صحیح جائزہ لے کر اسلامی احکام کی عظمت و توقیر کو اپنا فرض سمجھ کر قدم اٹھائے کہ "اسلامی حکومت" کا تقاضا یہی ہے جب صدر محترم نے خود صدارتی الیکشن کے موقع پر صاف الفاظ میں یہ اظہار فرمایا تھا کہ اگر میرے سامنے قوم "قانونِ اسلام" کا مطالبہ کرے گی تو میں سفید کاغذ پر دستخط کر کے دے دوں گا"۔ سابق اسمبلی کے دور میں اراکینِ مرکزی اسمبلی نے ترمیمات فیملی لاز میں پیش کی تھیں اور ان پر غور کرنے کے لئے سب کمیٹی بنائی گئی تھی، آخر

اس کی کارروائی کو کیوں دفنا دیا گیا؟ اس کے برعکس اس جدید عہد میں بی ڈی ممبران کو صریح ہدایت دی جاتی ہے کہ ان قوانین کو عوام میں مقبول بنائیں اور ان پر عمل کرائیں، حالانکہ ملک کے تمام سربرآوردہ مستند علماء کرام نے ان قوانین کے شریعت کے خلاف ہونے کو ثابت کرنے کے بارے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی کوئی ایسا پہلو نہیں جو تشنہ رہ گیا ہو، ہماری آرزو اور خواہش تو یہی ہے کہ صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صاحب جس طرح محبوب تھے آخر تک اسی طرح محبوب رہیں اور جس طرح سیاسی و دنیوی اصلاحی کارنامے انجام دے چکے ہیں ٹھیک اسی طرح دینی کارنامے بھی انجام دیں تاکہ خالق و مخلوق دونوں کے سامنے سرخ رو ہوں اور دنیا و آخرت دونوں کی نعمتوں سے سرفراز ہوں۔

ہم صاف کہتے ہیں کہ مسئلہ اب بھی علماء سے پوچھا جائے گا نہ بنیادی ممبران سے، نہ ڈاکٹر فضل الرحمن سے، نہ مشاورتی کونسل سے، پھر کون سی مصلحت کا تقاضا ہے کہ قوم پر قرآن و حدیث کی تصریحات اور امت کے اجماعی مسائل کے خلاف قانون نافذ کرایا جائے۔

الدین النصیحة للہ ولرسولہ ولکتابہ ولأئمة المسلمین۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اور ہمارے حکمرانوں کو حق سمجھنے اور حق پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

ربیع الاول ۱۳۸۶ھ، جولائی ۱۹۶۶ء

رحمتوں اور برکتوں والا مہینہ

بشریت کو قدم قدم پر ٹھوکریں لگتی ہیں، کبھی نفسانی خواہشات کی راہ سے اور کبھی عدوِ مبین شیطانِ لعین کے فریب و تلبیس کی راہ سے، اور کبھی شیاطین الانس (انسانی شیطانوں) کے وساوس اور غلط ماحول کے بُرے اثرات سے، لیکن ارحم الراحمین کی رحمتِ کاملہ قدم قدم پر اس کمزور فطرت انسان کی برابر دستگیری فرماتی رہتی ہے، عقل جیسی نعمت عطا فرمائی اور پھر عقل کی رہنمائی کے لئے انبیاء کی بعثت و رسالت اور آسمانی تعلیمات کا نظام جاری فرمایا اور امتِ محمدیہ کے لئے تو اس رحمتِ کاملہ کے مظاہر رحمت کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے عبادت و عبودیت کے مظاہر (افعال و اعمال) میں انتہائی تیسیر و تسہیل (سہولت اور آسانی) اور پھر اس عبادت پر بیکراں اجر و ثواب اور قدم قدم پر قبولیت اور رضامندی کی بشارتیں، انہی بیکراں نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ماہِ رمضان المبارک ہے جو سرتاپا ماہِ رحمت ہے اور ماہِ برکت ہے جس میں اللہ تعالےٰ کی نعمتوں کی بارش ہوتی ہے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ماہِ شعبان کی آخری تاریخوں میں خطبہ دیا اور فرمایا:۔

" اے لوگو! تم پر ایک عظیم الشان برکتوں والا مہینہ سایہ فگن ہونے والا ہے جس میں (۱) ایک رات (شبِ قدر) ایسی ہے کہ اس میں عبادت ایک ہزار مہینوں کی عبادت سے بڑھ کر ہے۔ (۲) اس مہینہ کے دنوں میں روزے فرض ہیں اور اس کی راتوں میں نمازیں پڑھنا بہت زیادہ باعث خیر و برکت ہے (۳) اس مہینہ میں نفل کا ثواب فرض کے برابر ہے (۴) اور فرض کا اجر و ثواب ستر گنا ملتا ہے (۵) یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے (۶) مسلمانوں خصوصاً فقراء کے ساتھ مواسات و ہمدردی کا مہینہ ہے (۷) مومن کا رزق اس مہینہ میں بہت زیادہ ہو جاتا ہے (۸) ایک روزے دار کا روزہ افطار کرانے والے کے بہت سے گناہوں کی مغفرت ہو جاتی ہے اور دوزخ کی آگ سے رہائی نصیب ہوتی ہے اور خود اس روزہ دار کو اپنے روزہ کا ثواب الگ ملتا ہے اور لطف و کرم یہ ہے کہ روزہ دار

کا ثواب بالکل کم نہیں ہوتا اور پھر آپ نے اس کی تفصیل بیان فرمائی کہ روزہ کی یہ افطاری چاہے دودھ کی لسی ہو یا ایک کھجور کا دانہ یا پانی کا ایک گھونٹ ہو (۹) کسی روزے دار کو پیٹ بھر کر کھانا کھلانے کے صلہ میں حوض کوثر سے وہ سیرابی نصیب ہو گی جس کے بعد کبھی پیاس نہیں لگے گی (۱۰) اس مہینہ کا پہلا عشرہ اللہ تعالٰے کی رحمت ہے، درمیانی عشرہ اللہ تعالٰے کی مغفرت ہے اور آخری عشرہ دوزخ کی آگ سے رہائی کا پیغام ہے (۱۱) جس روزہ دار نے اپنے غلام (یا نوکر یا مزدور) کا بوجھ ہلکا کر دیا اس کے گناہ بھی معاف ہو جائیں گے۔

احادیثِ نبویہ میں ماہِ رمضان کے فضائل و برکات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے جس کے بیان کرنے کی ان صفحات میں گنجائش نہیں اسی ایک روایت پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ولی کامل بنانے کا آسمانی نسخہ

ماہِ رمضان درحقیقت مومن کو "ولی کامل" بنانے کا ایک عجیب آسمانی نسخہ ہے، قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے :-

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ (یونس ۶۲ و ۶۳)

یاد رکھو! بلاشبہ اللہ کے ولی اور دوست وہ ہیں جن کو نہ کوئی خوف (و دہشت) ہے اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ اللہ کا ولی - جو ہر خوف و غم سے آزاد ہوتا ہے۔ ہر وہ شخص ہے جس میں یہ دو وصف موجود ہوں (۱) ایمان اور (۲) تقویٰ گویا کمالِ تقویٰ کا دوسرا نام ولایت ہے۔ اس ارشادِ گرامی کے بعد حسبِ ذیل آیت کریمہ ملاحظہ ہو :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ -

اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلی امتوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

اس آیتِ کریمہ میں حصولِ تقویٰ کا ذریعہ روزے کو قرار دیا ہے، دونوں آیتوں کو ملانے سے صاف نتیجہ نکلا کہ روزہ ولی اللہ بننے کا وسیلہ ہے۔

تقویٰ حاصل کرنے کا ذریعہ

اب ذرا غور فرمائیں روزہ رکھنے سے تقویٰ کیونکر حاصل ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ روزہ رکھنا ایک فرض حکمِ خداوندی کی تعمیل ہے، روزہ رکھنے سے منہیات (ممنوع کاموں) اور برائیوں سے اجتناب میسر آئے گا، برائیاں کچھ تو ایسی ہیں جن کا تعلق زبان سے ہے، کچھ کا تعلق پیٹ سے ہے، کچھ کا تعلق شرمگاہ سے ہے اور ان سب کا تعلق نفسِ انسانی کی خواہشات سے، نفسانی خواہشات بھی مختلف قسم کی ہیں، کچھ خصلتیں تو انسان میں درندوں کی ہیں، دوسرں کو مارنا پیٹنا، توڑنا پھوڑنا اور غیظ و غضب کے تقاضوں کو پورا کرنا، کچھ خاصیتیں جانوروں کی ہیں، شکم پروری، تن پروری کھانے پینے اور سونے وغیرہ کے مشاغل اور اس کے نتیجہ میں حوائجِ ضروریہ، کچھ نفسیاتی تقاضے شرم گاہ سے متعلق ہیں جن کو ہم عرف میں "نفسانی خواہشات" کہتے ہیں، یہ تینوں نفسانی قوتیں اور ان کی خواہشات جب تک قابو میں نہ آئیں تقوی کا حصول ممکن نہیں۔

اسلام یہ چاہتا ہے اور تمام علماءِ اخلاق کا کہنا بھی یہی ہے کہ ان تینوں قوتوں کی تہذیب و اصلاح مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعہ ہو جائے یعنی ان کا رُخ صحیح ہو جائے، ان کا استعمال بروقت اور برمحل ہو، بے جا اور ناوقت استعمال اور غلط راہ روی سے کلی طور پر اجتناب ہو جائے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے حکماء و عقلاء میں ہمیشہ سے چند اصولی امور پر اتفاق رہا ہے۔

(۱) تقلیلِ طعام (کم خوری) (۲) تقلیلِ کلام (کم گوئی) (۳) تقلیلِ منام (کم خوابی) (۴) تقلیلِ اختلاط مع الانام (لوگوں سے کم ملنا جلنا)

ماہ رمضان کے روزے ان تینوں مقاصد کو پورا کرتے ہیں، روزہ دار کو (۱) دن میں طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک کھانے پینے اور نفسانی خواہشات پورا کرنے سے بالکل روک دیا گیا ہے (۲) رات میں تراویح، قیامِ لیل، شب بیداری کے ذریعہ نیند پر کنٹرول

کرنے کا موقعہ فراہم کیا گیا ہے (۳)، تلاوتِ کلام اللہ اور ذکر اللہ و استغفار کی کثرت کی ترغیب دے کر قلتِ کلام (کم گوئی) کی تدبیر کی گئی ہے (۴) رمضان کے عشرۂ اخیرہ میں اعتکاف کو مسنون قرار دے کر لوگوں سے کم ملنے جلنے اور بلا ضرورت میل جول ترک کرنے کی عادت پیدا کرنے کی تدبیر کی گئی ہے۔

پورے ایک ماہ یہ ریاضت کرانے کا مقصد یہی ہے کہ یہ خصلتیں مستقل عادات و اخلاق بن جائیں، چنانچہ پورے تیس دن سحری کا حکم دے کر سحر خیزی کی عادت ڈالی جاتی ہے اور پورے ایک ماہ تراویح کا حکم دے کر شب میں کثرت سے نفلیں پڑھنے کی عادت ڈالنا مطلوب ہے۔

یہ ہی روزہ کے مقاصد ہیں ان کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسبِ ذیل ارشاداتِ عالیہ کامل غور و فکر اور توجہ کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے اور ان پر عمل کیجئے:۔

(۱) من لم یدع قول الزور والعمل به فلیس لله حاجة فی أن یدع طعامه و شرابه. (البخاری)

(۱) جو شخص روزہ میں جھوٹ بولنا اور جھوٹے (برے) کام کرنے، نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس سے بھی کوئی سروکار نہیں ہے کہ وہ کھانا، پینا چھوڑے (جب روزہ کا مقصد پورا نہیں کرتا تو بھوکا پیاسا مرنے کی کیا ضرورت ہے۔

(۲) وإذا کان یوم صوم أحدکم فلا یرفث ولا یصخب فإن سابّه أحد فلیقل إنی صائم۔ (صحیح بخاری و مسلم)

(۲) اور جب تم میں سے کسی کے روزہ کا دن ہو تو اس کو نہ کوئی بے شرمی و بے حیائی کی بات کرنی چاہیئے اور نہ شور و شغب کرنا چاہیئے اگر اس سے کوئی سخت کلامی یا گالم گلوچ یا ہاتھا پائی کرے تو اس کے جواب میں بس اتنا کہہ دے "میرا روزہ ہے۔"

(۳) کم من صائم لیس له من صیامه إلا الظمأ

(۳) بہت سے روزہ دار ہیں جن کے روزہ کا حاصل بجز بھوک پیاس کی مصیبت جھیلنے کے اور کچھ نہیں

وکم من قائم لیس لہ من قیام إلاّ السھر۔ (الدارمی)

اور کتنے ہی راتوں کو نماز پڑھنے والے ہیں جن کی نمازوں کا حاصل بجز مفت کی جگائی کے کچھ نہیں۔

(۴) لیس الصیامُ من الأکل والشربِ إنما الصیامُ من اللغو والرفثِ، فإن سابّہ أحدٌ أو جھل علیك فلیقل: إنی صائم۔

(۴) روزہ صرف کھانے پینے سے رُکنے اور بچنے کا نام نہیں، روزہ تو حقیقت میں صرف بیہودہ اور بے حیائی کی باتوں سے رکنے اور بچنے کا نام ہے پس اگر کوئی تمہیں گالی دے یا تمہارے ساتھ بدتمیزی کرے تو تم کہہ دو! میاں میرا روزہ ہے۔

(۵) رب صائم لیس لہ من صیامہ إلاّ الجُوعُ۔

(۵) بہت سے روزے دار ہوتے ہیں جن کے روزوں کا حاصل بھوکے مرنے کے سوا کچھ نہیں۔

(۶) من لم یدع الخناق الکذب فلاحاجۃ للہ أن یدع طعامہ وشرابہ۔ (ط)

(۶) جو روزہ دار فحش کام (گالی گلوچ بے شرمی کی باتیں) اور جھوٹ نہیں چھوڑتا اللہ کو اس کے کھانا پینا چھوڑنے سے کوئی سروکار نہیں۔

(۷) الصیام جُنّۃٌ مالم یخرقھا، قیل: و بم یخرقھا؟ قال: بکذب أو غیبۃ: (نسائی وغیرہ)

(۷) روزہ (گناہوں سے بچانے والی) ایک سُپر (ڈھال) ہے جب تک روزہ دار اس کو نہ توڑے عرض کیا گیا: اس ڈھال کو توڑنے والی کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا: جھوٹ اور غیبت۔

ان احادیث کو اپنے روزوں کا جائزہ لینے کی غرض سے، دوبارہ غور سے پڑھئے اور دیکھئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسی کیسی تدبیروں سے اپنی امت کی تربیت اور ان کے روزوں کی حفاظت فرمائی ہے تاکہ روزوں کا خاطر خواہ فائدہ. تقویٰ اور پرہیز گاری کی تربیت حاصل ہو۔

مجاہدہ نفس اور روزہ

الغرض اللہ تعالیٰ نے ماہِ رمضان المبارک کو مجاہدۂ نفس کا مہینہ بنایا ہے تاکہ امت کی ظاہری و باطنی تربیت اور اصلاح ہو سکے اور ان کو یہ موقع اس لئے دیا ہے کہ وہ اپنے

اعمال کا جائزہ لیں اور گذشتہ پورے سال میں جو کوتاہی کر چکے ہیں اس کا تدارک کریں اور آئندہ کے لئے بھی ایسی تیاری کر لیں کہ جلد نفس و شیطان کے اثرات سے متاثر نہ ہوں۔ دن کو روزہ جیسی مبارک عبادت فرض کی جو عجیب و غریب اصلاحی تدابیر پر مشتمل ہے اور یہاں تک حکم دیا ہے کہ روزہ دار کسی سے سخت کلامی بھی نہ کرے اور کوئی بے حیائی کی بات زبان پر نہ لائے بلکہ اگر کسی نے سخت کلامی کی اور کوئی تکلیف پہنچائی تو بغیر روزہ کے اگرچہ اتنی ہی مقدار میں بدلہ لینے کی اجازت ہے لیکن روزے کی حالت میں اس کی بھی اجازت نہیں صرف اتنا کہہ دے کہ میرا روزہ ہے یعنی جواب سے معذور ہوں، افطاری و سحری میں اگر اعتدال سے کام لیا جائے اور شرعی ہدایات اور نبوی ارشادات کے مطابق روزہ رکھ لیا جائے تو درحقیقت انسانی زندگی میں انقلاب پیدا ہو جائے گا اور روحانیت ترقی کر کے ایسی منزل پر پہنچ جائے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت قلب میں جلوہ گر ہو جائے اور محبتِ الٰہی کا وہ اثر دل میں پیدا ہو جائے گا کہ کسی اور تدبیر سے ممکن ہی نہیں، رات کو تراویح کی عبادت مقرر کر دی تاکہ نماز اور اللہ تعالیٰ کے کلام پاک سے نفسِ انسانی پر وہ نقوش مرتسم ہو جائیں جو کسی اور تدبیر سے حاصل نہیں ہو سکتے، قرآنِ کریم زبان سے خود پڑھتا ہے یا کانوں سے سنتا ہے، قیام و رکوع و سجود سے اللہ تعالیٰ کے دربار میں عبادت میں مشغول ہے کبھی دعا میں سربسجود ہے اور کبھی تسبیح و تہلیل وردِ زبان ہے قدرت کیسے روحانی عجیب و غریب سیر و سلوک سے منازلِ عشق کا سفر طے کرا رہی ہے، سبحان اللہ۔

تراویح کی ہر چار رکعت کے بعد کا جو مختصر وقفہ ہے اس میں تسبیحات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی تقدیس و بزرگی بیان کی جاتی ہے اور بندہ اپنے خدا کے حضور میں حاضر رہتا ہے اور برکاتِ روحانی سے مالا مال ہوتا ہے، یہ بڑا قیمتی وقت ہے اس میں توجہ الی اللہ سے غفلت نہیں ہونی چاہیئے، کلمۂ تمجید تو ہر شخص کو یاد ہوتا ہے یعنی سبحان اللہ و الحمد للہ و لا إلٰہَ إلَّا اللہ وَ اللہ اکبر و لا حول و لا قوۃ إلَّا باللہِ العلی العظیم وہ پڑھ لیا کرے یا سبحان اللہ و بحمدہٖ سبحان اللہِ العظیم کا ورد جاری رکھے، اور فقہائے نے ایک خاص تسبیح جو بہت ہی جامع ہے لکھی ہے وہ یہ ہے: سبحان ذی الملک و الملکوت، سبحان

یہ عربی الفاظ اصل کے مطابق ہے

ذی العزۃ والعظمۃ والقدرۃ والکبریاء والجبروت، سبحان الحی الذی لاینام ولایموت سبوح قدوس ربنا ورب الملائکۃ والروح لاالٰہ الا اللہ، نستغفر اللہ نسئلک الجنۃ ونعوذبک من النار، اس کو تین مرتبہ ہر ترویحہ میں اور وتر اور تراویح کے وقفہ میں پڑھا کریں۔

غرض اللہ تعالیٰ نے ماہِ رمضان میں شرعی احکام کا ایسا پروگرام بنایا کہ انسان چاہے تو اپنی پوری زندگی میں صالح و متقی بن جائے نیز ماہِ صیام میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں زیادہ خرچ کرنے کی ترغیب دیکر متقی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کو سخی بنانے کی بھی تدبیر فرمائی اور اس کے طبعی بخل کی اصلاح اس طرح کی، الغرض پورے مکارمِ اخلاق، تقویٰ و صلاح نیکو شعاری اور نیک گفتاری جود وسخا اور کرمِ نفس کی ایسی تلقین کی گئی اور اس کے لئے ایسا پروگرام بنایا گیا کہ عقلِ انسانی حیران رہ جاتی ہے اور اس سے بہتر تدبیر کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا، قرآن کریم کے ایک لفظ میں ان سب باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا، ارشاد ہے:- "لعلکم تتقون" یعنی تم پر روزہ اس لئے فرض کیا گیا تاکہ تم متقی و صالح بن جاؤ۔

دینی تربیّت اور ماہِ رمضان

آج کل والدین اپنی اولاد کی دینی تربیت میں بے حد کوتاہی کرتے ہیں حالانکہ جس طرح ان کے ذمہ فرض ہے کہ خود نماز پڑھیں، صالح اور متقی بنیں اسی طرح ان کے ذمہ یہ بھی فرض ہے کہ اپنی اولاد کو اور گھر والوں کو نماز سکھائیں اور پڑھائیں چنانچہ حکم ہے کہ جب بچہ سات برس کا ہو جائے تو اس کو نماز پڑھنے کا حکم دیں گویا نماز سکھانا اس سے بھی پہلے ہوگا اور اگر دس سال کا ہو جائے اور نماز نہ پڑھے تو والدین اس کو پیٹیں اور نماز پڑھائیں، الغرض دینی تربیت دینا اور صالح بنانا بھی ان کے ذمہ فرض ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں تاکیداً فرمایا ہے: "یاایھا الذین آمنوا قوا انفسکم واھلیکم ناراً" یعنی "اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔" ماہِ رمضان سے یہ فائدہ بآسانی حاصل کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ ان دنوں مغرب اور

عشاء کی نماز میں بچوں کو آنے کا طبعاً شوق رہتا ہے، اسی طرح سحری میں اٹھنے کا بھی شوق ہوتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قدرتی روشنی ان کے دل میں ہوتی ہے، اگر بچے کے اس فطری جذبہ اور شوق و صلاحیت سے کام لیا جائے تو نہایت آسانی سے نماز و سحر خیزی کا عادی بنایا جا سکتا اور یوں رمضان کی برکت سے اپنی اولاد کو صالح بنانے کی بھی تدبیر کی جا سکتی ہے اگر انسان خود ان باتوں پر عمل کرے تو خود بخود اولاد کو صالح و نیک بنانے کی صورتیں نکل آتی ہیں، نیز چونکہ حدیث میں اس مہینہ کو ہمدردی کا مہینہ فرمایا گیا ہے اس لئے پڑوسیوں کے ساتھ اچھے تعلقات اور محبّت قائم کرنی چاہیئے۔ ایک دوسرے کے ہاں تھوڑا سا ہدیہ بھیجنے میں بھی بہت سا ثواب ہے اور اللہ تعالےٰ اس کے ذریعہ سے دلوں میں محبت بڑھا دیتے ہیں اور نیکی کا ذریعہ بنا دیتے ہیں اپنے چاروں طرف نیکی کی یاد دلانا اور نیکی پھیلانے کی کوشش کرنا اللہ تعالےٰ نے مسلمان پر فرض کیا ہے لہٰذا محض اللہ تعالیٰ کے لئے باہمی محبت اور نیک برتاؤ ضروری ہے، رمضان کے مہینے سے اس کام میں بھی بڑی مدد ملتی ہے اور بہت برکات ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے کہ ماہِ رمضان کی برکتوں سے مالا مال ہوں اور اس عاشقانہ و محبانہ عبادتِ الٰہی کے ثمرات و آثار سے بیش از بیش حصّہ نصیب ہو، آمین۔

وصلی اللہ علیٰ خیر خلقہ حبیب رب العالمین وخاتم النبیین
محمد وآلہ وصحبہ اجمعین.

رمضان المبارک ۱۳۸۶ھ، جنوری ۱۹۶۷ء

قومیّت اور اُس کے رُوح فرسا نتائج

پچھلے چند دنوں میں خاص طور پر خون ناحق کی ارزانی و فراوانی اور جان و مال کے محافظوں کے ہاتھوں جان و مال کی تباہ کاری و بربادی کے جو دردناک و خون چکاں واقعات پیش آئے ہیں اور ان کا سلسلہ اب تک بھی ختم نہیں ہوا ہے، یہ تاریخِ پاکستان کے سیاہ ترین اوراق ہیں جس طرح بھائی بھائی سے دست و گریباں ہے، بھائی بھائی کے ہاتھ قتل ہو رہا ہے، بھائی بھائی کے مکان و دکان کو آگ لگا رہا ہے، سامان کو لوٹ رہا ہے۔ یہ تاریخِ پاکستان کا انتہائی دردناک دور ہے، نہ بھائی سے بھائی کی جان محفوظ ہے نہ آبرُو محفوظ ہے نہ مال محفوظ ہے انتہائی کرب انگیز صورتِ حال ہے، مسلمان کے خون کی یہ ارزانی، مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے گھروں اور دوکانوں مارکیٹوں کی یہ تباہی و بربادی تاریخِ پاکستان کے الم انگیز اور شرمناک واقعات ہیں بلکہ پاکستانی قوم کی پیشانی کا سیاہ داغ ہیں، مہاجروں اور سندھیوں میں سفاکی کے یہ ہولناک منظر ہلاکو اور چنگیزی بربریت کی یاد تازہ کرتے ہیں بلکہ ان خدا ناآشنا وحشیوں کو بھی شرماتے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ راجِعُون۔

اُردو سندھی لسانی تنازعہ کے عنوان سے ابھرنے والی ملعون "قومیت" کے نتائج انتہائی حسرت ناک ہیں، کاش حکومت ذرا غور و تدبر سے کام لیتی اور اس نازک ترین مواقع پر اس قضیہ کو ابھرنے نہ دیتی اور موزوں وقت کا انتظار کر لیتی تو شاید یہ دردناک صورت پیش نہ آتی، اگرچہ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ یہ نزاع و اختلاف ان واقعات و محرکات کی محض ظاہری صورت ہے ورنہ پسِ پردہ کوئی اور مخفی طاقت ہے جو ان واقعات کو اُچھال رہی ہے لیکن حیرت تو اس پر ہے کہ اس طاقت کی تشخیص کے باوجود آخر کیوں اس کو زہر پھیلانے کا موقعہ دیا جا رہا ہے، زہر بھی وہ زہر جس سے خود صدرِ مملکت اور برسرِ اقتدار پارٹی بھی نہیں بچ سکتی، خیال تھا کہ مشرقی پاکستان کے واقعات کا اعادہ مغربی پاکستان میں نہ ہوگا اور مشرقی پاکستان کے واقعات سے مغربی پاکستان کو عبرت ہوگی لیکن افسوس

کہ عبرت تو کیا ہوتی ان کی تقلید کی جارہی ہے ان کو مثال اور نمونہ بنایا جارہا ہے۔

دراصل اسلامی اخوت کی نعمت سے جب مسلمان قوم محروم ہو جاتی ہے تو لسانی قومی وطنی عصبیتوں کی لعنت میں گرفتار ہو جاتی ہے اور عالم گیر اسلامی ملت اور قوم چھوٹے چھوٹے دیشوں اور قوموں میں تبدیل ہو جاتی ہے پاکستان کے پیٹ سے "بنگلہ دیش" تو جنم لے ہی چکا ہے اور اگر ان قومی ولسانی لعنتوں کو ختم نہ کیا گیا تو بقیہ مملکت کے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور "بنگلہ دیش" کے بعد "سندھو دیش" جنم لے گا اور پھر نہ معلوم اور کون کون ؟ اور اس ملعون عصبیت کا سیلاب کہاں جاکر تھمے گا ؟

بلاشبہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے ہماری طویل غفلت کی سزا ہے بلکہ غلط اور غیر اسلامی نظامِ زندگی کو اپنانے کا نتیجہ ہے، ہم "بینات" کے صفحات میں بارہا یہ ماتم کر چکے ہیں اور بار بار یہ تنبیہات کر چکے ہیں لیکن "صدائے برنخاست" زبان پر نام اسلام کا ہو اور افکار اور اعمال تمام کے تمام کافروں کے ہوں، استعمال تو زہر اور سمیات کا ہو اور نتیجہ میں اُمید "تریاق" کی ہو۔ ع "ایں خیال است ومحال است وجنوں" بہت پرانی مثال ہے :۔
"گندم از گندم بروید جو ز جو"

پورے پچیس سال ہم نے خدا اور خدا کی مخلوق کو دھوکہ دیا ہے اسلام کے نام سے اسلام کی بنیادوں کو ڈائنامیٹ لگایا ہے ہر اس لعنت اور اس عمل کو جو حق تعالےٰ کے قہر وغضب کو دعوت دیتا ہے اپنایا اور اس کی حوصلہ افزائی کی ہے اور یہ نفاق کا سلسلہ روز افزوں ہوتا جا رہا ہے نہ تو سابق زندگی سے توبہ کی توفیق نصیب ہوتی ہے نہ دردناک واقعات سے عبرت ہوتی ہے نہ معلوم اس بدنصیب ملک کا کیا انجام ہو گا اور اس بدقسمت قوم کا کیا حشر ہو گا؟

اسلامی اخوت

قرآنِ عظیم :

۱ — (۱) إنما المؤمنون إخوة فأصلحوا بين أخويكم (الحجرات)

اس کے سوا نہیں کہ اہلِ ایمان تو (آپس میں) بھائی بھائی ہیں پس (اگر کوئی نزاع ہو جائے تو) اپنے بھائیوں کے درمیان صلح صفائی کرادو۔

۲- «فاتقوا اللہ و أصلحوا ذات بینکم» (۱: انفال)

سو ڈرو اللہ سے اور صلح کرو آپس میں۔

۳- «واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا ولا تفرقوا» (۱۰۲- آل عمران)

اور تھام لو اللہ کی رسی کو سب مل کر اور الگ الگ (قوموں میں) نہ بٹو۔

حدیثِ پاک:

۴- «المسلم أخو المسلم لا یظلمہ ولا یسلمہ ومن کان فی حاجۃ أخیہ کان اللہ فی حاجتہ، ومن فرّج عن مسلم کربۃ فرّج اللہ بھا کربۃ من کرب یوم القیامۃ ومن ستر مسلمًا سترہ اللہ یوم القیامۃ»۔ (بخاری ومسلم)

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کا ساتھ چھوڑتا ہے اور جو کوئی اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگے گا اللہ اس کی حاجتوں کو پورا کرے گا اور جو کوئی کسی مسلمان کی مصیبت دور کرے گا اللہ اس کی مصیبت، قیامت کے دن کی مصیبتوں میں سے دور کرے گا اور جس نے کسی مسلمان کا پردہ رکھا اللہ قیامت کے دن اس کا پردہ رکھے گا۔

۵- «المسلم أخو المسلم لا یخذلہ ولا یکذبہ ولا یظلمہ» (ترمذی)

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس کا ساتھ چھوڑتا ہے نہ اس کو جھٹلاتا ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے۔

۶- «المؤمن للمؤمن کالبنیان یشدُّ بعضہ بعضًا» (بخاری)

مسلمان مسلمان کے لئے عمارت (کی اینٹوں) کی طرح ہے ایک دوسرے کو مضبوط رکھتا ہے۔

۷- «من مشی فی حاجۃ أخیہ کان خیرًا لہ من اعتکاف عشر سنین» (الطبرانی)

جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے کے لئے چلے گا (جدوجہد کرے گا) یہ اس کے حق میں دس سال کے اعتکاف سے بہتر ہے۔

۸- «المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ» (بخاری ومسلم)

مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں۔

۹۔ «مثل المؤمنین فی توادهم وتراحمهم وتعاطفهم کمثل جسد إن اشتکی عضو منه تداعی له سائر الجسد بالسهر والحمّی» (بخاری ومسلم)

مسلمانوں کی مثال (صفت) آپس میں دوستی اور باہمی ترحم اور آپس میں شفقت کے لحاظ سے ایک جسم (اور بدن) کے مانند ہے، اگر اس (بدن) کا ایک عضو کسی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو بدن کے تمام اعضا بخار اور بےخوابی میں اس کا ساتھ دیتے ہیں۔

۱۰۔ «ألا أخبرکم بأفضل من درجة الصیام والصلاة والصدقة؟ قالوا: بلی! قال: صلاح ذات البین فإن فساد ذات البین هی الحالقة» (ابوداؤد، ترمذی)

کیا میں تم کو ایسا عمل نہ بتلاؤں جو روزے، نماز اور صدقہ کے درجہ سے بھی افضل ہو؟ صحابہ نے عرض کیا: ضرور بتلائیے؟ آپ نے ارشاد فرمایا: وہ عمل باہمی تعلقات کی درستی ہے اس لئے کہ بلاشبہ آپس کے تعلقات کی خرابی ہی تو (تمام خوبیوں اور برکتوں کو) مٹا دینے والی ہے۔

ایسے بے شمار جواہرات ہیں جن میں سے بطور مثال یہ چند پیش کئے گئے ہیں جن سے اسلامی اخوت کے ایمانی رشتہ کی اہمیت اور ضرورت قومی اور اجتماعی زندگی کے بقا اور تحفظ میں واضح ہوتی ہے بشرطیکہ کوئی عقل و ہوش کے کانوں سے سنے اور دل سے سبق حاصل کرے، نیز عیاں ہو جائے کہ ایک مسلمان کا مسلمان کے ساتھ تعلق کیسا ہونا چاہیئے؟ اور مسلمان کے مسلمان کے ذمے کیا حقوق ہیں اور مسلمان کی امداد و اعانت کے کیا کیا درجات ہیں؟۔

ان آسمانی ہدایت و ارشادات پر غور کریں اور جو کچھ ہو رہا ہے اور جس دردناک طریق پر مسلم خون کی ارزانی ہو رہی ہے اس کو دل کی آنکھوں سے دیکھیں، یقین نہیں آ سکتا کہ جو قوم زبانی ہی سہی، مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتی ہے وہ ان وحشیانہ جرائم کا ارتکاب کیسے کر سکتی ہے؟ درحقیقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلوں سے اسلام کی روح نکل چکی ہے، حق تعالیٰ کے خوف سے دل خالی ہو گئے ہیں، قیامت پر ایمان نہیں رہا ہے

ورنہ تو مذکورہ بالا آیات واحادیث کے علاوہ مذکورہ ذیل احادیثِ نبویہ دلوں کو لرزا دینے کے لئے بہت کافی ووافی ہیں:۔

مسلمان کی جان کی اہمیت (قتلِ مسلم پر وعیدیں)

۱۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:۔

«لزوال الدنیا اُھون علی اللہ من قتل رجل مسلم» (نسائی/ترمذی)

ایک مسلمان کا قتل حق تعالیٰ کے نزدیک تمام کائنات کے تباہ ہو جانے سے بھاری ہے۔

۲۔ ایک اور حدیث میں ارشاد ہے:۔

«قتل المؤمن اُعظم عند اللہ من زوال الدنیا»

ایک مومن کا قتل اللہ کے نزدیک تمام دنیا کے زوال سے بڑھ کر ہے۔

۳۔ ایک اور حدیث میں جو ترمذی نے بروایت ابوسعید خدری وابوہریرۃ نقل کی ہے:۔
اگر تمام روئے زمین وآسمان کے باشندے کسی ایک مسلمان کے قتل کرنے میں شریک ہو جائیں تو اللہ تعالےٰ سب کو اوندھے منہ جہنم میں ڈال دے گا۔

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے:۔
اگر تمام انس وجن ایک مسلمان کے قتل پر جمع ہو جائیں تو سب کے سب جہنم میں جائیں گے۔

۴۔ ایک اور حدیث میں جو ابن ماجہ وغیرہ میں آئی ہے ارشاد فرمایا:۔
جو شخص کسی مسلمان کے قتل کرنے کے بارے میں ایک آدھ لفظ بھی زبان سے کہے گا تو قیامت کے روز اس کی پیشانی پر لکھا ہوگا کہ یہ شخص حق تعالےٰ کی رحمت سے مایوس ہے (یعنی محروم ہے) العیاذ باللہ۔

۵۔ صحیح بخاری ومسلم کی ایک حدیث میں جن سات چیزوں کو امت کی تباہی کا ذریعہ بتلایا گیا ہے ان میں سے ایک "مسلمان کا خونِ ناحق" ہے۔

۶۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ:۔ مسلمان کی جان ومال حق تعالےٰ کے نزدیک بیت اللہ

شریف سے بھی زیادہ قابلِ احترام ہے۔

۷۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ:۔
ایک قاتل کو کسی مسلمان کے قتل پر قیامت میں ایک ہزار مرتبہ قتل کیا جائے گا۔
(یعنی ہر مرتبہ قتل کے بعد زندہ کیا جائے گا پھر قتل کیا جائے گا)

۸۔ ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا ہے:۔
اگر قاتل کو مسلمان کے قتل سے روکا نہ گیا تو تمام امّت عذاب میں مبتلا ہو گی (یہی ہو رہا ہے) اس قسم کے اور بے شمار ارشاداتِ نبویہ موجود ہیں ان کو ٹھنڈے دل سے پڑھئے اور پھر آج کل جو سرزمین سندھ میں ہو رہا ہے اس کا جائزہ لیجئے، یقین سا ہوتا جاتا ہے کہ خاکم بدہن اس قوم کی تباہی کا وقت آ گیا ہے، یہ دردناک صورتحال مسلمانوں کے جہل کا نتیجہ ہے یا لے دینی کا، خود کر رہے ہیں یا کرایا جا رہا ہے؟ قدیم سندھی جدید سندھیوں سے کہہ رہے ہیں کہ: سندھ سے نکل جاؤ یا جدید قدیم سے کہہ رہے ہیں کہ تمہارا وجود ناقابلِ برداشت ہے تم سندھ کو چھوڑ دو۔

بدقسمتی سب سے بڑی یہ ہے کہ حکومت اصلاحِ احوال میں بری طرح ناکام ہو چکی ہے درحقیقت مسلمان قوم کو من حیث القوم خدافراموشی کبھی راس نہیں آ سکتی۔ افراد اس لعنت میں گرفتار ہوں تو معاملہ قابلِ برداشت ہوتا ہے لیکن جب پوری قوم اس تباہ کن معصیت یعنی خدافراموشی میں مبتلا ہو جائے تو نجات کیسے ہو!

ایک طرف تو یہ مصیبتِ عظمیٰ نازل ہے دوسری طرف چھپے ہوئے دشمنانِ اسلام اور اس ملک کے اصلی غدار بے ضمیر ملحد و دہریئے مارِ آستین بنے ہوئے ہیں وہ سندھ کی علیحدگی اور "جئے سندھ" کا نعرہ بلند کر رہے ہیں اور سندھو دیش کے شیطانی راگ الاپ رہے، بلاشبہ پاکستان کی تاریخ میں یہ سب سے دردناک اور تباہ کن دور ہے۔

سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ ملک تباہی کے کنارے آ لگا ہے لیکن دلوں کی قساوت و غفلت کی کوئی انتہا نہیں، اب بھی عبرت نہیں ہوتی، آج بھی اگر پوری قوم محکوم اور حاکم، پبلک اور پولیس و فوج، سب صدقِ دل سے اپنی بدکرداریوں سے توبہ

کرلیں اور اللہ تعالیٰ سے اپنے جرائم کی معافی مانگ لیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلیں اور اس خدافراموش وخودفراموش زندگی کو یک قلم ترک کر دیں اور ہر شخص اپنے دائرۂ اقتدار میں ایمانداری سے اصلاحِ احوال کا عزم کرلے اور اپنی زندگی خداترسی کی زندگی بنالے تو:-

«إن رحمة الله قريب من المحسنين» بیشک اللہ کی رحمت مخلص نیکوکاروں سے قریب ہے۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ضرور نازل ہوگی مملکت بھی محفوظ ہوجائے گی اور باشندگانِ مملکت بھی آرام کی نیند سوئیں گے۔

جب یہ بات یقینی ہے کہ اپنے اعمال کی سزا اُمت کو مل رہی ہے یعنی مرض کی تشخیص ہوگئی ہے تو تشخیص مرض کے بعد تو علاج بہت آسان ہوجاتا ہے قرآنِ حکیم نے اس قسم کے امراض کے لئے جو تیر بہدف نسخہ تجویز فرمایا ہے وہ استغفار ہے، انابت الی اللہ، اور اپنے اعمال پر ندامت ہے، صدقِ دل سے توبہ ہے اس ملک میں صحیح معاشرہ کا قیام ہے اس کے لئے اسلامی قانون جلد سے جلد نافذ کیا جائے، شراب اور شراب خانے فوراً بند کئے جائیں، شرعی سزائیں جاری کی جائیں، مختصر یہ کہ غیراسلامی زندگی کو فوراً ختم کیا جائے یعنی حق تعالےٰ کے قہر وغضب کو دعوت دینے والی زندگی کو پہلی فرصت میں ترک کردیا جائے اللہ تعالیٰ کی رحمت وفضل وکرم کو دعوت دینے والی حیاتِ طیبہ کو قائم و رائج کیا جائے، پھر دیکھئے چند دنوں میں انقلاب آجائے گا، اسلامی اخوت کے مظاہرے ہونے لگیں گے قلوب میں سکینت واطمینان پیدا ہوجائے گا۔ جان، مال، آبرو سب محفوظ ہوجائیں گی۔

۱۹۶۵ء میں حق تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کا یہ نمونہ بھی اہلِ پاکستان کو دکھلا دیا ہے، چند دنوں میں پوری قوم نے فسق وفجور کی زندگی سے تائب ہوکر صالحین کی زندگی اختیار کرلی تھی، مسجدوں اور گھروں میں اللہ تعالےٰ کے ذکر سے فضائیں گونجنے لگی تھیں پورے ملک کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔

دیکھا آپ نے کہ کیسے اللہ تعالےٰ کی تدبیر کا ظہور ہوا اور کیسے لطیفۂ غیبیہ کا اظہار ہوا حق تعالےٰ کا ارشاد ہے:-

((ولو أن أهل القرى آمنوا واتقوا لفتحنا عليهم بركات من السماء والأرض)) (الأعراف)	اور اگر بستیوں والے (صدقِ دل سے) ایمان لے آتے اور نافرمانی ترک کر دیتے تو ہم یقیناً ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں نازل کر دیتے۔

یہ آسمانی نسخہ اور قرآنی علاج ہے تاریخِ عالم کا آزمایا ہوا نسخہ اور علاج ہے۔

لیکن اگر خدانخواستہ یہی خدا فراموشی اور خود فراموشی کی زندگی قائم رہی، یہی لیل و نہار رہے تو اس کے دردناک عواقب و نتائج سہنے کے لئے بھی تیار رہنا چاہیئے۔

((ولن تجد لسنة الله تبديلا))	اور تم سنتِ الٰہیہ میں تبدیلی ہرگز نہیں پاؤ گے۔

حق تعالیٰ رحم فرمائیں اور امتِ پاکستانیہ کو توبہ و انابت کی توفیق نصیب فرمائیں اور قہرِ الٰہی سے نجات اور سعادت و رضاءِ الٰہی کے آثار ظاہر فرمائیں اور موجودہ و آئندہ شقاوت و بربادی و تباہی سے اُمّت کو بچائیں، بحرمة سيد المرسلين وإمام المتقين وخاتم النبيين المبعوث رحمة للعالمين عليه صلوات الله والملائكة والناس أجمعين۔

رجب المرجب ۱۳۹۲ھ، ستمبر ۱۹۷۲ء

تقویٰ اور اس کی اہمیّت

ایمان کے بعد "تقویٰ" ہی ایسی بڑی نعمت ہے جو سعادتِ دارین کا ذریعہ ہے، قرآنِ کریم اور دینِ اسلام کی زبان میں "تقویٰ" احکام شرعیہ پر عمل کرنے کا دوسرا نام ہے، تقویٰ کیا ہے؟ اوامرِ الٰہیہ کا اتباع اور منہیاتِ شرعیہ اور فواحش ومنکرات سے بالکلیہ اجتناب، اتقویٰ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی معیت کا وسیلہ اور اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کا ذریعہ! قرآن کریم کی تلاوت اور مطالعہ سے "تقویٰ" کی جو برکتیں اور ثمرات ونتائج معلوم ہوتے ہیں وہ نہایت ہی عجیب ہیں، ایک مردِ مومن کی آرزو یہی ہوگی کہ زندگی سکون واطمینان سے گذرے، ضروریاتِ زندگی بآسانی مہیّا ہوں، وہ کسی کا محتاج نہ ہو، دنیا میں انجامِ کار بہتر ہو، تجارت کرے تو اس میں نفع ہو، زراعت کرے تو اس میں برکت ہو، اس کے اعمالِ صالحہ بارگاہِ ربوبیت میں خلعتِ قبول سے نوازے جائیں، آنکھیں بند ہوں (اس دنیا سے کوچ کا وقت آئے) تو جنّت کی بشارت ملے، آخرت میں جنت کی (بیش قیمت) نعمتیں میسر ہوں، گناہ اور تقصیریں معاف ہوں، ابدالآباد کی زندگی چین سے گذرے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے محبوبیت کا تمغہ ملے اور ولی اللہ ہونے کی سعادت نصیب ہو، الغرض جس کام میں ہاتھ ڈالے کامیابی اور کامرانی اس کے قدم چومے، خواہ دنیا کا کوئی صحیح مقصد ہو یا آخرت کی کوئی نعمت، سب اس کی آرزو کے مطابق حاصل ہوتی چلی جائیں، ظاہری وباطنی پاکیزگی اسے نصیب ہو، وہ فلاحِ دارین سے ہمکنار ہو، کیا اس سے بھی زیادہ کوئی صحیح آرزو ہوسکتی ہے؟ قرآن کریم بار بار اور صاف صاف ان حقائق کا تذکرہ کرتا ہے۔ مختلف اسالیب بیان سے ان عظیم الشان مقاصد کا ذکر فرماتا ہے، عجیب عجیب عنوانات سے ان کو ذہن نشین کراتا ہے اور مؤثر ترین نفسیاتی انداز سے اس کی ترغیب دیتا ہے، ہم ذیل میں چند آیات کے اقتباسات کے ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:۔

(۱) ’’بلیٰ من أوفی بعھدہ واتقی فإن اللہ یحب المتقین‘‘ (آل عمران ۷۶)	جو شخص[1] اپنے عہد کو پورا کرے اور اللہ سے ڈرے تو بے شک اللہ تعالیٰ محبوب رکھتے ہیں ایسے متقیوں کو۔

---

[1] آیات کریمہ کا ترجمہ حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے "ترجمۂ قرآن مجید" سے لیا گیا ہے۔

(۲) للذین اتقوا عند ربھم جنات تجری من تحتها الأنھار ۔ (آل عمران ۱۵)

ایسے لوگوں کے لئے جو (اللہ سے) ڈرتے ہیں ان کے مالک (حقیقی) کے پاس ایسے ایسے باغ ہیں جن کے پائیں میں نہریں جاری ہیں ۔

(۳) وسارعوا إلی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضها السموات والارض أعدت للمتقین ۔ (آل عمران ۱۲۳)

اور دوڑو طرف مغفرت کی جو تمہارے پروردگار کی جانب سے ہو، اور طرف جنت کی جس کی کی وسعت ایسی ہے جیسے سب آسمان اور زمین، وہ تیار کی گئی ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لئے ۔

(۴) فمن اتقی وأصلح فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (الاعراف ۳۵)

سو جو شخص پرہیز رکھے اور درستی کرے سو ان لوگوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۔

(۵) ولو أن أھل القری آمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والأرض ۔ (الاعراف ۹۶)

اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیز کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے ۔

(۶) إن اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون ۔ (النحل ۱۲۸)

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو پرہیزگار ہوتے ہیں اور جو نیک کردار ہوتے ہیں ۔

(۷) یا أیھا الذین آمنوا إن تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا ویکفر عنکم سیئاتکم ویغفر لکم واللہ ذو الفضل عظیم ۔ (انفال ۲۹)

اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو ایک فیصلہ کی چیز دے گا اور تم سے تمہارے گناہ دور کرے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے ۔

(۸) ومن یتق اللہ یجعل له مخرجا ویرزقه من حیث لا یحتسب ۔ (الطلاق ۲)

اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے (مضرتوں سے) نجات کی شکل نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا ۔

(۹) ومن یتق اللہ یجعل له من

اور جو شخص اللہ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اس کے

أمرہ یسراً (الطلاق ۴)	ہر ایک کام میں آسانی کر دے گا۔
(۱۰) ومن یتق اللہ یکفر عنہ سیئاتہ ویعظم لہ أجراً (الطلاق ۵)	اور جو شخص اللہ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اس کے گناہ دور کر دے گا اور اس کا بڑا اجر دے گا۔
(۱۱) واتقوا اللہ لعلکم تفلحون (آل عمران ۱۹۴)	اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو امید ہے کہ تم کامیاب ہوگے۔
(۱۲) والعاقبۃ للتقوی (طہ ۱۳۲)	اور بہتر انجام تو پرہیزگاری ہی کا ہے۔
(۱۳) والعاقبۃ للمتقین (الاعراف ۱۲۸)	اور آخر کامیابی انہی کو ہوتی ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں۔
(۱۴) إن أولیاءہ إلا المتقون (الانفال ۳۴)	اس کے ولی تو سوا متقیوں کے اور کوئی بھی اشخاص نہیں۔
(۱۵) واعلموا أن اللہ مع المتقین۔ (البقرہ ۱۹۴)	اور یقین کر لو کہ اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔
(۱۶) إنما یتقبل اللہ من المتقین۔ (المائدہ ۲۷)	خدا تعالیٰ متقیوں ہی کا عمل قبول کرتے ہیں۔
(۱۷) وإن للمتقین لحسن مآب (ص ۴۹)	اور پرہیزگاروں کے لئے (آخرت میں) اچھا ٹھکانا ہے
(۱۸) واللہ ولی المتقین (الجاثیہ ۱۹)	اور اللہ دوست ہے اہلِ تقویٰ کا۔

ان آیاتِ کریمہ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اربابِ تقویٰ کے لئے جن برکات کا وعدہ ہے ان سے زیادہ کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا ہے، پھر حیرت و تعجب بلکہ افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان ہو کر ان عظیم الشان نعمتوں کے حاصل کرنے کے لئے نہ صرف یہ کہ کوشش نہیں کی جاتی ہے بلکہ ان سے صاف صاف اعراض و انحراف کیا جا رہا ہے، ایک مسلمان جس کے مذہب کی بنیاد ہی تقویٰ و طہارت پر ہے اس کے لئے ازبس ضروری ہے کہ وہ ان "حقائقِ الٰہیہ" پر غور کرے، دل اور دماغ، اعضاء و جوارح الغرض ہر حصۂ بدن کے تقویٰ[1] کے حقوق ادا کرے، اور ظاہر ہے کہ "بنیادی تقویٰ" دل کا ہے اس کے حصول کے بعد ہی اعضاء و جوارح کا تقویٰ حاصل ہو سکتا ہے

[1] ہر حصۂ بدن کے تقویٰ" کی تفصیل امام غزالیؒ کی احیاء العلوم"، "کیمیائے سعادت" اور "تبلیغِ دین" ترجمہ اربعین" سے نیز حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی تصانیف اور مواعظ سے معلوم کی جائے۔

اس لئے حدیثِ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں دل کی طرف اشارہ کر کے فرمایا گیا :۔

أَلَا إِنَّ التَّقْوَىٰ هٰهُنَا "سن رکھو کہ "تقویٰ" یہاں ہوتا ہے"

اور قرآنِ کریم میں بھی ارشاد ہے :۔

فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ "یہ تو دلوں کا تقویٰ ہے"

اطباء اور علمائے علم النفس کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ متقیانہ زندگی سے دل و دماغ پر کنٹرول رہتا ہے اور غلط کاری و غلط روی سے جو بُرے نقوش لوحِ دل اور صفحۂ دماغ پر مرتسم ہوتے ہیں، اس طرح حفاظت کی بنا پر جسمانی صحت اور طاقت محفوظ رہتی ہے، گویا روحانی صحت دماغی صحت کا سرچشمہ ہے اور دماغی صحت سے بدن کی صحت و قوت محفوظ رہتی ہے، اطباء کے نزدیک دماغ اعصاب کا منبع ہے، جب دماغ میں ضعف و انحطاط رونما ہوگا تو جسمانی اعضاء خود بخود کمزور ہوں گے، "اسلامی تعلیم" کی بنیاد یہی ہونی چاہئے کہ نفسِ انسانی کا تزکیہ ہو اور صحیح روحانی تربیت اس کو حاصل ہو تاکہ طالبِ علم فارغ ہونے کے بعد زندگی کے جس شعبے میں بھی جائے وہاں صحیح خدمت کر سکے اور اپنے منصب کے تقاضے خوش اسلوبی سے انجام دے سکے، اگر "تعلیم" کے لئے جسمانی ورزش کو ضروری تصور کیا جاتا ہے تو اس سے کہیں زیادہ دل و دماغ کی پاکیزگی اور ذہن و شعور کی طہارت ضروری ہے۔

ان شرعی اور عقلی حقائق کی روشنی میں یہ بات کتنی واضح ہو جاتی ہے کہ اسکولوں، کالجوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں "مخلوط تعلیم" سے کتنے بُرے نتائج رونما ہو سکتے ہیں تو پھر تعلیمی مضامین میں ثقافتی رقص و سرود کو لازم کرنے اور طلبہ و طالبات کے آزادانہ اختلاط کے مواقع بہم پہنچانے کے "سمِ قاتل" ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ اور مقصدِ تعلیم اور تعلیمی روح سے یہ چیز کتنی بعید ہوگی؟ ان عریاں مناظر اور فواحش و منکرات کی معاشرت سے دل و دماغ کے صفحات پر جو بہیمانہ، شہوت انگیز اور گندے نقوش مرتسم ہوں گے، ان کے نتائج کتنے بُرے ہوں گے، اسلامی مزاج سے کتنے بعید اور قومی صحت کے لئے کتنے مضر ہوں گے؟

قدم قدم پر بے حیائی کے جان فرسا اور ایمان سوز مناظر، اور کوچے کوچے میں تھیٹر،

سینما، عریاں تصاویر، بے محابا برہنگی اور مرد و زن کے ایمان رُبا اختلاطی تماشے ہی اخلاقِ انسانی کا دیوالہ نکالنے کے لئے کیا کچھ کم تھے کہ ان پر مستزاد تعلیمی اداروں میں اس کے مواقع بہم پہنچائے جائیں؟ خوشی ہوئی تھی کہ حکومتِ مغربی پاکستان نے تعلیمی اداروں میں رقص و سرود پر پابندی کا قانون بنایا اور مزید خوشی کی بات ہوتی اگر مرکزی حکومت، صوبائی حکومت کے اس مستحسن اقدام کی پُرزور تائید کرتی، لیکن اخباری اطلاع کے مطابق اس کے بالکل برعکس ہوا، یعنی مرکزی حکومت نے صوبائی حکومت کے اس فیصلہ کو احمقانہ قرار دے کر مسترد کر دیا اس سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور راقم الحروف کا ایک مشترکہ بیان کراچی کے اخبارات میں شائع ہوا جو حسبِ ذیل ہے:-

چند روز قبل بعض اخبارات میں ایک غیر مصدقہ خبر شائع ہوئی ہے کہ مرکزی حکومت نے تعلیمی اداروں میں رقص و سرود پر سے پابندی اٹھالی ہے اور اس سلسلہ میں صوبائی حکومت کے فیصلہ کو احمقانہ قرار دیا ہے اس خبر کی اشاعت کے بعد مرکزی حکومت کی طرف سے اس کی کوئی تردید شائع نہیں ہوئی جس کی وجہ سے ملک بھر میں شدید اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔

آج سے چند ماہ پہلے جب صوبائی حکومت نے تعلیمی اداروں میں ناچ گانے مخلوط ڈراموں اور چست لباس پر پابندی عائد کی تھی تو ملک بھر میں اس مستحسن فیصلہ کا بڑی گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا تھا اور ہر طبقۂ فکر نے اس قابلِ تعریف اقدام کو سراہا تھا جس سے صاف ظاہر ہے کہ صوبائی حکومت کا یہ فیصلہ عوام کی خواہش کے مطابق تھا، ادھر مرکزی حکومت کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے آئے دن یہ اعلانات شائع ہوتے رہتے ہیں کہ وہ ملک کے ہر شعبۂ زندگی کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ رقص و سرود، مخلوط ڈرامے اور مرد و عورت کا آزادانہ میل جول اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے اور اس نے ہمیں اخلاقی تباہی کے کنارے پہنچا دیا ہے، خاص طور سے تعلیمی اداروں میں اس قسم کی شرمناک سرگرمیوں

سے نہ صرف تعلیم و تربیت کا اصل مقصد فوت ہو رہا ہے بلکہ طلباء کی صحت اور اخلاق پر اس کے بدترین اثرات مشاہدہ میں آچکے ہیں، ان حالات میں توقع تو اس بات کی تھی کہ مرکزی حکومت کی طرف سے صوبائی حکومت کے اس فیصلہ کی ہمت افزائی کی جائے گی اور مشرقی بازو بھی اس کی تقلید کرے گا لیکن اس کے برعکس اس فیصلے کو احمقانہ قرار دینے کی یہ خبر توقع کے یکسر خلاف، انتہائی حیرت ناک اور سخت اضطراب انگیز ہے اور اس سے بجا طور پر ملک کے عوام میں زبردست بے چینی پیدا ہو رہی ہے۔

یہ ملک جو سو فیصد اسلام کے نام پر بنا ہے، اس کی بیس سالہ تاریخ اس پر گواہ ہے کہ یہاں کے دس کروڑ عوام قرآن و سنت کی صحیح صحیح تعلیمات ہی کو اپنی فلاح و بہبود کا ضامن سمجھتے ہیں، انہوں نے ہمیشہ اس فیصلہ کو شدید نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے جو قرآن و سنت کے خلاف ہو اور اس فیصلہ کا دل و جان سے خیر مقدم کیا ہے جو انہیں اسلامی تعلیمات سے قریب کرے، اس لئے ہم مرکزی حکومت سے پُرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ صوبائی حکومت کے فیصلہ کو ہر قیمت پر بحال رکھے اور پوری وضاحت کے ساتھ اس خبر کی تردید شائع کر کے عوام کی دلی بے چینی کو دُور کرے[1]۔

---

[1] یہ حروف لکھے جا چکے تھے کہ اخبارات میں یہ اطلاع پڑھی کہ ایک صوبائی وزیر محترم نے اس خبر کی تردید کر دی ہے اور اس امر کی وضاحت بھی کہ صوبائی حکومت اس قانون کو واپس لینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی ہم اس خوشخبری پر تمام مسلمانان پاکستان کی طرف سے صوبائی حکومت کی تحسین کرتے ہوئے گذارش کرتے ہیں کہ بقیہ فواحش و منکرات کی روک تھام کے لئے بھی ہماری حکومت جرأت مندانہ قدم اٹھا کر معاشرہ کو ممکن حد تک پاک کرنے کی کوشش کرے، دعا ہے کہ حق تعالیٰ حکومت اور عوام دونوں کو اپنی مرضیات کی توفیق بخشے، آمین۔

ذوالقعدہ ۱۳۸۶ھ مارچ ۱۹۶۷ء

کمال ایمان

حضرت ابوامامۃ رضی اللہ عنہ سے "سنن ابی داؤد شریف" میں حدیث مروی ہے۔

«من أحبَّ لِله و أبغض لله و أعطى لله ومنع لله فقد استكمل الإيمان»

جس نے کسی سے محبت کی تو اللہ کے لئے اور دشمنی کی تو اللہ کے لئے اور کسی کو کچھ دیا تو اللہ کے لئے نہ دیا تو اللہ کے لئے تو اس نے اپنے ایمان کو مکمل بنا لیا۔

گویا کمالِ ایمان کی علامت یہ ہے کہ محبت ہو تو اللہ کے لئے اور بغض ہو تو اللہ کے لئے، اسی حدیث کے مضمون کے قریب قریب "جامع ترمذی" اور "مسند احمد" میں حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے اور "سنن ابی داؤد" میں ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایتیں موجود ہیں، غرض متعدد صحابہ کرام سے متعدد کتابوں میں اس مضمون کی حدیثیں موجود ہیں لہٰذا بحسب المتن اس حدیث کا درجہ خبرِ واحد سے متجاوز ہو کر خبرِ مشہور کے قریب پہنچ گیا ہے، یہ تو سرسری ورق گردانی سے معلوم ہوا ہے جستجو اور تلاش کے بعد بہت کچھ توقع ہے کہ اور صحابہ کرام سے بھی یہ روایت مل جائے۔

بہرحال کہنا یہ ہے کہ ایک مومن مسلمان کی شان یہ ہونی چاہیئے کہ وہ ہمیشہ محبت و عداوت دوستی و دشمنی میں اللہ تعالےٰ کی مرضی کو پیش نظر رکھے، نفسانی خواہش کو اس میں دخل دینے کا مطلق موقع نہ دے، صحابۂ کرام کی بھی یہی خصوصیت تھی، ان کے بعد مخلصینِ امت کا بھی یہی وتیرا رہا ہے، بدقسمتی سے یہ جوہر آج کل بہت کمیاب ہے اور جو ہے وہ بھی روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے، غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ درحقیقت یہ "محبت فی اللہ اور بغض فی اللہ" نتیجہ ہے محبت الٰہی کا اگر اللہ تعالےٰ سے محبت کامل ہے تو اس کی محبت کا تقاضا یہ ہونا چاہیئے کہ جو شخص اللہ تعالےٰ سے محبت کرے اس کی محبت دل میں جگہ پائے اور جس کو اللہ تعالےٰ سے محبت نہ ہو دل اس کی محبت سے خالی ہو، مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہر چیز پر غالب ہونا چاہیئے۔

«والذين آمنوا أشدُّ حُباً لله» مومنین کی محبت اللہ سے بہت زیادہ ہے۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کے کچھ لابدی آثار و لوازمات ہیں جن کا عملی زندگی میں ظہور ضروری ہے مثلاً دل میں اللہ تعالیٰ کی انتہائی عظمت و ہیبت اور جلال کا استحضار جو چیز اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو اس کی تعظیم و تکریم، اللہ تعالیٰ کی اطاعت یعنی اوامرِ الٰہیہ پر عمل کرنے کا جذبۂ صادق،

اور حتی المقدور ان کی پابندی" احکامِ ربانیہ سے عقیدت و احترام مرضیاتِ الٰہیہ کو بدل وجان تسلیم کرنا، اس رضا و تسلیم کا عملاً اظہار اور اس کی حفاظت کے لئے تدابیر اختیار کرنا، مومنین صالحین سے محبت کرنا، کفار و منافقین سے نفرت کرنا، اگر عقل و ادراک اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی حکمت و مصلحت سمجھنے سے قاصر ہوں تو اپنی کوتاہیٔ عقل کا اعتراف کرنا وغیرہ وغیرہ، اب اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے کلام میں اپنی رائے سے کوئی ایسی تأویل و توجیہ کرتا ہے جو منشأ خداوندی اور اجماع امت کے خلاف ہو تو لازمی طور پر یہی کہا جائے گا کہ یہ مقتضاءِ ایمان کے خلاف ہے۔

الحاد و زندقہ جس طرح ایمان و اسلام شرعی حقائق ہیں اور ان کے خاص خاص مفہوم و مصداق ہیں اور اسلامی تاریخ میں عہدِ نبوت سے لے کر آج تک ان کے وہی معانی و مصادیق امت کے نزدیک واضح و متعین اور مسلم چلے آتے ہیں، ٹھیک اسی طرح صلاۃ، صوم، زکاۃ، حج، بیع، ربا، خمر، میسر کے معانی واضح اور مراد متعین ہیں، ان معانیٔ واضحہ و مسلمہ کو محض اختلافِ ظروف و احوال اور بدلے ہوئے سماجی حالات اور خود ساختہ علل و مصالح کی بنا پر چھوڑ کر صرف اپنی رائے اور لغت پر اعتماد کر کے دوسرے معانی اختیار کرنا یا ان میں ترمیم و تنسیخ کرنا اسی کا نام ہے تحریف، اسی کا نام ہے الحاد اسی کا نام ہے زندقہ، علماءِ امت، فقہاء و محدثین، متکلمین و ارباب حقائق، سب کا اس پر اتفاق ہے کہ دینِ اسلام کے وہ احکام جن کی قطعیت اور معانی مقصودہ علماً و عملاً توارثاً و تواتراً مسلم چلے آتے ہیں وہ شریعت کی اصطلاح میں "ضروریاتِ دین" کہلاتے ہیں جس طرح ان کا انکار کفر ہے ٹھیک اسی طرح ان میں تأویل کرنا بھی کفر ہے، امام غزالی رحمہ اللہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس موضوع پر مستقل کتاب "فیصل التفرقہ بین الاسلام والزندقہ" تصنیف فرمائی اور آخری بے مثل اور جامع ترین کتاب حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "اکفار الملحدین فی ضروریات الدین" ہے۔

واضح رہے کہ کفر و الحاد، کافر و ملحد یہ سب شرعی مصطلحات ہیں جو شخص واقعی طور پر ان کلمات کا مصداق یا ان ناموں کا مستحق ہو اسی کے لئے یہ الفاظ استعمال ہوں گے، یہ سب دشنام یعنی دشنام اور گالی گلوچ نہیں اگر کوئی اس کا غلط اور بے محل استعمال کرے تو اگر وہ جانتا ہو کہ واقعہ میں یہ

شخص ایسا نہیں ہے تو یہ گالی اور ہتکِ عزت سمجھی جائے گی اور وہ آخرت میں گنہگار اور دنیا میں لائقِ تعزیر ہوگا، اگر وہ فی الواقع اس کو صحیح سمجھتا ہے تو پھر نہ گالی ہوگی اور نہ ہتکِ عزت اور توہین البتہ کبھی یہ حکم غلط ہوگا کبھی صحیح، غلط حکم پر اگر قائل مجتہد ہے تو معذور ہوگا ورنہ گنہگار ہوگا اور اگر حکم صحیح ہوگا تو اس کو اجر ملے گا، یہ ہے مسائلہ کی تنقیح۔

اب جو حضرات ان قطعی احکامِ شرعیہ اور نصوصِ قرآنیہ میں شب و روز تحریف و تبدیل اور ترمیم و تنسیخ کرتے یا ان کا بے محل استعمال کرتے رہتے ہیں ظاہر ہے کہ وہ خود شرعاً ان کلمات کا مصداق بنتے ہیں، پھر اگر شریعت کا عالم اس حکم شرعی کا اظہار کرنے کی غرض سے ان کلمات کا استعمال کرے یعنی حکم شرعی بتلائے تو معلوم نہیں کیوں یہ حضرات چراغ پا ہوتے ہیں اور کیوں اس کے ان کلمات کو خلاف تہذیب اور اس عالم کو غیر مہذب سمجھا جاتا ہے، افسوس وحیرت کا مقام ہے کہ یہ حضرات اللہ اور رسول کی اہانت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ کے بندے اس کو سن کر چپ رہیں اور اس توہین کو برداشت کریں؟ اللہ و رسول کے کلام کو توڑ مروڑ کر نئے نئے معنی پہنانا، اس سے بڑھ کر منصبِ خدائی اور منصبِ رسالت و نبوت کی کیا توہین ہوگی؟ منصبِ خدائی پر حملے ہوتے ہیں، پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذخیرۂ سنت کو زمانہ مابعد کی پیداوار اور تدوینِ حدیث کو "تحریک" یعنی سازش کہہ کر رد کیا جاتا ہے اور جان نثارانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے توقع کی جاتی ہے کہ ان کی تعریف کی جائے، ان سے خندہ پیشانی اور نرم خوئی سے گفتگو کی جائے؟ اپنی ذات گرامی صفات پر ذرا سا حملہ برداشت نہ کرنا اور اللہ و رسول کی ذات پر جتنے قبیح و فظیع حملے ہوتے ہیں، ان کو برداشت کرنے اور بردباری و نرم خوئی کی تلقین کرتے رہنا اور اسی کو تہذیب قرار دینا کہاں کا انصاف ہے اور کہاں کی دیانت؟ عجیب فلسفہ ہے! اللہ کی ذات و صفات کے بارے میں اتنی وسعتِ صدر اور اپنی ذات و صفات کے متعلق اتنی تنگ حوصلگی، سبحان اللہ کیسا عجیب فلسفۂ تہذیب و اخلاق ہے؟ حالانکہ "حب فی اللہ اور بغض فی اللہ" کا تقاضا تو یہ تھا کہ معاملہ اس کے برعکس ہوتا، اپنی ذات و صفات کے بارے میں "صبر و استقامت" اور "عفو و صفح" کو اُسوہ بنایا جاتا اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و تعلیمات و ہدایات کے بارے میں

بغیر کسی رواداری ومداہنت کے ناراضگی وناگواری کا اظہار کیا جاتا کہ یہی تقاضائے عین کمالِ ایمان ہے اور یہی کتاب وسنت کی تعلیم ہے۔ شوال ۱۳۸۴ھ،

مجمع البحوث الاسلامیۃ کی کانفرنس قاہرہ میں ۶ تا ۲۲ مارچ ۱۹۶۴ء منعقد ہوئی۔ زیر بحث مسائل سے مندوبین حضرات کو پہلے سے مطلع نہیں کیا گیا تھا لیکن حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ نے بغیر کسی تیاری کے اجتہاد جیسے اہم موضوع پر محققانہ انداز میں مقالہ تحریر فرمایا جس کا مندرجہ ذیل ترجمہ "بینات" میں حضرت مولانا محمد ادریس صاحب استاذِ حدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے قلم سے شائع ہوا تھا۔

اجتہاد

خطبۂ ماثورہ کے بعد:

بلادِ اسلامیہ کے برگزیدہ حضراتِ علماء وفضلاء!

ہم اولاً جناب ڈاکٹر محمود حب اللہ ناظم اعلیٰ "ادارہ تحقیقاتِ اسلامی" زیر سرپرستی جامعہ ازھر کی وساطت سے اس عظیم مؤتمر عالمِ اسلامی کی شرکت کے لئے ادارۂ ازہر کی جانب سے دی گئی لائق فخر ومباہات دعوت کو خوش آمدید کہتے ہیں، ثانیاً ہم خود کو اور تمام شرکاءِ مؤتمر کو ہدیہ تہنیت وتبریک پیش کرتے ہیں، اس قابلِ قدر دعوت پر جو عصر حاضر کی دینی مشکلات کو قرآنِ حکیم اور سنتِ نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والتسلیم کی روشنی میں اور اس لائقِ فخر علمی میراث (فقہ اسلامی) کی رہنمائی میں حل کرنے کے لئے دی گئی ہے۔ جس کو امتِ محمدیہ کے ایسے فقہاء نے آنے والی نسلوں کے لئے بطورِ ترکہ چھوڑا ہے جن کے پاک وصاف قلوب ایک عظیم تر اخلاص، تقویٰ اور خشیتِ الٰہیہ کے انوار سے لبریز تھے، دوسری طرف وہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے لافانی علوم ومعارف کے سرچشموں سے بھی شایانِ شان طور پر سیراب وسرشار ہوچکے ہیں۔ اور انہوں نے صبح وشام اپنی زندگی کے تمام شب وروز اور اپنی تمام تر توانائیاں علوم ومعارفِ الٰہیہ اور تعلیماتِ سنتِ نبویہ کے اندر دقتِ نظر میں اور طویل بحث وتفتیش میں صرف اور وقف کردی تھیں، اور اس سب سے بڑھ کر یہ کہ توفیق وتائیدِ الٰہی ان کے ساتھ تھی۔ اسی لئے وہ آنے والی دنیا کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں ایسے روشن اور تابناک ستارے بن کر چمکے کہ اطراف واکنافِ عالم ان کے علوم ومعارف کی روشنیوں سے جگمگا اٹھا اور آج تک مشرق ومغرب میں ان کی علمی فتوحات کے جھنڈے فضائے بسیط میں لہرا رہے ہیں۔

عظیم المرتبت جلیل القدر بزرگو!

جامع ازہر یا زیادہ صحیح تعبیر کے ساتھ جامعۂ ازہریہ تقریباً ایک ہزار سال سے ایسی عظیم الشان علمی اور دینی خدمت انجام دے رہا ہے کہ کسی بھی ملک و مملکت یا علمی و تعلیمی ادارہ کی خدمات اس کے مقابلہ پر تو کیا پاسنگ بھی نہیں بن سکتیں، اسی لئے بدون کسی شک و شبہ کے جامع ازہر تمام امت کی جانب سے علیٰ حسبِ المراتب عظیم الشان تعظیم و احترام، قدر دانی و قدر شناسی اور تحسین و ستائش کا مستحق ہے خاص طور پر جبکہ تاتاریوں کی تاخت و تاراج اور قتل و غارت کا تباہ کن سیلاب بلادِ اسلامیہ کے علمی مرکز بغداد اور اس کے تمام علمی و تعلیمی مراکز، عظیم درسگاہوں اور عظیم تر کتب خانوں اور سالہا سال کے علمی ذخائر کو بہالے گیا اور صفحۂ وجود سے حرفِ غلط کی طرح مٹا ڈالا لیکن جامع ازہر اللہ جلَّ شأنہ کے فضل و کرم سے ہر طرح کی تباہی سے محفوظ اور اس طوفان خیز دور میں بھی برابر خدمتِ علم و دین میں مصروف رہا، ایسی صورت میں ازہر کا علمی مقام دنیا کے ہر اس علمی و تعلیمی ادارہ پر جو تحسین و ستائش اور تعظیم و احترام کا مستحق ہو ایسی نمایاں فوقیت و برتری کا مالک ہے کہ اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

معزز حضرات!

زمانہ اور اس کے کوائف و ظروف بالکل بدل چکے ہیں، فکر و نظر کے انداز کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں، عہدِ حاضر کے مسائلِ حیات میں روز بروز مغربی تمدن کی پیدا کردہ نو بنو مشکلات اور پیچیدگیاں سنگِ راہ بن کر سامنے آرہی ہیں، زندگی کے تہذیبی، معاشی، اقتصادی اور تجارتی نظامات میں نئے نئے نظریئے اور افکار و خیالات رونما ہو رہے ہیں، یہ ایک نظری اور فکری سیلاب ہے جو پوری قوت کے ساتھ یورپ سے آرہا ہے لہٰذا ہم دنیا کے تمام مسلمان بجا طور پر "ازہر" سے امید اور توقع رکھتے ہیں کہ جس طرح "ازہر" نے اپنے سابقہ سنہری عہد اور شاندار ماضی میں عالمِ اسلامی کی لازوال علمی اور دینی قیادت کی تھی اسی طرح وہ اس پُر فتن دورِ حاضر میں بھی اپنی تمام تر دینی بصیرت اور حکمت و تدبر کے ساتھ اسلام کے اساسی حقائق اور بنیادی اغراض و مقاصد کو سامنے رکھ کر ایسی ہی لافانی رہنمائی کرے اور مسائلِ عصریہ کی دینی مشکلات اور پیچیدگیوں کو اس روشن اور پاکیزہ طریق پر حل کرے جس کا اسلام کی روح اور دین کا جوہر متقاضی ہے۔ کتابُ اللہ، سنتِ رسول اللہ، اجماعِ امہ اور

اسلامی فقہ پر اس کا مدار ہو۔ یورپ کی پُرفریب اور گمراہ کن تہذیب اور خدا پرستی کے جذبہ پر ضربِ کاری لگانے والے تمدن کا اس پر سایہ تک نہ پڑے اور اس طرح اس یورپین تمدن کے تباہ کن طوفان کے مقابلہ کے لئے ایک مضبوط چٹان کی طرح میدان میں آجائے اور ایک آزمودہ کار مردِ آہنی اور تجربہ کار دانائے راز کی طرح مقابلہ کرے، اس لئے کہ بغیر کسی شک و شبہ کے اس وقت اسلامی دنیا کی امیدیں ازہر سے وابستہ اور نظریں ازہر کی طرف اٹھ رہی ہیں جبکہ ہمارے پاس نہ اس سیلاب کے دھارے کو روکنے کے (مادی) وسائل ہیں اور نہ ہمیں اس کی امید باقی رہی ہے کہ ہم اس طوفان کا مقابلہ کر سکیں گے، لہٰذا اس یأس و ناامیدی کے عالم میں بجا طور پر ازہر سے اس دینی فرض کو ایسے طریق پر انجام دینے کی توقع کی جاتی ہے جو رحمتِ خداوندی اور رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہو تاکہ ازہر از سر نو اطراف و اکنافِ عالم میں مسلمانوں کے لئے مقتدا اور دوسری قوموں کے لئے ایک مثالی نمونہ بن جائے۔

معزز حاضرین!

اسلامی اور یورپین تہذیب و تمدن کے اس تصادم و تلاطم کے زمانہ میں دنیا دو متضاد سمتوں اور کناروں پر کھڑی ہے، ایک طرف علمائے دین کا گروہ ہے جن کو تصلّب فی الدین اور تمسک بالشریعت نے ایسا جمود ورثہ میں دیا ہے کہ انہوں نے حالاتِ حاضرہ میں علم اور دین کی خدمت کے لئے جن تقاضوں اور وسائل کی شدید ضرورت ہے ان کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے۔ دوسری طرف ان روشن خیال منکرین کا گروہ ہے جن میں عہدِ حاضر کی مشکلات اور پیچیدگیوں کو سمجھنے کی اہلیت تو بدرجۂ اتم موجود ہے وہ بہت اچھی طرح وقت کے ان تقاضوں سے واقف ہیں جن کی امتِ مسلمہ عہدِ حاضر کی مشکلات حل کرنے میں محتاج ہے۔ ان کے دلوں میں وہ ایمانی جرأت بھی موجود ہے جس کے تقاضہ کی بنا پر وہ اس خدمت کو انجام دینے کے لئے مضطرب ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان تمام دشواریوں اور پیچیدگیوں کو حل کر دیں جنہوں نے امت کے ذہن و فکر کو حیرانی کے گرداب میں سرگرداں بنا رکھا ہے لیکن وہ اس دینی بصیرت و ایمانی فراست اور صحیح و پختہ علمِ دین کی کماحقہٗ واقفیت سے محروم ہیں جس کے بغیر عہدِ حاضر کی پیدا کردہ مشکلات و پیچیدگیاں حل نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا اس میں شک نہیں کہ یہ ہر دو فریق امت کی توقعات کو پورا کرنے سے قاصر ہیں

اوران جیسے عصری مسائل کو ان دونوں میں سے کسی بھی ایک گروہ کے سپرد کردینا اور اسی پر تکیہ کرلینا زبردست غلطی اور گمراہ کن نادانی ہوگی نہ اس سے دین وملت ہی کو کوئی تقویت پہنچے گی اور نہ امت کی پیاس ہی بجھے گی۔

حضرات علماء وفضلاء!

ہماری آرزو اور تمنا یہ ہے کہ اس تحریک کی بنیاد اس پر رکھی جائے کہ ایسے رجالِ دین کو کسی ایک جگہ جمع کیا جائے جن کے نفوس ایک طرف کتاب وسنت اور فقہِ اسلامی کے علمی سرچشموں سے کما حقہ، سیراب وسرشار ہوں اور دوسری طرف عہدِ حاضر کی پیدا کردہ ان مشکلات اور پیچیدگیوں کو بھی خوب اچھی طرح سمجھتے اور ان کو حل کرنے کی بھی کما حقہ، اہلیت رکھتے ہوں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایمانی بصیرت، اخلاص اور ورع وتقوی کے زیور سے بھی آراستہ ہوں یا یہ ادارہ مجمع البحوث الاسلامی ایک ایسی مجلس کی تشکیل کرے جس کے مستقل اراکین مذکورہ بالا متنوع صفات اور متفرق خصائص کے حامل ہوں۔ ایسی صورت میں اگر ہر رکن ان تمام اوصاف کا جامع میسر نہ آئے تو ادارہ "مجمع البحوث" دونوں قسم کے ایسے علماء کو یکجا کرے جو اپنی علمی اور فنی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اس دینی خدمت کو انجام دینے پر دل سے متفق ومتحد بھی ہوں اور اس باہمی تعاون سے یہ جماعت مجموعی طور پر ان تمام ضروری اوصاف وخصائص کی حامل ہوسکے گی جن کا اوپر تذکرہ کیا جاچکا ہے۔

معزز ومحترم حضرات!

میں اس وقت بحثِ اجتہاد کی ان گہرائیوں میں نہیں جانا چاہتا جس کی تحقیق کا سہرا ان علماء اصولِ فقہ کے سر ہے جو تدوینِ علوم وفنون کے قدیم تر عہد سے اس پچھلے زمانہ تک ہر دور اور ہر زمانہ میں اس کا حق ادا کرتے رہے ہیں، چنانچہ اس موضوع اجتہاد پر سب سے پہلے قلم اٹھانے والے مصنف قاضی ابویوسف ہیں ان کے بعد امام شافعیؒ، پھر امام ابوجعفر طحاوی ان کے بعد ابوبکر جصاص رازی ان کے بعد ابو زید دبوسی ان کے بعد بزدوی پھر غزالی اور ابن حزم ان کے بعد رازی وآمدی ابن حاجب، بیضاوی، اسنوی، زرکشی، سبکی، قرافی، نسفی، شاطبی، امیر اتقانی اور ابن ہمام رحمہم اللہ کی تصانیف اس موضوع کی تحقیق وتنقیح کا حق ادا کرتی رہی ہیں اور قاضی شوکانی رحمہ اللہ پر یہ سلسلہ

تصنیف وتالیف ختم ہوتا ہے۔ ان بزرگوں نے اس موضوع پر چھوٹی بڑی محققانہ کتابیں جن میں کوئی ایک جلد میں ہے کوئی ایک سے زائد جلدوں میں لکھ کر اس موضوع کو اتنا غنی بنا دیا ہے کہ اس پر اضافہ یا مزید بحث وتنقیح اور کسی بھی پہلو سے تحقیق وتفحص کی گنجائش باقی نہیں چھوڑی، چنانچہ اجتہاد کی حقیقت، شرائط اقسام اور مجتہدین کے طبقات نیز یہ بحث کہ اجتہاد کا دروازہ کلاً یا جزءًا کھلا ہے یا بند ہو گیا، یہ تمام مباحث بالکل طے شدہ اور بحث سے بالاتر ہو چکے ہیں، اس کے بعد اب اجتہاد کے معنی، مبادی اور اصول پر بحث کرنے کا حاصل ایک بدیہی مسئلہ کو نظری بنا دینے کے سوا اور کچھ نہیں، مشاہدہ اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے جس کا جی چاہے مذکورہ بالا مصنفین کی تصانیف کا مطالعہ ومشاہدہ کرلے، ان مجتہدینِ عظام کی فنی تحقیقات اور مسائل کے استنباط، جزئیات کے استخراج، نو بنو رونما ہونے والے مسائل اور حوادث کے حل کے جو اصول اور طریقے بحث وتحقیق کے بعد ان حضرات نے مقرر کر دیئے ہیں وہ اس امر کی حقیقت کو معلوم کرنے کے لئے روشن ترین دلیل اور قوی ترین حجت ہیں کہ کہاں اجتہاد جائز ہے اور کہاں نہیں اور کس قدر اجتہاد باقی رہ گیا ہے اور کس حد تک ختم ہو چکا اور یہ فیصلہ آج کا نہیں بلکہ قدیم ترین زمانہ سے قرون وسطیٰ تک یا زیادہ سے زیادہ متاخرین کے عہد میں ہو چکا ہے یہ وہ بدیہی حقیقت ہے کہ اس کا انکار وہی شخص کر سکتا ہے جو معاند ہو یا ہٹ دھرمی کرنے والا ہو۔

اس وقت مجھے سب سے زیادہ اہم چیز جو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ میں شریکِ اجلاس علماءِ کرام اور فضلاءِ عظام کی توجہ چند اہم ترین امور کی جانب منعطف کراؤں اور اس میں بھی بسط وتفصیل کے بجائے اشارات پر اکتفا کروں:۔

امرِ اول:۔ یہ کہ تمامتر اجتہادی اور فقہی قانون سازی کے اساسی منبع ومآخذ صرف دو ہیں: ایک قرآن حکیم اور دوسرے سنتِ نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والتسلیم۔

امرِ دوم:۔ یہ کہ خلفاء راشدین ابو بکر وعمر وعثمان وعلی کی سنت ان کے بعد فقہاء صحابہ مثلاً ابن مسعود معاذ بن جبل، ابو الدرداء، زید بن ثابت، ابی بن کعب، ابو موسیٰ اشعری، حذیفہ، عمار، عبد الرحمٰن بن عوف، ان کے بعد ابن عمر، ابن عباس ابن عمرو وغیرہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اقوال وآثار بھی استدلال اور حجیت میں لائقِ اتباع سنت اور علوم نبوت کے انوار حاصل کرنے کے لئے منارہ

ہائے نور ہیں۔

امر سوم :۔ یہ کہ امتِ محمدیہ کے اجماع، خصوصاً اہلِ حرمین شریفین کے اجماع، مدینہ کے سات یا دس فقہائے اجماع اور اس کے بعد درجہ بدرجہ فقہاءِ امت کے اجماع کو بھی اصولِ دین کے اندر ایک ایسا محکم اور پائیدار مقام حاصل ہے کہ اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

امر چہارم :۔ یہ کہ امت محمدیہ کا علمی اور عملی متوارث و متواتر تعامل جو قرنہا قرن سے چلا آرہا ہے اس کا مرتبہ بھی اجماعِ صریح سے کم نہیں ہے۔

امر پنجم :۔ یہ کہ وہ تمام ائمہ مجتہدین جن کے مذاہب مشرق و مغرب میں پھیلے ہوئے ہیں اور روئے زمین کے تمام متنفس مسلمان بلا استثنا انہیں کے مقرر کردہ اصول و فروع پر اللہ تعالیٰ کی عبادت و طاعت کر رہے ہیں اور انہیں میں سے کسی ایک کے مسلک کی پیروی اور ان کے نقش قدم پر چلنے میں اپنی نجات کے معتقد ہیں، یہ عظیم تر قبولِ عام ان حضرات کو صرف اس لئے میسر نہیں آیا کہ یہی کتاب و سنت کے سرچشموں سے سب سے زیادہ سیراب تھے اور علومِ کتاب و سنت کے فوق العادۃ حاذق و ماہر تھے، اجتہاد کے لئے جن علمی و فنی لوازمات کی ضرورت ہے ان میں یہ کامل الفن تھے یا زمانہ ہائے دراز تک یہ اس بحث و تحیص میں لگے رہے تھے اور اسی میں انہوں نے اپنی تمامتر توانائیاں اور عمریں صرف و وقف کر دی تھیں، بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ یہ مقدس ہستیاں ورع و تقویٰ میں، معرفت و خشیتِ الٰہیہ میں اللہ کے دین کے لئے عظیم تر اخلاص میں، بندگانِ خدا کی رہنمائی میں، اور اللہ کے دین اور اس کی کتاب اور عامۃ المسلمین کی خیر خواہی میں، عہد نبوت سے قریب تر ہونے اور بچشم خود آثارِ نبوت کا مشاہدہ کرنے میں اور اس ماحول میں زندگی بسر کرنے میں جو دین کی معرفت کا کامل معیار تھا اور پھر ان میں سے بعض حضرات خود ان قرونِ خیر کے اندر ممتاز اور نمایاں حیثیت کے مالک تھے جن کے "خیر" ہونے کی شہادت دی گئی ہے اور ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ازلی مشیت کا فیصلہ تھا کہ ان پاکیزہ نفوس اور مقدس ہستیوں کو دنیائے اسلام میں قبولِ عام حاصل ہوگا، یہ ان نفوسِ قدسیہ کی برگزیدگی کے ایسے روشن دلائل ہیں کہ کائنات کے صفحات اس کی شہادت دے رہے ہیں اور اسلامی تاریخ کے اوراق اس کا اعتراف کر رہے، دشمن تک ان کے تقدس و

طہارت کے معترف ہیں۔

لہٰذا اس عہد کے ہر محقق و مفکر کے پیشِ نظر یہ بدیہی حقیقت رہنی چاہیئے کہ ان تمام موجبِ اعتماد امور کے حصول کا اس تاریک دور میں کسی بھی شخص کے لئے تصور بھی قریب قریب ناممکن ہے، چہ جائیکہ حصول، لہٰذا ائمۂ مجتہدین اور ان کے مذاہب کی عظمت کا اعتراف دل کی گہرائیوں میں راسخ ہونا ازبس ضروری ہے، ان سے باہر نکلنے کا تصور بھی پاس نہ آنا چاہیئے۔

امرِ ششم:۔ یہ ہے کہ لائقِ فخر میراث (فقہِ مذاہبِ اربعہ) جس کا امتِ محمدیہ کے ایسے ایسے ائمۂ مجتہدین نے امت کو وارث بنایا ہے یہی وہ سب سے بڑی دولت و ثروت ہے جس سے امت ابدالآباد تک مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتی، ایسی صورت میں "مسائل حاضرہ" کے حل کرنے میں ان مذاہب کے مجتہدین سے بحث و استفادہ ازبس ضروری ہے۔

امرِ ہفتم:۔ یہ کہ یہی قرآنِ حکیم، احادیثِ نبویہ، مسائلِ اجماع، مدون فقہ کے مسائل اور ائمۂ مجتہدین کا تعامل اور طریقِ کار، ان نو بنو مسائل و حوادث کے حل کرنے میں ہماری موثق رہنمائی کریں گے جو سلف کے زمانے میں نہ تھے، اس لئے کہ کتبِ فتاویٰ، کتبِ نوازل اور ہر عہد میں کتبِ تجنیس و مزید" اس امر کی روشن دلیل ہیں کہ ہر زمانہ میں جو بھی نیا واقعہ یا حادثہ یا مسئلہ پیش آیا ہے ہمارے فقہائے اس کے حل کرنے میں مطلق کوتاہی نہیں کی ہے۔

امرِ ہشتم:۔ یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ اور اس کے واقعات و حوادث قانونِ قدرت کے تحت برابر بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور بڑھتے چلے جائیں گے۔ ان میں وقوف اور ٹھیراؤ نام کو نہیں اور جتنی کتابیں اب تک تصنیف کی گئی ہیں اور فتوے دیئے گئے ہیں اور فقہاء کے مسائل ہم تک پہنچے ہیں وہ اس جدید زمانے میں پیدا ہونے والے نوبنو واقعات اور تازہ بتازہ حوادث و مسائل کے حل کرنے کے لئے یقیناً کافی نہیں ہیں اس لئے ہم اس پر مجبور یا مامور ہیں کہ ان جدید مسائل کو اسی ذخیرۂ علم و ہدایت کی روشنی میں حل کریں جو ہم تک پہنچا ہے یعنی کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ اجماعِ امت اور اجتہادی و فقہی مسائل میں متقدمین کی علمی میراث یعنی فقہِ مذاہبِ مجتہدین اور اپنی کوتاہ بینی یا اعترافِ عجز و شکست اور احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر جدید فکر و نظر کے اس سیلاب

میں (جو یورپین مفکرین کی جانب سے آرہا ہے) ہرگز نہ ہیں۔

امرِ نہم :۔ یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے اور جس طرح بھی ہو سکے ہم ائمہ مجتہدین کے اقوال ہی سے استدلال کریں اور فقہِ مذاہبِ اربعہ سے باہر نہ جائیں اگرچہ کسی خاص مسئلہ میں ان میں سے کسی ایک کا مسلک چھوڑ کر دوسرے کا مسلک اختیار کرنا پڑے، غرض ان مذاہبِ متبوعہ میں سے جس مذہب میں بھی عہدِ حاضر کی کسی پیچیدگی اور دشواری کا حل مل جائے، اور اس سے وہ عقدۂ لاینحل کھل جائے، اسی سے استدلال کریں اور اس کو دانتوں سے پکڑ لیں تاکہ ہر نئے مسئلہ میں جدید اجتہاد ہمارا مبلغِ سعی نہ بن جائے اور ہمیں اجتہاد کا دروازہ ہر کس و ناکس کے لئے چوپٹ کھولنا نہ پڑے اس لئے کہ فریضۂ وقت اور تقاضائے ضرورت نہ اجتہاد کے دروازہ کو بالکل کھول دینا ہے اور بالکلیہ بند کر دینا اور اس پر سیل لگا دینا۔ بلکہ اس اس افراط و تفریط کے درمیان اعتدال کی راہ ہی صراطِ مستقیم ہے کہ ناگزیر ضرورت کے وقت اجتہاد کیا جائے اور وہ اجتہاد فقہِ مذاہبِ اربعہ کے اصول اور طریقِ کار سے باہر اور آزاد نہ ہو۔

امرِ دہم :۔ یہ ہے کہ آج ہمارے سامنے "مہم" جس کو ہمیں سر کرنا ہے ان جدید مسائل کا حل ہے جو سلفِ صالحین کے عہد میں یکسر موجود نہ تھے اور نہ ان کے خیال و فکر میں آسکتے تھے۔ اس لئے کہ یہ صرف مغربی تہذیب یا جدید تمدن کی پیداوار ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ مزایا اور خصوصیات جو فراواں علم، عظیم اخلاص اور شدتِ خشیت اللہ کے ساتھ ساتھ ہمارے سلف صالحین کے اندر موجود تھیں جیسا کہ میں بتلا چکا اس دور میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت میں بھی نہیں جمع ہو سکتیں۔ لہٰذا اس کمی کی تلافی اس طرح کی جائے کہ جہاں تک ہو کسی ایک فرد کی شخصی رائے پر اعتماد اور اس کو قبول کرنے سے اجتناب کیا جائے خواہ وہ کتنا ہی بڑا وسیع النظر اور کثیر المعلومات عالم کیوں نہ ہو بلکہ اس ذمہ داری کا بار اٹھانے کے لئے ایک جماعت سامنے آئے جس میں بحیثیت مجموعی وہ تمام ممیزات و خصائص موجود ہوں جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے طریقِ کار کو اُسوۂ حسنہ اور مشعلِ راہ بنایئے کہ امام صاحب موصوف باوجودیکہ بجائے خود اتنے قدیم العہد مجتہد ہیں کہ صحابہ اور کبار تابعین سے ان کا زمانہ بالکل ملا ہوا ہے اور خود صغار تابعین میں سے ہیں اور کتاب و سنت کے موجزن سرچشموں سے مکمل طور پر سیراب و سرشار ہیں، اس فراوانی علم کے ساتھ ساتھ قیاسی مشکلات، دشوار ترین فقہی

مسائل اور قضاء وافتاء سے متعلق مغلق پیچیدگیوں کو حل کرنے میں روشن بصیرت اور ایسی فوق العادۃ قدرتِ اجتہاد کے مالک ہیں کہ باتفاق رائے آپ کے ہم عصروں نے آپ کو "رئیس المجتہدین" تسلیم کیا ہے اور امام محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ جیسے صفِ اوّل کے مجتہدین آپ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "تفقہ واجتہاد میں تمام دنیا ابوحنیفہ کی عیال (پروردہ) ہے، جیسا کہ حافظ ابن عبدالبر، صیمری اور ابن ابی العوام سے بحوالہ ابی عبید بن قاسم اور بحوالہ حرملہ و ربیع وغیرہ تلامذہ امام شافعی نے امامِ موصوف کا تذکرہ بالا مقولہ نقل کیا ہے لیکن ان تمام خارق العادۃ اور مسلّم صلاحیتوں کے باوجود امام ابوحنیفہ ایک ایسی جماعت کی تخلیق وتشکیل سے مستغنی اور بے نیاز نہ ہوسکے جس میں مجتہدین، محدثین لغویین، اہلِ عربیت اور اربابِ ورع وتقویٰ عباد وزہاد موجود ہوں، چنانچہ انہوں نے ایک اجتہادی کمیٹی بنائی جس کے مستقل اراکین قاضی ابو یوسف، امام زفر، محمد بن الحسن شیبانی، حسن بن زیاد اسد بن عمرو، نوح بن ابی مریم، عافیۃ ازدی، حمزۂ زیات، ابن مبارک اور وکیع بن الجراح جیسے تقریباً چالیس ماہرینِ علوم وفنون ائمہ عصر جمع کئے جن میں سے ہر ایک ممبر کسی نہ کسی علم وفن یا زہد وتقویٰ میں اختصاصی اہلیت کا مالک تھا جیسا کہ الموفق المکی نے اس "لجنۃ الاجتہاد" سے بحث کی ہے۔ تو دیکھئے کہ امام ابوحنیفہ نے اپنی شخصی رائے پر اپنے مذہب کی بنیاد نہیں رکھی بلکہ حنفی مذہب کی تشکیل وتدوین ان تمام حذاقِ علوم وفنون اور اربابِ ورع وتقویٰ ائمہ کی باہمی مشاورت ومساعدت سے وجود میں آئی ہے، یہی وجہ ہے کہ دوسرے شخصی مذاہب کے بالمقابل جو وسیع اور محیطِ عالم قبولِ عام حنفی مذہب کو میسر آیا ہے اور کسی مذہب کو میسر نہیں آسکا، اسی لئے جیسا کہ حنفی مذہب اپنے تکوّن کے اعتبار سے سب سے زیادہ قدیم العہد اور پہلا مذہب ہے، اسی طرح دنیا سے انقراض اور زوال کے اعتبار سے بھی دنیا کا سب سے آخری مذہب ہوگا (انشاء اللہ) جیسا کہ امام شعرانی نے اس کی تصریح کی ہے، بہرحال عمر فاروق، خلفاءِ راشدین اور صحابۂ کرام کے بعد ابوحنیفہ پہلے مجتہد ہیں جنہوں نے اپنے مذہب کی بنیاد (شخصی رائے کے بجائے) باہمی مشاورت اور اجتماعی رائے پر رکھی ہے تو بھلا اس تاریک در تاریک دورِ مظلم میں جو اس عہدِ زریں اور ورع وتقویٰ، اخلاص اور یقین کے انوار سے روشن زمانہ سے کوئی بھی نسبت نہیں رکھتا بلکہ بالکل متضاد ہے) ہم کیونکر

اس اجتماعی رائے اور مشاورت باہمی سے مستغنی اور بے نیاز ہو سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ بھی آیت کریمہ اِن تتقوا اللہ یجعل لکم فرقاناً میں اسی کی جانب اشارہ فرماتے ہیں اور نبی علیہ الصلاۃ والتسلیم کی ایک حدیث سے تو اس مسئلہ کے تمام پہلو روشن بلکہ منصوص ہو جاتے ہیں، چنانچہ حافظ طبرانی نے معجم کبیر اور معجم اوسط میں بسندِ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی کہتے ہیں : میں نے عرض کیا یا رسول اللہ جب ہمارے سامنے کوئی ایسا مسئلہ آئے جس کے متعلق کوئی واضح بیان (نصِ کتاب وسنت) موجود نہ ہو نہ امر ہو نہ نہی (نہ حکم ہو نہ ممانعت) تو ایسے مسئلہ کے متعلق آپ ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں (ہم کیا کریں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسے مسئلہ میں تم فقہاء اور اربابِ ورع وتقویٰ سے مشورہ کرو اور کسی بھی شخصی رائے پر تکیہ نہ کرو۔ حافظ ہیثمی مجمع الزوائد میں فرماتے ہیں: اس روایت کے تمام راوی ثقہ اور رجال صحیحین میں سے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی میں اسی اجتماعی اجتہاد اور اس کے شرائط کی طرف رہنمائی کی گئی ہے جس کا حاصل حسبِ ذیل ہے :-

(۱) اجتہاد کی ضرورت صرف ایسے مسائل میں معتبر ہے جن میں (کوئی نصِ صریح نہ ہو) نہ رسول اللہ کی کوئی سنت (حدیث) ہو نہ وحیِ الٰہی (نصِ قرآن) ہو۔

(۲) ایسے مسائل کا حل لابدی طور پر جماعتِ علماء کے مشورہ سے کیا جائے نہ کہ کسی شخصی رائے سے۔

(۳) اس اجتہاد کمیٹی کے اراکین میں بیک وقت دو وصف ضرور موجود ہونے چاہئیں: ایک تفقہ فی الدین، دوسرے تقویٰ وعبادت گزاری۔

لائقِ احترام بزرگو!

اس میں شک نہیں کہ قرآنِ حکیم اور سنتِ نبویہ ایسے دو سیراب کن سرچشمے ہیں جن کے اندر قیامت تک ہر پیدا ہونے والی نئی سے نئی بیماری کے لئے کامل شفاء اور ہر دور میں رونما ہونے والی علمی تشنگی کی تسکین کے لئے آبِ حیات موجود ہے، اس لئے ہمارا عقیدہ ہے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کا علم اس قدر محیط ہے کہ ہر وہ فتنہ اور گمراہی، بے حیائی اور بے لگامی جو انسانی معاشرہ میں کسی بھی دور کے اندر رونما ہونے والی ہے اس سے وہ بخوبی واقف تھا اور اس جدید تہذیب وتمدن کے زمانہ میں

نوعِ انسانی کے نظامِ زندگی میں جو بھی معاشرتی، معاشی، اقتصادی اور تجارتی ضروریات وقتاً فوقتاً پیش آتی رہیں گی، خواہ شخصی ضرورتیں ہوں خواہ اجتماعی خواہ مادی ضرورتیں ہوں یا روحانی اِن کو بھی وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا، دوسری طرف اس کی قدرت بھی اس قدر کامل اور محیط ہے کہ وہ اپنے بندوں کے لئے ایسا کامل واکمل نظامِ زندگی آسمان سے نازل فرمادے جو ہر زمانہ میں اور ہر جگہ کافی ووافی ہو، یقیناً اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اس سے قاصر وعاجز نہیں ہے، ایسی صورت میں قطعی طور پر ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ شریعتِ محمدیہ جو اس نے عطا فرمائی ہے وہ یقیناً ہر کٹھن منزل پر نوعِ انسانی کی دستگیری کے لئے کفیل ہے اور اس کے آغوشِ علمی میں ہر مشکل اور دشواری کا حل یقیناً موجود ہے، صرف اتنی بات ہے کہ عام انسانی عقول وافکار اس کے مآخذ تک پہنچنے سے قاصر رہتی ہیں تو وہ (اپنی لاعلمی کا اعتراف اور اہلِ علم کی طرف رجوع کرنے کے بجائے) اس عہد میں انسانی سوسائٹی کے لئے شریعت کے ناقابلِ عمل ہونے اور عصرِ حاضر کی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہونے کے طعنے مارنے شروع کردیتی ہیں۔

لہٰذا وقت کا تقاضا ہے کہ شریعت کے اساسی اصولِ تشریع کو سامنے رکھ کر ان عصری مسائل کو حل کرنے کے لئے صحیح معیار اور درست پیمانہ پر قدم اٹھایا جائے اور مجمع بحوثِ اسلامی کے کارفرماؤں سے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ آخری حل اور نتیجہ پر پہنچنے میں عجلت سے کام نہ لیں، صبر وضبط، تحمل وبردباری، دیانت داری وآہستہ روی اختیار فرماکر علومِ قدیم وجدید میں ربط واتصال پیدا کریں، نظرِ دقیق اور رائے صائب کے ذریعہ ان کو جمع کرنے کی انتہائی محتاط کوشش فرمائیں اور اس امانتِ الٰہیہ کی حفاظت کی ذمہ داری کا احساس وشعور ہر لمحہ پیش نظر رکھیں تاکہ وہ حل صحیح ہو، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بھی مقبول ہو اور عامۃ الناس کے نزدیک بھی پسندیدہ، دولِ وممالکِ اسلامیہ کے لئے وہ قابلِ اعتماد طریق کار اور امتِ مسلمہ کے لئے لائقِ اتباع نمونہ ہو۔

کاش کہ ہمیں اس مؤتمر میں آنے سے پہلے زیرِ بحث مسائل کی اطلاع دے دی جاتی تاکہ ہم اس سے زیادہ بصیرت اور تیاری کے ساتھ مؤتمر کے تحقیقاتی کاموں میں حصہ لیتے۔

بہر حال اب بھی ہم ان تمام زیر بحث مسائل میں اپنا نظریہ پیش کرنے کے لئے تیار ہیں اور آپ سے اتنی توقع ضرور رکھتے ہیں کہ مسائل شرعیہ میں صرف رخصتوں[۱] کا تتبع اور تلفیق بین المسائل[۲] پر قناعت کر کے اس دھوکہ میں نہ پڑ جائیے کہ ہم نے شریعت کا دامن پکڑ رکھا ہے اور اس طرح دین مبین کو کھیل بنا لینے کی غلطی کے مرتکب نہ ہو جائیے، اعاذنا اللہ منہ۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے پرخلوص دعا ہے کہ وہ ہماری امیدوں کو ناکام و نامراد نہ فرمائیں اور یہ عظیم خدمت ازہر کے زیر سایہ سید جمال عبدالناصر صدر جمہوریہ عربیہ متحدہ کے عہد مسعود میں صلحاء اور مخلص علماء کی مساعی سے پایۂ تکمیل کو پہنچے۔

خاتمہ پر میں ممالک اسلامیہ کے محترم علماء و فضلاء کے سامنے معذرت خواہ ہوں کہ یہ چند کلمات قاہرہ پہنچنے کے دو دن بعد مؤتمر کے پروگرام کا علم ہوتے ہی مصروف ترین اوقات میں سے دو چار گھنٹے بچا کر قلم برداشتہ لکھ کر پیش کر رہا ہوں، امید ہے کہ ادائے مقصد میں ناکامی ہونے کی صورت میں چشم پوشی اور درگذر سے کام لیں گے۔ واللہ ولی التوفیق و السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

صفر ۱۳۸۴ھ

---

[۱] تتبع رخص: مسائل شرعیہ میں مذاہب اربعہ میں سے ہر مذہب میں سے سہولتیں اور آسانیاں چھانٹ کر انہی کو اختیار کر لینا

[۲] تلفیق بین المسائل: مذاہب اربعہ کے مسائل کو اس طرح خلط ملط کر دینا کہ ان کے ممیزات و خصائص مٹ کر ایک نیا مذہب اور نئی فقہ بن جائے۔

اسلامی قوانین میں اجتہاد و عقل کا مقام
اور
جدید مسائل میں اجتہاد کا طریقِ کار

تحریر: حضرت العلامہ مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ

ترجمہ: مولانا محمد یوسف لدھیانوی

زیرِ نظر مقالہ "موقف التشریع الاسلامی من الاجتہاد ومنصب العقل فی الدین" کے عنوان سے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی راولپنڈی کی بین الاقوامی کانفرنس (۱۱-۱۲-۱۳ ذی القعدہ ۱۳۸۷ھ) کے لئے لکھا گیا تھا، مقالہ چونکہ تاخیر سے تیار ہوا تھا اس لئے وہاں پڑھا نہیں گیا البتہ اس کا خلاصہ زبانی بیان کر دیا گیا تھا اس لئے اس کا ترجمہ ہدیہ قارئین ہے۔ (مترجم)

بسم الله الرحمٰن الرحيم، الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين، محمد وآله وصحبه المجاهدين للدين وعلى الفقهاء المجتهدين والعلماء الراسخين إلى يوم الدين، أما بعد:

فهذه كلمة موجزة في موضوع الاجتهاد ولست أريد لبسط القول فيما يتعلق بالموضوع من لفظ الاجتهاد ومعانيه وحكمه وركنه وشروطه وأقسامه، وإقامة الحجة على المنكرين وما إلى ذلك من أبحاث واسعة الأرجاء فقد تدفقت بها كتب علماء أصول الفقه من أئمة المذاهب، فلم يغادروا

یہ "اجتہاد" کے موضوع پر مختصر سا مقالہ ہے، میں (اس وقت) موضوع سے متعلقہ تمام مباحث پر مفصل بحث کا ارادہ نہیں رکھتا مثلاً "اجتہاد" کی لغوی تحقیق، اجتہاد کے معانی، حکم، ارکان، شرائط اقسام، حجیتِ اجتہاد پر دلائل اور اس قسم کی اور طویل بحثیں جن سے تمام ائمہ، مذاہب کے اصولِ فقہ کی کتابیں بھری پڑی ہیں، چنانچہ ان اکابر نے کسی چھوٹی بڑی بحث کو نہیں چھوڑا جس کی کماحقہ، تحقیق و تنقیح نہ کر ڈالی ہو، یہ سلسلہ اسلام کے

صغيرةً ولا كبيرةً إلا أحصوها ونقحوها بتحقيق وتخريج من أُقدم عصور الإسلام إلى منتهى عصور العلم، ولا ريب أنها ثروة عظيمة للأمة الإسلامية لا يستغنى عنها من يدعى البحث والتفقه، أو يدعى حل المشاكل العصريه؛

فمن عهد الإمام أبي حنيفة وصاحبه الإمام قاضي القضاة أبي يوسف ثم الإمام الشافعي ثم الطحاوي ثم الجصاص الرازي ثم أبي زيد الدبوسي ثم الفخر البزدوي والغزالي ثم وثم إلى عهد الرازي والآمدي إلى عهد الأمير الكاتب الاتقاني وابن الهمام الحنفي ظهرت في المكتبة الإسلامية العلمية الفقهية ما تندهش له العقول.

وإنما أحاول أن أُلفت أنظار أهل العلم أولي التحقيق إلى دعائم الاجتهاد في المسائل الحاضرة والمشاكل الحديثة، فقد أحدثت المدنية الحاضرة مسائل جديدة نرى فيها أموراً أنحتاج إلى تطبيقها على قواعد الشريعة المحمدية والفقه الإسلامي۔

ولاريب أن الدين الإسلامي خاتم أديان العالم كفيل بكل ما يحدث

قدیم دور سے لے کر علمی دور کے آخری سرے تک جاری رہا ہے، بلاشبہ یہ امتِ اسلامیہ کی مایۂ فخر دولت ہے جس سے نہ بحث و تفقہ کا طالبِ علم مستغنی ہے، نہ عصری مسائل کے حل کا مدعی اس سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔

چنانچہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلمیذِ رشید قاضی القضاۃ ابویوسفؒ کے دور سے پھر امام شافعیؒ امام طحاویؒ، جصاصؒ رازی، ابوزیدؒ دبوسی، فخر بزدوی، امام غزالیؒ کے دور سے امام رازیؒ اور آمدیؒ کے دور تک اور ان کے دور سے امیر کاتب اتقانیؒ اور ابن ہمامؒ حنفی کے دور تک اسلامی کتب خانے میں (اصولِ فقہ پر) اتنا بڑا ذخیرہ وجود پذیر ہوا جس سے عقل حیران رہ جاتی ہے۔

آج کی فرصت میں میرے پیشِ نظر صرف یہ ہے کہ محققین اہلِ علم کی توجہ مسائلِ حاضرہ اور جدید مشکلات میں اجتہاد کے اہم اصولوں کی طرف مبذول کراؤں کیونکہ نئے تمدن نے نئے مسائل کو جنم دیا ہے اور ان میں بہت سی چیزیں ایسی نظر آتی ہیں جنہیں قواعدِ شرعیہ اور فقہِ اسلامی کے مطابق ڈھالنا ہماری پہلی ضرورت ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ دینِ اسلام، تمام ادیانِ عالم کے لئے خاتم اور قیامت تک کی ضرورتوں کا کفیل ہے۔

إلى يوم القيامة، فالكتاب والسنة وما يدور حولهما كل ذلك ينابيع فياضة ينبع منها حلّ الحوادث، فمذاهب الصحابة ومن بعدهم من التابعين ثم أئمة الدين رضوان الله عليهم إنهم اجتهدوا وقاسوا على الأصول التي ثبتت أحكامها بالنص واجتهدوا التعدية حكم النصوص إلى الفروع والحوادث والنوازل فهكذا أصبح الاجتهاد والقياس مدركاً من مدارك الشرع وبه اتسعت دائرة التفقه في الدين، ولسنا ممن يضيق هذه الدائرة أو أن نسدّ هذه المنابع الفائضة في دين الله فدلائل الكتاب والسنة والعقل قائمة على توسيع هذه الدائرة في كل عصر من عصور الإسلام.

منها: قوله تعالى: «فاعتبروا يا أولي الأبصار»

ومنها: «إن في ذلك لعبرة لأولي الأبصار»

ولاريب أن الاعتبار هو رد حكم الشيئ إلى نظيره ومنه يسمى الأصل الذي يرد إليه النظائر عبرة.

چنانچہ کتاب وسنت اور ان سے متعلقہ علوم وہ فیاض چشمے ہیں جن سے حل مسائل کے سوتے ابلتے رہیں۔ پھر صحابہؓ وتابعین اور ائمہ مجتہدین کا طریق کار ہمارے لئے روشنی کا مینار ہے ان حضرات نے اجتہاد کیا اور جن "اصول" کے احکام نص سے ثابت تھے ان پر (غیر منصوص) کو قیاس کیا اور نصوص کے حکم کو فروع وحوادث کی طرف متعدی کرنے کے لئے اجتہاد سے کام لیا، اس طرح اجتہاد وقیاس اصولِ شرعیہ میں سے ایک اصول قرار پایا جس سے تفقہ فی الدین کا دائرہ وسیع ہوا ہم اس حق میں نہیں کہ اس دائرے کو تنگ کر دیا جائے، یا دینِ خداوندی کے ان فیاض چشموں کو بند کر دیا جائے، کیونکہ کتاب وسنت اور عقل کے دلائل سے ثابت ہے کہ یہ دائرہ ہر دور میں وسیع رہے گا۔

چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "پس تم عبرت لو اے عقل مندو!"

نیز ارشاد ہے "بے شک اس میں عبرت ہے بصیرت والوں کے لئے"۔

اور ظاہر ہے کہ کسی شیئ کے حکم کو اس کی نظیر کی طرف لوٹانے کا نام "اعتبار" ہے اسی لئے جس اصل کی طرف نظائر کو لوٹایا جائے اسے "عبرۃ" کہا جاتا ہے۔

ومنها: «ولو ردوه إلى الرسول وإلى أولي الأمر منهم لعلمه الذين يستنبطونه منهم»

نیز ارشاد ہے: "اور اگر یہ لوگ اس کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اور جو ان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان کے حوالے کر دیتے تو ان میں جو لوگ اس کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس کو خود ہی جان لیتے"۔

وليس الاستنباط إلا استخراج المعنى من المنصوص بالرأي كما يقوله السرخسي في الأصول.

اور استنباط کے معنی ہیں۔ جیساکہ سرخسی نے لکھا ہے۔ اجتہاد کے ذریعہ حکمِ منصوص کی علت دریافت کرنا۔

ومنها قوله: «فإن تنازعتم في شيء فردوه إلى الله والرسول» ويقول السرخسي[1]:

نیز ارشاد ہے: "پس اگر تم کسی امر میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ"۔

امام سرخسی لکھتے ہیں:-

"فلا يجوز أن يقال: المراد هو الرجوع إلى الكتاب والسنة، لأنه علق ذلك بالمنازعة والأمر بالعمل بالكتاب والسنة غير متعلق بشرط المنازعة، ولأن المنازعة بين المؤمنين في أحكام الشرع قلما تقع فيما فيه نص من كتاب أو سنة، فعرفنا أن المراد به المنازعة فيما ليس في عينه نص، وأن المراد هو الأمر بالرد إلى الكتاب والسنة بطريق التأمل فيما هو مثل ذلك الشيء من المنصوص

"یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ اللہ و رسول کی طرف لوٹانے سے مراد کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنا ہے، کیونکہ یہاں رد کو منازعت پر معلق کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ کتاب وسنت پر عمل کرنا اس شرط پر معلق نہیں، نیز جن احکامِ شرعیہ پر کتاب وسنت کے نصوص موجود ہوں ان میں اہلِ ایمان کے نزاع کی صورت مشکل ہی سے پیش آسکتی ہے، اس سے واضح ہوا کہ یہاں مراد وہ منازعت ہے جو ایسے واقعہ میں پیش آئے جس کے لئے کتاب وسنت کا صریح حکم موجود نہ ہو، اور "رد" سے مراد یہ ہے کہ جس حادثہ میں نزاع واقع ہو غور وفکر

---

[1] اصول السرخسی (۲/۱۲۸) طبع جدید حیدر آباد دکن۔

وإنما تعرف هذه المماثلة بإعمال الرأي وطلب المعنى فيه .[1]

والأخبار عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، وعن الصحابة في حكم الاجتهاد والمقايسة والاعتبار في غاية الكثرة، وقد استوفى منها قدراً صالحاً السرخسي في "أصوله" وابن عبد البر في "جامع بيان العلم" والحافظ ابن القيم في "إعلام الموقعين" وغيرهم من الأعلام. ونحن نكتفي بحديث معاذ في "السنن" رواه الأئمة وتلقاه بالقبول الأمة جمعاء .

ويقول الإمام الغزالي في "المستصفى" :

حديث تلقته الأمة بالقبول ولم يظهر أحد فيه طعناً أو إنكاراً، وما كان كذلك فلا يقدح فيه كونه مرسلاً، بل لا يجب فيه البحث عن إسناده، وهذا كقوله : «لا وصية لوارث» و«لا تنكح المرأة على عمتها» «فلا يتوارث أهل الملتين» وغير ذلك مما عملت به الأمة كافة

سے کتاب و سنت کے منصوص احکام میں اس کی نظیر تلاش کی جائے، اور یہ مماثلت، اجتہاد کے ذریعہ علتِ حکم کی دریافت ہی سے معلوم ہو سکتی ہے:

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی احادیث، اجتہاد قیاس اور اعتبار کے سلسلہ میں کافی تعداد میں موجود ہیں ان کی ایک اچھی مقدار، امام سرخسیؒ نے "اصول" میں امام ابن عبد البرؒ نے "جامع بیان العلم" میں اور حافظ ابن قیمؒ نے "اعلام الموقعین" میں اور دوسرے اکابر نے جمع کر دی ہے۔ ہم یہاں حدیث معاذ کے ذکر پر کفایت کرتے ہیں جو "سنن" میں موجود ہے، ائمہ حدیث نے اسے روایت کیا ہے اور تمام امت نے اسے قبول کیا ہے۔

امام غزالیؒ "المستصفیٰ" میں لکھتے ہیں:

"اس حدیث کو امت نے قبول کیا ہے اور کسی نے اس میں طعن یا انکار کا اظہار نہیں کیا، اس لئے اس کا مرسل ہونا قادح نہیں بلکہ اس کی سند کی تفتیش بھی ضروری نہیں، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث جن پر پوری امت عمل پیرا ہے مثلاً "وارث کے لئے وصیت نہیں"، "کسی عورت سے اس کی پھوپھی پر نکاح نہ کیا جائے"، "دو ملتوں کے لوگ ایک دوسرے کے وارث

---

[1] اصول السرخسی ج ۲ ص ۱۲۹ .

إلا أنه نص في أصل الاجتهاد ولعله
في تحقيق المناط وتعيين المصلحة
فيما علق أصله بالمصلحة، فلا
يتناول القياس إلا بعمومه
اهـ [1]۔

غير أنه طال البحث من طائفة
وكثرت التساؤل عن سنده فنأتي
بصفوة تحقيق ولبابه للبحاثة
المحقق الإمام الكوثري[2] في تقوية
إسناده على أصولهم۔

والحديث هذا قد أخرجه
أبو داود والترمذي والدارمي عن
معاذ بن جبل بألفاظ مختلفة
"أنه لما بعثه النبي صلى الله عليه
وسلم إلى اليمن سأله قائلاً: كيف
تقضي؟ قال: أقضي بما في كتاب الله،
قال: فإن لم يكن في كتاب الله؟
قال: فبسنة رسول الله، قال:
فإن لم يكن في سنة رسول الله؟
قال: أجتهد رأيي ولا آلو، فقال رسول
الله صلى الله عليه وسلم: الحمد لله الذي

نہیں ہوں گے؛ وغیرہ رکہ اس علمی تواتر کے بعد ان کی اسناد
کی بحث غیر ضروری ہو جاتی ہے) البتہ یہ حدیث (معاذ رضؓ)
اصلِ اجتہاد میں نص ہے، اور شاید یہ "تحقیقِ مناط" اور
تعیینِ مصلحت کے بارے میں ہے جہاں کہ اصل کا حکم مصلحت
پر معلق ہو، اس لئے یہ قیاس کو صرف اپنے عموم کی بنا پر شامل ہوگی۔
مگر چونکہ بعض لوگوں نے اسے طویل بحث کا نشانہ بنایا اور
اس کی اسناد کا سوال اٹھایا ہے اس لئے ہم یہاں امام
کوثری کی تحقیق کا خلاصہ اور لبِ لباب پیش کرتے ہیں جو
اصولِ حدیث کے قواعد کے مطابق انہوں نے اس کی قوتِ
سند کے بارے میں فرمائی ہے۔

اس حدیث کو امام ابوداؤد، ترمذی اور دارمی نے
مختلف الفاظ میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے
روایت کیا ہے، کہ:
"جب حضرت معاذ رضؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو فرمایا: فیصلہ کیسے کروگے؟
عرض کیا: کتاب اللہ کے مطابق! فرمایا: اگر اس کا صریح
حکم کتاب اللہ میں نہ ہو؟ عرض کیا: تو سنتِ رسولؐ کے مطابق!
فرمایا: اگر سنتِ رسولؐ میں بھی نہ ہو؟ عرض کیا: پھر میں اپنی
رائے سے اجتہاد کروں گا اور غور و فکر میں کوتاہی نہیں
کروں گا۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالےٰ
کا بے حد شکر ہے کہ اس نے فرستادۂ رسول اللہ (صلی اللہ

---

[1] المستصفیٰ للغزالی ص۹۴۲ [2] مقالات کوثری ص ۶۰ تا ۶۴۔

وفق رسول رسول الله لما يرضاه
رسول الله[1]»

وهذا الحديث رواه عن أصحاب معاذ الحارث بن عمرو الثقفي وليس هو بمجهول العين حيث إن شعبة يقول عنه: إنه ابن أخ المغيرة بن شعبة، ولا بمجهول الوصف من حيث إنه من كبار التابعين في طبقة شيوخ أبي عون الثقفي المتوفى سنة ۱۱۶ھ ولم يثبت فيه جرح مفسر فيكفي لعدالته وقبول روايته، ولم يبق حاجة إلى ثبوت نقل توثيقه عن أهل طبقته، والتابعون كلهم مشهود لهم بالخير عدول ما لم يثبت فيهم جرح مؤثر وجرح مفسر، وأما الصحابة فكلهم عدول لا يؤثر فيهم الجرح أصلاً مع أن الحارث هذا ذكره ابن حبان في الثقات،

ولا مجال لتضعيف الحديث بتفرد ابن عون عن الحارث لأن رد الحديث بتفرد راوٍ غير

علیہ وسلم) کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پسندیدہ طریق کی توفیق دی۔"

اس حدیث کو اصحابِ معاذؓ سے حارث بن عمرو ثقفی نے روایت کیا ہے، اور حارث نہ تو مجہول العین ہے، چنانچہ امام شعبہ فرماتے ہیں کہ وہ مغیرہ بن شعبہؓ کے بھتیجے ہیں اور نہ وہ مجہول الوصف ہے کیونکہ وہ کبارِ تابعین میں، ابوعون ثقفی (م ۱۱۶ھ) کے طبقۂ شیوخ میں ہے اور ان کے بارے میں کوئی "جرحِ مفسر" ثابت نہیں اس لئے ان کی ثقاہت اور قبول روایت کے لئے اتنا ہی کافی ہے اس کے بعد ان کے اہلِ طبقہ سے نقلِ توثیق کی حاجت نہیں رہ جاتی، اور تمام تابعین کے حق میں خیر کی شہادت دی گئی ہے۔ وہ سب ثقہ اور عادل ہیں جب تک کہ ان میں جرحِ مؤثر اور جرحِ مفسر ثابت نہ ہو اور صحابہ سب عادل ہیں، ان میں کسی قسم کی جرح بھی مؤثر نہیں، علاوہ بریں حارث کو ابن حبان نے "ثقات" میں ذکر کیا ہے۔

اور یہ حدیث اس وجہ سے بھی ضعیف نہیں قرار دی جاسکتی کہ ابن عون حارث سے اس کی روایت میں متفرد ہیں، اس لئے کہ ثقہ راوی کے تفرد کی وجہ

---

[1] سنن ابی داؤد، باب اجتہاد الرائی فی القضاء ص۵۰۵ (مطبوعہ نور محمد) جامع ترمذی، باب ماجاء فی القاضی کیف یقضی ص ۱۵۹ ج ۱۔ سنن دارمی ص ۳۳ باب الفتیا وما فیہ من الشدة۔

مجروح ليس من أصول أهل الحق، وأبو عون هذا يروي عنه أمثال الأعمش وأبي إسحاق ومسعر وشعبة والثوري وأبي حنيفة وغيرهم وهو من رجال الصحيحين وتوثيقه موضع إجماع بين أهل النقد.

وروى عنه هذا الحديث أبو إسحاق الشيباني وشعبة بن الحجاج وعن أبي إسحاق أبو معاوية الضرير وعن شعبة يحيى بن سعيد القطان و عثمان بن عمر العبدي وعلي بن الجعد ومحمد بن جعفر وعبد الرحمان ابن المهدي وأبو داود الطيالسي وغيرهم وعنهم من لا يحصون كثرةً حتى تلقت فقهاء التابعين الحديث بالقبول.

ومحاولة توهين الحديث بأنه روي عن أصحاب معاذ من أهل الحمص عن معاذ، وأصحاب معاذ مجاهيل محاولة فاسدة.

أما أولاً: فأصحاب معاذ معروفون بالدين والثقة ولا يمكن لأحد أن يثبت جرحاً في أحد أصحاب معاذ نصاً،

وأما ثانياً: فذكر الأصحاب بدون ذكر أحد منهم يدل على مبلغ شهرة الحديث

سے حدیث کو رد کر دینا اہل حق کا اصول نہیں، اور ابن عون، امام اعمش، ابواسحٰق مسعر، شعبہ، ثوری اور ابوحنیفہ جیسے اکابر کے استاذ، صحیحین کے راوی اور بالاتفاق اہلِ نقد ثقہ ہیں۔

ابن عون سے اس حدیث کو ابواسحاق شیبانی اور شعبہ بن حجاج نے روایت کیا ہے، اور ابواسحاق سے ابومعاویہ ضریر نے اور شعبہ سے یحییٰ بن سعید قطان، عثمان بن عمر عبدی، علی بن جعد، محمد بن جعفر، عبدالرحمان بن مہدی اور ابوداؤد طیالسی وغیرہم نے روایت کیا ہے اور ان حضرات سے بے شمار لوگوں نے روایت کیا، یہاں تک کہ فقہاء تابعین نے اس حدیث کو بالاتفاق قبول کیا۔

اور اس حدیث کو اس وجہ سے رد کر دینا کہ، یہ اصحابِ معاذ سے مروی ہے اور وہ مجہول ہیں، چند وجوہ سے غلط ہے۔

اولاً، اس لئے کہ اصحابِ معاذ، دین وثقاہت میں معروف ہیں اور ناممکن ہے کہ کوئی شخص اصحابِ معاذ میں سے کسی ایک کے حق میں بھی جرح ثابت کر سکے۔

(اور ثقہ کا مبہم ہونا مضر نہیں)

ثانیاً، اس لئے کہ اصحابِ معاذ کا بلا تعیین ذکر، اس امر کی دلیل ہے کہ روایت کے اعتبار سے یہ

من جهة الرواية كما يقوله القاضي أبو بكر ابن العربي[1] وغيره، فالبخاري في "صحيحه" في[2] حديث عروة البارقي يروي: سمعت الحي يتحدثون عن عروة، ولم ينزل الرواية عن الصحة، وقال مالك في القسامة[3]: إنه أخبره رجال من كبراء قومه، وأيضاً في الصحيح[4] عن الزهري: حدثني رجال عن أبي هريرة «من صلى على جنازة فله قيراط»

وأما ثالثاً: فقد وقع في لفظ شعبة في تاريخ ابن أبي خيثمة[5] قال: سمعت الحارث ابن عمرو ابن أخي المغيرة بن شعبة يحدث عن أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم عن معاذ بن جبيل ومثله عند ابن عبد البر في "جامع بيان العلم"[6] فإذن أصحاب معاذ هم أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم وهم عدول.

حدیث حد شہرت کو پہنچی ہوئی تھی، جیسا کہ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا ہے چنانچہ امام بخاریؒ نے عروہ بارقی کی حدیث کی سند اس طرح نقل کی ہے! "میں نے قبیلے کے لوگوں کو عروہ سے روایت کرتے سنا ہے۔" اس کے باوجود یہ روایت درجۂ صحت سے نہیں گری اور امام مالکؒ نے "قسامۃ" میں سند یوں بیان کی ہے "اسے اس کی قوم کے بڑے لوگوں میں سے چند مردوں نے خبردی" نیز صحیح مسلم میں زہری سے یوں روایت ہے کہ "مجھ سے چند مردوں نے بروایت ابوہریرہ یہ حدیث بیان کی ہے کہ جس نے جنازہ کی نماز پڑھی اس کے لئے ایک قیراط ہے۔"

ثالثاً: اس لئے کہ تاریخ ابن ابی خیثمہ میں بروایتِ شعبہ یہ لفظ ہیں "میں نے مغیرہ بن شعبہ کے بھتیجے حارث بن عمرو سے سنا وہ اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معاذ کی یہ حدیث بیان کرتے تھے"۔ حافظ ابن عبدالبر نے بھی "جامع بیان العلم" میں اسی طرح روایت نقل کی ہے، اندریں صورت اصحابِ معاذ رضی اللہ عنہم سے مراد اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور وہ سب عادل ہیں۔

---

1. شرح ترمذی لابن عربی ج ۶ ص ۷۳ (مطبوعہ مصر ۱۳۵۰ھ)
2. بحوالہ شرحِ ترمذی لابن عربی ج ۶ ص ۷۳
3. المؤطا للامام مالک باب القسامۃ ص ۷۰۰ طبع نور محمد کراچی۔
4. صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۰۰ طبع رشیدیہ دہلی
5. بحوالہ مقالات کوثری ص ۶۲
6. جامع بیان العلم وفضلہ وما ینبغی فی روایتہ وحملہ، لابن عبدالبر ج ۲ ص ۵۵، طبع منیریہ۔

أما رابعاً: فيقول الخطيب البغدادي في "الفقيه والمتفقه"[1] وقول الحارث ابن عمرو: عن أناس من أصحاب معاذ يدل على شهرة الحديث وكثرة رواته، وقد عرف فضل معاذ وزهده وقد قيل: إن عبادة ابن نسي رواه عن عبد الرحمٰن ابن غنم عن معاذ، وهذا إسناد متصل ورجاله معروفون بالثقة، على أن أهل العلم قد تقبلوه واحتجوا به فوقفنا بذلك على صحة الحديث عندهم. وبالجملة الحديث صحيح ثابت عند فقهاء المحدثين الجامعين بين الفقه والحديث، وربما يبلغ حد التواتر المعنوي مع ضم القرآن المحتفة وبقية الروايات المؤيدة، انتهى ملخصاً.

رابعاً اس لئے کہ خطیب بغدادی "الفقیہ والمتفقہ" میں لکھتے ہیں:۔

حارث بن عمرو کا "عن اناس من اصحاب معاذ" کہنا شہرتِ حدیث اور کثرتِ رواۃ کی دلیل ہے، اور حضرت معاذ کا فضل وزُہد معروف ہے (ان کے اصحاب بھی معمولی درجہ کے لوگ نہیں ہوں گے) اور کہا گیا ہے کہ عبادہ بن نسی نے اسے بروایت عبدالرحمٰن ابن غنم حضرت معاذ سے روایت کیا ہے اور یہ سند متصل ہے اور اس کے راوی سب ثقہ ہیں علاوہ بریں اہلِ علم نے اسے بالاتفاق قبول کیا ہے اور اس سے استدلال کیا ہے جس سے واضح ہے کہ یہ حدیث ان کے نزدیک درجۂ صحت رکھتی ہے۔"

حاصل یہ کہ فقہاءِ محدثین کے نزدیک یہ حدیث صحیح اور ثابت ہے، اگر اس کے ساتھ خارجی قرائن اور تائیدی روایات کو بھی ملا لیا جائے تو یہ قریباً تواترِ معنوی کا درجہ رکھتی ہے، امام کوثری کی تحقیق کا خلاصہ ختم ہوا۔

ومن أجود الأدلة في حجية الاجتهاد في النوازل ما رواه النسائي في "سننه" في باب الحكم

اور جدید مسائل میں حجیتِ اجتہاد کی عمدہ ترین دلیل وہ حدیث ہے جسے امام نسائی نے سنن میں "باب الحکم باتفاق اہلِ العلم" کے ذیل میں

---

[1] بحوالہ مقالات کوثری ص۶۳

باتفاق أهل العلم: عن عبد الله ابن مسعود في أثر طويل وفيه:

فإن جاء أمر ليس في كتاب الله ولا قضى به نبيه صلى الله عليه وسلم فليقض بما قضى به الصالحون، فإن جاءه أمر ليس في كتاب الله ولا قضى به نبيه صلى الله عليه وسلم ولا قضى به الصالحون فليجتهد رأيه ولا يقول: إني أخاف، إني أخاف، فإن الحلال بين والحرام بين، وبين ذلك أمور مشتبهات فدع ما يريبك إلى ما لا يريبك[1].

حضرت عبد اللہ بن مسعود کے طویل اثر میں روایت کیا ہے کہ:۔

"پس اگر ایسا معاملہ پیش آئے جس کا صریح حکم نہ کتاب اللہ میں ہو نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ فرمایا ہو تو وہ فیصلہ کرے جو سلفِ صالحین نے کیا ہو، اور اگر ایسا معاملہ درپیش ہو جو نہ کتاب اللہ میں ہو، نہ سلف نے، تو اپنی بصیرت سے اجتہاد کرے، اور یہ نہ کہے کہ میں ڈرتا ہوں، میں ڈرتا ہوں کیونکہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی اور حلال وحرام کے مابین بعض چیزیں مشتبہ ہیں، اس لئے اس پہلو کو چھوڑ دو جو کھٹک پیدا کرے اور وہ پہلو اختیار کرو جس میں کھٹک نہ ہو"۔

قال أبو عبد الرحمن (النسائي): هذا الحديث حديث جيد جيد، ومثله عن عمر رضي الله عنه[2] وأما ضرورة الاجتهاد من جهة العقل فهو ظاهر جداً فيقول الإمام السرخسي: ما من حادثة إلا وفيها حكم الله تعالى من تحليل وتحريم أو إيجاب

امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ "یہ حدیث بہت عمدہ ہے" اور اسی کی مثل حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔

اور عقلی حیثیت سے اجتہاد کی ضرورت بالکل واضح ہے، امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:۔

"کوئی حادثہ ایسا نہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے حلت یا حرمت، وجوب یا عدم وجوب کا حکم نہ ہو اور ظاہر ہے کہ ہر حادثہ میں نص صریح نہیں ہوگی

---

[1] سنن مجتبیٰ للنسائیؒ ج ۲ ص ۲۶۴، طبع نور محمد کراچی، سنن دارمی ص ۳۳ مطبع نظامی کانپور

[2] سنن نسائیؒ ج ۲ ص ۲۶۴، سنن دارمی ص ۳۴۔

أو إسقاط، ومعلوم أن كل حادثة لا يوجد فيها نص، فالنصوص محدودة متناهية ولا نهاية لما يقع من حوادث إلى قيام الساعة وفي تسميته حادثة إشارة إلى أنه لا نص فيها فإن ما فيه النص يكون أصلاً معهوداً إلى آخر ما قال[۱]۔

وبالجملة: حوادث العالم تجري مستمرة وتحدث مسائل ونوازل فلا بد أن نحل تلك الحوادث النازلة بضوء من الكتاب والسنة وإجماع الأمة ومن تراث الأئمة من غير عمه وضلال وعجز وفشل.

وتاريخ التشريع الإسلامي وتكميل أدوار الفقه وتدوين الكتب في النوازل والأجناس في كل عصر من عصور العلم حجة مقطوعة على فتح باب الاجتهاد في المسائل الغير المنصوصة في الكتاب والسنة كما تعامل به الأمة وتوارثت في القرون فلا داعي لمزيد البحث في جواز الاجتهاد فإن الله سبحانه وتعالى قد خلق العقل وجعله مداراً في الإنسان

کیونکہ نصوص محدود و متناہی ہیں، جبکہ قیامت تک کے حوادث غیر متناہی اور حادثہ کا نام "حادثہ" رکھنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس میں نص نہیں ہوگی، ورنہ جس پر نص صریح موجود ہو وہ "اصل معہود" ہوا"۔

حاصل یہ کہ زندگی رواں دواں ہے اور وہ اپنے جلو میں بہت سے نئے مسائل کو لاتی ہے اس لئے ہمارا فرض یہ ہونا چاہئے کہ ہم کتاب وسنت اجماعِ امت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں ان جدید مسائل کا حل اس طرح تلاش کریں کہ نہ تو کجروی اور گمراہی کی وادیوں میں بھٹکیں نہ بزدلی سے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں۔

تشریعِ اسلامی کی تاریخ، فقہی دور کی تکمیل اور ہر زمانے میں جدید مسائل پر کتابوں کی تصنیف اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ جن مسائل میں کتاب وسنت کے نصوص موجود نہیں ان میں اجتہاد کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ چنانچہ امت اسی اصول پر کاربند رہی ہے اس لئے جوازِ اجتہاد پر مزید بحث کی ضرورت نہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے عقل پیدا کی ہے، انسان میں امانتِ الٰہیہ کی برداشت کا مدار اسی پر رکھا ہے اور "بصائر و عبر"

---

[۱] اصول السرخسی ج ۲ ص ۱۳۹

لحمل الأمانة الإلهية وحث على التدبر فيه واستعماله في البصائر والعبر.

ويقول الإمام الفخر البزدوي في أصوله:

إنه نور في بدن الآدمي مثل الشمس في ملكوت الأرض تضيئ به الطريق الذي مبدأه من حيث تنقطع إليه آثار الحواس ثم هو عاجز بنفسه وإذا وضح لنا الطريق كان الدرك للقلب بفهمه كشمس الملكوت الظاهر إذا بزغت وبدا شعاعها ووضح الطريق كان العين مدركة بشعاعها[1]

وبالجملة: هو نور تنجلي به ظلمات الأوهام ونور تشرق به علل الأحكام وقد أثنى الله سبحانه في التنزيل العزيز على العقل في كثير من الآيات القرآنية فقال عز وجل:

((إن في ذلك لآيات لقوم يعقلون)) (الرعد ع ١)

((فتكون لهم قلوب يعقلون بها)) (الحج ع ٦)

میں غور و تدبر کی بار بار دعوت دی ہے۔

امام فخر الاسلام بزدوی فرماتے ہیں:

"عقل بدنِ انسان میں ایک نور ہے جیسا کہ زمینی عالم میں آفتاب۔ اس سے وہ راہیں کھلتی ہیں جہاں حواسِ ظاہری کا دائرہ ختم ہو جاتا ہے پھر یہ بذاتِ خود راہنما نہیں بلکہ اس کا کام صرف راستے کا اجاگر کر دینا ہے۔ راستہ واضح ہو جانے کے بعد اس کا ادراک قلب اپنے نورِ فہم سے کرے گا جس طرح طلوعِ آفتاب سے راستہ کھل جاتا ہے مگر راستہ نظر آنے کے لئے تنہا سورج کی روشنی کافی نہیں بلکہ چشمِ بینا کی بھی ضرورت ہے۔"

بہرحال عقل ایک نور ہے، ایسا نور! جس سے اوہام کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں، ایسا نور! جس سے عللِ احکام کی راہیں اجاگر ہو جاتی ہیں حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی متعدد آیتوں میں عقل کی مدح و توصیف فرمائی ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے:

"ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان کو جو غور کرتے ہیں۔"[2]

"جو ان کے دل ہوتے جن سے سمجھتے"

---

[1] کشف الاسرار علی اصول البزدوی ج ۴ ص ۲۳۲ - [2] آیات شریفہ کا ترجمہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ہے۔

«كذلك نفصل الآيات لقوم
يعقلون» (الروم ع ٤)

«صمٌ بكمٌ عميٌ فهم لا يعقلون»
(البقرة ع ٢١)

«ويجعل الرجس على الذين
لا يعقلون» يونس ع ١٠)

«وما يعقلها إلا العالمون» (العنكبوت ع ٤)

«أفلا يتدبرون القرآن أم على
قلوب أقفالها» محمد ع ٣)

«إنما يتذكر أولو الألباب» (الرعد ع ٣)

«لعله يتذكر أو يخشى» (طه ع ٣)

«وما يتذكر إلا من ينيب» (المومن ع ٢)

«وليتذكر أولو الألباب» ع ٣)

«ويضرب الله الأمثال للناس
لعلهم يتذكرون» (ابراهيم ع ٤)

ولكن أمام الباحث أنه نور وهاج لكن له دائرة خاصة لا يمكن أن يتعداها وحيث ينتهي طيران العقل يبتدأ من هناك طور من وراء طور العقل وهو طور الوحي الإلهي وطور النبوة الإلهية فلا ريب أن العقل يقصر من مدارك الوحي وكفاه فخراً بأن

"یوں کھول کر بیان کرتے ہیں ہم نشانیاں
ان لوگوں کے لئے جو سمجھتے ہیں"۔

"بہرے، گونگے اور اندھے ہیں سو وہ کچھ
نہیں سمجھتے"۔

"اور وہ ڈالتا ہے گندگی ان پر جو نہیں
سوچتے"۔

"اور ان کو سمجھتے وہی ہیں جن کو سمجھ ہے"۔

"کیا دھیان نہیں کرتے قرآن میں یا دلوں
پر لگ رہے ہیں ان کے قفل"۔

"سمجھتے وہی ہیں جن کو عقل ہے"۔

"شاید وہ سوچے یا ڈرے"۔

"اور سوچ وہی کرے جو رجوع رہتا ہو"۔

"اور تا سمجھیں عقل والے"۔

"اور بیان کرتا ہے اللہ، مثالیں لوگوں کے
واسطے تاکہ وہ فکر کریں"۔

یہ بات خاص طور سے یاد رکھنے کی ہے کہ بلاشبہ عقل، نورِ فروزاں ہے مگر اس کے لئے ایک خاص دائرہ ہے جس سے آگے قدم بڑھانا اس کے لئے ممکن نہیں اور جہاں عقل کی پرواز ختم ہوتی ہے وہاں سے، عقل سے بالاتر دائرہ شروع ہوتا ہے اور وہ وحیِ الٰہی اور نبوت الٰہیہ کا دائرہ ہے، لاریب کہ عقل ان امور کا ادراک نہیں کرسکتی جو وحی کی آنکھ سے نظر آتے

يدرك ما أثبته الوحي والنبوة ويبلغ إلى إدراك حقائق الوحي بنوره الثاقب وأدرك حكمها العالية ومصالحها الغامضة وعللها الخفية وثبت من ذلك أن الكتاب والسنة والشرائع الإلهية والأحكام المنصوصة لا غنى للعقل عن الخضوع أمامها والقيام بين يديها بأدب ووقار وانقياد وتسليم وإذا لم يصل إلى دركها اعترف أمامها بقصوره.

وعلى كل حال تقديم العقل في كل شيء مع وجود نص الوحي تجاسر قبيح وتأخيره عن كل شيء مع عدم وجود النص قصور وعجز فالأمر بين الأمرين وهذا هو الصراط المستقيم،

ولكن من المهم إلى الغاية أن نشير إلى نقاط يتجلى منها هذا الموضوع في وضوح:

الأولى: علم القرآن والسنة وإجماع الأمة والوقوف على مؤلفات الفقه الإسلامي ومعرفة العلوم التي يحتاج إليها

ہیں عقل کے لئے یہی فخر کیا کم ہے کہ وہ وحی کے بیان کردہ حقائق کا ٹھیک ٹھیک ادراک کرلے اور اپنے نورِ خداداد سے ان حقائق کی بلند حکمتوں، گہری مصلحتوں اور باریک اسرار و علل کا سراغ لگانے میں وہ کامیاب ہو جائے۔ اس سے واضح ہوا کتاب و سنت، شرائعِ الٰہیہ اور احکامِ منصوصہ کے سامنے سر جھکانے اور ادب و وقار اور تسلیم و انقیاد کے ساتھ ان کے سامنے کھڑا ہونے کے سوا عقل کو کوئی چارہ نہیں اور اگر حقائقِ وحی تک اس کی رسائی نہ ہو سکے تو اسے اپنی تنگ دامانی کا اعتراف کرنا ہوگا۔

مختصر یہ کہ نصوصِ وحی کے ہوتے ہوئے بھی عقل کو ہر چیز میں مقدم رکھنا بڑی گھناؤنی جسارت ہے، اور نصوصِ وحی کے نہ ہونے کی صورت میں بھی اس سے کام نہ لینا نری حماقت اور کوتاہی ہے، صحیح راستہ ان دونوں کے بیچ سے ہو کر گزرتا ہے اور وہی صراطِ مستقیم ہے۔

البتہ یہاں چند اہم نکات کی طرف اشارہ ہمارے لئے بے حد ضروری ہے جن سے موضوع کھل کر روشن ہو جائے۔

اول: اجتہاد کے لئے قرآن و حدیث اور اجماعِ امت کا علم، فقہِ اسلامی کی کتابوں سے واقفیت، اور فہمِ کتاب و سنت کے لیے جن علوم کی ضرورت ہے ان

في فهم القرآن والسنة خصوصاً بثلج الصدر بعلم أصول الفقه الإسلامي حيث لا مندوحة عنه.

الثانية: الفهم الثاقب والذكاء البالغ مع التقى والخشية الإلهية والإخلاص لدين الله.

الثالثة: العناية بالاجتهاد الشوروي حيث يشكل وجود رجال أفذاذ في تلك الصفات فيجبر ذلك الوهن من رأي فردي شخصي بآراء جماعة تجتمع فيها هذه الصفات مجموعة فيهم وإن لم تجتمع في فرد واحد منهم حيث إن الحديث النبوي أرشد الأمة إلى أن يشاوروا الفقهاء والعابدين من أن يقضوا برأي فرد كما ثبت ذلك في حديث رواه الطبراني عن عليّ وعن ابن عباس، وأبو حنيفة الإمام مع كونه فقيه الأمة لم يستبد بنفسه بل كوّن جماعةً لهذا الغرض من أربعين من كبراء الكبراء كما يذكره الموفق في مناقب أبي حنيفة.

میں مہارت از بس ضروری ہے خصوصاً "علمِ اصولِ فقہ" میں کامل بصیرت ہونی چاہیئے کہ اس کے بغیر ہم ایک قدم آگے نہیں چل سکتے۔

دوم: بالغ نظری اور دقیقہ رسی کے ساتھ تقویٰ خشیتِ الٰہیہ اور دینِ خداوندی کے ساتھ کامل اخلاص۔

سوم: شورائی اجتہاد کا اہتمام چونکہ ایسے یکتا اشخاص کا وجود، جو ان مجتہدانہ صفات میں کامل ہوں، بے حد مشکل ہے، اس لئے "شخصی رائے" کی کمی کو ایسی جماعت کی آراء سے پورا کیا جانا چاہیئے، جن میں، فرداً فرداً نہ سہی مگر مجموعی حیثیت سے یہ تمام صفات کامل طور سے جمع ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ جدید مسائل میں انفرادی رائے کے بجائے "فقہاء و عابدین" سے مشورہ کیا جائے۔ امام طبرانی نے یہ حدیث حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے، فقیہ الامت ہونے کے باوجود انفرادی اجتہاد نہیں کیا، بلکہ اس مقصد کے لئے ایسے چالیس افراد کی جماعت تشکیل کی جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ یکتائے زمانہ تھا جیسا کہ الموفق نے "مناقب ابی حنیفہ" میں ذکر کیا ہے۔

الرابعة: إذا صادفنا حلاً للنازلة في أحد من مذاهب الأئمة المتبوعين ولا يكون ذلك الحل من جملة شذوذ أو خروج عن الإجماع نختاره لكي لا نضطر إلى اجتهاد جديد أو الخروج عن المذاهب.

الخامسة: أن المذهب السائد في هذه البلاد مذهب الإمام أبي حنيفة فلا داعي لأن نخرج عن اتباعه بدون إلجاء شديد واضطرار أكيد وأن نشوش رأي العامة من غير أي جدوى.

السادسة: أن المسائل المنصوصة المقطوعة فوق دائرة الاجتهاد في كل عهد وأن دائرة الاجتهاد في غير المنصوصة وفي غير المسائل الإجماعية فاستخراج علة أو مصلحة أو حكمة وجعلها مداراً للحكم بحيث يجعل المنصوص غير معمول به أو يكون خارقاً للإجماع هذا مما لا مساغ له ويكاد يقرب من إلحاد أو تحريف وقد ارتكبه كثير من الناس إما من جهل أو عناد[1].

چہارم: جب کسی پیش آمدہ مسئلہ کا حل، مذاہبِ اربعہ میں سے کسی میں موجود ہو، بشرطیکہ وہ رائے شاذ اور اجماعِ امت کے خلاف نہ ہو تو ہمیں اسی کو اختیار کرنا ہوگا تاکہ اجتہادِ جدید اور مذاہبِ مجتہدین سے خروج کی ضرورت نہ رہے۔

پنجم: چونکہ ہمارے ملک میں حنفی مسلک رائج ہے، اس لئے بدون شدید اضطرار کے بلاوجہ اس سے نکلنا اور "رائے عامہ" کو خواہ مخواہ پریشان کرنا غیر معقول ہوگا۔

ششم: جن مسائل میں نصوصِ قطعیہ موجود ہوں وہ ہر دور میں دائرۂ اجتہاد سے خارج ہیں، اجتہاد صرف ان مسائل تک محدود ہے جو نہ منصوص ہوں نہ اجتماعی، اس لئے اس کی گنجائش نہیں کہ کسی حکم کی علت، مصلحت یا حکمت تراش کر اسے ایسے طور پر مدارِ حکم قرار دے دیا جائے کہ اس سے نص کا غیر معمول بہ ہونا یا اجماعِ امت کا باطل ہونا لازم آئے یہ طرزِ عمل تقریباً الحاد و تحریف سے جا ملتا ہے اور بہت سے لوگ جہل یا عناد کی بنا پر اس کے مرتکب ہیں۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغۃ: باب الفرق بین المصالح والشرائع۔

السابعة: أن عهد الخلافة الراشدة وخصوصًا عهد الشيخين أبي بكر وعمر - رضي الله عنهما - لا يمكن لأن يجعل نظيرًا في بعض المسائل والاجتهاد الجديد فإن منصب الخلافة فوق منصب الاجتهاد واتباعه مأمور به من الشارع عليه الصلاة والسلام.

الثامنة: أن يجتنب عن تلفيق الأقوال في المذاهب وتتبع الرخص عند الأئمة إلا في بعض المسائل عند الاضطرار، فإن ذلك يرادف الانخلاع عن الدين.

التاسعة: أن القوانين الجارية في البلاد الغير الإسلامية المتبعة في الحضارة الجديدة التي تنافي روح الإسلام لا يجتهد في تطبيقها في البلاد الإسلامية سواء بسواء ويعتذر بالاضطرار إليها مع مخالفتها المقطوعات الإسلامية بل يجتهد في تطبيق حلها بما نجد بدلاً عنها في الإسلام وذلك مثل مسئلة ربا البنوك والتأمين والوكالات التجارية

ہفتم: مسائل جدیدہ میں اجتہاد کے لئے خلافتِ راشدہ خصوصًا خلافتِ شیخین حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو نظیر بنانا ناممکن ہے، کیونکہ خلافتِ راشدہ کا مقام منصبِ اجتہاد سے بالاتر ہے اور خلافتِ راشدہ کے فیصلوں کو مضبوطی سے پکڑنے کا حکم شارع علیہ الصلاۃ والسلام کی طرف سے امت کو دیا گیا ہے۔

ہشتم: مذاہبِ مختلفہ کو ملانے (تلفیق) اور اضطراری حالت کے بغیر مذاہبِ فقہاء سے چھانٹ چھانٹ کر رخصتوں کو تلاش کرنے سے پرہیز کیا جائے، کیونکہ یہ دین ہی سے نکل جانے کے مرادف ہے۔

نہم: جدید تمدن کی بدولت غیر اسلامی ممالک میں بیشتر ایسے قوانین رائج ہیں، جو روحِ اسلام کے منافی اور قطعیاتِ اسلامیہ سے ٹکراتے ہیں، انہیں "اضطرار" کے بہانے سے اسلامی معاشرے میں جوں کا توں فٹ نہ کیا جائے، بلکہ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے اسلام میں اس کا جو "بدل" موجود ہے اسے اختیار کیا جائے۔ مثلاً "بینک کا سود"، "بیمہ" اور "کمیشن ایجنسی" کا مسئلہ ہے کہ اسلام میں اس کا بدل "شرکت"، "قراض" اور "کفالت" وغیرہ

وغيرها بأن في الإسلام أبوابًا من الشركة القراض والكفالة ما فيه غنى عن اتخاذها قدوةً وأسوةً.

وإن المشكلة فيها قد أحدثها تطبيق فروع غير إسلامية على أصول إسلامية فيظن بالإسلام أنه لا يمكن أن يساير نظام العالم الحديث، ولكن أمام الباحث أن الأصول الإسلامية منبعها العلم الصحيح المحيط إلى قيام الساعة والقدرة الأزليه الكاملة لا تعجز عن شيئ فجاءت من لدن عليم خبير ومن هو على كل شيئ قدير.

العاشرة: أن يفرق فرقًا واضحًا جليًا بين الإلجاء والاضطرار وبين الترف والترفه ورغبة توفير الأموال واتخاذ الثروة، ومن الظلم العظيم أن يسوى بين رجل جائع لا يجد ما يسد به خلته وجوعه وبين رجل يتدفق بيته بأنواع من النعيم ولا يسد

کی صورت میں موجود ہے، جس کے ہوتے ہوئے ان حرام کے ارتکاب کی ضرورت نہیں رہتی۔

اشکال کی جڑ بنیاد یہ ہے کہ ہم غیر اسلامی قوانین کو، ان میں رتی بھر تبدیلی کئے بغیر اسلامی اصول پر منطبق کرنے بیٹھ جاتے ہیں اور جب وہ فٹ نہیں ہوتے تو گمان کر لیا جاتا ہے کہ اسلام معاذ اللہ جدید دور کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہ یاد رہے کہ اصولِ اسلامیہ کا سرچشمہ ذاتِ خداوندی ہے جس کا علم صحیح قیامت تک کے حوادث کو محیط ہے اور جس کی قدرت ازلیہ کاملہ کسی چیز سے عاجز نہیں کیونکہ یہ شریعت اس ذات کی طرف سے آئی ہے جو علیم و خبیر بھی ہے اور ہر چیز پر قادر بھی۔

دہم: الجاء و اضطرار کے درمیان اور عیش پرستی، زراندوزی اور امیر سے امیر تر بننے کی حرص کے درمیان جو نمایاں فرق ہے اسے ملحوظ رکھنا چاہیئے، ایک بھوکا ننگا فاقہ کش ہے جسے قوت لایموت بھی میسر نہیں اور ایک وہ امیر کبیر ہے جس کا گھر طرح طرح کے اسباب تنعم سے پٹا پڑا ہے مگر اس کی حرص کی جہنم کو صبر نہیں، یہ کتنا بڑا ظلم ہوگا کہ دونوں کا حکم یکساں قرار دیا جائے، پہلی صورت اضطرار کی ہے (جس میں سدِ رمق تک مردار کھانے کی بھی اجازت ہے) اور دوسری اسراف و تبذیر کی (جس کے لئے مجبوری کا بہانہ مضحکہ خیز نہیں تو اور کیا ہے) اور بدیہی

نهمته شئ، فذاك اضطرار
وهذا اسرف وتبذير، وسوء الفهم
يعمل المضحكات بل المبكيات،
ورحم الله من أنصف.

هذه إشارات موجزة في موقف
التشريع الإسلامي من الاجتهاد
اكتفيت فيها بالإجمال دون الخوض
في غمار التفصيلات حرصًا
على الوقت، ولا شك أن الموضوع
يحتاج إلى بسطٍ شافٍ نظرًا
إلى أهميته ولكن ما لا يدرك
كله لا يترك كله ودمع من عوراء
غنيمة باردة، وجهد المقل دموعه،
فكان الأمر كما قال قائلهم:

جهد المتيم أشواق فيظهرها
دمع على صفحات الخد ينحدر

عاشق کی پونجی وہ سوزِ دروں ہے، جس کی غمازی
رخسار پر بہتے ہوئے چند آنسو کیا کرتے ہیں

اسی طرح کے مضحکہ خیز لطیفوں بلکہ ماتم انگیز
حادثوں کو جنم دیا کرتی ہے۔
حق تعالیٰ رحم فرمائے اس پر جو
انصاف سے کام لے۔

"اسلامی قوانین میں اجتہاد کے مقام"
پر یہ چند مختصر اشارے عرض کئے گئے ہیں
جن میں تنگیٔ وقت کے پیش نظر تفصیلات
کے بجائے اجمال سے کام لیا ہے۔ اس میں
شک نہیں کہ موضوع کی اہمیت شرح وبسط کی
متقاضی تھی تاہم جس چیز کا پورا ادراک ممکن نہ ہو اسے
بالکلیہ چھوڑ دینا بھی زیب نہیں، کانی آنکھ کا رونا
بھی صد غنیمت ہے اور نادار کی کل کائنات
اس کے چند آنسو ہوتے ہیں، میرا حال وہی
ہے جو کسی شاعر نے کہا ہے:

والله سبحانه ولي التوفيق وهو حسبنا ونعم الوكيل.

محرم الحرام ١٣٨٨ھ

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کا تحریری بیان

جو آپ نے مجمع البحوث الاسلامیہ ازہر کی تیسری کانفرنس میں پیش کیا۔

كلمة الوفود

الأزهر

مجمع البحوث الإسلامية

المؤتمر الثالث — كلمة: لمحمد يوسف البنوري - الوفد الباكستاني

السكرتارية الفنية

الحمد لله وأشهد أن لا إله إلا الله وأن محمداً رسول الله، صلى الله عليه وعلى آله وصحبه ومن اهتدى بهديه وهداه، أما بعد:

السيد الرئيس والسادة الأجلة!

لا شك أن إدارة الأزهر الشريف قديماً وحديثاً مما يستحق كل إجلال وتقدير وإعجاب من الأمة الإسلامية خصوصاً في أهل العلم بأنها إدارة وحيدة قامت بخدمة الدين والعلم في حل المشاكل العلمية الدينية التي أنشأتها المدنية الجديدة والحضارات الحديثة أو الاستشراق الأوربّاوي.

ومن مفاخر الأزهر أنه قد قام في كل دور من أدوار الإسلام بما يقتضيه

جناب صدر اور جلیل القدر حضرات علماء

اس میں شک نہیں کہ ازہر کا ادارہ ہمیشہ سے اور آج بھی پوری امت اسلامیہ خصوصاً اہل علم کے احترام، قدر دانی اور سپاس وتحسین کا مستحق ہے اس لئے کہ یہی وہ منفرد ادارہ ہے جس نے ہمیشہ ان تمام تر علمی اور دینی مشکلات کو حل کر کے جو جدید تمدن، جدید تہذیب اور یوربین (فتنہ) استشراق کی پیداوار ہیں۔ علم اور دین کی خدمت بطریق احسن انجام دی ہے۔

ازہر کے لائق فخر کارناموں میں شاندار کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہمیشہ اسلام کے ہر دور میں دینی

مصالح العصر، وقام أمام كل إلحاد وتحريف سداً منيعاً وحصناً حصيناً، فذب عن الإسلام وحوزة الدين الحنيف كل حملة شعواء وفتنة شنعاء فأصبح قدوةً وأسوةً في العالم طوال القرون ومنارة النور الوهاج يستضيئ بها السائدون في العصور المختلفة .

وهذه منة جزيلة يستحق أن يشكرها المسلمون في حنايا صدورهم وطوايا قلوبهم .

ومما يسرنا أن الكلمات الثلاث التي ألقيت في حفلة المؤتمر صباحًا : (١) للأستاذ الأكبر (٢) وسيادة الأمين العام لمجمع البحوث الإسلامية (٣) والسيد نائب الرئيس حسين الشافعي قد اتفقت على حل جميع

اور علمی) مصالح وقت کے تقاضوں کو مکمل طور پر پورا کیا ہے اور ہر کجروی، انحراف اور دینی تحریف کے سیلاب کو روکنے کے لئے مضبوط بند اور لادینی کی یورشوں کے مقابلہ کے لئے محکم قلعہ بن کر سامنے آیا ہے اور اسلام اور حریم دینِ توحید کی جانب سے ہر اندھا دھند حملے اور بدترین فتنہ کا مکمل دفاع کیا ہے اسی بنا پر ازہر تمام عالم اسلامی کے لئے قرناً بعد قرنٍ ۔ لائق اقتداء نمونہ اور مختلف ادوار میں علمی اور دینی قائدین کے لئے روشنی کا منارہ (سرچ لائٹ) بنا رہا ہے کہ اس کی روشنی میں عمائدین اپنے اپنے ملک میں دینی قیادت کا فرض انجام دے رہے ہیں ۔

یہ وہ احسان عظیم ہے جس کی بنا پر ازہر اس کا مستحق ہے کہ تمام ملکوں کے مسلمان اپنے دلوں کی گہرائیوں اور سینوں کی پہنائیوں میں ازہر کے شکر وسپاس کے جذبات محسوس کریں ۔

ہمارے لئے انتہائی مسرت کا موجب یہ امر ہے کہ صبح موتمر کے اجلاس میں جو تینوں بیان پڑھے گئے. (١) استاذ بزرگ شیخ ازہر کا بیان (٢) مجمع البحوث کے عمید عمومی (ڈائرکٹر جنرل) کا بیان (٣) نائب صدر جمہوریہ متحدہ مصر جناب حسین شافعی کا بیان ۔ وہ اس پر متفق ہیں کہ تمام دینی اور علمی مشکل اور پیچیدہ مسائل خالص قرآن عظیم اور سنت نبویہ (علی

المشكلات الدينية والعلمية
بضوء القرآن الكريم
والسنة النبوية وألّا يشوه
وجهها بتحريف وإلحاد و
تأويل يستبرئ عنه روح
الإسلام وجوهر الدين،
كما أصبح هو ديدن
كثير من أرباب الأقلام
فرجائي من القائمين بالأمر
أن يكون هذا أساساً عملياً
لحل المسائل والمعضلات
لكي يتلقى بالقبول في بلاد
الإسلام بإذعان وانقياد و
ترحيب، ولكي لا يكون حلاً
على صفحات القراطيس
بل على صفحات القلوب۔

ولاريب أنها ستكون
خدمة نبيلة جالبة
للرحمة الإلهية مماثلة
لما اختطته عقول سلفنا
الصالحين من الأئمة المجتهدين
ومن بعدهم أفذاذ أهل
العلم والدين۔

صاحبہا الصلاۃ والسلام) کی روشنی میں
حل کئے جائیں گے بغیر کسی قطع برید، کجراہی و
انحراف کے اور بغیر کسی ایسی تاویل کے جو اسلام کی روح
اور اساس دین کے منافی ہو، جیسا کہ یہ طریق کار
اس زمانہ میں) بہت سے آزاد اہل قلم مصنفین
ومؤلفین کا شیوہ بن گیا ہے لہٰذا مجھے (مجمع البحوث
کے) اربابِ اختیار سے کامل توقع ہے کہ مسائل حاضرہ
اور مشکلاتِ عہد جدید کے حل کرنے کے لئے یہی
"اساس" عملی طور پر کارفرما رہے گی تاکہ (اس معیار
پر کئے ہوئے) یہ "حل" تمام عالم اسلام میں
یقین و اطمینان، تسلیم و انقیاد اور سپاس
وتحسین کے ساتھ قبولِ عام حاصل کریں اور تاکہ
یہ حل زینتِ صفحاتِ کتب بننے کے بجائے
صفحاتِ قلوب پر ثبت ہو کر بقاءِ دوام
حاصل کریں۔

اور اس میں تو شک ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ
شاندار (دینی اور علمی) خدمت اللہ تعالیٰ
کی رحمت کا موجب ہونے کے ساتھ ہی ساتھ
ہمارے سلف صالحین - ائمہ مجتہدین اور ان
کے بعد آنے والے "یگانہ روزگار" علماء امت
اور اربابِ دین - کی فہم و فراست کے اسوہ اور
طریق کار کے مماثل ومشابہ بھی ہوگی۔

وبالجملة: الرجاء الأكيد أن تقدم حلول هذه المشاكل كافةً للناس ناصعة الجبين مرضاةً لرب العالمين.

وآمالنا معقودة بمؤتمرات مجمع البحوث الإسلامية بأن تقوم بواجبها بكل كفاءة وديانة وهي أحق بها وأهلها.

والخطط المرسومة والقرارات والتوصيات في المؤتمرين السابقين لمجمع البحوث الإسلامية تجعلنا مطمئنين للخطوات المتقدمة إلى الأمام ونرجو أن تكون له مزايا ومفاخر في هذا الصدد بحيث لا يبارى ولا تجارى.

ووجود كبار العلماء في الأزهر وعلى رأسهم الإمام الأكبر شيخ الأزهر في مجمع البحوث الإسلامية كفيل بإنجاح هذه الآمال المعقودة والأعمال المنشودة لكي تكون أنوارًا ثاقبةً في دياجي هذه المادية القاتمة.

ثم لي رجاءان:

بہرحال قوی امید ہے کہ یہ روشن اور تابناک حل (نہ صرف مصر کے لئے بلکہ) تمام عالم اسلام کے لئے پیش کئے جائیں گے اور رب العالمین کی رضا کا وسیلہ ہوں گے۔

اور ہماری تو تمامتر امیدیں مجمع البحوث الإسلامیہ کی ان کانفرنسوں سے وابستہ ہیں کہ وہ پوری اہلیت وصلاحیت اور دیانت داری کے ساتھ اپنا فرض ادا کریں گی اس لئے کہ وہی اس کی اہل ہیں اور وہی اس کی مستحق ہیں۔

مجمع البحوث کی سابقہ دو موتمروں کے رسمی طریق کار اور تجاویز وسفارشات ہمیں اس کے آئندہ اٹھنے والے قدموں کے بارے میں کلی طور پر مطمئن کرتی ہیں اور ہمیں توقع ہے کہ وہ اس (دینی وعلمی خدمت کی انجام دہی کے) معاملہ میں ایسی امتیازی خصوصیات اور لائق فخر کارناموں کی مالک ہو گی جن کا نہ مقابلہ کیا جا سکے گا اور نہ انکار۔

مجمع البحوث میں ازہر کے کبار علماء اور ان کے سربراہ شیخ ازہر کا وجود مسعود ہماری ان امیدوں کے پورا ہونے اور شاندار کارناموں کے انجام پانے کی بہت بڑی ضمانت ہے تاکہ اس سیاہ رُو مادیت کی تاریکیوں کے دور میں وہ مشعل راہ بن سکیں۔

علاوہ ازیں میں مجمع البحوث سے دو امر کی درخواست کرتا ہوں:

الأول: أن يخصص مجمع البحوث ويكون لجنة خاصة للإشراف على التآليف الصادرة في جوهر الدين وحقائق الإسلام في الجمهورية المتحدة، وأن يرد على كل ما يستحق الرد من الخروج في جوهر الدين أو الشذوذ عن معتقد أهل الحق وأن يلقموا أحجاراً في أفواه أولئك التابعين وراء كل ناعق لكي تتم أعماله القيمة في كل ناحية ذباً عن حريم الشريعة المحمدية وبذلك يحيي شعار الأزهر القديم في ربوع الدنيا مرة أخرى.

والثاني: إن فرع الإرشاد والوعظ الديني بالأزهر أن يتسع نطاقه عملياً في كل قطر من أقطار البلاد للإرشاد الديني وتربية العامة الذين أصبحت صلتهم بالدين في غاية الوهن، وأن ينتخبوا علماء صالحين متبرعين بالخدمة والخروج إلى القرى والضواحي للنصح والتبليغ والتربية من

اوّل یہ کہ مجمع البحوث، جمہوریہ متحدہ مصر میں دین کے اساسی موضوعات اور اسلامی حقائق پر لکھی اور شائع کی جانے والی کتابوں پر خصوصی نگرانی کی غرض سے ایک مخصوص نگران کمیٹی کی تشکیل کرے، یہ نگران کمیٹی ان تمام تصنیفات وتالیفات کی دندان شکن تردید کرے جو اساس دین سے بغاوت یا اہل حق کے مسلمہ معتقدات سے انحراف پر مشتمل ہوں اور ان اہل قلم کا منہ بند کردے جنہوں نے ہر نیا نعرہ لگانے والے کی آواز پر لبیک کہنا اپنا شعار بنا لیا ہے تاکہ ہر پہلو سے مجمع البحوث کے قابل قدر "کارنامے" شریعت محمدیہ کے دفاع کے باب میں کامل ومکمل ہو جائیں اور اس طریق پر ازہر کا شعار (امتیازی نشان)، دنیا کے تمام آباد خطوں میں نئی زندگی حاصل کرے۔

ثانی: میں درخواست کرتا ہوں کہ ازہر کے شعبۂ وعظ وتبلیغ کے حلقہ کی عملی طور پر ملک کے ہر ہر حصہ میں مزید توسیع کی جائے اور دینی وعظ وتبلیغ اور عوام کی دینی تربیت کا جال گوشہ گوشہ میں بچھا دیا جائے اس لئے کہ اس زمانہ میں عوام کا دین سے تعلق اور وابستگی انتہا درجہ مضمحل ہو چکی ہے۔ (ملک گیر تبلیغ دین کی شدید ضرورت ہے) اور اس تبلیغ ودینی تربیت کے لئے لوجہ اللہ کام کرنے والے ایسے علماء کا انتخاب کیا جائے جو بغیر کسی معاوضہ

غير أن تكون لهم رواتب سامية بدل هذه الخدمة، ويصرفوا على رحلاتهم وأسفارهم نفقات خاصة من عند أنفسهم.

وقد قام في بلاد الهند والباكستان على هذا الطراز جماعات للدعوة تدنشروا الدعوة الإسلامية عملياً و يمثلون حياة إسلامية خالصة في حلهم وترحالهم، فحصل بذلك خير كثير وبركات في كل ناحية.

والله سبحانه ولي كل توفيق ونعمة وهو حسبنا ونعم الوكيل.

(تنخواہ) کے بستی بستی اور گاؤں گاؤں گشت کرکے محض رضاءِ الٰہی کے لئے وعظ و تبلیغ اور مسلمانوں کی دینی تربیت کا فرض انجام دیں اور نہ صرف یہ کہ اس خدمتِ دین کا کوئی معاوضہ نہ لیں بلکہ آمد و رفت اور سفر کے اخراجات بھی خود ہی برداشت کریں۔

ہندوستان و پاکستان میں اسی طرز کی ایک ملک گیر تبلیغی جماعتوں کا نظام قائم ہے یہ جماعتیں نہ صرف ملک میں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی اپنے سفر و حضر میں عملی طور پر خالص اسلامی زندگی کا نمونہ پیش کر رہی ہیں اور دین کی دعوت پہنچا رہی ہیں اور اس بابرکت تبلیغی تحریک سے ملک کے ہر حصہ میں مسلمانوں کو بہت زیادہ فائدہ اور نفع پہنچ رہا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ ہی ہر توفیق و نعمت عطا فرمانے والے ہیں وہی ہمارے لئے کافی ہیں اور بہت اچھے کارساز ہیں۔

کتبہ

محمد یوسف البنوری

۱۰/۸ ۱۹۶۶

افاداتِ حمّادیہ

سرزمینِ سندھ میں حضرت مولانا حماد اللہ صاحب ہالیجوی ان اکابرِ اُمت میں سے تھے کہ ان کے کمالات کو یا تو کسی نے صحیح طور پر پہچانا نہیں یا پھر صحیح فائدہ نہیں اٹھایا وہ پیر و مرشد تھے لیکن متبعِ سُنت، وہ حکیم بھی تھے، لیکن نہایت حاذق، وہ عالم بھی تھے لیکن نہایت محقق، وہ زاہد تھے جن کے زہد کی نظیر میں نے اپنی زندگی میں نہ دیکھی نہ سُنی، وہ عارف تھے، تصوف کے رموز و اسرار اور اُن کے لطائف و اذکار کے دانائے راز تھے، ان کی یہ خصوصیات تو ایک مقالے کی محتاج ہیں، دو چار ملاقاتوں میں ان کی زندگی کے ایسے گوشے نظر آئے کہ حیرت ہوئی، ان مختصر مجالس اور مختصر قیام میں چند باتیں سُنی تھیں، جن کی حلاوت و لذت سے اب تک سرشار ہوں، ان افادات کو اپنی یادداشت میں کچھ عرصہ کے بعد قلم بند کر لیا تھا، جی چاہا کہ "بینات" کے ناظرین اور اہلِ علم حضرات کو بھی اس لذت میں شریک کروں، کاش ان کے علمی ملفوظات اور مجلسی جواہرات قلم بند ہوتے تو آج تصوف کے علمی خزانے میں بیش بہا جواہرات کا اضافہ ہوتا: ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ (البنوری)

ف: أولئك الذين أنعم الله عليهم الآية :-

الأنبياء هم الذين جعل الله سبحانه وتعالىٰ قلوبهم مواس دالوحی الإلهی ینزل علیها الوحی، والصدیقون هم الذین جعل الله قلوبهم

ارشادِ خداوندی ہے: جو حکم ملنے اللہ کا اور اس کے رسول کا بس یہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ کا انعام ہوا، یعنی نبی صدیق شہید اور صالحین انبیاء (علیہم السلام) وہ حضرات ہیں جن کے قلوب کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے

أُدعيةً للوحي فتحفظ الوحي، والشهداء هم الذين يفدون بمهجهم وأموالهم لحفظ الوحي، والصالحون هم الذين يعملون بمقتضى الوحي الإلهي فأحقُّ هؤلاء بالعمل الذين اختارهم منازل وموارد لوحيه وأعرفهم بحقائقه ثم الذين قلوبهم أُوعية بطبيعتها لحفظه فلا يضيع الوحي الإلهي هناك أبداً، ثم الشهداء ثم الصالحون هذا ما استفدته من العارف السندي مولانا الشيخ حماد الله السندي.

وحیِ الٰہی کا محل بنایا کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے۔ صدیقؔ: وہ حضرات ہیں جن کے قلوب کو حق جلّ شانہ نے خازنِ وحی بنایا، وہ وحی کو محفوظ کرتے ہیں۔ شہید: وہ حضرات ہیں جو حریمِ وحی کی پاسبانی کے لئے جان ومال قربان کرتے ہیں۔ صالحینؔ: وہ حضرات ہیں جو منشاءِ وحی کی تعمیل کے لئے ہر آن حاضر رہتے ہیں پس جن حضرات (انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام) کو اللہ پاک نے اپنی وحی کا محل ومورد بنانے کے لئے منتخب فرمایا، وہ وحی کے حقائق ومعارف کے علم اور اس کی تعمیل میں سب سے آگے ہیں، ان کے نقشِ قدم پر وہ حضرات ہیں جو فطرۃً خازنِ وحی ہیں، ان حضرات کے ہوتے وحیِ الٰہی کے (علماً یا عملاً) ضائع ہوجانے کا احتمال نہیں، ان کے بعد شہداء کا پھر صالحین کا درجہ ہے۔" یہ تو عارف سندھی مولانا حماد اللہ کا افادہ ہے۔"

ويقول الشاه عبد العزيز الحجة الدهلوي في فتح العزيز: النبي من تأثر بنور القدس الإلهي من جهة القوة النظرية العلمية فيتجلى له الأشياء وحقائقها من غير أن يقع فيها اشتباه ومن جهة القوة

اور شاہ عبد العزیز دہلوی (نور اللہ مرقدہ) فتح العزیز میں فرماتے ہیں: "نبی وہ ہوتا ہے جس کی قوتِ نظریہ اور قوتِ عملیہ دونوں قدسِ الٰہی کے نور سے منور ہوں، چنانچہ اس کی قوتِ نظریہ کے اعتبار سے ان کے سامنے تمام اشیاء کے اصل حقائق روشن ہوجاتے ہیں۔

العملية بحيث تحصل له ملكة تصدر منها الأعمال الصالحة بغاية المحبة والرضاء وتنفر من أعمال الشر بطبيعته ثم إذا تم كمال قواه البدنية واستوفى عقله التجربي ونضج يبعث إلى هداية الخلق ويؤيد بالمعجزات الإلهية وبالآيات العقلية ثم بين تلك الآيات العقلية من أخلاقه الكريمة وعلومه الصادقة والبيان الواضح والحجة الواضحة وتأثر الخلق بأنوار صحبته وما إلى ذلك وهذه الآيات يستدل بها أهل الفضل والكمال من الخواص كما أن المعجزات يستدل بها العامة.

اور ان میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں رہتا اور قوتِ عملیہ کے اعتبار سے اسے ایسا فطری ملکہ حاصل ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ کمالِ محبت و رضا کے ساتھ اعمالِ صالحہ پر قادر ہوتا ہے اور بُرے اعمال سے اسے طبعاً نفرت ہوتی ہے، پھر جب اس کی بدنی قوتیں پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی ہیں اور عقلِ تجربی پوری طرح کامل و پختہ ہوجاتی ہے تو اسے مخلوق کی ہدایت کے لئے کھڑا کیا جاتا ہے اور خدائی معجزات اور عقلی دلائل و آیات اس کی پشت پر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے دلائلِ عقلیہ کی تفصیل بیان کی ہے، یعنی نبی کے اخلاقِ کریمہ، علومِ صادقہ، بیانِ واضح حجۃِ قاطعہ، مخلوق کا اس کی صحبت سے اثر پذیر ہونا وغیرہ، خواص اہلِ فضل وکمال ان آیات سے نبی کی نبوت پر اسی طرح استدلال کرتے ہیں جس طرح کہ عوام حسی معجزات سے۔

والصديق من يقارب النبي في قوته النظرية دون العملية والشهيد من يثلج صدره بإجابة النبي ويشاهد قلبه عيانا ذلك بحيث يستعد لكل تضحية من نفسه وماله بكل سهولة

صدیق وہ ہوتا ہے جو قوتِ نظریہ میں نبی کے ہم رنگ ہو مگر قوتِ علمیہ میں نہیں۔

شہید وہ ہوتا ہے جو نبی کی ہر بات ثلجِ صدر (قلبی اطمینان) سے قبول کرتا ہے اور اس کا قلب آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتا ہے۔

اور اسی بنا پر وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ

فهو يشبه النبي في قوته العملية.

والصالح من لم يبلغ في قوته إليه غير أنه يتابع النبي في حياته من اجتناب المعاصي والاتصاف بالعقائد الطاهرة وما إلى ذلك. ويطلق الولي في العرف عليه وإن كان يشمل هؤلاء الثلاثة والقدر المشترك بين الأربعة بأن الله يحبهم و يضع لهم القبول في الأرض ويتكفل رزقهم ومعاشهم بامتياز من عامة الناس ويكون همتهم عالية لا يرضون بحطام الدنيا وتكون قلوبهم مستنيرة ينجلي لهم الأشياء ما تقصر عنها عقول الناس انتهى ملخصًا.

ہر قسم کی جانی و مالی قربانی کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا ہے، یہ گویا قوتِ عملیہ میں نبی کے ہم رنگ ہوتا ہے۔

صالح: وہ ہوتا ہے جو اپنی دونوں قوتوں میں نبی رسے ہم رنگی تک نہیں پہنچ پاتا، تاہم وہ اپنی زندگی کے تمام لمحات میں نبی کے نقشِ قدم پر چلتا ہے، عقائد واخلاق میں بھی اعمال و عبادت میں بھی، اور گناہوں سے بچنے میں بھی، عرفِ عام میں اسی کو "ولی" کہتے ہیں، اگرچہ "ولی" کا مفہوم پہلی تین قسموں کو بھی شامل ہے اور ان چاروں قسم کے حضرات کے درمیان قدرِ مشترک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت فرماتا ہے، ان کی مقبولیت زمین میں پھیلا دی جاتی ہے، عام لوگوں سے کچھ نرالے انداز میں ان کے رزق و معاش کی کفالت فرماتا ہے، ان کی ہمتیں بلند ہوتی ہیں، وہ دنیا کی متاعِ حقیر کو خاطر میں نہیں لاتے، ان کے قلوب روشن ہوتے ہیں، ان کے سامنے وہ حقائق روشن ہوتے ہیں جن سے عام انسانی عقلیں قاصر رہتی ہیں، اھ ملخصاً۔[1]

---

[1] یہاں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تحقیق بھی پیشِ نظر رہے تو مناسب ہے وہ فرماتے ہیں:-
"اہلِ فہم جانتے ہیں کہ نبوت کمالاتِ علمی میں سے ہے، کمالاتِ عملی میں سے نہیں، الغرض کمالاتِ ذوی العقول کل دو کمالوں میں منحصر ہیں، ایک کمالِ علمی، دوسرا کمالِ عملی، اور بنائے مدح کُل انہیں دو باتوں پر ہے، چنانچہ کلام اللہ میں چار فرقوں کی تعریف کرتے ہیں: نبیین اور صدیقین اور شہداء اور صالحین، جن میں سے انبیاءؑ کو تو منبع العلوم اور فاعل اور صدیقین کو مجمع العلوم اور قابل سمجھئے اور شہداء کو منبع العمل اور فاعل اور صالحین کو مجمع العمل اور قابل خیال فرمائیے ......" (تحذیر الناس ص۵)
اس کے بعد حضرتؒ نے تفصیل سے اس متن کی شرح کی ہے یہ پوری بحث دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہے۔
(مدیر)

فائدہ: حسنات الأبرار سیئات المقربین

الأبرار هم الذين يعملون الصالحات ابتغاءً لجنته ونعيمها وما أعدّ الله سبحانه لهم من الجنّة الدائمة.

ابرار: وہ حضرات ہیں جو جنت اور نعمائے جنت کے لئے اعمالِ صالحہ کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے لئے جو پائیدار نعمتیں اور دائمی جنت تیار کر رکھی ہے اسے حاصل کر سکیں۔

والمقربون هم الذين يريدون وجهه تعالى وذاته العليا، بحيث فنيت شهواتهم وإراداتهم من دون كبريائه، فوصلوا إلى درجة المحبة الذاتية، والأبرار بقوا في درجة المحبّة الصفاتية، ولم يرتقوا منها، فكأنّهم يذكرونه ويحمدونه حصولاً لتلك النعماء الإلهيه - كمثل رجل له ابنان ابن يخدم أباه ويعطف عليه ويبرّه نظراً إلى حصول ما وعده أبوه من إعطاء صلةٍ ووراثةٍ، فيعلم أنّه يستحقه إذا برّ به ويحرم إذا عقّه فهذا إذا حصل له مراده فتر عطفه وبرّه أو ينتهي أو إذا يئس منه وتيقّن حرمانه

مقربین: وہ ہیں جو صرف حق تعالیٰ کی ذات اور اس کی رضا چاہتے ہیں ذاتِ کبریا کے سامنے ان کی خواہشیں اور ان کے ارادے مٹ چکے ہیں، پس مقربین محبتِ ذاتیہ کے مقام پر فائز ہو چکے ہیں اور ابرار ابھی محبتِ صفاتیہ کے مقام میں ہیں اس سے اوپر نہیں گئے، یہ حضرات اللہ تعالیٰ کا ذکر و حمد نعمتہائے خداوندی کے لئے کرتے ہیں، ان کی مثال ایسی سمجھو کہ ایک شخص کے دو بیٹے ہیں، ایک بیٹا باپ کی خدمت بھی کرتا ہے اس کی ضروریات بھی پوری کرتا ہے اس کے ساتھ اظہارِ محبت بھی کرتا ہے مگر اس کا مقصد یہ ہے کہ والد صاحب نے جس انعام یا وراثت کا اس سے وعدہ کر رکھا ہے اسے حاصل کر سکے، اسے معلوم ہے کہ وہ اپنے باپ کا مطیع و فرمانبردار ہوگا تو انعام و میراث کا مستحق ہوگا اور عاق ہونے کی صورت میں محروم رہے گا، اس بیٹے کے بارے میں یہ توقع بے جا نہیں کہ جب اس کا مطلب پورا ہو جائے گا تو اس کی خدمت و اطاعت میں فتور آجائے گا یا یہ سلسلہ بالکل ہی ختم

لأمر ينتهي عاطفته، وابن يخدم أباه محبةً مع شخصيته وذاته دون أن يخطر بقلبه هٰذه الأغراض، فإنّ برّه وعطفه لا ينتهي أُبداً سواء حصل لهٗ من خير أو لم يحصل فالأول في درجة الأبرار والثاني في درجة المقربين فلا شك أن حسنةً يقوم بها الأبرار غرضاً لتلك الصلة المادّيّة سيئةٌ كبيرة في نظر المقربين الذين لا يريدون إلّا وجههٗ ولا يشوب محبتهم شيءٌ من الأغراض المادية، فإذن علاقة المقربين علاقة متينةٌ قويّةٌ لا انفصام لها، وعلاقة الأُبرار واهية على شرف السقوط عند حصول المقصود، وبالجملة ليس الفرق بين هؤلاء وهؤلاء إلا من جهة النيات دون الأُعمال فهم متفقون في ظواهرهم ومختلفون في بواطنهم وإنما

ہو جائے گا، اسی طرح اگر وہ کسی وقت انعام سے مایوس ہو جائے، اور اسے یقین آ جائے کہ وہ بہر حال محروم رہے گا۔ تب بھی اس کی خدمت گذاری کا سارا سلسلہ یکسر بند ہو جائے گا۔ اس کے برعکس ایک دوسرا بیٹا ہے جو اپنے باپ کی خدمت اس کی ذات وشخصیت سے محبت کی بنا پر کرتا ہے، کسی اور غرض کا کبھی خیال تک اس کے دل میں نہیں آیا، اس بیٹے کو باپ کی طرف سے کوئی انعام ملے یا نہ ملے مگر اس کی خدمت و اطاعت کا سلسلہ کبھی موقوف نہیں ہوگا، پہلا بیٹا ابرار کے درجہ میں ہے اور دوسرا مقربین کے درجہ میں، ظاہر ہے کہ ان مادی انعامات کے لئے ابرار جو نیکیاں کرتے ہیں وہ مقرّبین کی نظر میں بہت بڑی غلطیاں ہوں گی، وہ تو صرف اس کی رضا چاہتے ہیں، ان کی محبت ان اغراض مادیہ کی آمیزش کو گوارا نہیں کرتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ مقربین کا تعلق ایسا مضبوط ہے کہ اس کے ٹوٹنے کا احتمال نہیں اور "ابرار" کا تعلق کمزور ہے، ہر دم خطرہ ہے کہ ان کا مقصود بر آجائے تو یہ جاتا رہے، خلاصۂ کلام یہ کہ اُن میں اور اِن میں فرق ہے تو صرف نیت کا ہے

الأعمال بالنيات وإنما لامرئ مانوى" و الله أعلم.	عمل کا نہیں، ظاہر دونوں کا ایک جیسا ہے لیکن باطن الگ الگ: "اعمال کا مدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی۔" واللہ اعلم[1]

اس آیت کی تفسیر میں شاہ عبدالقادر دہلویؒ لکھتے ہیں: "لوگ کہتے ہیں جو کوئی اللہ کو پکارے توقع سے یا ڈر سے وہ محبِ تحقیق نہیں، یہاں سے اس کی غلطی نکلی۔"

حکیم الامۃ حضرت تھانویؒ اپنے شیخ امام العارفین مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (نور اللہ مرقدہٗ) سے نقل کرتے ہیں کہ وہ فرمایا کرتے تھے: "بھائی ہم تو احسانی عاشق ہیں۔"

درحقیقت محبتِ صفاتیہ ہی محبّت ذاتیہ کا زینہ ہے جب تک مقامِ صفات میں رسوخ نہ ہو مقامِ ذات تک رسائی کیسے نصیب ہوسکتی ہے؟ اور ہم نالائقوں کو حق تعالیٰ کی صفات و احسانات کا بھی شعور نہیں، ذاتی محبت کیا کریں گے۔

---

[1] یہاں مقصود صرف ان دونوں بحثوں کے درمیان فرق بتانا ہے اور یہ کہ محبتِ ذاتیہ کا مرتبہ سب سے عالی ہے اس مرتبہ میں ارتداد کا خطرہ نہیں مگر صفاتی محبت میں مرنے سے پہلے پہلے زوال کا خطرہ رہتا ہے مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ جب تک محبّتِ ذاتیہ کا مرتبہ حاصل نہ ہو سب کچھ بیکار ہے بہت سے لوگ بعض بزرگوں کے حالات (مثلاً رابعہ بصریہؒ کے واقعہ) سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ جنت اور نعمتِ الٰہیہ کے حصول کے لئے یا اس کے عذاب اور جہنم سے بچنے کے لئے عبادت کرنا بے کار اور غلط ہے حالانکہ اگر یہ خیال صحیح ہوتا تو قرآن و حدیث میں جگہ جگہ ثواب و عذاب اور وعدہ وعید کی کیا ضرورت تھی؟ سورۂ انبیاء میں بہت سے انبیاءِ کرامؑ کا تذکرہ فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ) (الانبیاء ع ۶)	تحقیق یہ حضرات بھلائیوں میں جلدی کرتے تھے، اور رغبت سے اور ڈر سے ہمیں پکارتے تھے اور ہمارے سامنے عاجزی کرنے والے تھے۔

یہاں یہ بھی یاد رہنا چاہیے کہ حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام اور ان کے مخلص متبعین مقامِ ذات کے ساتھ مقامِ صفات کو بھی جمع کر لیتے ہیں، وہ عمل جنت ہی کے لئے کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے بار بار جنت اور نعمائے جنت کی دعائیں کرتے ہیں (جیسا کہ احادیث میں بکثرت وارد ہے) مگر جنت ان کو اس لئے مطلوب ہے کہ وہ محبوبِ حقیقی کی رحمت و رضوان کی جگہ ہے جو وہاں پہنچ جائے گا، اس سے ہمیشہ ہمیشہ کی رضا و رحمت کا وعدہ ہو چکا ہے، بس جنت خود مطلوب نہیں بلکہ اس لئے مطلوب ہے کہ رضائے الٰہی کا مظہر ہے، خدانخواستہ وہاں بھی رضائے الٰہی نصیب نہ ہو تو جنت، جنت نہیں، بدترین دوزخ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اصل مقام حبِ ذاتی کا ہے تاہم جنت اور نعمائے جنت سے استغناء نہیں، واللہ اعلم (مدیر)

شعبان ۱۳۹۰ھ، اکتوبر ۱۹۷۰ء

افادات حمادیہ

فائدة من باب المعرفة بالله

قد بيّن السادة الصوفية العرفاء للذكر أربع طبقات: الأولى: الناسوت، والثانية: الملكوت، والثالثة: الجبروت، والرابعة: اللاهوت،

حضرات صوفیاءِ کرام (رحمہم اللہ) نے ذکر کے چار درجے بیان فرمائے ہیں، ناسوت[1]، ملکوت[2]، جبروت[3]، لاہوت[4]۔

فالناسوت: ظهور البشر في عالم الوجود والمرأ إذا ظهر في هذه المرتبة فله قرينان: النفس والشيطان، وأيضًا هو محفوف بالحوائج الطبيعية من النفقة والسكنى وغيرهما؛

ناسوت سے مراد ہے انسان کا عالم وجود میں ظاہر ہونا، آدمی جب اس مرتبہ میں ظہور پذیر ہوتا ہے تو نفس و شیطان اس کے ساتھ لگے رہتے ہیں نیز وہ خوراک، رہائش اور اس قسم کی دوسری ضروریات میں گھرا رہتا ہے۔

فالنفس تشتهي لذائذ الدنيا وشهواتها كما أشار إليه سبحانه وتعالى في قوله: "زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ"

اب نفس دنیا کے لذائذ و شہوات پر لپکتا ہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے اپنے ارشاد میں اس کی طرف اشارہ فرمایا: "آراستہ کی گئی لوگوں کے لئے محبت خواہشات کی، یعنی عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے جمع کئے ہوئے ڈھیر."

والشيطان يزين لها تلك اللذائذ والشهوات والأعمال الفاسدة من الفسق والفجور كما بيّنه الله سبحانه وتعالى في عدة آيات التنزيل: "وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ" الآية "فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ" الآية

اور شیطان نفس کے لئے ان لذات و شہوات کو خوبصورت کر کے دکھاتا ہے اور فسق و فجور اور اعمالِ بد کی ترغیب دیتا ہے، جیسا کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے یہ قرآن مجید کی کئی آیتوں میں بیان فرمایا، ایک جگہ ارشاد ہے: "اور جب آراستہ کر دکھائے ان کو شیطان نے ان کے عمل"، نیز ارشاد ہے: "پس آراستہ کیا ان کے لئے شیطان نے."

والحاجات البشرية المرأ بطبيعته يشتهيها، فهذه الأمور كلها تستدعي أن تكون محبوبةً وتقع محبتها من المرأ بجذر قلبه وتستولي عليه، فالذكر باسم الجلالة "الله" يكون القصد بأن ينفي محبة هذه الأمور ويثبت محبة الله جلّ ذكره؛ فإذا قال: "اَللهُ اَللهُ" فكأنّه يُجيب النفس والشيطان بأني لا أحبّ إلا الله ولا محبة إلا للهُ جل ذكره، فيكرره ويقول "اَللهُ اَللهُ" وهو الذكر في مرتبة الناسوت.

ثم كأنّه يرتقي السالك الذاكر من هذه المرتبة إلى مرتبة الملكوت (مبالغةٌ في الملك بفتحتين) والملكُ لا نفس هناك ولا شيطان ولا تلك الطبائع البشرية والحاجات الطبيعية ومقصود الملائكة رضا الله جل ذكره، فالذكر في هذه

اور انسانی ضروریات کا تقاضہ خود آدمی کی طبیعت میں موجود ہے، پس یہ سب چیزیں محبوب بننا چاہتی ہیں اور ان کی محبت آدمی کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوا چاہتی ہے، پس حق تعالےٰ کے اسم گرامی "اللہ" کے ذکر سے مقصد یہ ہے کہ ان تمام امور کی محبت کی نفی کی جائے اور حق تعالےٰ کی محبت کا اثبات کیا جائے، پس جب ذاکر "اللہُ اللہ" کہتا ہے، گویا وہ نفس وشیطان کو جواب دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے محبت نہیں کرتا اور محبت اللہ جل شانہ کے سوا کسی کا حق نہیں، چنانچہ غیر اللہ کی محبت کو مٹانے اور صرف اللہ جل شانہ کی محبت کو راسخ کرنے کے لئے وہ بار بار اللہ اللہ کا ورد کرتا ہے، یہ مرتبۂ ناسوت کا ذکر ہے۔

پھر سالک ذاکر اس مرتبہ سے ترقی کرکے مرتبہ ملکوت میں پہنچتا ہے (ملکوت، ملک کا مبالغہ ہے) مرتبہ ملکیت میں نہ نفس ہے، نہ شیطان، نہ بشری طبائع ہیں، نہ طبعی حاجات ــــ ملائکہ کا مقصود صرف اللہ جل شانہ کی رضا جوئی ہے، اس لئے اس مرتبہ میں ذکر کا مقصد محض حق سبحانہ

المرتبة القصد فيها حصول رضا الله سبحانه وتعالىٰ، فيقول: "الله الله" إبتغاءً لرضاه تعالىٰ،

و تعالیٰ کی رضا جوئی ہے، اور بس۔ پس اسی رضائے الٰہی کے لئے اللہ اللہ کا ذکر کرتا ہے۔

ثم يرتقي منه إلى مرتبة الجبروت وهي عبارة عن مرتبة صفات الله تبارك وتعالىٰ، فيلاحظ في هذه المرتبة صفاته العليا من جلالٍ وكبرياءٍ وعظمةٍ وإحسانٍ ورأفةٍ ورحمةٍ، وبالجملة فيراقب صفاته من جلال وجمال ويقول: "اَللّٰهُ اَللّٰهُ" استغراقاً في صفاته تعالىٰ جلّ وعلا۔

پھر یہاں سے مرتبۂ جبروت میں ترقی پاتا ہے اور یہ عبارت ہے حق تبارک تعالیٰ کے مرتبۂ صفات سے، اس مرتبہ میں وہ حق تعالیٰ شانہ کی صفاتِ عالیہ، جلال، کبریائی، عظمت، احسان، شفقت رحمہ وغیرہ، کا ملاحظہ و مراقبہ کرتا ہے اور صفات میں مستغرق ہوکر اللہ اللہ کا ذکر کرتا ہے۔

ثم يرتقي من درجة الصفات ويلاحظ مرتبة اللاهوت (والتاء فيها زائدة مبالغةً للنفي) كما في قوله "لات" فكأنّهٗ في الأصل "لات هو"۔ فنفىٰ غير الله سبحانه بقوله "لات" ثم أثبت ذاته البحتة بقوله "هو" فكأنّهٗ رعايةً للجبروت وقع هذا الترتيب فأخرت التاء)

پھر درجۂ صفات سے ترقی کرتے ہوئے مرتبۂ لاہوت" کا ملاحظہ کرتا ہے (لاھوت میں تا مبالغۂ نفی کے لئے زائد ہے) جیسے لات میں گویا لاہوت اصل میں لات ھو تھا: "لات" سے غیر اللہ کی نفی کی گئی، اور "ھو" سے حق تعالیٰ شانہ کی ذات بحت کا اثبات کیا گیا، غالباً جبروت کی مناسبت سے لات ھو میں تا کو موخر کرکے لاھوت بنا لیا گیا[1])

ففي هذه المرتبة يراقب ويلاحظ ذاته العليا من غير ملاحظة الصفات بأنّ ذاته تعالىٰ هو المقصود المطلوب دون ما عداه، وأنّهٗ من حيث هو هو مستحق لكل حمدٍ وثناءٍ فيقول الذاكر

بہرحال اس مرتبہ میں صرف حق تعالیٰ کی ذات عالیشان کا لحاظ ہوتا ہے، صفات کا بھی لحاظ نہیں ہوتا، ذاکر یہ تصور اور مراقبہ کرتا ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات ہی مقصود و مطلوب ہے اس کے سوا کچھ مطلوب نہیں اور وہ بلالحاظ کسی اور چیز کے اپنی ذات کی وجہ

---

[1] یہ لفظی توجیہ نہایت ہی لطیف اور نادر ہے۔ مدیر

" اَللّٰہُ اَللّٰہُ " نظراً إلی ذاتہ البحتة، وأنّہٗ ھو المقصود الأعظم، فھکذا، یقول الذاکر: " اَللّٰہُ اللّٰہ " مرتین فی مرتبة الناسوت جواباً للنفس والشیطان، ثم یقول: " اللّٰہُ اللّٰہُ " مرتین طلباً لرضاہ وابتغاءً لما یرضاہ دون ما عداہ، ثم یقول: اللّٰہُ اللّٰہُ مرتین ملاحظةً لصفاتہ العُلیاء بأنّہٗ یستحق الذکر من جھة ھذہ الکمالات، ثم یقول: " اللّٰہُ اللّٰہُ " مرتین مراقبةً لذاتہ العلیاء فیذکرہ بھذہ النیة، فإذن یذکر اسم الجلالة ثمانی مرات، کل مرتین بنیّةٍ مفردة، وھکذا یختلف الملاحظة باختلاف النیات فی کل مرتبة، وفی الشریعة لہ نظائر بأن شیئاً واحداً یُراد بنیاتٍ متعددة و یختلف تأثیراتہٗ علی مقتضی النیات والملاحظات ثمانیة مرةٍ فکذا حیث کل مرةٍ تحوی ثمانی مراتٍ من ذکر اسم الجلالة تکون سبحة واحدة تحوی ثمانی مائة مرة من اسم الجلالة:

سے ہر حمد وثنا کا مستحق ہے، پس محض ذات کا تصور باندھ کر وہ "اللہ اللہ" کا ذکر کرتا ہے کہ وہی مقصودِ اعظم ہے پس ذاکر دو مرتبہ اللہ اللہ مرتبۂ ناسوت میں کہتا ہے جس سے مقصود نفس وشیطان کو صاف صاف جواب دینا ہے، پھر دو مرتبہ اللہ اللہ کہتا ہے جس سے مراد حق تعالیٰ شانہ کی رضا اور مرضیات کا حصول ہے، پھر اس کی صفاتِ عالیہ کو مدنظر رکھ کر دو مرتبہ اللہ اللہ کہتا ہے، مطلب یہ کہ وہ ان کمالات کی وجہ سے ذکر وحمد کا مستحق ہے پھر اس کی ذاتِ عالی شان کا مراقبہ کرتے ہوئے دو مرتبہ اللہ اللہ کہتا ہے کہ ذات بحت ہی مقصودِ اعظم ہے، یہ اسم مبارک کا ذکر آٹھ مرتبہ ہوا، اور ہر دو مرتبہ الگ نیت کے ساتھ ذکر کیا گیا، اسی طرح ہر مرتبہ میں نیتوں کے مختلف ہونے سے مقاصد مختلف ہوجاتے ہیں۔

اور شریعت میں اس کے بہت سے نظائر ہیں کہ ایک ہی چیز میں مختلف نیتیں جمع کی جاسکتی ہیں اور ہر نیت کے مطابق اس کے الگ الگ اثرات ظاہر ہوتے ہیں، خواہ سو۱۰۰ نیتیں جمع کرلی جائیں اسی طرح جب اسم مبارک "اللہ اللہ" کا ایک بار ذکر مختلف نیتوں کے اعتبار سے) آٹھ مرتبوں پر مشتمل ہوا

"الله" فينبغي كل يوم للذاكر مائة مرة من الذكر بهذه الكيفية ».

تو ایک تسبیح اسم مبارک اللہ کے آٹھ سو مرتبہ ذکر کرنے کے قائم مقام ہوگی، لہٰذا ہر ذاکر کو چاہیئے کہ سو مرتبہ یومیہ اسی کیفیت سے ذکر کیا کرے۔

(هذا ملخص، استفدت من الشيخ العارف السنديؒ)

(یہ خلاصہ ہے اس تقریر کا جو مولانا حماد اللہؒ سے میں نے سُنی)

فائدة: تتعلق بالذكر على طريقة أهل المعرفة:

ينبغي للذاكر أن يذكر اسم الجلالة على ثلاثة تصورات ».

ذاکر کو چاہیئے کہ اسم مبارک "اللہ" کے ذکر میں تین دھیان رکھا کرے۔

أما أولاً: فيلاحظ أنّ الله سبحانه وتعالىٰ هو المحبوب الحقيقي، لأنه هو الخالق والرازق والمنعم لكل نعمة، فمنهُ تعالىٰ الألطاف والنعم كلها، فيتصور أنّ قلبه يحبّ الله سبحانهٗ ويعلم أنّهٗ المحبوب الحقيقي فيدعوا اسم الله سبحانه ويقول: "اَللّٰهُ اَللّٰهُ"

اول: یوں دھیان کرے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ محبوب حقیقی ہیں، وہی خالق وہی رازق ہیں، وہی ہر نعمت عطا کرنے والے ہیں۔ ساری عنایتیں اور نعمتیں اسی کی جانب سے ہیں، اب یہ تصور کرے کہ اس کا دل اللہ سبحانہٗ سے محبت کرتا ہے اور اس بات کا یقین کرے کہ وہی محبوبِ حقیقی ہے یہ دھیان باندھ کر اللہ سبحانہٗ کے نام کو پکارے۔ اور کہے: اَللّٰہُ اَللّٰہُ۔

وأمّا ثانياً: فيلاحظ أنّهٗ يخاطب الله سبحانهٗ، لأنه مصدر كل كمال وجمال، فيثبت لله تعالىٰ كل كمال، وينفي عن نفسه كل كمال وصفة، فيراقب كمالاته تعالىٰ ثم يدعوه وينادية كأنه يخاطبه، غير أنه

دوم: یہ دھیان کرے کہ وہ اللہ سبحانہٗ سے خطاب کا شرف حاصل کر رہا ہے کیونکہ وہی ہر کمال وجمال کا مصدر ومنبع ہے، پس اللہ تعالیٰ شانہٗ کے لئے ہر کمال کو ثابت کرے اور اپنے سے ہر کمال وصفت کی نفی کرے، اللہ تعالیٰ کے کمالات کا مراقبہ کرتے ہوئے اُسے پکارے، گویا وہ

لا يأتي بحرف النداء وهو مراد في ذهنه وتصوره فيقول: اَللّٰهُ، اَللّٰهُ، اَللّٰهُ. وهكذا يستمر.

وثالثاً: يتصور أنه الموجود الحق وأنّ كل من سواه كأنّه غير موجود، لأنّه يزول ويفنىٰ ولا يبقىٰ «كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ» فيدعو الله سبحانه على هذه المراقبة ويقول: اَللّٰهُ، اَللّٰهُ، اَللّٰهُ وهكذا، فيذكر الله سبحانه على هذه المراقبات والملاحظات الثلاث على هذا الترتيب وقتاً طويلاً، ويناسب أن يكون نحو ثمانية آلاف مرة، وإن لم يتسع وقته فعلىٰ حسب وسعه ووقته وأقله سبع عشرة مرةً في اليوم، ويستوي الذكر الخفي من غير تلفظٍ أو بتلفظٍ خفيٍ أو جهراً كما تقتضيه طبيعته.

هكذا أرشدني إليه الشيخ العارف بالله مولانا حماد الله السندي الهاليجي من خلفاء الشيخ العارف تاج محمود الأمروتي السندي القادري طريقةً ومشرباً.

اللہ تعالیٰ سے خطاب کر رہا ہے مگر حرف ندا لفظوں میں نہیں لاتا، البتہ اس کے ذہن و تصور میں ہے، پس خطاب کے دھیان سے کہے: اَللّٰہُ، اَللّٰہُ، بس اسی طرح کہتا رہے۔

سوم: یہ تصور کرے کہ وہی موجودِ حقیقی ہے، اور اس کے ماسوا جتنے ہیں وہ گویا وجود ہی نہیں رکھتے، کیونکہ زائل اور فانی ہیں، ان کو بقا نہیں، "ہر چیز مٹنے والی ہے، سوائے اس کی ذات کے" پس اللہ سبحانہ کو اس دھیان اور مراقبہ کے ساتھ پکارے اور کہے اللّٰہُ، اللّٰہُ اللّٰہُ ان تینوں مراقبوں کے ساتھ علی الترتیب اللہ سبحانہ کا ذکر دیر تک کرتا رہے، مناسب ہے کہ تقریباً آٹھ ہزار مرتبہ ذکر کرے اور اگر وقت میں اتنی گنجائش نہ ہو تو اپنی وسعت اور وقت کی گنجائش کے مطابق کر لیا کرے، مگر یومیہ سترہ مرتبہ سے کم نہ ہو، خواہ ذکرِ خفی تلفظ کے بغیر ہو خواہ آہستہ آواز سے، خواہ مناسب جہر سے، جیسا طبیعت چاہے کر لیا کرے، حضرت شیخ عارف باللہ مولانا حماد اللہ سندھی، ہالیجی نے مجھ سے اسی طرح فرمایا تھا، آپ شیخ عارف باللہ مولانا تاج محمود امروٹی سندھی قادری کے خلیفہ تھے۔

رمضان ۱۳۹۰ھ

افکارِ ڈاکٹر فضل الرحمٰن

۱۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے کچھ عرصہ خاموشی کے بعد پھر اپنا کام تیزی سے شروع کر دیا ہے انہوں نے اللہ کی طرف سے قرآنِ کریم کے ابدی ہونے کے معنی یہ بتلائے کہ قرآن کے احکام ابدی نہیں بلکہ اس کے علل ابدی ہیں یعنی احکامِ خداوندی سارے تبدیل ہو سکتے ہیں، سنتِ نبویہ کے بارے میں یہ تحقیق فرمائی کہ اس عہد کے قانون رائج الوقت کا نام تھا، آج ہم نئے حالات کے تحت نئے قوانین وضع کر سکتے ہیں، احادیث افسانے ہیں اور ہر دور میں مولوی احادیث بناتے رہے اور سُنّت میں اضافے کرتے رہے، نمازوں کی تعداد پانچ سے انکار کیا، نصابِ شہادت کو ختم کیا، بینک کے سود کو جائز قرار دیا اور ربیٰ کو حلال بتلایا گیا، شرحِ زکاۃ کو قابلِ تبدیلی بتلایا وغیرہ وغیرہ، ان تحقیقاتِ اسلامیہ سے جب فراغت ہوئی تو اب "حدود اللہ" کی باری آئی، چنانچہ تازہ پرچہ "فکر و نظر" میں اس پر گل افشانی فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ حدود کی اصطلاح جرائم و سزا کے لئے فقہاء کی ایجاد کردہ ہے قرآنِ کریم نے حدود کو اس معنی میں استعمال نہیں کیا ہے، تمام حدود کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگوں کو شر سے محفوظ رکھا جائے، زنا چوری ڈاکہ کے بعد اگر تائب ہو جائے تو یہ تمام جرائم اس کے لئے معاف کر دیئے جائیں گے، الخ یہ ہیں وہ تحقیقاتِ اسلامیہ جن پر لاکھوں روپیہ سالانہ خرچ کیا جا رہا ہے، ڈاکٹر صاحب اگر بالارادہ اور بقصدِ تحریف و الحاد یہ سب کچھ نہیں کہہ رہے ہیں اور یہی حسنِ ظن بھی ہے تو یہی کہا جائے گا کہ ان میں عربیت اور علومِ دین کے صحیح فہم اور صحیح ذوق کا فقدان ہے اگر ایک لفظ ایک لغوی عموم کے اعتبار سے قرآن میں ایک معنی میں استعمال ہو گیا تو شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کو گویا یہ حق حاصل ہی نہیں رہتا کہ کسی شرعی معنی میں اس لفظ کو استعمال کر سکے، ڈاکٹر صاحب حکم اور حکمت میں آج تک فرق نہ کر سکے، ایک تو شرعی حکم ہے مثلاً نماز پڑھنا اور ایک اس کی حکمت ہے جو ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یاد مقصود ہے، اب کوئی شخص آئے اور یہ کہہ دے کہ بس اللہ کی یاد مقصود ہے جس طرح کی جائے تو یہ کیسے صحیح ہوگا اور "چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد" اپنے ان خیالات کو اس انداز سے پیش فرمایا ہے کہ امام محمد بن الحسن شیبانی اور عزّ الدین بن

عبدالسلام اور تفتازانی قرافی اور شاہ ولی اللہ بھی ان کے ہمنوا ہیں فیا للأسف (۱) ہم ڈاکٹر صاحب کو چیلنج کرتے ہیں کہ ان اکابر پر اتہام لگایا ہے وہ اس تہمت سے بری ہیں، سبحانك هذا بهتان عظيم، ہمت وجرأت ہو تو دعویٰ کا اثبات کریں، ڈاکٹر صاحب نے میکگل یونیورسٹی میں اپنے استاذ محترم اسمتھ مستشرق کی نگرانی میں ایک کتاب تیار کی ہے اور ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری اسی پر لی ہو، غالبًا یہ مضامین اسی کتاب کے ابواب میں جو تین سال سے ڈاکٹر صاحب اردو ترجمہ شائع کرکے اپنے شیخ کے خلف الرشید ہونے کا پورا حق ادا کرتے رہتے ہیں۔

جشنِ قرآن

مؤتمر عالم اسلامی کے سیکریٹری جناب مسٹر انعام اللہ خاں صاحب کی طرف سے ایک اعلان "بینات" میں بغرضِ اشاعت موصول ہوا ہے جو آج ہی کے شمارے میں کہیں درج ہوگا جس میں قرآنِ کریم کی چودہ سو سالہ سال گرہ منانے کی تجویز پیش کی ہے، شاید یہ تجویز ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی ہے، ہمیں تو اس موقع پر صحیح بخاری کی وہ حدیث یاد آتی ہے کہ یہود کہا کرتے تھے کہ آیۂ کریمہ "اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام دينا" اگر ہماری توراۃ میں اس قسم کی آیت ہوتی تو اس کے نزول کے دن کو یادگار مناتے، حضرت فاروقِ اعظم نے فرمایا کہ ہمارے یہاں تو اس دن کو دو عیدین ہیں، جمعہ کا دن اور عرفہ کا دن یعنی خود بخود یادگار ہیں ہمیں اس کے علاوہ یادگار منانے کی کیا ضرورت ہے، ٹھیک اسی طرح حق تعالیٰ نے ماہِ رمضان کو قرآنِ کریم کا سال گرہ مقرر فرمایا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ماہِ رمضان میں جبریل امین کے ساتھ قرآنِ کریم کا دور فرمایا کرتے تھے اور جس سال وصال ہوا تو دو مرتبہ دور فرمایا، پھر تمام روئے زمین پر جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں تراویح میں ختم قرآنِ کریم ہوتا ہے اور جشنِ قرآن منایا جاتا ہے اور تقریبًا اکثر مسلمان ماہِ رمضان میں ختم قرآن کرتے ہیں اور بعض اربابِ توفیق تو متعدد ختم کرتے ہیں، یہ قدرتی اور فطری یادگار ہر حیثیت سے معنی خیز اور مؤثر وبابرکت ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کو عبادت کی شکل دے دی ہے لاکھوں مسلمان بچے روزانہ ناظرہ قرآنِ کریم اور حفظ قرآن کریم میں مکاتب ومعابد میں مشغول رہتے ہیں اور کروڑوں مسلمان فجر کی نماز اور جہری نمازوں میں قرآن کریم پڑھتے اور سنتے ہیں، روزانہ عالم اسلام میں ہزاروں قرآنِ کریم کے ختم ہوتے ہیں کہیں حل مشکلات کے لئے کہیں ایصالِ ثواب کے لئے دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں قرآنِ کریم مطابع میں چھپتے ہیں، روئے زمین پر

کوئی کتاب قرآنِ کریم سے زیادہ نہ پڑھی جاتی ہے نہ زیادہ دیکھی جاتی ہے، الغرض یہ سب جشنِ قرآن نہیں تو اور کیا ہے؟ جس چیز کی ضرورت ہے وہ قرآنِ کریم پر عمل کرنا اور اس کے حقائقِ الٰہیہ سے عبرت و موعظت حاصل کر کے معرفتِ الٰہی کا ذریعہ بنانا ہے، اس کو قانون و دستور کی شکل دے کر دنیا کو نجات و سعادت دارین سے ہمکنار کرنا ہے جس پر کہیں عمل نہیں ہو رہا ہے وہ عمل بالقرآن ہے جو دین و دنیا کی عزت و مجد و سربلندی کا ذریعہ ہے، ضرورت ہے تو اس کی ہے کہ قرآنِ کریم کا قانون و آئین بنانے کی تدابیر پر غور و خوض ہو اس پر عمل کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد ہو اس "حبل اللہ المتین" اور "العروۃ الوثقیٰ" کو سختی سے تھامنے کی ضرورت ہے یادگار منائیں تو اس کے لئے منائیں، درحقیقت جس قوم سے روح نکل جاتی ہے اور جو قوم بے عمل ہو جاتی ہے وہ یادگاروں کو سوچتی ہے ورنہ اگر مسلمان عامل بالقرآن ہوں تو ان کو یادگار بنانے کی کیا ضرورت ہے ہر مسلمان زندہ یادگار ہے، سیرت کے جلسے ہوں یا میلاد کی محفلیں، یہ سالگرہیں یہ مظاہرے بے عمل اور بے روح قوم کی نشانیاں ہیں، مؤتمرِ عالمِ اسلامی اگر کوئی جاندار چیز ہے تو چاہیئے کہ اس ملک اور تمام ممالکِ اسلامیہ میں قرآنِ کریم کو آئین بنانے کے لئے مؤثر تدابیر اختیار کرے نہ یہ کہ جگہ جگہ قدم قدم پر قرآنِ کریم کے حقائقِ ربّانیہ اور احکامِ الٰہیہ میں الحاد و تحریف و خود ساختہ تشریح کو روکنے کی کوشش کرے سب سے بڑی ضرورت تو یہ ہے کہ قرآنی حکومت آخر تشکیل کی جائے اور دنیا کو ایک مرتبہ یہ باور کرایا جائے کہ لن یصلح آخر ھذہ الامۃ إلا ما أصلح أولها، آج بھی قرآنِ کریم عہدِ قدیم کی یاد تازہ کر رہا ہے اور موجودہ معاشرہ اور دنیا کی قومیں جس تباہی و بربادی کے کنارے کھڑی ہیں ان کو نجات دلانے اور سربلندی عطا کرنے کے لئے قرآنِ کریم پکار رہا ہے، واللہ سبحانہ ولی التوفیق والھدایۃ وھو حسبنا ونعم الوکیل وصلی اللہ علیٰ خیر خلقہ سیدنا محمد وآلہ وصحبہ وبارک وسلم۔

عصرِ حاضر کے جدید مسائل کا حل اور ایک غلط فہمی کا ازالہ

"بینات" کے چند مسلسل اعداد میں راقم الحروف نے علماءِ امت کی خدمت میں جو گذارش کی تھی اس کا حاصل یہ تھا کہ "دینِ اسلام" کامل ترین نظامِ حیات ہے۔ ہر عصر کے لئے صالح نظام ہے اور ہر مشکل کا علاج اس میں موجود ہے۔ قرآن کریم وسنتِ نبویہ دو ایسے سرچشمے ہیں جن کا آبِ حیات قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے حیات بخش ہے اور قیامت تک پیدا ہونے والے امراض کے لئے نسخۂ شفا ہے۔ انہی دو چشموں سے "اجماعِ امت" اور "قیاسِ فقہی" کی نہریں جاری ہوئی ہیں۔ اور اس طرح سے کتاب وسنت یا قرآن وحدیث اور اجماعِ امت وقیاس سے فقہِ اسلامی وجود میں آئی اور اسلامی قانون مدوّن ہوا ہے اور فقہاءِ امت کی مساعیٔ مشکورہ سے ہزاروں لاکھوں مسائل قرآن وحدیث کی روشنی میں مرتب ہو گئے ہیں۔

فقہاءِ امت نے انہی اسلامی ماخذ کی روشنی میں ہر دور کے نئے مسائل کو حل کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ابدی اور محکم ہے۔ ہر مرض کی دوا اس میں مل جاتی ہے جس طرح ہمارے سلفِ صالحین نے اپنے اپنے زمانے میں جدید واقعات ومسائل کا حل تلاش کیا اور امت کی رہنمائی کی اور امت کو گمراہی سے بچایا، ٹھیک اسی طرح آج یہ فریضہ عہدِ حاضر کے علماء کے ذمے عائد ہوتا ہے کہ جدید تمدن سے جو جدید صورتِ حال رونما ہوئی ہے اس کے پیشِ نظر مدون ومرتب ذخیرہ کی روشنی میں ان نئے مسائل کا حل معلوم کر کے جدید نسل کو گمراہی سے بچائیں اور ایک دفعہ پھر اس تاریخی حقیقت کو باور کرائیں کہ دینِ اسلام اور قانونِ اسلامی ہر زمانے کے لئے کافی وشافی ہے اور یہ کہ فقہاءِ اسلام کی کوششوں سے جو کچھ مرتب ہوا یہ ہمارا قیمتی سرمایہ ہے۔ امت کبھی اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ اس خیال کے تجزیہ سے یہ بات نہایت واضح ہے کہ جو کچھ قرآن کریم اور احادیثِ نبویہ میں منصوص احکامِ شرعیہ آ گئے ہیں وہ امت کے لئے ہر حالت میں واجب الاطاعت ہیں اور ہمارے اجتہاد کے دائرے سے بالاتر ہیں اور اگر احادیث میں کچھ تعارض ہے یا قرآن کریم کی دلالتِ قطعی موجود نہیں ہے تو فقہاءِ امت اور محدثین کرام نے انہی مشکلات کے تصفیہ کے لئے اصولِ فقہ اور

اصول حدیث کے علوم و فنون تدوین کئے ہیں اور وہ مسائل و ابحاث دائرۂ فقہ میں آجاتے ہیں۔ الغرض دین کے احکام تین قسم کے ہیں :۔

۱. احکام مخصوصہ اتفاقیہ.

۲. احکام اجتہادیہ اتفاقیہ.

۳. احکام اجتہادیہ خلافیہ.

پہلی دو قسموں میں جدید اجتہاد کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ تیسری قسم میں بھی اجتہاد کی ضرورت نہیں سمجھتا البتہ اتنی گنجائش ہے کہ اگر مذہب حنفی میں واقعی دشواری ہے اور امتِ محمدیہ واقعی تیسیر اور تسہیل کی محتاج ہے اور اعذار بھی صحیح و واقعی ہیں محض وہمی و خیالی نہیں ہیں تو دوسرے مذاہب پر عمل کرنے اور فتویٰ دینے کی گنجائش ہوگی اور ضرورت کس درجہ میں ہے اور ہے بھی یا نہیں، یہ صرف علماء و فقہاء کی جماعت طے کرے گی۔

چوتھی قسم مسائل کی وہ ہے جو جدید تمدن نے پیدا کئے ہیں اور سابقہ فقہِ اسلامی کے ذخیرہ میں اس کا ذکر نہیں ہے نہ نفیاً نہ اثباتاً۔ ان مسائل میں ان جدید تقاضوں کو پورا کرنا اور ان مشکلات کو حل کرنا دورِ حاضر کے علماء کا فریضہ ہے۔ یعنی یہ کہ وہ ان مسائل کا قیاس و اجتہاد سے قدیم ذخیرہ کی روشنی میں فیصلہ کریں۔ ان علماء میں حسب ذیل شرائط ہوں۔

(۱) اخلاص (۲) تقویٰ (۳) قرآن و حدیث و فقہِ اسلامی میں مہارت و وسعت۔

(۴) دقتِ نظر و ذکاوت (۵) جدید مشکلات کے سمجھنے کی اہلیت۔

ان صفات کے ساتھ شخصی فیصلہ نہ کیا جائے بلکہ ان صفات پر متصف جماعت ہو اور ان کے فیصلہ سے مسائلِ حاضرہ حل کئے جائیں، بہر حال قرآن کریم حجت ہے، احادیثِ نبویہ اور سنتِ نبویہ دین کی اہم بنیاد ہے۔ تعاملِ علماءِ امت و اجماعِ امت شرعی حجت ہیں۔ فقہاءِ کرام کے اجتہادی مسائل واجب العمل ہیں۔ ظاہر ہے جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ اجتہادِ جدید کی ضرورت ہے یعنی سارا دینِ اسلام کا قدیم ڈھانچہ بدل کر جدید ڈھانچہ تیار کیا جائے یا منصوص اجماعی و متفق علیہ مسائل کو از سر نو زیر بحث لایا جائے اور قانونِ اسلامی کے متفقہ مسائل سے خلاصی کی

راہ ڈھونڈ نکالیں اور یہ سب کچھ صرف اس لئے کہ عصرِ حاضر کی خواہشات و تقاضے سابقہ کوششوں سے پورے نہیں ہوتے۔ اگر کوئی صاحب یہ خیال قائم کریں تو کتنا غلط اور غیر واقعی خیال ہوگا۔ سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔ بہر حال میرا یہ منشا قطعاً نہیں کہ فیصلہ شدہ مسائل جو عہدِ نبوت سے آج تک مسلمہ ہیں اور امتِ محمدیہ ان پر عمل پیرا ہے خواہ قرآن کریم کی تصریحات سے ہیں یا احادیثِ نبویہ میں فیصلہ شدہ ہیں یا فقہاءِ امت نے طے کر لئے ہیں۔ ان میں ترمیم کی گنجائش ہے یا تبدیل کا امکان! یہ سب فرقِ مراتب کے باوجود عملی حیثیت سے سب کے لئے واجب الاطاعت ہیں۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب ڈائریکٹر مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی کراچی نے اپنی تائید میں میرا جو حوالہ پیش کیا ہے مجھے اس پر تعجب ہے۔ ڈاکٹر صاحب بینک کے سود کو جائز قرار دیتے ہیں اور موجودہ معاشرے کے لئے بے حد ضروری خیال کرتے ہیں حالانکہ سُود کے جملہ اقسام کی حرمت دینِ اسلام کا مسلّمہ قانون ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ علماءِ امت دوبارہ اس مسئلہ پر غور کر کے ان کی تائید و تصدیق کر دیں گے۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب کے خیال کا دار و مدار ہی اس حقیقت پر ہے کہ انہوں نے حرمتِ ربا کی احادیث نبویہ کو قطعاً نظر انداز کر دیا ہے اور حضرت رحمت عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور قرآن دانی اور منصبِ نبوت سے سراسر ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ نیز قرآن فہمی کے لئے جن علومِ عربیت اور علومِ بلاغت اور اصولِ فقہ کے مسلمہ قواعد و اصول کی ضرورت تھی، یہ مضمون لکھ کر انہوں نے اپنی ناواقفیت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے جس کی تفصیل و تحقیق ڈاکٹر صاحب ہی کی تعمیل حکم کے پیشِ نظر عنقریب پبلش کی جائے گی اور ان کی جدید تحقیق کا تجزیہ کر کے دکھلایا جائے گا کہ ڈاکٹر صاحب سنتِ نبویہ اور سنتِ جاہلیہ کے حدود بھی متعین نہ کر سکے۔ ڈاکٹر صاحب احادیثِ نبویہ کو ایک حدیثی تحریک کی حیثیت ہی سے جانتے ہیں جو بعد کی پیداوار ہے وہ اس کی تشریعی حیثیت کے بالکل منکر ہیں۔

ڈاکٹر صاحب مجلہ "فکر و نظر" میں جو اپنے مضامین شائع فرما رہے ہیں ان سے یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ ان کے اصولِ موضوعہ کے پیشِ نظر دینِ اسلامی کے اساسی مسائل سب زیرِ بحث آسکتے ہیں، نماز، روزہ، زکاۃ، حج، شراب، زنا، سود سب میں تاویل و تحریف

کر کے اچھا خاصا اسلام کا جدید ڈھانچہ تیار ہو سکتا ہے اور شاید جدید معاشرے کے لئے یا لسلام کے جدید ایڈیشن کی تیاری کی تدبیر ہو رہی ہے۔ قران کریم کے متن کی تشریح کے لئے اگر تعلیماتِ نبوت سے روشنی حاصل نہ کی جائے تو پورے کفر کا دوسرا نام اسلام ہو سکتا ہے جیسا کہ آج تک ہر دور کے ملاحدہ باطنیہ کرتے رہے پھر مسٹر پرویز کرتے رہے اور یہی کام خاکسار تحریک کے بانی نے کیا۔ کیونکہ خاکسار تحریک کی بنیاد بھی اسی انکارِ حدیث پر تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بحیثیت امیر کے مانتے تھے نہ بحیثیت نبوت، اس لئے ان کے نزدیک وفات کے بعد پیغمبر کے اقوال واجب الاطاعت نہیں رہتے، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔

چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:۔

"آنحضرتؐ اساسی طور پر بنی نوع انسان کے اخلاقی مصلح تھے وقتاً فوقتاً کچھ انفرادی فیصلوں کو چھوڑ کر جن کی حیثیت محض ہنگامی واقعات کی ہوتی تھی۔ آپ نے اسلام کی ترقی کے لئے بہت ہی کم عام قانون سازی کی طرف توجہ فرمائی ہے۔ خود قرآن مجید میں بھی اسلامی تعلیمات کا بہت تھوڑا سا حصہ ہے جس کا تعلق عام قانون سازی سے ہے۔ الخ۔"

ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے۔

"آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) جو وقتِ وفات تک اہلِ مکہ اور عرب کی اخلاقی اصلاح کی شدید جدوجہد میں مصروف اور اپنی قومی ریاست کی تنظیم میں مشغول رہے ان کو اتنا وقت ہی کہاں مل سکتا تھا کہ وہ زندگی کے جزئیات کے لئے قوانین مرتب فرماتے الخ"

ڈاکٹر صاحب کی تحقیق ہے:۔

"کہ اوقاتِ نماز اور ان کی جزئیات کے بارے میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے امت کے لئے کوئی غیر لچکدار اور جامد انداز نہیں چھوڑا۔" یعنی لچکدار انداز چھوڑا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تائید میں اپنے فہم کے مطابق موطا مالک کی پہلی حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں صراحۃً پانچ نمازیں آپ نے پڑھی ہیں لیکن اس میں راوی نے پانچ اوقات کی تصریح نہیں کی حالانکہ دوسری روایات میں ان پانچ وقتوں کی تصریح بھی آگئی ہے جہاں تک ڈاکٹر صاحب کی نگاہ نہیں پہنچی

بلکہ خود اسی روایت میں "وقت الصلوۃ" کا ذکر ہے۔ آگے خود موطاً مالک ہی میں فجر، عصر، ظہر، مغرب، عشار سب ہی اوقات کی احادیث موجود ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کی تحقیق ملاحظہ ہو:۔

"بعدازاں حدیث میں جب کبھی نماز پر زور دیا جاتا ہے تو "صلوٰۃ" کے ساتھ "علیٰ میقاتہا" بھی شامل کر دیا جاتا ہے یعنی نماز اپنے صحیح وقت میں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نمازوں کے لئے ایک معیاری وقت قائم کرنے کی مہم چلائی گئی تھی۔" (مجلہ فکر ونظر شمارہ نمبر ا جلد نمبر ا)

دیکھا آپ نے کس صفائی کے ساتھ اب اعتراض فرمایا گیا کہ پانچ نمازیں بعد کی پیداوار ہیں، گویا نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ نمازیں پانچ اوقات میں پڑھی ہیں نہ حکم دیا ہے۔ انا للہ۔ جب ڈاکٹر صاحب کی تحقیقات یہاں تک بے نقاب ہو کر آگئیں تو آئندہ کیا توقع رکھی جاسکتی ہے۔

ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا

ڈاکٹر صاحب نے مجلہ "فکر ونظر" کے تین اعداد و شمار میں تقریباً ستر صفحات کا جو مضمون تحریر فرمایا ہے وہ سب اسی انداز کا ہے اس سے چند جملے بلا تبصرے کے پیش کئے گئے تاکہ ناظرین مفصل تبصرے کے انتظار میں زیادہ زحمت نہ اٹھائیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے کافی عرصہ قبل یہ "بارود" تیار کر رکھی تھی جواب دفعۃً موصوف نے چھوڑ دی، نہ معلوم ڈاکٹر صاحب کے بارودخانہ میں تباہ کاری کے اور کتنے سامان پنہاں ہیں، یہ تو محض بسم اللہ ہے، یہ ہے پاکستان کا مرکزی ادارۂ تحقیقاتِ اسلام!! شاباش زندہ باد ادارۂ تحقیقاتِ اسلام! ہم تو ایک پرویز کی ہی مرثیہ خوانی کر رہے تھے۔ کیا معلوم تھا کہ ایں خانہ ہمہ آفتاب است

ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

اللہ تعالیٰ امتِ محمدیہ کو صحیح اسلام اور اسلامی حقائق کی صحیح فہم عطا فرمائے اور اپنے دین کی حفاظت کے لئے کوئی غیبی سامان فرمائے۔ وماذلک علی اللہ بعزیز۔

رجب ۱۳۸۳ھ، دسمبر ۱۹۶۳ء

مرکزی ادارہ تحقیقاتِ اسلامی میں کی ہوئی علامہ بنوری کی تقریر کی تلخیص

تمہید مرکزی ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کا ماہانہ "فکر و نظر" جب سے شائع ہونا شروع ہوا ہے ادارے کے ڈائرکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے قلم سے جو مضمون شائع ہوا تو محسوس ہوا کہ رسالے کے بنیادی مضامین میں انکارِ سنت کا فتنہ نئی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے بلکہ نہ صرف انکار سنت یا انکار حدیث کا فتنہ ہے بلکہ پورے دینِ اسلام کے بنیادی و جوہری مسائل کی بنیاد اکھاڑی جا رہی ہے اور "فکر و نظر" کے تین شماروں میں ۹۲ صفحات پر یہ مضمون پھیلا ہوا ہے جن انگریزی ماخذ سے اس کا تانا بانا لیا گیا ہے، اتفاق سے ہمارے کتب خانہ میں عربی زبان میں وہ سارا ذخیرہ موجود ہے جس سے یہ اندازہ ہوا کہ ان نام نہاد تحقیقات میں مستشرقین کی تقلیدات ہی جلوہ گر ہیں، مدعیٔ اسلام یا مدعیٔ علم کی شان سے بہت ہی بعید معلوم ہوا کہ اس صفائی کے ساتھ دینِ اسلام کے اساسی مسائل بلکہ اساسی شعائر کی تحریف کی کوشش کی جائے، چنانچہ "بینات" کے شذورے میں اس کا اجمالاً ذکر کیا اور عزم تھا کہ آئندہ چل کر اس کی تردید کی جائے گی، رفیقِ ادارہ جناب مولانا محمد ادریس صاحب نے اس طویل مضمون کا ایک خلاصہ نکالا اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی خدمت میں بھیجا کہ وہ بھی تصدیق کر دیں کہ یہی خلاصہ ہے اور اس تصدیق کے بعد جو کچھ ہمیں لکھنا ہے لکھیں، ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس خلاصہ کو دیکھنے کے بعد خواہش کی کہ پہلے ایک ملاقات ہو جائے تو بہتر ہے چنانچہ اگلے روز ایک ملاقات طے پائی جس میں راقم الحروف اور ڈاکٹر صاحب کا تبادلۂ خیالات ہوا اور بینات کے ایڈیٹر مولانا محمد ادریس صاحب اور فکر و نظر کے ایڈیٹر فاطمی بھی موجود رہوں، اس طرح مجھے دینی خیر خواہی کا براہِ راست موقع ملا اور غنیمت سمجھا۔ یہ مجلس تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی، یہ ایک پرائیویٹ مجلس تھی، اس کی تفصیلات شائع کرنے کی اس وقت حاجت نہیں البتہ اتنا کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب سے جو سوالات کیے گئے، اور ڈاکٹر صاحب نے جو جوابات دیئے اگر وہ جوابات موصوف کے دل کی صحیح ترجمانی ہے تو ان کی ذات کے متعلق تو شبہات ختم ہو جانے چاہئیں لیکن جہاں ان کی شخصیت کے بارے میں شبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے ان کے مضامین کے بارے میں شبہات افسوسناک شکل اختیار کر لیتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ اطمینان دلایا ہے اس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:-

الف :- اللہ تعالیٰ کی ذات وصفاتِ کمال پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ آخرت پر یقین ہو۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل پر ایمان لانے کے بعد یوم جزاء کا ہونا ضروری ہے۔

ب :- قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، لفظ و معنی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں۔

ج :- قرآن مجید کے متعلق یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاداتِ ربانیہ کو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لباس کا جامہ پہنایا ہے۔

د :- قرآن کریم نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریح و بیان کا حق دیا ہے اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان دینِ اسلام کا جزء ہے۔

ھ :- حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیانات کا یہ حصہ دین میں محفوظ چلا آرہا ہے۔

و :- آپ کے بیانات کا اکثر حصہ امت کے سامنے جو مدوّن شکل میں موجود ہے۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد، نسائی وغیرہ میں آگیا ہے البتہ جن احادیث میں پیشین گوئیاں کی گئی ہیں۔ ان احادیث پر مجھے شبہ ہے کہ شاید بعد میں ملائی گئی ہیں (اس پر میں نے درمیان میں کہا کہ اگر ان احادیث کی صحیح توجیہات کی جائیں جن سے آپ کی تصدیق و تائید نکلے تو پھر آپ کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے فرمایا ہاں یہ ہوسکتا ہے)

ز :- نبوت اللہ تعالیٰ کا ربانی عطیہ ہے کسب کا اس میں کوئی دخل نہیں یعنی وہبی منصب ہے کسبی چیز نہیں۔ ان واضح اسلامی حقائق کے اعتراف کرنے کے بعد میں نے کہا کہ اب تو مجھے آپ سے بہت مفصل واضح طور پر سوالات کرنے کا حق ہے اور آپ اب اس کے مکلف ہیں کہ مجھے قابلِ اطمینان جواب دیں۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ ادارے میں ایک لیکچر دیں جس میں ادارے کے سارے افراد موجود ہوں اور اپنے خیالات پیش کریں، میں نے اس خواہش کا احترام کیا اور دعوت قبول کی اگلے روز مرکزِ ادارہ کے ہال کمرے میں اس خطاب کا انتظام کیا گیا اور تقریر کو ریکارڈ کرنے کا بھی انتظام کیا گیا۔

پھر روزنامہ ڈان انگریزی میں اور ماہنامہ "فکر ونظر" میں اس کا خلاصہ جس انداز سے پیش کیا

گیا اس میں غلط فہمی کی گنجائش تھی کہ میں نے ادارے کے ساتھ غیر مشروط تعاون کا اظہار کیا ہے اور ادارے کے موجودہ طرزِ عمل سے میں مطمئن ہوں بلکہ ماہنامہ "بینات" کے خلاصے سے بھی کسی قدر غلط فہمی کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ اس تقریر کا ریکارڈ ہم بھی ان سے حاصل کر کے اس کو شائع کریں تاکہ ناظرین کے سامنے تصویر کا صحیح رخ سامنے آئے اور غلط فہمی دور ہو۔

خطبہ کا موضوع یہ تھا

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے اغراض و مقاصد کیا ہونے چاہئیں؟

نوٹ:۔ تقریر چونکہ بہت طویل ہو گئی تھی جب اس کو ٹیپ ریکارڈ سے صفحاتِ کاغذ پر اتارا تو تیس صفحات فل اسکیپ سائز سے متجاوز تھی اس لئے تلخیص ہی مناسب معلوم ہوئی۔

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ الخ

أما بعد فأعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔

«الیوم أکملت لکم دینکم و أتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الإسلام دیناً»۔

جنابِ صدر و معزز حضرات! مجھے اس وقت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ آپ حضرات کے صدرِ محترم کی دعوت پر مجھے موقع مل رہا ہے کہ میں آپ کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ اور یہ حسن اتفاق ہے کہ ایک نجی و اتفاقی ملاقات میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں آپ حضرات کے سامنے اپنے خیالات ظاہر کروں، مجھے اس پر مسرت ہے کہ اس طرح مشافہۃً گفتگو کرنے سے ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع مل جاتا ہے، اس حیثیت سے اس اجتماع کو نہ صرف مفید بلکہ مبارک سمجھتا ہوں اور نیک فال سمجھتا ہوں۔

حضرات! اس نازک دور میں دین جس انداز سے خدمت کا محتاج ہے وہ محتاجِ بیان نہیں، ضرورت ہے کہ ہم اپنی اپنی جگہ پر اللہ تعالیٰ نے جو اہلیت اور موقع جس کو دیا ہے وہ دین کی خدمت کرے اور دین کو فائدہ پہنچائے، اگر ہم اس طرح خدمت کریں گے تو دین کی یہ عمارت ہماری متفقہ کوششوں سے ایک خوشنما عمارت بن جائے گی جس کے ثمرات و برکات سے آئندہ نسل مستفید ہوگی اور ان کی تربیت کے لئے ایک ایسا ذخیرہ مہیا ہو جائے گا جو ہماری آخرت کے لئے مفید ہوگا۔

علمائے و جدید تعلیم یافتہ حضرات کے اجتماع سے دینی مسائل کا حل

سوءِ اتفاق سے علماء حضرات اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کے درمیان اتنا وسیع خلیج حائل ہو گیا ہے کہ یہ خیال ہونے لگا کہ دونوں حضرات کا اجتماع ممکن ہی نہیں یہ بالکل غلط ہے اور سوءِ تفاہم کا نتیجہ ہے۔ اگر اخلاص ہے اور مقصد صحیح ہے تو دونوں حضرات کے اجتماع ہی سے آج کل صحیح خدمتِ دین کا موقع مل سکتا ہے اور بہت سے مسائل کا صحیح حل نکل آئے گا۔

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کی غرض و غایت

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی اس ملک میں قائم ہوا ہے اس کے اغراض و مقاصد کیا ہونے چاہئیں، میں اس موضوع پر اپنے خیالات پیش کرنا چاہتا ہوں، ظاہر ہے کہ غرض و غایت متعین ہونے کے بعد ہی منزلِ مقصود تک پہنچنا آسان ہو گا اور اس کے بعد ہی یہ سمجھنے کا موقع ملے گا کہ جس راستہ کو ہم نے اختیار کیا ہے وہ صحیح ہے یا غلط اور اس راستے کو طے کرنے کے لئے کس قسم کے رفقاء اور کن معاونین کی ضرورت ہے، الغرض غایت و غرض کے تعین کے بعد ہی رفقاءِ سفر کا انتخاب اور طریق کار کی تعیین سے منزل مقصود کی رہنمائی ہو گی۔

آیۂ کریمہ جو میں نے تلاوت کی ہے درحقیقت یہی موضوعِ سخن ہے۔ ٹھیک ایک ہزار تین سو چوہتر برس قبل ذی الحجہ کا مہینہ تھا، عرفہ کا دن تھا، جمعہ کا مبارک دن تھا، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا تئیسواں برس تھا اور آپ کی حیاتِ مقدسہ کا تریسٹھواں سال تھا، عصر کا وقت تھا، عرفات کا میدان تھا، سامعین کا ایک عظیم الشان مجمع ایک لاکھ کے لگ بھگ تھا، ایسا مجمع کہ روئے زمین پر اتنا برگزیدہ مجمع کبھی جمع نہیں ہوا، آپ اپنی ناقہ قصواء پر سوار تھے اور ایک عظیم الشان خطبہ ارشاد فرما رہے تھے جو نہ صرف اسلامی تاریخ میں بلکہ نسلِ انسانی کی تاریخ میں انتہائی محیر العقول تھا جو آج بھی کائنات کے صفحات پر وحیِ ربانی کے حروف سے لکھا ہوا ہے، نسلِ آدم کی جس آخری تربیت کے عظیم مقصد کے لئے آپ کی بعثت ہوئی تھی اس کا آخری مرحلہ تھا اور جس نسل کے تزکیۂ نفوس و تکمیل و تربیت کا بیڑا اٹھا چکے تھے آج اس کی تکمیل ہو رہی تھی۔ اس عظیم و جلیل موقع پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی اور علیم و قدیر، عالم الغیب والشہادہ کا خدائی

اعلان ہوا کہ آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو ہر طرح کا کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام پورا کر دیا اور میں نے "اسلام" کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا یعنی اب قیامت تک کے لئے یہی دین رہے گا اور یہی آخری نعمت تھی جو تمہیں دی گئی۔

آیۂ کریمہ کی تشریح لفظِ دین کی تشریح "دین" نام ہے اس طریقِ کار کا جو نسلِ انسانی کی تربیت و تزکیہ نفوس اور تعلق مع اللہ کے لئے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک حق تعالیٰ نے آسمان سے بذریعہ وحیِ الٰہی سلسلہ جاری کیا ہے۔ حق تعالیٰ کی مرضیات کا ادراک عقلِ انسانی کے دائرہ سے بالاتر تھا عقل کا دائرہ مشاہدات و مادیات و ظاہری کائنات تک محدود ہے، غیب و ماوراء الطبیعۃ کا دائرہ حیطۂ عقل سے باہر تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے عقل کی رہنمائی کے لئے وحی و نبوت کا سلسلہ جاری فرما دیا، درحقیقت عقل کی سرحد جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے نبوت کا دائرہ شروع ہوتا ہے۔

بہر حال مخلوق کا جو معاملہ خالق سے ہوگا اور خالق کی رہنمائی سے مخلوق کو ہوگا چاہے اس کا تعلق عقائد سے ہو یا اعمال سے، اخلاق سے ہو یا معاملات سے اس سب کا نام دین ہے جو نظام نسلِ انسانی کے لئے اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے اس کا نام دین ہے اسی حقیقت کے لئے قرآن کریم نے یہ تعبیر کی ہے، تفصیل میں جانے کی حاجت نہیں۔

اسلام کی تشریح عربی لغت میں اسلام کے معنی ہیں سونپنا سپرد کرنا، یہاں یہ لفظ اس لئے لایا گیا ہے کہ جو شخص حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا اس نے اپنی جان و مال و وقت اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا جب بھی ان تین چیزوں میں سے کسی چیز کا مطالبہ ہو تو عذر نہ ہوگا، اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے قرآن کریم میں متعدد آیتیں ہیں، ایک جامع ترین آیت حسبِ ذیل ہے:

"قل إن كان آباؤكم وأبناؤكم وأزواجكم وعشيرتكم وأموال اقترفتموها وتجارةٌ تخشون كسادها ومساكن ترضونها أحبَّ إليكم من الله ورسوله وجهاد في سبيله فتربَّصوا حتى يأتي الله بأمره إن الله لا يهدي القوم الفاسقين" (توبہ ۲۵)

صاف اعلان ہو گیا کہ باپ، بیٹے، بیویاں، قبیلہ، مال، تجارت، مکانات، ان سب چیزوں

کی محبت اللہ و رسول کی محبت میں حائل نہیں ہونا چاہیئے، بوقتِ ضرورت ان سب کو اللہ و رسول کے لئے چھوڑا جا سکتا ہے۔

اب یہ "دینِ اسلام" دینِ محمدی کا نام ہے اس دینِ اسلام کو آخری نعمت کہا گیا ہے اور اس کی تکمیل کا اعلان کیا گیا ہے، یہ عجیب و غریب آیۂ کریمہ ایک بشارتِ عظیمہ تھی جس کا اعلان ایسے عظیم الشان موقع پر کر دیا گیا جس کی یاد ہر ہفتہ و ہر سال تازہ ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا علم محیط تھا، اس کے علمِ ازلی میں یہ بات موجود تھی کہ قیامت تک کے آنے والی نسلوں میں کیا کیا خرابیاں پیدا ہونگی اور معاشرے کی اصلاح کس کس طرح ہوگی اور حق تعالیٰ کی قدرت بھی کامل تھی کہ قیامت تک معاشرے میں پیدا ہونے والے امراض کے لئے ایک جامع ترین و کامل ترین نسخۂ شفا اتارے جب علم بھی محیط ہے اور قدرت بھی کامل ہے اس علم و قدرت کے مطابق "دینِ اسلام" کا نسخہ اس کائنات کے لئے تجویز ہوا اور نازل فرمایا، انسانی عقول و ادراکات سے بالاتر چیز ہے اس لئے نہ اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہ ترمیم نہ اضافہ نہ کمی کی، پھر قابلِ غور ہے کہ جس ہستی نے انسان کی تخلیق کی ہو اس کی نفسیات سے زیادہ باخبر اور کون ہو سکتا ہے، اس لئے قرآن کریم آخری ربانی پیغام ہدایت ہے جو نسلِ انسانی کو دی گئی اور حضرت خاتم الانبیاء آخری رسول و نبی ہیں جو قیامت تک کی امتوں و نسلوں کی رہنمائی کے لئے بھیجے گئے ہیں اب نہ کوئی اور کتاب آئے گی اور نہ کوئی رسول و نبی، پس دینِ اسلام کامل و مکمل ہو چکا ہے، اس بات کو سمجھ لینے کے بعد سارے شبہات خود بخود دور ہو جاتے ہیں۔ یہ نظام چند عقول کی پیداوار نہیں جن کا دائرہ محدود ہے بلکہ یہ نظام تو خالق العقول کی طرف سے آیا ہے۔

قرآنِ کریم اور نبی کریم | قرآنِ کریم نے جس طرح ارشادات و ہدایات کا بیان فرمایا ہے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اعلان کر دیا ہے کہ ایک سمجھانے سکھانے والا بھی ساتھ ساتھ بھیجا جن کا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور صاف صاف اعلان کر دیا کہ قرآن کی تعلیم، نسل انسانی کی تربیت و تزکیۂ نفوس وغیرہ اس کے ذمہ ہیں اور یہ بھی اعلان کر دیا ہے کہ جو وہ کہے اور جو سمجھائے اسے باور کرنا ہوگا اور وہ ہمارا نائب ہے ان کا بیان ہر جہت سے معتبر ہے، اس کا بیان ہمارا بیان متصور ہوگا، قرآن

کریم میں ایک سو کے قریب آیتیں ایسی ہیں جن سے یہ مضمون بالکل صاف ہو جاتا ہے اور اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو چھوڑ کر قرآنِ کریم پر ایمان باقی رہ سکتا ہے۔ اگر کاغذ کے صفحات پر اللہ تعالیٰ کا پیغام ثبت ہے تو کائنات کے صفحات پر حیاتِ محمدؐ کے کارنامے ثبت ہیں۔

دینِ اسلام کی علمی و عملی حفاظت "دینِ اسلام" میں حق تعالیٰ کا منشأ خداوندی پورا ہو گیا اور یہ قیامت تک محفوظ بھی ہونا چاہیئے، اگر یہ محفوظ نہیں تو حق تعالیٰ کی حجت امتوں پر پوری نہ ہوگی۔ اس لئے ارشاد ہوا ہے ((إنا نحن نزّلنا الذکر وإنا له لحافظون)) دیکھئے اگر ایک قانون کا مسودہ تیار ہو گیا، اس کے الفاظ بھی مرتب و مدون و محفوظ ہو گئے لیکن الفاظ ایسے ہیں کہ ہر شخص اس کا نیا مطلب نکال سکتا ہے اور اس طرح اس کا مفہوم و مقصد محفوظ نہ ہو سکا تو الفاظ کی حفاظت بے معنی ہے، اب تو ضرور یہ ماننا پڑے گا کہ اس کے الفاظ و مقاصد سب محفوظ ہیں، قرآن کریم کے مقاصد کا یہ حصہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے عملی زندگی سے امت کے تعامل سے احادیثِ نبویہ سنتِ نبویہ سے پورے طور پر محفوظ ہو گیا، صلاۃ، زکاۃ، صوم، حج، ربا، خمر، زنا، کفر، اسلام، نکاح، طلاق، عدت وغیرہ وغیرہ قرآنی اصطلاحات ہیں، تعلیماتِ نبویہ و تعاملِ محمدی نے ان کے مقاصد و اساسی شکل و صورت سب کو محفوظ کر دیا ہے، کسی ملحد یا پرویزی خیال شخص کو تحریف کا موقع نہیں مل سکتا، بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ نہ صرف علمی اعتبار سے دینِ اسلام مأمون و محفوظ ہو گیا ہے بلکہ عملی اعتبار سے بھی قیامت تک محفوظ رہے گا اور امتِ محمدیہ میں ایک جماعت قیامت تک ایسی موجود رہے گی جو اپنی عملی زندگی سے قرآن و حدیث کے مطابق دینِ اسلام کے پورے خد و خال کی حفاظت کرے گی اور ان کو دیکھ کر دینِ اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے کا موقع ملتا رہے گا۔ عہدِ نبوت کے بعد عہدِ خلافتِ راشدہ نے ہر طرح دین کی علمی و عملی حفاظت کی، ملوکیت کے ادوار میں بھی اسلام کی روح باقی رہی اور عاملین بالدین ہر دور میں موجود رہے، کسی دور میں بھی کسی زندیق و ملحد کو یہ قدرت نہ ہو سکی کہ وہ دین کے شعائر اور اساسی مسائل میں کوئی تحریف کرے اور وہ چل جائے اور امت غافل رہے آج تک الحمد للہ

"دینِ اسلام" کا پورا نقشہ صحیح و سالم شکل میں موجود ہے، فرق صرف تناسب کا ہے پہلے صحیح عمل کرنے والے بہت تھے اور اب تھوڑے ہیں، بہرحال موجودہ دور میں اسلامی تصنیفات، اسلامی ادارے، دینی مدارس، دینی انجمنیں یہ سب درحقیقت دین اسلام کی حفاظت کی قدرتی تدابیر ہیں، اس لئے صفائی سے عرض کرتا ہوں کہ آپ کے "ادارہ مرکزِ تحقیقاتِ اسلام" کا موضوع بھی یہی ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالٰی کی آخری نعمت دینِ اسلام جس صورت میں آیا تھا ہم اس کی پوری حفاظت کریں، اگر آئندہ نسلوں کے لئے ہم نے اس نعمت کی حفاظت کی اور ہمارے ذریعہ سے یہ نعمت محفوظ ہو جائے تو ہماری کتنی بڑی سعادت ہوگی اور ہمارا منصب کتنا اونچا ہوگا، اگر ہماری حکومت کے ذمہ پاکستان کے باشندگان کی جان و مال و آبرو کی حفاظت فرض ہے ہماری سرزمین ہماری سرحدوں کی حفاظت فرض ہے اور حکومت اپنی فوج پولیس اور اپنے وسائل کے ذریعے اربوں روپیہ اس پر خرچ کرتی ہے اور اس مادی نظام کی حفاظت کرتی ہے جس سے ہمارا مختصر و محدود تعلق ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے دین کی حفاظت نہ کرے جو ہمارا روحانی نظام ہے اور جس کے ذریعہ ہم غیر محدود و ابدالآباد کی نعمتوں سے مالا مال ہوں گے، آپ کے ادارہ "تحقیقاتِ اسلام" کا اصلی مقصد تو یہی ہونا چاہیئے کہ وہ صحیح معنی میں "و إنا له لحافظون" کی عملی تفسیر بنے، اس طولانی تمہید کے بعد اب میں ان نقطوں کو واضح کرنا چاہتا ہوں جو آپ کے ادارے کے لئے عملی خطوط ہوں:۔

ربیع الاول ۱۳۸۴ھ

مرکزی ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ کے بنیادی مقاصد کیا ہونے چاہئیں؟

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ کے لئے دو اساسی اصول ہونے چاہئیں: (۱) اسلامی عقائد اور اسلام کی حقانیت کے لئے عصرِ حاضر میں قدرتِ کاملہ نے جو سائنس کے ذریعہ تحقیقات کرائی ہیں، ان سے اس مقصد کے لئے فائدہ اٹھایا جائے، اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا کرشمہ ہے کہ معجزاتِ نبوت ورسالت کا دور تو ختم ہو چکا تھا، نہ جدید نبوت کا ظہور ہو سکتا تھا نہ نبوت کے معجزات ظاہر ہو سکتے تھے لیکن چونکہ اسلام کی دعوتِ حق قیامت تک کی آنے والی نسلوں کے لئے تھی اس لئے قدرت نے طبیعیات کونیات اور نظامِ کائنات میں ایسے ایسے عجائبات ظاہر فرما دیئے جن سے ایک منصف حکیم وقت اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات وکمالات کے اعتقاد پر مجبور ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کائنات کے محیّر العقول نظام میں اس کے اقتدار وتدبیر وتصرف کے اسرار وغوامض معلوم کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو جائے اور قیامت کے روز انکار کی گنجائش باقی نہ رہے۔

جدید علمِ کلام

درحقیقت جدید علمِ کلام نام ہی اس طریقۂ فکر کا ہے کہ نظامِ کائنات کے حقائق سے اصولِ اسلام کی تائید وتصدیق کا سامان مہیا کیا جائے، قرآنِ کریم نے اسی انداز میں فکرِ انسانی کو دعوتِ غور وفکر دی ہے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دار العلوم دیوبند نے اپنی کتاب حجۃ الاسلام اور مباحثۂ شاہجہان پور اور انتصار الاسلام اور قبلہ نما اور تقریر دلپذیر اور مکتوب قاسم العلوم میں اس جدید علمِ کلام کی بنیاد رکھی ہے اور سلطان عبد الحمید خاں کے عہد کے سب سے بڑے محقق عالم الشیخ حسین الجسر طرابلسی نے "الرسالۃ الحمیدیۃ" میں جدید علمِ کلام کی دعوت دی ہے اور ان کے صاحبزادے الشیخ عبداللہ ندیم الجسر مفتیٔ طرابلس نے قصۃ الایمان بین الفلسفۃ والعلم والقرآن میں اسی موضوع کو اختیار کیا ہے[۱]، میرا یہ مقصد نہیں کہ ایسے جدید نظریات جو اب تک زیرِ بحث ہیں اور قطعیت کے درجہ تک نہیں پہنچے ہیں اُن پر ایمان لا کر قرآنی حقائق اور اسلامی اصول وعقائد میں فوراً تاویل کر کے تحریف کا راستہ نکالا جائے بلکہ سائنس کے قطعی اصول وتحقیقات کی روشنی میں دینِ اسلامی کے قطعی حقائق کی تصدیق کا راستہ نکالا جائے ورنہ یہ تو الحاد کا طریقہ کار ہوگا، اسلام وحقیقت سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہیں جیسے آج کل بہت سے مدعیٔ تحقیق غیر شعوری طور پر اس

---

[۱] مثالوں کا اضافہ بعد میں کیا گیا ہے۔

الحاد میں مبتلا ہو چکے ہیں یہ بحث تفصیل کی محتاج ہے یہاں اشارہ کافی ہوگا۔

غرض پہلا بنیادی نقطہ یہ ہونا چاہیئے کہ سائنس اور طبعیات کی تحقیقات کی صحیح معلومات کے ذریعہ اصولِ اسلام کی تصدیق و تائید کے دلائل فراہم کئے جائیں، سائنس کا یہ ذخیرہ یورپ کی زبانوں کے علاوہ عربی زبان میں بھی بہت کافی منتقل ہو چکا ہے اور عربی زبان بھی اس غرض کے لئے غنی زبان ہے، تین چار تو مستقل انسائیکلوپیڈیا عربی میں تالیف ہو چکی ہیں اور شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہو کہ عربی زبان میں اس پر مواد نہ ملتا ہو چاہے مستقل تصنیف ہو یا ترجمہ ہو چکا ہو۔

عہدِ نبوت کے چند واقعات اور سائنس | عہدِ نبوت میں بہت سے واقعات ایسے ملتے ہیں جو در حقیقت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات تھے ملاحدہ تسلیم نہیں کرتے تھے اس لئے کہ وہ ان واقعات کو عقل یا درایت یا فلسفہ کی رو سے خلاف سمجھتے تھے لیکن آج سائنس کی ترقیات نے نہ صرف ان کا امکان ثابت کر دیا ہے بلکہ حقائق بن کر وہ دنیا کی نگاہوں میں آگئے ہیں لیکن وہ "معجزات" اس لئے تھے کہ اسباب کے بغیر وجود میں آئے تھے اور عقلِ انسانی کی ترقی کے بعد جب اسباب کے دائرے میں آگئے تو اب معجزات نہ رہے۔

مثلاً عرفات کی وادی میں ایک لاکھ کے مجمع میں آپ اپنی معتاد آواز میں خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں ہر شخص سن رہا ہے کسی کو کوئی دقت محسوس نہیں ہو رہی ہے یا اس سے بھی عجیب تر ایک واقعہ ہے جو سنن ابی داؤد میں مذکور ہے، آپ جانتے ہیں کہ منیٰ کی وادی تقریباً آٹھ مربع میل ہوگی، آٹھ مربع میل میں ایک لاکھ صحابہ کرامؓ کا مجمع منتشر طور پر اپنے اپنے خیموں میں موجود ہے، حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قیام گاہ خیمہ میں (جہاں آج کل مسجد بنائی گئی ہے اور مسجدِ خیف کے نام سے مشہور ہے) خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں، سب صحابہ کرامؓ اس طویل وادی میں پھیلے ہوئے اپنے اپنے خیموں میں پوری آواز سن رہے ہیں حالانکہ نہ بجلی ہے نہ لاؤڈ اسپیکر ہے نہ ریڈیو اسٹیشن ہے، یہ سب کچھ بغیر ان اسباب و آلات کے ہو رہا ہے، سننِ ابی داؤد کی حدیث میں الفاظ یہ ہیں:-

خطبنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم	آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا جس میں حج کے مسائل تھے
ونحن بمنی ففتحت أسماعنا حتی کنا	رمیِ جمار تک مسائل بیان فرمائے، ہم منیٰ میں اپنی اپنی

نسمع ما یقول ونحن فی منازلنا نطفق یعلمهم مناسکهم حتی بلغ الجمار الخ۔ قیام گاہوں میں یہ خطبہ سنتے تھے ہمیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آج ہماری قوت سماع بڑھا دی گئی ہے۔

بہرحال یہ تو نبوت کا معجزہ تھا کہ بغیر ظاہری آلات و تدبیر کے اتنا بڑا مجمع جو میلوں میں پھیلا ہوا تھا اور اپنے کاموں میں مشغول تھا، آپ کی آواز سن رہا تھا، موجودہ ریڈیو کے نظام نے اسباب کے درجہ میں اب یہ ترقی کرلی ہے کہ جہاں چاہیں اپنی آواز پہنچا دیں۔

ایک اور بنیادی عقیدہ کا حل قدیم فلاسفہ آواز کو عرض کہتے تھے اور یہ نظریہ تھا کہ عرض وجود میں آنے کے بعد فنا ہو جاتا ہے، اس نظریہ کی بنیاد پر اسلامی عقیدہ کہ انسانی آوازیں سب محفوظ ہیں اور قیامت میں اللہ تعالیٰ جب چاہیں گے سنوا دیں گے، ضعیف الایمان لوگوں کا یہ عقیدہ متزلزل ہونے لگا تھا۔ جدید سائنس نے یہ عقدہ بھی حل کر دیا کہ یہ سارے اعراض خواہ اصوات ہوں یا حرکات وجود میں آنے کے بعد سب باقی رہتی ہیں کوئی چیز فنا نہیں ہوتی، غرض قدیم بطلیموسی فلسفہ نے اور فیثاغورس اور ارسطو کی تحقیقات نے اسلام کے عقائد کو متزلزل کر دیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنی حجت پوری کر دی، جدید فلسفہ نے آکر اس فلسفہ کے بہت سے نظریات و مسائل کو غلط ثابت کر دیا، اس طرح اسلامی عقائد کا راستہ صاف ہو گیا بلکہ اس کی تصدیق و تائید ہو گئی، وکفی اللہ المؤمنین القتال، فرق صرف اتنا ہے کہ انسان مخصوص آلات و وسائل کے ذریعے ان آوازوں کو محفوظ کرتا ہے، اور رب العالمین خالقِ اسباب کے لئے ساری کائنات کے صفحات ریکارڈنگ کے وسائل ہیں جلّت قدرتہ

عذابِ قبر کے مسئلہ کا حل اور اس کی مثال اسلامی عقائد میں ایک مسئلہ عذابِ قبر کا ہے کہ انسان پر موت طاری ہونے کے بعد اور روح جدا ہونے کے بعد تکلیف و راحت کا احساس و شعور و ادراک باقی رہ سکتا ہے، اس مسئلہ سے زیادہ بعید از عقل اور کوئی مسئلہ بظاہر نہ ہوگا لیکن جدید فلاسفہ کی تحقیقات نے اس بعید عن القیاس مسئلہ کو بھی اتنا صاف کر دیا ہے کہ عقل حیران ہے، مسمریزم اور علم الارواح کی تحقیقات و واقعات نے اس مشکل کے حل کا راستہ بھی نکال دیا ہے، ڈاکٹر فرید وجدی مصری نے اپنی کتاب "دائرۃ المعارف" (انسائیکلو پیڈیا) ج ۴ ص ۳۰۰ میں ایک فرانسیسی ماہرِ مسمریزم اور اس پر بحو دیلزم "کو نیل دروشاس" کا رجو پیرس کے انجینئرنگ کالج کا پرنسپل تھا) ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ

لہ جلد و صفحہ کا حوالہ بعد کا اضافہ ہے۔

"اس نے ایک شخص پر مسمریزم کا عملِ توجہ کیا اور اتفاق سے توجہ زیادہ دے دی یہاں تک کہ معمول کی حرکت وغیرہ ختم سی ہوگئی جواب دینا بند ہوگیا اور اس کو بہت تشویش ہوئی کہ شاید مرگیا، فوراً ایک دوسرے شخص پر عمل توجہ کیا تاکہ اس کے ذریعے سابق معمول کی حالت معلوم کرسکے، دوسرے معمول نے بتلایا کہ اس کی روح کچھ فاصلے پر بیٹھی ہے اور بدن سے نکل گئی آنا نہیں چاہتی وہ عامل اس کی تلاش میں رہا یہاں تک کہ اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس وقت دوسرے معمول نے کہا کہ اس وقت آپ کا ہاتھ اس کی پنڈلی پر ہے، کوونیل نے ایک نشتر ہاتھ میں لے کر اس طرف ہوا میں لگایا فوراً اس معمول کی ٹانگ سے اسی جگہ سے خون نکل آیا حالانکہ درمیان میں فاصلہ بھی تھا۔

اس واقعہ سے جو نتیجہ نکلتا ہے کتنا اہم ہے کہ روح بدن سے جدا ہونے کے بعد بھی اس کا ایک قسم کا تعلق بدن سے رہتا ہے نیز روح کے تاثر سے بدن متاثر ہوتا ہے، برزخی دور کے لئے اس سے زیادہ واضح مثال کیا ہوسکتی ہے، دیکھا آپ نے کہ کس طرح ایک غامض ودقیق مسئلہ کے لئے موجودہ جدید تحقیقات سے امداد مل گئی، الغرض حق تعالیٰ کے وجود وصفاتِ کمال کے لئے موجودہ سائنس اور جدید معلومات سے کافی دلائل وشواہد مل سکتے ہیں، میرا مقصد جدید علمِ کلام سے اس قسم کی تحقیقات ہیں جن سے اسلام کو فائدہ پہنچ سکتا ہے، ہمارے استاد حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری دیوبندی نے ایک کتاب "ضرب الخاتم علی حدوث العالم" لکھی ہے جس میں قدیم وجدید طبیعات والٰہیات سے دلائل وبراہین قائم کئے ہیں لیکن وہ کتاب عربی نظم میں ہے اور بہت دقیق ومشکل ہے اس میں ایک شعر اس مضمون کا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاءِ کرام کو جو معجزات دیئے ہیں درحقیقت وہ اس بات کی تمہید ہے کہ آئندہ نسلِ انسانی اسباب کے درجہ میں پہنچ کر یہ ترقیات کرے گی، گویا انبیاءِ کرام کے معجزات مادی وتمدنی ترقیات کا پیش خیمہ ہیں، فرماتے ہیں ؎

وقد قیل إن المعجزات تقدم

بما یوتقی فیہ الخلیقۃ فی مدٰی

عصرِ حاضر میں اس طرح ہم اسلام کی بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں!

نیز قدیم متکلمین کے بعض نظریات جو فلسفۂ ارسطو کے خلاف تھے یا اشاعرہ کے بعض مسائل جو معتزلہ

کے خلاف تھے آج نئی تحقیقات نے ان کی تصدیق کردی اور ایک مستمر نزاع وجدال کا سلسلہ جو عرصہ سے جاری تھا آج مشاہدات کی روشنی میں حل ہوگیا، حضرت رسالت پناہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کا واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہوائی تخت کا مسئلہ جدید ترقیات و سائنس کے کارناموں نے اس کا امکان پیدا کر دیا ہے، امکان کے بعد مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کا قطعی ہونا ایک مومن کے لئے کافی ہے۔

متکلمین نے تو لکھا تھا کہ روح انسانی کا تعلق بدن کے ساتھ پانچ طرح کا ہوتا ہے:۔

(۱) بحالت جنین جبکہ شکم مادر میں ہو۔ (۲) ولادت کے بعد بحالت بیداری۔
(۳) بحالت نیند۔ (۴) موت کے بعد برزخی دور میں۔ (۵) مرنے کے بعد کی زندگی جیسا کہ حافظ ابن القیم نے "کتاب الروح" میں اور ان کے علاوہ دیگر محققین نے لکھا ہے ۔ اس تعلق کے اثبات کے لئے سابق فرانس کے عالم مسمریزم کے واقعہ نے بات صاف کردی۔

کسوف شمس (سورج گرہن) کے بارے میں قدیم سے یہ سوال چلا آیا ہے کہ یہ حسابی معاملہ ہے، کائنات میں یہ واقعہ ہمیشہ ہوتا رہتا ہے جب کرۂ قمر زمین و سورج کے درمیان حائل ہوتا ہے یہ صورت نمایاں ہوتی ہے، اب احادیث نبویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ پریشان ہوتے تھے، نماز پڑھا کرتے تھے۔ نماز پڑھنے کا حکم دیا کرتے، خیرات و صدقات کا حکم دیا کرتے اور اس نازک وقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے دعا وزاری میں مشغول ہونے کا حکم دیا کرتے تھے وغیرہ وغیرہ اس کی کیا وجہ ہے، لیکن جدید طبیعیات کے نظام نے قطعی طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ وقت نظام عالم کے لئے خطرناک وقت ہوتا ہے، سورج میں جاذبیت کا نظم ہے اور زمین میں بھی کشش موجود ہے اور خطرہ ہوتا ہے کہ چاند کا کرہ درمیان میں زمین سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے، الغرض یہ وقت انتہائی خطرناک ہوتا ہے ایسے وقت پریشانی کا ہونا اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا ایک فطری تقاضا ہے اور بالکل قرین عقل ہے اسی لئے تو نیوٹن کہتا ہے کہ کواکب کی حرکات حالیہ ممکن نہیں کہ عام قوت جاذبہ کے فعل کا نتیجہ ہوں۔ یہ قوت جاذبہ تو کواکب کو شمس کی طرف ڈھکیلتی ہے اس لئے کواکب کو سورج کے گرد حرکت دینے والا ضروری ہے کوئی خدائی ہاتھ ہو جو باوجود قوت جاذبہ

کی عام کشش کے ان کو اپنے اپنے مدارات پر قائم رکھ سکے، کوئی طبعی سبب ایسا نہیں بتلایا جاسکتا جس نے تمام کواکب کو کھلی فضا میں جکڑ کر بند کر دیا ہے کہ وہ سورج کے گرد چکر لگاتے رہیں اور معین مدارات پر ایک خاص جہت میں حرکت کریں اور کبھی اس کے خلاف نہ ہو، میں تو سمجھ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان سائنسدانوں پر اپنی حجت پوری کر رہا ہے تاکہ قیامت کے روز یہ نہ کہہ سکیں کہ عقل ان باتوں کو باور نہیں کر سکتی تھی اور معجزات کا دور گذر چکا تھا، انبیاء کا زمانہ ختم ہو چکا تھا، گویا اللہ تعالیٰ نے کائنات میں اپنے علمی معجزے ان ہی سائنسدانوں کے ذریعہ دکھلائے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی حجت قاہرہ اور سلطانِ قاہر کا مشاہدہ کریں، انکار کی مجال باقی نہ رہے۔ الغرض وقت کا ایک اہم کارنامہ یہ ہوگا کہ جدید تحقیقات و نظریات سے اسلام کے اساسی عقائد و مسائل کے لئے دلائل و شواہد فراہم کی جائیں نہ یہ کہ اسلام کے عقائد کی بیخ کنی جدید نظریات سے کی جائے، یا کسی سائنسدان نے کچھ کہہ دیا، اس سے قبل کہ اس کی تحقیق کی جائے یا وہ پایۂ ثبوت کو پہنچے اسلامی عقائد میں تحریف و تاویل و انکار کے راستے تلاش کئے جائیں۔ اللہ تعالےٰ نے قرآنِ کریم میں جن حقائق و کونیات کو بیان فرمایا ہے وہ قطعی و یقینی ہیں چاہیں ہم انہیں سمجھیں یا نہ سمجھیں اللہ کے کلام کی حقانیت کی تائید و تصدیق انسانی عقول و ادراکات سے بالاتر ہے۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ نئی نسل جو جدید سائنس پر ایمان لاکر قرآن کریم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منحرف ہو رہی ہے ان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کوئی سامان مہیا کیا جائے۔ خلاصہ یہ کہ ایک کام تو یہ ہوگا کہ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ اس انداز سے دینِ اسلام کی خدمت کا ارادہ کرے اور اپنے مقاصد میں اس کو شامل کرے اور تحقیقاتِ اسلامیہ کا یہ ایک اصولی شعبہ ہوگا۔

فقہِ اسلامی کی جدید تدوین[1] دوسرا مقصد یا دوسرا شعبہ فقہِ اسلامی کی تدوینِ جدید ہے فقہ علمِ شریعت کا وہ علم ہے جس کا تعلق ہماری زندگی کے ہر شعبے سے ہے خواہ وہ عبادات ہوں یا معاملات، عقود ہوں یا معاہدات، حدود ہوں یا تعزیرات، جدید تمدن و تہذیب نے زندگی کے ہر شعبے میں نئے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں، علماءِ امت کے ذمہ اب یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم اور سنتِ نبویہ اور احادیثِ نبویہ اور فقہاءِ امت کی مدون کردہ فقہ کی روشنی میں جدید مسائل کا حل

---

[1] حضرت مولانا کی تین تحریریں اس موضوع سے متعلق اور قابلِ دید ہیں ملاحظہ ہو بینات ج ۲ کے شمارہ ۳، ۴، ۵ میں زیر عنوان "فکر و نظر"۔

تلاش کریں، عبادات سے میری مراد وہ جدید مسائل ہیں جو نماز، روزہ، حج تقریباً ہر باب میں نئے نئے سوالات کے ساتھ پیدا ہو گئے ہیں، نماز ایک شخص اپنے صحیح وقت میں پڑھ لیتا ہے اور جیٹ طیارے میں ایک ایسے ملک میں پہنچ جاتا ہے کہ ابھی نماز کا وقت داخل نہیں ہوا، کیا یہ نماز دوبارہ پڑھی جائے گی یا نہیں؟ نماز کا وقت آ گیا ہوائی جہاز میں سفر ہو رہا ہے جہاں ہوائی جہاز پہنچے گا یا اترے گا نماز قضا ہو چکی ہوگی، یہ نماز ہوائی جہاز میں پڑھی جائے گی یا قضا کی جائے گی؟ عید کی نماز حجاز میں پڑھ لی پاکستان آکر ابھی ماہ رمضان باقی ہے یا مثلاً کسی ملک میں ماہ رمضان شروع ہو چکا ہے، وہاں کے حساب سے روزہ شروع ہو گیا ہے، دوسرے ملک میں پہنچا جہاں دو دن بعد روزہ شروع ہوتا ہے اگر سابق ملک کا اتباع کرے گا تو ۲۸ روزے ہوں گے اور اگر آخری ملک کا اتباع کرے گا تو ۳۲ روزے رکھنے ہوں گے؟ یا حج کے بارے میں مثلاً میقات سے احرام باندھنا ہوتا ہے صحیح میقات کی محاذات کا تعین مشکل اور محاذات کا مسئلہ ہوا میں مختلف مواقیت سے ہو سکتا ہے یا کوئی شخص گلوکوز کا انجکشن لیتا ہے یا اور کوئی ایسا انجکشن جس سے بھوک و پیاس ختم ہو جائے، کیا یہ انجکشن مفسد صوم ہوگا یا حرام یا مکروہ یا موجب کفارہ؟ وغیرہ وغیرہ۔ الغرض زندگی کے ہر شعبے میں حتیٰ کہ عبادات تک میں نئی نئی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں، اس قسم کی خدمت کے لئے تمام علماءِ دین اور صالح و متقی حضرات کی مشترکہ جدوجہد ہی سے کوئی قابل قبول و قابلِ اطمینان صورت نکل سکے گی، اگر نااہلوں کو یہ انتظام سونپا گیا تو یہ دین کی تخریب ہوگی نہ کہ تعمیر۔

مقصد یہ نہیں ہے کہ جدید معاشرے میں جدید تمدن نے جو صورت حال پیدا کر دی ہے اس کی خواہشات کی تسکین کے لئے نصوصِ قطعیہ کے مفاد میں ترمیم کی جائے اور فیصلہ شدہ متفقہ مسائل پر جدید اجتہاد کے نام سے عملی جراحی شروع کی جائے، زنا و شراب، سود و قمار، رقص و سرود، عریانی و بے حیائی وغیرہ وغیرہ کے لئے نصوصِ قطعیہ میں تحریف کر کے دینِ اسلام کے مسخ کرنے کی کوشش کی جائے[1] بلکہ اسلام تو ایک کامل ترین نظام زندگی ہے جو اپنے خاص اصول پر ایک معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں اللہ و رسول کی اطاعت اس کا سرمایۂ سعادت و نجات ہو، آخرت پر اس کا ایمان ہو، حرص و بخل، رذالت و بے حیائی سے پاک ہو، خدائے تعالیٰ سے ایسا تعلق ہو کہ مخلوقِ خدا

---

[1] جیسا کہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ (لاہور) سے رقص و سرود اور مردوں کے لئے سونے اور ریشم کے استعمال کے جواز پر قرآنی مفاہیم کو مسخ کر کے کتابیں شائع کی گئی ہیں۔

پر رحم کرے ایک مسلمان کی جان اور اس کا مال و آبرو اس سے محفوظ ہو، جدید خدا فراموش متمدن کے ہاتھوں اور آبرو باختہ انسانوں کے قوانین کے ذریعہ جو مہلک نظام وجود میں آچکا ہے اگر آپ چاہیں کہ ان دونوں بالکل متضاد نظاموں میں کوئی درمیانی راستہ نکالیں تو۔

ع این خیال است و محال است و جنوں

سابق شعبہ جس کا تعلق ایمانیات و اصولِ دین سے ہوگا اس شعبہ کا یہ فرض ہوگا کہ اسلام کی حقانیت کے عقلی دلائل و براہین سے اسلام کی برتری ثابت کرے اور نظامِ اسلام کے صالح ثمرات سے دنیا کو آگاہ کرے اور جدید مہلک نظام کے تباہ کن اثرات کو دنیا پر واضح کرے، صحیح پاؤں کے لئے ایک قالب یا ایک سانچہ جو بنایا گیا اگر ٹیڑھا پاؤں اس میں فٹ نہ ہو تو سانچہ کا کیا قصور، آپ چاہیں کہ ماڈرن اسلام کا کوئی نسخہ ایسا تجویز کرلیں کہ خواہشاتِ نفس کا جدید نظام اس میں سما جائے تو اسلام کے ساتھ اس سے بڑھ کر دشمنی کیا ہوگی؟ الغرض جدید تدوین سے میری مراد یہ ہے کہ اسلام ایک مکمل دین و مذہب ہے جس میں نسلِ انسانی کے فطری صحیح تقاضوں کو پورا کیا گیا ہے، اگر فقہ اسلامی کے اجتہادی قوانین جن کا تعلق مخصوص عہد کے عرف سے ہو اور قرآن و سنت کی رہنمائی وہاں نہ ہو یا ایسے مسائل ہوں کہ نسلِ انسانی بغیر ان کے زندہ نہ رہ سکے اور سابق فقہ میں اس کا فیصلہ نہ ہوا ہو تو قرآن و سنت کے اصول کے پیشِ نظر اور فقہ اسلامی کی روح کی روشنی میں آپ فیصلہ کریں اور اس کا حل ڈھونڈھ نکالیں۔ مثلاً تجارت و خرید و فروخت اجتماعی زندگی کے لئے ایسا ضروری شعبہ ہے کہ کوئی حکومت یا دولت بغیر اس کے چل نہیں سکتی اور ظاہر ہے کہ آج کے دور میں کوئی ملک دنیا کے ملکوں سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا، درآمد و برآمد کے بغیر کوئی ملک زندہ نہیں رہ سکتا، باہر کی دنیا میں غیر اسلامی زندگی رائج ہے۔ جس کی بنیاد سود اور بیمہ پر ہے، نیز بلا بینک کا کوئی نظام آج کل نہیں چل سکتا ہے تو ہمیں غور کرنا ہوگا کہ ایسا نظامِ تجارت سوچیں اور ایسا بینک قائم کریں کہ جو بغیر سود کے چل سکے، چاہے وہ مضاربت کے اصول پر ہو یا شرکت کے قانون پر ہو نہ یہ کہ ہم یہ اندازِ فکر اختیار کریں کہ بینکنگ کے سود کو جائز ٹھہرائیں کہ یہ وہ سود نہیں جس کو اسلام نے حرام کیا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ درحقیقت بینک کا سود ہی وہ بڑی لعنت ہے جس پر سرمایہ داری کی ساری عمارت کھڑی ہے اور یہی لعنت ہے جو اپنے

ردعمل کے طور پر اشتمالیت واشتراکیت کا سبب بن رہی ہے کیپٹیل ازم ہی کے ردعمل سے دنیا میں کمیونزم کی بنیاد پڑ جاتی ہے، دنیا میں یہ طبقاتی تفاوت کہ ایک انسان نانِ شبینہ کے لئے محتاج رہے، اور دوسرا کروڑوں کا مالک بن بیٹھے۔ اس کا منشا سودی کاروبار نہیں تو اور کیا ہے؟

سرمایہ داریت میں فقراء و مساکین کے ساتھ ہمدردی و غم خواری کا جذبہ یکسر ختم ہو جاتا ہے اور سود خوار کے دل میں بے رحمی و قساوت پیدا ہو جاتی ہے، انسانی اخلاق کی جگہ بہیمانہ زندگی جنم لیتی ہے، اس کی وجہ سے پوری قوم اور ملک و ملت کے سرمایہ و دولت پر چند سرمایہ داروں کا قبضہ ہو جاتا ہے، اس لئے قرآنِ کریم نے اتنا شدید اعلان فرمایا کہ اگر تم سود کو نہ چھوڑو گے تو تم سے اللہ اور رسول اعلانِ جنگ کرتے ہیں گویا سود خور قوم جہاد کی سزاوار بن جاتی ہے، سود خور اور سرمایہ دار کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا، اس لئے حدیث میں آیا ہے کہ دو حریص ایسے ہیں کہ ان کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا، علم کا حریص اور مال کا حریص، آج اگر قرضِ حسنہ کی بنیاد پر معاشرے کی تشکیل ہو اور سودی نظام کو ختم کیا جائے تو کمیونزم و اشتمالیت خود بخود ختم ہو جائے گی۔

الغرض جدید تدوینِ فقہ میں اس پر غور کرنا ہوگا کہ موجودہ نظامِ تجارت کو سود سے کیسے پاک کیا جائے نہ یہ کہ سود ہی کو جائز کیا جائے، اسلام کا منشأ یہ ہے کہ دنیا کے سارے مادی نظام کی بنیاد روحانی نظام پر قائم ہو جس میں اخلاق اور انسانی ہمدردی کی روح کارفرما ہو، اگر روحانی رابطہ اس مادی نظام سے کٹ گیا تو سراسر فساد پیدا ہوگا، لہٰذا اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے دو بنیادی مقاصد ہونے چاہئیں، دینِ اسلام کے اصولی نظام کی حفاظت اور فروعی نظام کی جدید تشکیل، ہر مقصد کے لئے صحیح موزوں افراد کا انتخاب کرنا ہوگا ورنہ نااہلوں کو کام سپرد کرنے کے نتائج ظاہر ہیں، مصر کے مجمع البحوث الاسلامیہ میں جس طرح قدیم و جدید علماء کے اشتراکِ عمل سے کام ہو رہا ہے ہمیں بھی اسی انداز سے کام کرنے کی ضرورت ہے، جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہمارے ملک میں دینی تعلیمات سے بالکل بے خبر رہتا ہے اس لئے کہ ہماری تعلیم کی بنیاد دین پر نہیں، مصر و شام ان بلاد میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ آٹھ سال تک جس تعلیم سے بہرہ در ہوتا ہے اس کی بنیاد دینِ اسلام پر ہے، اس لئے وہ دینی معلومات اور اسلامی تعلیمات سے بڑی حد تک باخبر رہتا

ہے، آئندہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جاکر البتہ کسی شعبے کو اختیار کرلیتا ہے لیکن دینی معلومات سے بقدر ضرورت واقفیت ہوتی ہے۔ افسوس کہ ہمارے ملک میں اب تک جو نظامِ تعلیم رائج ہے وہ بالکل اس سے مختلف ہے۔ اس لئے ہمارے قدیم طرز کے علماء اور جدید تعلیم یافتہ حضرات میں قدرِ مشترک مفقود ہے جس کی وجہ سے اختلاف کی خلیج زیادہ وسیع ہوگئی ہے۔

بہر حال ہمارے ملک میں بڑی ضرورت ہے کہ فقہِ اسلامی کی جدید تدوین کے ذریعہ جو قرآن و سنت اور حضرتِ حق جل ذکرہ اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منشأ کے مطابق صالحین کے موروثہ اثاثہ کی روشنی میں کی جائے، جدید پیدا شدہ مسائل کا حل تلاش کرکے فیصلہ کردینا چاہیئے تاکہ دینِ اسلام کا مضبوط اور حسین وجمیل قلعہ قیامت تک اعداد اور اغیار کے حملوں سے محفوظ رہے، مشکل سب سے بڑی یہ ہے کہ ہم یورپ کے جدید معاشی واقتصادی نظام اور معاشرتی نظام کو پہلے ہی سے اپنا لیتے ہیں اور پھر چاہتے ہیں کہ جوں کا توں یہ پورا نظام اسلام کے اندر فٹ ہوجائے، یہ کیسے ممکن ہے اس لئے کہ جس معاشرے کی بنیاد میں نہ عفت ہو نہ عصمت، نہ حیا ہو نہ شرم، نہ حلال وحرام کی تمیز ہو، مرد وعورت کا آزادانہ اختلاط ہو، کلبوں اور سینماؤں کی دنیا ہو، شراب وقمار کا مشغلہ زندگی کا جزء لاینفک بن چکا ہو، سودی کاروبار تجارت کا جزء ہو، اس کا اللہ تعالیٰ کے اس قانون سے کیا جوڑ لگ سکتا ہے جہاں حیاء کو ایمان کا جزء بتلایا گیا ہو، غضِ بصر کا حکم ہو، شہوانی زندگی پر پابندی ہو، زنا وشراب پر دُرّے لگنے کا حکم ہو یا سنگسار کرنے کا قانون ہو، پردہ اور حجاب کا حکم ہو، مرد وعورت کے اختلاط کی ممانعت ہو، شہوت کی نگاہ کو مسموم تیر سے تشبیہ دی گئی ہو، الغرض جس معاشرے کے کمالات وتمدن کے طریقے وہاں جرائم ہوں تعزیرات وحدود اس پر لگائے گئے ہوں دونوں میں کیسے مصالحت ہوسکتی ہے اس لئے خدائے تعالیٰ کی اس آخری نعمت دینِ اسلام کے صالح نظام کی حفاظت جو امت کے ذمہ فرض ہے اگر آپ کا ادارہ جس کو مالی ومادی ہر طرح کے وسائل حاصل ہیں، یہ خدمت انجام دے سکے تو دنیا میں بھی اس کی عزت ہوگی اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی قبولیت کی خلعت سے سرفرازی ہوگی، نیز اس کی ضرورت ہے کہ ادارۂ تحقیقاتِ اسلام موجودہ نظامِ تعلیم کی اصلاح کے لئے بھی قدم اٹھائے۔

اور میٹرک تک تعلیمی نظام میں تعلیماتِ اسلام کا اتنا حصہ آجائے کہ اگر آگے چل کر تعلیمِ دین نہ حاصل کر سکے تو تب بھی سچا و پکا مسلمان رہ سکے، اس ادارے کے ڈائرکٹر کا پہلا فرض یہ ہے کہ صحیح مقاصد متعین کرنے کے بعد ادارے میں صالح دمتقی، باکمال اشخاص و افراد کا تقرر کرے جن میں ان مقاصد کی تکمیل کی پوری اہلیت اور جذبہ ہو، افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہماری کرم فرما حکومت نے ایک اعلیٰ ترین خدمت اور اونچے منصب کے لئے "مشاورتی کونسل" قائم کردی لیکن جن افراد کا انتخاب اس میں کیا گیا ہے ان میں سے اکثر اس کی اہلیت سے عاری ہیں بلکہ بعض تو وہ افراد ہیں کہ اسلامی نظام کے ساتھ ان کا علاقہ و رابطہ وہی ہے جو مستشرقین اعداءِ اسلام کا اسلام کے ساتھ ہے موجودہ وقت کا سب سے بڑا فتنہ یہ ہے کہ اربابِ حکومت اور علماءِ امت میں کوئی رابطہ نہیں ہے بلکہ جانبین میں بے اعتمادی بلکہ بداعتمادی کے خیالات جاگزیں ہیں، ادارۂ تحقیقاتِ اسلام کو اس طرف بھی توجہ کرنی چاہئے کہ یہ فتنہ ختم ہو جائے، نہ یہ کہ اس کی پرورش ہونی ہے۔

آج دنیا اسلام کے محاسن سے فائدہ اٹھا رہی ہے لیکن مسلمان اس نعمت سے محروم ہوتے جاتے ہیں، یورپ والے اسلام کی ظاہری خوبیوں کی بدولت دنیا کی عزت و وجاہت سے متمتع ہو رہے ہیں، راست بازی، راست گوئی، معاملات کی صفائی، اجتماعی روح، انسانی ہمدردی، وغیرہ وغیرہ جو اسلام کی تعلیمات تھیں آج دنیا کی حیثیت سے یورپ والے اپنا رہے ہیں، اگر مسلمان اسلامی روح و جوہر کے ساتھ ان پر عمل کریں تو دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی ان کے ہمکنار ہوگی، مسلمان ان باتوں پر اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے اور آخرت کے تصور سے عمل کرتا ہے، غیر مسلم صرف دنیا کی حیثیت سے عمل کرتا ہے۔ ظاہری صورت اگرچہ ملتی جلتی ہے لیکن حقیقت میں بڑا فرق ہے۔

حدیث میں آتا ہے:-

لا یبقی بیت وبرٍ ولا مدرٍ الا	یعنی کوئی آبادی متمدن و غیر متمدن ایسی نہیں
اُدخلہ اللہ الاسلام بعزِ عزیز	رہے گی جہاں اسلام نہ پہنچے خواہ لوگ چاہیں
وذل ذلیل۔	یا نہ چاہیں۔

ہمارے حضرت شیخ امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری فرماتے تھے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام

کی خوبیوں کو دیکھ کر دنیا کے مذاہب اپنے اپنے مذاہب کی اصلاح پر مجبور ہوں گے اور اسلام کے بہت سے محاسن اپنالیں گے، اس وقت وقت کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ نئی نسل کو اسلام سے روشناس کرائیں اور اسلام کے محاسن ان کے سامنے لائیں تاکہ اسلام سے ان کو محبت و تعلق پیدا ہو جائے، انہی مقاصد کے پیش نظر پاکستان کے حصول کی کوشش کی گئی تھی لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان اپنے نصب العین سے کتنا دور ہوتا چلا گیا، ہماری سب کی کوشش ہونی چاہیے کہ ملک دنیاوی قوت و شوکت کے ساتھ معنوی و روحانی طاقت سے بہرہ ور ہو اور ظاہر و باطن ہر طرح پاکستان کی یہ خوشنما عمارت "تسر الناظرین" کا مصداق بن جائے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ فتنوں کا بڑا نازک دور ہے، اگر ذرا اخلاص سے کام کیا جائے تو بہت زیادہ ثمرات ظاہر ہوں گے افسوس کہ مسلمانوں میں آج اخلاص، عزم، دیانت، امانت، تندہی، محنت و جفاکشی جیسی بہترین خصوصیات جو مسلمانوں کے امتیازی نشان تھے ختم ہو رہے ہیں، ان اخلاق کی جگہ نفاق، خودغرضی، خیانت بے ہمتی، راحت طلبی اور آسانی جیسے مہلک امراض پیدا ہو گئے ہیں، اگر آپ کا یہ ادارہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کام کرے تو ہم ہر قسم کے تعاون کے لئے آمادہ ہیں، یہی تو ہماری زندگی کا نصب العین ہے اور اگر خدانخواستہ یہ ادارہ اسلام کی بیخ کنی کرے تو ہم تعاون تو کیا جو کچھ اس کے خلاف کر سکیں گے کریں گے، سپاہی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہوتا ہے کہ جس مقصد کے لیے اس کا تعین ہوا ہو وہ اپنی جان قربان کر دے، ایک خادم دین کے سامنے دین و مذہب جان و مال سے زیادہ عزیز ہونا چاہیئے، بہرحال اسی دین کی حفاظت ہمارا نصب العین ہے اس نصب العین کی حفاظت کی خاطر ہم ہر قربانی کے لئے تیار ہیں "ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم" ہم بوریہ نشینوں کی مختصر زندگی ہے اس کے لئے زیادہ فکر کی ضرورت نہیں، جس وقت آپ کا ماہنامہ "فکر و نظر" وجود میں آیا مضامین دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی کہ خدا خیر کرے کہ ایک نیا فتنہ اور ظاہر ہوا ہے لیکن آج کی ان مجلسوں سے کچھ توقع ہو گئی ہے کہ شاید رخ صحیح ہو سکے۔

یہ چند باتیں تھیں جو صفائی کے ساتھ "الدین النصیحۃ" کے پیش نظر آپ حضرات سے

عرض کردیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری نیتوں و اعمال دونوں کی اصلاح فرما کر اپنی مرضیات کی توفیق نصیب فرمائے۔ و آخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

اس تقریر کے ختم کے بعد جناب ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے شکریہ ادا کیا اور یقین دلایا کہ ہم کوشش کریں گے کہ موزوں افراد کا انتخاب کریں اور دراصل یہ کام علماء کا ہے کہ وہ فقہِ اسلامی کی تدوین کریں اور جدید معاشرے کو بتائیں کہ یہ کام اس طرح چل سکے گا[1] اور انشاء اللہ تعالیٰ ہماری نیتوں میں فرق نہیں پائیں گے۔

---

[1] مقصد تو یہی ہے کہ آپ کا ادارہ اس مقصد کے لئے جید علماء کا انتخاب کرے اور یہ کام اپنی نگرانی میں ان سے کرائے۔ حضراتِ علماء کے پیشِ نظر تو عرصہ سے یہ کام ہے ہی لیکن وسائل کے نہ ہونے سے وہ اب تک اس کی تکمیل نہیں کر سکے ہیں۔

ربیع الثانی ۱۳۸۴ھ

چند حقائق اور توجہ طلب باتیں

(۱) ہر طبیعت، ہر مزاج، ہر عقل، ہر فکر کے لئے قدرتِ ازلیہ نے ایک محدود و معین معیار مقرر فرما دیا ہے، ہر چیز کی پرواز اسی حد تک ہو گی جو قدرتِ الٰہیہ نے ازل سے اس کے لئے ٹھیک ٹھیک اندازہ کے مطابق تجویز فرما دی۔ ذلك تقدیر العزیز العلیم۔

علیٰ ہذا ہر فن اور ہر علم کا ایک خصوصی اثر ہے، پھر اس علم وفن کی کثرت و مزاولت اور استمرار کے ساتھ اس کے مطالعہ، درس و تدریس کا بھی ایک خاص اثر ہے۔ اسی طرح ماحول کے اثرات، تربیت کے اثرات، معاشرت کے اثرات بھی مستقل خصائص رکھتے ہیں۔

ان گوناگوں عوامل کے ہوتے بہت مشکل ہے کہ ایک انسان جس کی طبیعت میں تاثر و انفعال کا خاصہ قدرت نے خلقۃً رکھا ہوا ہے بالکلیہ اپنے معاشرہ اور ماحول کے اثرات سے محفوظ رہ سکے، ہاں کبھی کبھی قدرتِ الٰہیہ المعی قسم کی غیر معمولی اور خارق العادہ مثالی ہستیوں کو پیدا فرما کر ارادۂ الٰہی کے فوق کل شی ہونے کا اظہار فرماتی رہی ہے۔ اسی کا نام قدرتِ الٰہی کا معجزہ ہوتا ہے۔ اسی نظامِ اسباب وعادت کی جانب اشارہ کرنے کے لئے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

((اذا سمعتم بجبل زال عن مکانہ فصدقوہ واذا سمعتم برجل زال عن خلقہ فلا تصدقوہ))	اگر تم سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو یہ ممکن ہے اس کی تصدیق کر سکتے ہو اور اگر تم سنو کہ کوئی شخص اپنی فطرت سے ہٹ گیا تو یہ ناممکن ہے اس کی تصدیق مت کرو۔

(۲) اگر آپ چاہیں کہ مادر زاد نابینا کو سرخ و سفید، کالے پیلے، مختلف قسم کے رنگ و الوان کے باہمی امتیازات سمجھا دیں اور وہ سمجھ لے تو یہ ناممکن ہے اس میں اس تمیز کی اہلیت ہی نہیں، اگر آپ چاہیں کہ اخشم (جس کی قوتِ شامہ سونگھنے کی قوت مفقود ہو) کو بدبو، خوشبو اور گلاب، کیوڑہ، خس کی خوشبو کا فرق سمجھا دیں تو یہ ناممکن ہے، علیٰ ھذا القیاس۔

(۳) اگر یہ حقائق یقینی ہیں اور درست ہیں تو بتلایئے کہ کیا اس کا امکان ہے کہ جو شخص نعمت ایمان سے اہلِ ایمان کی صحبت سے ماحول سے، معاشرہ سے بالکل محروم ہے، آپ اس کو حلاوت

ایمان سے آشنا کرا سکیں؟ جو شخص مومن نہیں آپ اس کو کیسے سمجھا اور باور کرا سکتے ہیں کہ ایک مومن کامل کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے کیسی عقیدت ہوتی ہے اور کیسی محبت اور کیسا قلبی تعلق ہوتا ہے اور کس درجہ کا والہانہ عشق جو شخص ایمان سے محروم ہو، ایمانی معاشرت سے محروم ہو، اسلامی تہذیب و تمدن سے عاری ہو، اسلامی طرزِ فکر سے بے مایہ ہو، علومِ نبوت کی تعلیم و تعلم کی اسے ہوا تک نہ لگی ہو، حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا علم اور مزاولت اس کو میسر نہ آئی ہو، علم اصولِ حدیث و علم اسماء الرجال سے بے خبر ہو، نہ اصل حاملینِ حدیث صحابہ و تابعین کی زندگی اور نفسیات سے واقف ہو، نہ ان کی فوق العادہ حرصِ حفاظتِ حدیث اور قوتِ حفظ سے، بھلا وہ محروم و بے بہرہ انسان کیا اندازہ لگا سکتا ہے کہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذخیرہ کیوں کر محفوظ ہوا؟ اور سنتِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کس طرح سینہ بسینہ منتقل ہوئی؟ پھر جس کی نیت بھی صحیح نہ ہو، نگاہ بھی کج ہو، شکوک و شبہات اور اوہام و خیالاتِ فاسدہ سے ذہن بھی ماؤف ہو چکا ہو، کیا اس کا امکان ہے کہ وہ محدثانہ علوم، محدثانہ ذوق، محدثانہ بصیرت کا صحیح ادراک کر سکے؟ اور نیت کی خرابی تو ایسی تباہ کن بنیاد ہے کہ اس پر قائم شدہ تحقیق و نظریات کی پوری عمارت کے ایک دم گر جانے کا خطرہ ہر وقت لگا رہتا ہے، عداوت و عناد تو جحود و انکار سے بھی زیادہ خطرناک اور لاعلاج مرض بلکہ روگ ہیں یہی وہ مقام ہے جس پر پہنچ جانے کے بعد «طبع اللہ علیٰ قلوبھم فھم لا یفقھون» کی مہر لگ جاتی ہے اور «ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ أبصارھم غشاوۃ» کی مہر لگ جاتی ہے اور پھر «لھم قلوب لا یفقھون بھا» ان کا طرۂ امتیاز بن جاتا ہے۔

مستشرقین نے آج تک جو علوم اسلامیہ پر ریسرچ کی ہے اور کرتے رہتے ہیں خواہ وہ جدید ہوں یا قدیم، گولڈزیہر ہو یا شاخت، آربری ہو یا ولسن، ان سب کے متعلق یہی فطری اور نفسیاتی حقائق ہیں جن کو پیشِ نظر رکھ ان کی تحقیقات کو پڑھنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اسی طرح ہماری نسل کے "مفکرین" و "محققین" جو انہی مستشرقین اور یورپین مصنفین کی گودوں میں پلے ہوئے اور انہی کی زیرِ تعلیم و تربیت طرزِ تفکر و تحقیق سیکھے ہوئے اور ان ہی کی ریزہ چینی

اور زلہ ربائی سے ان کے دماغوں اور ذہنوں کی نشو و نما ہوئی ہے۔ مزید برآں گراں قدر وظائف لے کر ان کے رہینِ منت بھی رہ چکے ہیں۔ ان سے حدیث و سنتِ رسول اللہ کے متعلق کسی کلمۂ حق اور کلمۂ خیر کی کیا توقع ہو سکتی ہے؟

سب سے زیادہ خطرناک امر یہ ہے کہ یہ مستشرقین اور انگریز مصنفین جن کے رگ و ریشہ میں اسلام سے عداوت و کینہ اور جذبۂ انتقام پیوست ہو چکا ہے انتہا درجہ زیرک و چالاک واقع ہوئے ہیں، ان کا واحد مقصد مسلمانوں کی نئی نسلوں کو لادینی کا شکار بنانا ہے، اس لئے اسلام اور مسلمانوں کے انتہائی ہمدرد اور خیر خواہ بن کر ان کے ایمان پر ڈاکے ڈالتے ہیں اور ان سے رہنمائی کے نام سے رہزنی پر مسلمانوں سے ہدیۂ تشکر و امتنان بھی وصول کرتے ہیں، استغفر اللہ العلی العظیم۔

حدیث کے بعد قرآن

یاد ش بخیر ہمارے دوست ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب ڈائرکٹر مرکزی ادارۂ تحقیقات اسلامی کی ایک اور جدید تحقیق بھی سامنے آگئی، اب سے کچھ دن پہلے تو ڈاکٹر صاحب موصوف نے ۹۰ صفحات کا ایک طویل مقالہ "تصورِ سنت اور تحریکِ حدیث" کے عنوان سے سپردِ قلم فرمایا تھا جس کا مقصد تقریباً انکار حدیث تھا، ہم اس پر کچھ لکھنے کی فکر میں تھے کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ اطمینان دلا کر ہمیں خاموش کرنے کی سعی کی کہ اس میں کچھ حصے میرے منشا کے خلاف ترجمہ ہو گئے ہیں، عنقریب ان کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں آپ انتظار کریں"، المؤمن غر کریم (مسلمان شریف اور بھولا بھالا ہوا کرتا ہے) ہم خاموش ہو کر چشم براہ تھے کہ کب اس کی وضاحت ہوتی ہے، ہم نے سوچا کہ مصداق در دکفی ارادہ المؤمن [illegible]، خود ڈاکٹر صاحب اپنی غلطیوں اور خامیوں کی تردید فرما دیں تو اچھا ہے لیکن ہمیں معلوم ہوا کہ دوسری طرف ڈاکٹر صاحب اپنے حلقۂ احباب و رفقاء کو یہ یقین دلاتے تھے مولوی صاحبان سب خاموش ہیں فانا للہ۔

آخر مجبور ہو کر اور بسم اللہ کہہ کر ہم نے مقالہ "تصورِ سنت و تحریکِ حدیث" پر قلم اٹھانا چاہا تھا کہ [illegible] میں ایک نیا "شگوفہ" سامنے آیا عنوان [illegible] قرآن کی ابدیت

لیکن مضمون کا ماحصل ہے "قرآن کی عدم ابدیت" ع برعکس نام زنگی نہند کافور مثل مشہور ہے۔
ارشاد ہوتا ہے:-

درحقیقت ابدیت ان علل و غایات کو حاصل ہے جو قرآنی احکام کی تہ میں ہیں اور جو ہمیشہ قرآن سے صراحۃً یا کنایۃً یا سیاقاً اخذ کئے جا سکتے ہیں فرمائیے اب پرویز صاحب اور ڈاکٹر صاحب میں کیا فرق رہا؟ پھر یہ باہمی "جنگ زرگری" کیوں ہے؟

بطور مثال زکوٰۃ کو مالی ٹیکس اور نصابِ شہادت میں عورت کو مرد کے مساوی قرار دے کر ڈاکٹر صاحب قرآن کی قطعی نصوص میں ترمیم فرماتے اور اس کو عین منشاءِ قرآن بتلاتے ہیں، پرویز صاحب نماز روزہ کو اسی لائن میں شمار کر چکے یعنی ترمیم و تنسیخ کا تختۂ مشق بنا چکے ہیں آخر در تشابہت قلوبہم قاتلہم اللہ أنی یؤفکون کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہوگی۔

گویا اللہ تعالیٰ نے یہ احکام نازل فرمانے کے وقت ان حضرات کو مشورہ میں شریک کر لیا تھا اور اپنا منشاء بتلا دیا تھا کہ ان احکام کی علت غائی و منفعت یہ ہے نیز ان احکام کی یہ شکل ظاہری صورت ہے ان کی روح وہ ہوگی جو تم بیان کروگے، نیز یہ ہنگامی اور وقتی احکام ہیں، اس عبوری دور کے لئے ہیں، آگے چل کر ہر دور میں عصری تقاضوں کے مطابق ان کی تعبیر و تشریح کا تمہیں اختیار ہے۔ علت و غایت کو سامنے رکھ کر مصالحِ وقت اور ظروف و احوال کے مقتضیٰ کے مطابق ان میں ترمیم و تنسیخ ہوتی رہیگی، العیاذ باللہ استغفر اللہ العظیم

کیا قرامطہ اور باطنیہ نے اپنے اپنے دور میں بھی کچھ نہیں کہا تھا اور بھی کچھ نہیں کیا تھا؟
اس ماءِ مہین سے پیدا شدہ مخلوق کی یہ پرواز ع نفو بر تو اے چرخ گرداں نفو۔ عالم الغیب اور احکم الحاکمین کے علم و حکمت کو اپنے مایہ و کم بضاعت عقل کے پیمانے سے ناپتا ہے بالنصوصِ صریحہ قرآن کی علل و غایات کی خود تعیین کرتا ہے اور ان کو قطعی اور ابدی قرار دے کر صریح نصوص و احکام خداوندی پر خط ترمیم و تنسیخ کھینچتا ہے اور اس پر طرہ یہ ہے کہ اسی کو عین منشاءُ الٰہی بتلاتا ہے ع بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است، کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔

یہ عقل و خرد کے فقیر تو اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے اور اس کا علم تمام

کائنات پر محیط ہے ازل سے ابد تک کے انسانی تقاضے اور بدلتے ہوئے حالات وظروف سب اس کے سامنے ہیں پھر وہی خالق ہے وہی مدبر مخلوق کی گوناگوں اور متنوع و متجدد حاجات وضروریات کو اس سے زیادہ کون جان سکتا ہے اور اس سے بہتر ان کی تدبیر کون کر سکتا ہے؟ قدرت بھی اس کی کامل ہے، اختیار بھی تام ہے جب مصلحت تدبیر و تصرف سے بھی کوئی مانع نہیں، ان حقائق پر ایمان رکھنے کے بعد کیسے کوئی جرأت کر سکتا ہے کہ ان نصوص صریحہ پر بدلے ہوئے حالات وظروف کا نام لے کر خطِ تنسیخ پھیرے اور ساتھ ہی ان کی علل و غایات پر عمل کرنے کا مدعی بلکہ علمبردار بھی ہو؟

اور پھر یہ ظروف و احوال اور ان پر مبنی علل و غایات تو ہمیشہ بدلتی رہیں گی، آج پرویز صاحب اور ڈاکٹر صاحب نے یہ علت و غایت بتلائی ہے کل کوئی اور نئے پرویز اور جدید ڈاکٹر صاحب اور کوئی علت و غایت بتلائیں گے، اس کا لازمی نتیجہ یہ نہ ہوگا کہ آیاتِ قرآنیہ اور نصوصِ ربانیہ "بازیچۂ اطفال" بن کر رہ جائیں گی؟

یہ علم و بصیرت سے تہی دامن مساکین اتنا بھی نہیں جانتے کہ نماز روزہ، زکاۃ اور حج خالص عبادات ہیں، بذاتِ خود مطلوب ہیں، اصل مقصد اللہ جلَّ ذِکرُہ کی عبادت و عبودیت ہے، یہی اصل روحِ عبادت ہے اور یہی ان احکام کی علت و غایت ہے، شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کی جو صورت اللہ تعالیٰ کے حکم سے مقرر فرما دی ہے اس میں سرمو ترمیم و تنسیخ اور تغیر و تبدل کی مطلق مجال نہیں، عبد (بندہ) کا کام معبود کی اطاعت و فرماں برداری ہے، بندہ کو جس طرح حکم ملا ہے آقا کی اطاعت ہو بہو اسی طرح کرنی ہو گی بندہ اس کی علت و غایت سمجھنے کا نہ مامور ہے نہ مکلف، نہ اس کی عقل کی رسائی وہاں تک ممکن ہے نہ ہی وہ اس کا مجاز ہے کہ اس کے مماثل یا اس سے بہتر کوئی اور صورت اپنی عقل و فہم سے تجویز کرے۔

یاد رکھیے کسی عبادت کا قلب و قالب جسم و روح ظاہر و صورت و معنی سب حضرت حق جل وعلا کی طرف سے تجویز و متعین کر دیے گئے ہیں، ان جاہلوں کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ علت کسے کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے افعال معلل بالاغراض ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں؟ اور جن کو یہ علت کہہ رہے ہیں وہ علت ہیں بھی یا نہیں؟ زیادہ سے زیادہ ان کو حکمت و منفعت کہا جا سکتا ہے اور حکمت و منفعت بھی وہ

جس کو انسان اپنی عقلِ نارسا سے دریافت کر سکا ہے۔

نماز اللہ تعالیٰ کی ایک عبادت ہے یہی اس کی علتِ غائیہ ہے، نہ یہ کہ "نماز نظم وضبط کا عادی بنانے کے لئے ایک ورزش و ریاضت ہے" لہٰذا انسان کو حق حاصل ہے کہ جب چاہے اور جس طرح چاہے اور ہر دور میں جو وقت کا تقاضا ہو اس کے مطابق اس کی صورت تبدیل کرے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس عبادت میں یہ منفعت بھی رکھ دی گئی ہے جو انسان نے اپنی عقل کے مطابق سمجھی ہے۔

اسی طرح روزہ اللہ تعالیٰ کی ایک بدنی عبادت ہے، مخصوص زمانہ میں معیّن وقت تک کے لئے ان مفطرات و مفسدات سے انسان کو منع کر دیا جاتا ہے جو اس کے طبعی تقاضے ہیں، اسی پابندی میں اس کی آزمائش ہے اور یہی مطلوب ہے اور یہی روزہ کی علت غائیہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر بالارادہ اور عمداً ایک ماشہ کی مقدار بھی کوئی چیز کھالی تو روزہ ٹوٹ گیا اور وہ شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو گیا، کفارہ بھی لازم آئے گا اور توبہ بھی کرنی ہوگی تب جا کر اس جرم کی اخروی سزا جہنم سے بچنے کی توقع ہو سکتی ہے، یہ سب کچھ کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ اس نے عمداً خدا کی نافرمانی کا ارتکاب کیا ہے اور اگر بھول چوک سے پیٹ بھر کر بھی کھالے گا روزہ نہیں ٹوٹے گا اور یہ شخص روزہ دار رہے گا صرف اس لئے کہ اس نے عمداً خدا کی نافرمانی نہیں کی اور یہ جو شکم سیر ہو کر کھایا ہے یہ منجانب اللہ ضیافت خاصہ اور رحمت الٰہیہ تصور کی جائے گی جبکہ پہلی صورت میں ایک ماشہ غذا بھی اللہ کے غضب کا موجب تھی، یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ مدار فرماں برداری اور نافرمانی ہے نہ کوئی مصلحت پیش نظر ہے نہ کوئی علت معتبر ہے۔

اسی طرح زکاۃ اللہ جل شانہ کی ایک "مالی" عبادت ہے اس کی شرح نصاب اور اموالِ زکاۃ خود شارع علیہ الصلاۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے مقرر فرما دئیے ہیں مصارفِ زکاۃ اور مستحقین بھی متعین کر دیئے ہیں، اس کی علت محض عبادت اور تعمیل حکم ہے اور بس یہ کہ اس سے فقراء کی حاجات پوری ہوتی ہیں، یہ اس امت پر محض اللہ تعالیٰ کی رحمت و مکرمت ہے ورنہ امم سابقہ میں زکاۃ اور صدقات سے انتفاع قطعاً ممنوع تھا، اس کو منفعت و حکمت تو کہہ سکتے ہیں، علت ہرگز نہیں کہا

جا سکتا۔ بہر حال زکاۃ محض ایک عبادت ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان لوگوں سے جنہوں نے زکاۃ کو ایک مالی ٹیکس سمجھ کر ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا جہاد کرنے کا حکم دے دیا اور فرمایا "جو شخص بھی نماز اور زکاۃ میں تفریق کرے گا یعنی نماز کو تو عبادت سمجھے گا اور زکوٰۃ کو عبادت نہ سمجھے گا تو میں اس سے ضرور جنگ کروں گا۔" فاروقِ اعظمؓ نے پہلے تو کچھ مخالفت کی لیکن جلد ہی حقیقتِ حال سمجھ کر حضرت ابو بکر صدیقؓ سے اتفاق کر لیا اور مانعینِ زکاۃ سے قتال اور جنگ کرنے پر تمام صحابہ کا اتفاق اور اجماع ہو گیا۔ اگر زکاۃ کی علت صرف حکومتی ٹیکس ادا کرنا تھا تو وہ تو کہتے تھے کہ "آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو ہمارے قبائلی سردار اور حکمران ہوں گے ہم ان کو زکاۃ ادا کریں گے" علاوہ ازیں تیرہ سو سال سے اُمت برابر زکاۃ وصدقات کو ایک مالی عبادت سمجھ کر شریعت کے مقرر کردہ طریق پر ادا کرتی چلی آرہی ہے اگر یہ مالی ٹیکس ہوتا تو ظاہر ہے کہ ہر حکومت اپنے اپنے عہد میں اپنی صوابدید کے مطابق اس کی شرح مقرر کرتی اور حسبِ مصلحت اپنی ضروریات اور سرکاری مصارف میں صرف کرتی، نہ شرح زکاۃ محدود و متعین ہوتی اور نہ مصارف و مستحقین کی تحدید و تعیین ہوتی لیکن آج تک پورے اسلامی دور میں دنیا کے تمام ممالکِ اسلامیہ میں کسی بھی حکومت و حکمران بلکہ کسی بھی مدعیٔ اسلام نے یہ جرأت نہیں کی کہ زکاۃ کو ایک مالی ٹیکس کہہ کر اس کی شرح یا اموالِ زکاۃ میں تغیر و تبدل کا نام تک لے بلکہ حاکم و محکوم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر فرمودہ اموال میں سے مقررہ شرح کے مطابق اغنیاء سے زکاۃ لیتے اور فقراء کو دیتے چلے آتے ہیں۔

کیا موجودہ حکومتوں کا پیٹ دورِ حاضر کے ان جان گسل اور خون آشام گوناگوں ٹیکسوں سے نہیں بھرتا جن کے بارِ گراں سے قومیں کراہ رہی ہیں اور ان کی صلاحیتیں اور اہلیتیں ختم اور فنا ہو رہی ہیں اور اس ظلم و جور سے بچنے کے لئے غیر قانونی تدبیروں کے اختیار کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ کسی طرح ان ٹیکسوں کی گراں بار شرح سے بچ سکیں اور مضطرانہ جد و جہد میں ضمیر، دین و دیانت اور اخلاق کی حدود سے تجاوز کر کے تباہ ہو رہے ہیں، کیا یہ کافی نہیں ہے کہ اب زکاۃ و صدقات جو محض فقراء اور یتامیٰ کے لئے اللہ تعالیٰ نے حلال کئے ہیں ان کو بھی ٹیکس قرار دے

کرشرح بڑھانے اور من مانے طریق پر خرچ کرنے کی غرض سے اپنے ایجنٹوں سے فتوے حاصل کر کے ضروریاتِ دین میں تاویل و تحریف کی جا رہی ہے تاکہ حکمرانوں اور ارکین و افسران حکومت کی ہوس رانیوں اور غیر اخلاقی عیش کوشیوں کی تکمیل اور حرص و آز کے جہنم کو بھرنے کا سامان کیا جائے۔

فإنّا لله وإنّا إليه راجعون۔

اسی طرح حج اللہ جل جلالہ کی ایک مخصوص عبادت ہے، اللہ تعالیٰ کی تجلیاتِ خاصہ کے مرکزِ قدیم "بیت اللہ" کی عاشقانہ زیارت اور مشتاقانہ طواف وسعی، برکات وسعادت اور رحمت و رضوان الٰہی کے خصوصی روحانی فیوض کے حصول کا ذریعہ ہیں ان مشاہدِ مقدسہ میں حاضری اور اس طرز کی والہانہ عبادات دلوں کے تزکیہ، روحوں کے تجلیہ اور ورع و تقویٰ کے حصول کے وسائل اور عبدیت کے کامل ترین مظاہر ہیں اور یہی اظہارِ عبدیت حج کی علتِ غائیہ ہے، یہ دوسری بات ہے کہ اس کے ذریعہ اور دوسرے انفرادی و اجتماعی فوائد و منافع بھی حاصل ہو جاتے ہیں، ایک مقدس خطۂ زمین پر ہر سال تمام ممالکِ اسلامیہ و غیر اسلامیہ کے مسلمانوں کا اجتماع ہوتا ہے، اس بے مثل عظیم اجتماع سے گوناگوں دنیاوی منافع بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ کہنا کہ "اسلام میں حج درحقیقت ان عرب اور غیر عرب اقوام کی جو بیت اللہ کی عظمت کی قائل ہیں ایک سالانہ کانفرنس" کے طور پر مقرر کیا گیا ہے اور یہی اسلامیانِ عالم کا سالانہ اجتماع حج کی علتِ غائیہ ہے۔" صریح کفر ہے العیاذ باللہ۔ قرآنِ حکیم تو تمام نوعِ انسانی کو خطاب کر کے اعلان کر رہا ہے:۔

«وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۝» — لوگوں پر محض اللہ کے لئے بیت اللہ کا حج فرض ہے جو سفر کرنے کی قدرت رکھتے ہوں۔

اور اللہ جل شانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم فرما رہے ہیں:۔

«وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ» — اے ابراہیم، تم لوگوں میں حج کا اعلان تو کر دو، لوگ پا پیادہ اور ہر نحیف و لاغر اونٹنی پر سوار دور دراز وادیوں کے سفر طے کر کے ضرور آئیں گے۔

اسی لئے اس مقدس ترین عبادت کو ملتِ ابراہیمی اور دینِ محمدی کے شعائر میں شمار کیا گیا ہے۔

چنانچہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔
اگر باوجود استطاعت کوئی حج نہ کرے تو چاہے وہ یہودی مرے چاہے نصرانی مرے اللہ جل شانہ کو اس کی کوئی پروا نہیں۔
اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے نبی کی تائید میں فرمادیا :۔

«وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ» — اور جو نہ مانے تو اللہ تعالیٰ کو تو تمام جہان والوں کی بھی پرواہ نہیں۔

اگر ان خرد باختہ ملحدوں کے قول کے مطابق حج صرف "مسلمانانِ عالم کی ایک سالانہ کانفرنس" ہوتی تو حکومتوں کو اختیار ہوتا جہاں چاہتیں یہ اجتماع کراتیں پھر اس وادیٔ غیر ذی زرع کی کیا ضرورت تھی اور کیوں پابندی ہوتی کہیں وادی کشمیر یا سوئٹزرلینڈ جیسی سرزمین میں اس کا انعقاد ہوا کرتا۔

أستغفر الله العلي العظيم۔

پس واضح اور قطعی طور پر سمجھ لیجئے کہ "نماز عبادت ہے" ورزش ہرگز نہیں "روزہ عبادت ہے" حفظانِ صحت کی تدبیر ہرگز نہیں۔ "زکاۃ عبادت ہے" مالی ٹیکس ہرگز نہیں "حج عبادت ہے" سالانہ کانفرنس ہرگز نہیں، ان چار عبادتوں پر دین اسلام کی عمارت اسی طرح قائم ہے جیسے کلمۂ شہادت پر اور یہ پانچوں "بناء" اسلام کے اساسی ارکان ہیں، خاتم انبیاء سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلان ہے :۔

بني الإسلام على خمس :۔ (۱) شهادة أن لا إله إلا الله وأن محمداً رسول الله (۲) وإقام الصلاة (۳) وإيتاء الزكاة (۴) وصوم رمضان۔ (۵) وحج البيت :۔

اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی (۱) اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت (۲)، نماز قائم کرنا (۳)، زکاۃ کو ادا کرنا۔ (۴)، رمضان کے روزے رکھنا (۵)، بیت اللہ کا حج کرنا۔

جس طرح کلمۂ شہادت یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے، ٹھیک اسی طرح نماز روزہ، زکاۃ اور حج، بعینہٖ اس متواتر شرعی صورت میں جس پر امّت چودہ سو سال سے عمل کرتی چلی آرہی ہے کی فرضیت پر ایمان لانا بھی فرض ہے۔ اور ان کو اللہ تعالیٰ کی عباداتِ عظمیٰ سمجھنا بھی فرض ہے، ان عباداتِ محضہ کو اللہ تعالیٰ کی محض

عبادت نہ سمجھنا بھی کفر ہے جس طرح سرے سے ان کا انکار کرنا کفر ہے، یہی حکم ان تمام نصوصِ قطعیہ" اور "ضروریاتِ دین" کا ہے جن پر چودہ سو سال سے امت کا اجماع ہے اور علی التواتر امت ان کو مانتی اور ان پر عمل کرتی چلی آ رہی ہے، یہ دین کے وہ قطعی احکام ہیں جن میں انکار اور تاویل دونوں کفر ہیں جیس طرح نماز کو ورزش کہنا کفر ہے، حج کو کانفرنس کہنا کفر ہے، ٹھیک اسی طرح زکاۃ کو ٹیکس کہنا، اور ایک عورت کی شہادت کو ایک مرد کے برابر کہنا بھی کفر ہے۔

افسوس ہے کہ ان ڈاکٹروں اور ڈائرکٹروں کو نہ تو علماءِ دین سے علمِ دین حاصل کرنا نصیب ہوا اور نہ صالحین ومتقین کی صحبت نصیب ہوئی، علم دین اگر سیکھا تو یوربین معلمین اور مستشرقین سے اور وہ بھی دارالکفر اور کافرانہ ماحول میں اور صحبت نصیب بھی ہوئی تو کافروں اور اعداءِ ایمان واسلام کی، اور اعدا بھی ایسے شاطر اور فرزانہ جو دشمنی کریں دوستی کی شکل میں، ان عوامل ومحرکات کے نرغہ میں دارالکفر کی معاشرت اور کفار کی صحبت کے اثرات سے اسلامی فطرت کا مسخ ہو جانا لازمی اور لابدی امر ہے، سچ فرمایا اصدق القائلین صلی اللہ علیہ وسلم نے :

((کل مولود یولد علی الفطرۃ، فأبواہ یھودانہ أو ینصرانہ أو یمجسانہ))	ہر بچہ فطرت (سلیمہ) پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں ۔

اور یہ تو ہمارا حسن ظن ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ نیت ہی فاسد ہو چکی ہے، صرف علوم دینیہ سے جہل ہی نہیں ہے بلکہ عمداً دین میں تاویلیں اور تحریفیں کر کے اس کی بیخ کنی کا بیڑہ اٹھا چکے ہیں، ایمان ودیانت کے متاعِ گراں مایہ کی نعمت ہی سے محروم ہو چکے ہیں۔

چونکہ عوام میں ہر دلعزیزی مطلوب ہے، اس لئے کہ مسلمان بن کر اسلام کی جڑیں کھوکھلی کرنا چاہتے ہیں اور قرآن وحدیث کا نام لئے بغیر رائے عامہ کو اپنے لئے ہموار نہیں کر سکتے، اسلامی معاشرہ میں اسلامی ملک میں صاف وصریح نصوصِ قرآنیہ کا انکار کرنے کی جرأت وہمت نہیں ہے، اس لئے چور دروازہ سے داخل ہو کر اور "ابدیتِ قرآن" کا نعرہ لگا کر تاویلات وتحریفات کی راہ سے نصوصِ قرآن کی ابدیت کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں، درحقیقت یہ جدید ملاحدہ خواہ مستشرقین ہوں خواہ ان کے چیلے مستغربین ان سب کی کوشش یہی رہی کہ الحاد فی الدین اور تحریفِ دین

کے نت نئے طریقے نکالیں اور ضروریاتِ دین میں تشکیک وارتیاب کی راہ سے ارکانِ دین و ایمان کی عظمت و عقیدت مسلمانوں کے دلوں سے ختم کریں اور اس پر فریب طریق پر اسلام اور مسلمانوں سے انتقام لے کر اپنے دلوں کو ٹھنڈا کریں، اس لئے ہم مجبور ہیں کہ اس پوشیدہ و پنہاں الحاد و زندقہ کا تار و پود بکھیر دیں اور ان مدعیانِ علم و عقل کے سامنے ان کے علم و عقل کا "آئینہ" رکھ دیں کہ دیکھو اس میں اپنے جہل کی مکروہ و قابلِ نفرین صورت۔

وباللہ التوفیق وسیعلم الذین ظلموا أی منقلب ینقلبون۔

دسمبر ۱۹۶۴ء، رجب ۱۳۸۴ھ

"بینات" کے گذشتہ شمارے میں ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب ڈائرکٹر "مرکزی ادارہ تحقیقاتِ اسلامی" کی بعض آراء پر تبصرہ کیا گیا تھا کہ زکاۃ مالی عبادت ہے حکومت کا ٹیکس نہیں "عبادت" کی کمیت و کیفیت کی تحدید سے عقلِ انسانی قاصر ہے، زیادہ سے زیادہ بعض نکات یا بعض جہات یا بعض منافع تک رسائی ہو جاتی ہے لیکن وہ بھی حرفِ آخر نہیں ہو سکتا، اس سلسلہ میں مزید تنبیہ کی ضرورت ابھی باقی ہے۔

یہ بات تو صاف ہو گئی تھی کہ زکاۃ حکومت کے مصارف پورے کرنے کے لئے نہیں بلکہ فقراء و مساکین کی حاجت روائی کا ذریعہ ہے، ممکن ہے کسی کو یہ خیال گذرے کہ اب موجودہ شرح اڑھائی فیصد اس مقصد کے لئے کافی نہیں ہوگی اس لئے یہ بات پیشِ نظر رہے کہ زکاۃ صرف آمدنی پر نہیں بلکہ سرمایہ پر واجب ہے، اس حیثیت سے اموال کی شرح بہت بڑھ جاتی ہے مثلاً پاکستانی بینکوں کے پاس تین ارب سرمایہ ہے جس سے وہ کاروبار چلا رہے ہیں اب تین ارب کے مالکوں کو تین ارب ہی کی زکاۃ نکالنی ہوگی نہ یہ کہ جو آمدنی مالکان کو ہوگی صرف اس کی زکاۃ نکالنی ہوگی، پھر کارخانوں میں تیار شدہ اربوں کا مال تجارت جو جمع ہوگا اس سب پر زکاۃ ہوگی نہ صرف یہ کہ کارخانوں سے جو فروخت شدہ مال کی رقم ہے صرف اس پر زکاۃ واجب ہوگی، پھر شخصی طور پر گھروں میں تجوریوں میں مضاربت، شرکت وغیرہ کے ذریعہ جہاں بھی جو سرمایہ لگا ہوگا اس سب پر زکاۃ آئے گی، پھر گھروں میں جو زیورات کی شکل میں یا سونے چاندی کے برتنوں کی صورت میں جو سرمایہ ہوگا اس سب کی زکاۃ دینی ہوگی، مثلاً اگر قوم کی سالانہ آمدنی ایک ارب روپیہ ہے تو زکاۃ اڑھائی کروڑ

ہو گی لیکن کل سرمایہ جو بینکوں میں جمع ہے یا کارخانوں میں بشکل مالی تجارت موجود ہے یا دکانوں میں جو مال موجود ہے یا گھر میں زیورات ہیں ان سب کی جتنی مالیت ہے اس سب پر زکوٰۃ واجب ہو گی، دیکھئے اس طرح سرمایہ اور آمدنی کے تناسب میں کتنا بڑا تفاوت ہو گیا، اگر آمدنی ایک ارب ہے تو سرمایہ دس ارب ہو گا اور دس ارب کی زکاۃ پچیس کروڑ ہو گی اس لئے یہ بالکل یقینی امر ہے کہ اگر صحیح شرعی طریقے سے زکاۃ ادا کی جائے تو ناممکن ہے کہ دنیا میں فقیر کا نام بھی باقی رہے اس لئے جب زکاۃ کے بارے میں یہ خیال آئے کہ شاید اس زمانے میں یہ شرح کافی نہ ہو گی تو اس وقت فوق الذکر مدّات اور ان کے فرق کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے، پھر زکاۃ جو فقراء کا حق ہے وہ صرف نقد سرمایہ اور اموال تجارت ہی میں محدود نہیں ہے بلکہ زرعی پیداوار کی آمدنی میں بھی عشر یا نصف عشر (دسواں یا بیسواں) حصہ ادا کیا جاتا ہے، ان سب کو ملا کر زکاۃ کی شرح ممکن ہے کہ کروڑوں سے متجاوز ہو کر اربوں کو پہنچ جائے، اس لئے اسلام نے جو شرح مقرر فرمائی ہے وہ ہر دور میں کافی ہے اور اس طرح یہ صالح ترین نظام ہر دور میں جامع ترین نظام رہے گا، سرمایہ و دولت میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے ملکیت تبدیل ہوتی رہتی ہے لیکن تبدیلِ ملکیت سے زکاۃ پر اثر نہیں پڑتا، تعجب تو اس پر ہے کہ یہ حضرات جن کا فن ہے کہ ان حقائق پر غور کریں وہ ایسی سطحی باتیں کیسے کرتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دین کی عداوت میں عقلی صلاحیتیں بھی جواب دے چکی ہیں، اللہ تعالےٰ مسلمانوں پر رحم فرمائے اور اربابِ انصاف کو حق سمجھنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

شعبان ۱۳۸۴ھ، جنوری ۱۹۶۵ء

عصرِ حاضر کے جدید مسائل اور علماء کے فرائض

"بینات" ۱۳۹۰ھ ج ۲ میں عصرِ حاضر کے مسائل کے بارے میں کچھ عرض کیا تھا کہ عہدِ حاضر کے علماءِ امت کے ذمہ جو اہم فریضہ عائد ہوتا ہے وہ جدید مسائل کی عقدہ کشائی ہے غنیمت ہے ابھی تک خال خال علم فقہ کے علماء و ماہرین کچھ موجود ہیں، ضرورت ہے کہ ان کی حیات میں جدید مسائل کا حل تلاش کر لیا جائے تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں اس بارِ گراں سے سبکدوش ہوں اور حدیثِ نبوی "اتخذ الناس رؤساجهالا فافتوا بغير علم فضلوا وأضلوا" (ایسا زمانہ آئے گا کہ جاہل اربابِ فتوی ہوں گے بغیر علم کے فتوے صادر کریں گے خود بھی گمراہ ہوں گے اوروں کو بھی گمراہ بنائیں گے) کے مصداق نہ بنیں، جس وقت یہ خیال آیا تھا اور "بینات" میں علماءِ امت کے سامنے لمحۂ فکریہ پیش کیا تھا ٹھیک اسی وقت ہندوستان کے اربابِ علم وفضل کے حلقہ میں بھی یہی موضوع زیرِ بحث تھا چنانچہ "مجلس تحقیقاتِ شرعیہ" کے نام سے ندوۃ العلماء میں ایک علمی مجلس کی تشکیل وجود میں آچکی ہے اور کام بھی شروع ہو گیا ہے اس لئے شعبۂ تصنیف وتالیف نے ان سے بھی رابطہ قائم کر لیا ہے۔ انشورنس (بیمہ) کے مسائل سے مجلس نے افتتاح کیا ہے اور ایک سوالنامہ شائع کیا ہے، سوالنامے سے قبل بطورِ تمہید بیمہ کی حقیقت اور اس کی قسمیں تفصیل سے بیان کی ہیں تاکہ علماء کو سوال کی حقیقت سے پوری واقفیت حاصل ہو جائے تاکہ علیٰ وجہ البصیرت اس کی روشنی میں علمی وفقہی مسائل پر غور کر کے حل پیش کر سکیں، ہم ان حضرات کے ممنون ہیں کہ ان کی توجہ سے منقح سوالنامہ سامنے آگیا، اب "بینات" کے پڑھنے والے اہلِ علم حضرات بھی اس مسئلہ کا حل پیش کر سکیں گے، اس لئے تمہید وسوالات دونوں شائع کئے جا رہے ہیں اور جو جواب "بینات" کی طرف سے ہوگا آئندہ شمارہ میں وہ بھی شائع کیا جائے گا۔

واللہ الموفق

سوالنامہ متعلق انشورنس

(۱) **بیمہ کی حقیقت** | بیمہ" انگریزی لفظ" INSURE "(انشور) کا ترجمہ ہے جس کے معنی لغت میں یقین دہانی کے ہیں چونکہ کمپنی بیمہ کرانے والے کو مستقبل کے بعض خطرات سے حفاظت اور نقصانات کی تلافی کی یقین دہانی کر دیتی ہے اس لئے اسے انشورنس کمپنی کہتے ہیں ، یہ ایک معاملہ ہے جو بیمہ کے طالب اور بیمہ کمپنی کے درمیان ہوتا ہے اور اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ بیمہ کمپنی (جس میں بہت سے سرمایہ دار شریک ہوتے ہیں اسی طرح جس طرح تجارتی کمپنیاں ہوتی ہیں) بیمہ کے طالب سے ایک معینہ رقم بالاقساط وصول کرتی رہتی ہے اور ایک معینہ مدت کے بعد وہ رقم اسے یا اس کے پسماندگان کو (حسب شرائط) واپس کر دیتی ہے اس کے ساتھ ایک مقررہ شرح فی صد کے حساب سے اصل رقم کے ساتھ کچھ مزید رقم بطور سود دیتی ہے گو اس رقم کا نام ان کی اصطلاح میں ربا یا سود نہیں بلکہ بونس یعنی منافع ہے۔

(۲) کمپنی کا مقصد اس رقم کے جمع کرنے سے یہ ہوتا ہے کہ اسے دوسرے لوگوں کو بطور قرض دے کر ان سے اعلیٰ شرح پر سود حاصل کرے یا کسی تجارت میں لگا کر یا کوئی جائداد خرید کر اس سے منافع حاصل کرے، اس کے شرکاء اپنی ذاتی رقم خرچ کئے بغیر کثیر رقم بصورت سود یا منافع حاصل کرتے رہتے ہیں اور اسی سود یا منافع میں سے بیمہ دار کو ایک حصہ دیتے ہیں۔

ممکن ہے کسی درجہ میں ان لوگوں کا مقصد مصیبت زدہ یا پریشان حال افراد کی امداد بھی ہوتا ہو لیکن اصل مقصد وہی ہوتا ہے جو اوپر عرض کیا گیا ہے مگر اس کی بحث بے ضرورت ہے، اس لئے کہ نفس مسألہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا، بیمہ کرانے والے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کا سرمایہ محفوظ رہے اور اس میں اضافہ بھی ہوتا رہے ؛ اس کے علاوہ اس کے پسماندگان کو امداد و رعایت حاصل ہو یا ناگہانی حادثات کی صورت میں اس کے نقصان کی تلافی ہو جائے۔

(۳) **بیمہ کی تین قسمیں ہیں** :-

(الف) زندگی کا بیمہ (ب) املاک کا بیمہ (ج) ذمہ داری کا بیمہ۔

(الف) **زندگی کا بیمہ** | اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ بیمہ کمپنی اپنے ڈاکٹر کے ذریعہ سے بیمہ کے طالب کا معائنہ کراتی ہے اور ڈاکٹر اس کی جسمانی حالت دیکھ کر اندازہ کرتا ہے کہ اگر کوئی ناگہانی آفت پیش نہ آئی

تو یہ شخص اتنے سال مثلاً بیس سال زندہ رہ سکتا ہے، ڈاکٹر کی رپورٹ پر کمپنی بیس سال کے لئے اس کی زندگی کا بیمہ کر لیتی ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بیمہ کے لئے ایک رقم مابین طالب و کمپنی مقرر ہو جاتی ہے جو بالاقساط بیمہ دار کمپنی کو ادا کرتا ہے اور ایک معینہ مدت میں جب وہ پوری رقم ادا کر دیتا ہے تو بیمہ مکمل ہو جاتا ہے اب اس کے بعد اگر بیمہ دار اتنی مدت کے بعد انتقال کر جاتا ہے جس کا اندازہ کمپنی کے ڈاکٹر نے کیا تھا تو کمپنی اس کے پسماندگان میں سے جسے وہ نامزد کر دے یا اگر نامزد نہ کرے تو اس کے قانونی ورثاء کو وہ جمع شدہ رقم مع مزید رقم کے جس کو بونس (BONUS) کہتے ہیں یکمشت ادا کرتی ہے۔

اور اگر وہ مدت مذکورہ سے پہلے مر جائے خواہ طبعی موت سے یا کسی حادثے وغیرہ سے تو بھی کمپنی اس کے پسماندگان کو حسبِ تفصیل مذکورہ پوری رقم مع کچھ زائد رقم کے ادا کرتی ہے، گو اس صورت میں شرحِ منافع زائد ہوتی ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ وہ شخص مدت مذکورہ کے بعد بھی زندہ رہے، اس شکل میں بھی اسے رقم مع منافع واپس ملتی ہے مگر شرح منافع کم ہوتی ہے، زندگی کا بیمہ تو پورے جسم کا بیمہ ہے، لیکن اب تو انفرادی طور پر مختلف اعضاء کے بیمہ کا رواج بھی بکثرت ہو گیا ہے مثلاً ہاتھوں کا بیمہ، سر کا بیمہ، ٹانگوں کا بیمہ وغیرہ اس کی شکل بھی وہی ہوتی ہے، فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ ان شکلوں میں ڈاکٹر کسی ایک عضو کی زندگی یا کارکردگی کا اندازہ لگاتا ہے اس کے اندازہ پر بقیہ معاملہ اسی طرح ہوتا ہے جس طرح زندگی کے بیمہ کی صورت میں اور واپسی رقم مع منافع کی شکلیں وہی تین ہیں البتہ یہاں پورے جسم کی مدت کے قائم مقام صرف ایک حصہ جسم کی صحت یا اس کے ناکارہ ہونے کو قرار دیا جاتا ہے۔

(ب) **املاک کا بیمہ** عمارت، کارخانہ، موٹر جہاز وغیرہ ہر چیز کے بیمہ کا رواج اب عام ہو گیا ہے اس کی شکل بھی وہی ہوتی ہے یعنی بیمہ دار ایک معینہ مدت کے لئے ایک رقم بالاقساط ادا کرتا ہے اور کمپنی ایک مدت کے بعد اسے وہ رقم مع کچھ زائد رقم کے واپس کرتی ہے اور اگر کسی حادثہ کی وجہ سے بیمہ شدہ املاک تلف ہو جائے مثلاً کارخانہ میں آگ لگ جائے یا جہاز غرق ہو جائے یا موٹر کسی حادثہ میں ٹوٹ جائے تو کمپنی اس نقصان کی تلافی کرتی ہے اور اس رقم کے ساتھ کچھ مزید رقم زیادہ شرح فیصد کے حساب سے بیمہ کرانے والے کو دیتی ہے۔

(ج) **ذمہ داریوں کا بیمہ** | نا سمجھ بچے کی تعلیم، شادی وغیرہ کا بیمہ بھی ہوتا ہے کمپنی ان کاموں کی ذمہ دار ہوتی ہے، رقم وغیرہ کی ادائیگی اور وصولی کی صورتیں وہی ہوتی ہیں۔

(۴) بیمہ کرانے والے کو ایک معینہ رقم بصورت اقساط ادا کرنی پڑتی ہے لیکن اگر بیمہ دار (حسب قواعد و شرائط) کچھ اقساط ادا کرنے کے بعد مزید رقم کی ادائیگی بند کر دے تو اس کی ادا کی ہوئی رقم سوخت ہو جاتی ہے اور واپس نہیں ملتی لیکن اسے اختیار ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے درمیان کے بقایا اقساط ادا کر کے حسبِ سابق اقساط جاری کرائے، بقایا اقساط نہ ادا کرنے کی صورت میں بھی بعض قواعد کے ماتحت اقساط کا سلسلہ دوبارہ جاری ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ سلسلہ منقطع کر کے جمع شدہ رقم واپس لینا چاہے تو ایسا نہیں کر سکتا۔

(۵) بیمہ دار اگر سود نہ لینا چاہے تو کمپنی اسے اس پر مجبور نہیں کرتی اور حسبِ شرائط اس کو اصل رقم واپس کر دیتی ہے۔

(۶) بیمہ دار ۲ سال تک قسط ادا کرنے کے بعد کم شرح سود پر قرض لینے کا مجاز ہو جاتا ہے۔

(۷) ہندوستان میں زندگی کے بیمہ کے متعلق حکومت نے ایک قانون بنایا ہے جس کی رو سے بیمہ کی یہ قسم نجی کمپنیوں کے ہاتھ سے نکل کر خود حکومت کے ہاتھ میں آگئی ہے اور اب کسی نجی کمپنی کے بجائے یہ معاملہ بیمہ دار اور حکومت کے درمیان ہوتا ہے، بظاہر حالات سے ایسا نظر آتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد یہ پورا کاروبار نیشنلائز کر لیا جائے گا اور نجی کمپنیاں ختم کر کے حکومت خود یہ معاملہ کرے گی۔

خلاصہ | بیمہ کی یہ مختلف شکلیں ہیں لیکن ان سب کی حیثیت وہی ہے جو سب سے پہلے عرض کی جا چکی ہے یہاں اختصار کے ساتھ مکرر پیش کیا جاتا ہے۔

حقیقت کے لحاظ سے انشورنس کا معاملہ ایک سودی کاروبار ہے جو بینک کے کاروبار کے مثل ہے، دونوں میں جو فرق ہے وہ شکل کا ہے حقیقت کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے حقیقت میں اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ اس میں ربا کے ساتھ "غرر" بھی پایا جاتا ہے۔

بیمہ کرانے والا کمپنی کو روپیہ قرض دیتا ہے اور کمپنی اس رقم سے سودی کاروبار یا تجارت وغیرہ کر کے نفع حاصل کرتی ہے اور اس نفع میں سے بیمہ کرانے والے کو بھی کچھ رقم بطور سود ادا کرتی ہے، جس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس منفعت کے لالچ میں زیادہ سے زیادہ بیمہ کرائیں، بینک

بھی یہی کرتے ہیں البتہ اس میں شرح سود مختلف حالات وشرائط کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہے۔ عموماً ایسا نہیں ہوتا۔

بیمہ کے مصالح اور مفاسد

دنیاوی نقطۂ نظر سے بیمہ پالیسی خریدنے میں کیا مصلحتیں ہیں اور کیا مفاسد ہیں؟ ان کا تذکرہ درج ذیل ہے تاکہ حضرات اہلِ علم ان پر نظر فرما کر فیصلہ فرما سکیں، اس لئے یہاں صرف انہیں دنیاوی مصالح ومفاسد کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو فی نفسہ کسی نہ کسی درجہ میں شرعاً بھی معتد بہ ہیں جو مصالح ومفاسد شرعاً غیر معتد بہ ہیں ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا، مثلاً ایسی دنیاوی مصلحت کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے کہ اس طرح خریدار کو سود ملتا ہے اور اس کی اصل رقم میں بغیر محنت اضافہ ہوتا ہے اس لئے کہ یہ مصلحت شرعاً غیر معتد بہ ہے بلکہ مصلحت کے بجائے مفسدہ ہے اسی طرح اس مفسدہ کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ قلیل آمدنی والے افراد جب پالیسی خریدنے کے لئے کچھ رقم پس انداز کریں گے تو تحسینات میں کمی کرنے پر مجبور ہونگے اور بعض جائز لذتوں سے محروم رہیں گے اس لئے کہ شرعاً یہ مفسدہ غیر معتد بہ ہے۔

مصالح ناگہانی حادثات کی صورت میں بیمہ دار تباہی وبربادی سے بچ جاتا ہے مثلاً:۔

(۱) ہندو مسلم فساد میں بہت سے مسلمانوں کے کارخانے خاکِ سیاہ اور تباہ وبرباد کر دیئے گئے جن لوگوں نے اپنے کارخانوں کا بیمہ کرا لیا تھا وہ تباہی سے بچ گئے اور انہوں نے دوبارہ اپنا کاروبار جاری کر دیا لیکن جنہوں نے اپنے کارخانوں کا بیمہ نہیں کرایا تھا وہ پورے طور پر برباد ہو گئے اور پنپ نہ سکے، دوکانوں اور مکانوں وغیرہ کی بھی یہی کیفیت ہوئی۔

نوٹ:۔ فسادات ہندوستان کا روزمرہ بن چکے ہیں اور ان کا انسداد مسلمانوں کی استطاعت سے باہر ہے۔

(۲) اوسط طبقہ کے افراد جو کثیر العیال بھی ہوں اگر ناگہانی طریقہ سے وفات پا جائیں تو ان کے پسماندگان سخت پریشانی میں پڑتے ہیں، اپنی قلیل آمدنی میں عموماً وہ کوئی رقم پس انداز کر کے نہیں رکھ سکتے جو ان کے پسماندگان کے کام آسکے، ایسی حالت میں اگر وہ بیمہ پالیسی خرید لیں تو ایک طرف تو انہیں پس اندازی میں سہولت ہوتی ہے، دوسرے ان کی ناگہانی وفات پر ان کی پس انداز رقم مع مزید رقم کے ان کے پسماندگان کو مل جاتی ہے جو ان کے لئے بہت مفید اور معاون ہوتی ہے۔

تعلیم وغیرہ کی صورت میں تو یہ مصلحت اور بھی زیادہ نمایاں ہوجاتی ہے اس لئے کہ اگر وہ اپنی اولاد کو مناسب تعلیم دلانے سے قبل وفات پاجائیں تو اولاد کا سلسلۂ تعلیم منقطع نہیں ہوتا اور کسی نہ کسی دن اولاد اس قابل ہوجاتی ہے کہ کچھ کما سکے۔

(۳) اگر اولاد ناہنجار ہو تو باپ کے مرنے کے بعد ماں کی طرف سے غفلت برتتی ہے اور اس کا شرعی حق نظر انداز کرکے باپ کی کل جائیداد واملاک پر قابض ہوجاتی ہے۔

اگر شوہر بیمہ کی پالیسی خرید کر اپنی بیوی کو اس کا وارث قرار دے دے تو یہ رقم بیوہ کو بے خرخشہ مل جاتی ہے۔

اگر اولاد کے درمیان تحاسد وتباغض ہو یا بعض بچے چھوٹے ہوں اور دوسری اولاد سے خطرہ ہو کہ ان کے حقوق کو غصب کرلیں گے تو بھی ان کے نام سے بیمہ پالیسی خرید لینا مفید ہوسکتا ہے۔

(۴) چونکہ کمپنیاں عموماً اہلِ ہنود کی ہیں اس لئے بیمہ پالیسی خریدنا فسادیوں کی تباہ کاریوں کو روکنے کا بھی ایک ذریعہ ہوسکتا ہے اس لئے کہ فسادی یہ معلوم کرکے کہ مسلمان کی بیمہ شدہ مملوکہ شئی کو نقصان پہنچانا خود ہندؤوں کو نقصان پہنچانا ہے۔ شاید اس نقصان پہنچانے سے باز رہیں، اس طرح ممکن ہے کہ کسی درجہ میں یہ حفاظت جان کا ذریعہ بھی بن جائے۔

نوٹ:۔ اب سے دو چار صدی پیشتر مسلمانوں کے حالات مختلف تھے اول تو ناگہانی حادثات کی اتنی کثرت نہیں تھی جو آج مشینوں کے رواج کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے، دوسرے بکثرت مسلمان اسلامی حکومتوں میں رہتے تھے جہاں بیت المال بڑی حد تک ان حوادث کے نتائج سے پناہ دیتا تھا، تیسرے مصارف زندگی کا اتنا بوجھ بھی نہیں ہوتا تھا، چوتھے آپس کی ہمدردی کا جذبہ اتنا سرد نہیں ہوا تھا جتنا آج ہوگیا ہے، پانچویں تعداد کی قلت اور قوم کی بحیثیت مجموعی دولت مندی، زکوٰۃ وصدقات کا رواج یہ سب امور مل کر اس قسم کے نقصانات کی تلافی کردیا کرتے تھے، اب ان سب چیزوں کا تقریباً فقدان ہے آبادی میں اضافہ مزید پریشانی کا باعث ہے، سو میں ایک کی تباہ حالی دور کرنا آسان ہے مگر سو میں ۵۰ کے ساتھ مواسات کرنا بہت مشکل ہے۔

مفاسد | واضح رہے کہ یہاں صرف دنیاوی مفاسد کا تذکرہ مقصود ہے جن کی طرف بعض اوقات بعض اہل علم کی نظر نہیں جاتی دینی مفاسد سے چونکہ ہر صاحبِ علم واقف ہے اس لئے ان کا تذکرہ

ہنیں کیا گیا:۔

(۱) ایسے واقعات بھی ہوتے ہیں کہ کسی وارث نے بیمہ کی رقم وصول کرنے کے لئے مورث کو (جو کہ بیمہ دار تھا) قتل کروادیا۔

(۲) اس قسم کے واقعات بھی پیش آتے ہیں کہ بیمہ دار نے دھوکہ دے کر اپنی دکان یا اپنے مکان یا کسی اور چیز کی مالیت زیادہ ظاہر کردی اور اس کا بیمہ کرادیا اور کچھ عرصہ کے بعد سود کی رقم (جو اس کی مملوکہ شئے کی مالیت سے معتد بہ حد تک زائد تھی) وصول کرنے کے لئے اس شئی کو مخفی طریقہ سے خود تلف کردیا مثلاً آگ لگادی یا اور اسی قسم کی حرکت کی اور اس طرح نقصان کی تلافی کے ساتھ مزید نفع بھی اٹھایا۔

اس قسم کے واقعات کی تعداد اگرچہ قلیل ہے مگر نہ تو بعید از قیاس ہے اور نہ النادر کالمعدوم کہے جاسکتے ہیں۔

(۳) تجربات شاہد ہیں کہ جو دولت بے مشقت اور بے محنت ہاتھ آجاتی ہے آدمی اسے بہت بے دردی کے ساتھ خرچ کرتا ہے، نوجوان اولاد کو اگر باپ کے بعد بیمہ کی رقم بغیر محنت و کوشش ملے گی تو ظنِ غالب یہی ہے کہ وہ اسے بے دریغ صرف کرے گی، اسراف و تبذیر کی عادت فی نفسہٖ مذموم ہونے کے علاوہ افلاس و تباہی کا پیش خیمہ بھی ہے جو اخلاقی خرابیاں ایسی صورت میں پیدا ہوتی ہیں ان کی تفصیل بے ضرورت ہے۔

(۴) یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ بیمہ پالیسی کی خریداری میں سرمایہ دار طبقہ ہی پیش پیش ہوسکتا ہے سود کی رقم اس کی دولت میں اور اضافہ کرے گی، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سرمایہ داری کو مزید ترقی ہوگی۔

ان تمہیدی امور کے عرض کرنے کے بعد حضرات علماءِ کرام سے درخواست ہے کہ "انشورنس" کے متعلق مندرجہ بالا حقیقت اور اس کے مصالح و مفاسد کو پیش نظر رکھ کر شریعتِ مقدسہ اسلامیہ کی روشنی میں مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات عنایت فرمائیں، استدعا یہ ہے کہ براہ کرم جوابات مدلل و مفصل عنایت فرمائیں:۔

"سوالات"

(۱) انشورنس کی جو حقیقت، بیان کی گئی ہے اس میں کمپنی جو رقم بطور سود دیتی ہے جس کا نام وہ اپنی اصطلاح میں منافع رکھتی ہے۔ شریعت کا اصطلاحی ربا ہے یا نہیں؟

(۲) اگر سود مذکور شرعی اصطلاح میں ربا ہے تو کیا مصالحِ مذکورہ کے پیش نظر اس کے جواز کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے۔ اگر نکل سکتی ہے تو کیا؟

(۳) زندگی کے بیمہ، املاک کے بیمہ، ذمہ داری کے بیمہ کے درمیان شرعاً کوئی فرق ہوگا یا تینوں کا حکم ایک ہی ہوگا؟

(۴) معاملہ کی یہ شرط کہ اگر بیمہ شدہ شخص یا شے وقتِ معین سے پہلے تلف ہو جائے تو اتنی رقم ملے گی اور اس کے بعد تلف ہوئی تو اتنی جبکہ تلف ہونے کے وقت کا تعین غیر ممکن ہے، اس معاملہ کو قمار کے حدود میں تو داخل نہیں کر دیتی ہے؟

(۵) اگر یہ قمار یا غرر ہے تو کیا مصالحِ مذکورہ کے پیش اسے نظر انداز کر کے اس معاملہ کے جواز کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے؟ اور اگر نکل سکتی ہے تو کیسے؟

(۶) اگر بیمہ دار مندرجہ اقسام بیمہ سے کسی میں سود لینے سے بالکل محترز رہے اور اپنی اصل رقم کی صرف واپسی چاہتا ہو تو کیا یہ معاملہ جائز ہو سکتا ہے؟

(۷) جو رقم کمپنی بطور سود ادا کرتی ہے اسے ربا کے بجائے اس کی جانب سے اعانت و امداد اور تبرع و احسان قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

نوٹ:۔ بعض کمپنیوں کے ایجنٹ اس کا مقصد امداد ہی ظاہر کرتے ہیں۔

(۸) اگر کوئی مسلمان کسی دار الحرب کا باشندہ ہو (مستامن نہیں) اور کمپنی حربیوں ہی کی ہو تو کیا اس صورت میں یہ معاملہ مسلمانوں کے لئے جائز ہوگا؟

(۹) اس صورت میں جبکہ انشورنس کا کاروبار خود حکومت کر رہی ہو اور اس صورت میں جبکہ یہ کاروبار نجی کمپنیاں کر رہی ہوں کوئی فرق ہے یا نہیں؟

(۱۰) اگر یہ کاروبار حکومت کے ہاتھ میں ہو تو کیا اس بنیاد پر کہ خزانۂ حکومت میں رعیت کے

ہر فرد کا حق ہوتا ہے، زیر بحث معاملہ میں سود کی رقم عطیۂ حکومت قرار پاکر" ربا" کے حدود سے خارج ہو سکتی ہے یا نہیں اور کیا اس صورت میں یہ معاملہ جائز ہو سکتا ہے؟

(۱۱) فرض کیجئے بیمہ کا کاروبار حکومت کے ہاتھ میں ہے ایک شخص بیمہ پالیسی خریدتا ہے اور میعادِ معین کے بعد اصل مع سود کے وصول کرتا ہے لیکن:۔

(الف) سود کی کل رقم بصورت ٹیکس و چندہ خود حکومت کو دے دیتا ہے۔

(ب) ایسے کاموں میں لگا دیتا ہے جن کا انجام دینا خود حکومت کے ذمہ ہوتا ہے مگر وہ لاپرواہی یا کسی دشواری کی وجہ سے انہیں انجام نہیں دیتی مثلاً کوئی جگہ پل یا راستہ بنوانا کسی تعلیمی ادارے کو امداد دینا کنواں کھدوانا یا نل لگوانا وغیرہ جہاں یہ امور قانوناً حکومت کے ذمہ ہوں۔

(ج) ایسے کاموں میں صرف کرتا ہے جو قانوناً حکومت کے ذمہ نہیں ہوتے مگر عام طور پر رعایا ان کے بارے میں حکومت کی امداد چاہتی ہے اور حکومت بھی ان کی اس خواہش کو مذموم نہیں سمجھتی، بلکہ بعض اوقات امداد کرتی ہے مثلاً کسی جگہ کتب خانہ کھول دینا وغیرہ۔

تو کیا مندرجہ بالا صورتوں میں اس شخص کے لئے بیمہ پالیسی کی خریداری جائز ہو گی اور اسے ربا لینے کا گناہ تو نہ ہو گا؟

نوٹ:۔ مندرجہ بالا تینوں صورتوں (الف، ب، ج) کے احکام میں اگر فرق ہے تو اسے واضح فرمایا جائے۔

(۱۲) بیمہ دار اگر سود کی رقم بغیر نیت ثواب کے کسی دوسرے شخص کو امداد کے طور پر دے دیتا ہے تو کیا اس صورت میں انشورنس کا معاملہ جائز ہو گا؟

اگر انشورنس کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو کیا مصالح و حاجات مذکورہ کو سامنے رکھ کر:۔

(الف) اس کا کوئی بدل ہو سکتا ہے جس میں مصالح مذکورہ موجود ہوں اور اس پر عمل کرنے سے ارتکابِ معصیت لازم نہ آئے اگر ہو سکتا ہے تو کیا ہے؟ یا

(ب) انشورنس کی مروجہ شکل میں کیا کوئی ایسی ترمیم کی جا سکتی ہے جو اسے معصیت کے دائرے سے خارج کر دے اور مصالحِ مذکورہ کو فوت نہ کرے اگر ہو سکتی ہے تو کیا ہے؟

(مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء بادشاہ باغ لکھنؤ)

شعبان ۱۳۸۴ھ، جنوری ۱۹۶۵ء

عصرِ حاضر کا خطرناک فتنہ (۱) وقت کا سب سے بڑا فتنہ یہ ہے کہ علمی و دینی دقیق ترین مباحث اور اساسی اصول پر طبع آزمائی فرما رہے ہیں، بے علم و بے دین گریجویٹ حضرات جن کی عملی زندگی اس "تعبیر" کا بین ثبوت ہے، اللہ جل شانہ کا یہ دین جس کے حاملین ہر دور میں صلحاء امت اور علماء و فقہاء کی خدا ترس جماعت رہی ہے آج بے علم و بے عمل خدا ناشناس بیرسٹروں کے لئے تختۂ مشق بنا ہوا ہے اور دین اسلام کے حقائق اور شرائعِ الٰہیہ ہر کس و ناکس کے لئے بازیچۂ اطفال بنے ہوئے ہیں۔

اس سے بڑھ کر قیامت کبریٰ کی اور کیا علامت ہوگی؟ صادق مصدوق نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

"اتخذ الناس رؤسًا جهالًا فسئلوا فأفتوا بغير علم فضلّوا وأضلّوا"

(بخاری ج ۱ ص ۲۰)

لوگ (آخر زمانہ میں) جاہلوں کو سردار (دینی پیشوا) بنالیں گے پس ان سے دینی مسائل دریافت کئے جائیں گے تو وہ علم کے بغیر فتوے دیں گے خود بھی گمراہ ہوں گے دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

امانتِ الٰہیہ اس بُری طرح ضائع ہو رہی ہے کہ جس مسلمان کے دل میں ذرا بھی خوفِ خدا ہو وہ اس صورتِ حال کو ہرگز برداشت نہیں کرسکتا۔

(۲) اس سے بھی بڑھ کر فتنہ یہ ہے کہ انہی نااہلوں کو اہل سمجھا جارہا ہے اور اسی گروہ کو اسلامی موضوعات پر "تحقیقات" کی خدمت تفویض کی جارہی ہے اور ملک و ملت کا لاکھوں روپیہ اسی نام نہاد "اسلامی تحقیقات" پر بے دریغ خرچ کیا جارہا ہے۔

درحقیقت ریسرچ کے نام سے اسلام کا پوسٹ مارٹم اور تعبیر کے نام سے دین کی تخریب ہورہی ہے اور "تحقیقات" کے نام سے علانیہ تحریفات کی جارہی ہیں جہاں انگریزی زبان و ادب میں بیرونی ممالک یا اندرونِ ملک کی کوئی ڈگری کسی کے ہاتھ آئی اور گریجویٹ ہونے کا ٹھپہ لگ گیا اور تھوڑا بہت لکھنے کا سلیقہ آگیا، کچھ انگریزی، اردو ادب اور انشاپردازی کی مشق کے مواقع میسر آگئے، بس سارے "شرائطِ اجتہاد فی الدین" پورے ہوگئے اور اسلامی موضوعات پر برائے نام دو چار "مقالے"

یا "رسالے" لکھ دیئے اور بن گئے "تجدد پسند" محقق و مجتہد اور اگر کسی کافر مستشرق کی تربیت بھی حاصل ہو گئی اور استشراقی انداز فکر کے تحت الحاد و تحریف کا جدید زاویۂ نگاہ اور مشق نگارش بھی نصیب ہو گئی تو پھر معراجِ فضل و کمال حاصل ہو گئی۔

(۳) ستم بالائے ستم یہ ہے کہ جو خدا ترس خادمانِ دین اس ظلم و عدوان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں ان کو قدامت پسندی، رجعت پسندی اور جمود کے طعنے دے کر ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے اور قوم کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور نئی نسل کے دلوں سے ان کی دینی عظمت و دیانت کو ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کا جدید شاہکار!! (۴) "مرکزی ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی" کا جدید شاہکار "اجماع اور باب اجتہاد" نامی جدید کتاب شائع ہوئی ہے۔ یہ کمال فاروقی صاحب کی تالیف ہے جن کا تعارف وزارت اطلاعات و نشریات کی طرف سے شائع شدہ کتابچہ "پاکستان میں اسلامی عائلی قانون" میں حسب ذیل الفاظ میں کرایا گیا ہے۔ یہی کمال فاروقی صاحب کا "مبلغِ علم" ہے

مصنف (کمال فاروقی) نے "کیلیفورنیا یونیورسٹی" سے "خصوصی تعلیمات" میں گریجویشن کیا، پھر لندن کے مڈل ٹمپل سے بیرسٹرایٹ لاء کی ڈگری حاصل کی، اب کمال فاروقی صاحب کراچی بار میں وکالت کر رہے ہیں نیز وہ مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی کے قانونی مشیر ہیں۔

گویا اب ادارہ تحقیقات اسلامی نے کتاب و سنت کے بعد اجماع و اجتہاد پر بھی عمل جراحی اور طبع آزمائی شروع کر دی ہے، شریعتِ محمدیہ کے چار ستون تھے، کتاب و سنت، اجماع و قیاس (اجتہاد)، تجدد پسند طبقہ[۱] مجبور ہے کہ ان چار بنیادی اصطلاحوں کی ایسی تعبیر و تشریح کرے کہ دین کی گرفت ڈھیلی ہو جائے تاکہ وہ من مانی کارروائی، ترمیم و تصریف کر سکے اور عوام کو یہ باور کرا سکے کہ دین کے انہی "اصولِ اربعہ" پر ہمارا بھی عمل ہے یعنی ہماری "تعمیر نو" ان اساسی اصولِ دین سے باہر نہیں ہے۔

(۵) ظاہر ہے کہ علوم دینیہ میں قرآن و حدیث یعنی اللہ اور رسول کے کلام کو سمجھنے کے لئے علماء امت نے

---

[۱] نیا اسلام "پسند کرنے والا گروہ جس کا خصوصی نعرہ" اسلام کی تعمیر نو (نیو کنسٹرکشن New-Construction of Islam.) ہے۔

روزِ اول سے جن لابدی اور ضروری علوم و فنون کو مدون کیا ہے ان میں دقیق علم، علم اصولِ حدیث، علم اصولِ فقہ ہیں۔ اجماع و اجتہاد کا تعلق اس مؤخر الذکر علم سے ہے اور پھر اجماع و اجتہاد تو اس علم کا نہایت دقیق اور غامض حصہ ہے خصوصاً قیاس و اجتہاد کے مباحث تو اتنے غامض و دقیق ہیں کہ قیاس و اجتہاد کے مدارک و مراتب سمجھنے کے لئے تمام علماءِ امت میں بھی ہر دور کے اندر چند افراد سے زیادہ نہ ملیں گے۔ ائمہ مجتہدین کے بعد علماء حنفیہ میں امام ابو جعفر طحاوی، امام ابو بکر حصاص، ابو زید دبوسی، سرخسی، فخر الاسلام بزودی قدماء میں سے ممتاز گذرے ہیں اور متاخرین میں امیر عمید الدین کاتب اتقانی (صاحب کتاب الشامل)، شیخ ابن ہمام اور عبد العزیز بخاری (صاحب "کشف الأسرار") ممتاز شخصیتیں ہیں۔

غرض اسلام کے ہر دور میں اس موضوع پر قلم اٹھانے والے علماءِ امت کے وہی افراد ہوئے ہیں جو علوم قرآن و حدیث اور جملہ علومِ اسلامیہ میں انتہائی حذاقت و مہارت کے ساتھ ہی ساتھ اذکیاءِ امت میں بھی شمار ہوئے ہیں اور صلاح و تقویٰ، زہد و عبادت میں بھی فخرِ روزگار سمجھے گئے ہیں۔

مذہب حنفی اور شورائیت امام اعظم امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ جیسی عظیم شخصیت نے بھی جب سب سے پہلے استنباطِ احکامِ شرعیہ یعنی اجتہاد کا بیڑہ اٹھایا تو اپنے وقت کے کبار محدثین اور اذکیاء و صالحین، عارفین و زاہدین کے چالیس افراد کی منتخب روزگار جماعت انتخاب فرمائی اور ان کے تعاون و مشورہ سے تحقیق مسائلِ فقہیہ کا کام شروع کیا۔ (۱) قاضی ابو یوسف (۲) محمد بن الحسن الشیبانی (۳) زفر بن الهذیل (۴) اسد بن عمرو (۵) یوسف بن خالد السمتی (۶) نوح بن ابی مریم (۷) وکیع (۸) حمزہ زیات (۹) یحییٰ بن زکریا۔ (۱۰) عافیۃ ازدی (۱۱) حفص بن غیاث (۱۲) حبان (۱۳) مندل (۱۴) قاسم بن معن (۱۵) فضیل بن عیاض۔ (۱۶) داؤد طائی جیسے اکابر علماءِ امت اس "مجلس شوریٰ" میں شامل تھے، حافظ حدیث ابن ابی العوام کے الفاظ میں یہ کبراء الکبراء (بڑوں کے بڑوں) کا مجمع تھا۔

یہی وجہ ہے کہ حنفی مذہب کو قبول عند اللہ اور قبول عند الناس اس درجہ حاصل ہوا ہے کہ بقیہ تینوں مذہبوں کو مل کر بھی یہ درجہ قبول نصیب نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ ایک "شورائی" اور "اجتماعی" مذہب تھا جس پر اکابر امت نے مل کر سالہا سال تک غور و خوض کیا تھا اس کے بالمقابل بقیہ مذاہبِ ثلاثہ "انفرادی" اور "شخصی" مذاہب کی حیثیت رکھتے تھے۔

(۶) اب خیال فرمائیے کہ اتنا اہم اور اعلیٰ و ارفع موضوع ہو اور اُس پر اس دورِ جدید میں قلم اٹھانے

والے کون حضرات ہوں؟ وہ گریجویٹ اور بیرسٹر جنہوں نے قرآن و حدیث اور علومِ فقہیہ تو ایک طرف عربی زبان کے مبادی، الف ب صرف و نحو، بھی کسی عربی مدرسہ کے طالب علم کو چند ماہ معاوضہ (ٹیوشن فیس) دے کر سیکھے ہوں اور ہر موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے آیات و احادیث اور فقہی عبارتوں کے حوالے تنخواہ دار مولویوں سے نکلوا کر ان میں سائنٹیفک ریسرچ یعنی من مانی مسخ و تحریف کرتے ہوں۔ بتلایئے اس سے بڑھ کر امانتِ الٰہیہ کے ضائع ہونے کی لرزہ خیز اور روح فرسا کوئی مثال ہو سکتی ہے؟

عہدِ حاضر کی جاہلیت کا شاہکار (۷) پھر یہ "عہدِ حاضر کی جاہلیت" کا شاہکار واقعی کوئی مبسوط تالیف یا تحقیقی مقالہ ہے؟ جی نہیں چند صفحات کا مجموعہ ہے جس میں مصنف نے ایک دو عالموں سے اجماع و قیاس پر ایک مکتوب کے ذریعہ چند سوالات کئے ہیں اور ان کے مختصر سے جوابات پر اپنی "تحقیق" کی بنیاد رکھ کر کوشش فرمائی ہے کہ اجماع کا دائرہ کار اتنا وسیع کر دیں کہ دورِ حاضر کے "عوام" کا اجماع بھی سلفِ صالحین اور علماءِ عاملین کے اجماع کے قائم مقام ہو سکے اور اگر یہ خدمت ججوں کی کوئی قانون ساز جماعت انجام دے دے تو سبحان اللہ پھر تو اس کے حجت ہونے میں شک و شبہ یا چون و چرا کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ سکتی حالانکہ خود مؤلف کے لفظوں میں "گذشتہ دس سالوں کے دوران میں انسانی علم، عمق اور وسعت کے اعتبار سے زبردست ترقی بھی کر چکا ہے۔

الغرض یہ تحقیقی مقالہ یا تالیف کیا ہے چند بے معنی و مہمل تعبیرات، لغو استدلالات اور چند بے محل آیاتِ کریمہ سے بے معنی استنباطات کا ایک "مجموعہ" ہے نیا للأسف۔

ہمیں کمال صاحب کی نیت پر زیادہ بدگمانی نہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ جو کچھ فرماتے ہوں خلوص اور نیک نیتی پر مبنی ہو لیکن کیا کریں جو تحقیق و استدلال ہمارے سامنے ہے اس میں تو کمال صاحب نے کمال ہی کر دکھایا ہے۔

آخر میں ہم قارئینِ کرام سے دریافت کرتے ہیں کہ اگر کوئی عربی دان مولوی جس نے عربی زبان و ادب کی تحصیل و مزاولت میں ساری عمر گذاری ہو، صرف انگریزی ریڈرون پڑھ کر شکسپیئر کے ڈراموں پر تنقید اور اس کی فصاحت و بلاغت پر تبصرہ کرنے لگے تو اس سے بڑھ کر کوئی اور مضحکہ خیز حرکت ہو سکتی ہے؟

قومی اسمبلی میں وزیر قانون نے اسلامی کونسل کی سفارشات کا اعلان کر دیا

اسلامی مشاورتی کونسل کا قابلِ قدر کارنامہ (روزنامہ جنگ کراچی ۱۲ جولائی ۷۶ء (سنڈے ایڈیشن) رقمطراز ہے:-

راولپنڈی ۱۰ جولائی (اپ پ اپ پ ا) مرکزی وزیر قانون سید محمد ظفر نے آج قومی اسمبلی میں وقفہ سوالات کے دوران اعلان کیا کہ اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل اب مسلم عائلی قوانین کے آرڈیننس پر غور کر رہی ہے اور جلد ہی اپنی سفارشات پیش کر دے گی، انہوں نے ڈاکٹر علیم الرحمٰن کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ حکومت نے شراب، سود اور جوئے وغیرہ کے بارے میں کونسل کی رائے طلب کی تھی۔ بعض مسائل پر کونسل سے مزید مشورہ طلب کیا گیا ہے۔ ایک ضمنی سوال کے جواب میں وزیرِ موصوف نے کہا کہ شراب کے مسئلہ پر کونسل کی رائے سے اس کے ایک رکن نے اختلاف کیا ہے اور اپنے اختلافی نوٹ میں لکھا ہے کہ اگر شراب کے استعمال سے واضح نشہ نہ ہو تو قرآن و سنت نے اس کی ممانعت نہیں کی ہے اس لئے کہ صرف نشہ کی ممانعت کی ہے۔ اس اختلافی نوٹ پر ارکانِ قومی اسمبلی نے شدید ناراضگی کا اظہار کیا۔ مسلم لیگ کے سید اصغر علی شاہ نے کہا کہ اسلامی کونسل کے جس رکن نے اختلافی نوٹ لکھا ہے اس کا نام بتایا جائے اور یہ بھی بتایا جائے کہ اُسے کونسل کی رکنیت سے کیوں محروم نہیں کیا گیا ہے؟ وزیرِ قانون نے نام بتانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اس ایک رکن کے سوا باقی تمام ارکان نے یہی رائے ظاہر کی ہے کہ قرآن اور سنت کی رو سے کسی بھی حالت میں شراب کا استعمال جائز نہیں۔ وزیر موصوف نے مزید کہا کہ اسلامی کونسل نے بیئر کو بھی شراب قرار دیا ہے اور اس کے استعمال کو ناجائز کہا ہے۔ ہر قسم کے جوئے کو جس میں گھوڑ دوڑ بھی شامل ہے کونسل نے اسلامی تعلیمات کے منافی قرار دیا ہے۔ پریس آرڈیننس کے بارے میں کونسل نے کہا کہ دفعہ نہیں جو قرآن و سنت کے خلاف ہو۔ کونسل نے اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ اس میں ایسی کوئی قانون شریعت میں ترمیم کے بل کو منظور کرنے کی سفارش نہیں کی جا سکتی۔

اسلامی کونسل کی سفارشات قومی اسمبلی میں مرکزی وزیر قانون سید محمد ظفر نے اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل کی جن دس سفارشات کا اعلان کیا وہ درج ذیل ہیں: (۱) روزمرہ کی زندگی میں اسلامی قدروں پر عمل کرانے کے لئے محکمہ مذہبی امور قائم کیا جائے جو خاص طور پر اسلامی اصولوں کے

مطابق صلاۃ وتعظیم المساجد، زکاۃ اور بیت المال اور خدمت خلق وغیرہ کا انتظام کرے۔ (۲) (الف) سرکاری اور عام تقریبات میں شراب پیش کرنے کی ممانعت کی جائے (ب) افطار اور نماز کے وقت سرکاری محکموں اسکولوں اور کالجوں وغیرہ کی طرف سے جلسے کرنے اور عصرانہ وغیرہ کو نماز کے اوقات میں جاری نہ رکھنے کا حکم دیا جائے (ج) ماہ رمضان کے دوران سرکاری و عام تقریبات میں دوپہر کے کھانے کی دعوتوں اور چائے کی دعوتوں کے انتظامات پر پابندی لگائی جائے (۳) الف: ایسی فلموں کی اجازت نہ دی جائے جن سے مذہبی جذبات مجروح ہوں جن سے مملکت کی سلامتی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو جن میں اخلاقی پستی کا مظاہرہ کیا گیا ہو اور جو فحش ہوں (ب) سنسر بورڈ میں ایسے افراد شامل کئے جائیں جو قومی ذمہ داریوں کا احساس رکھتے ہوں اور اسلامی نظریہ کو فروغ دینے کے اہل ہوں، ساتھ ہی ساتھ فحش ادب کی اشاعت اور فروخت پر پابندی لگائی جائے۔ (۴) ایسے نائٹ کلب چلانے کی اجازت نہ دی جائے جن میں عام شراب نوشی اور نیم عریاں رقص ہوتے ہوں (۵) جو لوگ ملاوٹ کے مجرم پائے جائیں ان پر بھاری جرمانہ کیا جائے، ان کی پوری املاک بھی ضبط کی جا سکتی ہیں اور عمر قید کی سزا بھی دی جا سکتی ہے۔

(۶) بچوں کو اغوا کرنے والوں کو عمر قید کی سزا دی جائے (۷) اسمگلنگ کی سزا دس سال قید رکھی جائے، مذہبی لٹریچر کی چھان بین کے لئے مرکزی سنسر بورڈ قائم کیا جائے اور لاہور و ڈھاکہ میں اس کی صوبائی شاخیں کھولی جائیں (۹) ادب، فلم، اشتہارات، ریڈیو و ٹیلیویژن پروگرام۔ نقاشی، مجسمہ سازی، پینٹنگ، نائٹ کلب اور ثقافتی سرگرمیوں میں فحاشی اور عریانیت کا خاتمہ کرنے کے لئے سخت پالیسی اختیار کی جائے (۱۰) پبلک ہائی اسکولوں میں ایسی تعلیم دی جائے کہ طلبا، قوم کی نظریاتی ضرورتیں پوری کر سکیں۔

مذکورہ بالا خبر انتہائی مسرت انگیز اور تنقید و تبصرہ سے بالاتر ہے باقی جس رکنِ مشاورتی کونسل نے حرمتِ شراب کے مسئلہ پر اختلافی نوٹ لکھا ہے وہ بھی جانے پہچانے ہیں انہی کی نگرانی میں بہت بڑا ادارہ تحقیقاتِ اسلامی چل رہا ہے، کاش وہ اختلافی نوٹ میں ان آیات و احادیث کی نشاندہی بھی کر دیتے جن پر ان کا اختلافی نوٹ مبنی ہے۔ ہمیں بھی غور کرنے کا موقعہ ملتا۔

بہرحال مشاورتی کونسل کو اور خصوصاً اس کے صدرِ محترم کو ہم مبارکباد دیتے ہیں کہ تین سال

کے عرصہ میں ہی سہی، پہلی مرتبہ حق کی آواز تو اٹھائی گئی۔ اب مرکزی اسمبلی کا فرض ہے کہ جلد از جلد ان سفارشات کو آئینی شکل دے کر قانون سازی کی رسمی کارروائی پوری کر دے اور حکومت بلا تاخیر ان قوانین کو نافذ کر دے۔

ہم بار بار صاف طور پر یہ کہہ چکے ہیں کہ مرکزی اسمبلی کا منصب ملک کے قانون کو شریعت کے مطابق بنانے کے بارے میں صرف شرعی احکام کو رسمی قانون کی شکل دینا ہے اور بس۔ درحقیقت احکام شرعیہ الٰہیہ ان کی قانون سازی کے دائرہ سے بالاتر ہیں۔ اسی طرح مشاورتی کونسل کا منصب یہ ہے کہ وہ صحیح احکامِ شرعیہ کی نشاندہی کرے اور قانون ساز اسمبلی کا فرض ہے کہ وہ ان کو قانونی شکل دے دے اور حکومت کا فرض یہ ہے کہ وہ ان کو نافذ کر دے۔ نہ کسی کو ان میں ترمیم وتصرف کا حق ہے نہ ان کی منظوری کے لئے کثرت وقلت رائے کا سوال ہے۔ قانون سازی کا دائرہ درحقیقت مملکت کے انتظامی امور اور اداری نظم ونسق تک محدود ہے۔

اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل سے ہم متوقع ہیں کہ وہ مملکت کے دستور جس کی بنیاد کتاب وسنت پر رکھی گئی ہے کے تحت تدریجی طور پر مگر تیز رفتاری کے ساتھ پوری شریعتِ اسلامیہ کے ملک میں اجراء کے لئے عملی اقدامات کرے، چند مسائل کی سفارشات۔ وہ بھی زمانہ دراز میں اور چند جزوی احکام کے نفاذ کے لئے محکمہ امورِ مذہبی کے قیام کا مطالبہ یہ سب ناتمام تصورات ہیں۔ یاد رکھئے ان چند جزوی ہدایات وسفارشات کر دینے سے آپ شرعی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، ہماری آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس اسلامی مملکت کو پوری شریعتِ اسلامیہ کو جلد از جلد ملک کا قانون بنا کر نافذ کر دینے کی توفیق عطا فرمائیں اور اس اسلامی مملکت کو دینی، سیاسی، اقتصادی اور فوجی غرض ہر اعتبار سے مستحکم ترین مملکت بنا دیں اور اس وقت جبکہ بیشتر ممالک اسلامیہ آج قانونِ الٰہی کو چھوڑ کر فوضویت وانتشار، اختلال واضطراب اور فقدانِ استحکام کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں، ہماری حکومتِ پاکستان اسلامی شریعت کا ملک میں اجراء کر کے اسلامی دنیا میں سیادت وقیادت کی علمبردار بنے، صدرِ مملکت سے بھی ہماری درخواست ہے کہ وہ اپنی خداداد جرأت وقابلیت سے جس طرح ملک کے سیاسی استحکام اور اقتصادی ترقی کو اپنا نصب العین بنا چکے ہیں اور اس میں شب وروز خاطر خواہ کامیابیاں وکامرانیاں حاصل کر رہے ہیں۔ اسی

طرح شریعتِ الٰہیہ کے نفاذ و اجراء کو بھی اپنا مقصدِ حیات بنا کر دنیا و آخرت کی دائمی سرخ روئی حاصل کریں اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا کہ دوبارہ مسندِ صدارت پر ان کو جلوہ آرائی کا موقع نصیب فرمایا ہے، عملی شکر بہ ادا کریں اور اللہ جل شانہ کی مزید نعمت و رحمت سے سرفراز ہوں۔ "لئن شکرتم لأزيدنكم ولئن کفرتم فان عذابی لشدید"

ربیع الاول ۱۳۸۵ھ۔ اگست ۱۹۶۵ء

انسانیت کی نجات اور فلاح بہبود کا راستہ

ابھی حال ہی میں صدر محترم نے اسلامی نظریات کی مشاورتی کونسل کے اراکین کو شرف ملاقات بخشا ہے اور کچھ ہدایات بھی فرمائی ہیں۔ بحوالہ روزنامہ جنگ ۲۵ مئی ۶۶ء،

ہمارا حسن ظن یہ ہی ہے کہ صدر محترم بطور خاص لیے ڈاکٹر فضل الرحمن کو جو کونسل کے اجلاس سے صرف دو روز پہلے پریس کو ایک نہایت، غیر ذمہ دارانہ بیان دے چکے ہیں اور اس میں اپنے غیر اسلامی نظریات کا اعلان کر چکے ہیں۔ اور ان جیسے لوگوں کو اپنے خاص انداز میں نصیحت فرمانا چاہتے ہیں۔ ارشاد ہے ہ

ہمیں اپنی روزمرہ کی زندگی میں اسلامی نظریات سے مستقل رہنمائی حاصل کرنی چاہیئے۔

اسلامی تعلیمات نے عقل اور علم کو بہت بلند مرتبہ عطا کیا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ انسانیت کو اسلام سے جو راہنمائی ہوتی ہے اس کے لیے عقل و علم سے دلائل فراہم کئے جائیں:

بالکل بجا ارشاد فرمایا۔ روزمرہ کی زندگی میں مستقل طور پر راہنمائی کا منصب صرف آسمانی تعلیمات اور اسلامی نظریات ہی کو حاصل ہے انسانی عقل اور تدبر و تفکر کا کام یہ ہے کہ وہ ان خداوندی تعلیمات اور اسلامی نظریات کو عام انسانی فہم سے قریب تر بنانے کی غرض سے ان کی تائید و تصدیق علم و حکمت اور سائنس کی نو بنو تحقیقات و اکتشافات کی روشنی میں اس طرح کرے کہ وحی الٰہی پر ایمان و بصیرت میں برابر اضافہ ہوتا ہے اور یقین و طمانیت۔ جس کی روزمرہ کی زندگی میں نشاط کار اور یقین محکم پیدا کرنے کے لیے شدید ضرورت ہے۔ برابر بڑھتا رہے

یہی ماہنامہ بینات شروع سے ڈاکٹر فضل الرحمن اور ان کے رفقاء کار کو سمجھانے اور باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے کہ

مذہب اسلام کے قطعی احکام میں قطع و برید اور تاویلات و تحریفات کرتے رہنے کے بجائے سلام کی حقانیت کے دلائل و براہین علوم جدیدہ اور سائنسی تحقیقات کے ذریعہ مہیا کیجئے (ملاحظہ فرمایئے ادارہ تحقیقات اسلامی میں راقم السطور کی تقریر ماہنامہ بینات بابت ماہ ربیع الثانی ۹۰ھ)

اس کے بعد صدر محترم فرماتے ہیں کہ :

"اگر جدید زندگی کے مسائل کے حل کے لئے مذہب اور سائنس کے امتزاج سے ایک نیا فلسفہ تیار کیا جائے تو اسلامی تصور حیات کو زیادہ بہتر طور پر پیش کیا جا سکتا ہے"

نہ معلوم صدر محترم نے کس انداز میں یہ بات فرمائی ہے اور پریس میں کس انداز سے آئی ہے ؟ لیکن جو کچھ ہمارے سامنے ہے اس کے اعتبار سے ہم سمجھتے ہیں کہ سابق الذکر ارشاد کے ساتھ اس کا جوڑ صحیح نہیں معلوم ہوتا، اس لئے کہ مذہب کا دائرہ عبادات معاملات اور اخلاقیات کی تعلیمات سے نیز معاشرہ کی اصلاح و بہبود اور نظام معیشت کے قوانین کی تعیین و تجدید سے ہے، سائنس کا دائرہ اس سے بالکل الگ ہے وہ کائناتی نظام میں حق تعالیٰ کے جو لامحدود قدرتی خزانے اور قدرتی وسائل کے ذخیرے چھپے ہوئے ہیں اور اب تک وہ انسان کی نگاہ سے اوجھل رہے ہیں سائنس شب و روز ان کی تلاش و جستجو میں منہمک اور ان کو منظر عام پر لانے اور انسان کے لئے قابل انتفاع بنانے میں مصروف ہے۔

اب رہا ان کا استعمال اور ان سے کام لینا یہ خود انسان کا کام ہے، مذہب اسی استعمال اور انتفاع میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے اور ان کو انسانیت کی فلاح و ترقی میں استعمال کرنے کی طریقے متعین کرتا ہے اور انہی اکتشافات و ایجادات کے انسانیت کی تباہی و بربادی کا ذریعہ بننے کے راستوں کی نشاندہی کرتا ہے اور ان راستوں میں ان خزائن قدرت کے استعمال کرنے کے ان خطرناک عواقب و نتائج سے جو ہوا و ہوس کے پھندوں میں گرفتار انسان کی نظر سے اوجھل رہتے ہیں ڈراتا اور خبردار کرتا ہے الغرض قدرت کے خزائن کو مذہب نسل انسانی کے لئے رحمت الٰہی بناتا ہے اور وحی الٰہی کی تعلیمات قدم قدم پر انسان کی رہنمائی کرتی ہیں۔

اسی لئے روزمرہ کی زندگی میں اسلامی تعلیمات کی مستقل رہنمائی کی اشد ضرورت ہے جیسا کہ صدر محترم نے اپنی مذکورہ بالا صدارتی ہدایات میں اراکین مشاورتی کونسل کو تنبیہ فرمائی ہے۔

چنانچہ نہ صرف تجربہ بلکہ بالکل فی الوقت مشاہدہ بھی یہی ہے کہ جب بھی اس اسیر ہوا و ہوس انسان نے ان قدرتی وسائل اور سائنس کے دریافت کردہ قدرتی ذخائر کو استعمال کرنے میں مذہب سے بغاوت کی ہے یہ دنیا انسانوں کے لئے جہنم بن گئی ہے۔

دنیا کی قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ ہی نہیں بلکہ موجودہ دور میں یورپین ممالک اور اقوام کے "فلسفۂ زندگی اور "نظامِ معیشت" کا مشاہدہ آپ کے سامنے ہے، یورپ و امریکہ اور روس میں اسی مذہب سے بغاوت نے ایک ایسی روح فرسا معیشت اور تباہ کن فلسفۂ حیات جدید تہذیب و تمدن کی شکل میں جنم دیا ہے جس کے مہلک نتائج آخرت سے پہلے دنیا ہی میں ظاہر ہو رہے ہیں نسلِ انسانی شدید ترین اخلاقی و اقتصادی تباہی میں گرفتار ہو کر کراہ رہی ہے سکون و اطمینان مفقود ہو چکا ہے دنیا دو گروپوں میں تقسیم ہو کر سائنسی ایجادات کے اسلحہ سے مسلح ہو کر ایک دوسرے کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے، سرد جنگ پورے عروج پر پہنچی ہوئی ہے، ہر فریق اور اس کے حلیف زیادہ سے زیادہ خطرناک اور جہانسوز ایٹمی اسلحہ تیار کرنے میں رات دن مصروف ہیں، حکومتوں اور قوموں کے تمام تر مالی وسائل اور پیداوار انسانیت کی فلاح و بہبود میں اور معیارِ زندگی کو بہتر بنانے میں صرف ہونے کے بجائے متوقع یا ممکنہ حملوں کے دفاع کی تیاریوں میں یا کمزور اقوام کی آزادیوں کو سلب کرنے میں صرف ہو رہے ہیں طاقت ور اور ترقی یافتہ ممالک نے کیپٹل ازم یا کمیونزم کا ایسا تباہ کن اقتصادی اور سیاسی جال پھیلایا ہوا ہے کہ پست اور کمزور اقوام کے لئے ان میں سے کسی ایک میں پھنس کر شکار ہونا ناگزیر ہو گیا ہے، نو آزاد اور کمزور ممالک کے لئے ناطرفدار رہ کر اپنے مالی وسائل اور پیداوار کو صرف اپنی فلاح و بہبود پر صرف کرنا ناممکن ہو گیا ہے اور یہ سب کچھ مذہب اور وحیِ الٰہی کی تعلیمات سے بغاوت کا لازمی نتیجہ ہے۔

دوسری طرف اسی مذہب سے بغاوت نے ایک ایسی تباہ کن تہذیب و معاشرت کو جنم دیا ہے جس میں تمام اخلاقی قدریں، پرسکون عائلی زندگی کے فطری پاکیزہ رجحانات اور جان و مال اور عزت و آبرو کا امن کلی طور پر تباہ ہو چکا ہے، جدید سائنس کی دریافت کردہ ایجادات و اختراعات عریانی، فحاشی بے لگام شہوت رانی کو فروغ دینے میں صرف ہو رہی ہیں، نو بنو امن سوز جرائم تازہ بتازہ جنسی بے راہ روی کے کارنامے[1] اس قدر عام ہو گئے ہیں کہ ان ممالک کا سنجیدہ طبقہ ششدر اور حیران ہے

[1] اسی شمارہ میں ص ۵۳ پر مکتوب مفتوح ملاحظہ کیجئے۔

کر اپنی اس تہذیب و تمدن کی تباہ کاریوں کا مقابلہ یا روک تھام کس طرح کرے، کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ اخبارات کے صفحات اس تباہ کن، گندی تہذیب کی تباہ کاری کی داستانوں سے خالی ہوتے ہوں لیکن درحقیقت سائنس اور اس کی نو بنو ایجادات و اختراعات اور جدید اکتشافات ہرگز اس تباہ کن، جہان سوزی اور بے راہ روی کے ذمہ دار نہیں، سائنس اور اس کی ایجادات ہرگز انسان کو اس تباہ کاری جہاں سوزی اور ہلاکت آفرینی کا درس یا ترغیب و تحریض ہرگز نہیں دیتیں، سائنس تو صرف حق تعالےٰ کے پیدا کردہ ان مخفی خزانوں، ذخیروں اور طاقتوں کو جواب تک انسان کی نگاہ سے اوجھل تھے منظرِ عام پر لاتی ہے اور انسان کے سپرد کر دیتی ہے، وہ خود گونگی بہری اور بیجان و بے حس ہے وہ کسی ذی عقل و ذی ہوش مخلوق کی رہنمائی کرنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتی۔

اب اگر ان "نو دریافت شدہ" قدرتی خزانوں اور ذخیروں کو ذی عقل و ذی ہوش انسان مذہب یعنی وحیِ الٰہی کی راہنمائی میں استعمال کرتا اور اُن سے نفع اٹھاتا ہے تو یہی ذخیرے اور خزانے نسلِ انسانی کے لئے "خزائنِ رحمت" بن جاتے ہیں اور اگر یہ خود سر اور ہوا پرست انسان مذہب اور تعلیماتِ وحی و نبوت سے بغاوت و سرتابی اختیار کرتا ہے تو یہی خزائن و ذخائرِ قدرت نسلِ انسانی کے لئے قہر و غضبِ الٰہی کا سامان بن کر نسلِ انسانی کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹا دیتے ہیں۔

اگر مذہب اور سائنس کے امتزاج سے صدرِ محترم کی مراد یہی مذہب کی رہنمائی اور بالادستی ہے تو "چشم ما روشن دلِ ما شاد" کیا عمدہ بات ہے اور کتنی اچھی نصیحت ہے اس امتزاج نے اسلام کے عہدِ عروج میں جو "اسلامی تصورِ حیات" پیش کیا ہے اس کے آثار و برکات کی تعریف میں نہ صرف مسلمان مؤرخین بلکہ یورپین مورخین بھی رطب اللسان ہیں اور اسلامی تہذیب و تمدن کے موضوع پر انہوں نے مستقل تصانیف لکھی ہیں۔

اور اگر خدانا کردہ صدرِ محترم کی مراد یورپ و امریکہ کا خالص ہوا و ہوس اور خود غرضی و خود پرستی کی اساس پر قائم شدہ مغربی تمدن اور نظامِ معیشت و معاشرت ہے تو ہم بصد احترام صدرِ محترم سے عرض کریں گے کہ موجودہ مغربی تہذیب و تمدن نہ سائنس ہے اور نہ ہی اس کو سائنس کا تقاضہ کہا جا سکتا ہے جیسا کہ ہم اس سے قبل عرض کر چکے ہیں کہ مذہب اور سائنس دو بالکل علیحدہ اور مختلف الجنس چیزیں ہیں اور دو مختلف الجنس چیزوں کے اختلاط و امتزاج سے کسی نئے فلسفہ کے تیار کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

باقی رہی مغربی تہذیب وتمدن اور نظامِ معیشت تو اس کی ہلاکت آفرینیوں سے تو یورپین اقوام بھی پناہ مانگ رہی ہیں، سائنس کی ترقی کے ذریعہ انسان نے ان تباہ کاریوں کو اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ تمام آباد دنیا قطعی اور یقینی ہلاکت کے کنارے پر کھڑی ہے.

صدر محترم آپ بچشم خود دیکھ رہے ہیں کہ سود و قمار کی بنیادوں پر قائم شدہ "اقتصادی و تجارتی نظام" شہوت رانی اور جنسی اختلاط و بے راہ روی کی آغوش میں پروان چڑھنے اور پرورش پانے والا "معاشرہ" اخلاقی انارکی اور نوبنو جرائم کو جنم دینے والی "سوسائٹی" "انسانیت کش بہیمانہ رجحانات پیدا کرنے والی تعلیم و تربیت" سب اس بے لگام مغربی تہذیب کے برکات و ثمرات ہیں جنہوں نے انسانیت کی تمامتر "مقدس قدروں" کو یکسر پامال کر کے رکھ دیا ہے.

اس لحاظ سے اس جدید تہذیب اور جدید سائنسی ترقیات کے دور میں تو مذہب کی بالادستی اور کنٹرول کی ضرورت ہزار درجہ پہلے سے زائد بڑھ گئی ہے اگر سابق غیر متمدن عہد میں ایک شخص تیر و تفنگ سے ایک آدمی کو ہلاک کر سکتا تھا تو آج اسی ایک شخص کے صرف ایک بٹن دبا دینے سے کروڑوں انسان ہلاک ہوتے ہیں.

ان حالات میں انسانیت کی نجات اور فلاح و بہبود کا راستہ اگر ہے تو وہ صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے روزمرہ کی زندگی میں مذہب یعنی وحیِ الٰہی اور تعلیماتِ نبوت کی بالادستی اور مستقل رہنمائی.

اور یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ مذاہبِ عالم میں کامل ترین اور جامع ترین مذہب صرف اسلام ہے اس لئے اب انسانیت کی نجات کا راستہ زندگی کے تمام شعبوں میں۔ خواہ انفرادی ہوں خواہ اجتماعی۔ صرف اسلام کی فرمانبرداری میں مضمر ہے، وحیِ ربانی کی یہ دعوت آج بھی نسل انسانی کو متنبہ اور خبردار کر رہی ہے:۔

"ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه وهو فی الآخرة من الخاسرین."	جو شخص بھی اسلام کے علاوہ کسی بھی دین کو اختیار کرے گا وہ دین ہرگز نہیں قبول کیا جائے گا اور وہ آخرت میں (آخر کار) خسارہ میں پڑنے والوں میں شامل ہوگا.

اور "اعلانِ عام" کر رہی:۔

"من عمل صالحا من ذکر او انثی وهو مؤمن فلنحیینه حیاة طیبة ولنجزینهم	جو شخص بھی مرد ہو یا عورت نیک کام کرے گا بشرطیکہ وہ (خدا و رسول پر) ایمان رکھتا ہو ہم یقیناً اس کو پاکیزہ زندگی عطا

بأحسن ما كانوا يعملون.. فرمائیں گے اور ان کے بہترین اعمال کی جزا ان کو ضرور دیں گے۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اور مسلمان حکمرانوں کو دینِ اسلام کو سمجھنے کی اور اس پر پورے طور پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

هٰذا وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه صفوة البرية سيدنا محمد وآله وأصحابه وبارك وسلّم۔

جون ۱۹۶۶ء، صفر ۱۳۸۶ھ

فرضیتِ زکاۃ اور اس کی قطعیت

کون نہیں جانتا کہ زکاۃ بھی عبادت ہے، جس طرح نماز، روزہ اور حج عبادات ہیں؟ کون نہیں جانتا کہ یہ چاروں اسلام کے بنیادی ارکان ہیں، کلمہ شہادت کے ساتھ مل کر یہ پانچ ستون ہیں جن پر اسلام کی عمارت قائم ہے اور ان کی فرضیت کا عقیدہ دینِ اسلام کا متوارث اور متواتر عقیدہ ہے جو عہدِ نبوت سے آج تک مسلسل چلا آرہا ہے جس کی تصدیق میں قرآنِ عظیم کی صدہا آیات اور سنتِ نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کی متواتر احادیث موجود ہیں۔ غرض کتاب و سنت اور اجماع و توارث ہر دلیل و برہان سے زکاۃ کی فرضیت اور اس کا عبادت ہونا ثابت ہے۔ مکتب کا بچہ اور دار العلوم کا استاد اس عقیدہ کو یکساں طور پر جانتے اور مانتے ہیں۔

جس طرح نماز کی رکعتیں اور ان کی تحدید اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے ٹھیک اسی طرح زکاۃ کی شرح نقود یعنی سونا چاندی ہوں یا جاندار اموال یعنی مویشی ہوں یا زرعی پیداوار ہو سب کی شرح ادائیگی حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متوارث چلی آرہی ہے، زکاۃ و صدقات کے مصارف اور مستحقین خود حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں متعین فرمادیئے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مطابق صرف اور تقسیم کرکے قولاً و عملاً واضح فرمادیا ہے، زکاۃ اور اس کی شرح ان احکامِ شرعیہ میں سے ہیں کہ عہدِ نبوت میں ہی ان کے تحفظ کا اتنا اہتمام کیا گیا کہ نہ صرف خلفاء راشدین کو بلکہ تحصیل و وصول صدقات کے لئے جو عمال بھی مقرر ہوتے تھے ان کو یہ احکام لکھوا کر حوالہ کردیئے جاتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ زکاۃ کی شرح اور مصارف کی تفصیلات کو کسی کے اجتہاد اور قیاس و رائے پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ خود شارع علیہ الصلاۃ والسلام نے تعیین فرماکر ان کی قطعیت پر آخری مہر ثبت کردی، قیامت تک کے لئے کسی کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ اس شرح میں ترمیم و تبدیل کرسکے۔

عہدِ صدیقی میں جب عرب کے چند مسلمان قبائل نے یہ خیال کر کے زکاۃ دینے سے انکار کیا کہ زکاۃ کی حیثیت سرکاری ٹیکس کی ہے جب حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو امیرامت اور سربراہ مملکت تھے دنیا سے رخصت ہو گئے تو اس ٹیکس (زکوٰۃ) کی ادائیگی بھی ختم ہو گئی اب زکاۃ ادا کرنا ضروری نہیں ہے۔

تو اس پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تمام صحابہ کے مجمع میں فرمایا:۔

واللہ لأقاتلنّ من فرّق بین الصلاۃ والزکاۃ۔	خدا کی قسم! میں ہر اس شخص سے ضرور جنگ کروں گا جو نماز اور زکاۃ میں فرق کرے گا۔

نیز فرمایا:۔

واللہ لو منعونی عقالاً کانوا یؤدونہا إلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقاتلتہم۔	خدا کی قسم! اگر یہ (مانعین زکاۃ) ایک زکاۃ کا اونٹ باندھنے کی رسی بھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ادا کیا کرتے تھے، مجھے دینے سے انکار کریں گے تو میں ان سے ضرور جنگ کروں گا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی صحیح حدیث کا مضمون بھی یہی ہے جو صحیحین میں موجود ہے:۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں:

إن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: أمرت أن أقاتل الناس حتی یشھدوا أن لا إلٰہ إلا اللہ وأن محمداً رسول اللہ، ویقیموا الصلاۃ ویؤتوا الزکاۃ، فإذا فعلوا ذلک عصموا منی دماءھم وحسابھم علی اللہ۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کرتا رہوں یہاں تک کہ وہ شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز کو قائم کریں، اور زکاۃ ادا کریں، جب وہ اس پر عمل کرنے لگیں گے تب وہ مجھ سے (میری دست برد سے) اپنی جان اور مال کو محفوظ کر سکیں گے (مسلمان ہو جائیں گے اور ان کی جان و مال محفوظ ہو جائے گا باقی ان کے دلوں کا حساب، کہ وہ دل سے مسلمان ہوئے یا نہیں، اللہ کے سپرد ہے۔

بینات ماہِ رجب و شعبان کے شماروں میں اس مسئلہ کی مزید تحقیق و تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے ان ہر دو فیصلوں کو تمام صحابہ کرام نے متفق الکلمہ قبول کر لیا، امت کا یہ سب سے پہلا اور سب سے قوی اجماع ہے جو رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے فوراً بعد پیش آنے والے حادثۂ نازلہ میں منعقد ہوا اور آج تک امتِ مسلمہ میں مسلّم چلا آرہا ہے۔ پہلا فیصلہ زکاۃ کے عبادت اور رکنِ اسلام ہونے کا قطعی دلیل ہے اور دوسرا فیصلہ شرحِ زکاۃ کے محدود و متعین ہونے کی قطعی دلیل ہے۔

صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے پیشِ نظر یہی حقیقت تھی کہ جس طرح نماز عبادت ہے اسی طرح زکاۃ بھی عبادت ہے، وہ بدنی عبادت ہے اور یہ مالی عبادت ہے، قرآنِ کریم نے بھی واضح طور پر اعلان کیا ہے:-

"فإن تابوا وأقاموا الصلوٰة وآتوا الزکوٰة فخلوا سبیلهم" — پس اگر وہ (کفر و شرک سے) توبہ کریں اور نماز کو قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں (اسلام قبول کر لیں)، تو ان کا راستہ چھوڑ دو (قتل و غارت سے ہاتھ روک لو)

ڈائرکٹر (سربراہ) ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے ادارہ کے ترجمان ماہنامہ فکر و نظر بابت ماہِ اکتوبر ۱۹۶۴ء میں نصوصِ قرآن میں قطع برید اور تحریف کی راہ ہموار کرنے کی غرض سے "ابدیتِ قرآن" کے عنوان سے جو تحقیقی مقالہ" سپردِ قلم کیا ہے اس میں تصریح فرماتے ہیں کہ:-

معاشرہ کی ضروریات کے لئے موجودہ شرحِ زکاۃ کافی نہیں حکومت کو اس میں اضافہ کا حق حاصل ہے۔

اور اسی رسالہ کے ایک اور محقق اور قلمی معاون ڈاکٹر رفیع اللہ نے ڈاکٹر صاحب موصوف کی تائید میں فکر و نظر بابت ماہ نومبر ۱۹۶۵ء میں اسی موضوع پر ایک "تحقیقی" مقالہ سپرد قلم کیا، اس میں وہ فرماتے ہیں:-

معیشت کی تبدیلیوں کی وجہ سے اس نصاب (زکاۃ) میں کچھ خامیاں پیدا ہو گئی ہیں اس لئے اس پر ایک تحقیقی نظر ڈالنا ضروری ہے۔

پھر اپنی "خانہ ساز" تحقیق و تفصیل کے بعد فرماتے ہیں:-

اب اوسط نصاب زکوٰۃ ٢٩٣٩ روپے ہونا چاہیئے اور آج کل کے ماہرین معاشیات کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے کہ اس سے کم آمدنی والے لوگ ہر قسم کے ٹیکس سے مستثنیٰ ہوں۔

یہ تو ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ کی اندرونِ خانہ "تحقیقات" سے متعلق چند سطریں ہیں اب ۲۱ مئی ۱۹۶۶ء

کو راولپنڈی میں اسلامی مشاورتی کونسل کا اجلاس شروع ہونے سے دو دن پہلے ڈاکٹر صاحب موصوف

پی پی اے کے نمائندے کو خصوصی انٹرویو دیتے ہیں کہ :-

(۱) قرآنِ مقدس میں مسلمانوں پر مملکت کو صرف ایک ہی ٹیکس لگانے کا اختیار دیا گیا ہے اور وہ زکاۃ ہے۔

(۲) یہ ٹیکس بنیادی طور پر اس لئے وضع کیا گیا تھا کہ اسے مملکت کی مختلف ضروریات پوری کرتے ہوئے نہ صرف مسلم معاشرہ کی سماجی ترقی پر صرف کیا جائے بلکہ مملکت کی دفاعی اور دیگر ضروریات بھی پوری کی جائیں۔ انہوں نے کہا: زمانۂ قدیم میں مسلم مملکت کی ضروریات اتنی زیادہ نہیں ہوتی تھیں جتنی آج کے زمانہ میں ہیں، جدید مملکت کے لئے معمولی شرح پر زکاۃ کا حصول (۲۲) بالکل بیکار ہے اور حاصل شدہ رقم سے اس کی مالی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے زور دیتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں پر شرح میں اضافہ کے ساتھ زکاۃ عائد کرنی کی ضرورت ہے۔"

اسلامی مشاورتی کونسل کا اجلاس منعقد ہونے سے صرف دو دن پہلے ڈاکٹر فضل الرحمٰن جیسے رکن کونسل کے اس "انٹرویو" سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یا کونسل کے ایجنڈے پر یہ مسئلہ موجود ہے ورنہ خود ڈاکٹر صاحب کونسل کے اجلاس میں یہ تجویز پیش کرنے والے ہیں چنانچہ پی پی اے کا نمائندہ اس عنوان سے یہ خبر دیتا ہے :-

اسلامی مشاورتی کونسل کے آئندہ اجلاس راولپنڈی میں تجویز پیش کی جائے گی کہ ملک کے بھاری ترقیاتی اخراجات پورے کرنے کے لئے زکاۃ کی مقررہ "شرعی" شرح میں اضافہ کر کے وصول کی جائے۔

پی پی اے کی اس خبر اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے اس انٹرویو سے ملک میں سخت اضطراب کی لہر دوڑ گئی اور ایک ہلچل مچ گئی؛ ملک کے ہر طبقہ کی جانب سے شدید مخالفت، برہمی اور غیظ و غضب کا اظہار ہونے لگا تو ڈاکٹر صاحب کو تو یہ کہتے بنی کہ :-

یہ میرے ذاتی نظریات ہیں اسلامی مشاورتی کونسل اور اس کے ہونے والے اجلاس کی کارروائی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔"

لہ درحقیقت ڈاکٹر فضل الرحمٰن عہدِ حاضر کے نہایت زیرک "محقق" ہیں وہ مشاورتی کونسل کے اجلاس سے صرف دو دن پہلے یہ انٹرویو

اور اسلامی نظریات کی مشاورتی کونسل کے ممبر جناب علامہ علاء الدین صدیقی کو یہ تردیدی بیان دینا پڑا۔

کونسل میں زیر بحث مسائل سے متعلق امور پر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے ذاتی نظریات کو مشاورتی کونسل کی کارروائیوں سے خلط ملط کرنا غیر ضروری، ناجائز اور نامناسب ہے۔

یہ خلط ملط کرنے کا موقعہ خود ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے عمداً کونسل کے اجلاس شروع ہونے سے صرف دو دن پہلے انٹرویو دے کر پیدا کیا ہے، سوال یہ ہے کہ ایسے غیر اسلامی نظریات کا نہ صرف مالک، بلکہ ان کا پرچار کرنے والا شخص اسلامی مشاورتی کونسل کا رکن کیسے نامزد کیا گیا اور ایسے غیر ذمہ دار، غیر محتاط اور غیر اسلامی نظریات کا اعلان کرنے والے شخص کو کونسل کی رکنیت سے کیوں نہیں الگ کیا جاتا؟

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے متضاد بیانات یا قلابازیاں پھر ایک طرف اندرون ملک ان کی سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی حمایت و سرپرستی کا یہ عالم ہے کہ اسی "انٹرویو" میں وہ فرماتے ہیں:-

ترقیاتی مقاصد کے لئے سرمایہ پر سود لگانا مذہب کی اسپرٹ کے منافی نہیں اور اس کا جواز موجود ہے۔

نہ صرف یہ بلکہ وہ تین سال سے ماہنامہ فکر و نظر میں پورا زور قلم "تجارتی سود" کے جواز پر صرف کر رہے ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی حوصلہ افزائی فرما رہے ہیں اور دوسری طرف وہ بیرون ملک امریکی پرنسٹن یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی "مذاہب کانفرنس" میں پاکستانی مندوب کی حیثیت سے کس جسارت کے ساتھ "کمیونزم" کی پرزور تائید کرتے ہیں، ارشاد ہے:-

بعض خصوصی سماجی حالات میں بیسویں صدی کا کامیاب مذہب کمیونزم ہے، اس کی تردید نہیں کی جاسکتی۔

حاشیہ گذشتہ صفحہ:

ے کر قوم کی اسلامی حمیت اور غیرت ایمانی کا جائزہ لینا چاہتے تھے کہ مسلسل تین سال سے ماہنامہ فکر و نظر کے ذریعہ وہ جس الحاد کی تخم ریزی کر رہے ہیں وہ بیج پھولنے پھلنے کے قابل ہو اہے یا سوخت ہو گیا۔ الحمد للہ ابھی پاکستان کے مسلمانوں میں اتنی اسلامی حمیت ہے کہ وہ اسلام کی شہ رگوں پر "کاروزنی" کرنے والوں کی چھری کو کند کرنے کے لئے بہت کافی ہے ۱۲ مدیر۔ صحیح: اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔" تصحیح از مدیر بینات۔ نوٹ!! انجام کراچی مورخہ ۷ جون ۶۶ء میں ڈاکٹر صاحب کا ایک وضاحتی بیان نظر سے گذرا آئندہ اشاعت میں اس کا جواب پیش کیا جائے گا۔

دیکھئے کس قدر شاندار تضاد ہے ایک طفلِ مکتب بھی جانتا ہے کہ کمیونزم، کیپٹیل ازم (سرمایہ داری) کا سخت ترین مخالف اور سرسخت دشمن ہے مگر ڈاکٹر صاحب ہیں کہ ساری عمر "سرمایہ داری" کی علمبرداری کرنے اور اسی کے زیرِ سایہ پرورش پلنے کے باوجود نہایت شد و مد کے ساتھ کمیونزم کو بیسویں صدی کا کامیاب مذہب قرار دے رہے ہیں۔

ایک اور عجیب تضاد پھر ایک طرف تو وہ اندرونِ ملک برابر تین سال سے اسلام کی "تعبیرِ نو" میں اپنا زورِ قلم صرف کر رہے ہیں اور اسلام کے منصوص اور قطعی احکام کو موجودہ زمانہ کے تقاضوں کے مطابق بنانے کے لئے نو بنو تاویلیں اور تحریفیں کر رہے ہیں اور اس مذکورہ بالا انٹرویو میں اسی مسئلہ سود پر علماءِ اسلام کو "مذہبی لیڈرز" کے لفظ سے یاد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

انہوں نے کہا کہ، اس سوال (مسئلہ سود) پر مذہبی لیڈروں نے غلط تاویل کی ہے۔
کیونکہ قرآن سود چارج کرنے کے سوال پر خاموش ہے۔"

اور علماءِ اسلام۔ ڈاکٹر صاحب کے لفظوں میں مذہبی لیڈروں۔ پر وہ جدید حالات میں اسلام کی تاویل نہ کرنے کی وجہ سے عوام کے ساتھ "غداری کرنے کا الزام لگاتے ہیں، ارشاد ہے:-

انہوں نے کہا کہ: مذہبی لیڈروں نے جدید حالات میں اسلام کی تاویل پیش نہ کر کے عوام کے ساتھ غداری کی ہے۔

دوسری طرف وہ مذکورہ بالا کانفرنس میں پاکستانی مندوب کی حیثیت سے گوہرافشانی فرماتے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ: موجودہ زمانہ کی ضروریات کے لئے اسلام کی تاویل سے نفسیاتی نقصان پہنچا ہے یہ مسلمانوں کے لئے خطرناک صورتِ حال ہے کیونکہ اگر وہ اپنی سوسائٹی کو جدید بنالیں جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے تو اسلام بحیثیت ایک سماجی طاقت کے ختم ہو جائے گا حالانکہ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ انفرادی زندگی ہی میں نہیں بلکہ معاشرتی زندگی میں بھی ایک طاقت ہے۔

اب آپ ہی بتلائیے غدار کون ہے؟ مذہبی لیڈر یا ہمارے یہ "لا مذہبی لیڈر"؟ موجودہ زمانہ کے لئے اسلام کی تاویل نہ کرنے والے یا تاویل کرنے والے؟ یہ ہیں ہمارے واحد اسلامی تحقیقاتی ادارہ کے سربراہ (ڈائرکٹر)، اور واحد اسلامی نظریات کی مشاورتی کونسل کے رکن رکین کے متضاد

افکار اور پراگندہ خیالات نہیں بلکہ منافقانہ دسیسہ کاریاں اور قلابازیاں۔

آپ اندرونِ ملک تجارتی سود اور ترقیاتی قرضوں پر سود لینے دینے کو جائز اور حلال کہہ کر سرمایہ کاری اور سودی کاروبار کی یعنی سرمایہ داری کی بنیاد پر قائم نظامِ معیشت کی تائید اور ہمت افزائی فرماتے ہیں اور بیرونِ ملک پاکستان کے مندوب کی حیثیت سے بیسویں صدی کا کامیاب مذہب کمیونزم کو بتلاتے ہیں جو کیپیٹل ازم (سرمایہ داری کا) شدید ترین مخالف اور دشمن ہے۔

ایک ہی سانس میں کمیونزم کو بیسویں صدی کا کامیاب مذہب قرار دے کر کمیونزم کی حمایت اور حوصلہ افزائی کرنا اور دوسری طرف باصرار تمام تجارتی سود کو حلال اور سودی کاروبار کو جائز قرار دے کر سرمایہ داری کی حمایت اور حوصلہ افزائی کرنا ہمارے اسلامی تحقیقاتی ادارہ کے سربراہ اور اسلامی نظریات کی مشاورتی کونسل کے رکنِ رکین کا ایسا "شاندار تضاد" ہے کہ اس بیسویں صدی میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

اور سنئے! چین سے "خراجِ تحسین" حاصل کرنے کی غرض سے اسی "مذاہب کی کانفرنس" میں ہمارے یہ پاکستانی مندوب فرماتے ہیں: (پی، پی، اے کا نمائندہ لکھتا ہے) مغربی ممالک اور امریکہ کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ عوامی جمہوریہ چین کو سمجھنے کی کوشش کریں جس کی آبادی ۷۰ کروڑ کے قریب ہے اور جہاں انسانوں کی بہت بڑی تعداد کو سماجی برائیوں سے نجات دلانے اور نیا سماجی، اقتصادی نظام قائم کرنے کی زبردست کوشش کی جا رہی ہے یہ بات ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے بتائی جو پاکستانی مندوب کی حیثیت سے امریکی پرنسٹن یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام "مذاہب کی کانفرنس" میں شریک ہوئے۔

کیا چین کی دوستی کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان اسلام کو چھوڑ کر کمیونزم کی ہمنوائی اختیار کرے؟ آج تو مارکس کے ملک میں بھی مارکسیزم (کمیونزم) ختم ہو رہا ہے، کمیونزم تو درحقیقت ایک سیاسی حربہ ہے جو سرمایہ پرست قوموں کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے بلکہ سرمایہ پرست قوموں کے "سودخواری" کی بنیاد پر قائم شدہ "نظامِ معیشت" کا ردِ عمل ہے جو دنیا کی دوسری خصوصاً ایشیائی اقوام کا خون چوس رہا ہے کیا ہمارے یہ لامذہبی لیڈر۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن۔ اسلام کے نظامِ معیشت کو ناقص قرار دے کر مذہبی لیڈروں۔ علماء اسلام۔ کو اس پر غداری کا طعنہ دیتے ہیں کہ وہ اسلام کو کمیونزم کی صورت میں پیش کیوں نہیں کرتے۔ فانا للہ

گویا ڈاکٹر صاحب کے اس بیان کی روشنی میں اسلام، علماءِ اسلام اور حکومتِ پاکستان سب ہی عوام سے

غداری کے مجرم ہیں کہ نہ وقت کے تقاضہ کو سمجھ رہے ہیں اور نہ پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مانا کہ یہ ڈاکٹر صاحب کے ذاتی نظریات ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ایسے متضاد، اور غیر اسلامی نظریات کے نہ صرف مالک بلکہ بہانگ دہل اندرون ملک اور بیرون ملک اعلان واشاعت کرنے والے شخص کو ایک لمحہ کے لئے بھی اسلامی تحقیقاتی ادارہ کا سربراہ اسلامی نظریات کی مشاورتی کونسل کا رکن باقی رکھا جا سکتا ہے؟ اور کیا اگر کسی دوسرے ادارہ کا سربراہ ملک کے باہر منعقد ہونے والی کسی کانفرنس میں اس طرح کا رسوا کن اور خود حکومت اور قوم کو مجرم گردانے والا بیان دیتا تو کیا حکومت فوراً اس کو معزول نہ کر دیتی اور اس مجرمانہ بیان پر اس کو سزا نہ دیتی؟

ہم نہیں سمجھتے کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن ایسے نادان ہیں کہ وہ ایسے متضاد بیانات دیں جن کے تضاد کو ایک طفلِ مکتب بھی محسوس کر سکتا ہے وہ تو نہ صرف میکگل یونیورسٹی کے فاضل ہیں بلکہ برسوں میکگل یونیورسٹی اور دوسری یونیورسٹیوں میں پروفیسر بھی رہے ہیں اور اپنے شفیق استاد مشہور مستشرق ڈاکٹر اسمتھ کے شاگردِ رشید ہیں وہ درحقیقت طے شدہ منصوبہ کے تحت اسلامی تحقیقاتی ادارہ پاکستان کے سربراہ بنا کر بھیجے گئے ہیں تاکہ اپنے استاد ڈاکٹر اسمتھ اور دوسرے مستشرقین کی نیابت کریں حکومت پاکستان غیر شعوری طور پر اس دسیسہ کاری کا شکار ہو گئی ہے لیکن اب تو ڈاکٹر صاحب کی حقیقت پاکستان کے ہر مسلمان پر عیاں ہو چکی ہے، اب تو حکومت کا فرض ہے کہ ان کو نہ صرف ان کے "غیر اسلامی نظریات" کی بنا پر بلکہ غیر ممالک میں ان رسوا کن بیانات کی بنا پر فوراً ان عہدوں سے معزول کر کے ان کے خلاف محکمانہ کارروائی کرے اس لئے کہ ان کے یہ بیانات اسلام علماء اسلام اور دستور پاکستان کے ساتھ غداری کے مرادف ہیں۔

اس وقت پوری قوم کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ اسلامی تحقیقاتی ادارہ پر جو ملک کا لاکھوں روپے سالانہ سرمایہ صرف ہو رہا ہے وہ نہ صرف ضائع جا رہا ہے بلکہ اسلام کی بیخ کنی پر صرف ہو رہا ہے اور متفقہ مطالبہ ہے کہ اسلامی نظریات کی مشاورتی کونسل اور اسلامی تحقیقاتی ادارہ کو جلد از جلد ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور ان کے ہمنوا قلمی معاونین سے پاک کر دیا جائے۔

خدا کا شکر ہے کہ ہمارا یہ بیان صرف اپنی "مملکتِ خداداد پاکستان" کے مفاد کے پیش نظر ہے اور محض دینی ذمہ داری کے احساس پر مبنی ہے خدا شاہد ہے کہ ڈاکٹر صاحب سے ہمیں کوئی ذاتی عداوت نہیں بلکہ ہم نے تو ایک ڈیڑھ سال تک ان سے برادرانہ تعلقات بھی محض دین کی خاطر قائم رکھے اور ڈاکٹر صاحب کو کافی

موقع دیا کہ وہ ملک و ملت کی صحیح خدمات انجام دیں تو ہم بھی ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہیں اور خود ڈاکٹر صاحب کے اصرار پر ادارۂ تحقیقات اسلامیہ میں جاکر تقریر اور تبادلہ خیالات بھی کیا اور اپنے بے لوث جذبات کے اظہار میں کوئی کوتاہی نہیں کی لیکن جب بالکل مایوسی ہوگئی تو اظہار حق کا فریضہ تو ہر چیز پر مقدم ہے اس لئے آج تین سال بعد یہ آواز اٹھانی پڑی ہے واللہ علی ما نقول وکیل .

صفر ۱۳۸۶ھ، جون ۱۹۶۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عصرِ حاضر میں اسلام کی بے چارگی اور اس کے خلاف دشمنوں کی سازش

(۱) انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ ہم ایسے دور سے گذر رہے ہیں جس میں تمام اسلامی حقائق کو مسخ کیا جا رہا ہے اور باطنیت و الحاد کا جو فتنہ ہزار برس پہلے ظہور پذیر ہو چکا تھا آج تمام عالم میں پھیل گیا ہے اور جو بیج پورے ایک ہزار برس پہلے بویا گیا تھا آج اس کے برگ و بار کے شباب کا دور ہے اُس وقت چونکہ عام مسلمانوں میں دین کا شغف، یقین کا رسوخ اور ایمان کی پختگی پائی جاتی تھی اس لئے یہ امکان نہ تھا کہ جلد عوام کے ایمان کو ختم کیا جا سکے پھر علماءِ امت میں ایسے تینِ اسلام موجود تھے جو ان کے زندقہ و الحاد کے تار و پود بکھیر کے رکھ دیا کرتے تھے، بوبکر باقلانی، امام الحرمین، امام غزالی، امام ابو حامد اسفرائینی، امام ابو المظفر اسفرائینی، امام فورک جو چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے آسمانِ علم و تحقیق کے درخشاں ستارے تھے بلکہ امام ابو منصور ماتریدی اور امام ابو الحسن اشعری سے لے کر عز الدین بن عبد السلام اور حافظ ابن تیمیہ تک بزرگوں نے اسلامی عقائد کی حیرت انگیز حفاظت فرمائی جن کے قلم نے اسلامی حقائق کی حفاظت میں وہ کام کیا جو سلاطینِ اسلام کی تلوار نہ کر سکی، نیز ان محققینِ امت کو سلاطینِ اسلام کی سرپرستی بھی میسر تھی اور اسی ظلِّ خداوندی کے سایۂ عاطفت میں اعداءِ دین کی سرکوبی کرتے رہے، آج ظاہر ہے کہ نہ تو وہ محققین ہیں جو دینِ حق کی حفاظت کے لئے بے نیام تلوار تھے، نہ وہ سلاطینِ اسلام ہیں جو حفظِ دین کی خاطر میدانِ شہادت کے لئے بے تابانہ انداز میں سربکف تھے ع "آن قدح بشکست و آن ساقی نماند" اور اِن ملاحدہ نے آج میدان کو خالی دیکھ کر اور فضا کو سازگار سمجھ کر وہ شگوفے کھلانے شروع کر دیئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ "تحریفِ دین کا نام "تحقیق اسلام" ہے "الحاد فی الدین" کا نام "اظہارِ حقیقت" ہے، حقائقِ دین کو اس طرح پامال ہوتا دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کیا کیا جائے "از ماست کہ بر ماست" "اسلام کی غربت و بیچارگی کا یہ دور انتہائی حسرت ناک بھی ہے اور عبرت ناک بھی إنا للہ و إنا إلیہ راجعون، اور انتہائی تعجب ہے کہ بعض سمجھے غزالی ابن رشد، ابن مسکویہ وغیرہ کے نام لے کر ناظرین کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں کہ ہم بھی اس میدان کے شہسوار ہیں تاکہ عوام یہ خیال کرنے لگیں کہ واقعی جو کچھ گوہر افشانی کر رہے

ہیں اس کی بھی کوئی قیمت ہے حالانکہ غور سے دیکھنے والوں سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ جو کچھ فرما رہے ہیں محض نام ہیں مَا لَهُمْ بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (ان کو کچھ بھی علم نہیں ہے صرف اٹکل سے باتیں کرتے ہیں)۔

قرآنِ کریم اللہ کا کلام اور وحی ہے

(۲) امتِ محمدیہ کا اجتماعی عقیدہ ہے کہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی طرح قدیم، غیر مخلوق اور غیر حادث ہے، معتزلہ کا فرقہ جو اہلِ حق کے نزدیک حق سے بعید ہے انہوں نے فلسفۂ یونان سے تأثر کی بناء پر کچھ موشگافیاں کیں اور تمام اہلِ سنت سے علیحدہ راستہ اختیار کیا وہ خالص علمی و کلامی بحث ہے جو ان صفحات کے لئے موزوں نہیں قرآنِ کریم اور تمام کتبِ الٰہیہ کی تصریحات کے مطابق حضرت جبرئیلِ امین جو بارگاہِ قدس کے مقرب ترین فرشتہ ہیں وحیِ قرآنی کو محفوظ طریقے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارتے تھے جس کے کلمات والفاظ میں حضرت رسالت پناہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ذرا تصرف کرنے کا حق حاصل نہ تھا۔

قرآنِ کریم میں اس اِنزال و تنزیل کی تعبیرات کی کوئی حد نہیں ذیل میں اس بحرِ محیط کے چند موتی ملاحظہ ہوں:

(۱) نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ (۱۹۳ تا ۱۹۵، الشعراء)

(۲) قُلْ مَن كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ (۹۷، البقرۃ)

(۳) آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ (۱۳۶، النساء)

(۴) اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا (۲۳، الزمر)

---

(۱) اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے آپ کے قلب پر صاف عربی زبان میں تاکہ آپ منجملہ ڈرانے والے کے ہوں۔

(۲) آپ یہ کہیئے کہ جو شخص جبرئیل کا دشمن ہو (ہوا کرے) اس نے تو قرآن آپ کے قلب تک پہنچا دیا ہے خداوندی حکم سے۔

(۳) تم اعتقاد رکھو اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ اور اس کتاب کے ساتھ جو اس نے اپنے رسول پر نازل فرمائی۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے بڑا عمدہ کلام نازل فرمایا ہے جو ایسی کتاب ہے کہ باہم ملتی جلتی ہے۔

⑤ وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (۲۳ البقرۃ)

⑥ تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (۱، الفرقان)

⑦ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِیْلًا (۲۳ الدھر)

⑧ وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًی وَّرَحْمَةً (۸۹ النحل)

⑨ وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ (۴۴ النحل)

⑩ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ (۱، الکہف)

⑪ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ (۱۵۵ الانعام)

⑫ اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (۱، القدر)

⑬ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ (۱۸۵، البقرہ)

⑭ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۲، السجدہ)

---

⑤ اور اگر تم لوگ کچھ خلجان میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نازل فرمائی ہے اپنے بندۂ خاص پر تو اچھا پھر تم بنالاؤ ایک محدود ٹکڑا جو اس کا ہم پلہ ہو۔

⑥ بڑی عالیشان ذات ہے جس نے یہ فیصلہ کی کتاب اپنے بندۂ خاص پر نازل فرمائی تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لئے ڈرانے والا ہو۔

⑦ ہم نے آپ پر قرآن تھوڑا تھوڑا کرکے اتارا ہے۔

⑧ اور ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے کہ تمام باتوں کا بیان کرنیوالا ہے اور مسلمانوں کے واسطے بڑی ہدایت اور بڑی رحمت ہے۔

⑨ اور آپ پر بھی یہ قرآن اتارا ہے تاکہ جو مضامین لوگوں کے پاس بھیجے گئے ان کو آپ ان سے ظاہر کردیں۔

⑩ تمام خوبیاں اس اللہ کے لئے ثابت ہیں جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل فرمائی۔

⑪ اور یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے بھیجا بڑی خیر و برکت والی سو اس کی اتباع کرو۔

⑫ بے شک ہم نے قرآن کو شب قدر میں اتارا ہے۔

⑬ ماہِ رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن مجید بھیجا گیا ہے۔

⑭ یہ نازل ہوئی کتاب ہے اس میں کچھ شبہ نہیں یہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔

(ترجمہ حضرت تھانویؒ)

(١٥) وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ (١٩٢، الشعراء)

(١٦) وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ (٢، محمد)

قرآنِ کریم کی ان آیاتِ کریمہ سے حسبِ ذیل حقائق خوب واضح ہو جاتے ہیں کہ ؛
قرآنِ مجید حق تعالیٰ نے اتارا، جبرئیل امین کے ذریعہ اتارا، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا، ماہِ رمضان میں اتارا، شبِ قدر میں اتارا، کس نے اتارا؟ کس کے ذریعہ سے اتارا؟ اس کا نام کیا ہے؟ اس کا لقب کیا ہے؟ کس پر اتارا؟ اس کا نام کیا ہے؟ کس ماہ اتارا؟ کس رات اتارا؟ کس مقصد کے لئے اتارا؟ الغرض ان آیاتِ مقدسہ میں نہایت وضاحت کے ساتھ تمام تصریحات موجود ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ طیبہ میں ان ہی کی تفصیلات موجود ہیں جنہیں ملحدین افسانہ کا نام دے کر بے وزن کرنا چاہتے ہیں، ان حقائقِ قرآنیہ کی روشنی میں تمام امتِ اسلامیہ کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور محفوظ ترین طریقے پر بواسطہ جبرئیلِ امین اللہ تعالیٰ نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے میں اتارا اور آپ نے اسی طرح بغیر ذرہ بھر تغیر کے امت تک پہنچا دیا، یہ امتِ محمدیہ کا اجتماعی عقیدہ ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں کتنی بڑی جہالت کی بات ہے جو یہ کہے کہ قرآن کریم کا چشمہ پیغمبر کے سینے سے پھوٹ کر بہا، جبرئیل کوئی خارجی شئے نہیں، وحی کے لئے خارجیت نہیں، اس کے سوتے قلبِ مبارک سے نکلے اور قرآن اگر کلامِ الٰہی ہے تو (معاذ اللہ) بایں معنی جیسے شاعروں کو کہا جاتا ہے "تلامیذ الرحمٰن" اور سچ تو یہ ہے کہ کفار و مستشرقین نے جو کچھ زہر اُگلا تھا انہی کی ترجمانی کی جا رہی ہے اور اسی قے کو چاٹا جا رہا ہے لیکن جمہورِ امت کے خوف سے کوشش یہ کی گئی کہ الفاظ کے گورکھ دھندوں میں پھنسا کر کچھ ایسی تعبیر کی جائے کہ گریز کا راستہ کچھ باقی رہے اور ساری لغویات و خرافات کے بعد یہ کہا جا سکے کہ جی ہاں اللہ کا کلام بھی ہے اور رسول کا

---

(١٥) اور یہ قرآن رب العالمین کا بھیجا ہوا ہے۔

(١٦) اور ایمان لائے اس پر جو محمدؐ پر اتارا گیا ہے اور حق ہے ان کے رب کی جانب سے ہے۔

کلام بھی ہے پھر اس کی تاویل کی جائے اور چاہتے ہیں کہ اس کفرِ صریح کو الفاظ و تعبیرات کے پردوں میں چھپا کر پیش کریں اور یہ اللہ کے کلام کی تشریح کرنے والے مزید رندانہ جرأت کر کے اسی کو غزالی اور شاہ ولی اللہ کا عقیدہ بتلاتے ہیں لیکن ایمانی بصیرت سے محرومی کی وجہ سے عقل و فہم کا حال یہ ہے کہ عام وحیِ الٰہی نبوت اور نزولِ وحی کی کیفیات کی جو تشریحات یا تعبیرات ان بزرگوں سے منقول ہیں اس کو وحیِ قرآنی پر محمول کرتے چلے جاتے ہیں سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ یہ سب کچھ ایمانی بصیرت اور ایمانی نور سے محرومی کا نتیجہ ہے یا پھر ان حقائقِ الٰہیہ سے جہلِ عظیم کا اثر ہے، خدارا انصاف کیجئے کہ تمام قرآن اور تمام وحی کو پیغمبر کا اخلاقی تجربہ اور توسیع ذات بتلایا جائے کیا یہ سریح گمراہی نہیں اور ادب و احترام کے لہجے میں ایسی تعبیر کی جاتی ہے کہ عوام متأثر ہوں اور یہ خیال کریں کہ ان لکھنے والوں کے دلوں میں اللہ اور اللہ کے رسول کا بڑا احترام ہے لیکن حقائق بین نگاہیں محسوس کرتی ہیں کہ اللہ کے دین اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ارشادات کی جڑیں کاٹ رہے ہیں اور اپنے سلف مستشرقین کی دلی آرزوں کو پورا کر کے وہ کام انجام دے رہے ہیں جو ان سے نہ ہو سکا۔

ادارہ تحقیقات اسلامی کے لئے اہل حضرات کون ہیں؟

یہ سطریں زیرِ قلم تھیں کہ یہ معلوم ہوا کہ ادارۂ تحقیقات اسلامی کے ڈائرکٹر جو ان لغویات کے علمبردار تھے عوام کے احتجاج پر اپنے منصب سے برطرف کر دیئے گئے لیکن سوال تو یہ ہے کہ اس وقت تک ان کی رہنمائی میں ماہنامہ "فکر و نظر" اور "اسلام" وغیرہ کتابوں کے ذریعہ جو بیج ڈالا گیا ہے اس کا کیا کیا جائے گا؟

اب تک جتنا لٹریچر ظہور میں آیا ہے وہ "غرق مئے ناب اولیٰ" کا مصداق ہے جب تک اس کو دریا بُرد نہ کیا جائے اس وقت تک کیا اطمینان ہے کہ پھر بھی کچھ نہیں ہوگا اور ان تحریفات والحاد پر اس وقت تک جو پاکستان کے خزانے سے لاکھوں روپیہ خرچ کیا گیا ہے اس کا کیا تدارک کیا جائے گا؟ اور جو اپنے ہمخیال اسٹاف کو اپنے ارگرد جمع کیا تھا اس کا کیا حشر

ہوگا؟ ضرورت اس کی ہے کہ یہ ادارہ امین ہاتھوں میں دیا جائے اور اس کی علمی و دینی معاونت کے لئے علماء امت میں سے معتمد ترین افراد کا انتخاب کیا جائے جن کے علم و تقویٰ پر جمہور امت کو اعتماد ہو اور وہ شرعی احکام و مسائل معلوم کرنے کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے ہوں۔

اور یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ ان تحقیقات کے لئے دائرہ عمل متعین کیا جائے اور دین کے مسلمات کو زیر بحث لانے کی اجازت نہ دی جائے۔

جب تک یہ روک تھام نہ ہوگی اس وقت تک قابلِ اطمینان صورت ملک میں پیدا نہ ہوگی۔ واللہ سبحانہ ھو الموفق۔

رجب ۱۳۸۸ھ

ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اور ڈاکٹر معصومی

مقامِ مسرت ہے کہ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی پاکستان کا رُخ بدل رہا ہے اور بجائے جدید استشراق قدیم عہدِ سلف لے رہا ہے اور جناب ڈاکٹر معصومی صاحب کی سرپرستی میں اونچے پیمانے پر علمی و دینی تحقیق کا حق ادا ہو رہا ہے، ادارے کا جدید شاہکار امام ابو جعفر طحاوی رحمہ اللہ کی کتاب "اختلاف الفقہاء" کی طباعت اور اس کا ایڈٹ کرنا ہے جس پر آئندہ اشاعت میں ایک مختصر بصیرت افروز مقالہ انشاء اللہ ناظرین کے سامنے آئے گا، مدت سے یہی تمنا تھی کہ ادارہ کے اساسی مقاصد اسی قسم کے ہونے چاہئیں تھے، خدا کرے استقامت نصیب ہو اور ملک و ملت کے لاکھوں روپے صحیح دینی و علمی مقاصد پر خرچ ہوں اور قدیم اسلام میں مستشرقین کے جدید اسلام کا پیوند لگانے کی کوشش نہ ہو، جدید علمِ کلام اور فقہِ اسلامی کی صحیح خدمت ہو تاکہ اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق دونوں بیک وقت راضی ہوں۔

واللہ سبحانہ ھو الموفق لکل خیر۔

جمادی الاولیٰ ۱۳۹۲ھ، جولائی ۱۹۷۲ء

"نزولِ قرآنِ کریم کا چہاردہ صد سالہ جشن"

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی راولپنڈی کی طرف سے امسال ماہِ فروری ۱۹۶۸ء میں ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا جس میں ممالکِ اسلامیہ اور عربیہ کی ممتاز شخصیتیں شامل ہوئیں، مندوبین میں السید محمد امین الحسینی الفلسطینی، مصر کے الاستاذ احمد حسن الباقوری مدیر الازہر، مجمع البحوث الاسلامیہ قاہرہ کے ڈائرکٹر الاستاذ ڈاکٹر حب اللہ، الشیخ منصور محجوب لیبیا کے قاضی القضاۃ اور ہیئت کبار علماء کے مستشار، شام کے مفتی الشیخ احمد کفتارو، عراق کے الاستاذ جواد علی، ترکی کے ڈاکٹر ذکی ولیدی طوغان، ایران کے ڈاکٹر بدیع الزمان فیروز، مراکش کے شیخ عبدالرحمٰن وکالی قائدین افواج کے مذہبی رہنما، تاشقند کے مفتی ضیاء الدین المعروف باباخانوف وغیرہ کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، اندرون ملک مشرقی و مغربی پاکستان کے مشاہیر اہلِ علم کو بھی دعوت دی گئی تھی بلکہ سُنی شیعہ وغیرہ تمام طبقات کے نمائندے بلائے گئے تھے، تمام مندوبین کے قیام کا انتظام ادارے کی طرف سے راولپنڈی کے سب سے بڑے ہوٹل "انٹرکانٹی نینٹل" میں کیا گیا تھا۔

مورخہ ۳؍ اکتوبر ۶۷ء کو ادارے کے سربراہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی جانب سے راقم الحروف کو دعوت نامہ ملا کہ "ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی" قرآن کریم کے نزول بابرکت کے چہاردہ صد سالہ جشن کی تقریبِ سعید پر پاکستان اور تمام ممالکِ اسلامیہ کے اہلِ علم و فکر کی مؤتمر منعقد کر رہا ہے اور حکومتِ پاکستان نے اس کی سرپرستی منظور کر لی ہے، کانفرنس کا پروگرام آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں، مجھے یقین ہے کہ آپ اس کانفرنس میں شرکت ضرور قبول فرمائیں گے اور اپنے علم و دانش اور بصیرتِ دینی سے کانفرنس کے مندوبین اور ان کے ذریعہ تمام عالمِ اسلام کو مستفیض فرمائیں گے، آپ سے درخواست ہے کہ کانفرنس کے انعقاد کے دوران ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کو میزبانی کا شرف بخشیں، آپ کے سفر کے اخراجات بھی ادارے کے ذمہ ہوں گے۔ اس دعوت

کی شرکت کے شرفِ قبول سے جلد سے جلد مطلع فرمائیں، وقت تھوڑا کام بہت ہے، آپ کی اعانت کے لئے ہم سب آپ کے ممنون ہوں گے۔"

راقم الحروف نے جواب میں عرض کیا کہ "دعوت منظور ہے بشرطیکہ حسبِ ذیل تین شرائط منظور فرمالیں (۱) ممالکِ اسلامیہ کے مندوبین کے اسماءِ گرامی سے مطلع فرمائیں (۲) مؤتمر کے موضوعات میں سے مجھے کسی ایک موضوع پر مقالہ پیش کرنے کا حق دیا جائے (۳) مقالات پر مناقشہ و تنقید کا حق حاصل ہو۔" جواباً ڈاکٹر صاحب نے تینوں شرطوں کو منظور فرمایا اور تحریر فرمایا کہ "مجھے اور مؤتمر کی مجلس انتظامیہ کو بہت مسرت ہے کہ آپ نے مؤتمر میں شرکت کی دعوت قبول فرمائی۔"

۱۰ فروری کو "انٹر کانٹی نینٹل" کے لان میں بڑے پیمانے پر اجلاس کا افتتاح ہوا، مندوبین کے علاوہ بعض ممالکِ اسلامیہ کے سفرا بھی موجود تھے، عام شرکت کے لئے دعوت نامے جاری کر دیئے گئے تھے۔

قرآنِ کریم کی تلاوت سے افتتاح ہوا اس کا افسوس رہا کہ افتتاحی تلاوت کے لئے نہایت ہی غیر موزوں قاری کا انتخاب ہوا تھا جس نے نہ صرف تجوید و حسنِ لہجہ ہی ساقط کر دیا تھا بلکہ قرآنِ کریم غلط بھی پڑھا اور جیب سے قرآنِ کریم نکال کر دیکھنے کے باوجود بھی غلطی کی اصلاح نہ کی، حالانکہ عمدہ سے عمدہ قاری اس مجمع میں موجود تھے، منتظمین کی اس فروگذاشت سے مجھے بے حد خفت ہوئی کہ باہر کے مندوبین کیا کہیں گے کہ اتنے اہم موقع پر ایسی غلط سلط تلاوت کی گئی۔"

تلاوتِ قرآنِ کریم کے بعد پاکستان کے صدرِ محترم کا پیغام سنایا گیا اور اس کے بعد ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے مصر، سوڈان، انڈونیشیا وغیرہ کے وصول شدہ پیغامات سنائے، افتتاحی اجلاس انہی پیغامات پر ختم ہوا۔

۱۱ فروری کی صبح کو حضرت المفتی محمد امین الحسینی الفلسطینی کی صدارت میں ہوٹل کے بڑے ہال میں اجلاس شروع ہوا، تلاوتِ قرآنِ کریم اور ابتدائی کارروائی کے بعد مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری کے مقالہ سنانے کا نمبر تھا، لیکن موصوف نے فرمایا کہ میرا مقالہ گم ہو گیا

چھپ نہیں سکا اور مجھے کچھ یاد بھی نہیں تاہم زبانی کچھ کہہ دوں گا، چنانچہ موصوف نے اجتہاد پر تقریر شروع کی، زور دیا کہ اجتہاد باقی ہے، بند نہیں ہوا اور عقل کی اہمیت پر تقریر کے دوران چند ساقط اور موضوع احادیث بھی سنائیں، حالانکہ عقل وتدبر پر قرآنِ کریم واحادیثِ نبویہ صحیحہ کا ذخیرہ کافی تھا، ان ہی سے استدلال کرتے تو بہتر ہوتا، بہرحال تقریر کا یہ حصّہ سکون سے سنا گیا، موصوف نے اس کے بعد اجتہاد کے دائرے کو منصوصاتِ قطعیہ تک وسیع کیا اور صاف فرمایا کہ "قرآنِ کریم اور صریح احادیث کے مقابلے میں بھی اجتہاد کا حق حاصل ہے اور حضرت فاروقِ اعظم نے ایسا کیا، قرآنِ کریم نے مؤلفۃ القلوب کو بھی صدقات کا مصرف مقرر کیا، فاروقِ اعظم نے اس کو ختم کیا، بیک وقت تین طلاقوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طلاقِ رجعی قرار دیا تھا، فاروقِ اعظم نے تین کو تین ہی رہنے دیا جس طرح عمرِ فاروق نے کیا آج ہمیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ وقتی مصالح کے پیشِ نظر اجتہاد سے کام لے کر مسائل وقوانین کا فیصلہ کریں۔" موصوف کی تقریر کا یہ خلاصہ ہے، ظاہر ہے کہ تقریر کا یہ حصّہ قطعاً تحقیق کے خلاف اور بڑی غلط فہمیوں پر مشتمل تھا اور قابلِ برداشت نہ تھا، راقم الحروف نے مجبور ہو کر صدرِ محترم کو مخاطب کیا کہ مقررِ موضوع سے باہر ہو گیا ہے اور آپ چونکہ اردو نہیں سمجھتے اس لئے متنبہ نہیں ہوا براہِ کرم اس کو روک دیں چونکہ موصوف کی بات میرے نزدیک ناقابلِ برداشت تھی اس لئے طبعاً غصّہ آنا چاہیئے تھا چنانچہ شدید اور سخت لہجہ میں یہ احتجاج عربی زبان ہی میں کیا:

یا سیدی الرئیس! أرجوك أن تلجم هذا الخطيب	جنابِ صدرِ جلسہ! مقرر کو روکیے، یہ اپنے
فإنه قد خرج عن موضوعه ووسّع	موضوع سے نکل گئے ہیں اور انہوں نے
دائرة الاجتهاد إلى النصوص القطعية	نصوصِ صریحہ قطعیہ کو اجتہاد کے دائرے میں
الصريحة أرجوكم أن تلجموه۔	لانے کا دعویٰ کیا ہے اس لیے براہ کرم روک دیجئے.

میرے احتجاج پر مشرقی پاکستان کے دو عالموں نے مندوبین میں سے کھڑے ہو کر حتجاج کیا، مولانا مفتی محمود صاحب نے صدرِ جلسہ سے تنقید کے حق کا مطالبہ کیا، مندوبین کے علاوہ ہال میں سامعین نے شور مچایا، الغرض مقرر نے تقریر کو مختصر کر کے ختم کیا، سب

سے پہلے ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب صدر شعبۂ عربی کراچی یونیورسٹی نے باجازتِ صدر عربی میں بہت عمدہ سلجھی ہوئی تقریر فرمائی کہ "عقل کے دائرے کو جو شخص اتنا وسیع کرے گا کہ قرآن و حدیث کے صریح نصوصِ قطعیہ بھی اس کی زد میں آجائیں وہ تو مسلمان ہی نہیں ہے۔" اس تقریر کا بہت اچھا اثر ہوا اور عرب ممالک کے مندوبین بھی خوش ہو گئے۔

اس کے بعد ڈاکٹر حب اللہ نے جو الازہر میں مجمع البحوث الاسلامیہ کے ڈائرکٹر اور بڑے محقق عالم اور دینی تصلب و پختگی میں ممتاز ہیں، باجازتِ صدر نہایت عمدہ اور مؤثر تقریر فرمائی اور فرمایا کہ "افسوس کہ جناب مقرر نے جن احادیث سے عقل کی اہمیت بیان کی ہے یہ احادیث بہت ہی ضعیف یا موضوعی ہیں اور عقل کا دائرہ شریعت کے اندر محدود ہے، عقل کو یہ آزادی کبھی نہیں دی گئی کہ شرائعِ الٰہیہ کے حدود سے باہر جائے، فلسفی عقل کے لئے شریعت میں کوئی جگہ نہیں، عملی عقل کا دائرہ وحیِ الٰہی کے دائرے میں ہے۔" باقی جو کچھ بقیہ تقریر کا حصہ تھا چونکہ وہ خالص اردو میں تھا اس لئے ڈاکٹر حب اللہ نہ سمجھ سکتے تھے نہ اس کی تردید فرما سکے، آخر میں صدرِ محترم السید الحسینی نے تنقید کے لئے راقم الحروف کو دعوت دی، میں نے چاہا کہ عربی میں تقریر ہو لیکن اردو خواں حاضرین کا اصرار تھا کہ تقریر اردو میں ہو تاکہ ان کے پلّے بھی کچھ پڑے سابق دو تقریریں عربی میں تھیں، میری تقریر و تنقید کا خلاصہ یہ تھا کہ :

"میری تقریر ڈاکٹر حب اللہ صاحب کی تقریر ہی کا تکملہ ہے، امتِ محمدیہ کا اس پر اجماع ہے کہ جو حکم شرعی قرآن و حدیث میں واضح طور پر آگیا ہے نہ اس میں اجتہاد کی گنجائش ہے نہ اس کی مخالفت کا امکان، اجتہاد کا دائرہ وہ حوادث و واقعات ہیں، جہاں کتاب و سنت خاموش ہوں جو جدید مسائل پیش آئیں ان میں قرآن و سنت نے اجتہاد کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ اس کا حکم دیا ہے ان مسائل میں اجتہاد کا دروازہ قیامت تک کھلا رہے گا ان مسائل میں اجتہاد کو بند کرنا اسلام کو بدنام کرنا ہے، البتہ اجتہاد کے لئے اہلیتِ اجتہاد کی ضرورت ہوگی اس کے لئے کوئی وجہِ جواز نہیں کہ جو شخص اجتہاد کا اہل نہ ہو وہ بھی اجتہاد کرے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صحیح حدیث میں جدید

اجتہاد کے لئے بھی ایک فیصلہ کن ارشاد موجود ہے وہ حدیث حافظ نورالدین ہیثمی نے اپنی کتاب "مجمع الزوائد ومنبع الفوائد" میں بحوالہ "معجم کبیر" و "معجم اوسط" طبرانی بروایت حضرت علی و حضرت ابن عباس نقل کی ہے حضرت علی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں :-

عن علی رضی اللہ عنہ قال : قلت : یارسول اللہ ! إذا نزل بنا أمرٌ لم یکن فیہ بیانٌ لا أمرٌ ولا نھیٌ فما تأمرنا فیہ ؟ قال : شاوروا الفقھاء والعابدین ، ولا تمضوا فیہ رأی خاصۃ ، وفی روایۃ : ولا تقضوا فیہ برأی خاصۃ[1]	حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا : یارسول اللہ ! جب ہمارے سامنے کوئی ایسا حادثہ پیش آئے جس کے بارے میں کوئی واضح حکم ، امر و نہی کا نہ ہو اس کے متعلق آپ ہمیں کیا ارشاد فرماتے ہیں ؟ فرمایا : فقہاء و عابدین سے مشورہ کرو ، اور اس میں شخصی رائے نافذ نہ کرو ، ایک روایت میں یوں ہے کہ اس میں شخصی رائے سے فیصلہ نہ کرو ۔

حافظِ حدیث امام نورالدین ہیثمی نے نقل کرنے کے بعد فرمایا :

ورجالہ موثقون من أھل الصحیح	اسناد کے رواۃ سب ثقہ اور صحیح احادیث کے راوی ہیں)

---

[1] یہ حدیث راقم الحروف کو ۱۳۴۶ھ سے یاد تھی ، پہلی مرتبہ تو زبانی حضرت الاستاذ امام العصر مولانا محمد انور شاہ رحمہ اللہ سے سنی تھی ، ایک دفعہ دارالعلوم دیوبند میں مرحوم مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی ایک خاص وفد میں تشریف لائے تھے موصوف نے حضرتِ شیخ سے جدید مسائل وحوادث کے بارے میں سوال کیا ، حضرت شیخ نے فوراً برجستہ یہ حدیث بلفظہ سنادی اور ہیثمی کی عبارت بھی نقل فرمائی یاد تو اسی رات ہوگئی تھی اور بعد میں اپنی یادداشت میں لکھ لی تھی ، حضرت شیخ کی وفات کے بعد حافظ نورالدین ہیثمی کی یہ کتاب مصر سے چھپ کر آگئی تو پہلی جلد میں کتاب العلم میں یہ حدیث دوبارہ نظر سے گذری اور ایک ٹکڑا اس کتاب کا ہندوستان میں چھپا تھا اس میں بھی دیکھی ، بہر حال یہ حدیث مجھے چالیس سال سے یاد تھی بعد میں الحمد للہ کہ میرے توسط سے اور "بینات" کے توسط سے بہت سے حضرات کو معلوم ہوئی ، وللہ الحمد ۔

اس حدیث نبوی سے بات بالکل صاف ہو گئی اور حسب ذیل امور روشنی میں آگئے:

(الف) جدید مسائل میں اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا۔

(ب) جب جدید مسائل پیش آئیں تو سب سے پہلے قرآن وسنت کے بیانات کی طرف رجوع کیا جائے۔

(ج) اگر اس کے حکم سے قرآن وسنت دونوں خاموش ہیں کوئی صریح بیان نہیں ملتا، تو اجتہاد کے ذریعہ فیصلہ کرنا چاہیئے۔

(د) اجتہاد کے اصول دو ہیں: (۱) اجتہاد کرنے والے فقہا ہوں جن کو دین کا فہم اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے (۲) شخصی اجتہاد سے گریز کیا جائے بلکہ اجتماعی یا اجماعی اجتہاد کیا جائے یعنی فقہاء و علماء مل کر غور کریں اور مسائل کا حل تلاش کریں، تنہا شخصی رائے قابلِ اعتماد نہیں۔

(ھ) اجتہاد کرنے والی جماعت، دینی فہم و تفقہ کے ساتھ، صلاح و تقویٰ و خدا ترسی و کثرتِ عبادت سے متصف ہو۔

دیکھئے کتنی صفائی کے ساتھ جدید اجتہاد کے شرائط روشن ہو گئے اور اجتہاد کے لئے یہ سب بنیادی چیزیں ہیں اگر کسی میں تفقہ فی الدین کی اہلیت نہیں تو ظاہر ہے کہ اس کا اجتہاد بازیچۂ اطفال قرار پائے گا، کیا کسی عاقل کی نزدیک یہ گنجائش ہے کہ کسی انجینئر سے امراض کا علاج کرایا جائے یا کسی طبیب سے مکان کا نقشہ بنوایا جائے، جب یہ بات مسلم ہے کہ "کل فن له رجال" ہر فن کے لئے اپنے اپنے آدمی ہیں تو اجتہاد کے لئے کیونکر اتنی آزادی دی جا سکتی ہے کہ ہر شخص کو اجتہاد کرنے کا حق ہے جب دنیا کے ہر معمولی پیشہ کے لئے ماہر کی شرط لگائی جاتی ہے تو آخرت اور دین کے معاملے میں یہ شرط کیوں ساقط کر دی جاتی ہے حالانکہ دنیا تو محض عقل کے تابع ہے اور آخرت عقل کے ساتھ وحیِ الٰہی کی محتاج ہے۔

بہر حال اس صحیح حدیث کی روشنی میں جدید اجتہاد کا مسئلہ بالکل صاف ہو گیا اور ساتھ ہی ساتھ قرآن وسنت کی جامعیت کا بھی اندازہ ہو گیا کہ کوئی مرض ایسا نہیں کہ قرآن و

سنت نے اس کی دوا تجویز نہ کر دی ہو اور کوئی درد ایسا نہیں کہ شریعتِ اسلامیہ کے شفاخانے میں اس کا مرہم نہ موجود ہو۔"

الحمد للہ میری اس مختصر تقریر کی تصور سے بالاتر قدر افزائی ہوئی اور سامعین کو فوق العادہ سکون ہوا، عربی ممالک کے مندوبین میں سے الشیخ عبدالرحمٰن وکالی مراکش و رباط کے مندوب نے اٹھ کر فرمایا:

یا شیخ واللہ إن خطابك	آپ کے اس بیان اور اس
وھذا الحدیث الذی ذکرتہ	حدیث نے ہمارے زخموں پر
کان یلسم الجروحنا.	مرہم کا کام کیا)

دوسرے دن اجلاس میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا مقالہ بہت اہم تھا اجلاس الاستاذ احمد حسن الباقوری (جمہوریہ مصر) کی صدارت میں شروع ہوا اور حضرت مفتی صاحب نے اپنا مقالہ اردو میں پڑھ کر سنایا جو تقسیمِ دولت اور اسلامی نظامِ معیشت پر تھا پسند کیا گیا، بعد ازاں چائے کے وقفے کے بعد جناب مسعود چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف کا انگریزی میں مقالہ تھا جس میں قرآنِ کریم سے "اشتراکیت یا سوشلزم" کے اثبات کی کوشش کی گئی تھی، اور علماءِ امت پر کچھ ناشائستہ انداز سے تنقید تھی، مقالہ انگریزی میں تھا مقالہ ختم کرنے کے بعد ہال میں شور اور غوغا آرائی ہوئی بلکہ اتنا شور ہوا کہ معاملہ قابو سے باہر ہو گیا، آخر مولانا مفتی محمود صاحب نے استاذ باقوری سے تقریر کرنے کی اجازت لی کہ یہ ہنگامہ بغیر تردیدی تقریر کے خاموش نہیں ہو سکتا، چنانچہ مفتی صاحب کی تقریر سے لوگوں کو تسلی ہو گئی اور اس روز کی مجلس بھی ختم ہو گئی۔

آخری دن ۱۳ فروری ۱۹۶۸ء کو اختتامی اجلاس تھا خواجہ شہاب الدین وزیر مواصلات کی صدارت میں اجلاس شروع ہوا، ابتدائی تلاوت قرآن کریم کے بعد وزیر قانون جناب ایس ایم ظفر صاحب نے سیمینار کے مقاصد پر روشنی ڈالی اور معزز مندوبین کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا، تقریر انگریزی میں تھی، عربی ترجمہ ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب کر رہے تھے اس روز کوئی اہم مقالہ نہ تھا، آخر میں صدرِ محترم جناب خواجہ شہاب الدین صاحب نے

ایک مبسوط مقالہ پڑھا، مقالہ اردو میں تھا اور جہاں تک اس کے پڑھنے کا تعلق تھا خواجہ صاحب نے بہت عمدہ خطیبانہ انداز سے پڑھا اور سکون سے سنا گیا، مقالہ کی روح یہ تھی کہ "مسلمانوں کی پستی اور تنزل کا سبب سائنس سے ناواقفی ہے اور مغرب اور یورپ کی ترقی کا راز سربستہ سائنس سے فائدہ اٹھانے میں ہے اور قرآنِ کریم نے بھی اسی پر زور دیا ہے، چنانچہ قرآن کریم کی آیت إنما یخشی اللہ من عبادہ العلماء میں علماء سے مراد وہی علماء ہیں جو ان سائنس کے علوم کو جانتے ہیں اور کائنات و کونیات سے واقف ہیں"۔

ظاہر ہے کہ قرانِ کریم کی دعوتِ حق کو اسی بات میں منحصر کرنا اسلامی روح کے سراسر منافی ہے قرآن تو سب سے پہلے اصلاحِ نفوس و تزکیۂ قلوب کی دعوت دیتا ہے، ایمان و یقین، توحید و رسالت اور مبدأ و معاد کا صحیح تصور پیش کرتا ہے، ہر ہر عمل پر محاسبۂ آخرت اور جزا و سزا کا یقین دلوں میں اتارتا ہے، عقائد و اعمال اور سیرت و کردار کی اصلاح کے ذریعہ انسانوں کو حیوانات کی صف سے نکال کر فرشتہ خصلت انسان بناتا ہے اور اس کے بعد دنیا کے ان وسائل سے صحیح فائدہ اٹھا کر خلق اللہ کی صحیح خدمت ان کے ذریعے کرانا چاہتا ہے اس طرح ان دنیوی وسائل کو محقق اقتدار اور ظلم و استبداد کا آلۂ کار بننے سے بچاتا ہے۔

اہلِ فہم و دانش طبقہ کو خواجہ صاحب کے مقالہ سے اختلاف تھا لیکن ان کے منصب کا احترام کرتے ہوئے سکون سے سنتے رہے لیکن ختم کے بعد نوجوان نسل سے برداشت نہ ہو سکا اور شور مچایا کہ خواجہ صاحب کے اس مقالہ پر تنقید کا موقع دیا جائے بنوری یا مفتی محمود کو تردید کا وقت دیا جائے، چونکہ احتفال کی یہ آخری نشست تھی اور دیر کافی ہو چکی تھی اس لئے اجلاس تو منتشر ہوا لیکن شدید ہنگامہ ہوا، خواجہ صاحب کو بھی عوام کی ناراضگی کا شدید احساس ہوا اور وہ جلد ہی چپکے سے تشریف لے گئے، راقم نے سب حضرات سے عرض کیا کہ آپ مطمئن رہیں کوئی صحیح تدبیر کی جائے گی، وقتی طور سے تردید اتنی مؤثر نہ ہو گی بلکہ جب یہ مقالہ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کی طرف سے طبع ہو گا تو اس کی تردید بھی ساتھ طبع ہو گی، اس صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے مرکزی وزیرِ قانون جناب محترم ایس. ایم ظفر صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ میں آپ کی قیام گاہ میں آکر ملنا چاہتا ہوں اور کچھ باتیں کرنی ہیں چنانچہ وہ حسبِ وعدہ

ٹھیک ۱/۲ ۱۲ بجے تشریف لائے اور قریباً ۴۵ منٹ بہت بے تکلفی سے مخلصانہ ماحول میں ان سب باتوں پر سیر حاصل گفتگو ہوئی اور الحمد للہ کہ موصوف کو ان باتوں سے بہت مطمئن پایا اور ہمیں ایک دوسرے کو پہچاننے اور قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا اور آئندہ کے لئے ان دینی موضوعات پر بھی تبادلہ خیالات کے لئے راستہ ہموار ہو گیا، مجھے خوشی ہوئی کہ وزیر موصوف کو میں نے ایک دردمند اور حساس دل رکھنے والا انسان محسوس کیا اور ان کے دل میں کام کرنے کے صحیح جذبہ اور تڑپ کا احساس ہوا اور ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی سے ایک مرتبہ پھر یہ توقع ہو گئی کہ شاید وہ اس انداز سے کام کر سکے جس سے خالق و مخلوق دونوں راضی ہوں اور وقت کے تقاضوں کے مطابق صحیح قدم اٹھایا جا سکے، وزیر موصوف نے گفتگو کے بعد فرمایا کہ انشاء اللہ آپ سے پھر ملاقات ہوگی، اس طرح یہ خصوصی مجلس اور عمومی اجلاس دونوں ختم ہوئے، رات کو تمام مندوبین کی دعوت شہرزاد ہوٹل اسلام آباد میں تھی، وزیر موصوف نے میرے مزید ٹھیرنے کی خواہش ظاہر فرمائی لیکن مجھے کراچی جلد پہنچنا ضروری تھا، افسوس کہ اس خواہش کی تکمیل نہ کر سکا۔

رات کے اجتماع میں جناب ڈاکٹر حبیب اللہ کی بڑی اہم تقریر ہوئی جو سیمینار ہی میں ہونی چاہیے تھی چونکہ مجھے اس کا علم تھا کہ تقریر ہوگی اس لئے پہلے سے برادرم مولانا محمد تقی صاحب عثمانی سے کہا تھا کہ ان کی تقریر ضبط کریں، اس کا کچھ خلاصہ اسی شمارے میں دوسری جگہ ملے گا۔

یہ مجلسِ مذاکرات بہت ہی نافع ہوتی، اگر وقت کم از کم ایک ہفتہ ہوتا اس میں شک نہیں کہ جناب وزیرِ قانون، ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب اور بقیہ منتظمین نے بڑی عرق ریزی سے کام کیا تاہم یہ پہلا موقع تھا اس لئے بہت سی خامیاں رہ گئیں اور جتنی کامیابی کی توقع تھی وہ نہ ہو سکی، وقت بہت کم تھا تراجم کا انتظام تحریراً یا تقریراً نامکمل تھا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح خدمتِ علم، خدمتِ دین اور خدمتِ ملک کی توفیق عطا فرمائے تاکہ پاکستان کا علمی و دینی اور سیاسی وقار بڑھے، آمین۔ ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ

تفاسیر قرآن اور مسلمان قوم

آج کل یہ دیکھا گیا کہ جو تحریک اسلام کے نام سے اٹھتی ہے اور جو شخص اسلام کا نام لے کر اٹھتا ہے اس کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ قرآن کریم کی ایک تفسیر لکھ ڈالے۔ اس پچاس سال کے عرصہ میں اس ملک میں کتنی تحریکیں اٹھیں اور کتنی اب بھی موجود ہیں اور سب کا تختہ مشق قرآنِ کریم ہے کیا اچھا ہوتا ہے کہ اہلِ حق و اہلِ علم کی جو تفاسیر موجود ہیں انہی کو مشعلِ راہ بناتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے لیکن افسوس کہ وہ کس طرف جائیں اور کس کو صحیح سمجھیں۔ قرآنِ کریم حق تعالیٰ کا کلام ہے۔ بلاشبہ جہاں اللہ تعالیٰ نے نصیحت و عبرت و عمل کے لئے آسان کر دیا ہے وہاں علوم و حقائق و معارفِ الٰہیہ کا وہ سمندر ناپید اکنار ہے کہ جس کی تہ تک پہنچنا کسی کی مجال نہیں ہے اس لئے اکابرِ صحابہ جن کی زبان اسلوبِ بیان اور اصطلاحیں تعبیر قرانِ کریم نے اختیار کیں وہی اولین و بہترین مخاطب ہیں، ان کے سامنے اسبابِ نزول موجود ہیں ان کے سامنے وہ ماحول ہے جس میں قرآن نازل ہوا ان کے سامنے وہ حیاتِ مقدسہ ہے جو قرآنِ کریم کی عملی تفسیر ہے، الغرض دنیا کی کوئی قوم اور کوئی دور ایسا نہیں کہ جو ان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ ان حالات و حیثیات کے ہوتے ہوئے حضرت صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ سے لے کر تمام صحابہ کرام قرآن کی تفسیر کے اقدام سے گھبراتے تھے، ایک موقع پر حضرت صدیق اکبرؓ جو بلاشبہ حضرت رسالت پناہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اعلم الناس بالقرآن تھے وہ فرماتے ہیں:۔

أیّ سماءٍ تظلّنی وأیّ أرضٍ تقلّنی	یعنی اس آسمان کے نیچے اور اس زمین کے اوپر کیونکر
إذا قلت فی کتاب اللہ برأیی۔	میں رہوں گا، اگر قرآن کریم کی اپنی رائے سے تفسیر کروں۔

خلفاءِ راشدین کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس وہ بزرگ ہیں کہ حضرات صحابہ اپنی مشکلاتِ قرآن میں ان سے رجوع فرماتے تھے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں وہ حضرت ابن عباس سے قرآنِ کریم پڑھا کرتے تھے۔ حضرت مجاہد نے جو کبار تابعین میں سے ہیں، حضرت ابن عمر سے تیس مرتبہ قرآنِ کریم پڑھا اور مشکلات حل فرمائیں، یہ ایک طویل داستان ہے جس کو یہاں بیان کرنا مقصود نہیں اس لئے علماءِ اُمت اور ائمہ تفسیر نے پندرہ علموں کی مہارت قرآن

سمجھنے کے لئے ضروری قرار دے دی ہے کہ جب تک ان علوم میں مہارت نہ ہو قرآن کریم کی تفسیر پر اس کو اقدام کرنا جائز ہی نہیں لیکن افسوس کہ آج کل ہر شخص سمجھتا ہے کہ سب سے آسان کام یہی ہے کہ قرآنِ کریم کی تفسیر وتشریح کا بیڑہ اٹھائیں پھر چاہے اسلام کا بیڑہ بھی غرق ہو جائے ان سب کی نیتوں پر شبہ نہیں کرتا لیکن طرزِ عمل پر تنقید کرتا ہوں یہ مانا کہ کہیں کہیں عمدہ بات اور بہتر توجیہ بھی کر لیتے ہیں لیکن کہیں اپنی رائے کی حریت اور علم کی کمی سے ایسی باتیں لکھتے ہیں کہ ان کی تمام محنتوں پر پانی پھر جاتا ہے اور بسا اوقات وہ غلطی گمراہ کن اور خطرناک ہوتی ہے اور قطعی عقیدہ کے خلاف ہوتی ہے بطور مثال اس وقت ایک نمونہ پیش کرتا ہوں :۔

ڈاکٹر اسرار احمد اور تفسیرِ قرآن

ہمارے ایک محترم نے سورۂ العصر کی تفسیر وتشریح میں حسبِ ذیل حقائق کا اظہار فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے :۔

الف :۔ سورہ العصر میں نجات کی کم ازکم چار شرائط بیان ہوئی ہیں اور ان سے کم پر نجات کی توقع نہیں کی جاسکتی، یہاں کامیابی کی فرسٹ یا سیکنڈ ڈویژن کا تذکرہ نہیں بلکہ صرف آخری درجہ میں پاس ہونے کی شرح کا بیان ہو رہا ہے۔

ب :۔ ایمان وعمل صالح تواصی بالحق تواصی بالصبر چاروں شرطیں لازمی ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو بھی ساقط نہیں کیا جاسکتا، مسلمانوں کی ایک عظیم اکثریت کے ذہنوں میں یہ بات غلط بیٹھ گئی ہے کہ ہر کلمہ گو کی نجات لازمی ہے، گویا نجات کے لئے صرف ایمان اور اس کا بھی محض زبانی اقرار کافی ہے الخ

دیکھو انسان کا اصلی سرمایہ از ڈاکٹر اسرار احمد خان مطبوعہ ادارۂ اشاعتِ علوم ملتان۔

افسوس کہ اس وقت تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں صرف اجمالی واختصار سے چند باتیں عرض کرتا ہوں :۔

(۱) قرآنِ کریم اور احادیثِ نبویہ متواترہ اور اہل سنت والجماعت کی تصریحات ہیں کہ اصلی نجات یعنی کفر سے نجات جس کا نتیجہ خلودِ نار اور دوامی جہنم ہے صرف ایمان پر ہے جو کلمہ شہادت میں ذکر ہے بشرطیکہ دل وجان سے یہ عقیدہ ہو صرف زبانی اعتراف نہ ہو۔

قرآنِ کریم کا ارشاد ہے :۔

«إن الله لا يغفر أن يشرك به ويغفر ما دون ذلك لمن يشاء» یعنی بلا شبہ حق تعالیٰ شرک و کفر کو نہیں بخشتا اور اس کے علاوہ جسے چاہے بخش دے۔

عملِ صالح کو جزءِ ایمان ایسا ماننا کہ اس کے نہ ہونے سے نجات نہ ہو اور انسان کافر بن جائے، یہ مذہب خوارج کا ہے اور قریب اس کے معتزلہ کا مذہب ہے۔ بہر حال اس قسم کا نظریہ دورِ حاضر میں جناب مودودی صاحب نے اپنی کتابوں میں بہت زور و شور سے پیش کیا، شاید ہمارے محترم چونکہ ان کے رفیق کار تھے ان سے لیا گیا ہوگا اور مودودی صاحب سے پہلے غالباً مولانا فراہی صاحب مرحوم بھی اس قسم کی باتیں لکھ چکے ہیں، بہر حال کسی نے بھی کہا ہو یہ سراسر غلط ہے، قرآن کریم کی نصوصِ قطعیہ کے خلاف ہے اور اہلِ سنت والجماعت کے عقیدہ کے خلاف ہے پھر سورہ والعصر میں جو کچھ بیان فرمایا گیا ہے اس کو تیسرے درجہ کی کامیابی سمجھنا سراسر غلط ہے وہ تو اعلیٰ ترین کامیابی ہے جس کے اوپر کوئی درجہ نہیں ہو سکتا، «وعملوا الصالحات» کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اسلام کی کوئی بات باقی نہیں رہی جو اس میں نہ آئی ہو۔

اس وقت تفصیل کا موقع نہیں ورنہ صاف صاف ان غلطیوں کی نشاندہی کرتے جہاں ہمارے محترم سے غلطیاں ہوئی ہیں، دراصل باکمال اصحاب کی صحبت کے بغیر علمِ دین اور قرآنِ کریم کا فہم میسر نہیں آسکتا، اسی وجہ سے مودودی صاحب بھی ان خطرناک غلطیوں میں مبتلا ہو گئے کہ تعجب ہوتا ہے، نیز واضح ہو کہ ایمان یقینِ قلبی کا نام ہے محض زبانی اعتراف کا نام ایمان نہیں ہے، قلبی اعتقادِ قطعی کے ساتھ زبانی اعتراف کی ضرورت ہے ورنہ محض زبانی اعتراف ہو اور دل میں اعتقاد نہ ہو یہ نفاق و زندقہ ہے اس کو ایمان کہنا ہی غلط ہے اگر کوئی شخص دل میں تمام اسلامی عقائد کا یقینِ کامل رکھتا ہے لیکن اعمالِ صالحہ پر اس کی تقصیر ہے تو ابدی جہنم سے محفوظ ہو گیا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے معاف ہو جائے یا شفاعت سے معاف ہو جائے یا پھر سزا بقدرِ معاصی بھگتنے کے بعد نجات مل جائے ایسی صورت میں مسلمان کلمہ گو کو کافر نہیں کہتے، اور "کلمہ گو" کے معنی یہ نہیں کہ محض زبانی اقرار ہو اور دل ایمان سے خالی ہو، اللہ تعالیٰ صحیح فہم عطا فرمائے اور انصاف نصیب فرمائے، واللہ سبحانہ ولی التوفیق۔

رمضان وشوال ۱۳۹۷ھ ، ستمبر و اکتوبر ۱۹۷۷ء

کتاب الزھد لابن المبارک پر تبصرہ اور اس کا تعارف

حضرت رسالت پناہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے ذخیرے کو محدثین اُمت نے آٹھ قسموں پر تقسیم کیا (۱) عقائد و توحید کی احادیث (۲) احکام شرعیہ (۳) آداب و مکارمِ اخلاق (۴) تفسیرِ قرآن (۵) سیر و تاریخ (۶) فتن و اشراط الساعۃ (۷) مناقب و فضائل (۸) زہد و رقائق، ان آٹھویں قسم کی احادیث کا مقصد یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ احادیث آخرت اور جنت کی نعمتوں کا شوق پیدا کریں اور ان سے دنیا اور دنیا کی نعمتوں کی طرف سے بے رغبتی پیدا ہو، درحقیقت دنیا اور نعیمِ دنیا کی محبت ہی معاصی اور آخرت سے بے تعلقی کی بنیاد ہے دورِ حاضر کا سب سے بڑا فتنہ یہی ہے حضرت عبداللہ بن المبارک خراسانی کی یہ کتاب اسی سلسلہ کی مشہور ترین کتاب ہے اور شاید امت میں پہلی کتاب یہی ہو بعض ان کے معاصرین اور بعد کے کبار محدثین کی کتابیں بھی ہیں جن میں امام احمد بن حنبل کی کتاب الزہد معروف و مشہور ہے اور ملک عبدالعزیز بن سعود کی توجہ سے پہلی بار مکہ مکرمہ کے سرکاری پریس مطبعۃ ام القریٰ میں ۱۳۵۷ھ میں طبع ہو چکی ہے اسی طرح حافظ ابوبکر بیہقی کی بھی دو کتابیں اسی موضوع پر ہیں: الکبیر، الصغیر، الکبیر کا ایک عمدہ نسخہ راقم الحروف کے پاس بھی محفوظ موجود ہے، ہند و پاک کے بڑے محدث اور رجالِ حدیث کے محقق عالم اور امام العصر حضرت شیخ مولانا محمد انور شاہ رحمہ اللہ کے ممتاز اور مایہ ناز تلمیذ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی زیدت فیوضہ و برکاتہ، ہمارے بے حد شکریہ کے مستحق ہیں کہ موصوف نے حضرت عبداللہ المبارک امامِ حدیث فقیہِ امت کی یہ کتاب الزھد آب و تاب سے شائع کرانے کی سعی فرمائی ہے۔ موصوف کے رشحاتِ قلم سے مجلس علمی کراچی و ڈابھیل کے لئے مسندِ حمیدی کی تعلیقات و مقدمہ علمائے حدیث سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں اور عنقریب مجلسِ علمی کے لئے مصنف عبدالرزاق موصوف کے تحشیہ و تعلیقات و مقدمہ کے ساتھ جلوہ افروز ہونے والی ہے، مسندِ احمد پر محدث احمد شاکر مصری کے تحشیہ و مقدمات پر فاضلانہ و محققانہ و محدثانہ تنقید امت کے سامنے آ چکی ہے، عبداللہ بن المبارک خراسانی مروزیؒ امتِ محمدیہ کے ان افراد میں سے ہیں

جن کے متعلق امامِ حدیث اسمٰعیل بن عیّاش کا یہ جملہ بہت مشہور ہے :۔

ماعلی وجه الأرض مثل عبد الله ابن المبارك ولا أعلم أن الله خلق خصلة من خصال الخير إلا وقد جعلها الله في عبد الله بن المبارك ،	روئے زمین پر عبداللہ بن مبارک جیسا شخص نہیں اور اللہ تعالیٰ نے خیر کی جتنی خصلتیں پیدا کیں ہیں میرے علم کی حد تک وہ سب عبداللہ ابن مبارک میں موجود ہیں ۔

جس کو شارح بخاری کرمانی ابن الجوزی وخطیب بغدادی وغیرہ نے نقل کیا ہے، ان کی یہ قابلِ قدر کتاب موصوف کے نفیس مقدمہ وعمدہ ترین تعلیقات کے ساتھ امت کے سامنے آ رہی ہے، موصوف کی تحریرات کی خصوصیت ہے کہ فضول تطویل اور حشو سے پاک ہیں، مقدمہ یا لقدمہ نہایت عمدہ اور محققانہ ہے کتاب کی افادیت کے لئے صاحبِ تعلیقات نے متعدد فہارس بنائی ہیں، فہرستِ الواب، فہرستِ احادیث مرفوعہ، فہرست مراسیل، فہرستِ احادیث موقوفہ فہرستِ آثار مقطوعہ آخر کتاب میں استدراکات وتعقبات اور مفصل صحت نامہ، وقت کی اہم ضرورت اس کتاب سے پوری ہوگئی خدا کرے کہ اس کتاب کا اُردو ترجمہ بھی شائع ہوجائے تاکہ عوام بھی براہ راست استفادہ کرسکیں، ملنے کا پتہ :۔ مولانا محمد عثمان، مکتبہ احیاء المعارف مشرقی اقبال روڈ، مالیگاؤں، ناسک (انڈیا)

الابواب والتراجم پر تبصرہ

قرآن کریم کے بعد صحیح بخاری شریف پہلی کتاب ہے کہ آج تک امتِ محمدیہ اس کی تشریح تلخیص ترجمہ وغیرہ میں مصروف ہے اللہ تعالیٰ نے قبولیت کے جس معیار پر اس کو پہنچایا ہے کوئی کتاب بھی اس کی ہمسری نہیں کرسکتی، خطابی وابن بطال مغربی سے لے کر آج تک اس کی شروح کا سلسلہ جاری ہے اور کہا جاتا ہے کہ حافظ ابن حجر شافعی اور حافظ بدرالدین عینی حنفی نے مل کر اس کی شرح لکھنے کا حق ادا کردیا ہے لیکن یہ بھی کہا گیا کہ صحیح بخاری کے ابواب وتراجم کی تشریح کا حق ابھی اُمت کے ذمہ باقی ہے امام بخاری کے تراجم یعنی عنواناتِ الواب کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "فقہ البخاری فی تراجمہ" یعنی فقہی مسلک کی تحقیق اور وقتِ نظر امام کی انہی عنوانات میں جھلکتی ہے اس لئے کبارِ محدثین اور اذکیاءِ محدثین نے ابواب وعنوانات کی مستقل شرحیں

لکھی ہیں، حافظِ حدیث امام ابو عبداللہ بن رشید السبتی کی کتاب ترجمان التراجم، امام ناصر الدین احمد بن المنیر مالکی کی کتاب المتواری علی تراجم البخاری، قاضی بدر الدین بن جماعہ کی تصنیف الشیخ محمد بن منصور سجلماسی کی کتاب "فك اغراض البخاری المبهمة فی الجمع بین الحدیث والترجمة" وغیرہ وغیرہ اس سلسلہ کی مشہور تصانیف ہیں آخری دور میں حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی کی کتاب بھی اسی موضوع پر بارہا طبع ہوئی، حضرت شیخ المشائخ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ نے اس موضوع پر طبع آزمائی فرمائی ہے جب مالٹا میں اسارت کا زمانہ پورا کر رہے تھے قرآن کریم کا ترجمہ وہیں مکمل فرمایا اور اس کے فوائدِ سورہ بقرہ، آلِ عمران، النساء کے مکمل فرمائے اور صحیح بخاری شریف کے ابواب و تراجم پر لکھنا شروع فرما دیا ہمارے سامنے اس وقت جتنا ذخیرہ موجود ہے، حضرت شیخ الہند کی یہ کتاب سب پر فوقیت رکھتی ہے لیکن افسوس کہ کتاب بالکل ناتمام رہ گئی پوری نہ ہو سکی تاہم جس انداز سے موصوف نے ایک حصہ لکھا ہے اور چند کلی مقصد و اشارات کے ذریعہ سے اغراضِ بخاری کی وضاحت فرمائی ہے وہ نہایت قابلِ قدر ہیں، عرصہ ہوا کہ یہ حصہ ایک مرتبہ دیوبند میں چھپ چکا تھا اور عرصہ سے مفقود تھا ہمارے محترم دوست مفتی اکبر علی صاحب شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے اس کی دوبارہ اشاعت فرمائی ہے اور اس عجالہ نافعہ کو دوبارہ عام کر دیا، مدرسین و طلباء بخاری پڑھنے پڑھانے والے امید ہے کہ اس کی پوری قدر دانی کریں گے۔

پتہ:۔ جناب مفتی اکبر علی صاحب اشاعۃ القرآن بوائز سیکنڈری اسکول بڑا میدان، کراچی ۱۸۔

رجب ۱۳۸۷ھ

تبصرہ بر
رُکن ایمان ترجمۂ قرآن

از مولانا ابوالقاسم محمد عتیق بحر العلومی

الحمد للہ وکفی وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ، خصوصًا علیٰ سیدنا محمد المصطفیٰ وآلہ وصحبہ ماکفی وشفی۔ امابعد: قرآنِ حکیم حق تعالیٰ کا آخری پیغام نجات ہے، قیامت تک کی آنے والی نسلوں کے لئے نسخۂ شفائے ہے، الحمد للہ کہ اُمتِ مرحومہ نے ہر دور میں حتی المقدور عصری تقاضوں کے مطابق قرآنی خدمت کا حق ادا کیا، یوں تو قرآنِ کریم حق تعالیٰ کی کتاب ہے، مخلوق کے حیطۂ قدرت سے اس کا حق ادا کرنا باہر ہے، وہ مخزنِ اسرارِ الٰہی ہے کہ زبانِ فیض ترجمانِ نبوت سے "لاتنقضی عجائبہ" کی حقیقت کا انکشاف ہوچکا ہے، اس کے نہ لطائف ختم ہوں گے، نہ اسرار تک عقل کی رسائی ہوسکے گی، چونکہ وہ ایک ابدی پیغامِ حیات ونجات ہے، ہرقوم و ملت اور ہر ملک ووطن کے باشندوں کے لئے چراغِ راہ ہے، اور تمام اُمت اس کی مخاطب ہے، اس لئے حق تعالےٰ نے اپنی حجت پوری کردی ہے کہ ہر عہد میں عصری ذوق وتقاضے کے مطابق امت کو تفسیر وتشریح کی توفیق نصیب ہوئی، اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے کہ گرامی مآثر محترم المقام مولانا ابوالقاسم محمد عتیق صاحب زیدت معالیہم نے ایک خاص انداز سے قرآنی خدمت انجام دی ہے:۔

(۱) قرآنِ کریم کا اردو عمدہ بامحاورہ واضح ترجمہ فرمایا اور جہاں تفہیم مقاصد کے لئے مزید توضیح کی ضرورت ہوئی تو قوسین میں کلمات کا اضافہ فرمایا تاکہ نفسِ ترجمہ سے مقصد کی تشریح ہوجائے اور تشنگی باقی نہ رہے۔

(۲) حاشیہ پر ہر آیتِ کریمہ کا ایک عنوان مقرر فرمایا، یہ بجائے خود ایک مستقل خدمت ہے۔

(۳) ہر آیت کریمہ کا مختصر عنوان الگ قائم فرمایا جو آیت کے موضوع کا کاشف ہے۔

(۴) جن آیاتِ کریمہ سے حضرت رسالت پناہ فداہ ابی وامی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی یا کمالاتِ نبوت میں کوئی وسوسہ پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، اس کے ازالہ وتشفی کے لئے ایک مستقل عنوان کے

ماتحت "التوضیح العجیب لآیات وردت فی حق الحبیب" تالیف فرمائی، جوایک سو پچاس ایسی آیات کی تفسیر ہے۔

(۵) ترجمہ وحاشیہ کے تفسیری مضامین کے مآخذ علماءِ اُمت کی قابلِ اعتماد تفاسیر ہیں، جن کا حوالہ ہر مقام پر دیا گیا ہے۔

(۶) ترجمہ کا نام: "رکن ایمان ترجمۂ قرآن" رکھا گیا۔

(۷) تمام اسماء وتمام تاریخی ہیں جن سے مصنف کا استخراج تاریخ کا خصوصی ذوق معلوم ہوتا ہے۔

(۸) مصنفِ محترم حضرت بحر العلوم مولانا عبد العلی لکھنوی اور حضرت ملا نظام الدین مرحوم، جن کے نام نامی سے درسِ نظامی معروف ومشہور ہے ان کے خاندان کے چشم وچراغ ہیں، گویا مصنف ومترجم موصوف کو یہ ذوق ورثہ میں ملا ہے، بہرحال دورِ حاضر میں قرآنِ کریم کی عمدہ خدمت ہے جو انتہائی قابلِ قدر ہے مجھے امید ہے کہ مولانا موصوف کی یہ خدمت عوام وخواص دونوں میں مقبول ہوگی اور حق تعالیٰ کی بارگاہِ قدس میں خلعتِ قبول سے سرفراز ہوگی۔

وَاللہُ سُبحَانَہٗ وَلِیُّ کُلِّ تَوفِیقٍ۔

جمادی الاخریٰ ۱۳۹۰ھ، اگست ۱۹۷۰ء

التقريظ والانتقاد

اختلاف الفقہاء للطحاویؒ

یا مختصر اختلاف الفقہاء للرازیؒ

بلاشبہ علوم دینیہ اور علوم اسلامیہ میں "فقہ" یا "تفقہ فی الدین" کو جو مقام حاصل ہے وہ اظہر من الشمس ہے صرف قرآنِ کریم کی ایک آیتِ کریمہ اور صحیح بخاری شریف کی ایک حدیث ہی اس کی مزیت اور اہمیت ثابت کرنے کے لئے کافی ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

((فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم إذا رجعوا إلیھم لعلھم یحذرون)) (توبہ ۱۲۲)	سو کیوں نہ نکلا ہر فرقہ میں سے ان میں کا ایک حصہ (گروہ) تاکہ وہ سمجھ پیدا کریں دین میں اور تاکہ وہ خبر پہنچا دیں اپنی قوم کو جبکہ لوٹ کر آئیں ان کی طرف تاکہ وہ بھی بچتے رہیں۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

((ومن یرد اللہ بہ خیراً یفقھہ فی الدین)) رواہ البخاری ومسلم من حدیث معاویۃ والترمذی من حدیث ابن عباس و ابن ماجہ من حدیث أبی ہریرۃ)	اللہ تعالیٰ جس کو خیر پہنچانا چاہتے ہیں اسے دین میں تفقہ اور سمجھ بوجھ عطا فرما دیتے ہیں۔

لیکن یہ علم جتنا اہم ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے اس لئے ہر اسلامی دور میں عام محدثین کی تعداد کے اعتبار سے فقہاء کی تعداد بہت کم رہی ہے، صحابۂ کرام کے عہدِ مبارک سے لے کر قرونِ متوسطہ تک اسی تناسب سے یہ سلسلہ جاری رہا، ظاہر ہے کہ دراصل تفقہ فی الدین یا فقہ کا تعلق فوق العادہ دماغی صلاحیتوں کے بعد انتہائی غور وفکر کی اہلیت سے ہوتا ہے اسی لئے مفکرین اور "اربابِ رأی" کی تعداد ہر دور میں کم ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے چونکہ انسانی عقول متفاوت پیدا کی ہیں، چنانچہ یہ

ضروری نہیں کہ ہر بات کو ہر عقل پا سکے اس لئے اجتہادی مسائل میں اختلاف ناگزیر تھا، قرآن کریم اور احادیثِ نبویہ کریمہ دینِ اسلام کے دو اساس ہیں لیکن تمام مسائلِ دین کو "دقیق و عمیق حکمت" کی بنا پر ان کو صراحت کے ساتھ بیان نہیں فرمایا گیا اور اُمت کے فقہاء کو موقع دیا گیا کہ وہ خود غور و خوض کر کے ان مسائل کا استخراج و استنباط کریں اور اس اختلاف کو نہ صرف یہ کہ برداشت کیا گیا بلکہ "قانونی" مقام دیا گیا، اسی لئے عہدِ صحابہ اور عہدِ سلف ہی سے یہ اجتہادی مسائل میں اختلاف کا سلسلہ جاری رہا، مسندِ احمد و سننِ ابی داؤد وغیرہ میں "حدیث معاذ" اجتہاد و تفقہ فی الدین کی بنیادی حدیث ہے اور اسی بنیاد پر تمام فقہاءِ اسلام کا طرزِ عمل رہا ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اگرچہ یہ کوشش کی کہ اپنے دور کے ممتاز محدثین اور اربابِ فکر و نظر اور اصحابِ ورع و تقویٰ کو ایک مرکز پر جمع کر کے فقہ کا "شورائی نظام" قائم کریں اور بقول موفق مکی اپنے عہد کے ممتاز چالیس اربابِ حدیث و اصحابِ فقہ اور اربابِ ورع و تقویٰ کی ایک "جمعیت" سی بنائی گئی تھی اور اس مجلس میں مہینوں بعض مسائل زیرِ بحث رہتے تھے لیکن اس کے باوجود بہت سے مسائل میں اتفاق نہ ہو پاتا تھا اور اختلاف باقی رہتا تھا تاہم ظاہر ہے کہ اس "شورائی فقہی مذہب" میں جو پختگی ہو سکتی تھی، انفرادی مذاہب میں وہ پختگی نہیں پیدا ہو سکی۔

بہر حال مجتہد کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ قرآن و حدیث اس کے پیش نظر ہوں وہاں یہ بھی ضروری ٹھہرا کہ اپنے سے پہلے عہد کے سلفِ صالحین کے اقوال و آراء بھی اس کے پیشِ نظر رہیں تاکہ "رأی" قائم کرنے میں پوری بصیرت میسر آ سکے، اسی مقصد کے تحت امام ابوحنیفہ نے "قضایاءِ صحابہ" پر ایک مستقل کتاب لکھی اور شاید ابوحنیفہ اُمت میں پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے صحابہ کے اقوال و آراء کو مدون فرمایا۔ کاش اگر اُمت کو یہ جوہر گرانمایہ مل جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔

غرض یہ کہ فقہاءِ امت کے اقوال و آراء و افکار اُمتِ مسلمہ کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں، اس کی حفاظت بہت ضروری ہے یہ اہم ترین ترکہ ہوتا ہے جو امت کو اپنے اسلاف میں ملتا ہے اسی وجہ سے جن علماءِ امت نے اپنی تالیفات میں اس سرمایہ کو محفوظ فرمایا ہے ان کا اُمّت

پر بڑا احسان ہے ان نفوسِ قدسیہ میں چند حضرات حسبِ ذیل ہیں :-

۱ــــ امام محمد بن نصر المروزی المتوفی (۲۹۴)

۲ــــ امام ابو بکر محمد بن المنذر المتوفی (۳۰۹)

۳ــــ امام اُبو جعفر محمد بن جریر الطبری المتوفی (۳۱۰)

۴ــــ اُبو حنیفۃ نعمان بن محمد المغربی

۵ــــ اُبو بکر الطبری الحنفی

۶ــــ امام اُبو جعفر اُحمد بن محمد الطحاوی (۳۲۱)

۷ــــ امام محمد بن محمد الباھلی الشافعی (۳۲۱)

۸ــــ اُبو یحیٰی زکریا الساجی

یہ چند حضرات تو "قدماء" میں سے ہیں، باقی قرنِ سادس میں قابلِ ذکر ابو المظفر یحییٰ بن محمد بن ہبیرۃ الحنبلی کی کتاب الاشراف ہے اور ابو علی الحسین النعمانی کی کتاب ہے۔

باقی وہ علماء و محدثین جنہوں نے اپنی ضخیم مؤلفات میں مذاہبِ ائمہ کے بیان کرنے کا التزام کیا ہے ان میں حافظ ابو عمر ابن عبد البر مالکی ہیں جن کی کتاب "الاستذکار لمذاھب علماء الأمصار" قابلِ قدر کتاب ہے جس کی ایک جلد اس وقت المجلس الأعلی للشئون الإسلامیۃ مصر کی توجہ سے طبع ہو گئی ہے اور ہمارے پاس آگئی ہے ابن رشد اپنی کتاب "بدایۃ المجتہد" میں اسی الاستذکار سے مذاہب نقل کرتے ہیں۔

امام نووی شافعی کی شرح المہذب امام ابن قدامۃ الموفق حنبلی کی کتاب "المغنی" امام بدر الدین عینی کی کتاب عمدۃ القاری مطبوعات میں اور نخب الأفکار شرح شرحِ معانی الآثار مخطوطات میں قابلِ ذکر کتابیں ہیں، متاخرین میں سے امام شعرانی اور عبد الرحمٰن دمشقی کی کتابیں مشہور ہیں اس فن کی کتابوں کی مزاولت سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سینکڑوں کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں، ہندوستان کے علماء میں سے قابلِ ذکر شخصیّت حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی ہے جنہوں نے اپنی تفسیر مظہری میں تحقیقِ مذاہب اور ان کے ادلہ کے بیان میں دادِ تحقیق حاصل کی ہے۔ جزاھم اللہ جمیعًا خیر ما یجزی عبادہ المحسنین، بہر حال

ان کتابوں کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

"ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ اسلام آباد" نے امام طحاوی کی کتاب "اختلاف الفقہاء" کا ایک قطعہ جو شائع کیا ہے یہ ادارہ کی قابلِ قدر خدمت ہے اور علمی کتب خانے میں قابلِ قدر اضافہ ہے، کاش ابتداء ہی سے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی پاکستان کا رُخ اس طرف ہوتا تو آج تک خاصہ بڑا علمی ذخیرہ جمع ہو جاتا اور اس وقت تک جو ایک کروڑ سے زیادہ روپیہ اس ادارہ پر خرچ ہو چکا ہے اس کا قابلِ ذکر نتیجہ سامنے آجاتا اگر سابق ڈاکٹر اور ڈائرکٹر کی توجہ اس طرف مبذول ہوتی تو ادارۂ تحقیقات کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

جناب ڈاکٹر صغیر حسین صاحب معصومی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ موصوف نے اس کتاب کو حاصل کر کے بہت عرق ریزی سے اس کو آڈٹ کیا اور اس پر ایک قابلِ قدر بصیرت افروز مقدمہ لکھا ہے جو بجائے خود ایک نہایت مفید مقالہ ہے، مقدمہ میں ائمہ اجتہاد کے اختلافات کی اہمیت اور تفقہ و اجتہاد کے باب کی ضرورت و اہمیت کو واضح فرمایا ہے اور فروعی اختلاف کی حکمت اور امت میں اس کے رحمت ہونے کی وضاحت فرمائی ہے اور یہ بالکل صحیح کہا ہے کہ اصول و عقائد میں اختلاف تو عذابِ الٰہی ہے لیکن فروعی مسائل میں اختلاف بلاشبہ رحمتِ الٰہی ہے، الحمد للہ کہ راقم الحروف ہی کے قلم سے "بینات" کے صفحات پر اس موضوع پر ایک بصیرت افروز مضمون آچکا ہے، بہر صورت کسی قلمی "مخطوطہ" کو طباعت کے لئے آراستہ کرنے اور مقدمات لکھ کر ان کو نافع سے نافع تر بنانے کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے اس کی حقیقت وہی شخص جانتا ہے جو ان صحراؤں کی بادہ پیمائی کر چکا ہو ۔

در بیاباں گر ز شوقِ کعبہ خواہی زد قدم   سرزنشہا گر کند خارِ مغیلاں غم مخور

مقدمہ کے صفحہ ۱۲ پر مروزی کا نام احمد بن نصر ذکر کیا ہے صحیح محمد بن نصر ہے۔

ڈاکٹر معصومی کی رائے سے اختلاف :-

جناب ڈاکٹر معصومی صاحب نے اس طبع شدہ حصہ کو امام ابو جعفر طحاوی رحمہ اللہ کی اصل کتاب کا ہی حصہ قرار دیا ہے اور صاحبِ "کشف الظنون" حاجی خلیفہ اور محققِ عصر

شیخ محمد زاہد کوثری کی رائے سے اختلاف کیا ہے، صاحبِ "کشف الظنون" کی رائے یہ ہے کہ امام طحاوی نے ایک مبسوط کتاب "اختلاف الفقہاء" لکھی ہے جو ایک سو تیس جزء سے زائد میں ہے اور شیخ کوثری نے بھی "الحاوی" وغیرہ میں اسی کا ذکر کیا ہے اور قاہرہ میں کتاب کا جو حصہ موجود ہے وہ امام ابوبکر جصاص رازی کی کتاب کا حصہ ہے جو امام طحاوی کی کتاب کا اختصار ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ان اجزاء سے حدیثی اجزاء مراد ہیں جو آج کل کے عرف کے مطابق دس بارہ جزء کا ایک مجلد بن جاتا ہے گویا اس حساب سے امام طحاوی کی تالیف دس بارہ اجزاء (مجلدات) میں ہوگی حاجی خلیفہ بہر حال اس فن کے امام ہیں۔ مخطوطات پر جو ان کی نظر ہے اس کی وسعت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ نیز شیخ کوثری بھی اس دور میں قابلِ حیرت وسیع النظر محقق ہوئے ہیں، ان کی وسعتِ نظر اور تحقیقی نگاہ میں کلام کی گنجائش نہیں، نیز عام قاعدہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بات کا اثبات کا دعویٰ کرتا ہے اور دوسرا نافی ہے (اس کی نفی کرتا ہے) تو مثبت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اسی طرح ابن ندیم کا یا آخری دور میں خضری مصری کا یہ کہنا کہ طحاوی نے اپنی اس کتاب کا اہتمام نہیں کیا قابلِ اعتبار نہیں، علاوہ ازیں جو شخص بھی امام طحاوی کی تصانیف کی مزاولت کے نتیجہ میں ان کے انداز سے واقف ہوگا وہ غور کرنے کے بعد یہی فیصلہ کرے گا کہ یہ امام طحاوی کی اصل کتاب نہیں ہے، نیز ظاہر یہ ہے کہ طحاوی کی اصل کتاب اس لئے بھی طویل ہوگی کہ وہ اپنی تصانیف میں جو اخبار و آثار اور روایات پیش کرتے ہیں اپنی اسناد سے پیش کرتے ہیں، ان اسانید کو ہی اختصار کرنے والے نے حذف کیا ہوگا اور یہی عام طور سے اربابِ اختصار کیا کرتے ہیں، ثبوت کے لئے "جامع بیان العلم" جو حافظ ابن عبد البر کی کتاب ہے اس کی تلخیص دیکھ لیجئے، امام طحاوی کے "مشکل الآثار" کے اختصار کو اور اختصار کے اختصار کو دیکھ لیجئے، بہر حال یہ تو عام شواہد ہیں اور ذوقی اشیاء ہیں۔ معصومی صاحب نے ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ جصاص کی تالیف میں کسی مترجم نے اس اختصار کا ذکر نہیں کیا حالانکہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ کسی مصنف کی تمام تالیفات کا استقصاء یا استیفاء کون کرتا ہے، اگر کوئی کرنا بھی چاہے تو نہیں کرسکتا، اسی لئے عام طور پر یہ دلیل بہت کمزور سمجھی جاتی ہے کہ "فلاں مصنف

کی تصانیف کی فہرست میں اس کتاب کا ذکر نہیں ہے"۔ بہر حال راقم ایک ایسی دلیل پیش کرتا ہے کہ یقین ہے کہ معصومی صاحب بھی اس سے انکار نہ فرما سکیں گے یہی کتاب جس کو خود معصومی صاحب نے آڈٹ کیا ہے اور تصحیح کی ہے اور تعلیقات تحریر فرمائی ہیں، اسی میں ایک اتنی واضح دلیل مل گئی ہے کہ یہ کتاب ابو بکر جصاص کی ہے اور اصل کتاب کا اختصار ہے اصل کتاب یہ نہیں ہے: ملاحظہ فرمائیے مطبوعہ کتاب کے صفحہ (۱۰۱) کی عبارت یہ ہے:۔

فی الحلف بالأمانة :۔

ذکر أبو جعفر عن أصحابنا فیمن حلف بأمانة اللہ أنها لیست بیمین۔

ظاہر ہے کہ خود امام طحاوی کبھی ایسا نہیں فرما سکتے کہ ذکر أبو جعفر عن اصحابنا، بلکہ اگر یہ طحاوی کی عبارت ہوتی تو یوں ہوتی: قال أبو جعفر: قال أصحابنا " آگے اور سنیئے۔ جصاص یہ لکھ کر اس پر تنقید فرماتے ہیں:۔

قال أبو بکر، ولیس کذلك الجواب فی الأصل، ھی یمین عندھم وقال الشافعی لیست بیمین اھ۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ابو بکر کہتا ہے: امام طحاوی نے ائمۂ احناف کی طرف جو بات منسوب کی ہے یہ صحیح نہیں ہے بلکہ "کتاب الاصل" یعنی مبسوطِ امام محمد میں مذکور ہے کہ یہ قسم درست ہے اور شرعی یمین ہے البتہ شافعی کے یہاں یمین نہیں ہے۔ "کتاب الاصل مبسوط امام محمد کا دوسرا نام ہے اور کتب" ظاہر روایت" میں شمار ہے گویا جصاص نے اعتراض کیا ہے کہ اس مسئلہ میں امام طحاوی کی یہ نسبت ائمۂ حنفیہ کی طرف درست نہیں کیونکہ مبسوط کے اندر اس کے خلاف بیان کیا ہے۔

یہ عبارت اور یہ تعبیر بالکل صاف دلیل ہے اس دعوے کی کہ یہ کتاب جو "اختلاف الفقہاء" کے نام سے طبع ہو رہی ہے یہ "مختصر اختلاف الفقہاء" ہے، اور ابو بکر جصاص رازی کی تالیف ہے، طحاوی کی کتاب نہیں ہے، بظاہر معصومی صاحب کی نگاہ اس عبارت پر نہیں پڑی ورنہ کوئی امکان نہیں کہ اس عبارت کو دیکھ کر وہ صاحبِ "کشف الظنون" اور کوثری کے دعوے کی تردید فرماتے، بہر حال یہ تو ایک ضمنی بحث و تحقیق ہے جو قطعہ کتاب کا زیور طبع سے

آراستہ ہو گیا ہے وہ بھی بڑی قابلِ قدر علمی خدمت ہے دوسرے اجزاء کا بے صبری سے انتظار ہے کاش یہ مختصر بھی پوری مل جاتی تو ہمارا بڑا کام چل جاتا کیونکہ ہمارے سامنے مطبوعات کے ذخیرہ میں کوئی ایسی کتاب نہیں کہ فقہاءِ بلاد سفیان ثوری اوزاعی حسن ابن شرمہ ابن ابی لیلیٰ وغیرہ کے اقوال و آراء کے ذکر کا التزام کرتی ہو البتہ شیخ کوثری کا یہ فرمانا کہ:۔ اس کتاب میں ائمہ اربعہ وغیرہ کے اقوال کا ذکر ہے۔ تو ہم اس میں معصومی صاحب کے ساتھ ہیں کہ یہ سہوِ قلم ہے امام احمد کے اقوال کا ذکر نہیں کیا گیا اور ممکن ہے کہ وجہ وہی ہو جو معصومی صاحب نے لکھ دی ہے، بہرحال ہمیں تو ان حضرات کے اقوال کی زیادہ ضرورت ہے جن کے مذاہب مدون نہیں ہوئے اور جن کے متبعین بھی دنیا سے اٹھ گئے ہیں یعنی ثوری اوزاعی ابن شبرمۃ ابن ابی لیلیٰ وغیرہ وغیرہ۔

واللہ سبحانہ ولی التوفیق

رجب المرجب ۱۳۹۲ھ، ستمبر ۱۹۷۲ء

ماہنامہ فاران انگلستان کا اجراء

خوشی کی بات ہے کہ انگلستان میں مغرب کے افق سے ایک اردو دینی ماہنامہ "فاران" کا طلوع جناب موسیٰ سلیمان کرماڈی کی ادارت میں ہوا ہے، اس سے بڑھ کر مسرت کی بات یہ ہے کہ کاغذ طباعت، حسنِ خط اور ساری ظاہری رعنائیوں کے ساتھ ساتھ ماشاء اللہ ہر طرح سے معنوی حسن و جمال کا مرقع ہے خیالات کی پاکیزگی مضامین مندرجہ کے انتخاب سے نمایاں ہے اگر معنویت کا یہی انداز باقی رہا تو کفرستانِ مغرب میں انشاء اللہ تعالیٰ نورِ ایمان کا کوکبِ درخشاں ہو گا اللہ تعالیٰ مزید تابانی نصیب فرمائے آمین۔ وہاں کے مسلمانوں کو اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

پتہ:۔ MANAGER FARAN MONTHLY

109 RUTTERWALS (SLAFFS) U.K. TEL. WA 22936

قصیدۂ مناجاتیہ[1]

إلٰهی إنّ آثامی حوتنی　　وضلّ مذاهبی وبکا هداها

الٰہی! میرے گناہ مجھ پر چاروں طرف سے محیط ہیں، مجھ سے راستے گم اور ان کے نشان اوجھل ہوگئے ہیں

فجهد النفس فی شرک الأمانی　　وتضییع الشباب فی هواها

نفس کی تمام جد و جہد آرزوؤں کا جال پھیلانے میں مصروف ہے اور جوانی اس کی خواہش میں ضائع ہو رہی ہے

وجهدی فی معاقرة الخطایا　　ونفسی فی الهوی بلغت مداها

میری محنت خطا کاریوں میں کھپ رہی ہے اور میرا نفس خواہشات کی حد نہایت کو پہنچ گیا ہے

أضعت العمر فی لعب ولهو　　فیا لهفی علی نفسی وآها

میں نے ساری عمر کھیل تماشے میں اڑا ڈالی، پس میرے نفس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے

صرفت العمر فی الآثام حتی　　ضللت حائرًا أمنها متاها

گناہوں میں عمر کھو چکا ہوں، یہاں تک کہ اب حیران و سرگرداں پھر رہا ہوں۔

وقد مزقت ثوبًا من تقاة　　یواری سوأتی عزًّا وجاها

میرا لباسِ تقویٰ تار تار ہے جو عزت و وجاہت سے میری ستر پوشی کرتا تھا

وإنی قد غرقت فی ذنوب　　فخلصنی إلٰهی من بلاها

اور میں گناہوں میں مستغرق ہوں، الٰہی! مجھے ان کی بلا سے خلاصی عطا فرمائیے

وقد ضیعت عمری فی الملاهی　　وأشیاء أتتنی من هواها

میں نے ساری عمر ملاہی اور خواہشات نفس کے پورا کرنے میں بسر کردی

فکانت کلها أهواء نفس　　بلیت بها فنفسی فی شجاها

یہ سب نفس کی خواہشات تھیں جن میں میں مبتلا رہا پس میری جان سخت غم و اندوہ میں ہے

---

[1] حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ نے یہ قصیدہ رمضان المبارک ۱۳۵۰ھ میں تحریر فرمایا تھا اور ربیع الاوّل ۱۳۹۴ھ میں بینات میں شاملِ اشاعت ہوا حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ کے عربی اشعار کا مجموعہ الحمد للہ قارئین کرام کی خدمت میں القصائد البنوریہ کے نام سے پیش کیا جا چکا ہے۔ مختار

ملاذی، ملجئی، مولائی، ربی　　إلٰهی فاحمنی ناراً لظاها

اے میری پناہ! اے ملجا! اے میرے مولا! اے میرے رب! اے میرے معبود! مجھے آگ کے شعلے سے بچا لیجئے

نصیری، ناصری ومليك نفسی　　رشیدی، مُرشدی، هادی عماها

اے میرے ناصر ومددگار اور میری جان کے مالک! اے مجھے ہدایت دینے والے اور تاریکیوں میں رہنمائی کرنے والے!

إلٰهی جئت أوّاهاً مُنيباً　　فأنزل منك من مزن حياها

الٰہی! میں گڑگڑاتا ہوا اور توبہ کرتا ہوا تیرے دربار میں حاضر ہوں مجھ پر اپنی رحمت کے بادلوں کی بارش نازل فرمائیے

فما عندی لعاقبتی مزاد　　وعفوك يا إلٰهی قد كفاها

میرے پاس کوئی توشۂ آخرت نہیں، الٰہی! اس کی جگہ تیرا عفو ہی کفایت کنندہ ہے

فأكرمنی بعفو من ذنوبی　　ورحم واسع هو مقتضاها

میرے گناہوں کو معاف فرما کر مجھے ذلت سے بچا لیجئے اور میرے گناہوں کی بقدر مجھ پر وسیع رحم فرمائیے

فإن كان العباد بحار ذنب　　فبحر العفو منك قد طواها

اگر بندے گناہوں کے سمندر ہیں تو تیری عنایت کا سمندر ان کو پاٹنے کے لئے کافی ہے

وإن كان العبيد فی سقام　　فعندك يا إلٰهی من دواها

اور اگر بندے مختلف امراض میں گرفتار ہیں تو الٰہی! تیرے پاس ان کی دوا موجود ہے

إلٰهی أنت ربّی أنت حسبی　　عليم بالنفوس وما ثواها

الٰہی! آپ ہی میرے رب ہیں آپ ہی مجھے کافی ہیں دلوں سے اور دلوں کے پوشیدہ خیالات سے باخبر ہیں

إلٰهی قد ترعرعت رقوداً　　فأيقظ نفس عبدك من كراها

الٰہی! میں خوابِ غفلت میں پل کر جوان ہوا، بس اپنے بندے کو اس کی نیند سے چونکا دیجئے

وهذا شهر رمضان المبارك　　فدعوات تجاب لمن دعاها

اور یہ رمضان کا مبارک مہینہ ہے جس میں مانگنے والوں کو منہ مانگی مُرادیں ملتی ہیں۔

فشهر فيه نور قد أتانا　　وشهر فيه أنوار نراها

یہی مہینہ ہے جس میں ہمارے پاس نور (قرآن مجید) آیا اور اس مہینے میں ہم واضح انوار کا مشاہدہ کرتے ہیں

فأيام وليلات كريمة　　فأسأل منك من كرم زهاها

اس کے دن رات میں کرم ہی کرم ہے، میں آپ سے غایتِ کرم کا خواستگار ہوں

فنعم الشهر نعم الوقت ربی — وأيام بليلات ضياها

میرے رب! یہ بہت خوب مہینہ اور بہت ہی خوب وقت ہے اس کے دن اور راتیں باہم دگر متشابہ ہیں

غنی أنت ذو جود غزیر — ونفسی أجدبت مما دهاها

آپ غنی ہیں بے پایاں جود و احسان کے مالک ہیں اور میرا نفس اپنی آفات کی وجہ سے خشک بنجر ہے

فمنك الفيض ليس له نفاد — ومنها الجدب ليس لها دواها

پس آپ کی جانب سے نہ ختم ہونے والا فیض ہے اور اس کی جانب سے ایسا فاقہ ہے جس کی دوا اس کے پاس نہیں

ومنك السح ليس له نهاءٌ — ومنها النشف ما منه غناها

اور آپ کی جانب سے رحمت کا بے پناہ سیلاب ہے اور اس کا کام اسے جذب کرنا ہے جس کے بغیر اسے چارہ نہیں

سألتك يا إلٰهی فی ليال — بخوف قد عرانی فی دجاها

الٰہی میں نے ایسے خوف کے ساتھ تیرے سامنے دستِ سوال دراز کیا ہے جو رات کی تاریکیوں میں مجھ پر طاری ہے

أتيتك سائلاً والنفس ترجو — وأنت المنعم الموفی مناها

میں بغرضِ سوال تیرے دربار میں حاضر ہوا اور دل میں امیدیں ہیں اور آپ انعام کرنیوالے اور دلی آرزوؤں کو پورا کرنیوالے ہیں

فطنب فوقها فسطاط عفو — وقوض من خطایاها خباها

پس اس پر معافی کا خیمہ تان دیجئے اور اس کی غلطیوں کے خیمے اکھاڑ دیجئے

ذنوبی إن عدت عداً وحصراً — ففضلك يا إلٰهی قد عداها

میرے گناہ اگرچہ حدِ شمار سے متجاوز ہیں، لیکن الٰہی تیرا فضل ان سے بھی متجاوز ہے

تعاملنی وجاملنی بفضل — كما أنت له أهل إلٰها

پس در گذر فرما کر مجھ سے فضل کا ایسا معاملہ فرما دیجئے جو آپ کے شایانِ شان ہو

وأللّٰهم صل ثم سلم — علی خير البرايا مصطفاها

اور اے اللہ صلاۃ وسلام نازل فرمائیے اس ذاتِ عالی پر جو تمام مخلوق سے بہتر اور برگزیدہ ہے

إلی ما تذرف العين دموعًا — وما وجلت قلوب من بكاها

جب تک آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں اور جب تک رونے سے دل کانپتے رہیں۔

ربیع الاول ۱۳۹۴ھ، اپریل ۱۹۷۴ء